
ماہنامہ

مکتبۂ اردو کی ہر دلعزیز مطبوعات

نغمۂ حرم [illegible] نغمۂ حرم [illegible]

شعلے [illegible]

ظلمت نیاں [illegible]

[illegible]

پریم کا جادو [illegible]

باسی پھول [illegible]

ترکی حمیدیہ [illegible]

[illegible]

خطوط [illegible]

شہنشاہ حبش [illegible]

نو کر افسانے [illegible]

پھول اور کانٹے [illegible]

حاجی لق لق [illegible]

[illegible] **کی خلوت** [illegible]

گناہ [illegible]

آہنگ [illegible]

دنیا کی حور اور دیار فیض یہ کتاب خاص طور پر لڑکیوں اور عورتوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ [illegible]

[illegible]

Date...........

منظور کردہ محکمہ تعلیم پنجاب صوبہ سرحد ریاست حیدرآباد دکن

چندہ سالانہ معہ سالنامہ و افسانہ نمبر تین روپے چار آنے علاوہ محصول ڈاک

چندہ ممالک غیر سے آٹھ شلنگ

رسالہ ادب لطیف لاہور

ادارۂ تحریر
چودہری برکت علی بی-اے
میرزا ادیب بی-اے

مینجنگ پروپرائیٹر
چوہدری نذیر احمد

مینیجر
بشیر احمد

فروری ۱۹۳۹ء

مقامِ اشاعت: مکتبۂ اردو لاہور

فی پرچہ چار آنے

جلد ۸ — نمبر ۲

فہرست مضامین

چودھری برکت علی بی-اے پرنٹر پبلشر نے مراد کو [illegible] پرنٹنگ پریس وطن بلڈنگ لاہور سے چھپوا کر دفتر ادب لطیف سرکلر روڈ لاہور سے شائع کیا

اشارات

اُردو رسائل کے قارئین کی بے حسی

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم ایک اہم مسئلہ پر لکھا۔ بیان کرکے اس امر کے متوقع ہیں کہ ہمارے محترم قارئین رسالہ اس سلسلے میں اپنی رایوں سے ہمیں مستفید فرمائینگے لیکن ہوتا یہ ہے کہ قارئین اس طرف کوئی توجہ نہیں کرتے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اہم مسئلہ جوں کا توں رہ جاتا ہے اور اپنی تمام اہمیت کھو دیتا ہے قارئین کے پاس یا تو اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ وہ مدیر کی گزارشات پر غور کرکے اپنی رائے کا اظہار کریں یا وہ زیر بحث مسئلے کو قابل غور ہی نہیں سمجھتے ہمیں متعدد رسائل و جرائد کے مدیران محترم سے اس سلسلے میں گفتگو کرنے کا موقعہ ملا قریباً تمام حضرات نے اپنے قارئین کی بے دلی کی شکایت کی ہے اور بعض دوستوں نے تو ہمیں یہ بھی بتایا کہ وہ اپنے ادارے میں قارئین جو کچھ چھپتے ہیں وہ اس لیے لکھتے ہیں کہ ... حال نہیں۔ ... اپنے قارئین سے وہ عملی طور پر مایوس ہیں۔ ... رسائل و جرائد کے کرم فرماؤں کی یہ حالت ہے تو پھر ... کوئی اہم مسئلہ ... کیونکر حل کر سکتا ہے؟

ہمارا مقالے میں جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ اس لئے لکھا جاتا ہے کہ رسالہ کے قارئین اس پر غور فرمائیں اور پھر اس سلسلے میں ایڈیٹر کی رہنمائی کریں۔ چند ماہ ہوئے ادب لطیف میں حشر مرحوم و مغفور کی یادگار اور ان کے ڈراموں کی اشاعت پر بہت کچھ لکھا گیا تھا مگر اس کا نتیجہ کیا نکلا ہے۔ صرف چند حضرات نے ... جو ہمارے خاص دوست ہیں، اپنے خیالات سے ہماری راہنمائی کی باقی ہمارے قارئین بالکل بے حس اور خاموش بیٹھے رہے گویا حشر مرحوم کے ڈراموں کی اشاعت کا مسئلہ کوئی ضروری مسئلہ نہیں درآنحالیکہ آغا مرحوم کے ڈراموں کی اشاعت سے ہمارے ادب میں معتدبہ اضافہ ہو سکتا ہے اردو کی یہ صنف ... بہت کمزور اور قابل رحم ہے ... عالم میں حشر نے ... کی خدمت کی، اس لئے اس کے احسانات کے اعتراف کے لئے اسکی یادگار قائم کرنا نہایت ضروری امر ہے اور پھر ... ڈراموں نے ڈرامانویسی کی سطح کو بہت بلند کردیا۔ اس

ان ڈراموں کا کتابی صورت میں محفوظ ہو جانا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ مگر ہمارے قارئین میں کتنے ہیں جنہوں نے اس سلسلے پر رائے دی کی؟ اس کے بعد اردو ہندی کے قضیہ نامرضیہ پر بہت کچھ لکھا گیا۔ مگر ہماری ہر گذارش صدا بصحرا ثابت ہوئی اور دیکھیے اسوقت ہندوستان کی فلم ساز کمپنیاں اپنی فلموں میں وہ زبان استعمال کر رہی ہیں ——— اور اس زبان کو عوام میں فروغ و ترقی دینے کی کوشش کر رہی ہیں جسے مضحکہ آمیز ہندی کہنا زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فلم ساز کمپنیوں کا یہ رویہ اردو کے ساتھ بدترین قسم کی دشمنی ہے۔ ادب لطیف میں عرصے سے اس پر لکھا جا رہا ہے مگر اب تک صرف چار پانچ کرمفرماؤں نے اسطرح پر خامہ فرسائی کی تکلیف گوارا فرمائی ہے!

قارئین محترم کو معلوم ہونا چاہئے کہ ایک منظم اور ہمہ گیر تائید کی حامل رائے ہی وقت کے اس اہم مسئلے کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ آپ کی بے حسی، خاموشی اور عدم دلچسپی وقت کی مخالف رو کا ساتھ دے رہی ہے۔ آپ خاموش بیٹھے ہیں اور بولنے والے حسب منشا کام کرتے چلے جا رہے ہیں آپ بے حس و حرکت بیٹھے ہوئے اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ وقت موجودہ اہم مسائل کا خود فیصلہ کر دے گا۔ - - - - - - - - - -

مگر کام کرنیوالے ان مسائل کا خود فیصلہ کر رہے ہیں آپ کسی بات میں دلچسپی نہیں لیتے مگر ہر بات میں دلچسپی لینے والے لوگ ہی ہر بات کو منوا کر ہی چھوڑتے ہیں!

ادب لطیف آپکی آواز ہے آپکی رائے کا ترجمان ہے، آپکی تمناؤں آپ کے ارادوں اور آپ کی خواہشوں کا پیغامبر ہے۔ پھر سوچئے اگر آپ خاموش رہیں گے، تو یہ کونسی آواز بلند کرے گا، آپ رائے نہیں دیں گے تو یہ کس رائے کا اظہار کرے گا آپ اس کی پالیسی کی تعمیر و تشکیل میں دلچسپی نہیں لیں گے تو بتایئے اسکی موجودہ پالیسی کن ارادوں کا عکس ہوگی؟؟

سوچئے!　　　سوچئے!!　　　سوچئے!!!

ڈراما نمبر ۔ ڈراما نمبر کے مضامین کی فراہمی کا کام شروع ہو گیا ہے، چند ڈرامے دفتر میں پہنچ بھی چکے ہیں ہم اپنے محترم اہلِ قلم کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ وہ اس طرف جلد توجہ کریں تاکہ مضامین اور ڈراموں کی ترتیب میں آسانی رہے۔

ہمیں کامل امید ہے ہمارا یہ نمبر ہر لحاظ سے ہم پلہ اور معیاری ہوگا

صحرا نورد کا آٹھواں خط ۔ ... کا آٹھواں خط ... علیحدہ کتابی صورت میں ... کتاب بنا جائے گا ... سکے ... حصہ ... ہیں ...

... اس کے متعلق کچھ بھی نہیں کہنا چاہتے ... کہ اس ... مصنف کا ... ہیں ... جو ... کی طرح ظلم اور ظالم ... دکھایا گیا ہے ... جس ... گرد ... اس کے سینے میں ... شعلوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں ... ظلم و مظلوم کا تصادم

اس رومان میں ایک کونگی ... دیوانی عورت ... حسین ... بھی لگی ہے اگرچہ اس کی رگ رگ میں جذبات کا طوفان ... ہے۔ مگر اس کی زبان ... بے معنی ... جذبات کا طوفان ... کے اظہار کے لئے ایک بامعنی آواز بھی حاصل نہیں ہو سکتی

... علیحدہ کتابی صورت میں ملاحظہ فرمائیں۔

ایف ڈبلیو بین کا ایک نیا شاہپارہ ۔ ... ادبِ لطیف کو ... حاصل ہے کہ اس نے اردو دان پبلک کو انگریزی کے جلیل القدر رومان نویس ایف ڈبلیو بین سے روشناس کرایا ہے ...

... نہیں ... ہو چکے ہیں ... آئندہ شمارے میں اس کا ایک نیا شاہکار ... شائع ہونا شروع ہو جائے گا ... رومان ... صاحب نے اردو میں نہایت کامیابی کے ساتھ منتقل کیا ہے۔

رسالے کی اشاعت میں تاخیر ۔ ہمیں افسوس ہے کہ رسالہ ... چند ... تاخیر کے ساتھ شائع ہو رہا ہے ... قارئین کرام ... کی تاخیر کے سلسلے میں کوئی شکایت نہیں ہوگی کا ... ادبِ لطیف ... کہ وہ بہت ... کریں گے

مکتبہ اردو کی تازہ سرگرمیاں ۔ حضرت ... کی نظموں کا ... مجموعہ ... چھپ کر تیار ہو چکا ہے جو حضرات اب تک ... کی ... اٹھاتے رہے ہیں ... اس طرف فوراً متوجہ ہونا چاہیئے۔

ہم نے اعلان کیا تھا جناب ... احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کا مجموعہ ... کے افسانے بھی شامل ہیں ... شائع ہو جائے گا ... جن کے چار افسانوں کو علیحدہ کتابی صورت میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ کتابت ... جاری ہے کتاب عنقریب شائع ہو جائے گی

... کا مجموعہ بھی لکھا جا رہا ہے ... صاحب کے افسانے ... بہت جلد شائع ہوں گے ... پروفیسر علی عباس حسینی کے افسانے بھی چھپ رہے ہیں ... جمہوریہ پریس میں ہے!

امید ہے دوسری کتابیں بھی بہت جلد شائع ہو جائیں گی۔

ہیڈ ماسٹر صاحبان سے ۔ ہماری یہ شکایت مدت سے چلی آ رہی ہے۔ کہ ہیڈ ماسٹر صاحبان رسالہ کے بلوں کی ادائیگی میں انتہائی بے پروائی برتتے ہیں درآنحالیکہ انہیں رسائل و جرائد کی طرف خاص توجہ دینی چاہیئے۔ امید ہے کہ آپ اس طرف توجہ کریں گے

(منیجر)

میرزا ادیب

صحرانورد کا آٹھواں خط

سمارت کا قیدی

پیارے دوست ——————————!

آخر ایک مدت کے بعد تمہاری پیاری تحریر آنکھوں کے سامنے آئی ہے۔ پوچھو کہ میں نے اسے کتنی بار پڑھا کس دلچسپی و شوق کے ساتھ پڑھا۔ ممکن ہے تم اسے صرف مبالغہ سمجھو مگر میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ جس بیتابی کے ساتھ تم میرے خطوط کا انتظار کرتے تھے ہو اسی بیتابی کے ساتھ میں تمہاری تحریر کا منتظر رہتا ہوں تمہاری تحریر مختصر سہی، بے کیف سہی، کسی دلچسپ رومان سے یکسر محروم سہی مگر پھر بھی۔ تمہاری تحریر تو ہے، ایک نہایت پیارے دوست —— ایک نہایت عزیز ہستی کی پیاری تحریر کیا تم میرے دعوے کی ناقابلِ تردید دلیل نہیں؟

میں نے جب پچھلا رومان بھیجا۔ اس وقت یہ رومان بھی مکمل تھا اور خیال تھا کہ دونوں رومان بھیج دوں گا لیکن یہ ارادہ جلد ہی بدل گیا، کیونکہ اس رومان کو زیرِ نظر رومان کے ساتھ بھیجنا چاہتا تھا اور اب جب کہ یہ رومان بھی مکمل ہو چکا ہے، میں اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہوں یہ رومان جو ابھی مکمل ہوا ہے، ایک نئی زنجیر کی کڑی ہے اور چند ماہ کے بعد تم اسے اپنے پاس پاؤ گے

یہ خط [illegible] طویل۔ دو رومانوں پر مشتمل ہے اور میں یقین کرتا ہوں کہ یہ داستانیں میرے پچھلے رومانوں سے زیادہ دلچسپ و دل آویز ہیں مگر اس سے یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ میں محض تمہاری آتشِ شوق کو ہوا دے رہا ہوں ہرگز نہیں۔ مجھے تو صرف حقیقت کا اظہار مطلوب ہے، اور یہی چیز میرے قلم سے یہ سطریں لکھوا رہی ہے!

فی الحال انتظار کرو، خلشِ انتظار میں بھی ایک قسم کی لذت ہوتی ہے۔ اور پھر تمہارے جیسے رومان پرست انسان کے لیے تو خلشِ انتظار بھی لذیذ شے ہے۔

حسبِ عادت تم نے اس خط میں بھی میرے موجودہ حالات کے متعلق دریافت کیا ہے، عزیز و مکرم دوست! میں تمہاری محبت —— تمہاری ہمدردی کا شکرگزار ہوں مگر جیسا کہ میں اپنے گزشتہ خطوط میں لکھ چکا ہوں صحرائی زندگی کی گوناگوں سحر انگیز کیفیات کا تجزیہ میری زبان کی وسعت سے بالا اور میرے قلم کی طاقت سے دور ہے! صحرا کی لق و دق بے برگ و بار اور پھر خوفناک و ہیبت زا دنیا انسانی تصور سے زیادہ پُراسرار، سحر طراز اور رومان پرور دنیا ہے

صحرا انسانی زندگی کا ایک مہیب خواب ہے۔ جو لامحدود خوفناک وسعتوں پر پھیلا ہوا ہے —— صحرائی زندگی ایک مست و مخمور نغمہ ہے، جو طلسم زا دھندلاہٹوں کے دامنوں میں رقص کر رہا ہے۔ اور پھر صحرائی مناظر نغمہ و نکہت کے وہ آویزہ دل پیکر ہیں، جو ہر وقت فضاؤں میں لہراتے رہتے ہیں یہاں کا خود رو پھول، رنگ و بُو کا ایک حسین مجموعہ ہی نہیں بلکہ قدرت کی نادر ترین صناعی اور کامل ترین رعنائی کا ایک لاجواب نمونہ بھی ہے —— یہاں کا ہر گوشہ ریت کے صرف چند تودوں، چند بے برگ و بار درختوں اور چند طرح طرح کی جھاڑیوں ہی پر مشتمل نہیں بلکہ ان بے رنگ و آب صحرائی عناصر کے ذرے ذرے میں وہ حسن رقصاں ہے، جو کہیں تو

دلنشیں کرنیں نکھرے چاند کے شفاف سینے سے جلوہ فشاں ہے اور جب موسیقی کی کیف آگیں لہریں ہو کر ستاروں پر لہرا رہا ہے۔ مگر یہ حسن، اس روح و روان کائنات کی حقیقت سمجھنے کے لئے حقیقت پرست آنکھ کی ضرورت ہے سطح بین نگاہ کیلئے یہ کچھ حقیقت نہیں رکھتا

تم نے اپنے خط میں پوچھا ہے کہ یہاں کی تنہائی سے میں گھبرا جاتا ہوں یا نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو آغا! بسرام کی شخصیت اسقدر دلچسپ ہے، کہ مجھے کسی ساتھی کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور پھر یہ بھی دیکھو۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال　　ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

میرے خیالات، یہاں ہر وقت میرے لئے ایک نئی دنیا آباد کئے رکھتی ہیں۔

سچ کہتا ہوں جب میں فکر کرتے ہوئے کوئی انسانی کاسہ سر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے تو تصوّرات کی ایک نئی دنیا میں لے جاتا ہے ایک ایسی دنیا میں جہاں میرے چاروں طرف ایک عجیب غریب ہیبت ناک تمدن اور ناقابلِ فہم تمدن کے آثار بکھرے ہوں۔ میں محسوس کرتا ہوں، جیسے میں صدیوں پیچھے چلا گیا ہوں، نئی انسانی شکلیں نمودار ہوتی ہیں ——— اور انکے ساتھ ہی پراسرار واقعات رونما ہونے لگتے ہیں ——— مجھ پر گھنٹوں ایک عالم تحیر کیفیت چھائی رہتی ہے اور جب کسی اونٹ کی ہڈیاں دکھائی دیتی ہیں، تو میری آنکھوں کے سامنے ریت کا وسیع صحرا آجاتا ہے جہاں ستاروں کی چھاؤں میں ایک قافلہ رستہ طے کر رہا ہے گھنٹیوں کی خوش آئند آوازیں فضا میں ایک طلسم انگیز ترنم پیدا کر رہا ہے اور حدی خوان کا درد آور نغمہ دل و دماغ پر ایک عجیب اثر پیدا کر رہا ہے!

کہاں تک لکھوں ان ہنگامہ آرائیوں کے باوجود تم مجھے تنہا سمجھو گے؟ میرا خیال ہے میں نے تمہارے سوال کا جواب دے دیا ہے! اور ممکن ہے یہ طرزِ تحریر تمہیں اپنا نظریہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دے۔

آغا بسرام تمہیں سلام کہتا ہے اور تمہاری یادآوری کا بہت ممنون ہے۔ اسے یقین ہے کہ تم میرے ساتھ اس کا شکریہ بھی ادا کرو گے ——— پھر آگے آنے سے پہلے اپنے آنے کی اطلاع ضرور کرنا!

میں ہوں تمہارا ——— صحرا نورد

(۱)

ابھرتا ہوا آفتاب شہر سمارت کی بلند و بالا فصیلوں پر اپنی سنہری کرنیں ڈال رہا تھا۔ فصیل کے باہر ایک وسیع میدان میں درختوں کے خزاں رسیدہ زرد پتے تیز ہوا کی سرد آغوش میں تھر تھرا رہے تھے۔ مظلوم غلاموں کے ٹھٹھرتے ہوئے جسم، جو سمارت کی موجودہ حکومت کے حکم سے شاہی باغوں اور کھیتوں کو سرسبز و شاداب رکھنے پر مقرر تھے۔ یہ مظلوم اور تیرہ بخت غلام رات کے آخری حصے ہی میں اپنے گھروں سے نکل کر اس وسیع میدان میں پہنچ جاتے اور یہاں پہنچکر سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے ہاتھوں کیساتھ ہل جوتتے۔ پودوں کو سینچتے، پھلوں کی آبیاری کرتے، اور اس کے علاوہ بھی شدّاد خو افسروں کے حسبِ حکم، رذیل سے رذیل بدبخت سے سخت

کام کرتے اور جب شام کی تاریکی پھیل جاتی، تو اپنے زخمی جسموں اور زخمی حصوں سے زیادہ زخمی روحوں کو لئے ہوئے گھروں کو روانہ ہو جاتے۔ یہی ان کے سب روزانہ فرائض تھے اور انہی فرائض کی تکمیل انکی غلامانہ زندگی کا بہترین مقصد ———.

صبح گوناگوں جلوے لئے ہوئے طلوع ہوتی تھی اور مختلف کیفیات پیدا کرتا ہوا رات کی جن میں غروب ہو جاتا تھا مگر ان زخمی روح غلاموں ——— ان حسرت نصیب ہستیوں کی دنیا ہر وقت صرف ایک ہی محور کے گرد چکر لگا رہی تھی اور وہ تھا غلامانہ بے چارگی کا محور ———! طلوع کے وقت بے نور و مضمحل چاند انہیں لرزتے ہوئے، کانپتے ہوئے ہی دیکھتا ——— شام کے زرد رو زوال آفتاب کو انکے زخمی اور دہشت زدہ جسم ہی نظر آتے اور رات کی تاریکی میں ہوا کی لہریں ان کی کراہوں اور

آہوں ہی کو سنتیں۔ ——— غرض ان کی زندگی سانس لیتی ہوئی بہشت تھی، چیختا چلاتا ہوا خوف تھا اور خاک و خون میں تڑپتی ہوئی بے کسی تھی۔ —— اسی حال میں ان کی زندگی گذر رہی تھی ——— گزرتی چلی جا رہی تھی۔

آج بھی وہ حسب معمول اپنے فرائض انجام دے رہے تھے —— ننگے آقایان محترم وہاں موجود نہیں تھے۔ مگر کیا ہوا؟ ان کے آقایان محترم کے جسم خراش بید تو ہر وقت ان کو نگاہوں کے سامنے نظر آ رہے تھے — حکومت کی بیدردی و سفاکی کا لرزہ خیز احساس تو ہر لمحہ ان کے دل میں موجود تھا۔ اور اپنی غلامانہ بے کسی کا یقین تو ہر وقت ان کی روحوں پر مسلط تھا۔ یہ احساس —— یہ یقین کیا ان کو بے چارگی و بے کسی کی اتھاہ گہرائیوں میں اترنے پر مجبور نہیں کر سکتا تھا؟؟

سورج ابھرتا جا رہا تھا —— روشنی پھیلتی جا رہی تھی!

یکایک ایک غلام نے ٹھٹھرتے ہوئے ہاتھ پیشانی پر رکھ کر ابھرتے ہوئے آفتاب کو دیکھا اور سرگوشی کے عالم میں اپنے ساتھی سے کہا۔

"آج تو سورج نکلتا ہی نہیں سردی سے مر ہی گئے!"

دوسرے غلام نے قہر انگیز نظروں سے اپنے ساتھی کو دیکھا اور کرخت آواز میں بولا "مر جاؤ! تمہیں زندہ رہنے پر کون مجبور کرتا ہے؟"

پہلے نے لمبی آہ بھری اور کہا "غدر کے سوا کون ہمیں زندہ رہنے پر مجبور کر سکتا ہے؟ ہم مر گئے تو کون ان باغوں کو پانی دے گا؟ کون ان کھیتوں کی پرورش کرے گا؟؟ کون اپنے ننگے جسموں پر خونخوار تاتاریوں کے بید کھائے گا؟؟؟ کون ———"

"ہمارے ساتھ سعادت کے نام پر شدت تو نہیں مرتب ہو گئے! جانتے نہیں اس بدنصیب ملک کا پیدا شدہ تاتاریوں کا غلام ہے" دوسرے نے اس کے الفاظ کاٹتے ہوئے کہا۔

"یہ تو درست ہے صفدر!"

صفدر نے ایک زرد پتے پر جو ابھی ابھی زمین پر گرا تھا اپنا پاؤں رکھا، اور قدرے پُرجوش لہجے میں کہنے لگا "فرخ تم کو غلام ملک کے باشندوں پر ہر قسم کا اختیار حاصل ہے وہ ان کے جسموں کو ٹکڑے ٹکڑے کر سکتی ہے، ان کی روحوں کو حقارت سے ٹھکرا سکتی ہے اور ان کے دماغوں کو جس طرح کچل سکتی ہے ——؟"

اس کے جواب میں صفدر کے ساتھی نے آہ بھری اور اپنے ان ساتھیوں کو دیکھنے لگا جو کندھوں پر بڑی بڑی ٹہنیاں اٹھائے سامنے پہاڑی کے دامن میں سے گزر رہے تھے۔

ایک منٹ تک خاموشی طاری رہی صفدر کے چہرے پر حسرت چھا گئی، اور اس نے لمبی آہ بھر کر کہا "کاش! پاشا زندہ رہتا"

"اگر پاشا زندہ رہتا تو آج ہمارا ملک آزاد ہو چکا ہوتا" صفدر کے ساتھی نے کہا اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

اب سورج فصیل کے عین اوپر چمک رہا تھا غلام اپنے اپنے کام میں مشغول تھے!

"غلام کتو" یکایک ایک تاتاری افسر کی آواز گونجی، اور اس کے ساتھ ہی شڑاپ شڑاپ کی آوازیں آنے لگیں تاتاری افسروں کا یہ روزمرہ کا دستور تھا کہ وہ آتے ہی غلاموں کے جسموں کو بید سے ادھیڑنے لگتے، اور یہ کام ان کے لئے محض تفریح طبع کی حیثیت رکھتا تھا چنانچہ آج بھی وہ اپنی تفریح طبع میں مشغول تھے۔

سورج کی روشنی اب غلاموں کی تاریک دنیا میں بھی پہنچ چکی تھی، ہوا میں بدستور تیزی و تندی موجود تھی، اور اس کے طوفانی جھونکے برابر زرد پتوں کو نوچ نوچ کر غلاموں پر گرا رہے تھے فصیل کے اوپر ابر کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اڑا چلا جا رہا تھا!

اچانک ایک تاتاری کے ہاتھ حرکت کرتے کرتے رک گئے، وہ کھیت کی جانب دیکھنے لگا، تھوڑی دیر کے بعد ایک لڑکا خون میں شرابور کھیت کے نشیب آ کر رک گیا۔ اس کے بازو بلند ہوئے، اور اس کے منہ سے ہانپتی ہوئی "اوفو، اوفو" کہتی ہوئی آواز فضا میں گونجنے لگی اس کے بازوؤں کے بلند ہوتے ہی ایک بڑی سی شہتیری پہاڑ سے لڑھکنے لگی، اور پھر دوسرے لمحے میں ایک شخص پہاڑی کے دامن میں گھوڑے پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ تاتاری افسر لڑکے کی طرف تیزی سے چلنے لگے مگر اس سے پیشتر، وہ وہاں پہنچیں لڑکا دھم سے زمین پر گر پڑا۔ ایک تاتاری افسر نے غصے میں تھرتھراتے ہوئے لڑکے کو اپنے بید سے ہلایا، لڑکے کے

منہ سے خون کی دھار نکلی اور منہ کے کچھ حصے کو سرخ رنگ گئی۔ اب سب تاتاری بھی لڑکے کے جسم سے برچھے کھینچ گیا۔ چند لمحے گزر گئے۔ یکایک پہاڑ کے دامن سے گرد و غبار کی آندھی سی اٹھتی ہوئی نظر آئی ــــ یہ آندھی بڑھنے لگی سب کی نگاہیں اس طرف دیکھنے لگیں تاتاری افسروں کے قریب پہنچ کر گرد و غبار کے کثیف پردے میں سے ایک سرپٹ دوڑتا ہوا گھوڑا نمودار ہو گیا اور دو تین لمحوں کے بعد ایک نوجوان نے گھوڑے سے اتر کر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ لڑکے کو بازوؤں پر اٹھا لیا اور گھوڑے کی طرف بڑھا ایک تاتاری افسر کے ہاتھ سے فرط حیرت میں بید گر پڑا اور اس کے منہ سے پاشا نکلتی ہوئی اور فضا میں گونج گئی ــــ اس وقت انکے سامنے حکومت امارت کا سب سے بڑا باغی کھڑا تھا ـــ

دونوں نے پاشا کی طرف جھپٹے۔ پاشا نے ایک ہاتھ سے لڑکے کو سنبھالا اور دوسرے ہاتھ سے دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ چند لمحوں کی کشمکش کے بعد وہ گھوڑے کے قریب پہنچ گیا۔ لڑکے کے منہ سے اور خون نکلا اس نے آنکھیں کھولدیں اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ آپس میں ٹکرانے لگے۔ اور ان سے ٹوٹتی ہوئی ہلکی سی... مضمحل سی آواز نکلنے لگی۔ پاشا گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ اور ابھی گھوڑے نے چند قدم ہی اٹھائے ہونگے کہ اسے چاروں طرف گرد و غبار کے بادل چھا گئے اور ان بادلوں میں تاتاری شہسواروں کے گھوڑے ہنہنانے لگے۔

لڑکے کے خون سے تھرتھرائے ہوئے ہونٹ ابھی تک تھرتھرا رہے تھے اور ان سے بہت مدھم سی آواز نکل رہی تھی ـــ ایکبار اور اس کے منہ سے خون کی دھار نکلی اور وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ پاشا کی غم و حسرت میں ڈوبی ہوئی نگاہیں اسکے معصوم چہرے پر گڑ گئیں۔ اور اسے یہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اسے اسوقت اپنی حالت کا اندازہ ہوا جب اس کے بازو زنجیروں میں جکڑے جا چکے تھے۔ اور بے شمار تاتاری سپاہی اس کے گرد کھڑے فتحمندانہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے!

جناب میکش ایڈیٹر سب رس

واردات

آنکھوں آنکھوں میں کچھ پیام آیا — وہ بھی ایسا کہ ناتمام آیا
بھولنے کی جو میں نے کوشش کی — سانس بن بن کے ان کا نام آیا
ان کا دامن ہے میری آنکھوں تک — میرا رونا ہی میرے کام آیا
شوق کی راہ طے ہوئی نہ کبھی — ہر قدم پر نیا مقام آیا
عزم توبہ ارے معاذ اللہ — ہونٹ تھرا گئے کہ جام آیا

میکدے میں بھی پی نہیں میں نے
بحر تک جا کے تشنہ کام آیا

جناب گنگا دھر ناتھ فرحتؔ بی اے کانپوری

میرے لئے

خندہ زن ہے جا بجا صحنِ چمن میرے لئے
ہر طرف سے آتی ہے بوئے وطن میرے لئے

کوثر و تسنیم ہیں، گنگ و جمن میرے لئے
غیرتِ فردوس ہے باغِ وطن میرے لئے

کھلتے ہیں ہر روز گلہائے چمن میرے لئے
ہوتی ہیں رنگیں ادائیں خندہ زن میرے لئے

جلوۂ رنگیں بنا صحنِ چمن میرے لئے
خوشتر و شاداب ہے باغِ وطن میرے لئے

یاد آئی، رو دیئے پھر مرد و زن میرے لئے
آج تک گریاں ہیں یارانِ وطن میرے لئے

ہو چکے بیرنگ پھر لعلِ یمن میرے لئے
کھل چلی زلفِ شکن اندر شکن میرے لئے

پھر کھڑا ہی رہ گیا کوئی غریبِ انتظار
پھر ہے محوِ غم کوئی نازک بدن میرے لئے

پھر دھڑک کر رہ گیا سینہ زمینِ باغ کا
پھر تڑپ کر رہ گئی شامِ وطن میرے لئے

سردیوں کی یہ خنک راتیں یہ ٹھنڈی چاندنی
اور محوِ انتظار اک سیمتن میرے لئے

چاندنی ہے پھیکی پھیکی اور ستارے ہیں اداس
غمزدہ ہے انجمن کی انجمن میرے لئے

بن گئے ہیں سب کے سب بھولی ہوئی سی داستاں
وہ گل و شبنم وہ کلیاں وہ چمن میرے لئے

مرہمِ زخمِ جگر درمانِ دردِ زندگی!
ہمسرِ اکسیر ہے خاکِ وطن میرے لئے

یوں تو اک مدت ہوئی مجھ کو وطن چھوڑے ہوئے
آج تک گریاں ہیں اربابِ چمن میرے لئے

نت نئے ایجاد ہوتے ہیں مظالم کس لئے
کس لئے گردش میں ہے چرخِ کہن میرے لئے

مجھ اسیرِ بوئے گل کو قیدِ بندِ زندگی
فرحتؔ آخر راس آیا کیوں چمن میرے لئے

مصنفہ: چیخوف روسی افسانہ نگار

مترجمہ: جناب علی احمد صاحب

ناکام خودکشی!

رات کے دو بج چکے تھے جب میرا باورچی گھبرایا ہوا ہانپتا کانپتا غیر متوقع طور پر میرے مطالعہ کے کمرے میں داخل ہوا اور مجھے بتایا کہ آپ کی بوڑھی ہمسائی بیوہ نے اپنے باورچی خانہ میں منجی کچھ دیر کے لئے آپ کو بلاتی ہے۔ اس کے مکان میں جو شخص رہتا تھا اس نے شاید خودکشی کر لی ہے:

"لیکن میں کیا کر سکتا ہوں؟" میں نے کہا "بیوہ تو کسی ڈاکٹر کے پاس جائے، یا پولیس کو اطلاع دے۔"

"وہ ڈاکٹر کی تلاش میں کہاں جا سکتی ہے؟" باورچی بولا "وہ اسی تو خوف سے سانس لے سکتی ہے ... آپ ہی کچھ مدد کر کے لے چلیں تو بہتر ہے"

میں نے گرم کوٹ اور ٹوپی پہنی اور بیوہ کے مکان پر گیا۔ دروازہ ایک طرف سے کھلا ہوا تھا۔ چند قدم چل کر میں رک گیا میں یہ سوچتے ہوئے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ صحن میں داخل ہو کر کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے تاریکی میں محسوس کیا کہ دروازہ مقفل نہیں ہے۔ اسے کھول کر میں اندر چلا گیا۔ روشنی کہیں نام کو بھی نہ تھی۔ ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ اور ایک خاص قسم کی بو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ اندھوں کی طرح راستہ ٹٹولتے ہوئے میں آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگا کہ یکایک کسی لوہے کی شے سے میری کہنی ٹکرائی اور ساتھ ہی کسی چوڑے تختے سے ٹھوکر کھا کر میں گر پڑا۔ اٹھا تو ایک دروازہ نظر آیا جس سے کھینچے ہوئے پردے لٹک رہے تھے۔ اس سے گزر کر میں ایک ہال کمرے میں پہنچا۔

اس وقت میں کوئی بھوتوں کی داستان نہیں لکھ رہا۔ ورنہ یہ چاہتا ہوں کہ پڑھنے والے کو بلا وجہ حیرت میں ڈالوں۔ لیکن جو منظر میری آنکھوں نے دیکھا، وہ اسقدر دہشت انگیز تھا کہ شاید موت بھی اس کا تجزیہ کر سکے۔ دفعتاً میری آنکھوں کے سامنے ایک دروازہ تھا جو چھوٹے گلابی رنگ روغن سے رنگا ہوا تھا۔ تین خوبصورت موم بتیوں کے چراغ ایک قطار میں روشن تھے۔ جن کی مدھم روشنی ہم نام ایک سایہ سے رنگ کی دیواروں پر پھیل رہی تھی۔ کمرے کے عین وسط میں دو میزوں پر ایک تابوت رکھا تھا۔ مدھم روشنی میں ایک زرد چہرہ نیم وا ستی پتلی ناک کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔ ریشم کے نرم تکیے اس کے سر سے پاؤں تک بکھرے ہوئے تھے۔ اور ان تکیوں میں سے دو بے حس زرد ہاتھ جھانک رہے تھے۔ ایک ہاتھ میں موم کا بنا ہوا ایک صلیب تھا جو اس کے سینے پر پڑا ہوا تھا۔ ڈرائنگ روم کے تاریک اور افسردہ گوشے، تابوت کے سایوں کا عکس، اور خود تابوت ــــ ہر چیز جو مدھم چراغوں کے موت کی طرح بے حس اور قبر کی طرح خاموش تھی

کتنا عجیب منظر" موت کے اس ڈراؤنے خواب کو دیکھ کر میرے منہ سے نکلا "ایک عورت کی لاش ایک تابوت ......"

میں نے اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ بائیں طرف ایک دروازہ تھا جس میں شیشے لگے ہوئے تھے۔ دائیں جانب ایک جھکا ہوا شکستہ سٹینڈ کھڑا تھا جس سے ایک پرانا اونی کوٹ آویزاں تھا۔

"پانی!" ایک کراہنے کی آواز آئی۔

یہ درد میں ڈوبی ہوئی آواز تھی۔ دروازے سے آئی۔ اسے کھول کر میں چھوٹے تاریک کمرے میں پہنچا۔ کھڑکی سے سڑک کی مدھم روشنی اندر آ رہی تھی۔

"کیا کوئی یہاں ہے؟" میں نے دریافت کیا۔ اور بغیر جواب کا انتظار کئے دیا سلائی روشن کی۔ اسکی مدھم روشنی میں میری آنکھوں نے دیکھا کہ میرے پاؤں کے قریب ہی ایک شخص خون سے لتھڑا ہوا

فرش پر بیٹھا ہے۔ اگر میرا ایک قدم بھی آگے بڑھا ہوتا تو یقیناً میں اسکو روند ڈالتا۔ پاؤں پھیلائے اور اپنے دونوں ہاتھوں کو زمین پر ٹیکے وہ اپنے خوبصورت اور موت کی طرح زرد چہرے کو اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب اسکی نظریں اوپر اٹھیں تو اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں میں نے پڑھا ناقابل بیان خوف درد اور یاس۔ پسینہ کا ایک سرد قطرہ، پیشانی سے ڈھل کر اس کے رخسار پر جم گیا تھا چہرہ کا اتار چڑھاؤ، پسینہ، تیز تنفس ملے ہوئے دانت اسکی بے اندازہ تکلیف، اور بے چینی کا پتہ دے رہے تھے۔ اس کے سیدھے ہاتھ کے قریب کچھ دور ایک پستول پڑا تھا۔

"مجھے چھوڑ کر نہ جانا" اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔ جبکہ میری جیبی ہوئی کاڑی بجھ رہی تھی "میز پر ایک قندیل رکھی ہے" قندیل روشن کر کے میں کمرے کے درمیان خاموش کھڑا ہو گیا۔ اب آگے کیا کرنا چاہیے مجھے معلوم نہ تھا میں نے فرش پر پڑے ہوئے آدمی پر ایک گہری نظر ڈالی، اور اسوقت میری آنکھوں نے ایسا محسوس کیا۔ کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔

"درد ناقابل برداشت ہے" اس نے بمشکل کہا "اور مجھ میں اتنی طاقت بھی نہیں، کہ دوسری گولی سے خود کو ہلاک کر لوں ...... اف دل کی کمزوری"

اپنا گرم کوٹ اتار کر میں اس مجروح کیطرف متوجہ ہوا۔ اسے فرش سے گود میں اٹھا کر میں صوفہ پر لٹا دیا۔ پھر احتیاط سے اسکے خون آلود کپڑے اتارے۔ سردی سے بے چارہ کانپ رہا تھا۔ جو زخم میں نے دیکھا وہ اتنا زیادہ نہ تھا جس کا اندازہ اس کے چہرے اور اس کے کانپنے سے ہو رہا تھا گولی اس کی پسلی کی پانچویں اور چھٹی ہڈی کے درمیان کمال سے گذر کر گوشت میں دھنسی ہوئی تھی، گولی کو بآہستگی نکال کر میں نے بہتے ہوئے خون کو حتی الامکان روکنے کی کوشش کی۔ اور آخرکار دو تولیے، ایک تکیہ کا غلاف اور دو دستیوں کو ملا کر ایک عارضی پٹی باندھنے میں کامیاب ہو گیا۔

زخمی آدمی کو پہلے میں نے کچھ پانی دیا۔ اور پھر اسٹینڈ سے لٹکتا ہوا اونی کوٹ اتار کر اسے اڑھا دیا۔ جبتک پٹی باندھی جاتی رہی ہم دونوں میں سے کسی نے کوئی گفتگو نہیں کی۔ میں اپنا کام کرتا رہا۔ اور وہ خاموش لیٹا ٹکٹکی باندھے مجھے ایسی نظروں سے دیکھتا رہا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنی ناتمام خودکشی، اور ایک اجنبی کی ہمدردی پر پشیمان ہے۔

"اب آپ کو خاموش لیٹے رہنا چاہیے" پٹی کا کام میں نے مکمل کر کے کہا۔ "میں کسی ڈاکٹر سے مشورہ کر کے کوئی دوا لاتا ہوں"

"اسکی کوئی ضرورت نہیں" اس نے میری آستین پکڑ کر اپنی نظریں میری نظروں سے ملاتے ہوئے کہا۔

خوف اسکی آنکھوں میں جھلکیاں لے رہا تھا۔ اور میرے جانے کے خیال ہی سے وہ گھبرا رہا تھا۔

"کوئی ضرورت نہیں! پانچ منٹ اور ٹھہر جائیے ...... دس منٹ ... اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو ٹھہریئے ...... میں التجا کرتا ہوں"

جب وہ مجھ سے یہ الفاظ کہہ رہا تھا۔ تو حقیقتاً اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ اور اس کے دانت بج رہے تھے۔ میں نے اسکی تعمیل کی، اور صوفے کے کونے پر بیٹھ گیا۔ دس منٹ سکوت میں گزر گئے۔ اور میں خاموش بیٹھا اس کمرے کی تمام چیزوں کا جائزہ لیتا رہا، جہاں قسمت نے غیر متوقع اس رات مجھے پہنچا دیا تھا۔ کتنی غربت! ایسا شخص جو ایسے متناسب اعضا اور ایسے حسین چہرہ کا مالک ہو، افسوس ہے کہ ایسے افلاس میں زندگی بسر کرے، ایک پرانا پھٹا ہوا صوفہ، ایک معمولی ٹوٹی ہوئی کرسی ایک چھوٹا میز، ایک فرسودہ پلنگ اور دیوار سے لٹکتی ہوئی ایک دھندلی تصویر، یہ تھا جو میں نے دیکھا۔

"کتنا خراب موسم ہے" مریض نے بغیر آنکھوں کو کھولے ہوئے کہا۔

"ہاں" میں نے جواب دیا "میرا خیال ہے، کہ میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔ کیا آپ نے لیو باخوف کے خانگی تھیٹر میں گذشتہ سال کام کیا تھا؟"

"اس سے آپ کا مطلب؟" اس نے جلدی سے اپنی آنکھیں کھولتے ہوئے پوچھا۔

اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو رہا تھا۔

"یقیناً میں نے آپ کو وہاں دیکھا ہے۔ کیا آپ کا نام سیلیوف

نہیں؟

"اگر ایسا ہو بھی تو اسے معلوم کرنے سے فائدہ؟"

"لیکن میں صرف جاننا چاہتا ہوں۔"

وسیلیوف نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنا رخ صوفہ کی ..... پشت کی طرف پھیر لیا۔ شاید وہ ناراض ہوگیا تھا۔

"میں آپ کے اس تجسس کو نہیں سمجھا" وہ بڑبڑایا، "اور اب شاید آپ یہ سوال کریں کہ میرے خودکشی کرنے کا باعث کیا ہو؟"

ایک منٹ بھی نہ گزرا تھا کہ وہ پھر میری طرف پلٹا، آنکھیں کھولیں اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا:

"معاف فرمایئے میرا لہجہ کچھ سخت ہوگیا تھا، لیکن آپ خود اس کا اقرار کریں گے کہ میں غلطی پر نہیں۔ ایک مجرم سے یہ سوال کرنا کہ وہ جیل میں کیونکر آیا، یا ایک مرتے ہوئے شخص سے یہ پوچھنا کہ اس نے خودکشی کیوں کی کتنی بھدی اور بے معنی سی بات ہے .... اپنی ذہنی تشفی کیلئے دوسروں کے جذبات سے کھیلنا ..... !"

"نہیں نہیں! میں آپ کو پریشان کرنا نہیں چاہتا۔ میرا یہ خیال ہرگز نہ تھا کہ میں آپ کی خانگی مصروفیتوں کی چھان بین کروں" میں نے اسکا جملہ کاٹتے ہوئے کہا۔

"آپ پوچھ سکتے ہیں .. ہمیشہ لوگ یہی تو کیا کرتے ہیں۔ اگرچہ ...... اس سے انکو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اگر میں کہوں تو شاید آپ یقین نہ کریں یا نہ سمجھیں ... یہی کہ اسکی وجہ میں خود نہیں جانتا ... آپنے سنا ہوگا پولیس اور اخبارات میں چند مخصوص محاورات اور عنوانات استعمال ہوتے ہیں مثلاً زبردستی کی محبت، اور افسوسناک افلاس ..... لیکن انکے وجود ظاہر نہیں ہوتے۔ وہ نہ تو مجھے معلوم ہیں، اور نہ آپ کو اور نہ اخباروں کے ایڈیٹروں کو باوجود اس کے کہ وہ خودکشی کرنیوالے کی ڈائری تک لکھ ڈالتے ہیں .... خدا ہی اس شخص کے قلبی تاثرات اور روحانی کیفیات کو سمجھ سکتا ہے، جو خودکشی کرکے اپنی زندگی کو ختم کردینا چاہتا ہے۔ خدا کے علاوہ اس راز کو کوئی نہیں سمجھ سکتا ..... کوئی ...."

"میں سب کچھ سمجھ گیا" میں نے کہا "لیکن آپ کو زیادہ بات نہیں کرنا چاہیے ......"

"لیکن میری خودکشی روکی نہیں جاسکتی" اپنے سر کو ہاتھوں کا سہارا دیکر ایک قابل پروفیسر کی طرح اس نے کہنا شروع کیا "انسان خودکشی کرنے والے کے ذہنی رجحان کو نہیں سمجھ سکتا پھر اسکی وجہ کی نسبت سوال کیونکر کیا جاسکتا ہے؟ آج اگر خودکشی کرنیوالے کا پستول اس سے زبردستی چھین لیا جاتا ہے، تو کل ممکن ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اس کو چھوڑ کر دنیا پسند کرے ...... یہ سب زیادہ تر آنیوالے لمحوں اور انکی کیفیات پر منحصر ہے۔ میری ہی مثال لیجئے۔ صرف آدھ گھنٹہ پیشتر مجھے موت کی دلی آرزو تھی اور اب جبکہ قندیل روشن کردی گئی ہے، اور آپ میرے پاس بیٹھے ہیں میں موت کا تصور کرنے کے لئے بھی تیار نہیں، اس فوری تبدیلی کو آپ سمجھا سکتے ہیں تو سمجھایئے .... میں تازہ دم ہو گیا ہوں اور میری زندگی کو موت کے آہنی پنجوں سے چھین لیا گیا ہے ..... کیا اس خوشگوار تبدیلی کا باعث مبدا نور کی منتشر کرنیں ہیں یا ایک ہمدرد اجنبی کی موجودگی؟"

"روشنی یقیناً اپنے اندر بہت اثر رکھتی ہے" صرف کچھ کہنے کی خاطر میں نے کہا "روشنی کا اثر خصوصاً نفسیاتی قوتوں پر ......"

"روشنی کا اثر ..... ؟ لیکن آپ کو معلوم ہوگا کہ لوگ روشنی کی موجودگی میں خودکشی کرلیتے ہیں۔ آپ کے ناولوں کے ہیروؤں کے لئے یہ ایک مضحکہ خیز بات ہوگی اور اگر ڈرامے کا پلاٹ ایک معمولی روشنی کی وجہ سے یکایک ..... پلٹا کھا جائے تو اس بکواس کی تشریح شاید کی جاسکتی ہے، لیکن ہمارے ذریعہ نہیں ..... ایسی چیزوں کے متعلق سوالات کرنا اور ان کے جوابات دینا جنہیں کوئی نہ سمجھے محض بیکار ہی نہیں لغو بھی ہے۔"

"معاف فرمایئے" میں نے کہا "لیکن آپ کے چہرے کی کیفیت سے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ پر نیند کا غلبہ ہے۔"

"ہاں" وسیلیوف نے چونک کر کہا "بہت ممکن ہے میں فطرتاً خیالی اور وہمی آدمی ہوں۔ اچھا سمجھایئے، اگر آپ کو اپنی قیافہ شناسی پر اعتماد ہے۔ آدھ گھنٹہ پیشتر میں نے خود پر گولی چلائی، اور ..... اس وقت اونگھ رہا ہوں ..... اسے سمجھایئے اگر آپ سمجھا سکیں۔"

آخری الفاظ ولسیلوف نے نہایت کمزور اور ڈوبتی آواز میں ادا کئے۔ اس کی قوتِ گویائی ختم ہوگئی اور وہ خاموشی کی فضا میں کھو گیا۔ چند لمحے یونہی گزر گئے۔ میں نے ایک تنقیدی نظر اس پر ڈالی۔ اس کا چہرہ موم کی طرح زرد تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے جسم سے روح نکل چکی ہے لیکن بے پایاں . . . تکلیف کے علامات جو اس خیالی اور وہمی شخص کے تیور سے ظاہر ہو رہے تھے۔ اسکے زندہ ہونے کی تائید کرتے تھے۔ اسے دیکھنے سے تکلیف ہو رہی تھی، باوجود اس کے ولسیلوف کے جسم میں حرکت ہوئی۔ شاید گفتگو کرنے کی صلاحیت اس میں پھر عود کر آئی۔

"آپ یہاں . . . . . کیا آپ یہاں ہیں"، کہنیوں کے بل اٹھتے ہوئے اس نے کہا، "خدا کیلئے سنئے!"

میں سننے کیلئے تیار ہوگیا۔ کھڑکی کے شیشے بارش کے مسلسل قطروں سے بج رہے تھے۔ ہوا غصہ میں باہر غرا رہی تھی۔ میموتیہ جو واپس آ گئی تھی ڈرائنگ روم میں لاش پر رو رہی تھی، اور محسوس ہوتا تھا کہ اسکی نحیف اور تھکی ہوئی آواز کبھی ختم نہ ہوگی۔

"کتنا بھلا منظر ہے!" ولسیلوف نے اپنی ڈراؤنی آنکھیں میری طرف پھیرتے ہوئے سرگوشی کے عالم میں کہا۔ "وہ تمام چیزیں جنکو آدمی دیکھتا اور سنتا ہے، اگر ایک بدی نغمہ میں تبدیل ہو سکتی ہیں تو . . . . . . لیکن تب میں اس نغمہ کو کیسے سمجھونگا . . . اور اسے کیا محسوس کرونگا . . . . اس وقت کے بجے ہونگے؟"

"تین بجنے میں پانچ منٹ!"

"رات ختم ہو رہی ہے اور صبح کو جنازہ کی رسم ادا ہونیوالی ہے کتنا خوشنما منظر! تابوت لئے کیچڑ اور بارش میں گزرنا ہوگا۔ ربڑ، بادلوں سے گھرا ہوا آسمان اور اس ناگوار تماشے کو دیکھ کر نظریں پھیر لیں گے کیچڑ سے بھری ہوئی سڑکیں قہوہ خانے، گھبرائی ہوئی سواریاں . . . . اور کسی کے کپڑے غلیظ پانی میں تر اور، نہ ختم ہونیوالی بھیگی سڑکیں لنگڑاتا ہوا سست وقت . . . . اور سینہ پر پتھر . . . . . ایک بھاری پتھر!"

دم بھر کیلئے ٹھہر کر اس نے پھر کہنا شروع کیا:

"جنرل لیوبا خوف سے ملے ہوئے آپ کو کتنا عرصہ گذرا؟"

"گذشتہ موسم گرما کے بعد سے میں نے اسے نہیں دیکھا۔"

"اسے شہرت کا جنون ہے، لیکن ملنسار اور خوش مزاج بوڑھا ہے اور کیا آپ اب بھی کچھ لکھتے ہیں؟"

"ہاں کبھی کبھی"

"آہ، تمہیں یاد ہوگا میں جو توتوں کیطرح خانگی تصویروں کا کیسے گشت لگاتا تھا . . . . یہ وہ زمانہ تھا جب میں نے زینا سے محبت کرنی شروع کی تھی . . . . . کیسا مجنونانہ فعل اور کتنا دلچسپ مذاق، اس زمانے کی رنگین یادوں سے موسم بہار کے جھونکے چلنے لگتے تھے۔ اب وہ منظر کتنا بھیانک ہوگیا ہے . . . . یہ پلاٹ تمہارے لئے بیحد دلچسپ ہوگا لیکن خودکشی کرنیوالے کی ڈائری لکھنے کی کوشش نہ کرنا . . . . . اس میں کوئی جدت نہیں . . . . . . مزاح پیدا کرنا چاہئے مزاح . . . . "

"پھر آپ پر غنودگی طاری ہو رہی ہے!" میں نے کہا۔ "ابھی آپ کی حالت قابلِ اطمینان نہیں"

"ہنسنے کی بات نہیں! آپ کہتے ہیں ہنسنے کی بات نہیں!" ولسیلوف جیخ گیا۔ آنسو اس کی آنکھوں میں چمک رہے تھے۔ زرد چہرے پر کرب اور بے چینی کی لہریں تڑپ رہی تھیں اور وہ قدرے کانپ رہا تھا۔

"آپ عورتوں کی بیوفائی پر ہنستے ہونگے!" وہ بولا، "لیکن کسی بے وفا عورت نے ایسا فریب نہ دیا ہوگا جیسا میری قسمت نے مجھے دیا ہے . . . . . مجھے بھی دھوکا دیا گیا، خوفناک دھوکا . . . . گذشتہ سال میں کس قدر خوش تھا . . . . . . کس قدر خوش! اور اب . . . . اب!"

ولسیلوف تکیوں میں دھنس گیا اور ہنسنے لگا۔

"ایسی اچانک تبدیلی! اس سے بڑی بدقسمتی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ آغاز تو بہار محبت، رنگین لمحے، خوشگوار راتیں اور انجام . . . ملازمت کی تلاش، گردش، مایوسی، اور پھر سب سے بڑھ کر گل کی دھوم دھام کیچڑ سے اٹی ہوئی سڑکوں سے . . . . . قبرستان کی طرف!"

وہ پھر ہنسا، میں نے غیر معمولی بے چینی محسوس کی، اور جانے کا ارادہ کر لیا۔

"میری بات سنئے۔ میں نے کہا، آپ خاموش لیٹے رہیں میں جا کر کسی ڈاکٹر کو لاتا ہوں"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور کوٹ پہنکر میں کمرے سے باہر نکل آیا اور باہر آکر میں نے دیکھا کہ تابوت کے قریب شمع تنہا جل رہی ہے۔ جیسے تم تاریکی میں دنیا کے جہنم کی مردہ روشنیاں جھلک رہی ہیں۔ ان متوحش خیالات کی رو میں بہتا ہوا میں خاموشی سے سڑک پر چل رہا تھا۔ مجھے مسٹر سلیوف سے اطمینان تھا۔ اس لئے کہ اس کا سبب ان میری جیب میں محفوظ تھا جب میں ڈاکٹر کے پاس سے واپس آیا تو دیکھا کہ وسیلیوف صوفہ پر بے ہوش پڑا ہے بندھی ہوئی آستین کی پٹی بازو سے پھاڑ ڈالی گئی ہے۔ اور زخم سے خون بہ رہا ہے دوبارہ پٹی باندھ کر جب میں اسے ہوش میں لانے میں کامیاب ہوا اس وقت صبح کا نور ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ تکلیف سے کراہ رہا تھا یہاں تک کہ سورج کھڑکی کے شفاف شیشوں سے جھانکنے لگا اور ہم نے پادری کی گونجتی ہوئی آواز سنی۔ جب وہ لاش پر دعائیں پڑھ رہا تھا۔

جب وسیلیوف کا کمرہ بوڑھی عورتوں اور جوان عورتوں سے بھر گیا۔ اور تابوت اٹھایا گیا تو میں نے اسے نصیحت کی کہ وہ اپنے کمرے میں خاموش لیٹا رہے۔ اور کہیں جانے کا خیال بھی نہ کرے۔ لیکن باوجود ممانعت اور برسات کی ناگوار صبح کے اس نے میری ایک نہ سنی ماتمی اور بھیگے پاؤں وہ تابوت کے پیچھے پیچھے قبرستان تک چلا گیا۔ مشکل سے وہ قدم اٹھا سکتا تھا درد و اضطراب کی گھٹائیں اس کے چہرے پر امنڈ رہی تھیں صرف ایک مرتبہ جب ایک بے معنی سوال سے میں نے اسکی خاموشی توڑنا چاہی تو اس نے اپنی مصروف نظریں میری طرف اٹھائیں جن میں اس کی مغمومیت کو صاف طور پر پڑھ سکتا تھا

. . . .

اس خوفناک رات کو ایک سال کا عرصہ گزر چکا ہے، اور اب وسیلیوف کے پاس اتنا وقت بھی نہیں کہ وہ بوٹ کے اس جوڑے کو جو بیوی کے تابوت کے ساتھ کیچڑ میں جانے کی وجہ سے خراب ہو گئے تھے کہیں پھینکدے۔

اسوقت جبکہ میں نے اس افسانہ کی تکمیل کر لی ہے وہ میرے پاس ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا نو بجا رہا ہے۔ اور عورتوں کو تعلیم دے رہا ہے کہ دیہاتی لوگ سبزہ میں جذباتی گیت کیسے گاتی ہیں عورتیں ہنس رہی ہیں اور انکے ساتھ وہ بھی قہقہے لگا رہا ہے — اپنی زندگی کی مسرتوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے

قہقہہ زن نازنینوں کی صحبت سے جدا کر کے اسے میں اپنے کمرے میں لاتا ہوں اور جب وہ آتا ہے صوفہ پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے میں اپنا تکمیل شدہ افسانہ اسے پڑھنے کے لئے دیتا ہوں، میری رومان آفرینی جدت نگاری، اور پیرایۂ بیان کا دلدادہ ہونے کے باوجود وہ مجبوراً افسانہ پڑھنے پر راضی ہوتا ہے۔ لیکن پڑھنے سے قبل جھینپتے ہوئے کہتا ہے۔

"کیا کوئی اس سے جلا دینے کے قابل"

لیکن جب پڑھنا شروع کرتا ہے۔ اور جیسے جیسے آگے پڑھتا ہے۔ اسکا چہرہ سنجیدہ ہوتا جاتا ہے۔ یہانتک کہ گزری ہوئی کا لعنتی کی لرزہ خیز یادسے، اسکے رخسار زرد پڑ جاتے ہیں۔ وہ کھڑا ہو جاتا ہے اور پڑھتا جاتا ہے۔ افسانہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور وہ کمرے کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ٹہلتا رہتا ہے۔

لیکن اب اسے ختم کیسے کیا جائے؟ میں اس سے پوچھتا ہوں "ختم کیسے کیا جائے؟" وہ دہراتا ہے۔

وہ کمرے کے چاروں طرف دیکھتا ہے، پھر میری طرف — عورتوں کے قہقہوں کی صدائیں سنتا ہے

"کیا میں نے ٹھیک نہیں کہا تھا کہ یہ سب بیکار اور محض ردی ہے ...... اُف کتنی دردبھری داستان ...... لوگ کہتے ہیں کہ گزری ہوئی مصیبتوں کے نقوش تا عمر مٹائے نہیں مٹائے جا سکتے لیکن ...... مجھ پر ان کا کوئی اثر نہیں ...... جیسے مجھ پر کوئی آفت پڑی ہی نہ تھی —— اسکی کوئی علامت اور کوئی نشان تک نہیں ...... دنیا کی ہر شے چند روزہ ہے، اور حباب کیطرح بہت جلد فنا ہو جانیوالی ہے ...... مزاح نگاروں کیلئے ایک وسیع میدان ...... میرے دوست! اسکا انجام یقیناً مزاحیہ ہونا چاہیئے"

"پیٹر نکولچ وسیلیوف! ہم آپ کی منتظر ہیں" الہڑ عورتیں ہمارے ہیرو کو پکارتی ہیں۔

"صرف ایک منٹ!" اپنی ٹائی کو درست کرتے ہوئے، وہ خیالی اور وہمی شخص کہتا ہے "میرے دوست، بات بیکار اور ساتھ ہی ساتھ ہمدردی کی بھی مستحق ہے۔ لیکن کیا کیا جائے! ...... کہ ہر شخص یہ تصور کرے اور کوشش کرے کہ تمام مصیبتوں کے دور جن سے وہ گزر چکا ہے۔ انکو اپنے دماغ میں تازہ رکھے۔ اس لیے کہ وہ اپنی زندگی کے اہم واقعات ہیں، تو یقیناً ہماری روزمرہ زندگی بھی ہمارے لئے وبالِ دوش ہو جائے"!

میں نے اسکے سنجیدہ چہرے کو دیکھا۔ اور میری آنکھوں میں پھر وہی مایوسی اور وہی خوف پھرنے لگا۔ جو ایکسال قبل اس رات کو میں نے دیکھا تھا۔ اسکی تقریر میں پھر وہی جوش اور وہی فلسفہ لہریں لیتا معلوم ہوتا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ میں نے پھر ایکبار دیکھا، کہ وہ خون سے رنگے ہوئے فرش پر بیٹھا ہے۔ اور اس کی آنکھوں میں کرب و اضطراب کروٹیں لے رہا ہے۔

"لیکن یہ افسانہ ختم کیسے کیا جائے"! میں پھر بڑبڑاتا ہوں۔

وسیلیوف بیٹھ جاتا، اور ٹائی کو درست کرتا ہوا ڈرائنگ روم میں چلا جاتا ہے .... اور میری نظریں پردوں تک اس کا پیچھا کرکے لوٹ آتی ہیں ....

جناب گوپال متل بی۔اے

دھوکے

رنگینیٔ ہوس کا وفا نام رکھ دیا
خود داریٔ وفا کا جفا نام رکھ دیا

خود غرضیوں کے سائے میں پاتی ہے پرورش
اُلفت کہ جس کا صدق و صفا نام رکھ دیا

مفلس کو اہلِ زر نے بھی کیا کیا دیئے فریب
اپنی جفا کا حکمِ خدا نام رکھ دیا

انسان کی جو بات سمجھ میں نہ آسکی
انساں نے اسکا حق کی رضا نام رکھ دیا

بے مہریٔ حبیب کا مشکل تھا اعتراف
یاروں نے اس کا ناز و ادا نام رکھ دیا

یہ روح کیا ہے جس کا عکس لطیف ہے
یہ اور بات ہے کہ خدا نام رکھ دیا

فطرت میں آدمی کی ہے مبہم سا ایک خوف
اس خوف کا کسی نے خدا نام رکھ دیا

جناب مسعود جاوید بی۔اے

دُخترِ نربدا

دریائے نربدا کی بل کھاتی ہوئی موجوں کے آغوش میں بیچ سے جو بہتے ہوئے ایک مرمریں چبوترہ قائم تھا اور شیلا اس حسین مرتفع سطح کے کنارے بیٹھی تھی۔ بس متفکر... ایک رنگین زینہ تھا جس کی سیڑھیاں دریا سے نکل کر چبوترے کے دوسرے کنارے تک آتی تھیں --- اور دریا کے اس پار --- گھنے درختوں کے درمیان ایک قدیم مندر۔ شیلا کا چہرہ دودھیا چاند کی چاندنی میں چمک رہا تھا اس کی ساری قوس قزح کی ست رنگیوں کا ایک مجموعہ معلوم ہوتی تھی اس کے برہنہ سیمیں پیر پانی کی نازک نازک لہروں میں بہہ کر خود بھی ایک نازک لہر بنے تھے --- اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ خود ایک انسانی ہستی نہیں بلکہ کوئی ماوری مخلوق ہے یا پھر ایک بت السحر --- اس کی بڑی بڑی آنکھیں بادلوں کے ان ٹکڑوں پر مرکوز تھیں جو شفقِ شام کی رنگ کاریوں سے گلنار بن گئے تھے۔ اس کا ستار کسی برہ کی ستائی ہوئی جوگن کی طرح گنگنا رہا تھا... اس کے نغموں میں ایک نامعلوم روحانی تشنگی تڑپ رہی تھی

"آہ کہاں ہو تم!" اس نے ایک طویل سرد آہ کے ساتھ دہرایا۔

پریتم! آہ کہاں ہو تم!"

"گوکل کے سبزہ زاروں میں اور بندرابن کے دامن میں
کرشن جہاں بنسی کی لے سے ہوک اٹھاتے تھے من میں
جنگل جنگل --- بستی بستی
ڈھونڈ پھری میں ڈھونڈ پھری
پریتم!
آہ کہاں ہو تم!
شیلا کے من کو جو پیارے کومل کے پر مل جاتے
شیلا کے جو پریم کو پریتم! تم نہ سمجھ سکے جاتے
بادل بادل --- تارہ تارہ
چھانی پھری اڑ اڑ کر
پریتم!
آہ کہاں ہو تم!"

بوڑھا پجاری جو زینے پر استادہ تھا جذبات کے اسی طوفان میں کانپ رہا تھا۔

پریم سنگھ --- ایک نوجوان سنت --- نے اپنی کشتی سے باہر قدم رکھا جو اس نے شیلا کی نشست کے پیچھے نہایت خاموشی سے روک دی تھی۔ وہ آگے بڑھا اس تمام احترام و تکریم کے ساتھ جس کا اظہار صرف ایک دیوی کے حضور میں کیا جا سکتا ہے۔ آگے بڑھا اور وہ سارے پھول جو مندر کی سنگین و بے زبان دیوی پر چڑھانے کو لایا تھا، شیلا کے سامنے پیش کر دیئے۔ شیلا نے ایک لمحہ کیلئے اس خوبصورت نوجوان کی طرف غور سے دیکھا۔ اور پھر نگاہیں جھکا لیں۔

"پھولوں کے اس تحفے کا شکریہ!" اس نے پھولوں پر نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔

لیکن وہ اب بھی ایک مرمریں مجسمے کی طرح بے حس و حرکت کھڑا تھا۔

"ایک جوگن سے اور کیا چاہتے ہو؟" اس نے اپنی آواز قدرے بلند کرتے ہوئے کہا: "ہمارے راستے بالکل جداگانہ ہیں پریمی! --- اس دیوی کو فراموش نہ کرو، جس کی پرستش کے لئے تم یہاں آئے ہو!"

اس نے سرِ تسلیم خم کیا، اور اپنی کشتی کھیتا ہوا چلا گیا --- شیلا مڑ مڑ کر اس کی چھوٹی سی کشتی کو موجوں پر ہچکولے کھاتے دیکھتی رہی۔ اسے حیرت تھی کہ نوجوان مندر میں دیوی کے حضور میں حاضر ہوئے بغیر کیوں چلا گیا۔

(۲)

"عورت کیلئے محبت ایک مذہب ہے اور مرد کے لئے تعطل و فرصت کا ایک لذیذ شغل!"

"لیکن مرد محبت پر اپنی جان دیدیتا ہے"

"ہاں — مگر محبت میں زندہ رہنا مرنے سے دشوار ہے - اور عورت زندہ رہتی ہے"

"محبت کا جاں ستاں زخم عورت ہی کی بیدردی کا نتیجہ ہوتا ہے"

"خوب! - - ابھی تک کیوپڈ کو خود اپنی جنس کا علم نہیں؟"

شیلا اور پریم سنگھ "غلطاں باغات" سے نیچے اتر رہے تھے وہ خوش طبعی کے ساتھ بحث و تمحیص میں مشغول تھے پریم کو اعتراف کرنا پڑا کہ وہ محض ایک سپاہی ہے اور بحث و مباحثہ اسکی قدرت سے بعید

چلتے چلتے دونوں ایک گلپوش کنج کے گرد گھومے تو شیلا نے ایک پھول توڑا، اور پریم کے کوٹ میں لگانے لگی

پریم نے ایک بے پناہ جاذبیت سے مجبور ہوکر اسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبالیا، اور اسکی آنکھوں کی گہرائیوں میں اپنی نظریں غرق کردیں

"اسرار کے ان دو سیاہ سمندروں نے میرے دل کو تباہ کردیا ہے ناقابلِ فہم ذہنیت کی شہزادی — شیلا! میری قسمت کا فیصلہ ایکبار ہمیشہ کے لئے کیوں نہیں کردیتی ہو؟"

"ہمارے درمیان ایک شفیق باپ کی ہستی حائل ہے جس کا میرے علاوہ دنیا میں کوئی نہیں، تمہاری ٹرین کو فلاں اسٹیشن میں داخل ہوتے ہوئے دیکھکر اس نے مجھ سے اپنی یہ تمنا ظاہر کی تھی، کہ اپنی ذات اور نسب کے وقار و احترام کو فراموش نہ کرنا"

"آہ! — پھر وہی رسوم و روایات کی لعنت! — اور ہاں شاید تمہارا الکھوتی باپ یہ بھی تو خیال کرتا ہوگا کہ پریم سنگھ اس قدر دولت مند نہیں، کہ تمہارے لئے منتخب کیا جائے"

"اسکی شرافت و عظمت پر حملے نہ کیجئے — تم دونوں میرے واسطے بیش قیمت ہو، میری آنکھوں کی طرح — میں کسی ایک سے بھی جدا نہیں ہوسکتی"

"پھر اس چیستاں کو کیسے حل کروگی تم؟"

"حل ہوجانے کے بعد چیستاں کی دلکشی فنا ہوجاتی ہے"

"تو پھر تم نے کیا سوچا ہے؟"

"پریم کی آگ میں گھل گھل کر ختم ہوجانا"

جذبات سے مغلوب ہوکر پریم نے شیلا کو اپنی آغوش میں کھینچ لیا لیکن شیلا فوراً ہی بجلی کیطرح تڑپ کر آزاد ہوگئی۔ اور شدتِ احساس سے کانپنے لگی . . . پریم نے عفو نوازی کی التجا کی — شیلا اٹھنے لگی — سسکیاں لیکر — وہ زبان سے کیا کہتی؟

(۳)

پریم سنگھ اور نینسی پیرس کے ایک نشاط خانے کے عقبی گوشے میں بیٹھے تھے، اور ہر اس شغل میں جذب تھے جو شراب و حسن و شباب کے تصادم سے پیدا ہوسکتا ہے نینسی کی آنکھیں فسوں کار تھیں اور اسکے لمبے لمبے بال میخانہ بدوش کالی گھٹائیں — اس لئے اگر پریم سنگھ جوشِ محبت میں اسے "یونان کی حسین پری" کہہ رہا تھا، تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی، دوبار تو ایسا ہوا، کہ ہیجانِ جذبات سے بے قابو ہوکر اس نے اٹھکر نینسی کی آنکھوں سے اپنے مرتعش لب واصل کردیئے۔ اور اکثر ایسا ہوا کہ لبریز جام شراب کو نینسی کے گرد طواف دیکر اس نے ایک سانس میں خالی کردیا — نینسی کی آنکھوں میں محبت حکمران تھی، اور وہ تمام فرانسیسی لوگ جو آس پاس بیٹھے تھے۔ اس خیال سے مسکرا رہے تھے کہ ایک ہندوستانی نوجوان معاملاتِ تعشق میں بھی اتنا ہی کاہل ہوتا ہے۔ جتنا کہ ہنگامہ کارزار میں!

آخرکار وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہوٹل کے خادم نے پریم سنگھ کو بتایا، کہ اس کا بل ایک حسین لڑکی نے ادا کردیا ہے۔ جو نیم مشرقی لباس پہنے ہوئے تھی اس نے دروازہ کیطرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:-

"وہ — سامنے جارہی ہے وہ لڑکی!"

پریم سنگھ تڑپ کر باہر سڑک پر پہنچا — لیکن ٹیکسی روانہ ہوچکی تھی، اس لڑکی کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے — اس نے چلاّ کر پکارا — "شیلا!!" اور لڑکھڑاکر زمین پر آرہا۔

(۴)

دریا کے وسط میں ایک مرمریں چبوترے پر ایک بنت البحر بیٹھی تھی، لوگ اسے "دخترِ نربدا" کہتے تھے۔ اسکے عارضوں کے گلاب مرجھا گئے تھے۔ اس کے لباس پر قوس و قزح کی رنگینیاں باقی نہ رہی تھیں— اسکے چہرے کا رنگ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کسی نے یاسمین کے پھول

میں زعفران کی لہریں دوڑ رہی ہیں —— اور —— اسکی آنکھوں میں چمکتی ہوئی بجلیاں بجھتی ہوئی شمع کی زرد کرنوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔

اس نے اپنی خوابناک نگاہیں متلاطم ہوا میں، اور اپنا ستار اٹھایا جو اس کے پہلو میں خاموش پڑا تھا۔ ستار کے تاروں سے نرم نرم شیریں جھنکار پیدا ہوئی۔ اور ذرا سی دیر میں شیریں نغموں کے ایک ابلتے ہوئے چشمے میں تبدیل ہو گئی۔ ایک مجبور و شکستہ تبسم جو سوز و درد سے نیم جان معلوم ہوتا تھا اسکے لبوں کے گوشوں پر نمودار ہوا۔ فتہ رفتہ اس کی آنکھوں میں سکر و سرور کی ایسی کیفیات ظاہر ہو گئیں جیسے کسی نے صرف نصف جام پی کر رکھ دیا ہو۔ اور اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی سرخی مجتمع ہونے لگی۔ اس کا نغمہ شیریں تھا —— اس کا ہر حرف نغمۂ شیریں تر! ——

"نہیں!" اس نے اپنا ترانۂ مسرت شروع کیا۔ "نہیں —— تم وہاں نہیں ہو!

ان حسین بستیوں میں جو ہیں بادلوں سے آگے
نہیں —————— تم وہاں نہیں ہو
مہ و مہر میں نہیں ہے
رُخِ پُرضیا تمہارا
نہیں کہکشاؤں میں بھی
کوئی نقشِ پا تمہارا
یہ فضا کے خالی دامن
ہیں ہوا کے خالی دامن
مرے شوق کی نظر نے یہ حجاب دیکھ ڈالے
نہیں —— —————— تم وہاں نہیں ہو!

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوئی اور پھر گانے لگی:-

کہیں فطرتِ حسیں میں تو چھپے ہوئے نہیں ہو!
نہیں! —— ورنہ یوں نہ رہتے یہ جہاں کے نظارے
یہ پپیہا مست ہو کر
وہ فسوں کے راگ گاتا
کہ تبسم آگ بن کر
لبِ گل پہ تھرتھراتا
یہ دھنک کے شوخ جلوے
کوئی ایسا رُخ بدلتے
کہ تمہارا نام جیسے کوئی آسماں پہ لکھ دے
نہیں —— تم وہاں نہیں ہو۔

وہ پھر ذرا رک گئی۔ اور ستار کے تاروں کو جھنجھوڑ کر گانا شروع کیا:-

"مگر ہاں! —— جیسے ہو تم تو میری اجڑی پریت میں ہی
تمہیں پا لیا ہے میں نے۔ تمہیں پا لیا ہے پیارے
یہ مرا اُنگار سپلو!
جو ہے یادگارِ الفت
میری ضبط کردہ آہیں
جو ہیں شاہکارِ الفت
میری رُوح۔ رُوحِ سوزاں
میرا قلب۔ قلبِ بریاں
یہ تمہارے واسطے ہے میرا سارا ساز و ساماں
تمہیں پا لیا ہے میں نے۔ تمہیں پا لیا ہے پیارے"

سن رسیدہ پجاری کے لبوں سے ایک کراہ بلند ہوئی اور وہ زمین پر گر پڑا!

جناب اعجاز صدیقی اکبرآبادی

پھولوں کی جوانی

سب ساز سمجھتے ہیں جسے ساز کہاں ہے　　دل بول رہا ہے مگر آواز کہاں ہے
تم دل میں ہو میرے مگر آواز کہاں ہے　　یہ ساز ابھی پردہ در راز کہاں ہے
اے موسمِ گل اور بڑھائے ابھی اپنی　　دیوانہ ابھی گوش بر آواز کہاں ہے
اے عشق نہ دے حسن کو تکلیفِ نظارہ　　اس کی متحمل نگہ ناز کہاں ہے
اے جانِ چمن دل جو بنا دے مرے دل کو　　وہ تیری نگاہِ غلط انداز کہاں ہے

قطعہ

وہ حسن کی مستانہ جما ہی پہ جما ہی　　وہ عشق کی گھبرائی سی آواز کہاں ہے
آغوشِ محبت میں وہ ہمی ہوئی نظریں!　　بے تابیٔ خاطر کا وہ انداز کہاں ہے
وہ چاندنی وہ "تاج" وہ جمنا کا کنارا　　وہ ہر جہتی روح کی پرواز کہاں ہے
پھولوں میں وہ چھپنا مرا وہ ڈھونڈنا ان کا　　پھر ناز سے کہنا اے اعجاز کہاں ہے

دل اور جگر ایک ہی مرکز پہ ہیں دونوں　　کیا جانئے ان کی نگہ ناز کہاں ہے
اک دل ہے نقط واقفِ اسرارِ حقیقت　　یہ ساری خدائی تری ہمراز کہاں ہے
دل ڈوب چکا چھپ چکے چاند اور ستارے　　آواز دے میرے بتِ طناز کہاں ہے
ہے وقت کہ دیوانے کچھ انگڑائیاں لے لیں　　وہ چشمِ فسوں ساز ابھی باز کہاں ہے
کلیوں کا لڑکپن ہو کہ پھولوں کی جوانی　　ان میں لبِ خود رنگ کا انداز کہاں ہے

اعجاز غزل میں ہے محبت کا تصرف
یہ ذہنِ رسا کا مرے اعجاز کہاں ہے

جناب عبداللہ بٹ ایڈیٹر کریسنٹ

یہ لاہور ہے

خطۂ لاہور یعنی جنّتِ ہندوستان

قبل اس سے کہ میں "لاہور یا لاہور والوں کے متعلق کچھ لکھا جائے میں ان تمام حضرات سے جنکا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ لاہور سے ہے، یا ہونے کی توقع ہے۔ معافی کا خواستگار ہوں۔ اور چونکہ خوش قسمتی سے خود بھی اسی شہر کا باشندہ ہوں، اس لئے اس مضمون کے پڑھنے کے بعد ہر قسم کی نکتہ چینیاں اور دھلی دھلائی گالیاں امپیریل بنک لاہور میں یا راقم الحروف کے نام بذریعہ منی آرڈر ارسال کی جائیں۔

یوں تو لاہور کی ہر چیز بے مثال اور لاجواب ہے۔ مگر یہاں کی سڑکیں اپنی نفاست اور صفائی کے اعتبار سے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آج جب کہ تمام دنیا اقتصادی بدحالی کا رونا رو رہی ہے۔ اور بیکاری اور بھوک کے مسائل کو حل کرنے کیلئے بڑے بڑے بل بنا رہی ہے "تاکہ تمام بیکار خصوصاً بیکار گریجویٹ آنتوں میں آسانی سے گھس سکیں اور گریجویٹ ہونے والے اصحاب "تیار رہیں" ہمارے لاہور کے دور اندیش اور عالم فہم دماغوں نے میونسپل کمیٹی معطل کرنے کا فیصلہ کیا۔ تاکہ سڑکوں کی حالت بدستور رہے اور انکی نفاست میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ اگرچہ بادی النظر میں میونسپل کمیٹی کا تعطل بہت ہی برا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ہم نہایت ہی گستاخی سے عرض کریں گے، کہ اس میں بھی ایک عظیم الشان نکتہ پوشیدہ ہے۔ جسے شاید ادارۂ رسالہ کے سوا اور کوئی شخص نہ سمجھ سکے۔ اس چیز سے شاید کوئی بھی اختلاف نہیں کر سکتا، کہ شہر میں کھانا ہضم کرنے کیلئے "چورن، چٹنی، اچار" یا "قاحب کے مصالحے" کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ اور یہ امر بھی واضح ہے، کہ ان چیزوں کے لئے حضرت مدبیہ علیہ السلام کی موجودگی لازمی ہے مگر موجود

جسکی تعریف سے خاک کے پنجاب آسماں

اقتصادی بدحالی کے ہوتے ہوئے ہر شخص ان چیزوں کو حاصل نہیں کر سکتا تھا بدہضمی کی شکایت بڑھتی گئی۔ اور لاہور کی صحت عامہ خراب سے خراب تر ہوتی گئی۔ چنانچہ ان حالات میں ہمارے دہان حکمرانوں نے نہایت ہی کم خرچ اور بالانشین طریقہ ایجاد کیا۔ اب آپ حضرات نہایت ہی آسانی سے بوقتِ ضرورت ریلوے سٹیشن سے مبلغ ایک آنہ خرچ کرکے بھاٹی دروازہ تک ایک عدد ٹانگہ میں تین دیگر ہمراہیوں کے ساتھ سفر کریں، انشاءاللہ کم از کم شاہ عالمی گیٹ اور زیادہ سے زیادہ موہنی گیٹ تک سب کچھ باہر آ جائے گا۔ اور آپ کو اس قدر بھوک لگے گی، کہ وہیں کسی ہوٹل پر کھانے کو جی چاہے گا۔ اور اگر آپ بدہضمی کے دائمی مریض ہیں، تو ذرا لمبائی گیٹ تک ہو آئیے "طبیعت بالکل صاف ہو جائے گی"۔ اسی وجہ سے لاہور کی سڑکوں کو "ہاضمہ سڑکوں" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہاں اگر آپ بھوکے ہوں تو پھر آپ کی پسلیوں کی خیر نہیں۔

لہٰذا باہر سے آنے والوں کو بذریعہ اشتہار ہذا مطلع کیا جاتا ہے کہ ریلوے سٹیشن سے سوار ہوتے وقت میو ہسپتال میں اطلاع کر دیں، کہ میں فلاں ابن فلاں ٹانگہ نمبر فلاں پر سوار ہو کر انارکلی جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اس لئے ملتمس ہوں، کہ ایک عدد ایمبولنس کار جائے وقوعہ پر بھیج دیجائے۔ شکر گزار ہوں گا۔ اگر آپ کو خدانخواستہ سائیکل پر جانا ہو تو "برائے مہربانی فرما کر" اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا: کا اچھی طرح مطالعہ کر لیجئے۔ اور ان کے ڈاکٹر کا پتہ اپنی پاکٹ بک پر نوٹ کر لیں، تاکہ بعد میں شکایت کا موقع پیدا نہ ہو سکے۔ ہاں اگر آپ کے پاس جاپانی سائیکل ہو تو شاید اس

سوال تک نوبت ہی نہ آئے. کیونکہ وہ انار کلی سے "پیشتر ہی آپ سے ناراض ہوکر خودکشی کرے گی. اور ہم آپ کے لئے اناللہ وانا الیہ راجعون پڑھتے ہوئے جیسے یہ ہال میں ایک ریزولیوشن پاس کرکے آپ کے پسماندگان کی خدمت میں بھیجدیں گے.

پیدل جانیوالے حضرات خربوزہ تربوز اور کیلے کے چھلکوں کی بدولت تھوڑی دیر تک دیکھنے والوں کیلئے ہنسی کا سامان مہیا کر دیتے ہیں ایکدفعہ یونہی "بی وی دے" اپنے ساتھ بھی ایسا معاملہ پیش آیا. لیکن خیریت یہ رہی کہ رات کا وقت تھا. نہایت ہی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ادھر ادھر نظر دوڑائی. اور جب دس دس گز کے فاصلے تک کوئی "کرمفرما" نظر نہ پڑے، تو نہایت ہی "ایڈیٹرانہ" انداز سے تیلون جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے.

(واضح رہے کہ اس فقرے سے یہ جتانا منظور نہیں کہ ہم کسی زمانے میں ایک عدد تیلون کے مالک بھی رہ چکے ہیں)

ہاں اگر آپ شہر کے اندرونی حصے خصوصاً موچی دروازہ میں تشریف لے جائیں، تو انشاءاللہ کسی چھلکے وغیرہ کی ضرورت محسوس نہ ہوگی. آپ کی خواہش چھلکے کے بغیر ہی پوری ہو جائے گی. یہاں کی بعض سڑکیں تو حد درجہ "شعر انگیز" ہیں مثلاً خواجہ دل محمد روڈ (جس پر ہمارے اکثر پروفیسروں کے بنگلے واقع ہیں) یہ سڑک اس قدر ہموار اور صاف ہے. کہ بے اختیار اسکی شان میں قصیدہ مدحیہ لکھنے کو جی چاہتا ہے. امیر علی شاعر روڈ کے متعلق آجتک ہمیں یہ معلوم نہ ہوسکا. کہ شاعر کی ضمیر کسکی طرف ہے. یہ امیر علی کی شاعر روڈ ہے، یا امیر علی شاعر کی روڈ.

اس سلسلہ میں ایک لطیفہ سن لیجئے. میں اپنے چھوٹے بھائی کے ہمراہ جو ابھی پہلی پرائمری میں تعلیم پاتا ہے. سیر کے لئے جا رہا تھا راستے میں اسکی نگاہ رائے بہادر. . . . . . . روڈ کے بورڈ پر پڑی اور اس نے نہایت ہی تعجب بھرے لہجے میں پوچھا. کہ کیا تمام ہندوؤں کی ذات "روڈ" ہوتی ہے؟" میں پہلے تو سوال سمجھنے سے قاصر رہا لیکن اس کے اصرار پر اس سوال کی توضیح چاہی جس پر نہایت ہی متانت سے جواب ملا. کہ آپ کے دوست جو آپ کو بٹ لکھتے ہیں. کیا یہ تمام ہندو اسی طرح اپنے آپ کو "روڈ" نہیں لکھتے چند منٹ تو میں خوب ہنسا، پھر اسکے بعد اسکو بتایا. کہ "روڈ" انگریزی میں سڑک کو کہتے ہیں.

حضرت غالب نے نہایت ہی حسرت بھرے لہجہ میں خدا سے پوچھا تھا. کہ ؎

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکن زلف عنبریں کیوں ہے
نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے

کاش کہ وہ آج ہم میں موجود ہوتے. اور ہم انہیں "لارنس گارڈن" لے جاتے. نصیر ماؤنڈ کی سیر کراتے. اور رات کو فرنٹیر میل پر کسی کو الوداع کہنے کے لئے انہیں ساتھ لے جاتے. تو شاید ان اشعار کی شکل وصورت کچھ اور ہوتی. آپ کسی روز لارنس تشریف لے جائیے. مجھے یقین ہے کہ آپ جنت کا نام تک زبان پر نہ لائیں گے مگر ایک چیز نہایت ہی افسوسناک ہے. کہ یہاں "عشق" اکثر "پیدل" اور "حسن" سائیکل سوار ہے. یا پھر "عشق" سائیکل کا پیڈل گھماتا رہتا ہے اور "حسن" موٹر پر گرد اڑاتا اور "عشق" کی آنکھوں میں سرمہ عشق آزمائی لگاتا ہوا نہایت ٹھاٹھ سے گزر جاتا ہے. تصویر کا یہ پہلو واقعی تاریک ہے اگر ممکن ہو تو ضلع لاہور کے عشاق کی ایک کانفرنس منعقد کرکے گورنمنٹ سے درخواست بلکہ پرزور مطالبہ کیا جائے. کہ عشق کے لئے "ہوائی جہاز" مہیا کئے جائیں. جہاں تک کانفرنسوں کا تعلق ہے. یہ کوئی نئی چیز نہیں. لاہور میں کانفرنس ساز طبائع کی کمی نہیں. ہر روز کوئی نہ کوئی کانفرنس ہوتی ہی رہتی ہے. آج کشمیری کانفرنس ہے. تو کل راعین کانفرنس، پرسوں افغان کانفرنس اور اب تو کَکّے زئی کانفرنس بھی منعقد کرنے کی تیاریاں کیجا رہی ہیں. ان کانفرنسوں کے ساتھ ساتھ یہ کانفرنس بھی ہو جائے. تو "عشق" کی "رسوائی" اور "بے چارگی" کا علاج ایک ہی نشست میں ہو سکتا ہے.

حفیظ جالندھری نے شاید "لارنس باغ" کے دلفریب نظاروں سے متاثر ہو کر یہ کہا تھا ؎

ہے تو یہ جنت مگر انسان بستے ہیں یہاں
خلد کے نکلے ہوئے ارمان بستے ہیں یہاں

صورت و معنی بہم محو نیاز و ناز ہیں
حسن کے پہلو بہ پہلو عشق کے انداز ہیں

اگر آپ کو دیوالی دیکھنے کی توفیق ارزانی ہوئی تو آپ ان اشعار کی حقیقت سے بخوبی واقف ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک تازہ واقعہ یاد آ گیا۔ صفدر صاحب کے کمرے میں یار دوست موجود تھے اور احباب کی محفل گرم تھی، کسی دل جلے نے دیوالی دیکھنے کی تجویز پیش کی جو تقریباً باتفاق رائے پاس ہوئی، چوہدری دین محمد سابق جنرل کانگ علامہ یوسف علی دحال بی۔ اے، کو ہالی کمان تسلیم کیا گیا اور یہ مختصر سا قافلہ چوہدری صاحب کی کمان میں انارکلی کی طرف تیز مارچ کرتا ہوا روانہ ہوا۔ ہم نظارۂ حسن میں اسقدر محو تھے، کہ تھوڑی دور جا کر چوہدری صاحب ہم سے جدا ہو گئے۔ ہم سمجھے کہ شاید شہید ہو گئے۔ چنانچہ اپنے ساتھی کی "شہادت" پر ہماری "رگِ جہاد" اور بھی پھڑک اٹھی، اور ہم لوگ پہلے سے زیادہ ذوق و شوق کے ساتھ اس جنگ میں حصہ لینے لگے۔ راقم الحروف کا یہ پہلا موقع تھا۔ اس لئے اگر دل چھوڑ جان بھی جاتی، تو تعجب کا مقام نہ تھا۔ صفدر صاحب "دیوانہ وار" پکار رہے تھے۔ کہ اے خدا میں گدا ہوتا اور آج بھیک مانگتا؛ ابھی ان کا فقرہ پورا نہ ہوا تھا، کہ مسٹر معراج الدین خالد بول اٹھے، کہ کاش میں کسی موٹر کار کا ڈرائیور ہوتا۔ خدا خدا کر کے بخشی بلڈنگ پہنچے، یہاں ایک نئی دنیا آباد پائی جہاں ہزار ہا "مجنون ۱۹۳۲ء" بلاتفریق مذہب و ملت موجود تھے۔ ہم پولیس کے پہرے میں حسن کی "بے نیازیاں" اور عشق کی "درماندگیاں" دیکھ کر دل ہی دل میں جل رہے تھے، اور ملک انور تو علی الاعلان کہہ رہے تھے۔ کہ یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔ کہ ہمارے خالص پرائیویٹ معاملات میں بھی "سرخ پگڑیاں حائل ہیں"۔ بعض رفقائے کار نے یہاں بھی ستیہ گرہ کا خالص کانگرسی نسخہ استعمال کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن یہ تجویز کسی نہ کسی وجہ سے عملی جامہ نہ پہن سکی، اور ہم نہایت ہی مجبوری کی حالت میں ریواز ہوسٹل واپس آئے۔ بعض ساتھی تو ہوسٹل پہنچنے سے پہلے ہی دیوالی کی نذر ہو چکے تھے۔ واقعی

حسن پھرتا ہے یہاں اٹھکیلیاں کرتا ہوا
سادگی کو بے حجابی پر عیاں کرتا ہوا

عشق ہر سو اس تماشاگاہ میں آوارہ ہے
زخم خوردہ ہے بہت آزردہ ہے بیچارہ ہے

اک طرف قاتل نگاہیں تیر برساتی ہوئیں
اک طرف مجبور آہیں دل کو دھڑکاتی ہوئیں

یہ وہ میخانہ ہے، جس میں ساقیانِ مے فروش
پھر رہے ہیں ہر طرف ساغر بکف مینا بدوش

ولولے اٹھتے ہوئے بڑھتے ہوئے چڑھتے ہوئے
بہ آفاتِ بلا کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے

جلوہ آرا ہیں یہاں کیفیتیں پنجاب کی:
سینۂ فولاد میں خاصیتیں سیماب کی

لاہور والوں کو خدا سلامت رکھے۔ بیچارے بہت زندہ دل واقع ہوئے ہیں۔ یہاں کے جلسے اور جلوس خاص طور پر مشہور ہیں۔ ذرا ذرا سی باتوں پر "عظیم الشان" اور "فقید المثال" جلسے منعقد ہو جاتے ہیں۔ جونہی کسی لیڈر کی بیگم صاحبہ ناراض ہوئیں۔ فوراً انہوں نے مبلغ ایک عدد جلسہ کر کے اپنی بیگم صاحبہ کے برخلاف عدم اعتماد کا ریزولیوشن باتفاق رائے منظور کرا کے بخدمت بیگم صاحبہ بھیج دیا اور قرار پایا، کہ اس کی نقول جناب گورنر صاحب بہادر اور اخبارات کو ارسال کی جائیں۔ یہاں کی پبلک کچھ اس قسم کی عجیب و غریب واقع ہے۔ کہ ہم تم اور تیرا سے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ لاہور تحریکوں کا گھر ہے ہر قسم کی تحریک کی ابتدا اس مبارک شہر سے ہوتی ہے، ڈاکٹر عالم اٹھے، تو انہوں نے نمک بنانا شروع کر دیا۔ احرار نے کشمیر چلو، کشمیر چلو کی تحریک چلائی، مغلپورہ پر دھاوا بولا۔ اور بالآخر مولانا ظفر علی خان صاحب نے "شہید گنج" شروع کی۔ لیکن آفرین ہے لاہور کے لوگوں پر کہ انہوں نے کسی کی دل شکنی مناسب نہ سمجھی، سب کا ساتھ دیا، قومی نعرے بھی لگائے۔ اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں سے موچی دروازے کے باغ کی گھاس اڑا کر اسے بیرسٹر بنا دیا، اور مجلس احرار

زندہ باد کے نعروں سے محشر بپا کر دیا۔ ہزارہا انسان قید ہوئے اس کے باوجود آپ نے دیکھا ہوگا۔ کہ اس تمام "کشمکش" میں لاہوری قیدیوں کی تعداد آٹے میں نمک سے بھی کچھ کم ہی ہوگی۔ "زندہ باد" اور "مردہ باد" ان لوگوں کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔ جلسوں میں ہاتھ اٹھانے والے تمام لوگ یہی ہونگے۔ اعتراض کرنے میں سب سے پہلے لیڈروں کے گلے میں ہار ڈالنے میں پیش پیش۔ اس پر طرہ یہ کہ ان کی پگڑی اچھالنے میں بھی سبقت لینے والے یہی غرض کہ ہر بات میں اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ ایک جلسہ میں مولینا ظفر علی خاں آئیں تو احرار کے خلاف ریزولیوشن پاس ہو جائے۔ اور دوسرے دن اسی جگہ اسی پبلک جلسہ میں اگر چوہدری افضل حق آجائیں تو مولینا ظفر علی کے خلاف عدمِ اعتماد کا ووٹ حاصل کر لیں، اور تیسرے دن ڈاکٹر عالم آئیں تو "اتحاد ملت" اور "احرار" دونوں کو "مردہ باد" کر جائیں یکدفعہ ہم مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر سننے کیلئے گئے۔ ہزارہا کا مجمع۔ لاؤڈ سپیکر کا تسلی بخش انتظام، اور لوگ شاہ صاحب کی تقریر کے لئے بے چین۔

خدا خدا کر کے شاہ صاحب سٹیج پر تشریف لائے۔ اور جناب صدر اور لاہور کے تماشائی دوستو! کہکر کرسی پر بیٹھ گئے۔ ہم حیران تھے یا الٰہی کیا ماجرا ہے۔ ہم نے سن رکھا تھا۔ کہ شاہ صاحب گھنٹوں بولتے ہیں، اور ان کی تقریر میں اسقدر سحر ہوتا ہے کہ کوئی شخص جلسہ گاہ سے اٹھنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ جب ہم نے اس مختصر سے فقرے کے بعد تقریر کو ختم ہوتے دیکھا۔ تو کچھ دیر تک ادھر ادھر کے "تشویشناک" خیالات نے دماغ پر چھاؤنی ڈالی۔ مگر جلد ہی ہم کو معلوم ہو گیا۔ کہ حضرت امیرِ شریعت نے مختصر سے فقرے میں پورا لاہور بند کر دیا ہے

جلسے اور جلسوں کے ساتھ ساتھ یہاں کے اخبارات اور رسائل بھی ملاحظہ کرتے جائیے۔ اگر لاہور کو اخبارات اور رسائل کا عجائب گھر کہا جائے تو بالکل بجا ہوگا۔ کیونکہ یہاں ہر قسم کے اخبارات پاکٹ سائز سے لیکر "جانماز" سائز تک مہیا ہو سکتے ہیں، اور لطف یہ ہے کہ انکے نام بالکل مختلف اور جدا جدا ہیں۔ آپ ہر رنگ ہر قیمت، ہر پالیسی، اور ہر زبان کے اخبارات کا مطالعہ فرما سکتے ہیں

انکی کثرت کا یہ عالم ہے۔ کہ حکومت کو درجنوں پسندیدہ درخواستیں گزارنے کے بعد کہ ہم فلاں نام کا "اخبار یا رسالہ" جاری کرنا چاہتے ہیں۔ ہر درخواست اس ریمارک کے ساتھ واپس آجاتی کہ اس نام کے اخبار یا رسالہ کیلئے پہلے کسی صاحب نے اجازت حاصل کر رکھی ہے۔ لہٰذا آپ کوئی نیا نام تجویز کریں۔ اگر لاہور کے کسی اخبار میں جلی حروف میں چار چار کالمی سرخی کے ساتھ اس قسم کی خبر دکھائی دے،

"مسلمانان لاہور کا فقید المثال اجتماع ایک لاکھ فرزندانِ توحید کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، حضرت مولانا کی بصیرت افروز اور وجد آموز تقریر"

تو سمجھ لیجئے۔ کہ جلسہ میں پانسو سے زائد انسان نہ ہونگے۔ اور پانسو میں پولیس اور سی۔ آئی۔ ڈی کو نکال دیا جائے۔ تو شاید تعداد سالمے تین سو سے بڑھنے نہ پائے۔ ہاں اگر آپ بھی بائی چانس اس جلسہ میں شامل ہوئے ہوں تو مندرجہ بالا خبر پڑھ کر شبہ ہوگا۔ کہ شاید کسی اور جلسہ کی کارروائی ہے۔ ہاں اگر جلسہ کسی ایسی جماعت کیطرف سے ہوا ہے۔ جو آپ کے سیاسی عقائد سے اختلاف رکھتی ہے۔ تو اس حالت میں بیس پچیس ہزار کے مجمع کو بیک جنبش قلم اس خبر میں اڑا دینا۔ ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

"احراریوں کی ناکامی اور نامرادی کا ایک بین ثبوت لاہور کے غیور مسلمانوں نے تقریر سننے سے انکار کر دیا۔ حاضرین کی تعداد دو سو سے کچھ کم، جن میں اکثریت تماشائیوں کی تھی"

لاہور کے پریس کی حالت یہاں کے لوگوں سے بھی زیادہ قابلِ رحم ہے۔ اب ذرا لاہور کی مہذب ترین مخلوق یعنی کالجیٹ لوگوں کا حال بھی سن لیجئے۔ فرسٹ ایر میں داخل ہوتے ہی انکی زبان پر "ہو بے پریم کا جھولا جھلا دے کوئی" اور "میرا جیون پریم کہانی" وغیرہ وغیرہ جاری ہو جاتا ہے۔ چاہے "پریم" کے معنوں سے وہ خود چھوڑ ان کے والد ماجد بھی ناآشنا ہوں۔ کالج میں داخل ہوتے ہی "پریم کی نیا" تجل میں چلنا شروع کر دیتی ہے۔ یہ لوگ اگر کسی کو لارنس باغ میں سیر کرتے ہوئے دیکھ پائیں یا کوئی قسمت کا مارا یا قسمت کی ماری

کالج جاتے ہوئے ان کے ہاتھ آجائے تو اس بیچارے یا بیچارن کی خیر نہیں ہوتی۔ اس کی موٹر کا نمبر نوٹ کر لیا جاتا ہے۔ پہلے پہل ٹیلیفون یا نامہ و نامے کے لئے سفارشات حاصل کی جاتی ہیں۔ اور اگر سیر پسیلٹی کا پاس شدہ ٹانگہ ہو تو ٹانگے والے کی پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔ یہ لوگ اس ٹانگے کا پیچھا نہیں چھوڑتے جب تک کہ سواری کا مکمل شجرۂ نسب معلوم نہ کر لیں۔ اس ٹانگہ کو کرایہ پر لیا جاتا ہے اور باتوں ہی باتوں میں ایک سگریٹ پیش کرتے ہوئے۔ سوالات کی بارش شروع کر دی جاتی ہے۔ کہاں سے نادی ہے؟ کس محلہ سے؟ گھر کا نمبر کیا ہے؟ والد کا نام؟ کونسی کلاس؟ وغیرہ وغیرہ جب شام کو یہ لوگ کالج ہوسٹلوں میں آتے ہیں تو "تجھ بن پریم مندر ہے خالی" گاتے گاتے سو جاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ واقعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ لارنس سے واپسی پر ہمارے ساتھیوں نے پانی پیا۔ اور ایک صاحب فرمانے لگے کہ میں تو ہر روز بلا ناغہ پانی پیتا ہوں۔ اور وہ محض اس لئے کہ شاید کسی معشوق نے اس گلاس میں پانی پیا ہو۔ اور اس کے ہونٹ اسی جگہ لگے ہوں جہاں ہمارے ہونٹ اور اسی طرح معشوق کے خیالی ہونٹوں پر اپنے ہونٹ پیوست کر دیتا ہوں: ان گلاسی بوسوں کا ذکر سنکر ہم حیران ہونے ہی والے تھے۔ کہ خواجہ احمد حسن صاحب نے ہمیں اطلاع دی۔ کہ آجکل تو ٹیلیفون کے ذریعہ "بوسہ بازی" شروع ہو گئی ہے۔ خدا ہمیں وہ دن نصیب نہ کرے۔ جب کہ ٹیلیفون کے ذریعے سب کچھ ہو جایا کرے۔ کیونکہ اب ہمارے کالجوں کے بہت سے لوگ شادی شدہ ہونے والے ہیں۔ انہیں تو خاص فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ہر وقت پرنسپل صاحب کا ٹیلیفون استعمال کر سکتے ہیں۔ جن لوگوں کے ہاں ٹیلیفون نہیں ہیں۔ ان کا کیا بنے گا۔

مولانا انقلاب نے کچھ عرصہ پہلے عشق کا نسخہ تجویز کرتے ہوئے لکھا تھا:

هوالشافی

بوسہ رخسار	بوسہ لب	دشنام گرفتہ
۳ عدد	۵ عدد	ہموزن

کوفتہ بیختہ آمیختہ ہمراہ شربت وصل بخورند۔ مگر ہمیں خدشہ ہے یہ نسخہ اب مفید نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اب عشق کافی ترقی کر چکا ہے۔ لہذا اس چتاخ پتاخ بیماری کے صحیح علاج کے لئے ہمیں کوئی اور نسخہ تجویز کرنا پڑے گا۔ ہمیں امید ہے کہ اس معاملہ میں طبیہ کالج کوئی عملی اقدام کرے گا۔ ہاں تو کالج کے یہ برخوردار جب الیف اے میں ہی تین چار سال تک بدستور چیکو سواکیہ بنے رہتے ہیں تو ان کا عشق فوراً اپنا رخ بدلتا ہے۔ اور جگت "پیا پریم ہی پریم" کی جگہ "پریم ہے من کی مجبوری" "اور پریم ہے سندر روگ" شروع ہو جاتا ہے۔ اور یہ لوگ پتلون ڈھیلی کر کے چیختے اور چلاتے ہیں:-

"اب میں نے جانا ہائے پریم کیا ہے"

اور آئندہ نسلوں کے لئے "جھوٹی دیکھی پریت جگت میں" کی وصیت لکھ کر رخصت ہوتے ہیں۔

سینما ضروریاتِ زندگی میں شمار کیا جاتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے۔ کہ سینما جانیوالے اصحاب اپنے دل بھی وہیں پھینک آئیں۔ مگر ہم نے اکثر ایسے دوست دیکھے ہیں جنہیں سینما کے بعد "درد دل" کا عارضہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور کسی ماہر ڈاکٹر کی خدمات حاصل کئے بغیر نہیں بنتی۔ یہاں کے ڈاکٹر حکیم اور وید بھی کچھ اسی قسم کے لوگ ہیں۔ ہماری مراد ان حکیموں اور ڈاکٹروں سے ہے۔ جو سڑکوں پر ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر گھومتے ہوئے نہایت ہی بلند آواز سے ؎

اے مسافر جانیوالے دیکھ لے منہ پھیر کر
ہم مسافر بھی کھڑے ہیں تیرا رستہ گھیر کر!

پڑھتے ہوئے چند شعبدے دکھا کر "نامردی سستی" یا "آتشک سوزاک" شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد اپنی دوائی کی تعریف کی انکو تہذیب اجازت نہیں دیتی۔ اور وہ محض خلق خدا کے فائدہ کے لئے صرف اپنی لاگت وصول کرتے ہیں۔ اگر آپ کو یہ طریقہ پسند نہ آئے تو کسی ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے پاس چلے جائیے۔ آپ خواہ بھلے چنگے چلتے پھرتے کھاتے پیتے اور جیتے جاگتے ہی کیوں نہ ہوں "ڈاکٹر صاحب" آپ کے ادھر ادھر ٹیوب لگانے کے بعد فتویٰ صادر فرمائیں گے۔

کہ آپ کے گردے خراب ہیں۔ مگر اس پر مزید تسلی کی ضرورت ہو، تو ایک اور صاحب کے پاس چلے جائیے۔ ان کے نزدیک آپ کے پھیپھڑے کام ہی نہیں کرتے۔ وہ جگر تو بالکل خراب ہو چکا ہے غرضکہ پانچ دس سپیشلسٹوں کے ہاں سے واپس آئیے۔ تو گھر پہنچ کر واقعی کل محسوس ہونے لگے گا۔ کہ شاید مجھے کوئی بیماری ہے۔ آپ کو لاہور کی سڑکوں پر نجومی بھی بکثرت مل جائیں گے۔ آپ ان کی ہتھیلی پر پانچ پیسے رکھدیجئے اور اپنی آئندہ زندگی کی مکمل داستان پوچھ لیجئے۔ وہ آپکے بچپن سے شروع ہونگے۔ جب کہ آپ ایک خطرناک بیماری سے بمشکل بچے تھے۔ اس کے بعد آپ کی تین شادیاں ہوں گی۔ جن میں سے دو منگنی کے بعد ہی فسخ ہو جائیں گی۔ اور ایک بیوی سے ہی آپ کو محبت ہوگی۔ آپ کی عمر کسی صورت میں نوّے سال سے کم نہیں ہے۔ اور آپ کو مغرب کیطرف سفر ضرور پڑے گا۔ آپ کے ہاں اولاد بکثرت ہوگی، مگر دولت آپ زیادہ سنبھال کر نہیں رکھیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔

المختصر لاہور کا ذرّہ ذرّہ اپنے اندر دلچسپی کا سامان لئے ہوئے ہے لیکن اسے دیکھنے کے مسٹر سکیناب کی آنکھوں کی ضرورت ہے۔ آہ۔ لاہور کے متعلق۔۔۔۔ کہاں تک لکھا جائے ؎

آب دگل میں زندگی ہنگامہ آرا ہے یہاں
موت بھی چاہے تو جینے کا سہارا ہے یہاں

جناب عبد اللطیف تپشؔ ایم اے

غزل

ضبطِ فریاد سے ہنگامۂ محشر ہی سہی — جنبشِ ساز تو ہے نغمۂ مضطر ہی سہی
مدتوں دیکھی ہے آئینۂ دل میں صورت — پھر بھی پتھر اسے کہتے ہو تو پتھر ہی سہی
ہے مجھے رنگِ پریدہ کا تماشا منظور — کوئی بے پردہ نہ ہو پردے کے اندر ہی سہی
حضرتِ شیخ بہکنے کے مگر کیا معنیٰ؟ — میکدہ مانا کہ مسجد کے برابر ہی سہی
تشنۂ رنگ ہے ہر پھول کی پتّی پتّی — ذرّہ ذرّہ چمن دہر کا ساغر ہی سہی
کسی صورت تو ہوا فتادِ محبت سے نجات — کچھ نہیں تو مری تقدیر میں چکّر ہی سہی

مٹ گیا شکوۂ دلسوزیٔ احباب تپشؔ
آپ ٹھنڈے تو ہوئے آگ لگا کر ہی سہی

نوشتہ۔ رابرٹ لوئیس سٹیون سن
(انگریزی مصنف)

مترجمہ۔ جناب آج کل ڈبائیوی بی اے

مسئلۂ موت و حیات

اعصائے جسمانی میں تبدیلیاں جہاں ہیبت ناک اور اٹل ہوتی ہیں، وہاں اپنے نتائج اور اثرات کے لحاظ سے بھی اسقدر خطرناک اور مایوس کن ہوتی ہیں۔ کہ یہ ہنگامہ دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتا، موت کے مضبوط چنگل سے بھلا نجات کہاں؟ فرشتۂ موت بعض اوقات تو اپنے شکار کو بالکل اسی طرح آدبوچتا ہے جس طرح ایک تُفنگ بالکل غیر متوقع طور پر کسی بیکس کے سر پر آموجود ہو۔ اور کبھی اس کو کسی کی زندگی کے قلعہ کو مسمار کرنے کے لئے برسوں محاصرہ بھی کرنا پڑتا ہے

جب موت اپنا کام کر چکتی ہے تو مرحوم کی ذات سے متعلقہ تو وابستہ زندگیوں میں جو ایک خاص قسم کا ہیجان سا بپا ہو جاتا ہے وہ بھی کم روح فرسا نہیں ہوتا، مرحوم کی ذات سے تعلق رکھنے والی ہر معمولی سی شئے کا نظارہ مرنے کے بعد اس کے احباب و اعزا، کو کسی روحانی خلش میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہ بات بھی اپنی جگہ پر کچھ کم جانکاہ نہیں ہے۔ اور ذرا اس ستم ظریفی کو ملاحظہ فرمائیے۔ کہ موت ہمارے احباب اور اعزا، کو ہماری آنکھوں کے سامنے سے بالکل ہٹا نہیں لیتی، بلکہ انسانی جسم کا وہ مضحکہ خیز، خوفناک اور ناقابل برداشت ہیولیٰ چھوڑ جاتی ہے۔ کہ جسکو اپنے ہی ہاتھوں سے جلد سے جلد چھپانے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نظر ہی نہیں آتا۔ کسی کی موت واقع ہونے کے بعد شروع سے اخیر تک تجہیز و تکفین کی تمام رسوم اور پابندیوں سے اب چاہے وہ مصر کے عظیم الشان اور فلک پیما مقبروں سے وابستہ ہوں، اور یا زمانۂ متوسط کے یورپ میں خونی مجرموں کی سزا [illegible] سے تعلق رکھتی ہوں۔ وابستگان کے دل و دماغ کو کیا کچھ اذیت نہیں پہونچتی! یہ بھی ظاہر ہے، عام طور سے صورت یہ ہوتی ہے۔ کہ ایک غریب اور محتاج تک کی میت کو بھی قبر تک پہنچانے کیلئے کچھ نفوس ضرور جمع ہو جاتے ہیں۔ یادگار کے طور پر بعض اوقات مرنے والے کی قبر کے سرہانے، ایک کتبہ بھی نصب کر دیا جاتا ہے مرحوم کے احباب اور اعزا بھی کافی تعداد میں اپنی شکلوں کو امکانی طور پر غمناک اور پُر حسرت بنائے، اس جسم بے رُوح کو سپردِ خاک کرنے کے لئے چلے جاتے ہیں۔ ان سب مایوس کن اور اذیت دہ ہنگامی کارروائیوں کو نہ صرف پژمردہ شعرا، کی قوت فکر کا سہارا حاصل رہا ہے۔ بلکہ متعدد فلسفیوں نے بھی اپنی پوری منطق کو خرچ کر کے غریب انسان کو کچھ کم غلط فہمی میں مبتلا نہیں کیا ہے۔ وہ تو یوں کہیئے کہ بچارے انسان کو اپنی زندگی کی گوناگوں مصروفیتوں میں پھنسے رہنے کے باعث ان شعرا، کی ہرزہ سرائی، اور ان فلسفیوں کی خشک منطق کیطرف توجہ کرنے کی مہلت ہی نہیں ملتی۔ ورنہ ان لوگوں نے جو انسان کو ہر دم افسردہ خاطر غمگین، اور ناشاد و مضمحل بنا دینے کی کوشش کی تھی، وہ اپنی نظیر آپ ہی ہے

ہر چند یہ حقیقت ہے۔ کہ انسان کسی ہنگامے اور حادثے سے اتنا خوفزدہ اور ہراساں نہیں ہوتا جتنا صرف موت کے نام کو ہی سنکر ہو جاتا ہے۔ ہم یہ بھی سنتے ہیں، کہ جنوبی امریکہ میں بہت سے قصبے آتش فشاں کے پہلو میں بسے ہوئے ہیں اور وہاں کے باشندے ہر وقت کے خطرہ سے شمہ برابر خوفزدہ ہوئے بغیر بالکل اسی بے فکری اور اطمینان کے ساتھ اپنے ضروری فرائض کو انجام دیتے رہتے ہیں۔ گویا وہ انگلستان کے کسی سرسبز و شاداب ترین خطہ میں باغات کے لئے زمین کو تیار کر رہے ہوں۔ وہ لوگ موت کی آغوش میں ہر وقت رہتے ہوئے بھی اپنی پرکیف رنگینیوں اور رنگ رلیوں کو کسی نہ کسی صورت سے قائم رکھتے ہیں۔ محتاط اور ڈرپوک انسان امریکنوں کی اس شاندار زندگی پر سر نہ دھنے تو اور کیا کرے؟ اور یہ سب سکون و اطمینان

کی باتیں اسوقت تک عمل میں آتی رہتی ہیں کہ جبکہ ان باشندوں کے قدموں تلے کی زمین کوہ آتش فشاں کی تپش کے باعث کانپتی سی رہتی ہے۔ کوہ آتش فشاں اپنی پوری خوفناکیوں کے ساتھ آگ اگلتا رہتا ہے۔ اور اس کا بہت قوی امکان ہوتا ہے۔ کہ خدا جانے کب اور کس وقت آتش فشاں کا آتشیں مادہ اس کے قریب بسے ہوئے ہر جاندار کے جسم کو روئی کے گالے کیطرح اڑا دے۔ یعنی پہاڑ کے اردگرد بسنے والی تمام آبادی کی رنگ رلیوں اور خوش نعلیوں کا پل بھر میں خاتمہ ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک دور اندیش، محتاط اور خود پرست کوہ آتش فشاں سے بہت کافی فاصلہ پر آخر کیونکر پیٹ بھر کر کھانا کھا سکے گا۔ چہ جائیکہ وہ رنگ رلیاں منائے۔ ایک نازک مزاج نواب موت کے امکان سے اس قدر قریب رہنا کہاں گوارا کر سکتا ہے۔ اس کے نزدیک ایسے خطرناک مقام پر مے نوشی خدا سے لڑنے کے برابر ہے۔ اسکی دانست میں تو ایسا مقام صرف سنیاسیوں اور درویشوں کے لئے، یا پھر شیطان کامل اور ہمہ دم شراب میں شرابور رہنے والے لوگوں کیلئے ہی مناسب ہو سکتا ہے۔

غور و خوض کرنے کی تھوڑی سی تکلیف اس بات کو صاف کر دے گی، کہ جنوبی امریکہ میں کوہ آتش فشاں کے قریب بسنے والوں کی موت کیطرف سے بے پروائی تو حقیقی صورت حالات کا ایک ادنیٰ سا نمونہ ہے۔ ورنہ اس دنیا کی زمین پر بسنے والی انسانی آبادی کے موت کی طرف سے تغافل کا اندازہ لگانا تو صرف محال ہی نہیں، بلکہ ناممکن بھی ہے۔ یہ دنیا کی زمین کا آتشیں گولہ جو ہزاروں مختلف سمتوں میں چلنے والے اجسامِ فلکی کے ساتھ نہایت تیزی سے اور پھر بہت ہی تنگ جگہ میں چکر لگا رہا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کب اور کسوقت وہ کسی ایسے سیارے سے ٹکرا جائے۔ اور کائنات ارضی و سماوی کو الٹ پلٹ کر رکھدے

طبی نقطۂ نظر سے ہمارے جسم کی بھی ایک آتشبازی کے پٹارے سے زیادہ حقیقت نہیں ہے۔ جس طرح کسی جہاز کا بارود اس کیلئے یکایک طور پر تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے بالکل اسی طرح ہمارے جسم کا چھوٹے سے چھوٹا عضو ہمارے جسم کی پوری مشین کو نامعلوم وقت تک کیلئے بیکار کر سکتا ہے۔ اسی بنا پر ہر سانس جو ہم لیتے ہیں اور خوراک کا ہر نوالہ جو ہم منہ میں ڈالتے ہیں، ہمارے لئے خطرہ کا باعث بن سکتے ہیں۔ پس واضح ہوا کہ اگر ہم فلسفیوں اور محققین کی ان خیالی اور فنی تعریفوں پر اعتماد کر لیں، تو دنیا میں ہماری زندگی دوبھر ہو جائے لڑائی کے میدان میں مرنا اپنی پوری آواز سے شور مچاتا رہیگا۔ لیکن اس کی آواز پر لبیک کہنے والا کوئی نہ ملے گا۔ اور اس طرح لڑائی کا میدان کبھی گرم ہی نہ ہوگا۔ جہاز کے مستول پر نیلا جھنڈا ہوا میں خوب زور سے لہراتا رہے گا۔ لیکن کیا مجال کہ کوئی روانہ ہونے والے جہاز میں قدم رکھ دے۔ ذرا غور کیجئے گا، کہ اگر غریب انسان ان خشک فلسفیوں اور محققین کے اعتقادات کی کورانہ پرستش کرتا، تو آج لذیذ کھانوں سے چنے دسترخوان کو آخر کون نوازتا۔ جو تاریخ کے کسی اہم سے اہم میدان جنگ کی تباہ ناکیوں سے ہرگز کم نہیں ہوتا۔ تجربہ اور حقیقت شاہد ہے کہ ہمارے بزرگوں کی بہت بڑی تعداد بدہضمی کا شکار ہوتی ہے۔ اور پھر تو اس کا بھی امکان تھا، کہ صنفِ نازک شادی کیطرف ہی راغب نہ ہوتی۔

ایک خاص اور مقررہ وقت کے بعد ہم ہر قدم، جو زندگی کی منزل میں رکھتے ہیں خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ ایک شخص جو زندگی کی ستر منزلیں طے کر چکا ہو۔ اسکا زندہ رہنا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے؟ جب ایسا ضعیف شخص اپنی ہڈیوں کے ڈھانچے کو لیکر رات کو بستر پر سوتا ہے۔ تو یہ شبہ یقیناً بے بنیاد نہیں کیا جا سکتا۔ کہ وہ ضعیف صبح کی روشنی کو بھی اپنی مادی آنکھوں سے دیکھ سکے گا یا نہیں؟ لیکن کیا ان سب امکانات کے باوجود ایک ضعیف شخص موت کو ذرا بھی خاطر میں لاتا ہے؟ اس ضعیف کی موت سے بے پروائی کا اندازہ ذرا اس سے لگائیے۔ کہ وہ کس قدر ہشاش بشاش رہتا ہے۔ رات کے وقت حسب معمول شراب کا جام بھی خالی کرتا ہے۔ اور پورے دل جمعی کیساتھ وہ دوسروں کو اپنی زندگی میں پیش آنیوالے واقعات بھی نہایت مزے سے سناتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنے ہمعصروں کو بلکہ اپنے سے بہت زیادہ کم عمر لوگوں کو مرتے ہوئے بھی دیکھتا ہے۔ لیکن کیا مجال کہ اس کی جبیں پر ایک شکن بھی پڑ جائے۔ اور اسکے چہرے پر ذرا تو خوف و ہراست کے آثار پائے جائیں۔ اور یہ موت کیطرف سے کامل بے پروائی اس

وقت عمل میں آتی ہے۔ جب کہ ایک ہلکا سا ہوا کا جھونکا بھی اسکی زندگی کا اسی طرح خاتمہ کرسکتا ہے۔ جس طرح وہ ایک چراغ کی لو کو بجھانے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ اور یا ایک ذرا سی ٹھوکر اس کے جسم کو اسی طرح چکنا چور کرسکتی ہے جس طرح وہ شیشے کے کسی ظرف کو پاش پاش کرسکتی ہے۔ اگر ہم صرف اور صرف خطرہ کو ہی پیش نظر رکھیں تو روم کے ایک وطن پرست نوجوان کرٹس کا اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کرنا بھی بالکل وہی حقیقت رکھتا ہے۔ جو ایک نوے سالہ ضعیف و ناتواں کا سوتے وقت کپڑے بدلنا۔

ایک دیا سلائی جلی اور جل کر ختم ہوگئی۔ بس یہی ہمارا عرصۂ حیات ہے۔ ابھی شراب کی بوتل کا کاگ ہی کھولا ہے۔ لیکن اتنی بھی توقع اور امید نہیں کہ موت ہم کو اس کے پینے کی بھی مہلت دے۔ یہ سب کچھ ہمیں محتاط اور گوشہ نشین بنانے کے لیے بہت کافی ہے۔ لیکن کیا باوجود ان عبرت سامانیوں کے انسان موت سے ڈرتا ہے؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔ "زندگی سے محبت" اور "موت کا خوف" یہ دو گتھیاں اس قدر پیچیدہ ہیں کہ انسان جتنا انکو سلجھانے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اتنی ہی یہ اسکی فہم و عقل سے بالا ہوتی جاتی ہیں

بات دراصل یہ ہے۔ کہ ہم لوگ موت سے متعلق فلسفیوں کی فنی اور منطقی تعریفوں کے مطالعہ سے اپنی عقل و فہم کو بہت گمراہ کر لیتے ہیں۔ کسی شخص کا مطالعہ اور مشاہدہ اس بات کی کافی دلیل نہیں ہے کہ وہ موت کا صحیح مفہوم سمجھ سکا ہے۔ اور زندگی کے متعلق کوئی صحیح رائے بھی قائم کرسکا ہے۔ "عمر خیام" سے لیکر تھامس کارلائل اور "والٹ وٹ مین" تک کا ادبی مواد اس موضوع پر ہمیں تو محض ایک کوشش سی ہی نظر آتی ہے۔ ہمارے محترم شعرا نے بھی اپنی تخیل کی انتہائی باریکیوں سے کام لیکر یہ سمجھانا چاہا ہے۔ کہ زندگی محض بھاپ سی کوئی شے ہے اور اسکی سراب سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں۔ اور وہ اسی صنف اور مادہ سے تعلق رکھتی ہے۔ کہ جس سے خواب جیسی بے حقیقت چیز کی تخلیق ہوئی ہے۔ اتنی وضاحت کے بعد میں یہ کہنے کیلئے تیار ہوں، کہ ہم نے لفظ زندگی کو سمجھانے کے لئے اس کے ساتھ سینکڑوں طریقوں اور پہلوؤں سے کھیل کھیلا ہے۔ حتی کہ ہماری طاقت ہمیں جواب تک دیدیا....

.... اصل میں "غم" اور "مسرت" ایک ہی چیز کے دو نام ہیں، اور اسی کا نام زندگی ہے۔ دنیا میں انسان کی زندگی کے ایام محدود ہیں۔ اور ان چند ایام میں اس کے فرائض کی فہرست بڑی طویل ہے۔ اگر وہ اپنا یہ مختصر عرصۂ حیات نام و نمود اور اپنی ذاتی حفاظت میں ہی گزار دے۔ تو کیا فرائض کی انجام دہی میں یہ کوتاہی نہ ہوگی؟ یہی وہ نقطہ ہے کہ جس کے تحت میں انسان ایک تنکے کے لئے بھی اپنی جان کو خطرہ میں ڈالنا گوارا کرلیتا ہے۔ جہاں تک زندگی سے محبت کرنے کا اور زندہ رہنے کی تمنا کا تعلق ہے۔ تو وہ جس صورت سے ایک بہت ہی محتاط اور دور اندیش شخص میں پائی جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح وہ الپائن پہاڑ کی چوٹی پر رسی کے ذریعہ چڑھنے والے مزدور اور میدان جنگ میں بہادر سپاہی کے قلب میں بھی موجزن ہوتی ہے۔

اس سکے کے روشن اور تاریک دونوں پہلو معزز قارئین کے سامنے پیش کئے جا چکے ہیں۔ جہاں مذہبی پیشوایان اعظم نے زندگی کی منزل کو نہایت درجہ پرہیزگاری اور احتیاط کے ساتھ طے کرنے کے لئے ہدایت کی ہیں وہاں بہت سے برگشتہ لوگوں نے اپنی جولانیوں اور رنگ رلیوں کے تحت اس عرصۂ حیات کو بہت مختصر بھی قرار دیا ہے۔ دراصل واقعہ یہ ہے۔ کہ ہم اپنی زندگی کی دلچسپیوں اور رنگینیوں میں کچھ اس طور سے گھرے رہتے ہیں، کہ موت کا خیال بھی اپنے ذہن میں لانا باعث حماقت سمجھتے ہیں۔ ہم زندگی کے اس مختصر زمانے کو ہرگز کسی اعتدال اور احتیاط کے ساتھ گزارنا گوارا نہیں کرتے بلکہ کامل عیش و نشاط اور بے انتہا بے پروائی ہمارا مطمح نظر بن جاتا ہے۔ ایسی صورت میں غریب انسان پر الزام رکھنا انصاف کا خون کرنا نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ جب اسے ایک پل کے لئے بھی اپنی زندگی کا یقین نہیں تو آخر وہ ان لمحات کو کیوں نہ مسرت و شادمانی اور کامل بے فکری سے گزار دے؟

ہم سب احساسات وتصورات کی قدر بہ قدر امکان تو ضرور کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم صرف احساسات وتصورات پر ہی اپنی زندگی کی بنیاد سمجھ لیں، تو یہ کے لئے تو بس وہی وقت موزوں ہو سکتا ہے کہ جب ہمارے سروں کے بال نہ صرف گر گئے ہوں۔ بلکہ ضعیفی اور کمزوری کیوجہ سے ہمارا سر بالوں کے بار کو برداشت بھی نہ کر سکتا ہو اور ساتھ ہی ہماری عقل وفہم میں بھی نقص واقع ہوگیا ہو۔ اس زندگی کو کسی نے جہاں ایک تاریک غار سے تشبیہ دی ہے وہاں کسی نے اسکو ایک مدرسہ بھی قرار دیا ہے۔ جہاں مرنے کے بعد شروع ہونے والی حقیقی زندگی کے لئے تیاریاں کرنی پڑتی ہیں۔ اور بہت سے تو نہ صرف موت کے بعد شروع ہونے والی زندگی، بلکہ مذہب اور خدا کے وجود کے بھی قائل نہیں۔ ایسے لوگ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ ڈھکوسلہ ہے اور اس مذہب اور اس خدائی وجود کی کوئی اہمیت اور اصلیت نہیں۔ بعض کھاؤ پیو اور خوش رہو میں زندگی کے راز کو مضمر پاتے ہیں۔ اور پھر بعض ایسے بھی ہیں۔ جو کامل احتیاط، پرہیزگاری، عاقبت اندیشی اور نفس کشی میں زندگی کا مزہ پاتے ہیں لوگوں کی زندگی کے متعلق ان مختلف آراء سے اگر کوئی ممکن اور مناسب نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ تو وہ صرف یہ ہے کہ انسان کو بغیر موت سے ڈرے زندگی کی تگ ودو میں پوری یکسوئی اور زندہ دلی کے ساتھ حصّہ لینا چاہیئے۔ اور پوری ہوشمندی کے ساتھ اس کو اپنے فرائض منصبی ادا کرتے رہنا چاہیئے۔ "ڈاکٹر سیموئیل جانسن" سے زیادہ کون "موت" کے نام سے ڈرتا ہوگا لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں۔ کہ باوجود خوف وہراس کے وہ زندگی کے متعلق کیسے خوشگوار خیالات رکھتا تھا۔ اور اس نے "زندگی اور زندہ دلی" کا کیسا صحیح نمونہ پیش کیا ہے۔ ہرچند وہ ضعیفی میں قدم رکھ چکا تھا لیکن اس نے پہاڑوں کے سفر سے بھی ہمت نہیں ہاری تھی...... انسانی اوصاف میں جو درجہ ہمت وجرات اور عقل کو حاصل ہے۔ وہ اظہر من الشمس ہے۔ اسی بنا پر ہماری عقل وفہم کا یہ تقاضا ہونا چاہیئے کہ ہم اپنی زندگی کے حالات کی اہمیت کا صحیح طور سے احساس کریں اور ہماری جرأت وہمت کا بھی یہی نتیجہ نکلنا چاہیئے، کہ ہم فرض اور حق کے لئے ضمیر کی آواز پر لبیک کہیں۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ زندگی بھی بس اسی کا نام ہے۔ اس دنیا کی زمین پر بسنے کے لئے اصلی انسان کو حق حاصل ہے کہ جو عزم واستقلال کا مالک ہو مستقبل کے متعلق خیالی پلاؤ نہ پکاتا ہو، اور ماضی کی ناکامیوں کے احساس سے اپنے آپ کو ہر وقت مضمحل اور پژمردہ نہ رکھتا ہو۔ کچھ ایسا ہی شخص جہاں اپنی ذات خاص کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ وہاں ایک مخلص دوست اور محب وطن کہلائے جانے کا بھی دعویٰ کر سکتا ہے۔ ڈرپوک اور کمزور طبیعت کے انسان سے ہمدردی اور ایثار کے جذبات کی توقع رکھنا عین حماقت ہے۔ ایک محتاط اور گوشہ نشین شخص جو اپنی صحت وتندرستی کی حفاظت کو ہی بس اپنا ایمان سمجھتا ہو اس سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ کہ وہ دوسروں کی مشکلات اور مصیبتوں میں ہمدردی سے کام لے گا۔ جس دل ودماغ میں خود غرضی اور خود پرستی کارفرما ہو۔ اس سے فیاضی اور رفاہ عام کے کاموں کی انجام دہی کی توقع رکھنا کہاں تک مناسب ہے۔ ایسا خود پرست شخص ایک ایسی روحانی خلش میں مبتلا رہتا ہے۔ جسمیں خوف وہراس کا پہلو نمایاں طور سے نظر آتا ہے۔ وہ صرف اپنی ذات سے متعلق حفاظت کے خیال میں اسقدر محو رہنے لگتا ہے کہ دنیا کی زمین پر بسنے والے اس کے ہم جنسوں کی آواز گویا اس کے لئے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی۔ اور وہ اس قدر بے حس بھی ہو جاتا ہے۔ کہ کسی کی مصیبت وراحت سے کوئی اثر لینا اس کے نزدیک کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ ضرورت سے زیادہ پرہیز اور احتیاط ایک انسان کو یقیناً سخت دل بنا دیتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ ایک خود پرست شخص زندگی کبھی کوئی مفید کام خلق خدا کے لئے نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ ہر چیز کو بے انتہا شک وشبہ کے ساتھ دیکھنے کا عادی ہے۔ اس کے بالکل برعکس وہ شخص جو نڈر اور بیباک ہوتا ہے۔ وہ ہر حالت میں متاثر بھی ہوتا ہے۔ اور اپنی زندگی کو فرض اور حق کی حمایت میں استعمال کرنے کا آرزومند بھی نظر آتا ہے۔ وہ زندگی کو بالکل دوسری ہی نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ حق کے لئے فرائض کی انجام دہی میں ہی اپنے ایمان کا راز سمجھتا ہے وہ حق

کی خاطر مشکلات اور دقتوں کے طوفان کو خاطر میں لانا، انسان کی فطرت کے عین خلاف سمجھتا ہے۔ موت اس کے سر پر منڈلاتی رہتی ہے۔ لیکن اس کے ذہن میں صرف ایک خیال ہوتا ہے۔ اور اس کے قلب میں ایک تمنا ہوتی ہے اور یہ دونوں صرف حق کی خاطر فرض کی انجام دہی سے متعلق ہوتے ہیں۔ ایک نڈر اور بے باک شخص کے احباب اور اعزا، اپنی جگہ پر تعجب کرتے ہیں اس کے اقدام کو خلاف مصلحت بھی ٹھہراتے ہیں۔ بہت سے احتیاط اور دور اندیشی کے تحت میں اس کو سمجھاتے بھی ہیں۔ اور بعض اس کے سامنے اس کے اقدام سے متعلقہ مشکلات کا ذکر بھی کرتے ہیں لیکن کیا وہ صاحب دل، اور باہمت کہیں بڑھائے ہوئے قدم کو پیچھے ہٹانے والا ہے؟ زندگی کے کچھ ایسے صحیح نظریہ نے بہادر نیلسن سے دریائے نیل کی مشہور تاریخی لڑائی میں "تخت یا تختہ" کے الفاظ اکہلوائے تھے ذرا انصاف تو کیجئے۔ کہ اگر زندگی اس کا نام نہیں ہے تو اور پھر کس کا ہے؟ یقیناً نیلسن کے یہ الفاظ دوسروں میں زندگی کا صحیح جوش پیدا کرنے کے لئے بہت کافی ہیں۔ ذرا غور تو فرمائیے کہ زندگی کا صحیح مقصد کس حد تک ان الفاظ میں پوشیدہ ہے۔

کہا جا چکا ہے کہ عزم و استقلال زندگی کا دوسرا نام ہے یہ عزم و استقلال کا ہی شاندار نتیجہ تھا۔ کہ ڈاکٹر جانسن "لغت" جیسی ضخیم کتاب کو شروع کر کے ختم کر سکا، ورنہ اگر وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے اندر کم ہمتی پیدا ہونے دیتا، تو بہت ممکن تھا کہ وہ دو پیسہ کا ایک کارڈ بھی لکھ کر ختم نہ کر سکتا۔

اسقدر طویل بحث کے بعد بھی موت "اور حیات" کے الفاظ اپنی جگہ پر جس طور سے شرمندۂ معنی ہیں۔ وہ ایک حقیقت ہے۔ مجھے تو یہ سب کچھ، ایک کھیل سا معلوم ہوتا ہے۔ جو ۔ ۔ ۔ ۔ اب تک ان الفاظ کے ساتھ کھیلا گیا ہے۔ ہاں انصاف طلب ذہنوں سے اتنی توقع ضرور کی جا سکتی ہے۔ کہ وہ اپنے لئے کوئی صحیح راستہ ضرور تلاش کر لیں گے۔ آپ ہی بتائیے۔ کہ زندگی کی تمام مسرتوں، اور رنگینیوں کو ترک کر کے کامل احتیاط اور خود غرضی کی زندگی بسر کرنا اگر زندہ در گور ہونا نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ کیا آپ کو اس کے ماننے میں کچھ تامل ہے۔ کہ زندگی بغیر بلند حوصلگی اور زندہ دلی کے فی الحقیقت موت کا دوسرا نام ہے؟ . . . . ہرگز ضروری نہیں کہ کسی کام کی تکمیل پر ہی کام کرنے والے کی عزت و منزلت کا انحصار ہو بلکہ اس کا اس کام کو پورے انہماک اور جوش سے شروع کر دینا ہی اس کے لئے یقیناً باعث فخر ہے۔ انسانی دنیا کبھی اس شخص کو فراموش کر دینے کی ہمت نہیں کر سکتی۔ کہ جس نے خلق خدا کے لئے ایک مفید کام شروع کیا تھا لیکن عین اسوقت کہ جب وہ اپنے لگائے ہوئے پودوں کے پھل کھاتا، اسے موت کے آہنی پنجہ نے آدبایا۔ ایک انسان تو وہ ہے۔ جو زندگی کی منزل کو متلاطم دریا کی مانند طے کر رہا ہے۔ اور دوسرا وہ ہے۔ جو کیچڑ اور دلدل سے بھرے ہوئے نالے کے مانند قدم قدم پر احتیاط اور دور اندیشی سے کام لے رہا ہے۔ دو طرح کی زندگیاں آپ کی آنکھوں کے سامنے ہیں۔ ان میں سے اول الذکر کو منتخب کرنا، آپ کی جرأت و ہمت کی دلیل ہے میرا اعتقاد ہے۔ کہ جب یونانیوں نے اس مسئلہ پر اپنا خیال ظاہر کیا تھا۔ کہ "وہ جو خدا کو پیارے ہوتے ہیں، کم سنی ہی میں مر جاتے ہیں" تو انکی نگاہ میں ایک معروف کار شخص کی یکایک ختم ہو جانیوالی زندگی بھی ضرور ہوگی میرا خیال ہے۔ کہ انسان کتنی ہی عمر میں کیوں نہ مرے لیکن اگر وہ کسی بہتر و برتر فرض کی انجام دہی میں یکایک مر گیا ہے۔ تو اس کی زیادہ عمر کی موت بھی عین شباب کی موت سے کسی طرح کم نہیں حقیقت یہ ہے۔ کہ زندگی کی دوڑ میں ایک بے نیاز اور زندہ دل شخص ہی کچھ مفید کام کر سکتا ہے۔ اور مرنے کے بعد بھی ایسے ہی شخص کی روح کو ابدی سکون حاصل ہونے کا امکان ہے۔ ایک معمار اپنے کام میں پورے انہماک سے مصروف ہے۔ اس کے آلات کے استعمال سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی، اور اسی دوران میں وہ یکایک جاتا ہے۔ اسی طرح جنگ کا میدان گرم ہے اور بہادر سپاہی نہایت جوانمردی سے دشمن پر حملہ کر رہا ہے۔ بگل کی آواز کان کے پردے پھاڑ رہی ہے۔ اور اسی دوران میں بہادر سپاہی لڑائی میں کام آگیا ہے۔ کیا آپ بلند آواز سے یہ اعلان نہیں فرما سکتے۔ کہ

ان دونوں کو حیاتِ ابدی حاصل ہوئی۔ اور حوروں نے ان کا خیر مقدم کیا —— یقیناً زندگی فرض کی انجام دہی میں جان کھو دینے کا نام ہے۔ ہوسناکیوں اور خود پسندیوں سے بھری ہوئی زندگی یقیناً انسانیت کے نام پر ایک نہ مٹنے والا دھبہ ہے۔

یہ جہاں دار العمل ہے چین دم بھر بھی نہ لے
دیکھنا ہے گر تجھے اپنی بہارِ زندگی (رسالہ نوری)

جناب سید شریف حسین صاحب انور گیلانی

غزل

جوانی، محبت، محبت، جوانی! اِنہیں دو پہ ہے منحصر زندگانی
محبت میں اک کیف ہے جاودانی ہر اک شے نظر آ رہی ہے سہانی
تری یاد سے ہے مرے دل کو فرحت تری دید سے ہے مری زندگانی
ہر اک شے میں جلوہ ترا دیکھتا ہوں یہ سب ہے مرے عشق کی کامرانی
محبت میں خونِ جگر پی رہا ہوں اسی میں ہے پوشیدہ کیفِ جوانی
بڑھا دے مرے دردِ دل کو بڑھا دے اسی درد میں ہے۔ مری زندگانی
مجھے خوابِ رنگیں نظر آ رہے ہیں "جوانی کی راتیں ہیں کتنی سہانی"
لبوں پر تبسم جوانی ہے اُن کی مگر اشک آنکھوں میں میری جوانی
اگر وہ مرے پاس آ جائیں انور
سُناؤں انہیں دردِ دل کی کہانی

نوشتہ وکٹر ہیوگو (فرانسیسی مصنف)

مترجمہ محترمہ انوری خانم تائب صاحبہ تنویر بمبئی

میرئن ڈیلارمے

یہ رومانی ڈراما ۱۸۲۹ء میں لکھا گیا لیکن شہنشاہ چارلس دہم کے فرمان امتناعی کے تحت اسے اشاعت و تمثیل کا لائسنس دینے سے انکار کردیا گیا۔ اس معاندانہ فرمان کی وجہ یہ تھی کہ وکٹر ہیوگو نے اس میں لوئی سیزدہم کی ابتر اور زبوں حالت کی پست کن تصویر پیش کی تھی۔ اس فرانسیسی تاجدار کے عہد میں میرین ڈیلارمے اپنی شاندار یادگار زندگی کے نصف النہار پر تھی۔ تاہم ڈراما ۱۸۳۱ء میں انقلاب کے بعد اسٹیج پر آیا۔ فن اسٹیج جس استادانہ کفایت کا ثبوت اس کی تسوید میں دیا گیا ہے اس نے ہیوگو کی سحر طرازی قلم کو حسن الکلام کا مقام دے دیا ہے۔ یہ فرانسیسی نپولین ادب محفل ڈراما نگاران میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ وہ حقیقتاً ایک شاعر ہے۔ جسے ایک نادر تخیل و تغزل ودیعت ہوا ہے۔ لیکن ادب اسٹیج اس کے جوہر شعری کی ایک آورد ہے جس کی کامیابی نے اس میں انداز کی شان پیدا کردی ہے ——— زیر ذکر ڈرامے کا ترجمہ پیرایہ اصل فرانسیسی متن سے تیار کیا گیا ہے۔

اشخاص ڈراما

میرین ڈیلارمے	کاشی ڈی گیسی	نقیب شہر
دیدیر	بریشانتو	محافظ
شہنشاہ لوئی سیزدہم	لی انجیلی (مسخرہ)	دو کاریگر
مارکوس ڈی سیونی	روشبیرن	سپاہی، حکام
مارکوس ڈی نگی	نفیا	عام لوگوں کا ایک ہجوم

پہلا ایکٹ

منظر (قصبہ بلآ کی ایک سڑک۔ زمانہ ۱۶۳۸ء۔ کچھ افسر سرائے کے باہر کی نیم روشنی و نیم تاریکی میں بیٹھے ہوئے گپ زنی، تمباکو نوشی، اور شراب نوشی میں مشغول ہیں۔ ناگہاں وہ استادہ ہو جاتے ہیں اور کاشی ڈی گیسی کا استقبال کرتے ہیں۔)

بریشانتو:- آپ بلآ میں غالباً رجمنٹ میں داخل ہونے کے لئے آرہے ہیں؛ ہم سب آپ سے اظہار تعزیت کرتے ہیں۔!

ہاں یہ فرمایئے پیرس کی کیا خبر ہے؟

گیسی:- ڈویل (رقیبانہ مبارزت) کا موقع پھر پیدا ہو گیا ہے کارڈینل ریشیلیو پھر عالم جلال میں ہیں!

روشبیرن:- خوب! یہ بھی کوئی خبر ہے؟ ابھی ڈویل تو ہم یہاں آئے دن لڑا کرتے ہیں! آخر وقت گزاری کے لئے کوئی شغل تو ہونا چاہیئے!

گیسی:- اچھا تو اب ایک تازہ بتازہ نو بنو خبر سنو: میرین ڈیلارمے کہیں روپوش ہو گئی ہے! غور کیجئے۔ اس واقعہ کی پُر اسراری

اُن بوالہوسی پر!

برلشیانتو:۔ اچھا ہمیں اس نادر مصرع طرح پر گرہ لگا دینے دیجئے۔ میرنؔ یہاں موجود ہے:

گیسی: یہاں موجود ہے؟! بلا سے میں، نہیں آپ مذاق کر رہے ہیں میرنؔ، وہ مہتاب جمال اور اس کو روہ کے گہن رہا!!

برلشیانتو:۔ گزشتہ شب کا واقعہ ہے کہ سیورنی پر مجرموں کی ایک ٹولی نے حملہ کیا۔ وہ اسے مار ہی ڈالتے، کہ ایک شخص مردِ غیب بنکر ظاہر ہوا، اور اس نے حملہ آوروں کو مار بھگایا! پھر وہ ہمارے دوست کو اک مکان کی پناہ گاہ میں لے آیا!

گیسی:۔ لیکن میرنؔ ڈیلا رمے!

برلشیانتو:۔ یہ پناہ گاہ میرنؔ ہی کا کاشانۂ حسن تو تھی!...... سیورنی کی جان بچانیوالا وہی نوجوان تھا۔ جس کو یہ جانِ حسن اپنی جان بنائے ہوئے ہے!

روشبیرن:۔ یہ کس قسم کا آدمی ہے؟!

برلشیانتو:۔ یہ سیورنی سے پوچھئے

نقیب شہر:۔ (ایک متعاقب انبوہِ عوام کی سرکردگی میں) فرمان!
جلالۃ الملک لوئی سیزدہم بافضائل الٰہی شہنشاہ فرانس و نوارے بتخاطب جملہ اشخاص متعلقہ! ما بدولت کا یہ فرمان ہے کہ آئندہ سے تمام لوگ عام اس سے کہ وہ عوام ہوں یا امرائے عظام جو ڈیویل لڑکر قانون شکنی کے مرتکب ہونگے پھر خواہ انہیں کا ایک فریق جانبر ہو یا دونوں زندہ رہیں، وہ تختۂ دار پر لٹکا دیئے جائیں گے۔ تاآنکہ وہ قیدِ حیات سے آزاد ہو جائیں! یہ ہے اینجانب کا منشائے ہمایونی!

گیسی:۔ ہمیں لٹکا دیا جائے گا؟ ہم امراء کو! عوام کالانعام کی طرح! ڈاکوؤں اور چوروں کیطرح۔

(شہر کے دو حکام سرکاری فرمان سلطانی کو ایک دیوار پر چسپاں کرتے ہیں، جس کے بعد نقیب شہر مع ہجوم عوام کے رخصت ہو جاتا ہے۔ سڑک تاریک ہونے لگتی ہے۔ سیورنی منظر پر نمودار ہوتا ہے:)

سیورنی:۔ حسین میرنؔ اپنا کاشانہ چھوڑ گئی! وہ طائرۂ پرستان اپنا قفس ویران کر گئی! آہ! میں اسے کہاں پاؤں:

اُس کی حسرت ہے جسے دل سے بھلا بھی نہ سکوں
ڈھونڈنے اس کو چلا ہوں جسے پا بھی نہ سکوں

گیسی:۔ کچھ یہ معلوم ہے کہ یہ آدمی کس رنگ ڈھنگ کا تھا؟

سیورنی:۔ کچھ نہیں بتا سکتا! مکان میں داخل ہونے پر میں نے شیریں میرنؔ کو پہچان لیا۔ اور اس سے راہِ سخن کھولی! لیکن قبل اس کے کہ میں مڑوں اور اس شخص کا شکریہ ادا کروں، جس نے مجھے از سرِ نو زندگی بخشی تھی، اس نے شمع گل کر دی! میں معاً پیچھے ہٹا، یہ دیکھ کر کہ اس حریم جمال میں نہیں، شاید ایک حلقہ بیرونِ در ہوں! آہ جو کچھ مجھ محرومِ قسمت کا مفلسانہ علم اس بارے میں ہے، وہ اتنا ہی ہے کہ تقدیر کے اس منظورِ نظر کا نام نامی دیدنیر ہے!

روشبیرن:۔ مجھے اس نام نامی سے بازاری بدنامی کی بو آتی ہے! غالباً یہ کوئی کم نسب آدمی ہے! اس حقیر تلفظ نام کا شخص، اور میرنؔ کو اڑا لے جائے؟ ع

پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے!

آہ میرنؔ! وہ ابنۃ الجمال اور ایک ایسے عفریت کا جنجال! ایسی ناز آفریں اور عشق نواز، اور ایسے کرگس کے ساتھ صرفِ پرواز!

سیورنی:۔ آہ روشبیرن! ممکن ہے ایسے لوگ موجود ہوں جو اس کے خاکسارانہ نام کے مقابلے میں بڑے بڑے بلند بانگ اسمائے گرامی و القاب سامی رکھتے ہوں! لیکن ناممکن ہے، کہ اسکا سا دل و جگر رکھتے ہوں! ذرا غور کرو، میرنؔ کی آغوش طلائی سے جست کرنا، اور ایک اجنبی شخص کی جان بچانے کے لئے جنگلی وحوش سے دست و گریباں ہو جانا! ـــ کتنی رستمانہ بات ہے! میں دیدنیر کا اتنا زیر بار احسان ہوں کہ اپنے سارے خون سے بھی اس کا بدل نہیں کر سکتا۔ اے کاش کہ مجھ سے پیمان دوستی باندھ لے!

(لی انجیلی ہو، بازی مسخرہ، ایک مکروہ صورت کی مخلوق آتا ہے اور حلقۂ مال میں بیٹھ جاتا ہے اس کے پیچھے پیچھے ایک

طویل القامت، زرد رو، خوش پیکر نوجوان ہے۔ یہ ویدیری)

ویدیرو:۔ مارکوس آف سیورنی! —— ہاں یہ سفلہ اپنے کو اسی لقب سے ملقب کرتا تھا! اللہ اللہ وہ بے ادبانہ اور بے تکلفانہ انداز جس سے وہ میرئن سے باتیں کرتا تھا۔ پھر اسی عجیب مخلقت سیدان کی تیاں نے بھی جان بچائی! اگر یہ حضرت پھر کبھی مجھے ملیں تو ——

گیسی:۔ سیورنی!

ویدیرو:۔ ہاں یہی ہے میرا بدخو، غلط رعب رقیب!

گیسی:۔ آپ نے ڈیول لڑنے کے خلاف تازہ اجراء فرمان شاہی دیکھا ہے؟ —— جس میں قانون شکنی کی پاداش پھانسی بتائی گئی ہے!

سیورنی:۔ پھانسی! پھانسی کا پھندا! اور شرفاء و امراء کے گلوئے محترم کیلئے! تم یقیناً مذاق کر رہے ہو! یہ اہانت انگیز سزا صرف ذلیل غلاموں کیلئے ہے!

بریشیانتو:۔ اچھا آئیے، اسی فرمان کو سڑک کی لالٹین کی روشنی میں پڑھئے۔

سیورنی (اس بات پر بے لطف ہوتے ہوئے کہ ویدیرا اس کو مسلسل گھور رہا ہے) اے زرد رو مردک، جا اور فرمان کو پڑھ کر مجھے سنا!

ویدیرا:۔ میں!

سیورنی:۔ ہاں تو!

ویدیر:۔ سنئے! یہ ایک فرمان ہے۔ جو یہ وعید سناتا ہے کہ تمام بڑے امراء کا تنقیہ دماغ تازیانہ زنی سے کیا جائے!... اچھا اب آپ کی فرمائش میں نے پوری کر دی۔ کیا میں اس کا تھوڑا سا معاوضہ طلب کر سکتا ہوں؟ بس اتنا کہ آپ میرے پیام مبارزت کو قبول فرمائیں!

سیورنی:۔ یقیناً، یقیناً! تم کس جگہ لڑنا چاہتے ہو؟

ویدیر:۔ یہیں میداں، یہیں چوگاں، یہیں گوئے! —— اچھا مجھے کوئی اپنی تلوار عاریتہً دیگا؟

لی اینجیلی:۔ میرے دوست! اس وحشیانہ حماقت کے لئے تو ایک احمق کی تلوار ہی لیجئے! اور اس کے بدلے میں میرے حق میں اس بستی کے ایک ٹکڑے کی وصیت کر جائیے جس سے آنجناب کی پھانسی کا پھندا بنے گا! شگون نیک کے طور پرانی رسم ضرور معلوم ہوتی ہے!

ویدیرا:۔ (شمشیر بدست ہوکر) اچھا مارکوس صاحب!

سیورنی:۔ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی!

ویدیرا:۔ ہوشیار، خبردار!

(جونہی دونوں حریفوں کی تلواریں اپنے اولیں تصادم سے جھنکار پیدا کرتی ہیں، میرئن دریچے سے نمودار ہوتی ہے)

میرئن:۔ (ویدیر کو حملہ آور دیکھتے ہوئے) ٹھہرو، ٹھہرو! ارے کوئی دوڑو! کوئی مدد کو پہنچو!!

(خاتون کی دہائی پر شہری گارڈ موقع واردات پر آن موجود ہوتا ہے!)

سرہنگ سپاہیاں:۔ ڈال دو اپنی تلواریں! ایں! ڈیول بازی اور فرمان شاہی کے عین چسپاں ہونے کے موقعے پر! نادانو! تمہاری موت کا فیصلہ ہو چکا۔ میں تمہارے پیکروں کو دو لاشوں کی صورت میں دیکھتا ہوں!!

(ویدیرا اور سیورنی غیر مسلح کر دیئے جاتے ہیں اور گارڈ کی حراست میں حوالات لیجائے جاتے ہیں!)

میرئن:۔ اس غریب نے کیا کیا جو ——

(لی اینجیلی فرمان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جسے وہ پڑھتے ہیں)

آہ! میں نے صدائے المدد بلند کی تھی! میری پکار پر کیا "موت" نے لبیک کہی؟ آہ! کیا اس کی رہائی کی اب کوئی صورت نہیں؟ کیا اب وہ کسی طرح جائز نہیں کیا جا سکتا.... مگر نہیں، بادشاہ سلامت دل سے بہت رحیم واقع ہوئے ہیں! وہ ضرور جاں بخشی فرما دیں گے!

لی اینجیلی:۔ مگر ریورنیڈ ریشیلیو جان نہ چھوڑیں گے: وہ خون آشام

کا تشنہ ہے! خون آشام پادری خونریزی کے کسی موقع کو ہاتھ سے نہ دے گا۔ اس کے لئے۔ ع

لبیر تقاضہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

میریٹن :۔ تم مجھے ذرا بتلاؤ کہ کون آئے، ہو تم کیا بلا؟

لی اینجیلی :۔ دربار کا ظریف!

میریٹن :۔ آہ ویدیئر! اگر ایک عورت کا دست نازک کسی بندہ کے گلو کو کاٹ سکتا ہے۔ تو وہ دست نازک وہ ہوگا جو میری کلائی سے جڑا ہوا ہے!

(رخصت ہو جاتی ہے!)

لی اینجیلی :۔ (جو تلوار اس نے ویدیئر کو دی تھی، اسے اٹھاتے ہوئے) ہا! ہا! ہا! — آج رات کو تو حماقت کا پارٹ کم از کم میں نے نہیں کھیلا!

دوسرا ایکٹ

منظر :۔ (قیصر شیمو ما کا ایک ہال شہنشاہ لوئی سیزدہم ایک سفید مو ضعیف العقل آدمی، شہ نشین پر بیٹھا ہے، رنگ زرد ہے، چہرہ فق ہے۔ دل میں قلق ہے۔ لی اینجیلی دربار کا مسخرہ پاس ہی استادہ ہے۔)

بادشاہ :۔ آہ! کتنی زار و نزار چیز ہے بادشاہ ہونا بھی! ایسا بادشاہ ہونا، جو تخت شاہی پر نشست تو رکھتا ہے۔ لیکن جس کے ہاتھ میں عصائے شاہی نہیں ہے! مقدس شیطان (ریشیلیو) میرے سارے منظور نظروں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے! مجھے کبھی کبھی خیال آتا ہے، کہ اسے اپنے قبائے سرخ کیلئے شاید انسانی خون تازہ کی ضرورت ہوا کرتی ہے!

لی اینجیلی :۔ یہ سب وہ فرانس کے لئے کرتا ہے، میرے آقا!

بادشاہ :۔ جی "فرانس" کے لئے، اور نیز اپنے "نفس" کے لئے! اف! اس مردود سے مجھے کتنی نفرت ہے! فرانس کے کسی جبار سے جبار شہنشاہ نے بھی کبھی یہ ظلم نہیں کیا ہوگا، جو وہ کر رہا ہے صرف میری زبان کے ایک لفظ کی ضرورت ہے۔ اور اس کی ساری سطوت و جبروت پرکاہ کیطرح اڑ جائے گی! لیکن آہ یہ لات تمکین، سب فریب سادہ دلی ہے: میری یہی فیصلہ کن، بے پناہ زبان خود اس کے ہاتھ میں ہے! ... اچھا خاک بر سر کن غم ایام را! میرے مسخرے آ اور میرا غم غلط کر۔ ع

اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

لی اینجیلی :۔ میرے آقا! کیا "خود قید حیات" اور "بند غم" اصل میں دونوں ایک نہیں ہیں؟

بادشاہ :۔ یقیناً ہیں! — اور آہ انسان کا یہ سارا وجود بھی ایک سایہ سے زیادہ نہیں!

لی اینجیلی :۔ اور بنی آدم میں جس کا نام بادشاہ ہے، وہ دراصل ایک تلخ زندگی کی معراج کا دوسرا نام ہے

بادشاہ :۔ شاہی مسخرے! مجھے کتنی آسودگی ہوتی ہے جب تو یہ نکات بیان کرتا ہے! تو ظرافت اور حکمت کا مجمع البحرین ہے۔ اے کاش کہ تیرے انہیں کلمات معرفت پر میں جاں بحق ہو جاؤں! تختۂ زمین پر تو ہی ایک آدمی ایسا ہے، جس کی گفتگو شائستہ سماعت ہے! مجھے تعجب ہے، کہ اس حکمت و دانش پر تو تاج زیبت کو ٹھکرا کیوں نہیں دیتا۔ اس دربار میں بھلا تیری کیا قدر و قیمت ہے — ایک مسخرہ! ایک کٹھ پتلی! جس سے میں ایک بچے کیطرح کھیلتا ہوں! — ایک مجسمۂ حکمت و فضیلت!

لی اینجیلی :۔ بجا فرماتے ہیں حضور! مگر میری ساری دلچسپی اس زندگی سے اتنی ہی ہے کہ اس مضحک دنیا کا مطالعہ کروں! بلاشبہ میں دربار میں ایک کٹھ پتلی ہوں۔ لیکن اس سے زیادہ قابل عبرت یہ ماجرا ہے، کہ خود ذات شاہانہ جس پادری صاحب کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بنی ہوئی ہے، وہ اس کا کیسا تماشا سر دربار دکھاتے ہیں۔

بادشاہ :۔ کچھ شک نہیں کہ جو کچھ تم کہتے ہو، میں ویسا ہی ہوں —! کاش کہ خود شیطان میرے تقدس مآب امام کلیسا کا منصب جلیل اختیار کر لیتا! شاید میری روح اس کی گرفت میں زیادہ آسودہ ہوتی!

لی اینجیلی:۔ میرا خیال ہے کہ بعینہٖ یہی حادثہ وقوع میں آچکا ہے!

بادشاہ:۔ اس مردود کی گرسنگی خون کا کچھ ٹھکانا ہے! کل وہ ہیوگنوٹس کا سر قلم کر رہا تھا اور آج یہ ڈیول لڑنے والے ہیں جن کے خون کا وہ طالب ہے! ؎

شیر نر لقمہ کردہ درکشید
معدہ اش نعرہ ھل من مزید

(لی اینجیلی ایک اشارہ کرتا ہے۔ اور میرین ڈیلارمے اور مارکوس ڈی سنگی داخل ہوتے ہیں!)

میرین:۔ جان بخشی! بادشاہ سلامت جان بخشی!!

بادشاہ:۔ کس کی؟

میرین:۔ دبدیر کی حضور!

مارکوس سنگی:۔ اور مارکوس آف سیورنی کی بھی۔ اعلیحضرت! دونوں صرف ۲۰۔۲۰ سال کے جوانانِ خام ہیں! بالکل ورد بچے: وہ دونوں کسی بات پر طفلانہ جھگڑ پڑے۔ ۔۔۔ اتنے میں چند جاسوسوں نے جنہیں ریشیلیو نے اس موقع پر تعینات کیا تھا۔

میرین:۔ معاف کر دیجئے میرے بادشاہ! معاف کر دیجئے! کیا حضور کو ان پر رحم نہ آئے گا! دو نوخیز لڑکے۔ ایک بیچگا نہ تو تو میں میں میں گرفتار! ایک بوند لہو کی نہ گری! صرف اتنی سی چھوٹی موٹی بات کیلئے بادشاہ سلامت سیکر دیبر کی جان لیں گے! نہیں نہیں کبھی نہیں!

بادشاہ:۔ (اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے) ریشیلیو کا حکم ہو چکا ہے۔ کہ تمام ڈیول لڑنے والوں کو پھانسی دیجانی چاہیئے اب آپ لوگ میرے لئے دردِ سر بن رہے ہیں! مجھ پر رحم کرو! چلے جاؤ! جیسا ہونا ہے ہوگا! پادری صاحب کا حکم ناطق ہے!

(لی اینجیلی میرین کو اشارہ کرتا ہے۔ کہ وہ پہلو کے تاریک دالان میں چھپکر کھڑی ہو جائے۔ جس کی وہ تعمیل کرتی ہے: مارکوس ڈی سنگی باہر چلا جاتا ہے)

بادشاہ:۔ اچھا ہو کہ وہ نہ آئیں اور مجھے نہ تڑپائیں! ۔۔۔ اچھا لی اینجیلی کچھ انصاف توبہ کی باتیں کرو! ہاں کیا تم اسی فلسفۂ موت ۔۔۔۔ کی بحث کی تکمیل نہ کروگے! یہ ذکرِ موت میرے لئے آلامِ حیات کو کچھ قابلِ برداشت بنا دیتا ہے!

لی اینجیلی:۔ حضور! میں تو اس وقت بندگانِ عالی کو اپنا آخری سلام رخصت کرنے آیا تھا!

بادشاہ:۔ رخصت! تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے! صرف موت تمہاری خدماتِ حسنہ کو مجھ سے منقطع کر سکتی ہے۔

لی اینجیلی:۔ یہی قاطعِ تعلق موت آنحضور اس غلام پر عائد فرماتے ہیں اس طرح کہ ان ڈیول لڑنے والے لڑکوں کو معاف نہیں فرماتے لیکن انکے ساتھ میں بھی اس غیر منسوخ شدنی موت میں شریک ہوں۔ میں نے ہی ان دونوں کو لڑایا تھا۔۔۔ اس لئے کہ میں نے ہی اپنی تلوار دیبر کو مستعار دی تھی!

بادشاہ:۔ آہ میرے درباری احمق۔ تو یہ ظالم تمہاری گردن بھی مار دینگے اچھا الوداع میرے ندیمِ قدیم! زندگی تمہارے بغیر بے لطف ہوگی! اچھا لی اینجیلی! جب تم مرو تو میرے پاس کسی دن آکر مجھے بتانا کہ وارداتِ موت کیا ہوا کرتی ہیں! تمہیں معلوم ہے بعض مرنے والوں کی ارواح اس طرح کبھی کبھی آیا کرتی ہیں ۔۔۔۔ اگر تم سے بھی ہو سکے تو یہ کرنا!

لی اینجیلی:۔ (اپنے سے) کس درجہ خوشگوار فریضہ ہے!

بادشاہ:۔ لیکن اینجیلی نہیں! ایسا نہ کرنا! اگر تمہارا بھوت کبھی آیا تو میرے لئے بڑی دہشت کا باعث ہوگا! بس بہتر یہ ہے کہ تم مرو ہی نا! لیکن آہ اینجیلی یہ موذی ریشیلیو! کیا سچ مچ تمہارا خیال ہے کہ میں امکاناً اس جن پر غالب آسکتا ہوں؟!

لی اینجیلی:۔ میرے آقا! کوشش کیجئے! قسمت آزمائی کیجئے۔

بادشاہ:۔ اچھا مجھے کچھ کاغذ دو!

(لی اینجیلی تعمیل حکم کرتا ہے بادشاہ عجلت اور وحشت کی حالت میں چند الٹے سیدھے الفاظ اس پر لکھتا ہے اور یہ تحریر درباری ظریف کے حوالے کرتا ہے!)

ہو میں نے تم سب کو معاف کر دیا!"

لی ایمیلی:۔ جلدی جلدی میرٹن کے پاس جاکر، لو یہ پروانۂ جاں بخشی شکریہ ادا کرو بادشاہ سلامت کا!

بادشاہ:۔ (میرٹن کو اپنے قدموں میں سربسجود دیکھکر) نہیں نہیں! مجھے ایسا نہ کرنا چاہئے! مہربانی کرکے کاغذ مجھے واپس دیدو! یہ ممکن نہیں ہے! ریشیلیو کا غصہ کون سہے گا؟

میرٹن:۔ ترحم خسروانہ کا فرمان اپنے سینے کے محرم میں چھپاتے ہوئے) میرے آقا! یہ قیمتی پرزۂ تحریر تو آنحضور کو اسوقت واپس مل سکتا ہے جب آپ میرا سینہ چاک کر ڈالئے!

بادشاہ:۔ (میرٹن کے حسن گلوسوز سے اپنی آنکھیں خیرہ پاتے ہوئے اور نظریں نیچی کرکے) اُف! تم کون ساحرہ ہو! میرا دل لرز رہا ہے! اچھا اس کاغذ کو اپنے پاس رکھو اور مجھے اپنی آنکھوں سے پناہ دو! یہاں سے رخصت ہوجؤ!

میرٹن:۔ (دربار سے باہر آکر) ہا! میرا دبدبہ رنج گیا!

بادشاہ:۔ لی ایمیلی! تم نے دیکھا؟ کہ آخرکار میں نے کارڈینل ریشیلیو کو بتلایا کہ فرانس کا فرمانبردار میں ہی ہوں۔

لی ایمیلی: لاریب کہ آپ ہی ہیں جنہوں نے سراسیمگی کیحالت میں ایک غلطی کر ڈالی اور اس غلطی کے پردے میں کم از کم ایک دفعہ صحیح کام انجام دیا!

تیسرا ایکٹ

منظر (قصر بوجنسی کے حصار کے پہلو میں ایک میدان بیرونی دیوار میں ایک بڑا چوڑا رخنہ پیدا کیا گیا ہے! اس خلا میں سے اندرونی قصر کی عمارت نظر آتی ہے۔ دو کاریگر اس مصنوعی پھاٹک پر ایک وسیع و عریض سیاہ پردہ تان رہے ہیں)

ایک کاریگر:۔ اگر ان دونوں شرفا کو بیرونی حصار کے باہر بھی پھانسی دیجانیوالی تھی تب بھی پادری صاحب اس کارروائی کا ملاحظہ بالائے قلعہ سے فرما سکتے تھے۔ اور اس شکست و ریخت کی مطلق ضرورت نہ تھی!

دوسرا کاریگر:۔ ہاں کیا وہ حصار کی بڑی پھاٹک سے نہ آسکتا تھا؟

پہلا کاریگر:۔ کیا کہا؟ ایک گاڑی جس کے اٹھانیوالے چوبیس آدمی ہوں، اسکے لئے وہ پھاٹک کافی گزرگاہ ہوسکتی ہے؟ نہیں میرے بےخبر دوست! تقدس مآب ریشیلیو کا کر و فر اور تزک و احتشام بادشاہوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے! جب کبھی خاص خاص موقعوں پر وہ شہر میں قدم رنجہ فرمایا کرتے ہیں، تو ان کا داخلہ شہنشاہوں اور فاتحوں کیطرح ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ امرا کے محلات کے کسی حصار میں اسی طرح کوئی رخنہ پیدا کیا جاتا ہے جس میں سے ہوکر ان کا مرکب ہمایونی داخلِ شہر ہوا کرتا ہے۔

دوسرا کاریگر:۔ تو گویا اب وہ اس بنائے ہوئے پھاٹک میں سے آئے گا۔ تاکہ ان دونوں جوانوں کی پھانسی کا تماشا دیکھے؟ کیسی مقدس قصابی ہے۔

پہلا کاریگر:۔ اچھا اب آؤ اور اس پھانسی کو دیکھو، جو ہمارے ہاتھوں بنائی گئی ہے!

(کاریگر رخصت ہوتے ہیں، اور اسی وقت میرٹن قصر کے دروازے پر پہنچتی ہے! وہ دستک دیتی ہے۔ لیکن قبل اسکے کہ دروازہ کھلے نعیما، ریشیلیو کا گماشتہ ایک بادپا گھوڑے پر سوار، آن پہنچتا ہے!)

میرٹن:۔ بادشاہ ذیجاہ کی جناب سے حکم!

دربان:۔ اجازت نہیں دیجا سکتی!

نعیما:۔ پادری صاحب کی سرکار سے ایک حکمنامہ!

دربان:۔ بسر و چشم! گزر جائیے!

میرٹن:۔ میرے پاس ترحم خسروانہ کا ایک فرمان ہے!

نعیما:۔ اور میرے ہاتھ میں اس فرمان کی منسوخی کا ایک حکم ناطق! پادری صاحب آج شب کو یہاں نزول اجلال فرمانے والے ہیں، تاکہ پھانسی کو ملاحظہ فرمائیں۔ اس کے لئے ۹ بجے کا وقت مقرر نہیں مقدر ہوچکا ہے!!

میرئن :- آہ! ـــ

قسمت تو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی ہے کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

ہائے تو اب کوئی امید نہیں ؟ میرا ویدیئر مجھ سے بغلگیر ہونے ..... کے بجائے پھانسی کے پھندے سے گلے ملے گا ؟ اُف اُف! میرے اللہ، میرے اللہ!

نعیما :- اب بھی اسکی نجات کی ایک صورت ہے! میں اسے نکل بھاگنے کا موقع دے سکتا ہوں۔ ویدیئر بچ سکتا ہے! بشرطیکہ میرئن تم ـــــ!

میرئن :- نہیں!!

نعیما :- یہ ویدیئر کی زندگی کی نفی ہے!

میرئن :- لیکن اگر اسکی زندگی بچ بھی جائے تب بھی کیا؟ اگر وہ مجھے ملتا ہے تو میں اسے نہیں ملتی! "ایک ٹھوپل جانگسل سکوت" اچھا ویدیئر جئے گا، پھر چاہے ـــ!!

(میرئن نعیما کی معیت میں قصر میں داخل ہوتی ہے: ویدیئر اور نعیما نظر آتے ہیں، جو جیلر اور اس کے گارڈ کی حراست میں ہیں: اب رات ہو گئی ہے!)

جیلر :- (سیورنی سے سرگوشی میں) تم چاہو تو بھاگ ... سکتے ہو! مادکوس آف تنگی نے تمہارے فرار کا سارا بندوبست کر لیا ہے:

سیورنی :- ہم دونوں کا

جیلر :- نہیں صرف تمہارا! دوسری بات مجھ سے نقد جاں طلب کریگی!

سیورنی :- مہربانِ من! جس طرح بنے میرے دوست کو بھی بچایئے

جیلر :- یہ میرے امکان میں نہیں ہے!

سیورنی :- تو مجھے اپنے رفیق کی رفاقت نبھانی ہے (ویدیئر کی طرف مڑ کر) دوست ہم دونوں اس رات ساتھ ساتھ ہی جنت کو چلیں گے!!

ویدیئر :- سیورنی! ذرا دیکھنا غور سے، یہ سامنے میرئن ڈیلارمے ہی ہے؟ تمہیں اپنی عزت کی قسم! مجھے بتاؤ، کیا میرا یہ مشاہدہ صحیح ہے!

سیورنی :- ضرور صحیح ہے۔ لیکن میری سمجھ میں تمہاری یہ کیفیت قلبی نہیں آئی، ویدیئر تمہیں اس بات پر فخر کرنا چاہیئے کہ تم ایک ایسی ملکۂ حسن کے حریم دل کے فاتح ہو

ویدیئر :- لیکن میرا تو یہ بھی خیال تھا کہ وہ جتنی حسین ہے اتنی ہی معصوم بھی ہے۔

سیورنی :- ہاں تو اس میں کوئی شک ہے؟ وہ تمہاری عاشق زار ہے! تمہارے فراق میں یہاں تک آ پہنچی ہے۔ اس کی جب تک جان میں جان ہے، تمہارا بال بیکا نہیں ہو سکتا: تم سچ مچ یک جان دو قالب ہو! تمہارے یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جا نے ہے!

(تاریکی بڑھتی جاتی ہے۔ سیورنی سو جاتا ہے۔ میرئن دروازے سے نکل کر آتی ہے۔ اسکی بغل میں ایک پوٹلی ہے!)

میرئن :- (ویدیئر سے) ادھر دیکھو، جلدی سے یہ کپڑے پہنو، ریشلیو آگیا ہے: سنتے نہیں ان توپوں کو، جو اس کے ورود کے استقبال میں سر ہو رہی ہیں؟!

ویدیئر :- ذرا اپنی آنکھیں اٹھاؤ، اور مجھ سے ملاؤ، مجھے تم نے کس قسم کا آدمی سمجھا ہے؟ احمق یا آبرو باختہ؟

میرئن :- (نہایت دشواری سے ویدیئر سے آنکھیں چار کرتے ہوئے اور سرتا پا لرزہ براندام) میں تم سے محبت کرتی ہوں ویدیئر! اپنی جان سے بھی زیادہ! میں نے کوئی قصور نہیں کیا! مگر اف! تمہاری آنکھیں کتنی بے آبرو ہیں! سنو تو کیا میں وہی تمہاری میری نہیں ہوں؟

ویدیئر :- میری یا میرئن ڈیلارمے؟

میرئن : ویدیئر مجھے معاف کرنا! میں تم سے سب قصہ کہدونگی اگر تمہیں میرا نام یاد رہتا تو مجھے خوف تھا۔ مجھے تمہیں اپنے ہاتھوں سے ویدیئر بنانا تھا! تم نے اپنی محبت سے میری نجات کی تھی، میں نے آرزو کی تھی کہ اپنے سابقہ وجود کے حافظے کے سارے آثار کو منہدم کر دونگی، وہ تمہارے ساتھ ایک بالکل نئی زندگی

شروع کر دی تھی۔ اس لئے کہ آہ میں تم سے محبت کرتی تھی اور آج بھی تم سے محبت کرتی ہوں! میرا عشق تمہارے لئے بہت عمیق ہے۔ دیدیر! ہاں تو پیارے مجھ بتاؤ نہیں تو میں مر جاؤں گی"

دیدیر:- سنو! میں سوال کا یہ سب درد کر میرے لئے یہ معافی! تم نے کس طرح حاصل کیا؟ یہ نجیبا میری گلو خلاصی کرنے کے لئے خود اپنی شہرت یوں خطرے میں لا رہا ہے؟ کیا ماجرا ہے؟

میرئن:- میں بتاؤں گی، میں بتاؤں گی! لیکن ابھی نہیں! پہلی بات یہ ہے کہ فوراً یہاں سے بھاگ چلو۔ بھاگ چلو۔ سنو! وہ لوگ آ رہے ہیں! مجھ نے اور بات کرنے کا موقع نہیں پہلے اپنی جان بچاؤ!

دیدیر:- نہیں! نہ میں حراست گاہ سے بھاگنا چاہتا ہوں، نہ دانگاہِ موت سے نکلنا! خدا کا شکر ہے کہ حسلا و پہلو میں موجود ہے!

(ایک جلاد اپنا تیر لئے، حکام اور سپاہیوں کی ایک جمعیت کے ساتھ نمودار ہوتا ہے!)

میرئن:- (دیدیر کے قدموں میں زمین بوس ہو کر) دیدیر! دیدیر!

ایک افسر:- صاحبان کیا آپ تیار ہیں؟

سیورنی:- کیسی بدتمیزی ہے! ایک میر کے خوابِ راحت میں یہ خلل اندازی؟

جلاد:- معاف فرمائیے! لیکن اس کی تلافی بہت جلد ہو جائیگی وقت آگیا ہے کہ آپ دونوں حضرات کو نہایت پرسکون بستروں پر دراز کر دیا جائے!

سیورنی:- اچھا ہوا دیکھا گیا ہے! بہت خوب! خنجر جلاد پھانسی کے پھندے سے کتنا بہتر ہے

دیدیر:- سیورنی سے بغلگیر ہوتے ہوئے، الوداع اے یارِ زندہ! الوداع۔

میرئن:- (دیدیر سے لپٹ کر) اور مجھے دیدیر! مجھے! تم مجھے خیرباد بھی نہ کہو گے!

دیدیر:- سپاہیوں کی داروگیر میں کشاں کشاں در حالتِ غیظ میں نہیں! تم کو کچھ نہیں! میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے! آہ میری! میری! میں تجھ سے محبت کرتا ہوں! اف میں غلطی پر تھا!

میرئن:- تو مجھے معاف کرتے ہو؟

دیدیر:- میں خود تم سے معافی چاہتا ہوں میری! مجھے یاد رکھنا رخصت میری لاڈلی رخصت!

(سپاہی دیدیر کو باہر گھسیٹتے ہیں)

افسر:- (غش کھاتی ہوئی میرئن کو اپنے ہاتھوں میں سنبھالتے ہوئے) ابھی آخری امید منقطع نہیں ہوئی ہے۔ دیکھو وہ کارڈینل رشلیو صاحب تشریف لا رہے ہیں، ان سے عرض و معروض کرو!

(باہر کے توپخانے کی توپیں سلامی دیتی ہیں! عمارت کے زبردست زینے کا مہیب سیاہ پردہ گرتا ہے! کارڈینل اپنی عظیم و جسیم پالکی کے اندر نمایاں ہوتا ہے جسے چوبیس پیدل سپاہی لا رہے ہیں۔ پالکی کے پردے خونی سرخ ہیں۔ انبوہِ عوام وحشیانہ چیخ رہا ہے۔ لیکن ان کے شور و شیون اور گراں گوش شیطان سیرت پادری کے کانوں کے درمیان بھی سرخ پردے حائل ہیں)

میرئن:- (دوڑ کر پالکی کی طرف۔ پٹ کو ایک تو بچکاں خطرناک پر گھسیٹتی ہوئی) للہ! فی سبیل اللہ میرے مقدس آقا! دیدیر ان دو ناشاد نوجوانوں کو بخش دیجئے

ایک آواز:- (پر پوش پالکی کی اندرونی نشست میں سے) ہرگز نہیں! ہرگز نہیں!!

(پالکی آگے نکل جاتی ہے، ہجوم اس کے پیچھے شور و شور بلند کرتا گزرتا ہے۔ میرئن اکیلی پڑی رہ جاتی ہے! اس پر غشی کا دورہ پڑ جاتا ہے!)

جناب ماہر القادری

کیف و نشاط

ہر سُو نشاط و کیف کا ساماں ہے آجکل — عالم تمام صبحِ بہاراں ہے آجکل
موجِ شراب زیست کا عنواں ہے آجکل — کونین غرقِ مستیٔ عصیاں ہے آجکل
جو بھی شریکِ محفلِ رنداں ہے آجکل — اُس پر نزولِ رحمتِ یزداں ہے آجکل
مستی کا نام جذبۂ عرفاں ہے آجکل — زاہد کو بھی گناہ کا ارماں ہے آجکل
قطرہ میں سلسبیل کی موجوں کا ہے فروغ — ذرہ طلوعِ صبحِ گلستاں ہے آجکل
ظلمت بھی نور و کیف کے سانچے میں ڈھل گئی — جامِ شراب، مہرِ درخشاں ہے آجکل
لطفِ نشاط کم نہیں ہوتا کسی طرح — ٹھہری ہوئی سی گردشِ دوراں ہے آجکل
فردا کی فکر ہے، نہ گزشتہ کا کوئی غم — دستِ جنوں میں ہوش کا داماں ہے آجکل
خود آ رہے ہیں اُن کی طرف سے پیامِ شوق — اپنے کئے پہ حسن پشیماں ہے آجکل
وہ فلسفہ جو فطرتِ انساں پہ بار تھا — شعر و شباب و حسن کا طوفاں ہے آجکل
نہ جانے کس نے چھیڑ دیا زندگی کا ساز — دوشیزۂ بہار بھی رقصاں ہے آجکل
ذرے سنا رہے ہیں محبت کی واردات — تاروں کی روشنی بھی غزلخواں ہے آجکل
ہر سمت ہو رہی ہے تمنا کی روشنی — امید کا چراغ، فروزاں ہے آجکل
ٹھہرا ہوا ہے منزلِ عشرت پہ کارواں — قابو میں میرے عمرِ گریزاں ہے آجکل
کہہ دو غمِ حیات سے فرصت نہیں ملی — اُن کا خیال سلسلہ جنباں ہے آجکل

وہ کیفیت کہ زیست کا حاصل کہیں جسے
ماہرؔ تری نظر سے نمایاں ہے آج کل

جان گالزوردی
(انگریزی افسانہ نگار)

مترجمہ جناب عزیز احمد

کھوئے ہوئے لمحے

مدر (کلیسا کی راہبہ عورت کو مدر کہتے ہیں) مدر اپیاری مدر! وہ رقاصہ بہت رنجیدہ ہے وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑے بیٹھی ہے اور ایک خالی جگہ کو گھور رہی ہے۔ اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ مدر! میں نے اس سے دعا مانگنے کو کہا لیکن افسوس وہ جانتی ہی نہیں کہ کس طرح دعا مانگی جاتی ہے۔ وہ بہت کمزور عقیدہ رکھتی ہے اس نے اپنے جرم کا اقبال کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے وہ بت پرست ہے۔ بالکل کافرہ۔ پکی کافرہ لیکن کوئی اسے ایسے تکلیف اور صبر آزما وقت میں کیا کہہ کے تسکین دے؟ میں نے کوشش کی، کہ وہ اپنی داستان مجھ سے بیان کر دے۔ مگر وہ خاموش بیٹھی رہی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف وہ خالی جگہ کو گھورتی رہی اسے اس حال میں دیکھ کر میرے دل پر ایک چوٹ لگی۔ کیا کوئی اسے مرنے سے پہلے تسکین نہیں دے سکتا؟ ایسی بھری جوانی میں اس عورت کا مرنا ——— ایسی نوجوان اور خوبصورت حسینہ کو گولی مارنا، کسقدر خوفناک اور درد انگیز بات ہے!؟

جب وہ اپنی گفتگو ختم کر چکی، تو مدر نے اپنا ہاتھ اوپر کو اٹھایا اور اپنے سینے پر باندھ لیا اس کی بھوری اور خشک آنکھیں اوپر اٹھیں اور اس نے استفسار انگیز نظروں سے سامنے کھڑی ہوئی سسٹر (کلیسا کی مقدس راہبہ عورت کو اس نام سے موسوم کرتے ہیں) کو دیکھا جس کا چہرہ اس کے نرم اور نازک بالوں میں اترا ہوا دکھائی دے رہا تھا، اور اس کے سامنے سفید کپڑوں میں ملبوس مدر کھڑی کچھ سوچ رہی تھی۔ وہ جاسوس عورت اس کی نگرانی پر مقرر تھی۔ وہ خانہ بدوش قبائل کی نسل کی ایک رقاصہ تھی، جس نے چند اہم رازکی خبریں اپنے فرانسیسی عاشق سے حاصل کر کے جرمن گورنمنٹ کو پہنچائی تھیں وہ گرفتار کر کے یہاں بھیجی گئی۔ تاکہ مرنے سے قبل وہ ان لوگوں میں رہ کر اپنے گناہوں سے توبہ کر سکے۔ اور اپنے ملحدانہ عقائد سے توبہ کرے

وہ پندرہ تاریخ تک کیلئے کلیسا میں بھیجی گئی۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ وہ جیل خانے میں رہنے کے بجائے یہاں رہکر بہتر بن سکتی ہے

ایک عورت کو گولی کا نشانہ بنانا ہے۔ اس خیال ہی سے ایک آدمی کا دل کانپ اٹھتا ہے۔ اور وہ بھی دوران جنگ میں۔ چھوٹی سسٹر کیطرف دیکھ کر مدر بولی: "یہاں میری جگہ کسی کو متعین کر دو میں اس سے ملنا چاہتی ہوں"۔ وہ برآمدے میں سے گزرتے ہوئے خراماں خراماں ایک کمرے میں آئی۔ رقاصہ اپنے پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی، اس کا چہرہ بے رنگ تھا، جہاں خون کا ایک قطرہ بھی نہ تھا۔ اس کا چہرہ بیضوی تھا، مژگانِ چشم اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ اور سیاہ بال کا جوڑا بندھا ہوا تھا، اس کے جذباتی نازک لب سفید تھے۔ جس کے درمیان موتی کیطرح سفید دانت چمک رہے تھے۔ وہ ہاتھ باندھے ہوئے تھی، اس کی آنکھوں میں شراب کا سا خمار تھا۔ اس کی نظریں سلاخ سے دور باہر کے مناظر کا نظارہ کر رہی تھیں۔ جس طرح پنجرے میں بند چیتا حسرت بھری نظروں سے باہر دیکھتا ہے۔ مدر نے کہا: "اے میری بیٹی! ہم تیرے لئے کیا کریں!"

لڑکی نے اپنے جسم کو سکیڑ لیا ——"تم بیکار تکلیف اٹھا رہی ہو!" مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے، کہ تم دعا نہیں مانگتی ہو، بیٹی یہ بہت افسوسناک بات ہے"

رقاصہ مسکرائی، جیسے کسی نے ساز کے تاروں کو چھیڑ دیا ہو۔ لیکن یہ دلفریب مسکراہٹ جلد ہی غائب ہو گئی: "یہاں تمہیں کوئی ایک حرف بھی نہ کہے گا، جس سے تمہیں تکلیف ہو، بلکہ یہاں ہر شخص تم سے ہمدردی رکھتا ہے کیا تم کوئی کتاب پڑھنا چاہتی ہو، یا کیا تم کوئی شراب پینے کی خواہشمند ہو؟ تمہاری جو آرزو ہو بتاؤ، میں اسکی تکمیل کی کوشش کرونگی"

رقاصہ نے اپنے دونوں ہاتھ کھول دیئے، اور پھر ایک شانِ دلربائی

کے ساتھ ان کو گردن پر رکھ لیا۔ یہ لمحہ بھی کتنا رنگین تھا، کس قدر پُرجوش اور جذبات سے بھرا ہوا ـــــ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا تمام جسم حسن اور کیف میں ڈوبا ہوا ہے۔ مدر کے چہرے پر ایک ہلکا سا رنگ آیا، اور وہ بولی "کیا تم...... ہم سب کی خاطر ایکبار ناچ سکتی ہو"

دوبارہ اس کے لبوں پر تبسم کھیلنے لگا۔ جیسے کوئی شرابی پہلا جرعہ پینے کے بعد متبسم ہوتا ہے۔ لیکن اس مرتبہ وہ دیر پا رہا، اور اس نے کہا "ضرور بصد شوق میں تمہارے لئے ضرور ناچوں گی، خاتون مجھے اس میں خوشی ہوگی"۔ "بہت بہتر تمہارے کپڑے آج ہی یہاں بھیج دیئے جائیں گے۔ آج رات کھانے کے بعد کمرے میں ڈنر کے بعد ـــــ اور اگر تم پسند کرو تو ایک پیانو کا بھی انتظام کیا جائے سسٹر مڈیلا بہت اچھا بجاتی اور گاتی ہے ۔ ہاں گانا بھی اچھا گانے گی ـــــ" خاتون کیا میں یہاں سگریٹ پی سکتی ہوں۔" "شوق سے میری بیٹی! میں تمہارے لئے ابھی سگریٹ بھجواتی ہوں"

رقاصہ نے انگڑائی لینے کے لئے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے جس سے اس کے خوبصورت حسین بازو عریاں ہو گئے۔ اور مدر نے اپنے دل میں کہا "افسوس یہ دلکش اور بلوریں بازو کل سرد ہو جائیں گے۔ اکثر لوگ تمام دن ان کا ناچ دیکھنے کے لئے بیچینی سے منتظر رہے۔ بعضوں کو اپنے گزشتہ بھولے ہوئے واقعات یاد آرہے تھے۔ ایسے ڈرامائی تحیر خیز واقعات جو ان کی رُوح کو اس مقدس مقام سے کہیں اور لئے جا رہے تھے۔

آخر کار کھانا ختم ہوا۔ تمام میزیں اٹھا دی گئیں، کمرہ آئینہ کیطرح صاف کیا گیا۔ ایک پیانو لاکر رکھا گیا۔ اور بنچوں کی قطار لگا دی گئی۔ سالٹھ بھورے رنگ والی سسٹریں را ہبہ عورتیں، بنچوں پر آکر بیٹھ گئیں اور پیانو پر سسٹر مڈیلا۔ اور ان کے سب کے درمیان مدر خاموش اور سنجیدہ بیٹھی تھیں۔ بمشکل انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ پہلے منتظمہ کمرے میں داخل ہوئی، اس کے پیچھے رقاصہ خراماں خراماں کمرے میں آئی۔ سوائے مدر کے ہر ایک نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا، رقاصہ سیاہ سلک پہنے ہوئے تھی۔ خوبصورت جرابیں اور چمکدار۔ اونچی ایڑی کا جوتا ـــــ اسکی دونوں کلائیوں پر سونے کی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں، اور اس کے بالوں کے گچھے میں سرخ گلاب لگا تھا۔ اور اس کے ہاتھ میں سفید ہاتھی دانت کے ستے کا ایک چھوٹا پنکھا تھا اس کے لبوں پر ہلکا سفید رنگ تھا اور اس کے چہرے پر ایک ہلکی رنگین نقاب۔

وہ کمرے کے بیچ میں پہنچکر رک گئی۔ اور اپنی نظریں جھکالیں سسٹر مڈیلا کی انگلیاں متحرک ہوئیں۔ اور پیانو سے سریلی آواز نکلنے لگی۔ رقاصہ نے اپنا پنکھا اٹھایا۔ اس اسپینی ناچ میں وہ مشکل سے اپنی جگہ سے ہٹ سکی۔ لیکن اس کے ہاتھ متحرک رہے تھے۔ اور جسم کا توازن قائم کر رہے تھے۔ اس کے جسم کا کوئی حصہ ساکت نہ تھا، ہر چیز متحرک تھی، صرف اسکی آنکھیں دکھائی دیتی تھیں، جو اس کے چہرے پر ساکت تھیں اور جو اس مجمع کو گھور رہی تھیں

دفعتاً سسٹر مڈیلا کی انگلیاں رک گئیں۔ رقاصہ ساکت کھڑی ہو گئی اور تمام کمرے میں ایک مکمل خاموشی چھا گئی، عورتوں کی قطار سے ایک ہلکا شور بلند ہوا، اور رقاصہ مسکرانے لگی، پھر سسٹر مڈیلا نے ایک نئے قسم کا گانا شروع کیا۔ ایک لمحہ تک رقاصہ خاموش کھڑی باجے کے سروں کو غور سے سنتی رہی، پھر اس کے پیروں کو حرکت ہوئی، اور وہ مسکرانے لگی، وہ بہت حسین اور خوش نظر آرہی تھی...... ایک تتلی کی طرح، کسی کی پرواہ کئے بغیر دیکھنے والوں کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی، اور انبساط کی ایک ہلکی لہر ان کے جسم میں دوڑ گئی۔

مدر انگلیوں میں انگلیاں ڈالے بیٹھی رہی۔ لیکن بھولے ہوئے لمحے اسے یاد آرہے تھے وہ پرانا گھر، وہ رومان ایک ایک کر کے اس کے سامنے آرہے تھے۔ وہ پھر جب اس کا عاشق لڑائی میں مارا گیا، وہ اس کلیسا میں داخل ہو گئی، یہ لچکدار ملائم انگلیاں سیاہ بالوں میں سرخ پھول، کتابی غازہ آلود چہرہ حسین آنکھیں اور دل میں گھپ جانیوالی نظریں اسے یاد آرہی تھیں۔ عیش وعشرت کے حسرت بار جھونکے، وقت سے پہلے فنا ہو گئے اور

چپڑ ں کو اس کھڑ یا میں لایا... گیا۔ نغمے ڈوب گئے۔ لیکن جلد ہی پھر ساری فضا مکمل نغمہ بن گئی۔ وہ ماضی کے رنگین افسانے جو ننا چونئے ت پہلے زندگی کے اہم ترین لمحے بنے ہوئے تھے۔ وہ سیاہ راتیں، اور وہ محبت اور اسکی پائمالی ـــــ اسکی آنکھوں کے سامنے تھے۔

مدر نے کچھ گھبرا کر اپنی دائیں اور بائیں طرف دیکھا۔ کیا یہ واقعی عقلمندی تھی، وہ سوچنے لگی، مختلف روشنیاں نوجوان دلوں کی رہنمائی کرتی ہیں پھر وہ کیوں نہ اس آخری لمحے میں اس کافر حسینہ رقاصہ کی دلجوئی کرے۔ اس کے خیال نے دفعتاً پلٹا کھایا وہ بہت خوش ہے اور ناچ رہی ہے معلوم نہیں کس کے خیال میں لیکن یہ ایک خوفناک حقیقت ہے، کہ اس نے ہر ایک کی نظر کو مسحور کر لیا ہے جس طرح ایک سپیرا سانپ کو مائل کر لیتا ہے۔ مسٹر وینس کو بھی اس نے مسحور کر لیا اور وہ تقریباً مسکرا اٹھی، بیچاری مسٹر لوئیس کے چہرے پر زفیۃ کرنے والا ایک نامعلوم خوف تھا۔ مدر نے اسے غور سے دیکھا، اور مسکرائی۔ اس چہرے کے آگے... دوسری طرف مدر نے نوجوان مسٹر میری کو دیکھا۔ یہ کمسن لڑکی کن نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔ میری بہت کمسن تھی۔ بمشکل اس کی عمر ۲۰ سال کی ہوگی اس کا محبوب، ایک سال ہوئے جنگ میں مارا گیا تھا کلیسا بھر میں سب سے زیادہ حسین لڑکی تھی، اس کے ہاتھ کتنے نازک اور نرم تھے۔ اور وہ کس ادا سے اپنا دامن پکڑے ہوئے تھی اور ہاں ـــــ وہ رقاصہ بھی اسکو دیکھ رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ صرف میری ہی کو اپنے ہاتھوں اور پاؤں کا تھرکنا، کمر کی لچک اور آنکھوں کی گردش بتا رہی ہے۔ اور اسی کے لئے رقاصہ کے لبوں پر ایک مسکراہٹ آئی۔ اور دفعتاً وہ سرخ ہونٹوں پر غائب ہو گئی، رقاصہ میری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس کے جذبات سے کھیل رہی تھی۔ اور انہیں ابھار رہی تھی۔ جس طرح ایک بھونرا نازک پھول سے کھیلتا ہے۔ مدر نے سوچا، کیا اس نے یہ کام کنواری مریم کی خوشی سے کیا ہے یا شیطان کے ورغلانے سے۔

ناچ ختم ہوا، دھڑکتے دل خاموش ہوئے۔ اشکبار آنکھیں تھم گئیں وہ ان عورتوں کے درمیان سے گزری، اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور اس کے چہرے پر غرور کی علامت تھی، اور اس کا جسم مکمل حسن کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ مسٹر میری کے دل میں ایک ارتعاش پیدا ہوا اور اس کے دل کو ایک دھکا لگا۔ اس کے پیچھے کی ایک چیز ..... رقاصہ نے جاتے ہوئے فضا میں ایک بوسہ چھوڑا، وہ کس طرف گیا ـــــ کون کہہ سکتا ہے اور یہ وہ اخلاقی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔ اس کے پیچھے بوڑھی مسٹر تھی، کنواری راہبوں کے درمیان سے ایک آہ نکلی اور کسی کی ہچکی سنائی دی مدر نے کہا "میری بیٹیو! اپنے اپنے کمرے میں جاؤ" نوجوان میری اس کے سامنے آئی، اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ مدر نے کہا "میری بچی دعا کرو، کہ اس غریب کے گناہوں کو مسیح معاف کر دیں ـــ لیکن ہاں میری بیٹی یہ واقعہ بہت دردناک ہے، جاؤ، اپنے کمرے میں جاؤ، اور دعا کرو" میری افسردگی کے ساتھ آہستہ آہستہ اپنے کمرے کی طرف بڑھی وہ بھی خوبصورت تھی اور حسین، مدر نے ایک آہ بھری ـــ صبح بہت سرد تھی برف کے ٹکڑے زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ مجمع ہونے سے قبل ہی وہ سب رقاصہ کو دیکھنے کیلئے آئے تھے۔ ایک فائر ہوا۔ اور ساری کائنات صرف نوحہ ہو گئی۔ وہ خاموش ہو گئی، بالکل خاموش، مدر نے کانپتے ہوئے لبوں سے رقاصہ کے لئے دعا مانگی اسی شام لوگوں نے مسٹر میری کو تلاش کیا۔ لیکن وہ لاپتہ تھی، وہ کہیں نہ ملی دو دن کے بعد ایک خط آیا "مدر مجھے معاف کرو، میں معافی چاہتی ہوں میں دوبارہ زندگی کی حسین وادیوں میں داخل ہو گئی ہوں" میری

مدر خاموش بیٹھی رہی، اس کے دماغ سے ایک خیالی تصویر نکلی، نظر آئی۔ اس رقاصہ کا چہرہ نظر آیا۔ اس کے بالوں کا سیخ پھول سیاہ حسین آنکھیں، خوبصورت نازک لب، تھرکتی ہوئی انگلیاں ـــــ ـــــ پھر ایک بوسہ کے بعد وہ تصویر رخصت ہو گئی۔

جناب راجہ مہدی علیخاں جائنٹ ایڈیٹر روزنامہ احسان لاہور

بہار کی ایک صبح کو

گلستاں میں نکہت چلی آرہی ہے — نہیں خود لطافت چلی آرہی ہے
وہ خود آرہی ہے خراماں خراماں — جلو میں نزاکت چلی آرہی ہے
چلی آرہی ہے بہاروں کی زینت — کلی کی صباحت چلی آرہی ہے
دمِ صبح آغوشِ گل سے نکل کر — مری سمت نکہت چلی آرہی ہے
کسی کنجِ باغِ ارم سے نکل کر — کوئی حورِ جنت چلی آرہی ہے
مرے دل سے رخصت تھی راحت مگر اب — مرے دل کی راحت چلی آرہی ہے
مجھے تھام لے اے جنونِ مسرت — مری سمت جنت چلی آرہی ہے
وہ خود پیچھے پیچھے ہے اور آگے آگے — حیا کی لطافت چلی آرہی ہے
نگہ سے مری ایک مدت سے جھجکی — نگہ کی شرارت چلی آرہی ہے

"وہی" آرہی ہے مرے گھر کی جانب
"وہی" ماہ طلعت چلی آرہی ہے

جناب جمیل احمد کندھا پوری بی اے

ڈھائی سَو رُوپَیہ!

(۱)

شام ہو رہی تھی۔ زید خان صحن میں ایک جھلنگی چارپائی پر لیٹا حقہ پی رہا تھا۔ اور اس کی بیوی چولہے میں آگ روشن کرنے میں مصروف تھی۔ گل بانو اٹھی اور گھڑا لیکر پانی لانے کیلئے ندی کی طرف چل دی

راستہ میں گاؤں کے زمیندار کا چھوٹا سا باغیچہ پڑتا تھا جس میں انواع و اقسام کے پودے لگے تھے۔ گل بانو شباب کی مستی سے چور اٹھلاتی قدم قدم پر حشر بپا کرتی چلی جارہی تھی، کہ دفعتاً اس کی نگاہ گلاب کے پودے پر پڑی۔ رنگ برنگ کے پھول کھلے تھے۔ جنہیں حسین تتلیاں دیوانہ وار چوم رہی تھیں گل بانو ہر روز... اس راستے سے پانی لانے کے لئے جاتی تھی، اور ہر روز... وہ تتلیوں کا رقص دیکھتی ہوگی، —— لیکن نہ جانے کیوں آج اس منظر نے اس کے دل پر ایک خاص اثر پیدا کر دیا۔ یکبارگی ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور ایک گلاب نے فرط محبت سے بیخود ہوکر دوسرے گلاب کا منہ چوم لیا۔ گل بانو یونہی ایک لمحہ کے لئے غیر ارادی طور پر باغیچہ کے پاس ٹھہر گئی تھی —— جوانی کی شوخی سے نہیں، بلکہ کسی خاص جذبہ کے زیر اثر! اور اب جو پھولوں کو منہ چومتے دیکھا تو وہ پھر چل پڑی۔ ندی وہاں سے چند ہی گز پر تھی جلدی وہاں پہنچ گئی

آفتاب غروب ہو رہا تھا اور اسکی خوں فشاں کرنیں سطح آب کا بوسہ لے رہی تھیں، ٹھنڈی اور کیف پرور ہوا چل رہی تھی، فضا میں سکوت تھا۔ گل بانو ندی میں پاؤں لٹکا کر کچھ دیر کے لئے بیٹھ گئی۔ اس نے دیکھا۔ دور، ایک کھیت کے کنارے مور کا ایک جوڑا رقص کر رہا ہے۔ اور یہ رقص کچھ ایسا جاذب توجہ تھا، کہ گل بانو اپنے ماحول سے یکسر بے خبر ہوگئی، تن بدن کا ہوش باقی نہ رہا —— مور کا رقص دیکھتے دیکھتے وہ درحقیقت رقص کی دنیا میں پہنچ گئی، جہاں رنگ برنگ کے پھول تھے، موسیقی تھی، اور محبت کے رنگین خواب! وہ اپنے خوش آئند مستقبل کے سہانے خواب دیکھنے لگی۔ جب اس کی زندگی بھی لطف اور رنگینیوں سے معمور ہو جائیگی —— جب اس سے بھی کوئی گرمجوشی سے محبت کرے گا، اور یہ بھی اپنے پرستار کی محبت کا جواب اسی گرمجوشی سے دے سکیگی۔

(۲)

شباب و جوانی کے خواب کتنے لطیف ہوتے ہیں، یہ کون نہیں جانتا! اور نہ جانے حسین گل بانو کب تک اس خود فراموشی کے عالم میں غرق رہتی، اگر قریب سے ایک چپو کی آواز اس کی توجہ اپنی جانب منعطف نہ کرلیتی کنارے سے کوئی چپو چلاتا ہوا آہستہ آہستہ آرہا تھا۔ جب وہ ایکدم قریب پہنچ گیا، تو پانی کی چھپ چھپ کی آواز سنکر گل بانو دفعتاً چونک پڑی، اس نے دیکھا کہ آفتاب کبھی کا غروب ہو چکا ہے فضا پر تاریکی مسلط ہو رہی ہے اور نیلے شفق پر اگے دکے ستارے نکل چکے ہیں۔ وہ جلدی سے اٹھی، اور گھڑا سر پر رکھ کر گھر کی طرف چلدی، دروازے کے پاس پہنچی تو دیکھا، باپ اور ماں دونوں مصروف گفتگو ہیں، جس کا موضوع خود اسی کی شادی ہے ظاہر ہے گل بانو کے جذبات کی اسوقت کیا کیفیت ہوئی ہوگی۔ گھڑا جلدی سے اس نے زمین پر رکھدیا اور دروازے سے لگ کر انکی گفتگو سننے لگی۔

"آخر کیا کرنا ہے؟" زید خاں نے حقہ اپنے قریب کھینچتے ہوئے کہا۔ "ہم نے جہاں بھی شادی کے پیغام بھیجے، سبھی نے تو روپے ہی طلب کئے"

"تو پھر؟" گل بانو کی ماں نے پیشانی پر شکن ڈال کر کہا۔

"پھر کیا" —— اس نے حقہ کا ایک بڑا سا کش لگا کر کہا: "آخر گل بانو کو کب تک بٹھا رکھو گی؟ لڑکی جوان ہو چکی ہے، شادی تو جس طرح بھی ہو کرنی ہی ہوگی"

"اور وہ ڈھائی سو روپوں کا مطالبہ؟"

"فصل لگی ہوئی ہے۔ غلّہ فروخت کرکے دیدوں گا"

"اور کیا پیٹ پر پتھر باندھو لوگے؟" گل بانو کی ماں نے ذرا چیں بجبیں ہوکر کہا۔

"تو اب کھانے کا خیال کروگی، تو گل بانو کی شادی ہوچکی" فرید خاں نے چلم کو پھونکتے ہوئے کہا، جسکی چنگاریاں دم توڑ رہی تھیں۔

"لیکن پھر بھی کچھ سوچا تو ہوگا؟"

"ان میں ابھی طاقت باقی ہے، گل بانو کی ماں!"— فرید خاں نے اپنے مضبوط بازوؤں کیطرف اشارہ کرکے کہا "میں مزدوری کر سکتا ہوں"

"مزدوری کروگے؟" وہ ذرا چونک کر بولی، جیسے اسے اس جواب کی توقع نہ تھی "کیا شرم وحیا دھوکر پی گئے، آخر کچھ لوگوں کا بھی خیال ہے، کہ وہ کیا کہیں گے؟"

"کہیں گے کیا؟" فرید خاں نے اپنی پیشانی پر گہری شکن پیدا کر کے کہا۔

"یہی کہ فقط ایک لڑکی کی شادی میں فرید خاں کی کبھی نہ جھکنے والی گردن آخر جھک گئی"

"لیکن گل بانو کی ماں!" فرید خان کسی قدر مطمئن انداز میں کہنے لگا "تم نے یہ بھی سوچا کہ شادی نہ کرنے کیصورت میں سماج کیا آوازے کسے گی؟"

"کیا؟"— گل بانو کی ماں نے رازدارانہ لہجہ میں دریافت کیا

"یہ کہ لڑکی جوان ہونے کو آئی، اور ماں باپ کو اس کے بیاہ کی فکر نہیں، اور ...."

"اور کیا؟" گل بانو کی ماں نے پوچھا۔

"اور شاید پھر .. سماج تمہاری نیک سیرت لڑکی پر بدچلنی کا الزام بھی لگائے اور اپنی تہمت سے ہمیں اس قابل نہ رکھے، کہ ہم پھر دنیا کو منہ بھی دکھا سکیں"

گل بانو کی ماں یہ سنکر کسی قدر سست پڑگئی۔

گل بانو نے جب یہ گفتگو سنی، تو اس کے خفتہ جذبات بیدار ہوگئے وہ بیشک مسرتوں کی دنیا آباد کرنا چاہتی تھی، لیکن اتنی گراں قیمت پر نہیں، اسے اپنے والدین سے محبت تھی، جنون کی حد تک۔ اسوقت ان کے سوا اس کا دنیا میں اور تھا ہی کون؟ پھر فرید خاں کی کوئی اور اولاد تو تھی نہیں، پھر یہ کس طرح ممکن تھا، کہ وہ ایک ایسی شادی پر رضامندی کا اظہار کرتی، جس سے بحالتِ موجودہ اس کے والدین کو ایک سال کے لئے کھانے تک کا سہارا باقی نہ رہتا۔ بیشک وہ اپنی زندگی میں ایک خلا محسوس کرتی تھی، اور چاہتی تھی، کہ کوئی محبت پرست دل اس کو نصیب ہو — لیکن یہ شادی اس کی نظروں میں ایسی شادی تھی جس کی بنیاد خود غرضی پر قائم کی گئی ہو، جو الفت ومحبت کے شعبوں سے یکسر عاری ہو۔

چنانچہ اسوقت ... وہ بےچینی میں پیچ وتاب کھاتی رہی — اسکی طبیعت میں ایک قسم کی وحشت ایک خاص انداز کا اضمحلال پیدا ہوگیا، رات کیوقت وہ اپنے والدین کی ضد کے باوجود بغیر کھانا کھائے سو رہی، فرید خاں نے ہرچند اپنی لڑکی کی اندرونی کش مکش کا جائزہ لینے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہوا۔

گل بانو کو آدھی رات گئے تک نیند نہ آئی، اسے رہ رہ کر وہ منظر یاد آجاتا، جب شادی بیاہ کے بعد وہ سسرال چلی جائے گی، اور اس کے باپ ماں یہاں فاقوں مرنے لگیں گے، رات کو عالمِ اضطراب میں اکثر اس نے فیصلہ کیا، کہ اسی وقت باپ کو جگاکر اپنی دلی کیفیت کا اظہار کردے لیکن پھر شرم وحجاب غالب آتا، اور وہ اپنا خیال ترک کرنے پر مجبور ہوجاتی۔

الغرض رات گل بانو نے بڑی مشکلوں سے گذاری۔

صبح ہوئی تو فرید خاں نے دیکھا، اسکی لڑکی گل بانو کا چہرہ اترا ہوا ہے اور قبل اس کے کہ وہ اس کے متعلق کچھ استفسارات کرے گل بانو نے اپنی ماں کو علیحدہ لے جاکر خود ہی کہا — ماں میں نے ساری باتیں سن لی ہیں، اور اس شادی پر ہرگز رضامند نہیں، جی چاہے تو بابا (فرید خاں کو وہ بابا ہی کہکر پکارتی تھی) کو کہدے:

"کیوں؟"— گل بانو کی ماں نے پریشان لہجہ میں کہنا شروع کیا "تیرا مزاج تو ٹھیک ہے۔ آخر آج شادی وادی کا ذکر کیا لے بیٹھی؟"

"ہاں ماں!"— گل بانو نے نظریں نیچی کئے ہوئے کہا "اس شادی

کرنے میں ہرگز تیار نہیں۔"

"کیوں؟ کوئی وجہ؟"

"وجہ میں نہیں جانتی"

"لے!" گل بانو کی ماں نے سمجھاتے ہوئے کہا: "اب تجھے وجہ بھی معلوم نہیں تو پھر نارضامندی کا اظہار کیوں کرتی ہے؟ ارے ہم ترے دشمن تو ہیں نہیں جو تیری برائی چاہیں گے باوا نے خود تیرے لئے دولہا ڈھونڈا ہے۔ شہباز کتنا اچھا لڑکا ہے، خوبصورت پڑھا لکھا۔ پھر اس کے پاس کچھ کھیت بھی ہیں، اور تو کیا چاہتی ہے؟"

"نہیں ماں! میں شادی نہیں کرسکتی"

"ارے۔ یہ کیا بے وقوفی ہے۔ تیرے باپ نے سن پایا تو اسکو کتنا صدمہ ہوگا۔ اس نے خود بر ڈھونڈا ہے"

یہ باتیں اندر باورچی خانہ میں ماں اور بیٹی کے درمیان ہو رہی تھیں، جہاں تیسرا کوئی متنفس بھی نہ تھا۔ فرید خاں باہر آنگن میں منہ ہاتھ دھو رہا تھا، جب اس سے فارغ ہوکر اندر آنے لگا، تو اس نے اتفاقاً ان کی گفتگو کا آخری حصّہ سن لیا۔

"کیوں گل بانو کی ماں آخر مجھے صدمہ کیوں ہونے لگا؟"

پہلے تو وہ عجیب کشمکش و رنج میں پڑگئی، کہ کیا کہے ۔۔۔ نہ کہے پھر یہ سمجھ کر کہ شاید فرید خاں پہلے ہی تمام پوری گفتگو سن چکا ہے۔ اس نے با دلِ ناخواستہ بولی:

"یہ تمہاری گل بانو شادی کے لئے آمادہ نہیں"

"کیوں؟" فرید خاں نے تعجب سے پوچھا، اور پھر قریب آ گل بانو کی تھوڑی پکڑ کر بولا۔

"کیوں بیٹا؟ کیا یہ سچ ہے؟"

"ہاں باوا! میں اپنی وجہ سے آپ کو پریشانی میں ڈالنا نہیں چاہتی"

"پریشانی کیسی گل بانو؟"

"پیداوار فروخت کرکے جب آپ روپے کسی کو دے دیں گے تو خود کیا کھائیں گے باوا۔ میں آپ کو محنت مزدوری کرتے دیکھوں، یہ ناممکن ہے"

فرید خاں نے اپنی لڑکی کا آخری جملہ سنکر ہنس دیا، اور گویا ایک خندہ زیرِ لب میں ساری گفتگو کو تحلیل کر دیا۔

"یہ تیرے سوچنے کی چیز نہیں گل بانو! تو ہی تو میرا واحد کھلونا ہے پھر کیوں نہ میں تیری خوشی کے لئے تکلیف مول لوں، اور اسی تکلیف کو اپنے لئے راحت سمجھوں"

(۳)

شہباز جس سے گل بانو کی شادی کی باتیں ہو رہی تھیں، حسن پور سے قریب ہی ایک گاؤں میں رہا کرتا تھا۔ اس کا باپ گاؤں کے خوشحال آدمیوں میں شمار ہوتا تھا۔ کچھ اپنی کاشت تھی، دو چار ہل بیل تھے۔ اور گھی دودھ کے لئے گائے بھینس کی بھی کمی نہ تھی۔ شہباز کی عمر ۲۵ کے لگ بھگ ہو چکی تھی، اس لئے اس کا باپ چاہتا تھا کہ جہاں بھی ہو جلد سے جلد اب اسکی شادی کر دیجائے۔ لیکن مشکل تو یہ تھی کہ وہ بغیر زرِ نقش کے شادی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جہاں سے بھی شادی کا پیام آتا شہباز روپے ہی طلب کرتا۔ چنانچہ جب فرید خاں نے گل بانو کے لئے یہاں پیام بھیجا، تو شہباز کے باپ نے ڈھائی سو روپوں کی گرانبہا رقم طلب کی۔ جس کو فرید خاں نے آخر قبول کر لیا۔ نہ قبول کرتا تو پھر چارہ ہی کیا تھا۔ ہر جگہ سے تو روپے ہی طلب کئے جاتے تھے کسی کی جیب تو اسے بھرنی ہی پڑتی۔

(۴)

فرید خاں نے گل بانو کو شادی میں دینے کیلئے چاندی کے چند زیور اور چند ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ روپوں کا قبل ہی سے انتظام کر رکھا تھا۔

اب ضرورت تھی تو ڈھائی سو روپوں کی لیکن فصل بکنے میں ابھی دو ماہ کی دیر تھی، اور اس سے قبل فرید خاں روپے کہاں سے مہیا کرتا، لیکن اس نے سوچا، کہ شہباز کے باپ سے گفت و شنید کرکے رسمِ شادی انجام دیدے۔

بیساکھ کے مہینے کی ابتدا ہوئی تھی، اسکی خواہش تھی کہ اسی مہینہ کے اندر تقریب انجام پا جائے۔ کیونکہ اس کے بعد جیٹھ کا مہینہ آتا تھا اور اتنی گرمی میں شادی کے انتظامات کرنے میں کس قدر دشواریاں ہوتی ہیں۔ فرید خاں اس سے بخوبی واقف تھا۔ چنانچہ اس نے شہباز کے باپ کے پاس آدمی بھیجکر یہ بات طے کر لی کہ بیساکھ کی پندرہویں تاریخ کو

شادی ہو جائے گی، روپوں کے متعلق اس نے کہلا بھیجا کہ فصل کٹنے پر غلّہ جیسے ہی تیار ہوگا وہ اسے فروخت کرکے روپے دے دیگا۔

چنانچہ شہباز کے باپ نے اسے قبول کرلیا، وہ جانتا تھا کہ فرید خاں اپنی غربت و تنگدستی کے باوجود جھوٹا یا دغا باز نہیں ہے۔ جب اس نے فرید خاں سے وعدہ کیا ہے، تو جس طرح بھی ہو وہ شادی کے بعد جیٹھ تک روپے ضرور ادا کردے گا۔

چنانچہ بیساکھ کی پندرھویں تاریخ آئی اور شہباز و گل بانو دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئے۔

دن ہفتے اور ہفتے مہینے میں تبدیل ہونے لگے۔ فرید خاں نے اسکلی محنت کرنا شروع کردی تھی، منہ اندھیرے اٹھتا اور کھیت پر چلا جاتا، دن بھر وہیں کام کاج میں لگا رہتا۔ جب وہ یہاں سے وہاں تک اپنے سرسبز لہلہاتے کھیتوں کو دیکھتا، تو اسکا دل خوشی سے باغ باغ ہو جاتا۔ کھیتوں کے درمیان اس نے اپنے لئے بانس کا ایک مچان بنا رکھا تھا جس پر بیٹھ کر وہ کھیتوں کی نگرانی کرتا رہتا۔ پھر کنوئیں سے پانی بھر بھر کر کھیتوں میں ڈالنا بھی اسی کے فرائض میں داخل تھا، دوپہر کے وقت کھانا لیکر گل بانو کی ماں خود ہی کھیتوں پر چلی جاتی۔ فرید خاں جانتا تھا کہ اس سال کی فصل اب اسکی نہیں بلکہ شہباز کی ہے۔ اس لئے اس نے ہر ممکن کوشش کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غلّہ پچھلے سالوں سے بھی زیادہ پیدا ہو، خود گل بانو دیکھتی تھی کہ اس کا باپ پہلے سے کہیں زیادہ انہماک سے محنت کرتا رہا ہے۔ اکثر اس نے اپنے باپ کو اس سے باز رکھنے کی کوشش بھی کی، لیکن بے سود، فرید خاں نے ذرا بھی توجہ نہ کی۔

گل بانو شادی سے پیشتر اکثر ازدواجی زندگی کے سہانے خواب دیکھا کرتی تھی، لیکن افسوس یہ وہ خواب تھے، جو شرمندۂ تعبیر نہ ہوئے ایک ماہ گزرنے پر گل بانو اس حقیقت سے آشنا ہو گئی تھی، کہ شہباز کو اس سے نہیں، اس کے باپ کے کھیتوں سے محبّت ہے۔ گل بانو پر یہ اچھی طرح آشکار ہو گیا تھا کہ شہباز ایک پیکر تھا، مادیت کا، اور اسکے سوا کچھ بھی نہیں، وہ جو کچھ بھی کرتا، اس میں اسی کے ذاتی اغراض پنہاں ہوتے۔ چنانچہ شادی میں بھی اس نے اسی کا بیوپار کیا تھا۔

کھیتوں میں فصل کٹ کر تیار ہوئی، فرید خاں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، اس کے کھیتوں میں اس سال تمام گاؤں والوں سے زیادہ غلّہ پیدا ہوا تھا، یعنی جہاں اور لوگوں کے کھیتوں میں بالعموم ایک بیگہ زمین میں دس من غلّہ پیدا ہوا، وہاں فرید خاں نے ایک بیگہ میں پندرہ من پیدا کیا، اس کامیابی میں جہاں خدا کی عنایتیں شامل تھیں، وہاں خود فرید خاں کی جاں توڑ محنت کو بھی کافی دخل تھا۔ اخیر میں تو راتوں کو بھی اپنے کھیت ہی میں مچان پر سوتا، تاکہ تاریکی شب میں کوئی بدنیت اس کی فصل کاٹ کر نہ لے بھاگے، جیسا کہ ہر سال گاؤں والوں اور بالخصوص فرید خاں کے ساتھ پیش آتا تھا۔

الغرض فصل کٹ کر کھلیان پہونچی، اپنے غلے کے انبار پر جب فرید خاں نگاہ دوڑاتا تو باغ باغ ہو جاتا، یہی اس کی سال بھر کی کمائی تھی، اور اس نظارہ سے اس کا مسرور ہونا ایک فطرتی امر تھا۔

شادی کے بعد بیس دنوں تک تو گل بانو شہباز کے گھر رہی، اور پھر اس کے بعد دونوں حسن پور چلے آئے، جیٹھ آگیا تھا، اور شہباز اپنے روپوں کے لئے چشم براہ تھا۔

یہاں پہنچکر جب اس نے فرید خاں کے غلّہ کا انبار دیکھا، تو دل میں ایک قسم کی مسرت محسوس کی لیکن اسے اب یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ شاید اس کا سسرا اس سے دغابازی کرے، اور وعدہ کی رقم ہضم کر جائے۔ شاید اپنے ہی سیاہ دل کو مدنظر رکھکر شہباز دوسروں کے دلوں کا بھی جائزہ لینے کا عادی تھا۔ یہی وجہ تھی، کہ فرید خاں کی طرف سے بھی اس کے دل میں قسم قسم کے شکوک پیدا ہونے شروع ہوگئے تھے۔ اسے کیا خبر کہ فرید خاں کے دل میں کتنی تمنا کتنی آرزو تھی، کہ وہ جلد سے جلد اس بارِ گراں سے سبکدوش ہو جائے۔ چنانچہ شہباز اپنے دھڑکتے ہوئے دلکو اطمینان دلانے کیلئے گل بانو سے بار بار پوچھتا۔

"تمہارے بابا نے روپوں کا وعدہ کیا ہے.... جانتی ہو نا؟"

"ہاں معلوم ہے۔"

یہ کہکر گل بانو ٹال تو دیا کرتی، لیکن شہباز کے اس قسم کے سوالات سے گل بانو کے دل سے اسکی وقعت و عظمت آہستہ آہستہ گھٹتی جا رہی تھی:—— اسی دن شام کو ندی کے کنارے شہباز اور گل بانو دونوں بیٹھے تھے۔ فضا میں ایک قسم کی اداسی تھی، اور شام کے دھندلے

میں دور تنوروں سے، پرے مٹی کے ٹوٹے پھوٹے، بیٹھے بیٹھے مکانات ایک عجیب غم انگیز سماں پیدا کر رہے تھے۔ اور شہباز نے گل بانو کے جذبات کو زیادہ سے زیادہ مجروح کرنے کیلئے پھر وہی پرانی گفتگو چھیڑ دی

"کل تمہارے بادا غلّہ فروخت کر رہے ہیں۔ گل بانو؟"

"ہاں: سنتی تو میں بھی ہوں" گل بانو نے بیزاری سے کہا۔

"روپے تو تجھے کل ہی مل جائیں گے نا؟"

"یہ سوال تمہیں میرے باپ سے کرنا چاہیئے"

"اور جو تم سے پوچھوں تو؟"

"یہ تمہاری بے وقوفی ہے"

کچھ دیر کے بعد دونوں گھر واپس آئے۔ گل بانو آج اپنے خود غرض شوہر کی گفتگو سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ اس لئے اس کے چہرے پر اسکا کافی اثر موجود تھا۔ بہت دیر تک وہ ماضی کو سوچتی رہی۔ وہ رنگین خواب اسکی آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگے۔ جنہوں نے شادی سے قبل اس کے دل و دماغ میں گھر کر لیا تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ شہباز کی ہستی کس طرح ایک خوفناک زلزلہ کی مانند، اس کے تصورات کی رنگین دنیا میں داخل ہوئی، اور اس کو بری طرح مسمار کر کے چلی گئی، لیکن افسوس عمارت منہدم ہو جانے کے بعد اب صبر و شکر کے سوا وہ کر ہی کیا سکتی تھی۔

اسی حالت میں اسے نیند آ گئی اور اس نے دیکھا۔ کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ پہاڑ کے لامتناہی سلسلے کے سامنے کھڑی ہے۔ ہر چہار طرف دھندلکا سا چھایا ہوا ہے۔ صرف پہاڑ کی انتہائی بلندی پر ایک بڑا سا ہیرا اپنی درخشانی سے آس پاس کو منور کر رہا ہے۔ گل بانو کی للچائی نگاہیں اس پتھر کے ٹکڑے پر پڑتی ہیں، اور جب فرید خاں کو اپنی لڑکی کے شوق کا علم ہو جاتا ہے۔ تو وہ کسی چیز کی پروا کئے بغیر اس کو اپنے قبضہ میں لانے کے لئے پہاڑ پر چڑھنے لگتا ہے۔ جاتے وقت خود گل بانو اسکو جان لیوا خطرناک مہم سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے لیکن فرید خاں اس سے اثر پذیر ہوئے بغیر آگے بڑھ جاتا ہے۔

راستے میں سینکڑوں قسم کی رکاوٹیں روڑے اٹکا دیتی ہیں لیکن یہ عزم کا پختہ مستقل مزاجی سے اوپر بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ منزلِ مقصود سامنے آ جاتی ہے۔ اور فرید خاں اس درخشاں ہیرے کو اپنے قبضہ میں کر لیتا ہے ——— لیکن افسوس واپسی کے لئے جونہی وہ قدم نیچے بڑھاتا ہے۔ اس کے پائے استقلال کو لغزش ہوتی ہے اور وہ لڑھکتا ہوا پتھر کی چٹان کیطرح نیچے آ رہتا ہے۔

گل بانو نے یہ منظر دیکھا، اور اس کی خوف و دہشت سے چیخیں نکل پڑیں، ایسی فلک شگاف چیخیں جو انتہائی سراسیمگی کی حالت میں انسان کے منہ سے نکلتی ہیں، اور پھر جو گل بانو نے بیدار ہو کر اپنی آنکھیں زرا اوپر اٹھائیں تو "آگ! آگ!" کی دہشت انگیز آواز بجلی کی سرعت کیساتھ اس کے کانوں کے پردے سے پار ہو گئی... فوراً ہی وہ چادر پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئی، اور دیکھا، کہ شہباز اور اس کی ضعیف ماں دونوں دیوانوں کیطرح رات کی پرہیبت تاریکی میں کسی چیز کی پروا کئے بغیر دوڑے جا رہے ہیں۔ گل بانو بھی ان کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگی، اور چند منٹ کے بعد جب وہ شہباز کے برابر ہو گئی تو اس نے پوچھا۔

"آگ کہاں لگی ہے؟"

"تمہارے بادا کی کھلیان میں"

اور پھر سب مل کر زیادہ تیزی سے روتے پیٹتے، چیختے چلاتے دوڑنے لگے۔ گاؤں کے کنویں کے پاس کے پاس سے کھلیان صاف نظر آ رہی تھی، قیامت کا نظارہ تھا، ہر طرف آگ ہی آگ نظر آ رہی تھی، فرید خاں سامنے رو رو کر اپنا کلیجہ پیٹ رہا تھا، اسکی اتنی محنت کی کمائی آج اسکی آنکھوں کے سامنے اسی کی غفلت سے راکھ کا ڈھیر ہو رہی تھی، مثل مشہور ہے کہ آگ بجھانے نہیں بجھتی اور اسکی لپٹیں روکے نہیں رکتیں چنانچہ ہوا تیز تھی اور فرید خاں کے انبار سے اب آگ دوسروں کے انبار تک پہنچ گئی، گاؤں والے اسوقت تک جمع ہو چکے تھے سبھوں نے متحد ہو کر آگ بجھانے کی ہر ممکن تدبیر کی لیکن قسمت کے فرشتے مسکرا رہے تھے۔ اور انکی تمام کوششیں رائگاں گئیں، اس نتیجے سے فرید خاں کے علاوہ گاؤں کے دو اور آدمیوں کے غلّے جل کر خاکستر ہو گئے۔

فرید خاں کو اس حادثہ سے کتنا پہونچا ہوگا۔ اس کا اندازہ کچھ وہی لگا سکتے ہیں، جو ایسی مصیبت سے کبھی دو چار ہوئے ہوں گل بانو اور اسکی ماں تو غم و الم میں روتی چیختی چلاتی۔ اور سینہ کوبی کرتی تھیں

لیکن فرید خان پر گویا سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ نہ کسی سے بولتا بولتا، وہ نہ اظہارِ غم کے لئے گریہ وزاری کرتا ـــــ ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ اس کے دماغ کی ساری قوت سلب ہو چکی ہے اور وہ اب ایک لفظ بھی کبھی زبان پر نہ لاسکے گا۔

اس واقعے کے تیسرے دن گل بانو شام کے وقت آنگن میں امرود کے درخت کے نیچے اداس بیٹھی تھی۔ پوری فصل جل کر خاک ہو گئی تھی، اور اس سے اسے بہت صدمہ پہنچا تھا۔ شہباز کہیں باہر گیا ہوا تھا جب وہ آیا، تو چپکے سے گل بانو سے مخاطب ہو کر بولا:۔

"اب میرے روپوں کا کیا ہو گا گل بانو؟"

"جس نے وعدہ کیا ہے، اس سے پوچھو" گل بانو نے شکستہ آواز میں کہا۔

"ان سے کیا پوچھوں؟"

"یہی کہ وہ تمہارا قرض کب ادا کریں گے؟"

"گل بانو! کیا تم مجھ سے مذاق کر رہی ہو؟"

"نہیں!" ـــ گل بانو نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"تو کیا اپنے باپ کی طرح تم بھی مجھے بیوقوف بنا رہی ہو؟"

"بنا تو کوئی نہیں رہا ہے۔ شاید تم خود ... ہی بیوقوف بن رہے ہو"

"مطلب؟" شہباز نے آنکھیں ملا کر پوچھا۔

"مطلب یہ کہ ایسے وقت اس قسم کے سوالات کرنا بیوقوفی نہیں تو اور کیا ہے؟"

"تو گویا روپوں سے میں اب ہاتھ دھو لوں؟"

"ہاتھ دھونا یا نہ دھونا، یہ تمہارے اختیار کی بات ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہونگی، کہ انسان کو موقع و مصلحت کو بھی مدِنظر رکھنا چاہیئے۔"

دوسرے دن شہباز یکایک غائب ہو گیا۔

فرید خاں نے گاؤں میں ادھر ادھر تمام ڈھونڈا۔ لیکن وہ کہیں ہوتا تو ملتا ـــ وہ تو بگڑ کر اپنے گاؤں بھاگ گیا تھا۔ جب فرید خاں تلاش کرتے کرتے تھک گیا، تو اسے گل بانو کی ماں سے یہ خبر ملی، کہ شہباز روٹھ کر چلا گیا ہے۔ لیکن اس کا اسے یقین نہ آیا۔ اور اس نے گل بانو سے جا کر پوچھا۔

"بیٹی آخر شہباز اس طرح بغیر کچھ کہے سنے کیوں چلا گیا؟"

گل بانو خاموش رہی۔

"کچھ معلوم ہو تو بتاؤ گل بانو! آخر وہ مجھ سے بغیر کچھ کہے سنے کیوں چلا گیا؟"

گل بانو نے اب بھی اپنی زبان کو زحمتِ گفتار نہ دی۔

"کیا تجھ سے کچھ جھگڑا ہوا؟" فرید خان نے قدرے عاجزی سے پوچھا باپ کا اصرار بہت بڑھ گیا تھا، اور گل بانو کے لئے اب خاموشی پر مصر رہنا ناممکن تھا

"نہیں بابا!" وہ آہستہ سے بولی۔

"تو پھر کونسی وجہ ہوئی؟"

"انہیں اپنے روپوں کی طرف سے مایوسی ہو گئی تھی" گل بانو لجاجت سے بولی

"مایوسی؟" فرید خاں نے متعجب ہو کر پوچھا "کیا وہ ایسے برے دنوں میں تجھ سے روپوں کا تذکرہ کر رہا تھا؟"

"ہاں بابا!"

فرید خاں پر ساری حقیقت آشکار ہو گئی اور سلسلۂ گفتگو کو باقی رکھنے کی تاب اس میں نہیں رہی۔

مثل مشہور ہے، مصیبت تنہا نہیں آتی، ـــ فرید خاں کے غلے میں آگ لگنے کے سبب سے جن دو آدمیوں کی فصل نذرِ آتش ہوئی تھی، انہوں نے اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی اور تھانے میں رپٹ لکھوا دی۔ چنانچہ فرید خاں دوسروں کے انبار میں آگ لگانے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ مقدمہ شروع ہوا۔ فرید خاں تو برابر حراست ہی میں رہا آخر اسکا دنیا میں تھا ہی کون؛ جو اس کی ضمانت قبول کرتا مرو کی صورت میں البتہ ایک شہباز تھا۔ لیکن اس جیسے انسان سے اس قسم کی توقعات قائم کرنی ہوا میں قلعے تعمیر کرنے سے کم نہ تھا۔ گاؤں کے چند نیک دل آدمیوں نے فرید خاں کی حمایت میں مقدمہ کی پیروی کی عدالت کے فیصلے سے فرید خاں بے قصور ثابت ہو کر اپنے گاؤں واپس ضرور آیا لیکن ایک مفلس، بھیک منگے کے روپ میں! مقدمے کی پیروی میں اس کی رہی سہی جائداد ختم ہو چکی تھی۔

مقدمہ کے دور ان میں گل بانو نے شہباز کو متعدد خطوط بھیجے۔ لیکن اس سنگدل انسان پر اسکا مطلق اثر نہ ہوا اور اس نے کوئی توجہ نہ کی

دن ہفتے اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہو گئے۔ فرید خان اب بہت پریشان حال رہنے لگا اس کے پاس صرف ایک بیل گاڑی رہ گئی تھی، جسے سستے داموں فروخت کر کے اس نے خورد و نوش کا سامان مہیا کیا، اور چند ماہ بعد جب وہ پیسے بھی ختم ہو گئے تو فرید خاں نے اپنا مکان زمیندار کے ہاں رہن رکھ دیا۔ گویا قسمت نے اس کا آخری سہارا بھی اب اس سے چھین لیا تھا

گل بانو کی صحت پر ان چیزوں نے خاص اثر پیدا کیا، اسکا رنگ روز بروز زرد ہوتا جا رہا تھا، اور وہ قبل از وقت بوڑھی معلوم ہونے لگی تھی۔ گویا اسکا شباب اب منہ چڑا چڑا کر اس سے رخصت ہو رہا تھا، نہ وہ چہل پہل تھی، نہ وہ بشاشت اور نہ وہ انداز زیادہ تر خاموش ہی رہتی، اور فکر کے لاانتہا ہی سمندر میں غوطہ زن! زندگی کی ناکامی کا حال گل بانو پر اچھی طرح آشکار ہو چکا تھا اور وہ دیکھ رہی تھی کہ قدرت اس کے ساتھ کیسا سنگین مذاق کر رہی ہے۔

ندی کنارے وہ اب بھی پانی لانے کے لئے جاتی تھی، پھولوں پر تتلیوں کا رقص وہ اب بھی دیکھا کرتی تھی، لیکن اس انداز سے جیسے کوئی بے حس انسان اسے دیکھ رہا ہو، اب نہ وہ امنگیں اٹھتیں اور نہ بھر دلمیں شوق کے وہ ولولے! کبھی کبھی وہ طاؤس کے دیوانہ وار رقص سے بھی دوچار ہو جاتی تھی، اور اسکی دید سے، پھر خوابوں کی دنیا میں پہنچ جاتی تھی لیکن اب اس کے خوابوں میں وہ لطافت اور رنگینی نہ ہوتی، بلکہ ان پر حزن و ملال، اور رنج و مایوسی کی تاریک اور بھیانک گھٹائیں چھائی رہتیں اسکی زندگی اس گلاب کی مانند تھی، جو کسی ویران کھنڈر کے ایک گوشہ میں کھلا، اور وہیں... تمازت آفتاب سے کملا کر مرجھا گیا۔

محبت کے لاتعداد خواب گل بانو نے شادی سے قبل دیکھے تھے لیکن سب ایک ایک کر کے غلط ثابت ہوتے گئے گویا وہ محض نقش بر آب تھے۔ جن کا وجود اس مادی دنیا میں ناممکن تھا

فرید خاں اس انقلاب کو بغور دیکھ رہا تھا جس سے اس کی لڑکی اسوقت دوچار ہو رہی تھی روزانہ وہ اس بڑھتے ہوئے سیلاب کے روکنے کی تدابیر سوچتا، لیکن کوئی بھی اس کے ذہن میں... نہ آتی۔ آخر ایک دن اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خود ہی شہباز کے پاس جائے، اور اسے سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ لیتا آئے۔ اس طرح اسے یقین تھا، کہ گل بانو کی صحت دوبارہ عود کر آئے گی، جیسے جیسے وہ اس کے متعلق سوچتا اسے اس کا زیادہ سے زیادہ یقین ہوتا جاتا کہ شہباز اس کی عرض قبول کرے گا۔ وہ خیال کرتا، شہباز آخر کتنا ہی برا ہو، پھر بھی اس کا داماد... ہے۔ . . . . ناممکن ہے، کہ وہ اس کے پاس رحم و کرم کی درخواست لیکر جائے، اور شہباز اس کی تمنا کو اپنی بے رخی سے کچل دے۔

ان تصورات سے مسرت کی ایک لہر فرید خاں کے چہرے پر دوڑ گئی، اور وہ مسکرانے لگا، جیسے کوئی فتحمندانہ انداز میں اپنی کامیابی پر مسرور ہو رہا ہو۔ دوسرے دن صبح سویرے اس نے اپنی بڑی سی لاٹھی لی، اور شہباز کے گاؤں کی طرف چل پڑا۔

جاتے وقت گل بانو کی ماں نے پوچھا — "کدھر کا ارادہ ہے؟"

"شہباز کو لانے جا رہا ہوں —" فرید خاں اتنا کہکر مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

گل بانو اور اس کی ماں دونوں شہباز کی فطرت سے بخوبی واقف تھیں لیکن جس طرح تپ دق کے مریض کو آخر وقت تک اپنی زیست کی امید رہتی ہے۔ اسی طرح یہ دونوں ماں بیٹی بھی امید کے خلاف شہباز کی واپسی کی امید کرنے لگیں۔

دوسرے دن شام کے وقت گل بانو کی ماں نے پورے مکان کو صاف ستھرا کیا، اور پھر تمام چیزوں کو مناسب جگہ پر قرینہ سے رکھ چھوڑا۔ وہ اس خیال سے بے حد مسرور تھی، کہ تین چار ماہ بعد اس کا داماد پھر یہاں آنیوالا ہے، اور اس کے لئے وہ ہر لمحہ چشم براہ تھی۔

رات کے دس بجے فرید خاں گھر واپس آیا لیکن گل بانو اور اس کی ماں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب انہوں نے یہ دیکھا، کہ شہباز اس کے ساتھ نہیں فرید خاں کے چہرے پر مایوسی اور اضمحلال کھنڈا ہوا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ وہ کسی بہت بڑے صدمے سے دوچار ہوا ہے۔

"شہباز کو ساتھ نہیں لائے؟"——گل بانو کی ماں نے حیرت سے پوچھا۔

"آنے پر راضی نہیں ہوا" فرید خاں مایوسی سے بولا۔

"کیوں؟"

"روپے مانگتا تھا"

"تو کیا اسے تمہاری موجودہ حالت کا علم نہیں؟"

"علم کیوں نہیں! میں نے خود ہی اسے تمام حقیقتوں سے آگاہ کیا اور ہاتھ جوڑ کر اس سے درخواست کی، کہ وہ میری حالت پر ترس کھا کر روپے اب معاف کر دے اور گل بانو کو دوبارہ اپنی خدمتگزاری کا موقعہ دے" فرید خاں نے کہا۔

"تو کیا اس پر بھی اس کا دل نہ پسیجا؟"

"نہیں! گل بانو کی ماں! ترس کھانا تو کجا، اس نے اپنے گاؤں کے سب آدمیوں کے سامنے مجھے ذلیل کیا"

"یہ کس طرح؟" گل بانو کی ماں نے حیرت سے پوچھا، جیسے اسے اسکی توقع نہ تھی۔

مجھے چور اور بے ایمان کہا اور یہی نہیں، بلکہ گل بانو کو طلاق دے دینے کی بھی دھمکی دی" فرید خاں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"طلاق؟" گل بانو کی ماں نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں طلاق!" فرید خاں کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

قدرے توقف کے بعد فرید خاں نے پھر کہنا شروع کیا "آئندہ جمعہ کو شہباز یہاں آئے گا گل بانو کی ماں! جب اس نے دوبارہ طلاق دینے کی دھمکی دی تو میں نے اس کو روپیہ ادا کر دینے کا وعدہ کر لیا جمعہ کے دن وہ اسی غرض سے یہاں آ رہا ہے۔ روپے پا جانے کے بعد شہباز تمام معاملات کو راہ راست پر لے آئیگا"

"لیکن تم اسے روپے دو گے کہاں سے؟" گل بانو کی ماں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"ابھی تمام راہیں مسدود نہیں ہوئیں گل بانو کی ماں...... ......ایک راہ تو اب بھی کھلی ہوئی ہے"

"وہ کونسی؟" اس نے اپنے مغموم چہرے پر خوشی کی لہر پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔

"چوری!"

"چوری!" گل بانو کی ماں نے حیرت سے دھرایا۔

"ہاں! اب اسکے سوا کوئی چارہ نہیں!"

باپ کی گفتگو سنکر گل بانو کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، طلاق کا لفظ معاذ اللہ! گل بانو کو ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے کسی نے اسکے سینہ میں چھری بھونک دی ہے۔ اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود بھی اسے شہباز سے ایسی توقع نہ تھی، یہ اس کے وہم میں بھی نہ تھا، کہ اس کا شوہر اب اتنا خطرناک قدم اٹھائے گا۔

گذشتہ واقعات ایک ایک کرکے اس کی نظروں کے سامنے رقص کرنے لگے۔ کس طرح شہباز نے کھلیان میں آتش زدگی کے باوجود اس سے روپوں کا تذکرہ کیا تھا...... پھر اس کا روٹھ کر بھاگ جانا، اور فرید خاں کو طرح طرح سے گاؤں والوں کے سامنے ذلیل و رسوا کرنا، اور پھر روپے نہ دینے کی صورت میں طلاق دے دینے کی دھمکی۔!

ان باتوں کو سوچکر گل بانو کے جسم میں لرزہ پیدا ہو گیا۔

چھ دن گزر گئے۔ اور فرید خاں روپے مہیا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا آج جمعرات کا دن تھا، اور کل صبح سویرے اسے شہباز کو روپے دینا تھے۔ لیکن ابھی ایک رات باقی تھی، اس نے فیصلہ کیا۔ کہ آج کی رات نصف شب گزر جانے کے بعد وہ زمیندار کے گھر چوری کرے گا۔

——چوری!!

گل بانو کو اپنے باپ کا ارادہ معلوم ہو گیا۔ وہ جان گئی کہ اس کا باپ صرف اس کی خوشی کے لئے آج کتنا خطرناک اور تباہ کن قدم اٹھانے والا ہے۔

وہ منظر اب اسکی آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگا۔ جب اس کا باپ چوری کے الزام میں گرفتار کر لیا جائے گا...... اور پھر اسے اپنی زندگی کا آخری...... بالکل آخری حصہ جیل کی تاریک تنہائیوں میں گزارنا پڑے گا، اور سماج زندگی بھر اسے کیا سمجھے گی ایک چور!...... حقیر اور ذلیل چور، سوسائٹی کا ٹھکرایا ہوا...... درگاہ ایزدی کا راندہ ہوا!

—— اور وہ خودکیا کہلائے گی —— ایک چور کی بیٹی۔ دنیا اسے بھی حقارت کی نگاہ سے دیکھے گی، اور پھر وہ عزت اسے سماج میں کبھی حاصل نہ ہوگی، جو آج اس کو نصیب ہے۔ جسکی آج یہ مستحق ہے۔

جیسے جیسے گل بانو ان باتوں کا خیال کرتی تھی، اسکی پریشانی بڑھتی جاتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا، کہ وہ ایک ایسی دنیا میں پہنچ گئی ہے جہاں صرف تاریکی ہی تاریکی ہے —— جہاں روشنی کی ایک کرن بھی موجود نہیں اور جب گل بانو کو اس ہولناک ظلمت کدہ سے باہر نکلنے کی کوئی تدبیر نہ سوجھی تو پھر اس نے لاچار ہوکر ایک ارادہ کیا۔ خوفناک ارادہ، ایسا ارادہ، جو اس کے باپ کو ان تمام رسوائیوں اور ذلتوں سے بچا سکتا تھا جن سے وہ عنقریب دوچار ہونیوالا تھا۔ صرف یہی ایک واحد ذریعہ تھا۔ جس سے یہ اپنے خاندان کو تمام تکالیف سے نجات دلاسکتی تھی، بس صرف یہی! اس کے علاوہ دوسری کوئی اور تدبیر نہ تھی۔

(۵)

دوسرے دن صبح سویرے شہباز خوشی میں چور ڈھائی سو روپوں کی تھیلی لینے کی غرض سے جھومتا جھامتا حسن پور چلا آرہا تھا۔ گاؤں کے عین وسط میں مسجد تھی، اور فرید خاں کے گھر پہنچنے کے لئے مسجد سے ہوکر گزرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ جب شہباز مسجد کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ کسی جنازے کی نماز ہورہی ہے —— پاس ہی چند لڑکے کھیل رہے تھے۔ شہباز نے ان میں سے ایک سے پوچھا:

"بچے! یہ کس کی لاش ہے؟"

"گل بانو کی! رات اس نے خودکشی کرلی ہے۔"

جناب رام جوایا خنداں

"شکار"

یہ دشت تھا کبھی مرکز مری نگاہوں کا
تھا ذرہ ذرہ حسیں ان شکارگاہوں کا!

نہیں وہ حسن یہاں اسلئے اداس ہوں میں
بہت اداس ہوں تصویر رنج و یاس ہوں میں

وہی ہے وقت، وہی جھیل کا کنارا ہے
فضا میں شام و شفق کا وہی نظارا ہے

وہی بہار کا موسم وہی ہوائیں ہیں
کہیں کلنگ کہیں قاز کی صدائیں ہیں

بہت شکار ہے لیکن شکار کون کرے!
اداس لمحوں کو اب خوشگوار کون کرے

کسی حسین شکاری کی یاد آئی ہے
مرا خیال شکار غم جدائی ہے

کسی کی یاد سے اسوقت بیقرار ہوں میں!
غم جدائی کے صدموں کا خود شکار ہوں میں

جناب اثر چکوالی بی، اے

حدیثِ نگاہ

فضائیں مست ہیں گردش میں جام ہے ساقی
جنوں نوازیوں کا اذنِ عام ہے ساقی

نوائے دردِ محبت کسی کو راس نہیں!
مذاق کتنا زمانے کا خام ہے ساقی

بڑے غرور سے یہ کہہ رہا ہے پروانہ!
حیاتِ سوختنِ نا تمام ہے ساقی

فلک کو چھوڑ کے آگے گزر گیا ہوں میں
بہت بلند نظر کا مقام ہے ساقی

نہ کہہ یہ مجھ سے کہ انجامِ کار کیا ہوگا
کہ میرا عشق سراپا دوام ہے ساقی

جس آب و رنگ میں چاہا اسی میں دیکھ لیا
جہان میری نظر کا غلام ہے ساقی

مرے کدو سے ہے روشن جہانِ تیرہ و تار
مرا کدو ہے، کہ ماہِ تمام ہے ساقی

پیامِ موت ہے دل کے لئے نمودِ ثبات
حیات ایک تغیر کا نام ہے ساقی

مری نگاہ میں ہم مشربِ جنوں کے لئے
خدا گواہ! بڑا احترام ہے ساقی

بہت محال ہے خوب اور زشت میں تمیز
مذاقِ عشق کچھ اس طرح عام ہے ساقی

خود اپنی نظروں میں احساس اپنی ذلت کا
ضمیر کے لئے مرگِ دوام ہے ساقی

میں ہار کر بھی ہوں سرگرمِ بزمِ ہستی میں
غلط غلط کہ مرا ذوق خام ہے ساقی

جناب محمد ایوب

طلوعِ سحر

افراد:۔ سرمایہ دار مزدور سپاہی شاعر

منظر: ایک تنگ و تاریک محبس۔ وقت۔ چار بجے شب۔

حالات:۔ چاروں افراد اسیرانِ جنگ ہیں۔ جنہیں صبح قتل کیا جائے گا۔

سرمایہ دار:۔ اُف رات کتنی جلد ختم ہو رہی ہے۔

سپاہی:۔ بزدل (طنزیہ ہنسی ہنسکر) موت سے ڈرتا ہے۔

(بم اور گولیاں چلنے کی آوازیں آتی ہیں)

مزدور:۔ کتنی بیدردی سے انسان کا خون بہایا جا رہا ہے۔

سپاہی:۔ اس سے زیادہ دلچسپ مشغلہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

شاعر:۔ نوعِ انسان کو ہوسِ ملک گیری میں ککری کی طرح کٹوایا جا رہا ہے۔

مزدور:۔ یہ دنیا کا دستور ہے کہ طاقتور کے ارادوں کی تکمیل کمزور خون سے ہو۔ بادشاہ ملک گیری کے لئے سپاہیوں کو کٹواتا ہے، سرمایہ دار عیش و عشرت کے لئے مزدور کا خون چوستا ہے۔

سرمایہ دار:۔ (انکی باتوں میں دلچسپی نہ لیتے ہوئے) ہائے بھیانک موت منہ پھاڑے نگلنے کے لئے تیار کھڑی ہے۔

شاعر:۔ موت کو بھیانک نہ کہو۔ موت ایک حسین دنیا میں لیجاتی ہے۔ جہاں رنگینیاں برستی ہیں، جہاں امن و سکون ہے ٹھہرو اس موضوع پر تمہیں ایک نظم سناؤں، جو میرا شاہکار ہے۔

(اپنے لباس میں نظم کا کاغذ تلاش کرتا ہے)

مزدور:۔ لیجئے آپ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی موت کی سرزمین کی سیر کر آئے۔ جبھی تو لوگ کہتے ہیں، کہ شاعر دیوانہ ہوتا ہے۔

سپاہی:۔ اور امن و سکون کے بھی آپ متلاشی ہیں، بزدل سکون اور امن میں کیا رکھا ہے۔ کوئی ہنگامہ ہو، کشمکش ہو۔

مزدور:۔ سکون جمود ہے۔ اور جمود موت، ہمارا شاعر زندہ ہوتے ہوئے بھی مردہ ہے۔

شاعر:۔ (گویا اس نے اب تک کچھ سنا ہی نہیں، خدا جانے کاغذ کمبخت کہاں غائب ہو گیا۔ ملتا ہی نہیں۔

سپاہی:۔ (قہقہہ مار کر) تو یہ اب تک نشے میں تھا۔

سرمایہ دار:۔ یہ کون اتنی خطرناک حالت میں قہقہے لگا رہا ہے۔

مزدور:۔ زندگی عبارت ہے خطروں سے اور مرد وہ ہے جو خطرناک سے خطرناک موقعوں پر قہقہے لگائے۔

شاعر:۔ زندگی خطروں سے عبارت ہے نہیں، نہیں، زندگی ایک سہانا خواب ہے۔ اور محبت سے اس کی رنگینیاں قائم ہیں۔

مزدور:۔ اس خیالی دنیا میں بسنے والے کو اگر پیٹھ پر دو من کا بوجھ لاد کر، چلچلاتی دھوپ میں تپتی ہوئی سڑک پر چلنا پڑے تو اسے معلوم ہو کہ زندگی سہانا خواب ہے یا سخت ترین عذاب۔

شاعر:۔ خیر زندگی عذاب ہی سہی، مگر محبت جو حوصلہ افزائی کے لئے ہے۔ محبت کی شراب ان چیزوں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

مزدور:۔ تم نے ساری عمر خیالوں میں بسر کی اور کیسے بے بنیاد خیالات محبت نفس کی رنگین خواہشوں کے اظہار کا مہذب ذریعہ ہے۔ اور بس۔

شاعر:۔ اُف اگر میرے کانوں میں کوئی پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیتا تو اسقدر صدمہ نہ ہوتا، جتنا تمہارے ان الفاظ سے ہوا۔

مزدور :- حقیقت بہت تلخ ہوتی ہے۔

(افق پر اجالا نمودار ہوتا ہے)

سرمایہ دار :- اب کیا وقت ہوگا؟

مزدور :- کبھی یہ سوال کرنے پر سرمایہ دار ہماری کھال ادھیڑ دیتے تھے، کہ تمہیں وقت سے کیا سروکار، بس کام کئے جاؤ۔ مگر میں اتنا سنگدل نہیں، کہ اس وقت تمہیں وقت نہ بتاؤں، صبح ہو رہی ہے۔

سرمایہ دار :- کیا صبح ہو رہی ہے ہائے کیا کروں، کہاں جاؤں، کیا تم لوگ موت سے نہیں ڈرتے؟

مزدور :- ہماری زندگی کونسی خوشگوار ہے، جو ہم موت سے ڈریں

سپاہی :- کبھی مرد بھی موت سے ڈرتے ہیں۔

شاعر :- موت سہانی ہے، موت کے جزیرے میں رنگینیاں ہیں۔

(اجالا بڑھتا جا رہا ہے۔ باہر سپاہیوں کی بات چیت کی آواز آ رہی ہے۔)

سرمایہ دار :- (کھڑا ہونے کی کوشش کرتا ہے، مگر گر پڑتا ہے) یا اللہ کیا کروں۔ اُف ہائے۔

شاعر :- اسے تسلی دینا چاہیئے، یہ بہت خوفزدہ ہے۔

مزدور :- اسے تسلی دینا بیکار ہے۔ موت خود آ کر اسے تسلی دے دے گی۔

(پیروں کی چاپ سے معلوم ہوتا ہے، کہ سپاہی ادھر آ رہے ہیں)

سپاہی :- (تن کر کھڑا ہو کر مضبوط آواز میں) دوستو! ہماری زندگی کا آخری لمحہ آ پہونچا اس وقت تم یہ ثابت کر دو۔ کہ ایک بہادر سپاہی کے رفیق ہو۔ جسے موت کا ذرہ بھر غم نہیں۔

مزدور :- یقیناً

(سپاہی اندر آتے ہیں ان موت کے فرشتوں کو دیکھ کر شاعر کی رنگینیت رخصت ہو جاتی ہے اور وہ بے اختیار چیخ اٹھتا ہے۔ سرمایہ دار بھی بری طرح چلانے لگتا ہے۔)

(پردہ کرتا ہے)

جناب ضیا فتح آبادی ایم اے

غزل

گلوں نے کہہ دیا آخر چمن سے
وطن کی شان ہے اہلِ وطن سے

یہ میرے شوق کا انجام توبہ
نکالا جا رہا ہوں انجمن سے

خدا جانے عداوت کس لئے ہے
زمانے کو اسیرانِ محن سے

جھلکتی ہے ادائے حسن تیری
گلوں سے نسترن سے یاسمن سے

اسی امید پر موجیں رواں ہیں
کبھی تو چاند نکلے گا گہن سے

کبھی ہوگی تو پھر ہوگی یقیناً
طلوعِ صبح چاکِ پیرہن سے

بیاباں میں بڑی آزادیاں ہیں
نکل چل اے ضیا قیدِ چمن سے

محترمہ ب ۔ ج ۔ رضوی

ننگ و ناموس

میری طلعت !

جی تو نہیں چاہتا مگر تم کہو تو یقین کر لوں کہ تم نے ہمیشہ کے لئے مجھے اپنے دل سے فراموش کر دیا ہے ——— آہ کاش مجھے بھی یقین آجاتا ۔

تمہاری ظالم خاموشیوں کے اس موجودہ دور میں مجھے ہر ساعت وہ گیا گذرا زمانہ یاد آتا ہے ۔ جب تم برہمی کے عالم میں مجھے دنیا بھر کی باتیں کہہ لینے کے بعد بھی اس قدر سنگدل نظر نہ آسکتی تھیں ، زمانہ کیا سے کیا کچھ ہو گیا مگر مجھے تو اب بھی یقین ہے کہ میں وہی بدنصیب فیروزہ ہوں جسے تم ہر طرح اپنی محبت کا اعتبار دلایا کرتی تھیں ۔ اگر کبھی میں کہہ دیتی کہ " کیا خوشگوار مستقبل میں محو ہو کر مجھے بھول جاؤ گی طلعت ؟ " تو تم مجھ سے ایک دم ناراض ہو جاتیں اور پھر ——— پھر خود ہی اُسے منانے لگتیں اور ہر ممکن طریقہ سے مجھے تسکین دینے کی کوشش کرتیں ۔ تمہارے یہ جان نواز الفاظ آج بھی میری سماعت میں محفوظ ہیں کہ " میں تمہیں کبھی فراموش نہیں کر سکتی فیروزہ ! تم دنیا میں مجھے ہر شے سے زیادہ عزیز ہو ۔ یہ ظالم سنسار ممکن ہے ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دے ——— کر دے لاکھ بار ——— مگر تم ہر وقت مجھ سے اسی طرح قریب رہو گی جیسے میرا دل " ——— اور پھر تم بے اختیار اپنے بازو میری گردن میں حمائل کر دیتیں ——— اور میں فرطِ مسرت سے بیخود ہو جاتی ——— مجھے ہر طرف محبت ہی محبت نظر آتی اور ——— کچھ دیر کے لئے مجھے محسوس ہونے لگتا کہ دنیا نے اپنی تمام خوشی مجھ پر نچھاور کر دی ہے ۔

مگر آہ وہ پر کیف زمانہ تو کہیں کھو گیا ——— اب اس کا تذکرہ بھی کوئی کیوں کرے ——— تم مجھے بھول گئیں تو مجھے اب کوئی بات کیوں یاد رہے ——— ؟

سچ بتاؤ طلعت ! کیا اب تمہارے دل میں کوئی دھڑکن ایسی نہیں رہی جو تم میرے خیال پر ضائع کر سکو ——— کیا اب تمہارے رات دن میں کوئی حقیر لمحہ اس قابل نہیں رہا کہ مجھے دو لفظ لکھنے پر صرف کر دو ؟ ——— کیا سکول کا وہ رنگین و معصوم زمانہ تمہیں یاد نہیں آتا جب میرے بغیر وہاں تمہارا جی نہ لگتا تھا ——— جب میری ذرا سی خاموشی تمہیں بیقرار کر دیتی تھی اور میری ذرا سی تکلیف سے تم اپنی ہر راحت کو بھول جاتی تھیں ——— اگر یہ سب کچھ اب تمہیں یاد نہیں تو خدارا ایک بار کہہ دو کہ ہاں میں بھول گئی ——— تو بھی بھول جاؤں ——— !

دو ماہ کا طویل عرصہ گذر گیا مگر تمہاری پیاری تحریر نظر نہ آئی ——— تمہیں کیا خبر کہ محرومی کے اس احساس نے میری کتنی کامرانیوں کو جان بلب کر رکھا ہے ۔ میری آنکھیں بیقرار ہیں ۔ اور اشک افشانی پر مجبور ——— روزانہ انتظار کرتی ہوں ۔ مگر تمہارا مکتوب نہیں آتا ——— تم خط نہیں بھیجتیں مگر میں پھر بھی انتظار کر رہی ہوں ——— اور کچھ نہیں تو میرے اس جنونِ شوق ہی کی شرم رکھ لو ۔

پھر ابھی تو تم " دلہن " بھی نہیں بنی ہو ۔ کہ تمہاری خاموشی کو شرم و حجاب سمجھ کر ہی صبر کر لوں ۔ تمہارے اوقات پر

ابھی کسی "اور" کا تصرف بھی نہیں ہوا کہ تمہیں فراموش کار کی بجائے خود فراموش سمجھ لیا جائے۔ ابھی تو تم آزاد ہو تتلی کی طرح!— مگر پھر بھی یہ بیچینی —— یہ جمود!!

میری طلعت! خدارا اپنی بدنصیب فیروزہ کو صرف ایک مرتبہ اور یاد کرلو —— پھر یہ شکوہ کرے تو تم اپنے ہونٹ سی کر بیٹھ جانا۔

ہاں وہ ہمارے وسیم بھائی یعنی تمہارے ہونے والے "وہ" آج کل کہاں ہیں! شرماؤ نہیں! —— پہلے کرم فرمائی کا سلیقہ سیکھ لو پھر شرمانا۔ ظالموں کے رخساروں پر حجاب و شرم کا رنگ اچھا معلوم نہیں ہوتا۔

رخصت ہوتی ہوں۔ خالہ جان کی خدمت میں آداب۔

—————— تمہاری مجبور و پریشان فیروزہ

فیروزہ پیاری!

تمہارا عتاب نامہ ابھی ابھی ملا ہے —— آہ تم نے اس لطف آگیں زمانے کا تذکرہ چھیڑ کر میرے درد میں اور اضافہ کر دیا۔ تمہارا مکتوب متعدد بار پڑھا ہے۔ اور یقین کرلو کہ ہر بار متعدد آنسو آنکھوں سے بہہ گئے ہیں —— کیا تمہارے تمام شکوے اتنا کچھ معلوم کرنے کے بعد بھی آسودہ نہیں ہوئے؟

تم میری خاموشی کی شاکی ہو؟ —— مگر آہ یہ خاموشی نہیں —— مردنی ہے —— کیا تم چاہتی ہو کہ ایک نعش تمہارے لئے زندہ ہو کر محبت کا مظاہرہ کرے۔ آہ تمہیں میری حالت کی خبر نہیں ورنہ بدگمانی کو اس قدر راہ نہ دیتیں ؎

انہیں بدگمانیاں ہیں میری پائمالیوں پر • لب نعش پر بھی یارب وہ کراہ چاہتے ہیں

میرے دل کی راکھ میں بھی وہ شرر کو ڈھونڈتے ہیں • وہ ہلاکِ سوزِ الفت سے بھی آہ چاہتے ہیں

میں کہاں سے لاؤں یارب وہ بجھے ہوئے شرارے!

سمجھیں کچھ! —— معلوم ہوا کہ تم کس سے یہ شکوے کر رہی ہو؟ —— میری نادان فیروزہ! —— آہ اب وہ طلعت مر چکی —— یا یوں کہو کہ آہستہ آہستہ مر رہی ہے۔

تعجب کیوں کرتی ہو! —— گھبراؤ نہیں تم نے یہ تذکرہ چھیڑ دیا ہے تو میں اپنی پوری داستان سنا کر دم لونگی —— تم سنو یا نہ سنو . . . .

سب سے پہلے تو اس چیز پر ایمان لے آؤ کہ میں تمہیں کسی حالت میں بھی فراموش نہیں کر سکتی۔ دنیا میں صرف تم ہی میری ہمدرد و ہمراز سہیلی ہو۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ ہنس ہنس کر تمہیں ہنساتی تھی —— آج وہ وقت بھی آگیا کہ رو رو کر تمہیں رلاؤں۔ مگر یاد رکھو یہ آنسو جو آج تمہارے سامنے میری آنکھوں سے چھلکینگے۔ اس وقت تک صرف دل میں محفوظ رہے ہیں۔ اگر تم ان کی قدر نہیں سمجھ سکتی ہو تو ان کو رسوا کر دینا ورنہ اپنی پلکوں میں جذب کرکے رکھ لینا۔

تم سے جدا ہوئے چھ ماہ ہو گئے ہیں۔ تمہیں کیا خبر کہ اس زمانے میں کیا کیا انقلاب آئے اور انہوں نے تمہاری طلعت کو کس طرح بدل کر رکھ دیا۔ تم جانتی ہو میں "انہیں" کس قدر چاہتی تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی یہ محسوس ہوا کہ "وہ" میرے ہیں۔ طفولیت کے زمانے سے ہی مجھے یہ علم تھا کہ بزرگوں نے ہم دونوں کی قسمتوں کو ایک کر دیا ہے۔ یہ والدین کا فیصلہ تھا —— خاندان کا فیصلہ —— سماج کا حکم —— اور ہم دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا —— وہ روز بروز میرے ہوتے چلے گئے اور میں ساعت

یہ ساعت ان کی محبت میں جذب ہوتی چلی گئی۔ بایں ہمہ تم جانتی ہو فیروزہ کہ نظر و سماعت کے لحاظ سے میں ہمیشہ اُن سے دور رہی اور وہ مجھ سے ——— جی چاہتا تھا ان کو دیکھوں ——— ساری دنیا سے چھپ کر ان کو صرف ایک بار دیکھ لوں ——— کان ترستے تھے کہ ان کی آواز سن لیں ——— پھر یہ بھی ہے کہ ایسے مواقع بھی اکثر آئے ——— چاہتی تو انہیں دور سے ایک لحہ کو دیکھ لینا دشوار نہ تھا۔ مگر نہیں ——— میں نے نہ دیکھا ——— انہوں نے بھی نہ دیکھا ——— اپنے دل کو تو اس خیال سے اطمینان تھا کہ کچھ دن اور ہیں ——— پھر یہ شدید محرومی کہاں سے آئیگی ——— ہم جلد ہی ایک دوسرے کے ہو جائینگے۔ پھر زندگی بھر میری نظریں ہونگی اور ان کی صورت ——— میری سماعت ہوگی اور ان کی شیریں آواز۔

زمانہ گذرتا گیا۔ اب میں انٹرنس میں تھی اور وہ بی۔ اے میں ——— ابا جان کا خیال تھا کہ امتحان سے ہم دونوں کو فراغت ہو جائے تو شادی کر دی جائے ——— مگر بیداد گر قسمت کچھ اور سوچ رہی تھی۔ ظالم سماج کسی اور فکر میں تھا ——— اسی زمانے میں تقسیم جائداد کا جھگڑا بیدار ہو گیا اور ابا جان اور چچا جان میں سخت رنجش پیدا ہو گئی۔ آخر اس کشمکش کا انجام یہ ہوا کہ امی جان نے میری منگنی کو توڑ دیا ——— آہ میرے دل پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تم جانتی ہی ہو۔ کہ مظلوم دوشیزہ لڑکیوں کو ان معاملات میں رونے کی بھی اجازت نہیں۔ مجھے معلوم نہیں مذہب کا صحیح حکم کیا ہے مگر اب تو سماج ہی مذہب ہے ؟ ——— سماج ہی خدا۔ ——— دنیا کے تمام مرد اب تو سماج ہی کو پوجتے ہیں۔ نوجوان نسل کا خون بہایا جا رہا ہے ——— وہ کچھ کہے تو کافر ——— ہنسے تو بے شعور ——— روئے تو بے حیا ——— پھر ان حالات میں کیا کر سکتی تھی ——— کلیجہ خون کر کے بیٹھ گئی ——— یہی وہ زمانہ تھا۔ جب مجھے سب سے پہلے مرنے کی دعائیں مانگنی پڑیں۔ دن رات رونے میں گذرتا تھا ——— مگر ان آنسوؤں کو کوئی دیکھ نہ سکتا تھا۔ میں نے ضبط کیا۔ اور اس انتہا تک کہ اُن کو بھی کچھ خبر نہ ہونے دی ——— مگر آخر تا کجا ؟ ——— ان کو سب کچھ معلوم ہو گیا ——— اور ایک شب وہ اُٹھ کر چلے گئے خدا جانے کہاں ———

عرصہ ہو گیا لیکن کسی کو علم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں ہیں۔ میری حالت جو کچھ تھی اسے کوئی بھی نہ جانتا تھا۔ مرنے کی دعائیں مانگتے مانگتے ہاتھ تھک گئے۔ لوگ کہتے تھے اسے دق کا مرض ہو گیا ہے۔

مگر آخر ایک روز مجھے ان کا ایک خط موصول ہوا۔ اس پر کوئی پتہ تحریر نہ تھا ——— نہ ان کا نہ میرا ——— خدا جانے مجھ تک کیسے پہنچا۔ کانپتے ہاتھوں سے چاک کیا ——— دل اتنی بری طرح دھڑک رہا تھا۔ کہ کچھ بھی پڑھا نہ جاتا تھا ——— خط یہ تھا:۔

طلعت ——— خوش رہو

تمنا تھی کہ تمہارے نام سے پہلے "میری" کا لفظ لکھتا ——— مگر نہیں لکھ سکتا۔ کیونکہ کچھ زمانے کے بعد تم کسی دوسرے کو سونپ دی جاؤگی ——— کسی اور کے گھر کی زینت ہوگی۔ مجھے کبھی اس چیز کا تصور بھی نہ تھا طلعت کہ تم مجھ سے چھن جاؤگی میں مسرور تھا۔ اور اپنی قسمت پر مغرور ——— مگر آہ انسان کی مسرتیں تقدیر کے قدموں میں کس قدر آسانی سے چور چور ہو جاتی ہیں۔ میں علیگڑھ سے بغیر کسی اطلاع کے چلا آیا۔ اور اب نہ معلوم کہاں جاؤں گا ——— اب میں وہاں کر تا بھی کیا۔ "جب سر پھوڑنا ہی ٹھہرا" تو سنگ آستاں کی تخصیص ہی کیا ؟

کبھی میں یاد آجاؤں تو مجھے گنہگار سمجھ کر معاف کر دینا ——— اچھا تو یہی ہے کہ مجھے رفتہ رفتہ بھول جاؤ۔ دنیا کی نظروں میں میری یہ تحریر ایک گناہ ہے۔ میں بھی آئندہ یہی سمجھنے کی کوشش کروں گا ———

تمہارا بدنصیب وسیم"

اس خط کو آج تین ماہ ہو گئے۔ کسی کو پتہ نہیں۔ وہ کہاں ہیں۔
تم سمجھ سکتی ہو فیروزہ۔ میں اپنی زندگی کے صبرآزما لمحات کیسے گذار رہی ہوں!
خودکشی کے تصور سے روح لرز جاتی ہے۔ دنیا کو خدا کا خوف نہیں رہا۔ مگر مجھے ابھی تک یہ خوف محسوس ہو رہا ہے دیکھئے زندگی کے یہ کٹھن دن کیسے گذرتے ہیں۔
پھر آخر میں یہ بھی سن لو کہ میرا جنازہ اٹھانے کے واسطے اب کسی "اور" کا انتخاب کیا جا رہا ہے۔ شاید نام ہے —— بمبئی میں کسی کالج میں پروفیسر ہے۔ لوگوں کا ارادہ دو سں بیس روز میں میری "خانہ بربادی" کا ہے۔ خدا کے لئے تم ضرور آنا ورنہ شاید اپنی بدنصیب طلعت کو پھر نہ دیکھ سکو۔ تم کیا سمجھو کہ مرنے والے کو ایک پرخلوص نوحہ خواں کی موجودگی بڑی سہارا ہوتی ہے۔
زندگی رہی تو پھر حالات سے مطلع کروں گی۔

تمہاری نامراد
طلعت

فیروزہ! میری محرم راز!!

تم خفا ہو گئیں؟ —— للہ معاف کر دو۔ میں کیا سے کیا ہو گئی۔ اور تمہیں اطلاع بھی نہ دے سکی۔ تمہارے مکتوبات پیہم موصول ہوئے مگر میں نے ایک بھی جواب نہ دیا۔ تمہاری علالت کو سنا لیکن میں خاموش رہی۔ ممکن ہے کہ مجھے مردہ سمجھ لیا ہو۔ مگر نہیں تمہاری طلعت زندہ ہے۔ اور ایک پُرتبسم زندگی گذار رہی ہے جس کا تصور بھی نہ ہوگا۔ متعدد بار تمہیں خط لکھنا چاہا۔ مگر وسیم صاحب کی علالت نے اجازت نہ دی۔ تم حیران ہو گی کہ یہ وسیم صاحب کہاں سے نازل ہو گئے —— متعجب نہ ہو —— کبھی کبھی اندھیرے سے بادلوں کو چاک کر کے یک لخت چاند نکل آتا ہے —— سنو!
تمہیں خط لکھنے کے پندرہ روز بعد میری شادی ہو گئی —— وہ وقت مجھ پر کس قیامت کا گذرا اس کا احساس تم اچھی طرح کر سکتی ہو۔ کئی مرتبہ ارادہ کیا۔ کہ اپنی زندگی کو بس اسی جگہ ختم کر دوں —— یا پھر کسی طرف دیوانہ وار نکل جاؤں —— ہر جگہ "انہیں" تلاش کروں۔ اور اس تلاش میں خود بھی گم ہو جاؤں۔ مگر شرم و غیرت نے دامن نہ چھوڑا —— ہر ارادہ ذہن میں آیا اور فوراً گیا —— اپنے مقدر پر شاکر ہو کر خاموش ہو رہی۔ گھر میں کون تھا۔ کہ خوشی نہ منا رہا ہو۔ ابا جان اور امی جان بھی مسرور تھیں کہ چلو آج یہ بوجھ بھی دور ہوا۔ کوئی جیئے یا مرے۔ ان کی ضد اور پندار کی شرم تو رہ گئی۔
میں اپنی سہیلیوں سے بھی چھپ چھپ کر رو رہی تھی۔ سوچتی تھی کہ کاش فیروزہ ایسے وقت علیل نہ ہوتی وہ میرے پاس ہوتی تو ان بیکس آنسوؤں کا دیکھنے والا تو میسر ہو جاتا۔
آخر وہ وقت آیا کہ میں سسرال پہنچ گئی دل چاہتا تھا کہ کہیں بھاگ جاؤں —— کانپ رہی تھی —— رو رہی تھی —— ان کا تصور آج انتہائی شدت سے محسوس ہو رہا تھا۔
آخرکار وہ آئے —— پاؤں کی آہٹ سے لرز گئی۔ دل اُچھل کر سینے تک آیا —— اور ایک بار دھک سے ہو گیا۔

"طلعت! اپنی شادی کی شرکت میں مدعو بھی نہ کیا" —— انہوں نے کہا —— مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے بجلی کی رو سر سے پاؤں تک سنسناتی ہوئی گذر گئی ہے۔ سوچتی تھی یا اللہ کان دھوکا تو نہیں کھا رہے ہیں —— یہ آواز تو وسیم جیسی ہے۔

وہ اور قریب آگئے اور بولے —— "کانپ کیوں رہی ہو طلعت! ارے تم تو رو بھی رہی ہو۔ ادھر دیکھو!

——" بے اختیار میری نظر اٹھی۔

سامنے وسیم کھڑے مسکرا رہے تھے!

یہ سب کچھ کیسے ہو گیا یہ طویل مگر دلچسپ داستان ہے۔ تم آؤ گی تو ان کے سامنے ہی کہوں گی۔ مختصراً یہ سمجھ لو کہ شاہد رہی تھے مگر یہ حقیقت نکاح کے لیے تک معلوم نہ ہو سکی —— سب حیران تھے مگر تم جانتی ہو۔ ہم سب سماج کے احکام کے ماتحت ہیں۔ کس کے کلیجے میں اتنی ہمت تھی کہ بارات کو ناکام واپس بھیج کر اپنی ناک کٹوا لیتا۔ چپکے چپکے سب کچھ ہو گیا۔ اور کسی نے دم نہ مارا۔ لوگوں کو مذہب اور خدا کا ڈر نہیں، مگر عزت کا ڈر ضرور ہے۔ پھر یہ بھی ہے۔ کہ اب وہ ایک پروفیسر تھے۔ کئی سو روپیہ ماہوار مشاہرہ پانے والے —— ایک دولت مند انسان —— زر و مال کے جھگڑوں نے اس رشتے کو توڑا تھا —— زر و مال نے پھر جوڑ دیا۔ "پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے"

اب تم جلد لکھو کب آؤ گی۔ تاکہ ایک بار اس داستان کی تمثیل کی جائے اور پھر "ننگ و ناموس" کے اس احمقانہ ڈرامے پر خوب دل کھول کر ہم تینوں قہقہے لگائیں۔

تمہاری طلعت

جناب احمد ندیم قاسمی بی اے

غریب کا تحفہ

مجھے اس سے بحث نہیں۔ کہ وہ کون تھی۔ کہاں کی رہنے والی تھی۔ میں تو صرف یہی کہہ سکتا ہوں اور یہی کہنا چاہتا ہوں۔ کہ میں نے اُسے دیکھا۔ اور دیکھتے ہوئے مجھے یہ محسوس ہوا کہ میری زندگی کا انتہائے مقصد اس نازنین کی صورت میں متشکل ہو کر میرے سامنے محوِ خرام ہے! میں نے اسے گاؤں سے باہر ایک کھنڈر کی جھکی ہوئی دیوار پر اُپلے تھوپتے ہوئے دیکھا اس نے مجھے ایک بار یونہی دیکھ لیا۔ اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی میں نے بھی اسے یونہی دیکھ لیا۔ اور آگے چلا گیا۔ اُپلے تھوپنا کوئی ایسا تعجب انگیز کام نہ تھا۔ کہ میں اسے غور سے دیکھتا۔ گاؤں کی ہر عورت صبح اٹھ کر نماز سے پہلے یہی کام کرتی ہے، میں سیدھا گھر آ گیا!

دوسرے دن میں منہ اندھیرے ہی گھر سے نکلا۔ کیونکہ اس دن میں نے ایک بہت اونچی چوٹی پر سورج کے طلوع ہونے کا منظر دیکھنے جانا تھا۔ میں گاؤں سے باہر آیا۔ تو ایک سایہ سا سر پر ٹوکری اٹھائے میرے آگے آگے رینگتا نظر آیا۔ میں نے یونہی پوچھ لیا "کون ہے بھائی؟"—

"جی میں ہوں" یہ ایک عورت کی آواز تھی۔ میں خاموش ہو گیا۔ طلوعِ خورشید کا منظر دیکھ کر میں اسی راستے سے واپس ہوا۔ تو اسی دیوار پر اُپلے تھوپے جا رہے تھے۔ اس نے مجھے ایک بار دیکھا۔ اور اس کے دیکھنے میں کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔ کہ میں رُک جاتا۔ میں چلا گیا۔ اور وہ سر جھکائے اپنے ہاتھوں کو تیزی سے جنبش دیتی رہی۔

اور یہ منظر میں نے صرف دو دن ہی نہ دیکھا۔ متواتر دس دن مجھے یہی لڑکی اسی کھنڈر کے پاس اپنے کام میں بیحد مصروف نظر آئی۔ دسویں دن میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا۔ کہ آخر یہ لڑکی اپنے گھر اُپلے کیوں نہیں تھوپتی۔ یہاں بھیانک کھنڈر کی کمزور دیوار سے اسے کیا لگاؤ!———لیکن میں ان دنوں اپنی شادی کی تیاریوں میں اس طرح مصروف رہتا تھا۔ کہ کسی ایک خیال کا مسلسل طور پر میرے دماغ پر مسلط رہنا بے حد ناممکن تھا———میں اپنے گھر آ گیا!

ایک دن میں صبح سویرے اٹھ کر گاؤں سے باہر گیا۔ تو وہ رستے میں بیٹھی گوبرا تھا رہی تھی۔ رستہ ذرا تنگ تھا۔ میں اس کے پاس آ کر رُک گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ اور تیزی سے ایک طرف ہو کر بولی "گزر جائیے جی"

میں نے ایک قدم اٹھایا مگر مڑ کر صرف اتنا پوچھ لیا "تم کس کی بیٹی ہو لڑکی؟"

"میں پردیسی ہوں جی۔ میرے ماں باپ مر گئے ہیں" اس نے اپنی پھٹی ہوئی چادر جلدی سے اپنے سینے پر پھیلاتے ہوئے کہا۔

"کس کے اُپلے تھوپتی ہو؟"

"اپنے جی۔ انہیں بیچ کر پیٹ بھرتی ہوں"

میں آگے نکل گیا۔ ایک بار مڑ کر دیکھا۔ تو وہ ایک اور جگہ بیٹھی ٹوکری میں گوبر ڈال رہی تھی۔ میری کنپٹیوں کی رگیں قدرے پھول گئیں۔ اور میں راہ کے ہموار ہونے کے باوجود ہانپنے لگ گیا———! واپسی پر میں نے اسے اسی دیوار کے پاس جھکتے اور اُٹھتے ہوئے دیکھا۔ دوسرے دن وہ پھر مجھے اسی راستے پر ملی۔ میں اس کے قریب آ کر رُک گیا۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور بولی "آپ ہیں جی؟"

"ہاں" میں بولا "بہت سویرے نکلتی ہو گاؤں سے!"

"سویرے نہ نکلوں تو دوسری گوبر اٹھانے والیاں رستے صاف کر جائیں———اور میرا تو یہی روزگار ہے جی"

میں دو چار لمحے وہیں کھڑا رہا۔ وہ وہاں سے ٹوکری اٹھا کر آگے جانے لگی۔ مجھے خاموش کھڑا دیکھ کر پوچھا "آپ صبح سویرے کہاں جاتے ہیں جی؟"

"سیر کرنے"

"اچھا جی تو" اس نے یہ الفاظ اس انداز سے کہے گویا وہ میرا مطلب نہیں سمجھی!

چار دنوں کے لئے مجھے گاؤں سے باہر جانا پڑا۔

پانچویں دن آیا۔ تو صبح سویرے اٹھکر اس طرف چلدیا۔ وہ بھینسوں کے ایک گلے کے پیچھے پیچھے جا رہی تھی۔ اچانک وہ گوبر اٹھانے کے لئے جھک گئی۔ میں اس کے قریب گیا۔ تو اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور قدرے اداس مسکراہٹ سے پوچھا۔

"آپ کہاں چلے گئے تھے جی؟"

"پردیس میں کچھ کام تھا!"

"میں چار دن آپ کو بہت دیر تک دیکھتی رہی۔ میں نے کہا اللہ خیر کرے۔ ملک جی نہیں آئے۔ میں تو آج آپ کو گھر پوچھنے کے لئے جانے والی تھی!"

میرا دل دھڑک کر بجلی کی ایک لہر بن گیا۔ جسم سُن ہو کر رہ گیا۔ اور کانوں میں ایک بے نام سی گونج پیدا ہو گئی!

بادلوں کے دو چار ننھے ننھے ٹکڑے مشرقی پربت پر منڈلا رہے تھے۔ ابھرتے ہوئے سورج کی لرزتی ہوئی کرنوں کو دیکھ کر ان کے چہرے لمحہ بہ لمحہ لال ہو رہے تھے۔ اور ان کا عکس تمام وادی پر مہین ارغوانی پردہ پھیلا رہا تھا۔ گیہوں کے تازہ اُگے ہوئے پودے اوس کے بوجھ سے زمین پر جھکے ہوئے تھے۔ اور دور بھینسوں کا گلہ چرانے والا کاموں مہیوال ایک گیت دردناک سُروں میں الاپ رہا تھا!

اس وقت میں نے لڑکی کو کچھ ایسی نظروں سے دیکھا۔ کہ وہ کانپ کر شرما گئی۔ اس کا رنگ پربت کی چوٹی پر منڈلانے والوں بادلوں کا سا ہو گیا۔ اس کی گہری سیاہ آنکھوں پر پھیلی ہوئی پانی کی جھلی تک بھی گلابی ہو گئی۔ اس نے جھک کر ٹوکری اٹھائی۔ اور آگے جانے لگی۔ مہینوال بہت دُور جا چکا تھا۔ اور گاؤں کے آس پاس کوئی شخص نظر نہ آتا تھا۔ اُپلے تھوپنے والی کی کھلی آستینوں والی میلی قمیص نرم نرم جھونکوں سے آہستہ آہستہ لہرا رہی تھی۔ اور جس بازو سے اس نے ٹوکری کو تھام رکھا تھا۔ وہ شانے تک عریاں تھا ــــــ میرا دل دھڑک اٹھا۔ میں بے ارادہ اس کی طرف تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ ایک گنجان جھاڑی کے پاس میں نے اسے جا لیا۔

اس کی آنکھوں میں خوف تھا۔ اور ہونٹوں میں تھرتھری۔ اُسکے کھلے بال اس کے رُخساروں اور کانوں کو ڈھانپے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مجھ سے بھاگ جانا چاہتی ہے۔ وہ ایک طرف گول گول پتھروں کی دیوار کے ساتھ چمٹ گئی!

"آپ ــــــ ملک جی آپ کیا کہتے ہیں مجھے؟" اس نے ٹوکری کو دونوں ہاتھوں سے مضبوط تھام لیا۔ اس کا دوسرا بازو بھی ننگا ہو گیا۔ میلی چادر سینے سے ڈھلک کر ایک طرف لٹکنے لگی۔ اور وہ زور سے سانس لینے لگی۔

میں گھبرا گیا۔ میں اسے کیا کہوں! ــــــ میں اسے کیا کہوں!

ــــــ میں اسے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ ایک ذرا سی بات ــــــ الفاظ حلق تک آکر رُک جاتے تھے۔ میرا دماغ گونجنے لگا! دل کی رفتار غیر معمولی طور پر تیز ہو گئی۔ میری زبان لڑکھڑانے لگی۔ میں نے جھجک کر اس کا نام پوچھا۔

"خانی" اس نے یہ لفظ یوں کہا۔ جیسے اس نے ایک بہت بھاری مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر لیا ہے!

میں واپس ہو پڑا۔ مجھ سے اب وہاں زیادہ نہیں ٹھہرا جاتا تھا میری نبضوں میں آگ لگ گئی۔ میں گاؤں میں داخل ہوا۔ تو ایک نوجوان مستری دینو ملا "السلام علیکم ملک جی" وہ بولا "خیر تو ہے آپ کا چہرہ اس قدر زرد کیوں ہو رہا ہے؟"

"خیریت ہے بھائی" ــــــ اور میں تیزی سے آگے نکل گیا۔ نوجوان میرے پیچھے زور سے کھانسا۔ کھانسی مصنوعی تھی! ــــــ میرے دل میں جیسے کسی نے چٹکی لی!

دن بھر میں یہ بات پر نہ گیا۔ نمبردار نے دو تین میراثیوں کے ہاتھ کہلا بھیجا۔ کہ میں لاہور سے سہگل اور اختری بیگم کے نئے ریکارڈ خرید لایا ہوں۔ تمام گاؤں صرف تمہارا منتظر بیٹھا ہے۔ لیکن میں نے کوئی نہ کوئی بہانہ تراش کر انہیں ٹال دیا! ابا آئے۔ پوچھنے لگے "آج پڑھا کچھ نہیں؟" میں نے کہا "جی۔ سر میں درد ہے" ان کی آن میں انگریزی اور یونانی دوائیوں کا ایک انبار میرے سامنے تھا! ــــــ والدین کی محبت کتنی انجان ہوتی ہے!

شام کو چھت پر ٹہلنے کے قصد میں اپنے کمرے سے نکلا۔ دیوار دل کے منڈیر پر [illegible] پڑی ہوئی تھیں بے ارادہ میری زبان سے یہ الفاظ نکل گئے: "ماں۔ یہ اپلے کس نے تھوپے!"

"نرگس نے اور کس نے!"

"اچھا ——— نرگس نے! ——— میں سمجھا کہیں سے خریدے ہیں!"

میں شام کے اندھیرے میں گھر سے نکلا۔ اور اسی کھنڈر کی طرف چل دیا۔ اپلوں پر اپلوں والی کی نازک انگلیوں کے نشانات تھے۔ جن پر میں اپنی انگلیاں پھیرتا رہا۔ سامنے اندھیرے میں مجھے میرے شہر کی شکست ہنستے نظر آئے۔ اور پھر اسی اندھیرے سے ایک لڑکی ٹوکری اٹھائے ہوئے لہراتی ہوئی ابھری۔ اور اندھیرے میں غائب ہو گئی! ———

گاؤں میں گھر گھر دیئے ٹمٹما اٹھے۔ میراثیوں کے گھر سے شہنائیوں کی آواز بلند ہوئی۔ کوئی نوخیز لڑکا شہنائی سیکھ رہا تھا! کھنڈر کی دیواریں اندھیرے میں مل گئیں، مجھے اپنا وجود تک نظر نہ آتا تھا! ———

گھٹاٹوپ اندھیرا! ——— میں نے گھبرا کر اوپر دیکھا۔ آسمان پر بھیانک بادل گھر آئے تھے!

میں خاموش سر جھکائے گھر کی طرف چل پڑا۔ میرے قدموں کی چاپ سُن کر جھینگر خاموش ہو گئے۔ رستے سے دور ایک کمہار کے گھر سے ایک کتا میری طرف جھپٹا اور میرا پتھر کھا کر لوٹ گیا!

دور کہیں بادل گرجے! ——— اور کہیں بجلی چمکی! ———

دور کہیں ایک کوئل خوف سے چیخ اٹھی! اور کپکپاتی ہوئی ہوا لہرا لہرا کر خوابیدہ جھاڑیوں کو چھیڑنے لگی۔ ایک بوند میرے ماتھے پر گری، دوسری میرے گال پر! اور اس کے بعد ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی! میں گھر کی طرف دوڑنے لگا!

اچانک میرے قدم آپ سے آپ رُک گئے! میں واپس لوٹ پڑا۔ ایک غریب لڑکی کی ہفتوں کی محنت خاک میں مل جائے گی! خشک اپلے بھیگ جائیں گے اور وہ بیچاری بہت روئے گی! میں بھاگتا بھاگتا کھنڈر تک آیا۔ اور اندھیرے میں جتنے اُپلے اکٹھے ہو سکے۔ کھنڈر کی بوسیدہ چھت تلے جمع کر دیئے۔ اسی اثنا میں مینہ پورے زور سے برسنے لگا! اور میں اپنے دل میں بے انتہا مسرت محسوس کرنے لگا! جیسے میں نے کسی سات دن کے پیاسے کو شربت کا ایک گلاس پلایا ہو! اور رنج و غم کافور ہو گئے۔ میں مسکرانے لگا! میں خوشی سے دوڑنے لگا۔ ٹھنڈی ہوا اور تیز پھوار مجھے نہ روک سکی۔ میں اُڑا جا رہا تھا۔

اچانک مجھ سے کوئی چیز ٹکرائی۔ اور ساتھ ہی ایک ہلکی سی چیخ کی آواز آئی۔ میں نے اندھیرے میں کسی کو گرا دیا تھا! میں نادم ہو کر جھکا۔ پہلے تو ہاتھ کیچڑ میں دھنس گئے۔ پھر لمبے لمبے بالوں پر ——— لمبے لمبے ملائم بھیگے ہوئے بال! پھر نرم نرم گالوں پر ——— نرم نرم ٹھنڈے بھیگے ہوئے گال! ——— میرا ہاتھ ایک جھٹکے سے پرے ہٹا دیا گیا! ——— "تم کون ہو؟"

اپلوں والی کی آواز! ——— بوندوں کی بوچھاڑ! ———

گھٹاٹوپ اندھیرا ——— کپکپاتی سسکتی ہوا ——— ویران راہ ——— اور نوخیز اپلے تھوپنے والی حسینہ! ———

بادل گرجنے لگا۔ دل ناچنے لگا!

میں بولا "اندھیرا تھا خالی! ——— اور پھر میں کوئی غیر تو ہوں نہیں!"

خاموشی! ——— تیز تیز سانسوں اور ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکوں کی آواز ——— کمہار کے کتے کی بادلوں کو بھونکنے کی آواز ——— اور پھر خاموشی!

اچانک بادل زور سے گرجا۔ اور بجلی زور سے چمکی۔ کھلے بالوں اور بھیگے لباس والی حیران اور پریشان حسینہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ میں دو قدم آگے بڑھ آیا!

"کدھر جا رہی ہو اس اندھیرے میں؟" میں نے پوچھا۔

"جی کھنڈر کی طرف" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ "جی میں نے ان تین ہفتوں میں جتنے اُپلے تھوپے۔ اتنے تین مہینوں میں بھی کوئی نہیں تھوپ سکتی۔ جی مجھ غریب کی یہی دولت تھی۔ سب اپلے بھیگ گئے ہوں گے۔ اور میں ایک ہفتہ فاقے کاٹوں گی ——— اب ایک ہفتہ تک . . . . ." وہ آگے نہ بول سکی۔ اسکی آواز سسکیوں میں ڈوب گئی۔ میں اندھوں کی طرح ہاتھ اِدھر اُدھر ہلاتا ہوا ایک دو قدم اور آگے بڑھا۔ میں نے اسکا ہاتھ چھوا۔ اس نے کوئی حرکت نہ کی۔ میں نے اس کا ہاتھ دبایا اور بولا "میں نے

کھنڈر کی چھت تلے تمہارے سارے اُپلوں کا ڈھیر لگا دیا ہے۔ بے فکر رہو۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ کانپ گئی ہے "آپ کتنے اچھے ہیں جی۔"

"میں بہت بُرا ہوں خانی ـــــ میں نے تمہیں گرا دیا۔ اب جانے تمہیں کہاں کہاں چوٹ آئی ہوں گی۔"

"مجھے کہیں چوٹ نہیں آئی ـــــ آپ . . . ."

بارش تھم چکی تھی۔ رات پہاڑی نالوں کی آواز سے گونج رہی تھی۔ مینڈک آس پاس گڑھوں میں پورے زور سے ٹرّا رہے تھے۔ خانی نے میرا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا "اب میں گھر جاؤں جی؟"

"گھر؟ ـــــ تمہارا بھی کوئی گھر ہے خانی؟"

"جی ایک خدا ترس نے ایک کٹیا دے رکھی ہے۔ سر چھپانے کا سہارا تو ہے جی ـــــ اب جا کر وہاں سے وہ پانی نکالوں گی جو چھت میں سے ٹپکا ہو گا۔"

میرا آراستہ پیراستہ کمرہ اچانک میرے ذہن پر ابھر آیا۔ لرزا اور ٹکڑے ٹکڑے۔ ریزہ ریزہ ہو کر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ میری آنکھوں سے دو بہت گرم بوندیں نکلیں اور نیچے کیچڑ میں گر گئیں۔ میں نے سوچا۔ ہم زندگی کے اسقدر مختلف زاویوں پر کیوں رکھے گئے ہیں۔ یہ کیسی خدائی ہے؟ ـــــ یہ کیسا قانون ہے؟

میں نے کہا "خانی! آخر تم مجھے یہ کیوں نہیں بتاتیں کہ کہاں کی رہنے والی ہو؟ کون ہو؟ یہاں کیسے آئیں۔ تم گوبر اُٹھانے کے لائق تو نہیں تھیں خانی! ـــــ تم ریشم اور کمخواب میں لپٹی رہنے کے قابل ہو!"

"آپ"۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی "آپ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں! آپ ـــــ آپ سنکر کیا کریں گے؟"

"خانی!" میں نے احساسات کے طوفان سے مجبور ہو کر سرگوشی کے انداز میں کہا "خانی!"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کی انگلیاں بھیگی ہوئی تھیں۔ بارش سے یا پسینے سے ـــــ مگر بارش کا پانی اتنا گرم تو نہیں ہوا کرتا! "خانی! ـــــ تم اب غریب نہ رہوگی ـــــ تم میرے ہوتے . . ."

"آپ جی ـــــ [illegible] بچی ہوں اور سُنکر بھلا بھی چکی ہوں۔ میرے ماں باپ نے مجھے ایک خوبصورت نوجوان سے بیاہا۔ وہ بھی اسی قسم کی باتیں کرتا تھا۔ پھر جب ایک وبا میں میرے ماں باپ اور بھائی مر گئے۔ تو اس نے ایک اور لڑکی سے شادی کر لی۔ اور مجھے گھر سے باہر نکال دیا۔ اب ان باتوں کو بھول گئی ہوں۔ ریشم اور کمخواب پر سونے کی لذت میں چکھ چکی ہوں۔ اور اسکا انجام بھی میرے سامنے ہے۔ اب ان اُپلوں کو تھوپنے میں جو لذت ہے وہی غنیمت ہے۔ اب ریشم و ریشم کی ہوس نہیں رہی جی۔ اور نہ کسی چیز کی خواہش ہے۔ آپ نے میرے اُپلے محفوظ کر دیئے۔ اسکے لئے میرے پاس شکریہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور اگر ہو بھی تو میں دینے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ . . . . ."

اندھیرے میں مجھے کسی نے آواز دی۔ کوئی مجھے ڈھونڈھتا پھرتا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا "خانی! تم مجھے ایسا نہ سمجھو۔ میں . . ."

ـــــ ایک اور آواز آئی۔ میں نے تیزی سے کہا "کوئی مجھے ڈھونڈھ رہا ہے، کل ملوگی؟ ـــــ کھنڈر کے پاس؟ کل صبح ـــــ ملوگی نا؟ ـــــ اچھا!"

لیکن وہ خاموش تھی۔ میں اسکا ہاتھ تیزی سے اپنے لبوں تک لے گیا۔ اس نے چیخ کر اسے پیچھے کھینچ لیا۔ میں گھبرا گیا اور دوڑتا ہوا پکارنے والے کی طرف بڑھا۔ "کون ہے بھائی؟" میں نے زور سے کہا۔

"میں ہوں جی ـــــ دینو مستری۔ سارا گھر آپ کی فکر میں پریشان ہے۔ آپ بارش میں کدھر نکل گئے تھے؟ بیماری کی حالت میں؟ ـــــ اور یہ چیخا کون تھا ملک جی؟"

"میں چیخا تھا۔ ایک کنکر چبھ گیا تھا پاؤں میں!"

دینو زور سے کھانسا! کھانسی مصنوعی تھی! میرے دل میں جیسے کسی نے چٹکی لی!

"کھنڈر میں پناہ لی ہوگی آپ نے؟" اس نے پوچھا۔ میں کانپ اُٹھا۔

"نہیں چلتا پھرتا رہا۔ مجھے ایسے میں سیر کرنے میں بڑا لطف آتا ہے!"

ٹھیک ہے سنگی بی ——— اس کے انداز گفتگو میں تشنج تھا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گھر آیا۔ تب جا کر گھر والوں کی تسلی ہوئی!

صبح سویرے اٹھ کر میں کنڈی کی طرف گیا۔ وہ وہاں موجود تھی۔ مجھے دیکھ کر شرما گئی۔ لیکن بھرپور نگاہیں گاڑے کہیں سطح صاف تھا۔ گہرے نیلے آسمان میں سورج کی آتش ٹکیا پوری آب و تاب سے چمک رہی تھی۔ گاؤں کی چھتوں سے دھواں سا اٹھ رہا تھا۔ نہائے ہوئے پہاڑ نیچے مصفا جھیلوں میں اپنے چہرے دیکھ رہے تھے!

خانی خشک اپلوں کو باہر دیوار پر چن رہی تھی۔ بارش کی نمی کی وجہ سے وہ استعمال کے قابل نہ رہے تھے۔ اور ایک دن دھوپ میں پڑے رہنے سے ٹھیک ہو سکتے تھے۔ میں نے قریب جا کر کہا، "خانی کل رات کتنی عجیب رات تھی!"

خانی نے شرما کر سر جھکا لیا۔

میں نے کہا "خانی ——— مجھے تم سے محبت ہے!"

وہ مسکرائی۔ میری طرف ایک خاص انداز سے دیکھا جیسے استاد اپنے نالائق شاگرد کی طرف دیکھتا ہے۔ "اللہ آپ کو اس کا اجر دے"

اس فقرے سے اس کا کیا مطلب ہے ——— اس کا حل نہیں تھا۔ میں نے گھبرا کر گاؤں کی طرف دیکھا۔ دینو مستری کے کوٹھے کی منڈیر پر ایک بوڑھا مرغ گردن کھینچ کر پکار رہا تھا ککڑوں کوں!

——— میرے دل میں جیسے کسی نے چٹکی لی! میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ایک چیل دوسری چیل سے کسی بدبخت مرغی کا ایک چیختا ہوا چوزہ چھین کر سورج پرے گزرتی ایک پہاڑی کے تاریک درے میں گھس گئی ———!

میں خاموش گھر واپس آگیا!

اس سال کسی خاص ضرورت کی وجہ سے میری شادی رک گئی۔

دوسرے سال گرمیوں کی چھٹیوں میں میں پھر لاہور سے اپنے گاؤں گیا۔ برات دھوم دھام سے دلہن کے گھر روانہ ہوئی۔ میرے شہری دوستوں نے سہرے گا گا کر پڑھے۔ میرے دیہاتی ساتھیوں نے تالیاں بجا بجا کر اور ڈھول کے ارد گرد ناچ ناچ کر اپنی بے ساختہ مسرت کا اظہار کیا!

صبح ہوئی۔ میں شب بیداری کے اثر کو زائل کرنے کیلئے اکیلا کھیتوں میں چلا گیا۔ اچانک پیچھے سے میرے کاندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ اپلوں والی کھڑی مسکرا رہی تھی! ———

"خانی!" میں نے حیران ہو کر کہا،

"آج کس کی شادی ہے جی؟"

میں سر جھکائے ایک سوچ میں ڈوب گیا۔ خون کی جگہ میری رگوں میں خانی گردش کر رہی تھی!

کچھ دیر کے بعد میں نے سر اٹھایا۔ دینو مستری اپنے کوٹھے پر کھڑا کھانس رہا تھا اور اپلوں والی غائب تھی!

واپسی پر میں اپنے گھر کے بڑے دروازے کے قریب سے گزرا۔ دور سے مجھے وہاں خشک اپلوں کا ایک بہت بڑا ڈھیر نظر آیا۔

"کون لے آیا؟" ——— میں نے ایک میراثی سے پوچھا۔

"کوئی رات کو یہاں ڈھیر لگا گیا"

دعوت ولیمہ تیار کرتے وقت وہی اپلے استعمال کئے گئے!

ادارہ:-

نقد و نظر

اوراقِ پارینہ :- مصنفہ چودھری شیر جنگ، کتابت و طباعت اعلیٰ، صفحات ۱۴۰، قیمت ۲، ملنے کا پتہ: نیشنل پبلشنگ ہاؤس کوچہ گوردت سنگھ شیش محل روڈ لاہور، مکتبہ اردو لاہور۔

"اوراقِ پارینہ" ملک کے مشہور و معروف سیاسی کارکن جناب چودھری شیر جنگ کے آتشیں افکار کا مجموعہ ہے۔ چودھری صاحب موصوف ایک مدت سے سیاسی دنیا میں سانس لے رہے ہیں۔ مگر اس کے باوجود آپ کے شاعرانہ احساسات کی نزاکتوں میں ذرہ بھر کمی واقع نہیں ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ کتاب کا ہر ورق، ہر سطر ایک مجروح روح کی دردناک چیخ، اور ایک زخم نصیب دل کی نمناک پکار ہے۔ ناممکن ہے کہ انسان اسے پڑھے اور پھر متاثر نہ ہو۔ ناممکن ہے کہ مصنف کے شعلہ ریز جذبات کی حرارت قدرتی سامع کے دل کی گہرائیوں تک نہ پہنچ جائے۔ چودھری صاحب کو خیالات کی پختگی کے علاوہ اسلوبِ بیان کی دلکشی سے بھی بہرہ وافر ملا ہے اور یہی وجہ ہے کہ کتاب بہت موثر اور بہت دلچسپ ہے۔

اوراقِ پارینہ مشاہدات ہیں ایک قیدی کے، تجرباتِ حیات ہیں ایک گرفتارِ سلاسل انسان کے، اور احساساتِ آتشیں ہیں ایک مقید شاعر کے۔ جب چہکتی ہوئی بلبل کو پابندِ قفس کر دیا جائے تو اس کے نغموں میں زیادہ درد اور زیادہ اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب شاعر کو جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بند کر دیا جائے، تو اس کے احساسات و جذبات تمام دنیا کی دکھی ہوئی روحوں کی فریاد بن جاتے ہیں۔ چودھری صاحب موصوف کے یہ اوراقِ حیات موجودہ ہندوستان کے ایک بدبخت مگر حساس غلام کے صحیح جذبات لئے ہوئے ہیں۔ چودھری صاحب کی انشا پردازی کا رنگ ملاحظہ فرمائیے۔

"سطحی محبت اور سطحی غم ہمیشہ قائم رہ سکتے ہیں، لیکن وہ محبت اور وہ غم جس کی گہرائی بے پناہ اور بے انتہا ہوتی ہے، اپنی ہی لامحدود اور خوفناک وسعت میں کھو جاتے ہیں۔ آگ کا تند و تیز ابھرتا ہوا شعلہ کبھی ایک حالت میں دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ شعلہ جس قدر تند، تیز اور بلند ہو گا اس کی راکھ اسی قدر ٹھنڈی، بے دم اور بے جان۔"

حقیقتاً اوراقِ پارینہ ایک بہت قابلِ قدر کتاب ہے۔ امید ہے قارئین کرام اس مفید و دلچسپ کتاب کا ضرور مطالعہ کریں گے! (م۔ا)

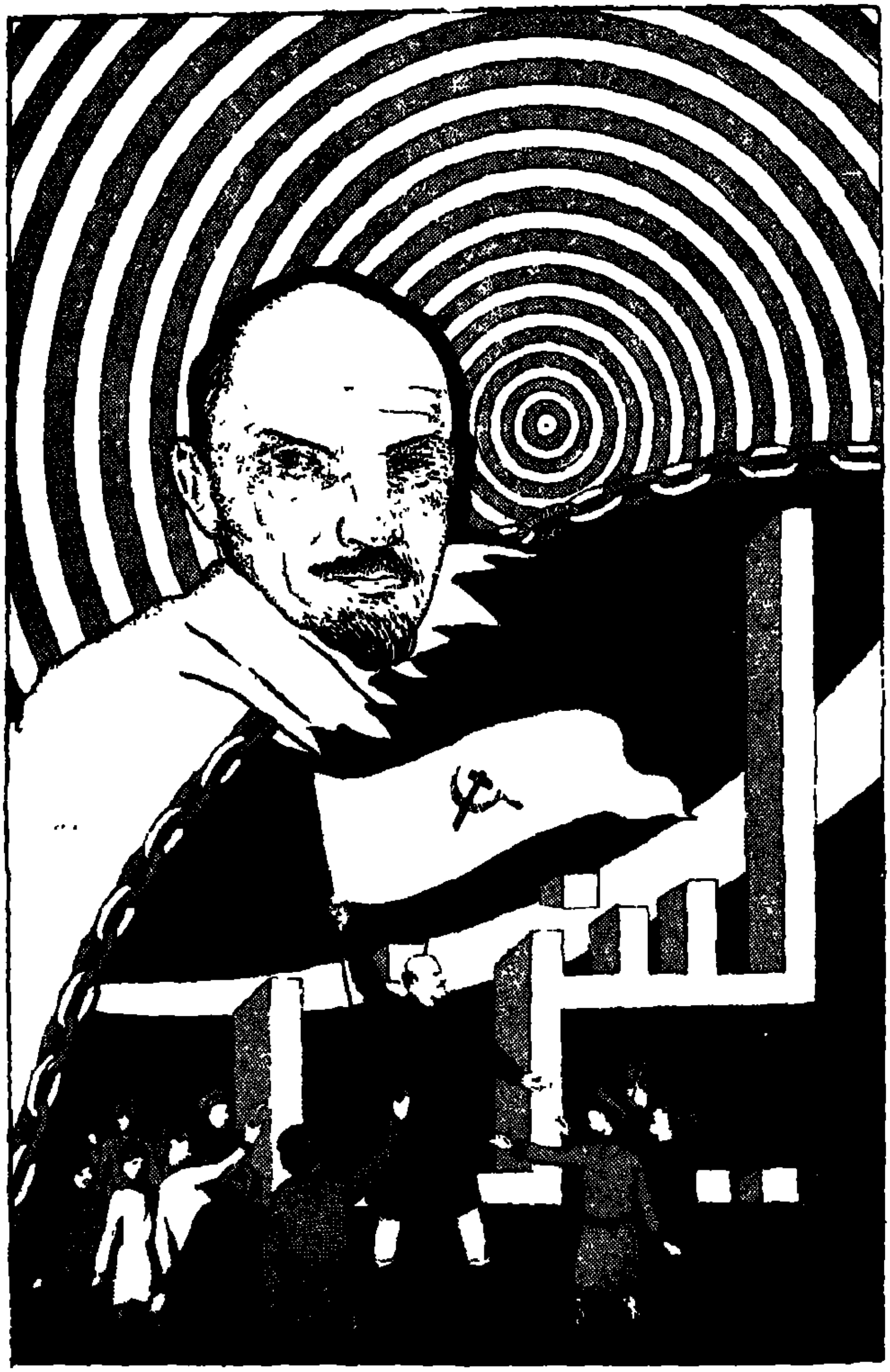
چنگاریاں :- مصنفہ پرنسپل چھبیل داس، کتابت و طباعت خوشگوار، صفحات ۲۴۴، قیمت ۲، ملنے کا پتہ: لاجپت رائے اینڈ سنز بک سیلرز و پبلشرز لوہاری دروازہ لاہور۔

چنگاریاں، مجموعہ ہے جناب چھبیل داس کے سیاسی افسانوں کا۔ چھبیل داس اشتراکیت کے شہرۂ آفاق راہنما ہیں اور اس سے پیشتر اشتراکیت اور دیگر سیاسی موضوعات پر کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ چونکہ آپ مدت سے سیاسی زندگی گزار رہے ہیں اس لئے سیاسی نکات سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اس مجموعے پر آپ نے سیاسیات کے نہایت اہم رازوں کو نہایت سلیس و شگفتہ زبان میں پیش کر دیا ہے۔ ہر ایک افسانہ کسی نہ کسی سیاسی راز کے گرد گھوم رہا ہے۔ اور افسانہ پڑھتے ہی یہ راز خود بخود معلوم ہو جاتا ہے۔ مصنف نے ہر افسانے کے آخر میں افسانے کی توضیح و تشریح بھی موزوں الفاظ میں کر دی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے سے معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی سیاسیات کے اہم نکات سے بہت حد تک واقف ہو جاتا ہے۔ ناظرین کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

امید ہے، جس مقصد کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے وہ مقصد پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔

(م۔ا)



لینن یقیناً مزدوروں کا یگانہ مسیحا اور سب سے بڑا انسان تھا جس نے دیکھتے ہی دیکھتے روس کی کایا پلٹ دی۔ کون ہے جو اس لوہے کے انسان اس مزدوروں کے عظیم رہنما و سیاسی کے سوانح حیات کو دلچسپی سے پڑھنا گوارا نہیں کریگا۔ مصنفہ ڈی ایس مرسکی مترجمہ ڈاکٹر محمد اشرف مجلد عہ

لینن

ڈاکٹر محمد اشرف

قیمت ایک روپیہ

مکتبہ اردو لاہور

Regd. L. No. 3521

Title Page printed at The Peco Art Press Lahore


ماہنامہ



ASTRA
SHIRTING
فینسی قمیضوں کے کپڑوں میں زبردست انقلاب
استرا
یہ کپڑا نہ تو چارخانہ ہے۔ اور نہ دھاری دار۔ یہ خاص نئے ڈیزائن ہیں
THE TRADE MARK ON EVERY 2 YARDS SELVEDGE
مینوفیکچررز
دی بنگلور وولن کاٹن اینڈ سلک ملز کمپنی لمیٹڈ بنگلور
سول ڈسٹری بیوٹرز
برجموہن کرشن پرشاد
کٹڑہ آہلووالیاں امرتسر
برانچہائے:۔ بمبئی - دہلی

منظور کردہ محکمہ تعلیم پنجاب صوبہ سرحد و ریاست حیدرآباد دکن

سالانہ چندہ معہ ضخیم سالنامہ وافسانہ نمبر تین روپے آٹھ آنے علاوہ محصول ڈاک

چندہ ممالک غیر سے آٹھ شلنگ

رسالہ ادب لطیف

ادارۂ تحریر
چودھری برکت علی
بی اے
میرزا ادیب
بی اے

مینجنگ پروپرائٹر
چودھری نذیر احمد

مینجر
چودھری بشیر احمد

مارچ ۱۹۳۹ء
مکتبہ اردو لاہور
فی پرچہ چار آنے

جلد ۸ — فہرست مضامین — نمبر ۳

ادارہ

اشارات

ڈراما نمبر: گزشتہ شماروں میں اعلان کیا جا چکا ہے کہ اب کے افسانہ نمبر کی بجائے ڈراما نمبر شائع ہو رہا ہے۔ ہمارے افسانہ نمبر پبلک میں جو مقبول ہوتے ہیں وہ ہر نئی اشاعت کا خاص طور پر انتظار کرتے رہتے ہیں۔ مگر جیسا کہ اہل ذوق حضرات بخوبی جانتے ہیں صرف افسانہ نگاری کا فروغ ہی ہمارے ادب کو بلند نہیں کر سکتا بلکہ افسانہ نگاری کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہمیں ادب کے دیگر اصناف وانواع کے فروغ کی طرف بھی توجہ دینی چاہیئے۔ چنانچہ اسی خیال کو مدنظر رکھ کر ڈراما نمبر کا اعلان کیا گیا۔ ہماری پبلک فن ڈراما سے مانوس نہیں اس لئے ڈراما نمبر کی اشاعت کا اعلان کرتے وقت ہمیں جہاں اس امر کا احساس تھا کہ ہماری کوششیں وقت کی ایک اہم ضرورت کیطرف توجہ کر رہی ہیں وہاں ہمیں اس کا علم بھی تھا کہ ہمیں متعدد مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اول تو ہمارے یہاں ڈراما نویس ہی بہت کم ہیں۔ اور جو چیدہ چیدہ ہیں وہ یا تو فلمی راستے پر گامزن ہو گئے ہیں اور یا انہوں نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا ہے اور یا پھر انکی ذاتی مصروفیات انہیں رسالوں کے لئے ڈرامے لکھنے کی وقت نہیں دیتیں۔ مگر اب ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ ہمارے قارئین نے جس ذوق و شوق اور جس دلچسپی کے ساتھ ہمارے ارادے کا خیر مقدم کیا ہے وہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ کم از کم ڈرامے کے بارے میں پبلک کے متعلق ہماری رائے محض سوء ظن کی حیثیت رکھتی تھی۔ ایک طرف تو قارئین ڈراما نمبر کی اشاعت کا نہایت مسرت افزا انداز میں خیر مقدم کرتے ہوئے خط پر خط لکھ رہے ہیں اور دوسری طرف دفتر میں ایسے بلند پایہ کامیاب اور خوبصورت ڈرامے اور مضامین موصول ہو رہے ہیں جنہیں پڑھ کر ہم یہ اندازہ لگا چکے ہیں کہ ڈراما نمبر افسانہ نمبر سے بدرجہا زیادہ کامیاب رہے گا۔

مشہور و معروف ڈراما نویسوں کو انکی گوناگوں مصروفیات نے گھیر رکھا ہے۔ مگر انکی بجائے میدان ادب میں ایسے نوجوان ڈراما نویس آ رہے ہیں جنکی کوششیں یقیناً اردو ڈراما کو بہت بلند مقام پر لے جائیں گی۔ ان نوجوان دماغوں کے، جو ان فکر ، فنی نقطہ نظر سے اتنے بلند اور کامیاب ہیں کہ آپ یقیناً اردو کی اس صنف (ڈراما نویسی) کے فروغ و ترقی کے معترف ہوئے بغیر نہیں رہیں گے۔

ہمارے محترم اہل قلم اس نمبر کو کامیاب سے کامیاب بنانے کیلئے انتہائی کوشش کر رہے ہیں۔ مندرجہ ذیل مضامین اور ڈرامے دفتر میں پہنچ چکے ہیں:۔ جیون ایک کہانی از عشرت رحمانی۔ باہمی سمجھوتہ از اوپندر ناتھ اشک۔ ضیغم ہندوستان (منظوم ڈراما) از احمد ندیم قاسمی۔ آرام علاج از انصار ناصری۔ جو دوست از سراج الدین احمد نظامی۔ ڈرامے کی تاریخ از ماہر القادری۔ مجرم از سہیل احمد کند۔ عاشق کی موت کا پھندہ از اکرام قمر۔ حقوق نسواں از پروفیسر کنہیا لال کپور۔ وحشت زدہ مریم پرکاش آرٹسٹ۔ موہنجو داڑو کی تباہی از میرزا ادیب۔ علاوہ ازیں مندرجہ ذیل حضرات کی نگارشات بھی شریک اشاعت ہونگی۔

علامہ کیفی۔ حکیم یوسف حسن۔ سید بادشاہ حسین۔ اختر اورینوی۔ فضل حق قریشی۔ اعجاز شاکر۔ نذر حیدر آبادی۔ مسعود جاوید۔ اوپندر ناتھ اشک۔ عطاء اللہ پالوی۔ یزدانی جالندھری۔ اثر چوہانی۔ عزیز احمد۔ علی احمد۔ کرشن چندر ایم اے۔ سنت سنگھ سیکھوں۔ پروفیسر فیاض محمود ایم اے۔ راجہ فاروق علی خاں۔ راجندر سنگھ بیدی۔

ہمیں یہ سنکر بہت افسوس ہوا کہ ہمارے عزیزہ مکرم شاعر جناب رام جوایا صاحب خنداں علیل ہیں۔ خدا کرے وہ جلد صحت یاب ہو کر حسب معمول اردو نوازی کا ثبوت دیں! قارئین سے التماس ہے کہ وہ خنداں صاحب کے لئے دعائے صحت کریں۔

ایک اہم اطلاع۔ جیسا کہ قارئین جانتے ہیں، ہمارا افسانہ نمبر اپریل اور مئی کے نمبروں پر مشتمل ہوتا ہے اس سے ڈراما نمبر بھی ان دو مہینوں کا مجموعی نمبر ہوگا؛ چنانچہ اپریل کا پرچہ شائع نہیں ہوگا۔ اور ڈراما نمبر یکم مئی کو مارکیٹ میں آ جائے گا۔ قارئین اپریل کے پرچہ کا انتظار نہ کریں۔

حضرت اختر شیرانی کا صحیح پتہ:۔ اختر شیرانی ۱۸ فلیمنگ روڈ لاہور۔

جناب راجندر سنگھ بیدی

موت کا راز

(۱)

اس بے ربط ناہموار زمین کے شمال کی طرف نباتی بیلوں کی دامن میں میں نے گندم کی تجرباتی فصل لگائی تھی، اور سرطانی سورج کی حیات بخش تمازت کے نیچے پکتے ہوئے سٹوں کو دیکھ کر میں خوش ہو رہا تھا۔ گندم کا ایک ایک دانہ پہاڑی دیمک کے برابر تھا، ایک سٹے کو مسل کر میں نے ایک دانہ نکالا، وہ کناروں کی طرف سے باہر کو قدرے پچکا ہوا تھا، اسکی درمیانی لکیر کچھ گہری تھی، یہ اس بات کا ثبوت تھی کہ گندم اچھی ہے۔ اس میں خوردنی مادہ زیادہ ہے۔ اور گورکھپور کی منڈی میں اس سال اسکی فروخت نفع بخش ہوگی۔

میرے خیالات کچھ یکسوئی اختیار کر رہے تھے، اسوقت زندوں میں سے میرے نزدیک کوئی نہ تھا۔ قدرتاً آپ پوچھ سکتے ہیں کہ اگر زندوں میں سے کوئی تمہارے نزدیک نہ تھا، تو کیا مردوں کی یاد تمہارے ویران خانۂ دل کو آباد کر رہی تھی۔؟ ——— میرا جواب اثبات میں ہے۔ میں آپ سے ایک اور بات بھی اصرار سے منوانا چاہتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ میں مردوں کا تصور ہی نہیں کر رہا تھا، بلکہ ان کو اپنے سامنے، پیچھے دائیں اور بائیں کتھا کلی انداز سے رقص کرتے، ہنستے اور خوف سے کانپتے ہوئے دیکھ رہا تھا، جس طرح آپ کی داڑھی کا بال بال مجھے علیحدہ نظر آتا ہے، اور آپ کی تمازت زدہ آنکھوں کے سرخ ڈورے دیکھ رہا ہوں، اسی طرح میں انہیں دیکھ رہا تھا، ان میں سے کسی کا چہرہ موتیا کی اس کلی کی مانند جسکا چہرہ صبح کے وقت کاشمیری بہار کی شبنم نے دھو دیا ہو، شگفتہ ہو کر چمک رہا تھا، اور کسی کے چہرے پر جھریاں اور گہری گہری لکیریں تھیں، شاید وہ کسی نتیجہ خیز تجربۂ زندگی کی نشانیاں تھیں۔

وہ گندم کے کھیت کے کنارے [illegible] نہیں کھیل رہے تھے نہ [illegible] بتیس سالہ شیشم جس کے گھنے سایہ دار پھیلاؤ کے نیچے میں آلتی پالتی مار بیٹھا تھا، اپنے ہلکے پھلکے پاؤں کو بچا رہے تھے، بلکہ وہ خود میرے جسم کے اندر تھے .... ؟ ہیں! آپ حیران کیوں ہو رہے ہیں۔ آپ پوچھتے ہیں کہ میں کہاں تھا؟ .... سنئے تو، میں جسم کی اس حالت میں تھا جسے بنہالک کی آخری منزل کہنا چاہیے۔ میں خود اپنے جسم سے علیحدہ ہو کر اسے یوں دیکھ رہا تھا جس طرح پرانی حکایتوں کا شہزادہ کسی اونچے اور نباتاتی ٹیلے پر کھڑا دور سے اس شہزادی کے محل کا اٹھتے ہوئے دھوئیں کے وجود سے اندازہ لگائے جس نے اپنی شادی مشروط رکھی ہو۔

وہ رقصاں، خنداں، لرزاں لوگ میرے بزرگ تھے...... مجھے اپنے والدین کی تصویر یاد ہے، میرا باپ اپنے باپ کی تصویر تھا، اس لئے میں اپنے دادا کی تصویر بھی بنا سکتا ہوں، اور یوں ارتقائی منازل طے کرنے کی وجہ سے اپنے پرکھوں کی اگر صاف نہیں تو دھندلی سی تصویر ضرور ہوں...... ہندوستانی تہذیب دو نسلوں سے شروع ہے، ایک دراوڑ اور دوسری آریہ۔ میں آریہ نسل سے ہوں، میرا دراز قد، گورا رنگ، سیاہ آنکھیں، [illegible] اور قدرے جسم پر گوشت ہونا، اس بات کا ثبوت ہیں۔ ——— یہ بات معلوم کرنے کی میری زبردست خواہش تھی کہ موت کا راز کیا ہے۔ مرتے وقت مرنے والے پر کیا کیا عمل ظہور پذیر ہوتا ہے۔ مجھے یہ یقین دلایا جا چکا تھا کہ مادہ اور روح لافنا ہیں۔ ایسی حالت میں اگر وہ موت کے عمل میں اپنی ہیئت بدلتے ہیں تو اسوقت انکی کیا حالت ہوتی ہے ——— آخر مرنے والے کہاں گئے؟ اور وہ جا بھی کہاں سکتے ہیں۔ سوائے اس بات کے کہ وہ کوئی دوسری شکل اختیار کر لیں، جسے ہم لوگ آواگون کہتے ہیں کہ کئی [illegible] حیات میں ظہور پذیر ہونے کے بعد پھر اس ذرہ کو جس سے کہ ہم پیدا ہوئے ہیں، آدمی کی شکل دیجاتی ہے۔

یہ بات سنکر شاید آپ بہت ہی متعجب ہونگے، کہ میں اپنے سامنے

اپنی پیدا ہونے والی اولاد کو بھی دیکھ رہا تھا، میرے سامنے ایک گھنگریالے سیاہ بالوں چمکتے ہوئے دانتوں والا فہیم و شحیم بچہ آیا، جو کہ آج سے ہزاروں سال بعد پیدا ہوگا۔ اور جو کہ میری ایک دھندلی سی تصویر تھا، میں نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ اور چھاتی سے لگا بھینچ بھینچ کر پیار کرنے لگا۔ اسے پیار کرتے وقت فقط مجھے یہ ہی محسوس ہوا جیسے میں اپنا دایاں ہاتھ بائیں کندھے اور بایاں ہاتھ دائیں کندھے پر رکھ کر اپنے آپ کو بھینچ رہا ہوں اس بچے نے کہا:۔

"بڑے بابا۔ . . . پیرنام۔ . . میں جا رہا ہوں"

میرا ہونے والا بچہ، اور بزرگانِ سلف تمام واپس جا رہے تھے، اس انہماک کے عالم میں میں ابھی تک دور کھڑا یہی محسوس کر رہا تھا، کہ میرا جسم زمین کا ایک ایسا حصہ ہے، جس میں میرے بزرگانِ سلف کی غاریں اور آئندہ نسلوں کے شاندار محل ہیں، جن میں رفتگان، اور آنیوالے اپنے قدیم اور جدید طریقوں سے جوق در جوق داخل ہو رہے ہیں . گھبرائیے نہیں، اور سنئے تو۔ . . . . یہ میری باتیں جو بظاہر پاگلوں کی سی دکھائی دیتی ہیں، ہیں بڑی مطلب خیز۔ . . . مجھے کچھ سمجھنے دو — پھر میں آپ کو ادبی مضمون میں تشبیہ دینے کا طریقہ بتاؤں گا کل ہی آپ کہہ رہے تھے، کہ درختوں پر گدھ شام کے وقت بیٹھے یوں دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے کسی اونچے شیشم پر سنہری تربوز اوندھے لٹک رہے ہوں — کتنی بھونڈی تشبیہ کہی آپ نے! .

(۲)

یہ تو میں جانتا ہی تھا، کہ روح کے علاوہ مادہ بھی فنا نہیں ہوتا مگر اس بات کو دیکھنے کی ایک آگ سی ہر وقت سینہ میں سلگتی رہتی تھی، کہ موت کے عالم میں، بظاہر فنا ہوتے ہوئے شخص یعنی ذرہ کی مجموعی صورت کو کن کن تخریبی و تعمیری مدارج سے گزر کر دوسری ہیئت میں آنا پڑتا ہے۔ . . . یعنی . آخر . . . . موت کا راز کیا ہے؟

وہ ذرہ عظیم، وہ جزو لایتجزی، جو کہ تمام ارضی و سماوی طاقت کا مغز ہے کیسا منتظم ہے۔ مثال کے طور پر اجرام فلکی کی گردش کا نظام لیجئے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی جرم اپنے مخصوص راستہ سے ایک انچ بھی ادھر ادھر ہو جائے تو کیسی قیامت بپا ہو جائے چاند گرہن کے موقع پر ہم لوگ دان پن بھی کرتے ہیں۔ تو اسی لئے کہ وہی ایک ایسا وقت ہو سکتا ہے جبکہ اجرام فلکی کا کشش ثقل سے ادھر ادھر ہو کر اور آپس میں ٹکرا کر مادہ ہیولی کی شکل اختیار کر لینا ممکن ہے ہم آریہ — یا جس، من موجی اور توہم پرست نہیں چاہتے۔ کہ ہم کوئی برا کام کرتے ہوئے تباہ ہو جائیں، اور مادہ ہیولی کا ایک حصہ بن جائیں۔ دان پن سے اچھا کام اور کیا ہوگا؟

. . . . . . آپ اسے تصوف، وہم خشک اور ترش مضمون کہیں، مگر یہ ان ہر سہ اقسام سے بالاتر ہے۔ ہاں ہاں! آپ نے پوچھا تھا۔ کہ یہ ذرہ عظیم کیا ہے۔ — یہ جاندار شئی کی ابتدائی صورت ہے یہ عورت اور مرد دونوں میں زندہ ہے۔ تمام ارضی و سماوی طاقت کا مرکز ہے۔ شاید اس سے بہتر اسکی کوئی تعریف نہیں کر سکتا۔ اس کے متعلق میں ایک قیاس غیر مصدق جو بظاہر یاوہ گوئی دکھائی دیتا ہے۔ مگر ہے بہت جامع اور درست — دہرا دینا چاہتا ہوں، وہ قیاس غیر مصدق ریاضی طبعیات کے ایک بڑے ماہر نے کہا تھا

"ذرہ . . . . جزو لایتجزی . . . . — ہم نہیں جانتے کیا . . کچھ کرتا ہے — ہم نہیں جانتے کیسے' . . . ؟ . .!؟

شاید ریاضی قواعد ضرب و تقسیم اس۔ ذرے سے ہی ریاضی دانوں نے سیکھے ہیں، وہ دو سے چار، چار سے آٹھ اور آٹھ سے چوگنا ہوجاتا ہے . . . . . اور پھر ہزاروں سے حیران کن طور پر ایک . . . . . یہ تو سب جانتے ہیں، کہ وہ یہ سے وہ ہو جاتا ہے اور وہ سے یہ ہو جاتا ہے مگر اس بات پر سے پردہ راز نہیں اٹھا۔ کہ وہ کیسے؟ جس دن یہ پردہ راز اٹھے گا۔ تو موت کا راز منکشف ہونے میں باقی رہ ہی کیا جائیگا؟

چند دن ہوئے میں اسی اضطراب ذہنی میں مبتلا بیٹھا تھا۔ اور سرطانی سورج گندم کے سٹوں کو پکا رہا تھا سٹے بالکل سوکھ چکے تھے اور انکی داڑھی اسقدر خشک ہو گئی تھی۔ ایک ایک بال کانٹے کی مانند چبھتا تھا، کچھ دبانے سے بال خود بخود جھڑنے لگے۔ سٹے کو مسلتے مسلتے

+ Eddington - in Gifford lectures

اسکا ایک بال میرے ناخن میں اتر گیا، اور لاکھوں ذرات جن کی میں مجموعی صورت ہوں۔ ان میں سے ایک ذرے کو جو کہ انفرادی طور پر ذرۂ عظیم سے کم نہیں، اسنے آگے دھکیل دیا، وہ ذرہ جو آگے دھکیلا گیا نامعلوم گذشتہ زمانے میں میرا کوئی بزرگ تھا یا شاید آئندہ نسلوں میں سے کوئی ——— یہ میں جان نہ سکا، بہرحال بیٹے کا بال ان دونوں میں سے نہ تھا۔ وہ ایک بیرونی خارجی چیز تھی، جس کو میرے نظام جسم میں داخل ہونے کی قطعی مخالفت تھی۔ اس کا یوں میرے جسم میں چلے آنا اس مسافر کی مداخلت بے جا کی مانند تھا، جو لفظ "شارع عام نہیں ہے" پڑھتے ہوئے بھی اندر گھس آئے۔ یہ ممانعت قطعی نیوجہ ہی تھی کہ درد سے ٹیس اٹھ اٹھ کر مجھے لرزہ براندام کر رہی تھی ———

بھلا ایک کتا اپنی گلی میں دوسرے کتے کو نہیں آنے دیتا، تو میرے قابل پرستش بزرگوں اور معرکتہ الآرا کام کرنے والی آئندہ نسلوں کی عظیم الشان ہستیاں اس خارجی چیز کی مداخلت بے جا کو کب برداشت کرسکتی تھیں۔ اُف درد! ماسوا اس چیز کے ——— اس ذرے کے جو کہ ہماری آئندہ نسلوں کا اپنی ضرب و تقسیم کے ساتھ روحانی اور جسمانی بت بنے، یا ہمارے بزرگوں سے ہمیں ورثہ میں آئے کسی اور چیز کو مطلق دخل نہیں۔ مادہ اور روح دونوں اس وقت تک چین نہیں پاتے، جب تک کہ خارجی مادے کو ہر ایک تکلیف سہ کر جسم سے باہر نہیں پھینک دیا جاتا۔

وہ ذرہ تو ہر جنبش سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ اگر آپ نے غلط روی سے اپنے جسم و روح کے نامناسب استعمال سے انہیں کسی طرح مفلوک اور ناتواں بنادیا ہے۔ تو آئیے وہ ذرے جنہوں نے آپکے بیٹے اور پوتے بننا ہے، مفلوک اور ناتواں حالت میں آپ کے سامنے آکر اپنے دلی اور ذہنی اضطراب کا باعث ہوں گے۔ اور وہ اسے قسمت یا تقدیر کہیں گے، مگر اگر قسمت کی تعریف مجھسے پوچھیں، تو وہ یہ ہے "صحبت نیک و بد کے اثر کے علاوہ جو چیز پوری ذمہ داری سے ہمارے بزرگوں نے ہمیں دی ہے وہ ہماری قسمت ہے" اس لئے آپ جو بھی فعل کریں سوچ کر کریں۔ انگلی بھی ہلائیں تو سوچ کر . . . یاد رکھئے۔ یہ ایک معمولی بات نہیں ہے۔ . . . . . . اب شاید آپ ذرے کے قول و فعل سے کچھ واقف ہو گئے ہونگے۔

(۳)

اس دن جس دن کرشے کا بال میرے ناخن میں داخل ہوا۔ میں بہت مضطرب رہا ——— شام کو میں گھبرائے ہوئے پاس ہی کے ایک شہر کے کسی بڑے اختر شناس کے پاس گیا۔ اس نے میری ماس وغیرہ دیکھتے ہوئے تیا فہ لگایا اور مجھے کہا۔ کہ برھسپت کا اثر تمہیں ہر بلا سے محفوظ رکھے گا۔ اور تمہاری عمر بہت لمبی ہے۔ اس کا شاید خیال ہو کہ درازی عمر کی پیشین گوئی سنکر یہ مالدار زمیندار اپنے بائیں ہاتھ میں چمکتی طلائی انگوٹھی اتار کر دے دے گا مگر یہ بات سنکر مجھے سخت بے چینی ہوئی، ایک ملال سی کے عالم میں میں نے اسے اسکی قلیل فیس ——— ایک ناریل، آٹا اور پانچ پیسے دے دیئے . . . . میں تو مرنا چاہتا تھا، اور دیکھنا چاہتا تھا، کہ اس حالت میں مجھ پر کیا عمل ہوتا ہے۔ مجھے اس بات کا بھی شوق تھا، کہ میں اس راز کو، جس کی بابت بڑے بڑے حکیم اور روحانی طبعیات کے ماہر کہہ چکے ہیں ——— "وہ کرتا ہے کچھ . . . . . ہم نہیں جانتے کیسے . . . . . " طشت از بام کردوں، اور دنیا میں پہلا شخص ہوں جو کہ دوسری ہیئت میں آتے ہوئے اپنی حیرت انگیز یادداشت کے ذریعہ سے دنیا پر واضح کردے۔ کہ ذرے کو یہ حالت پیش آتی ہے ——— اور وہ اس شکل میں تبدیل ہوتا ہے

اس بات کے مشاہدہ کے لئے خود مرنا لازمی تھا، مگر عاقل اختر شناس نے اسکے برعکس درازی عمر کی روح فرسا خبر سنائی تھی، تاہم کہ خودکشی ایک پاپ تھا، جس کا ارتکاب نہ صرف میرے بزرگوں کے نام پر دھبہ لگاتا تھا، بلکہ موجودہ بچوں اور آئندہ نسلوں پر بھی اثر انداز ہوتا تھا، چنانچہ میں نے خودکشی کے خیال کو بالکل باطل گردانا۔

میں جنگل میں ایک ٹیلے پر بیٹھا تھا، وہاں سے دریائے گنڈک کے ایک معاون کے . . . آبشار کی آواز صاف طور پر کانوں میں آرہی تھی اور چونکہ مجھے وہی بات خوش کرسکتی تھی، جو کہ میرے دل کو مضطرب کرے۔ اس لئے گنڈک کے معاون کے آبشار کی دل کو بٹھا دینے والی آواز مجھے بھارہی تھی، ایک پتھر کو اٹھاتے ہوئے میں نے بہت سے کیڑے مکوڑے دیکھے۔ پھر میں نے کہا:

"شاید اس آبشار کی آواز اور موت کے راگ میں ہم آہنگی ہو —" شام ہو چکی تھی۔ سورج مکمل طور پر ڈوبا بھی نہیں تھا کہ سر پر چاند کا سپید نورانی نقرئی رنگ کا جسم دکھائی دینے لگا۔ پتھروں میں سے ایک جلا دینے والی حرارت نکل رہی تھی۔ یکایک مجھے ایک خیال آیا ایک ترکیب سوجھی۔ جس سے کہ میں ذرے کی ہیئت بدلنے کا مشاہدہ کر سکتا تھا یعنی موت کا عمل جانچ سکتا تھا۔ اسے ہم خود کشی بھی نہیں کہہ سکتے۔ وہ صرف مشاہدہ کی آخری منزل ہے وہ یہ — کہ گنگ کے معاون کے آبشار سے دو میل نیچے کی طرف جہاں پانی کی خوفناک لہریں ایک بھورے ٹیلے کو مسدود ٹکرا کر اپنا دم کھوتے ہوئے جنوب مشرق کی طرف گنگ سے ملنے کے لئے جا نکلتی ہیں۔ نہانے کیلئے اتر جاؤں۔ اور غیر ارادی طور پر پانی کے اندر ہی اندر گہرائی اور تیز بہاؤ کی طرف آہستہ آہستہ جذب ہو جاؤں۔ اور یہ صورت پیدا ہو کہ یا میرا پاؤں کسی آبی جھاڑی میں الجھ جائے یا کوئی بھنور مجھے کھینچ لے یا پانی کا کوئی زبردست ریلا۔ وہ عمل ... جس سے ذرہ کی کوئی دوسری صورت ہے — شاید آپ اسے بھی خود کشی کہیں مگر اس غیر ارادی فعل کو میں تو قدرتی موت ہی کہوں گا۔

چنانچہ مدت سے بہت پہلے میں نے تصور میں یہ عمل — گنگا دانی کے پتوں پر رکھا اور سوچا کہ میں ضرور اس غیر ارادی فعل کو پایۂ تکمیل تک پہنچاؤں گا

(۴)

گنگ کے معاون آبشار سے ایک میل نیچے کی طرف ندی پر زور سے بہہ رہی تھی باوجودیکہ وہ چٹان سے ٹکراتے ہوئے اس کی لہریں اپنا دم کھو چکی تھیں

میں کمر تک ننگی ٹانگیں اور دھوال گری سے گرد گرد کی جھاڑیوں سے آتے ہوئے برفانی پانی میں داخل ہو چکا تھا۔ میں بہت جلدی آگے بڑھنا چاہتا تھا کیونکہ ایسا کرنا ارادتاً اپنے آپ کو مار ڈالنا تھا کچھ آگے بڑھتے ہوئے میں نے آہستہ آہستہ پاؤں کو تقلیدی نصف دائرہ کی شکل میں گھمانا شروع کیا اور پانچ منٹ کے بعد لمبا کرتا رہا تاکہ کوئی پانی کا ریلا مجھے بہا لے جائے یا کوئی بھنور یا جھاڑی پانی میں ٹانگ پکڑ کر مجھے گھسیٹ لے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔

. . . معاً میرا پاؤں ایک آبی جھاڑی میں الجھ گیا۔ اور میں پانی میں غوطے کھانے لگا۔ میرا پاؤں اور پھسلا۔ اور دوسرے لمحہ میں پانی کے موج میں تھا پانی کے ریلے بڑے زور و شور سے میرے سر پر سے گزر رہے تھے۔

کچھ دیر تک تو میں نے اپنا دم سادھے رکھا۔ مگر کب تک؟ . . . .

بے ہوش ہونے سے پہلے مجھے چند ایک باتیں یاد ہیں کہ میری ٹانگیں اور ہاتھ پانی میں کانپتے ہوئے ادھر ادھر چل رہے تھے۔ باہر نکلتے ہوئے سانس سے چند بلبلے اٹھ کر سطح کی طرف گئے۔ میرے دماغ میں زندہ رہنے کی ایک زبردست خواہش نے کسمساہٹ پیدا کی۔ اور اس کی کشش میں میں کسی چیز کو پکڑنے کے لئے پانی میں ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارنے لگا مگر اب میں پانی کی زد سے باہر نہ آ سکتا تھا۔ باوجودیکہ میں نے بہت کچھ جدوجہد کی۔

اس کے بعد میری یادداشت مختل ہونے لگی.... جسیر بوگان . . . تکمیل . . . . . پرانی حکایتوں کا شہزادہ . . . . . موت کا راز . مکتی ناتھ . . . . . تکمیل . . . . . موت کا راز . . . . اس کے بعد ایک گہرا سا اندھیرا چھا گیا۔ اندھیرے میں کبھی کبھی روشنی کی ایک جھلک ایک بڑے سے کہرے کی شکل میں دکھائی دیتی . . . پھر پرانی حکایتوں کا شہزادہ . . . . . ذرہ . . . . موت کا عمل

. . . خاموشی اور اندھیرا ہی اندھیرا!!

اس مکمل بے ہوشی میں مجھے ایک نقطہ سا دکھائی دیا۔ جو کہ برابر پھیلتا گیا۔ شاید یہ وہی ذرہ عظیم تھا جس کی بابت میں نے بہت کچھ کہا ہے۔ جو کہ بسیط ہوتا گیا۔ وہ پھیل کر ایک جھلی کی سی صورت میں میرے جسم کے ارد گرد لپٹ گیا اس طرح کہ اب پانی اس میں داخل نہیں ہو سکتا تھا مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے میں کسی خلا میں ہوں۔ جہاں سانس لینا بھی ایک تکلف ہے

ذرہ عظیم سے آواز آنے لگی "

"موت کے عمل میں تین حالتیں ہوتی ہیں قبل از موت۔ موت۔ بعد از موت۔ . . اس حالت میں ہو سکتا ہے۔ کہ دوسری حالت تم پر

طاری ہونے سے پہلے تم زندہ رہ جاؤ، قدرتاً اس میں تمہیں دوسری حالت کا احساس نہیں ہو سکتا۔ دوسری حالت میں تم اس بات کو ایک عاقلی عرصہ کے لئے جان سکتے ہو۔ جس کی تم اتنی خواہش لئے ہوئے ہو۔ مگر اس کا اظہار نہیں کر سکتے۔ مابعد موت تمہیں زندگی کی پہلی نشانی گویائی کی قوت عطا کی جاتی ہے۔ پھر یادداشت کو جو اوّل دوم حالت میں تم سے ساتھ ہوتی ہے اسے خیرباد کہنا ہوتا ہے۔ ذرّے کو دوامی عطا کر کے اس پر مہربانی کی جاتی ہے۔ عین اسی طرح جیسے آدمی کو غیب سے ناآشنا رکھ کر اس پر کرم کیا جاتا ہے ۔۔۔ وہ راز یادداشت کی تکمیل میں پنہاں ہے

"یادداشت کی مکمل تحلیل"۔ میں نے ان الفاظ کو ذہن میں دہراتے ہوئے کہا: "یادداشت کی تحلیل ۔۔۔ مکمل تحلیل پر میں وہ رازِ دنیا والوں کے سامنے طشت از بام کیسے کر سکتا ہوں۔ ۔۔۔۔۔۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں"

۔۔۔ زندگی کی اس خواہش کے ساتھ ہی میں نے اپنے آپ کو مکتی ناتھ اور دھولاگری کے درمیان پہاڑیوں میں تہ بہ کراتے ہوئے برفانی پانی کی سطح پر پایا۔ جھیل کی سپید جسم پر ست اتر چکی تھی۔ زندگی کی ایک اور خواہش کے پیدا ہونے ہی گنڈک کے معاون کے ایک ریلے نے مجھے کنارے پر پھینک دیا۔ اس وقت چاندنی رات میں ہوا تیزی سے چل کر سانس کی صورت میں میرے ایک ایک مسام میں داخل ہو رہی تھی۔

جناب تابش صدیقی بی اے

چاندنی کی آمد

رات ساکن ہے زمیں چپ آسماں خاموش ہے
برگ و بر خاموش ہیں سارا جہاں خاموش ہے

ہے زمین و آسماں کو نیند سی آئی ہوئی
اور فضاؤں پر ہیں پریاں نیند کی چھائی ہوئی

چاندنی امنڈی چلی آتی ہے اٹھلاتی ہوئی
نور کے طوفاں میں ہر ذرّے کو نہلاتی ہوئی

کچھ بلند و پست سے سرگوشیاں کرتی ہوئی
ایک دلہن کی طرح اٹکھیلیاں کرتی ہوئی

چپکے چپکے بستیوں سے گاؤں سے ہوتی ہوئی
باغ اور کھیتوں میں موتی نور کے بوتی ہوئی

مسکراتی مسکرا کر پھول برساتی ہوئی
مست خوشبو سے ہر ایک ذرّے کو مہکاتی ہوئی

آسمانوں سے اتر کر آ رہی ہے چاندنی
دور اور نزدیک پھیلی جا رہی ہے چاندنی

اک روپہلی خواب ہے کون و مکاں کو آ رہا
ہے فضا کی آنکھ میں نشہ سا اک ٹھہرا رہا

نوشتہ:۔ ای نسبت

اُس کی موت کی وجہ

مترجمہ:۔ جناب جمیل احمد کندھاپوری بی اے

گرچہ اس افسانہ کا ہر ہر لفظ حقیقت پر مبنی ہے تاہم میرا خیال ہے کہ بہت کم لوگ ان واقعات کی صداقت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر آمادہ ہونگے وجہ اسکی یہ ہے کہ اب لوگ ہر چیز کو عقل و ہوش کی روشنی میں دیکھنے کے عادی بن گئے ہیں اور میں اس سچی کہانی کے لئے عقلی دلائل پیش کرنے سے قاصر! بس اتنا سمجھ لیجیے کہ اکتوبر کی اس یادگار اکتیسویں تاریخ کو ہم دونوں میں اور میری شریک حیات روزی دھوکا اور غلط فہمی میں مبتلا ہو کر اسیسی حادثہ کا شکار بنے افسانہ ختم کرنے کے بعد آپ خود اسکا اندازہ لگانے کے قابل ہو جائیں گے کہ میری ذاتی کہانی کہاں تک اور کس طرح قابل قبول ہے نیز تین آدمیوں نے اس یادگار واقعہ میں حصہ لیا ہے میں، روزی، اور ایک نوجوان ڈاکٹر! موخر الذکر ابھی بقید حیات ہے اور آپ اگر چاہیں تو اس ناقابل یقین واقعہ کی اصلیت اور حقیقت کے متعلق اس سے استفسار کر سکتے ہیں

یوں تو آج تک زندگی میں کبھی بھی مجھے فارغ البالی نصیب نہ ہوئی لیکن بالخصوص اسوقت جبکہ یہ واقعہ رونما ہوا میں بہت زیادہ تہید ست تھا حتی کہ معمولی ضروریات زندگی کے لئے بھی مجھے اکثر دوستوں کے سامنے دست سوال دراز کرنا پڑتا تھا ایک تو یہ حالت اور اس پر مستزاد ہماری شادی! ایسی حالت میں آپ ہی بتائیے زندگی بغیر کفایت شعاری کے ہمارے لئے ناممکن تھی یا نہیں؛ وہ تو خیریت ہوئی کہ میری شریک حیات روزی افسانے لکھنا جانتی تھی جسکی بدولت ہر مہینہ تھوڑی بہت رقم مالکان رسائل کی طرف سے اسے مل جایا کرتی تھی، اور میں سمتوری سے کچھ نہ کچھ کما لیا کرتا تھا، اس طرح گویا معمولی طور پر گزر اوقات کی صورت پیدا ہو جانے کی امید تھی، ورنہ خدانخواستہ اگر وہ بالکل بے ہنر ہوتی تو زندگی سراپا مصیبت بنکر رہ جاتی، شہر میں بود و باش اختیار کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا کیونکہ محدود آمدنی کے ساتھ آپ جانتے ہیں شہری زندگی کس قدر ناممکن ہے۔ اب صرف یہی ایک صورت تھی کہ کسی گاؤں میں کوئی چھوٹا سا مکان کرائے پر لیکر وہیں سکونت اختیار کی جائے۔ ہماری خواہش تھی کہ جس گاؤں پر ہماری نظر انتخاب پڑے وہ نہ صرف خوبصورت ہو، بلکہ اسکی آب و ہوا بھی اچھی ہو۔ مگر یہ دونوں چونکہ ایسے اوصاف ہیں، جو بمشکل کسی جگہ یکجا نظر آتے ہیں۔ اس لئے کچھ دنوں تک تو ہماری تلاش رائگاں گئی، مگر آخرکار ایک گاؤں مل گیا، جو ہمارے مقررہ معیار پر پورا اترتا تھا۔

اس گاؤں کا نام برزنٹ تھا۔ جو خوفناک دلدلوں کی دکھن جانب ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع تھا۔ آخری حدود میں گرجا کے قریب ہمیں ایک مکان ملا۔ یہ ایک قدیم خستہ حال عمارت تھی، جس کے بعض حصے ادھر ادھر سے گر گئے تھے۔ صرف درمیانی دو کمرے اب تک محفوظ رہے تھے۔ مگر ان کی ساخت بھی بیڈھنگی تھی، دیواروں پر تمام کائی جم گئی تھی، اور جا بجا گھاس چھائی ہوئی تھی، مکان کے سامنے قدیم طرز کا ایک باغ تھا جس میں روشیں بنی ہوئی تھیں۔ اور رنگ برنگ کے جنگلی پھولوں کے پودے۔ بالخصوص گلاب اور چنبیلی کے پودے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ اگر یہ چیزیں نہ ہوتیں۔ تو وہ جگہ یقیناً بہت بھیانک نظر آتی۔

کنارے کے چند کمرے ٹوٹ کر گر گئے تھے۔ اور وہاں اب صرف کھنڈر ہی کھنڈر نظر آتا تھا۔ جس کمرے کو ہم لوگوں نے اپنے رہنے کے لئے پسند کیا تھا۔ اس کی کھڑکی سے خوشنما مرغزار اور سمندر کی نیلی سطح دکھائی دیتی تھی!

اور چونکہ اس مکان کا کرایہ غیر معمولی طور پر کم تھا۔ اس لئے معمولی سی دیکھ بھال کے بعد ہم نے وہ مکان کرایہ پر لے لیا۔

ایک ضعیف دیہاتی عورت جس نے اپنا نام مسز ووڈرمن بتایا وہیں ہمیں بطور خادمہ کے مل گئی۔ باغات کے متعلق اس کا دائرہ معلومات کافی وسیع تھا۔ اور وہ اکثر ہمیں عجیب و غریب پھولوں کے نام اور انکی نوعیت بتایا کرتی تھی۔ امور خانہ داری میں بھی اس سے بہت مدد ملتی تھی۔ روزی کو کاموں سے سبکدوشی حاصل ہو گئی۔ اور وہ اپنے اوقات رسالوں کیلئے مختصر افسانے لکھنے میں ہی صرف کرنے لگی۔

ازدواجی زندگی کے تین مہینے ہم نے نہایت لطف سے گزارے اور آپس میں کسی قسم کی شکر رنجی پیدا نہ ہوئی۔ ہمارے مکان سے کچھ دور بشاش طبیعت کا ایک نوجوان ڈاکٹر رہا کرتا تھا جس کا وطن آئرلینڈ تھا۔ اس سے ہمارے تعلقات دوستانہ ہو گئے تھے۔ اکتوبر کی ایک شام کو میں اس کے ساتھ سگار پیتا ہوا باہر نکل گیا۔ روزی چونکہ ایک اہم افسانہ لکھنے میں مصروف تھی۔ اس لئے اس نے خلاف معمول گھر ہی میں رہنا پسند کیا۔ جاتے وقت میں نے اپنی شریک حیات پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی ——— آہ! اس کا پیارا پیارا متبسم چہرہ! اپنے کرداروں کی قہقہہ آفریں حرکات پر وہ اسوقت دل ہی دل میں ہنس رہی تھی۔

کوئی آدھ گھنٹہ کے بعد میں تفریح سے واپس آیا۔ اور میری حیرت کی حد نہ رہی جب میں نے اپنی عزیز از جان روزی کو مشرقی دریچہ کے پاس سسک سسک کر روتا ہوا پایا

"خدا یا خیر! آخر بات کیا ہے پیاری؟" میں نے اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا ——— بولو تو، ماجرا کیا ہے؟

"خادمہ مسز ووڈرمن نے . . . .!" روزی نے سسک سسک کر کہا۔

"آخر اس نے کیا بگاڑا؟" ——— میں نے کسی قدر اطمینان کے ساتھ پوچھا۔

"وہ گھر جانے کے لئے ضد کر رہی ہے . . . . کہتی ہے کہ شہر میں بھتیجی علیل ہے اور مجھے ماہ رواں ہی میں اسے جا کر دیکھنا ضروری ہے مگر مجھے یقین نہیں آتا . . . . اول تو مسز ووڈرمن کو اپنی بھتیجی سے کچھ ایسی دلچسپی نہیں، پھر وہ تو مدت سے بیمار ہے . . . . آج کوئی نئی بات تھوڑے ہی پیش آ گئی . . . . . میرا خیال ہے، کسی نے اسے ہماری طرف سے بدگمان کر دیا ہے . . . . !"

"تو یہ ——— میں نے مطمئن ہو کر کہا: آخر اتنی سی بات کے لئے کیوں فکر کر رہی ہو؟"

"اف! تم نہیں سمجھتے۔ روزی نے کہنا شروع کیا یہ کہ معاملہ کسقدر اہم ہے، اس گاؤں کے لوگ بکریٔ سے فقیر ہیں۔ اگر مسز ووڈرمن نے کام چھوڑ دیا، تو مجھے یقین ہے کہ کوئی بھی اسکے فرائض قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوگا ——— اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا . . . . جانتے ہو؟ پھر خانہ داری کا سارا بار مجھ پر آگرے گا۔ حتیٰ کہ قابل نفرت روغن آلود برتن بھی مجھے ہی صاف کرنا پڑیں گے۔ اور تمہیں، میرا خیال ہے، نہ صرف کنویں سے پانی لانا پڑے گا۔ بلکہ چھری کانٹے بھی خود اپنے ہاتھوں سے صاف کرنا ہونگے . . . . . . اور پھر ان سب کا لازمی انجام کیا ہوگا . . . .؟ . . . فاقہ کشی!! جب مجھے افسانہ نگاری اور تمہیں مصوری کیلئے وقت نہ ملے گا تو اس کا نتیجہ فاقہ کشی کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا ہے؟" روزی نے تمام نشیب و فراز سے مجھے متنبہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ صرف تمہارا وہم ہے پیاری!" میں نے اس کے ہاتھ کو اپنے سینہ سے لگا کر کہا: "اگر واقعی ہمیں تمام کام خود ہی کرنا پڑے۔ جب بھی کچھ نہ کچھ وقت ہم سیر و تفریح اور دیگر مشاغل کے لئے نکال لیں گے" مگر روزی کا نظریہ بدل چکا تھا۔ اور وہ اس معاملہ کو کسی دوسرے زاویہ نگاہ سے دیکھنے کے لئے تیار نہ تھی۔

"اچھا مسز ووڈرمن بازار سے واپس آئے تو میں اس معاملہ کے متعلق اس سے گفتگو کروں گا" میں نے روزی کو اطمینان دلانے کیلئے کہا: "میرا خیال ہے، وہ اپنی تنخواہ میں کچھ اضافہ چاہتی ہے! دو ایک روپے بڑھا دوں گا۔ اور پھر وہ کہیں آنے جانے کا خیال ترک کر دیگی"

اسکے بعد میں نے اپنی پیاری شریک حیات سے تفریح کی غرض سے گرجا چلنے کی تجویز پیش کی، اور چونکہ وہ بھی افسانہ ختم کر کے کچھ پریشان سی ہو گئی تھی، اس لئے اپنے دل و دماغ کو تازگی بخشنے کے لئے وہ میرے ساتھ چلنے پر رضامند ہو گئی!

گرجا کی عمارت دیہات سے کسی قدر ہٹ کر ایک سنسان اور غیر آباد مقام پر واقع تھی۔ چاندنی راتوں میں ہم اکثر وہاں جایا کرتے تھے اور ہمیں یہاں میں ایک خاص لطف حاصل ہوتا تھا۔ وہاں جانے کے لئے ایک تنگ سی راہ جنگل کو صاف کر کے بنائی گئی تھی۔ جو مرغزاروں سے ہوتی ہوئی گرجا تک چلی گئی تھی، یہ راہ کچھ دور تک پختہ تھی اور لوگ اسے مُردہ بردار راہ کے نام سے موسوم کرنے کے عادی تھے۔ کیونکہ جنازے تجہیز و تکفین کے لئے اسی راستہ سے ہو کر گرجا جایا کرتے تھے معبد کی دیواروں کے ارد گرد گھنے اور تناور درخت لگے تھے جن کے سیاہ بدنما سائے ویران گرجا کے اندر رات کی پرجلال تاریکی میں ایسے معلوم ہوتے تھے۔ جیسے خوفناک جن خواب استراحت میں مستغرق ہوں۔ قبروں کے پاس صنوبر کے درخت تھے۔ جن کی شاخیں بطور حرمت بیداری تلوں پر جھکی ہوئی تھیں۔ اندر داخل ہونے کے لئے شاہ بلوط کا ایک چوڑا کواڑ لگا تھا، اور اس کے پٹ لوہے سے جڑے ہوئے تھے محرابوں کے درمیان دریچے لگے تھے۔ جن سے چاند کی روشنی اندر داخل ہو کر پھیلی ہوئی تھی! مشرقی جانب کھڑکیوں میں قیمتی شیشے جڑے تھے۔ اور روشنی میں ان کا ہلکا ہلکا مدھم رنگ نظر آرہا تھا، معبد کے ہر دو جانب جنگجو سپاہیوں کے سفید مجسمے ایستادہ تھے سنگ تراش نے انکو سامان حرب سے بھی آراستہ کر دیا تھا، جو زندگی میں ان کے لباس کا خاص جزو رہے ہونگے اور ان کے ہاتھ اوپر کی جانب اٹھے ہوئے تھے گویا وہ دائمی عبادت میں مصروف تھے۔ اور اس طرح اپنے گناہوں کی معافی کے لئے دعائیں مانگ رہے تھے۔ ان مجسموں کے نیچے ہی انکی قبریں بھی تھیں۔

گاؤں کے دہقانوں میں ان کے متعلق یہ افواہ مدت سے پھیلی ہوئی تھی، کہ ان قبروں کے مکین (یعنی وہ مجسمے)، اسی گاؤں کے باشندے تھے اور اسی مکان میں رہا کرتے تھے جس میں آجکل ہم رہتے تھے زندگی میں وہ نہایت بدخو اور بد اطوار طبیعت کے انسان تھے۔ اور ہمیشہ کشت و خون اور قسم قسم کے لہو و لعب میں مصروف رہا کرتے تھے اسی لئے کسی شخص کو بھی ان سے محبت نہ رہی اور خدا نے ان کی بے اعتدالیوں سے تنگ آکر آخر بطور قہر انکے مکان پر بجلی گرا دی، مگر چونکہ ان کے وارثوں کے پاس کافی سیم و زر تھے۔ اس لئے وہ ان گنہگار انسانوں کو موت کے بعد گرجا کے اندر جگہ دلانے میں کامیاب ہو گئے۔

ان سفید مجسموں کی ہیئت کذائی کو دیکھ کر دہقانوں کی باتوں کا یقین ہو جاتا تھا۔

گرجا اس رات غیر معمولی طور پر بہت ہیبت ناک نظر آرہا تھا اور صنوبر اور شاہ بلوط کے سائے صحن اور ستونوں پر بدنما انداز میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور خوبصورت مرغزار ضیائے ماہ میں "پرستان" بن گئے تھے۔ ہم گھنٹوں تک اس معبد کے پرجلال حسن کو بغور دیکھتے رہے جو اس مقام کا خاص طرۂ امتیاز تھا۔ اور پھر جب رات ذرا زیادہ ہو گئی۔ تو گھر واپس لوٹ آئے۔

صبح کے وقت مسز ڈورمن سے میں یوں مخاطب ہوا:

"میں نے سنا ہے، کہ تم گھر جانا چاہتی ہو! کیوں مسز ڈورمن! آخر اسکی وجہ کیا ہے؟"

"جی ہاں" مسز ڈورمن نے اپنے خاص انداز میں کہا۔ "اس ماہ کے اختتام سے قبل میرا اس گھر سے چلا جانا نہایت ضروری ہے"

"کیا تمہیں ہم سے کوئی شکایت پیدا ہو گئی ہے؟"

"نہیں حضور! مطلق نہیں . . . . آپ اور آپ کی رفیقۂ زندگی تو مجھ پر ہمیشہ بہت مہربان رہتے ہیں ——!"

"اچھا تو کیا تم اب اپنی تنخواہ میں کچھ اضافہ چاہتی ہو؟"

"نہیں آقا! میرے دل میں تو اس قسم کا کوئی خیال نہیں!"

"تو پھر یہاں ٹھہرتی کیوں نہیں ہو؟"

"نہیں حضور! میرا جانا ناگزیر ہے" مسز ڈورمن نے قدرے تامل کے ساتھ کہنا شروع کیا —— "گھر پر بھتیجی سخت علیل ہے"

"لیکن بھتیجی تو تمہاری اسی وقت سے علیل ہے۔ جب تم پہلی مرتبہ یہاں آئی تھیں . . . . . . کیا تم کم سے کم ایک مہینہ اور ہمارے ساتھ نہیں ٹھہر سکتیں؟"

"نہیں جناب! پنجشنبہ کو میرا جانا لازمی ہے"

اور وہ دوشنبہ کا دن تھا۔

"مگر تمہیں اپنے جانے کے متعلق قبل اطلاع دیدینی چاہئے تھی۔ اب اتنا وقت بھی نہیں کہ میں کوئی دوسری خادمہ ہی کی خدمات حاصل کر سکوں۔ روزی کے متعلق تو تم جانتی ہی ہو کہ وہ خانہ داری کے فرائض انجام دینے کے لائق نہیں —— اب اسی حالت میں کیا تم ایک ہفتہ بھی اور یہاں نہیں ٹھہر سکتی؟ . . . میں اس عرصے میں کوئی دوسرا آدمی ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا"!

"مگر ایک ہفتہ بعد تو میں خود ہی حاضر ہو جاؤں گی"!

"تو پھر صرف اس ایک ہفتہ کے لئے جانے کے کیا معنی" میں نے کسی قدر حیران ہو کر پوچھا —— "کوئی معقول وجہ بتاؤ"!

مسز ڈورمن نے اپنی چھوٹی سی کریم چادر اپنے سینہ سے بھینچتے ہوئے کہا "لوگوں کا خیال . . . ہے . . . کہ . . . . . . یہ مکان عہد کیتھولک میں خاص شہرت رکھتا تھا . . . اور اس کے اندر . . . . . قسم قسم . . . . . کے . . . . . کام . . . . بھی . . . . . انجام دیئے . . . . . گئے . . . ہیں"!

"قسم قسم کے کام! . . . ." نہایت مبہم بات تھی اور جسم کا خون رگوں میں منجمد کر دینے کے لئے کافی! خیر میں خوش تھا کہ روزی اس وقت کمرے میں موجود نہ تھی، ورنہ وہ کمزور طبیعت کی کمسن لڑکی . . . . . مکان کے متعلق اس دہقانی عورت کی حیرت انگیز باتوں کو سنکر ضرور متوحش ہو جاتی۔

"اپنا مطلب ذرا صاف اور غیر مبہم الفاظ میں بیان کرو مسز ڈورمن! مجھ جیسے شخص کے سامنے تامل بیکار ہے۔ میں آخر بچہ تو ہوں نہیں، جو اس قسم کی باتوں سے خواہ مخواہ ڈر جاؤں گا"!

اور یہ کسی قدر حقیقت بھی تھی۔

"معبد کے ہر دو جانب آپ نے سفید مجسمے تو ضرور ہی دیکھے ہونگے!" مسز ڈورمن نے آخر ڈرتے ڈرتے کہا۔

"او ہو!" میں نے خوش ہو کر کہا "تمہارا مطلب ان سپاہیوں کے مجسموں سے ہے"!

"جی ہاں۔ میرا مطلب ان قبروں کے مکینوں سے ہے جن کے مرمریں مجسمے بھی وہاں ایستادہ ہیں۔ ہر سال سینٹ ایو (St. Eve) کی شب وہ مجسمے اپنی مقررہ جگہ سے اٹھتے ہیں، اور معبد کے اندر قبروں کے ارد گرد گھومتے رہتے ہیں۔ پھر جب گرجا کا گھڑیال گیارہ بجاتا ہے۔ تو وہ گرجا کے احاطہ سے باہر نکل جاتے ہیں"!

"مگر وہ مجسمے معبد سے نکل کر جاتے کدھر ہیں؟" میں نے اشتیاق آمیز لہجے میں پوچھا۔

"وہ اپنے اسی مکان میں آتے ہیں جسے آپنے کرایہ پر لے رکھا ہے اور اگر کسی شخص کو دیکھ پاتے ہیں تو ——"!

"تو پھر؟" میں نے دریافت کیا۔

مگر مسز ڈورمن نے اس سے آگے ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالا اور یہی رٹ لگاتی گئی کہ —— "گھر پر بھتیجی بیمار ہے اور مجھے جا کر اسے دیکھنا ضروری ہے"!

"خیر! کچھ بھی ہو!" قدرے توقف کے بعد مسز ڈورمن پھر اس طرح گویا ہوئی "لیکن خدارا سینٹ ایو کی شب دروازے ذرا سویرے ہی بند کر لیں کواڑ اور دریچوں پر صلیب کے نشانات بنا دیں"!

"مگر کیا کسی نے اب تک سینٹ ایو کی شب اپنی آنکھوں سے ان مجسموں کو اصل روپ میں دیکھا بھی ہے؟" میں نے پوچھا "گذشتہ سال اس مکان میں کون تھا؟"

"کوئی نہیں حضور! آجتک اس مکان میں کرایہ دار بھی نہیں آیا۔ صرف مالک مکان اس میں موسم گرما گزارتا ہے۔ اور سینٹ ایو سے ایک مہینہ قبل ہی بطور احتیاط اس مکان کو چھوڑ کر لندن چلا جایا کرتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اپنی باتوں سے خواہ مخواہ آپ کو متوحش کر دیا ہے لیکن کچھ بھی ہو میری بھتیجی علیل ہے، اور مجھے جا کر اسے دیکھنا ضروری ہے"

عجیب بیل عورت تھی۔ اصل وجہ بیان کرنے کے باوجود خواہ مخواہ بھتیجی کی علالت کی لغو رٹ لگاتی جا رہی تھی۔

روزی کو میں نے مجسموں کے متعلق یہ باتیں نہیں سنائیں صرف اس خیال سے کہ فضول وہ ابھی سے ایک محض خیالی بات کے پیچھے پریشان ہو جائے گی چونکہ میں بذات خود توہم پسند نہیں، اس لئے اول تو مجھے مسز ڈورمن کی باتوں کا یقین ہی نہیں آیا۔ پھر وہم یہ کہ اس کے دوسرے ہی دن میں نے روزی کی ایک نہایت خوبصورت تصویر بنانا شروع

کی اداس میں کچھ ایسا محو ہوا، کہ ساری باتیں بھول بیٹھا۔ اپنی تصویر کا پس منظر میں نے غروب آفتاب کا سرخ اور چمکیلا نظارہ پیش کیا تھا، جو نہایت دلنشیں تھا۔ اور میں اپنے پورے جوش وخروش کے ساتھ اس تصویر کو جلد سے جلد ختم کرنے میں منہمک ہو گیا۔ پنجشنبہ کے دن مسز دوارمن رخصت ہوئی اور جانے سے قبل ازراہ کرم روزی سے بولی "دلہن! جو کام ۔ ۔ ۔ ۔ کرنے کے قابل نہ ہو، اسے چھوڑ دیں۔ ۔ ۔ ۔ آئندہ ہفتہ واپس آکر میں اسے انجام دے لونگی"

پنجشنبہ کا دن نہایت مزے سے گزر گیا۔ اور اس کے بعد جمعہ کا یادگار دن آیا۔ وہ دن جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ یہ کہانی عبارت ہے اسی واقعہ سے جو ہمیں جمعہ کے دن پیش آیا۔

اس صبح کو میں ذرا سویرے ہی جاگ اٹھا۔ اور خود ہی باورچیخانہ کے چولہوں کو روشن کیا۔ اور ابھی میں دھواں دور کرنے میں اچھی طرح کامیاب بھی نہ ہوا تھا، کہ روزی بہار کی خوبصورت کلی کی مانند شاداں و فرحاں میرے پاس ذرا تیزی سے آئی ہم نے مل کر ناشتہ تیار کیا اور آپ یقین کیجئے یہ کام ہمارے لئے ذرا بھی تکلیف دہ نہیں ثابت ہوا بلکہ ہم نے اس میں کافی لطف محسوس کیا۔ اس کے بعد ہم نے برتن وغیرہ مانجھ کر جلد ہی تمام کام انجام دیدیئے۔ دن کے کھانے میں ہم نے اپنے ہاتھوں کی تیار کردہ چیزیں مثلاً قہوہ اور کیک وغیرہ کھائے روزی اسدن معمول سے زیادہ بشاش نظر آرہی تھی۔ اور اس کی غیر معمولی فرحت کو دیکھکر میں نے اندازہ کیا کہ روزانہ خانہ داری کا تھوڑا سا کام انجام دینا اس کے لیئے بہت مفید ثابت ہوگا اپنی ازدواجی زندگی میں ہمیں سچ پوچھئے تو کبھی ایسی مسرت محسوس نہ ہوئی تھی جیسی کہ اس دن۔ اور پھر اس یادگار سہپر کو ۔ ۔ ۔ ۔ باور کیجئے، وہ تو ہماری زندگی کی مسرور ترین ساعت تھی۔ جب غروب آفتاب کے گہرے سرخ بادل ایک ایک کرکے دلدلوں میں روپوش ہوگئے۔ اور دور میدانوں کے اردگرد سفید کہر چھانے لگا تو ہم ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے واپس لوٹ آئے۔

"تم اس وقت ۔ ۔ ۔ کسی قدر مضمحل نظر آرہی ہو میری پیاری!" اپنے چھوٹے سے ملاقاتی کمرے میں بیٹھ کر میں نے صرف ذرا چھیڑنے کی غرض سے روزی کو یہ جملہ کہا۔ ورنہ میں جانتا تھا کہ اس قسم کی کوئی بات نہ تھی، خود میری خاموش عبادت تھی، سراپا مسرت سے لیکن میری توقع کے خلاف وہ بولی:-

"ہاں میں ذرا پریشان سی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ طبیعت واقعی اندر ہی اندر مٹھی معلوم ہوتی ہے۔ سیر سے واپس آنے پر تین چار مرتبہ مجھ پر کپکپی سی طاری ہو چکی ہے۔ اور پھر دیکھو سردی بھی تو غالب نہیں ہے!"

"ہاں! سردی تو مفقود ہے؟" —— اتنا کہہ کر مجھے خیال آیا کہ شاید سہپر کے وقت دلدلوں کے بیرحم کہرے اس کے نازک جسم کو سردی لگ گئی ہے۔ لیکن روزی نے میرے قیاس کی مخالفت کی، اور کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ خود بولی:-

"کیا تمہیں غیر محسوس طور پر نامعلوم اشیا سے کبھی خوف بھی معلوم ہوتا ہے؟"

"مطلق نہیں!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اگر میں بھی اسطرح کا خوف محسوس کروں، جب بھی مجھے ان باتوں پر یقین نہ ہوگا"

"مجھے تو ہوتا ہے" روزی کہنے لگی "جس رات میرے والد کا انتقال ہوا تھا۔ اس رات بھی مجھ پر اسی قسم کا خوف طاری ہوا تھا۔ حالانکہ میرے والد اسوقت مجھ سے کوسوں دور شمالی سکاٹلینڈ میں تھے"

روزی کی باتوں کا میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

کچھ دیر تک تو وہ خاموش بیٹھی رہی، میرا ہاتھ اپنی نرم ونازک انگلیوں میں دبائے، انگیٹھی کی چنگاری کو بغور دیکھتی رہی، اور پھر یکایک میری پیشانی کا بوسہ لیکر بولی —— "چلو شمع روشن کرکے ذرا پیانو سے دل بہلائیں"

ڈیڑھ دو گھنٹے ہم نے نہایت لطف کے ساتھ پیانو کے پاس گزارے تقریباً ساڑھے دس بجے رات کو مجھے حسب معمول آخری مرتبہ پائپ پینے کی خواہش ہوئی روزی کو چونکہ تمباکو کا دھواں ویسے ہی ناپسند ہے اور اسوقت وہ کسی قدر علیل بھی تھی، اس لئے میں نے مناسب نہ سمجھا کہ کمرے میں بیٹھ کر بدبو کے ساتھ اپنے پائپ کے تمباکو سے روزی کی طبیعت کو مکدر کردوں۔

"میں ذرا ٹہل کر پائپ پیتا ہوں پیاری!" —— میں نے روزی سے کہا

"تو پھر میں بھی آتی ہوں!"

"نہیں جان! آج کی رات نہیں! تم ویسے ہی بہت تھک گئی ہو، میں فوراً واپس آتا ہوں۔ جاؤ۔ جاکر سو رہو! ورنہ تمہاری طبیعت خراب ہو جائے گی اور کل صبح مجھے خانہ داری کے کاموں کے علاوہ ڈاکٹر کا بھی انتظام کرنا پڑے گا۔" میں نے مذاقاً کہا۔

جانے سے قبل میں نے اس کے لبوں کا بوسہ لیا اور۔۔۔ باہر نکلنے کے لئے ابھی مڑنے بھی نہ پایا تھا کہ وہ میرے سینے سے لپٹ گئی، جیسے وہ مجھے کبھی باہر نہ جانے دیگی۔ میں نے اس کے ریشمی بالوں کو سہلا کر کہا۔

"جاؤ! سو رہو! پیاری!! خانہ داری کے کاموں نے تمہیں تھکا دیا ہے"

اپنی گرفت اس نے کسی قدر ڈھیلی کر دی، اور ایک طویل سانس لیکر کہا۔ "نہیں پیارے! آج تو ہم بہت خوش رہے ہیں نا!!۔۔۔

۔۔۔ اچھا واپس آنے میں دیر نہ کرنا"

"گھبراؤ نہیں۔ میں فوراً واپس آجاؤں گا پیاری!"

سامنے کے دروازے سے میں باہر نکل گیا۔ اور اس کو یونہی کھلا ہوا چھوڑ دیا۔ اف کیسی ہیبت ناک رات تھی! سیاہ اور بھاری بادل کے ٹکڑے آسمان کی سطح پہ جابجا تیر رہے تھے۔ اور پتلے پتلے سفید بادل ستاروں کے درمیان منڈلا رہے تھے۔ بادلوں کے بحر ناپیدا کنار میں چاند ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی سیمیں کشتی ہے جو کچھ دیر تو موجوں سے جنگ کرتی ہے اور پھر گہری تاریکی میں غائب ہو جاتی۔

رات نہایت خاموش تھی، اور ہر طرف ایک پر اسرار سکوت غالب تھا۔ نہ تو خرگوشوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دیتی تھی، اور نہ ہی نیم بیدار پرندوں کی صدا آتی تھی۔ اگرچہ تیز ہوا فضا کی بلندی پر بادلوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ دھکیلتے پھر رہی تھی لیکن نیچے زمین پر اسکا نام و نشان تک نہ تھا۔ اسی لئے جنگل کے درخت کے پتے بھی ساکت تھے۔ اور کہیں سے کھڑکھڑاہٹ کی آواز نہیں پیدا ہو رہی تھی۔ مرغزاروں کی اس طرف مجھے گرجا کا بلند مینار نظر آرہا تھا۔ جو دور آسمان کے مقابل اپنے پرہیبت جلال کیساتھ ایستادہ تھا۔ اپنی تین ماہ کی خوشگوار ازدواجی زندگی پر غور کرتا ہوا میں۔۔۔ سست قدموں کے ساتھ وہاں ٹہلتا رہا۔

گرجا کی جانب مجھے ٹن ٹن کی آواز سنائی دی۔ گھڑیال گیارہ بجا رہا تھا۔ میں نے گھر واپس جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن پھر کسی نامعلوم جذبہ کے زیر اثر ارادہ ترک کر دیا، اور گرجا کی جانب بڑھنے لگا۔

اپنے مکان کے نیچے دریچہ پر میں نے ایک آخری نگاہ ڈالی۔ روزی انگیٹھی کے قریب آرام کرسی پر لیٹی ہوئی تھی، اس کا چہرہ میں نہ دیکھ سکا، البتہ مدھم نیلی دیوار کے مقابل اس کا پیارا پیارا ننھا سا سر نظر آیا۔ وہ بالکل خاموش اور غیر متحرک تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بلاشبہ وہ آغوش خواب میں ہوگی۔

جنگل کے کنارے کنارے میں دبے پاؤں جا رہا تھا۔ قریب سے کسی آواز نے یکایک سکوت شب کو درہم برہم کر دیا۔ یہ ایک قسم کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز تھی۔ جو جنگل میں پیدا ہوئی تھی۔ میں نے دفعتاً رک کر آواز کو سننے کی کوشش کی۔ لیکن میرے ساتھ ساتھ آواز بھی رک گئی تھی میں نے قدم اٹھایا اور میرے ساتھ ساتھ اس آواز نے بھی، جیسے وہ صدائے بازگشت تھی شاید وہ کوئی چور یا ڈاکو ہوگا۔ خود میرے پڑوس میں اس قسم کے چوروں کے متعدد واقعات ہو چکے تھے۔ لیکن وہ خواہ کوئی بھی ہو احمق ضرور تھا، کیونکہ اسے بطور احتیاط اپنے قدم ذرا آہستگی سے اٹھانے چاہئیں تھے۔ میں نے مڑکر جنگل پر ایک نگاہ ڈالی، اور اب مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ آواز بھی میرے نقوش قدم پر آہستہ آہستہ میرا تعاقب کر رہی ہے میں سوچا ضرور یہ میری صدائے بازگشت ہوگی۔ چاندنی نے جنگل پر متانت سی پیدا کر دی تھی، موٹے موٹے درخت ایسے معلوم ہو رہے تھے۔ جیسے گو تھک ستون! "آخر مردہ بردار راہ" سے ہوتے ہوئے میں گرجا کے اندر اس مقام پر پہنچ گیا۔ جہاں قبریں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی ہوئی تھیں،

ایک لمحہ کے لئے میں اس جگہ ٹھہر گیا، جہاں بیٹھ کر گزشتہ دن میں نے روزی کے ساتھ حسن و عشق کی مدح پرور باتیں کی تھیں۔ یکایک میری نظر گرجا کے دروازے پر پڑی۔ جس کے کواڑ کھلے ہوئے تھے۔ اور گزشتہ شب اس کو یونہی کھلا چھوڑ کر چلے جانے پر میں نے آپ ہی آپ اپنے ضمیر کو ملامت کیا۔ گاؤں میں صرف ہم ہی ایسے انسان تھے، جو یکشنبہ کے علاوہ بھی یہاں سیر و تفریح کی غرض سے آیا کرتے تھے۔ اور اس خیال سے مجھے اسوقت کچھ کوفت سی محسوس ہوئی کہ اپنی بےپرواہی

سے ہم نے دروازے کھلے چھوڑ دیئے تھے۔ جس سے خزاں کی تمر زدہ بیل ہواؤں کو اندر داخل ہوکر عمارت کو برباد کرنے کا موقع ملا تھا، میں اندر داخل ہوا۔ یہ بات آپ کو ذرا تعجب خیز معلوم ہوگی کہ معبد میں داخل ہونے کے بعد یکایک ایک خوف کے ساتھ مجھے مسٹر ڈورمن کی باتیں یاد آگئیں کیونکہ یہ سینٹ ایو کی شب اور ٹھیک وہی وقت تھا، جب اس کے خیال کے مطابق مجسمے اپنی جگہ چھوڑ کر گرجا سے باہر نکل جایا کرتے تھے۔ اب یقین کیجئے، اسکا خیال آتے ہی میں نامعلوم خوف کے زیر اثر جسم میں کپکپی سی محسوس کرنے لگا۔ اور دل ہی دل میں گھر سے باہر نکل آنے پر خود کو کوسنے لگا۔

خیر! تو اس کا خیال آتے ہی میں نے اپنے دل کو مضبوط کر کے، ان مرمریں مجسموں کے پاس جانے کا ارادہ کیا تاکہ گاؤں میں پھیلی ہوئی افواہ کی بچشم خود تردید کر دوں مجھے یقین تھا کہ مجسمے اپنی جگہ استادہ ہونگے۔ اور اس خیال سے مجھے خوشی ہوئی کہ اب حقیقت دریافت کر کے مسٹر ڈورمن کو اس کے واپس آنے پر کہونگا کہ اس کے خیالات بالکل غلط تھے اور یہ کہ سینٹ ایو کی شب گیارہ بجے مجسمے حسب دستور اپنی مقررہ جگہ پر ایستادہ تھے خیر تو جیب میں ہاتھ ڈالے میں آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا اس طرف روانہ ہوا —— چاند کی دھندلی روشنی میں معبد کا مشرقی حصہ معمول سے ذرا زیادہ بڑا نظر آ رہا تھا، اور ان دو قبروں کی محرابیں بھی پہلے سے کسی قدر دراز دکھائی دے رہی تھیں، چاند نے بدلیوں کے اوٹ سے نکل کر مجھ پر اصل حقیقت واضح کر دی، میں یکلخت ٹھٹھر گیا سینہ یکایک طبوں اچھلنے لگا اور ایسا محسوس ہوا جیسے شدت خوف سے میرا دم گھٹ کر رہ جائے گا

وہ مجسمے اپنی جگہ سے غائب تھے وہ چوڑے چوڑے سفید پتھر جن پر انکے بت نصب تھے۔ اسوقت چاند کی پھیکی اور مغموم روشنی میں جو مشرقی دریچہ سے گزر کر داخل ہو رہی تھی ...... خالی پڑے ہوئے تھے۔

کیا وہ مجسمے واقعی اپنی جگہ سے غائب تھے، یا میں اسوقت دیوانہ ہوگیا تھا۔ اپنے دل کو مضبوط کر کے میں نے ان خالی اور سفید پتھروں کو اپنے ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر دیکھا —— لیکن وہاں ایک معمولی سنگریزہ تک موجود نہ تھا۔ بڑی تحیر زا بات تھی! کیا کوئی ان دیو قامت مجسموں کو اٹھا لے بھاگا تھا؟ —— کیا کسی نے میرے ساتھ یہ سنگین مذاق کیا تھا؟ .... بہرحال میں نے اسکی اصلیت دریافت کرلینے کا فیصلہ کیا، اور اس ارادہ کے ساتھ ہی اپنی جیب سے کاغذ کا ایک بڑا سا ٹکڑا نکال کر اسے دیا سلائی سے روشن کر کے مشعل بنایا، اور اوپر کی جانب اٹھایا، اسکی زرد روشنی نے تاریک محرابوں اور خالی پتھروں کو دفعتاً منور کر دیا۔ وہ مجسمے غائب تھے! .... اور میں ..... اسوقت ...... اس خوفناک .... گرجا کے اندر .... تنہا ...... کھڑا تھا!!

اب مجھ پر شدید خوف طاری ہونے لگا: خوف .. ناقابل بیان .... ناقابل یقین ...... اور لامحدود! —— اور میں سمجھ گیا کہ عنقریب مجھ پر کوئی بہت بڑی آفت نازل ہو جائے گی —— بس جنون آمیز حالت میں میں نے مشعل ہاتھ سے گرا دی، اور انتہائی خوف و تشویش کی حالت میں تیزی سے معبد کے اندر سے نکل کر بھاگا۔ اسوقت میں اپنے لبوں کو زور زور سے کاٹ رہا تھا اور قریب تھا کہ شدت خوف سے میری چیخیں نکل جائیں —— اُف! اسوقت میں دیوانہ ہوگیا تھا۔ گرجا کی چہار دیواری سے ... چھلانگ مار کر میں باہر کود پڑا، اور کھیتوں سے گزرتا ہوا سیدھا اپنے مکان کی جانب روانہ ہوگیا۔

ابھی میں نے نصف راستہ ہی طے کیا تھا۔ کہ کوئی شخص مجھے اپنی طرف بڑھتا ہوا دکھائی دیا۔ آنے والی آفت کے خیال سے میں اس وقت پاگل سا ہو رہا تھا۔ اور مزاحمت بے جا کی تاب نہ لا کر غصہ سے چیخ اٹھا "ہٹ جاؤ میرے راستہ سے!"

لیکن اس شخص نے اپنے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ مجھے پکڑ لیا۔ اور پھر جو میں نے بغور دیکھا۔ تو اس نوجوان ڈاکٹر پر نظر پڑی جو نہ صرف میرا ہمسایہ تھا، بلکہ دوست بھی!

"چھوڑو! جانے دو مجھے! معبد سے مرمریں مجسمے چل پڑے ہیں!! میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا ہوں!"

ڈاکٹر نے زور سے ایک قہقہہ لگایا —— کل مجھے تم کو دوا پلانا پڑیگی ...... سگار اور تمباکو کی کثرت نے تمہارا توازن دماغی متزلزل

کر دیا ہے"

"مذاق جانے دو ڈاکٹر!" میں نے ترش روئی سے کہا "میں خود دیکھ رہا ہوں کہ مجسمے گرجا سے غائب ہیں"

"اچھا! تو پھر میرے ساتھ چلو! میں ایک مریض کو دیکھنے جا رہا ہوں، سر راہ گرجا جا کر ہم اسکی تصدیق بھی کر لیں گے"

"تم کو جہاں بھی جانا ہو جاؤ" ——— میں نے ڈاکٹر کی بیوقت ہنسی سے بگڑ کر کہا ——— "میں اپنی بیوی کی خیریت معلوم کرنے جا رہا ہوں"

"دیوانہ کہیں کا!" ڈاکٹر نے کہا ——— "کیا تمہارا یہ خیال ہے، کہ میں اسوقت تمہیں چھوڑ دونگا، تاکہ تم تمام شہر میں مہمل افواہ پھیلاتے رہو، کہ سینٹ ایو کی شب میں نے ان مجسموں کو اپنی جگہ سے غائب دیکھا ہے . . . . . نہیں دوست . . . . میں ایسا کبھی نہیں کر سکتا!"

رات کی ہوا . . . انسانی آواز . . . . . . اور ایک بلند قامت تنہا انسان کی صحبت . . . . . . ان چیزوں نے مل ملا کر میرے پریشان ہوش و حواس مجتمع کر دیئے۔

"اچھا تو پھر چلو!" میں نے کہا "گرجا پہنچ کر میں دکھا دونگا، کہ مجسمے اپنی جگہ سے غائب ہیں یا نہیں!"

ڈاکٹر میرا بازو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا، ہم تھوڑی دیر کے بعد گرجا کے پاس پہنچ گئے، جہاں موت کی سی خاموشی مسلط تھی میں دل ہی دل میں خوش تھا، کہ ابھی میری بات کی تصدیق ہو جائے گی اور ڈاکٹر شرمسار ہو جائے گا۔ کیونکہ مجھے یقین کامل تھا، کہ مجسمے اپنی جگہ سے غائب ہونگے، ڈاکٹر نے اپنی برقی لیمپ روشن کی ——— "دیکھو! یہ مجسمے بدستور اپنی جگہ پر موجود ہیں . . . . . میں نہ کہتا تھا، کہ تمہارا دماغی توازن متزلزل ہو گیا ہے"

میں نے آنکھ کھول کر دیکھا ——— واقعی سفید پتھروں پر دو مجسمے حسب سابق ایستادہ تھے۔ میں نے کسی قدر اطمینان کا سانس لیا۔

"میں تمہارا بہت ممنون ہوں ڈاکٹر!" میں نے شکریہ کے لہجہ میں کہا "مگر میری آنکھوں کو اسوقت کسی نہ کسی طرح دھوکا ہوا تھا، شاید یہ دماغی کمزوری کثرت کار کا نتیجہ ہو!"

"مجھے معلوم ہے" ڈاکٹر نے ہنس کر کہا "تمہیں اپنے دماغ کی طرف کافی توجہ صرف کرنی چاہئے۔ ورنہ ممکن ہے آئندہ تمہیں سخت دھوکا کھانا پڑے"

وہ اسوقت خمیدہ ہو کر دائیں جانب کے مجسمے کو بغور دیکھ رہا تھا، جس کی ہیئت کذائی سے بے تنہا شرارت مترشح تھی۔

"اوہو! بخدا! یہاں کوئی نہ کوئی آیا ضرور ہے" دیکھو اسکے ہاتھ کی انگشت شہادت غائب ہے جیسے ٹوٹ کر کہیں گر گئی ہو"

اور واقعی ڈاکٹر نے درست کہا تھا، کیونکہ ایک روز قبل جب میں روزی کے ساتھ یہاں آیا تھا، تو مجسمے بالکل صحیح و سالم تھے۔

"شاید کسی بدنیت نے اس کو یہاں سے ہٹانے کی کوشش کی ہے" نوجوان ڈاکٹر نے کہا

"اچھا چلو" میں نے ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا "گھر پر تنہا وہ پریشان ہو رہی ہوگی، تم بھی وہاں بیٹھ کر میرے ساتھ وسکی کا ایک جام نوش کر لوگے۔ پھر تو ہم زندگی بھر یاد کریں گے، کہ غلط طور پر اپنی حماقت سے اس قسم کا خوف ہم پر بھی مسلط ہوا تھا"

"مجھے اپنے مریض کو جا کر دیکھنا تھا، مگر اب کافی دیر ہو گئی . . . . خیر! صبح سویرے دیکھ لونگا۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

راستہ میں ہم آپس میں گفتگو کرتے رہے۔ جس کا بنیادی مرکز یہ تھا کہ کس طرح بسا اوقات ہماری آنکھیں ہمیں دھوکا دیتی ہیں اور ہم ان چیزوں کو جن اور بھوت پر محمول کرنے لگتے ہیں

گھر پہنچ کر باغ کے پاس سے میں نے دیکھا کہ سامنے دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اور اسکی روشنی کی تیز شعاعیں باہر نکل رہی ہیں۔

"اندر آ جاؤ!" میں نے ڈاکٹر سے کہا اور وہ میرے ساتھ ملاقاتی کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں جابجا موم بتیاں روشن تھیں، کوئی ادھر کوئی ادھر بعض اس جگہ بعض اس جگہ . . . . کہیں کہیں چراغ اور تیز مشعل بھی جل رہی تھی، اسوقت مجھے خیال آیا کہ شاید روزی نے تنہائی کے خوف سے یہ روشنیاں جلا رکھی ہیں . . . . بے چاری لڑکی . . . کیوں میں فضول اسے تنہا چھوڑ کر باہر گیا . . . . . بیشک میں سنگدل تھا

کمرے کی چاروں طرف میں ایک طائرانہ نگاہ ڈالی، لیکن روزی کا کہیں پتہ نہ تھا، اسکی کرسی خالی پڑی تھی، اور اس کی کتاب نظر آ رہی . . . .

تھی، میں دوسرے کمرے میں داخل ہوا، دیکھا کہ وُہ دریچہ کے پاس ایک میز کے سہارے وہ گری پڑی ہے ــــ اُف معبود! معلوم ہوتا تھا، جیسے کسی نے اسکا تعاقب کیا ہے، اور وہ خوف و دہشت سے گر پڑی ہو۔

...... ہائے میری پیاری روزی!!

اس کا نصف جسم تو میز پر تھا، اور نصف دریچہ پر، اس کا سر نیچے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ اور اسکے لانبے لانبے خوبصورت بال پریشانی کے عالم میں قالین پر بکھرے پڑے تھے۔ اسکے لب عجیب خوف افزا طور پر دیر کی جانب اٹھے ہوئے تھے، اور اسکی آنکھیں بند تھیں.... ..ہمیشہ کے لئے بند! اب نا ممکن ہے وہ کوئی چیز بھی نہ دیکھ سکتی تھیں۔ اُف معبود! وہ کونسی شے ہوگی جس پر میری روزی نے مرنے سے قبل آخری مرتبہ نظر ڈالی ہوگی۔

ڈاکٹر اسکی جانب بڑھا، لیکن میں نے اسے دھکیل کر پرے ہٹا دیا، اور خود اس کو اپنے بازوؤں میں لے کر کہا:۔

"روزی! پیاری روزی!!..... دیکھو! میں واپس آگیا"

وہ میرے بازوؤں کی مضبوط گرفت میں تھی، میں نے اسے لپٹا کر بوسہ لیا اور طرح طرح کے دلنشیں ناموں سے اسے پکارا، لیکن وہ ابدی نیند میں غرق تھی، اور میری آوازیں اسے خواب غفلت سے بیدار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اسکی مٹھیاں خوب مضبوطی سے جکڑی ہوئی تھیں، اور ایک کے اندر وہ کسی چیز کو زور سے بھینچے ہوئے تھی، جب مجھے اسکا یکدم یقین ہو گیا کہ وہ ہمیشہ کے لئے مجھے داغِ مفارقت دے گئی تو میں نے ڈاکٹر کو اس کی مٹھی کھولنے کی ہدایت کی۔

اور جب وہ میرے ارشاد کی تعمیل کر چکا، تو میں نے کیا دیکھا.... اُف معبود! اس کے اعادہ سے ابھی بدن پر رعشہ سا طاری ہو جاتا ہے.......!...... وہی پتھر کی سفید مرمریں انگشتِ شہادت، جو گرجا والے مجسمے کے ہاتھ سے گم ہو کر غائب پائی تھی۔

جناب اثر چکوالی بی اے

غزل

دِل پہ طاری ہے شعورِ انبساط ۔۔۔ زندگی ہے ایک احساسِ نشاط

دِل فسردہ، آنکھ پُرنم، رُوح شق ۔۔۔ ماسوا اس کے ہے کیا میری بساط

عشق سوزِ جاوداں کا نام ہے ۔۔۔ حسن ہے ذوقِ نظر کا انبساط

اپنی آپس میں فرق سب معدوم ہے ۔۔۔ کیا عجب ہے دوستی کا اختلاط

عقل ہے گم کردہ منزل اے اثرؔ
عشق محکم ہے عناں گیرِ بساط

جناب سید احسان علی شاہ
(بی اے)

میں ہوں اپنی شکست کی آواز

پوجیہ پتا!

مجھ بھاگوں جلی کی زبان سے یہ القاب سنکر آپ ناراض نہ ہوں آپ مجھے بیٹی بناکر اپنے گھر لائے تھے۔ آگے یہ میری تقدیر تھی کہ آپ ہی نے مجھے دھکے دیکر اس گھر سے باہر نکال دیا۔ مجھے اسکا کوئی گلا نہیں جب تقدیر ہی انسان کو مٹی میں ڈالنے پر تل جائے، تو تدبیر کیا کر سکتی ہے؟ اور پھر ایک مچھلی سارا جل بھی تو گندہ کر دیتی ہے۔ آپ نے گندی مچھلی کو نکال کر سارے تالاب کو اپوتر ہونے سے بچا لیا۔ آپ نے بڑا اچھا کیا۔ بڑا ہی اچھا!

لیکن میں گندی ہی سہی، بری ہی سہی اوباش ہی سہی۔ جو کچھ بھی ہوں آخر ہوں تو وہی، جسے آپنے اپنے بیٹے کی استری بنایا تھا، اور بڑے چاؤ سے بہورانی کہا تھا۔ اب اگر میں آپ کی نظروں میں اس خطاب کے قابل نہیں رہی، تو نہ سہی، میں دنیا سے منہ کالا کرتی ہوں آخر اپنے ساتھ آپ کی اور آپ کے خاندان کی عزت کو کیوں غرق کروں، چند منٹ کے بعد یہ منحوس صورت ہمیشہ کے لئے روپوش ہو جائے گی، اور آپ کی طرف کوئی انگلی بھی نہ اٹھا سکے گا۔

مرنے سے پہلے آپ سے ایک بھیک مانگتی ہوں، مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ سے ایک راز کہہ دوں۔ یہ میری ساری زندگی کا حاصل ہے میں جانتی ہوں کہ آپ ہی اسے اپنا راز سمجھ سکیں گے، اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسے اپنے سینے کی اتھاہ گہرائیوں میں چھپا سکیں گے، اس لئے آپ ہی سے کہتی ہوں!

یہ پڑھ کر شاید آپ مجھے منہ پھٹ اور بے شرم لڑکی سمجھیں، میں جانتی ہوں بزرگوں سے ایسے راز نہیں کہے جاتے۔ لیکن میں پھر بھی سب کچھ لکھوں گی، میں اپنی زندگی کے ان حسین ترین لمحات کو وقت کی راکھ تلے سے کرید کر رہونگی، خواہ آپ کچھ ہی کہیں:

کالج کی پرکیف زندگی کا نقشہ میری نگاہوں کے سامنے رقص کر رہا ہے۔ اور میں دیکھ رہی ہوں کہ ایک نوجوان اپنے متناسب جسم کو ایک خوش رنگ سوٹ میں ملبوس کئے اپنے دوستوں کے جمگھٹے میں بیٹھا ہے، اسکی آنکھوں میں شرارت کھیل رہی ہے، اور اس کے ہونٹوں پہ ایک بڑی ہی میٹھی مسکراہٹ! میں جان بوجھ کر اس کے قریب سے گذر جاتی ہوں لیکن اپنے رویہ سے بے اعتنائی کا اظہار کرتے ہوئے! وہ اپنی پیاری پیاری آنکھوں سے میری طرف دیکھتا ہے اور پھر اپنے دوستوں سے مخاطب ہو جاتا ہے۔

"لو گرفتار معلوم ہوتے ہیں،" وہ مترنم آواز میں کہتا ہے۔

"کمار! تم تو ہمیشہ سے پاگل ہی رہے،" اسکے دوستوں میں سے ایک کہتا ہے "ارے بھئی یہ تو مدت سے کالج میں حشر برپا کئے ہوئے ہیں"

"اور ابھی تک ہوا کیوں نہیں!" وہ ہنس کر جواب دیتا ہے۔

"اگر چند روز اور یہی عالم رہا، تو ہو جائے گا"

میں ان لوگوں کی باتیں سنی ان سنی کر کے آگے بڑھ جاتی ہوں لیکن کمار کو بار بار دیکھنے کی ایک عجیب سی خواہش میرے دل میں چٹکیاں لینے لگتی ہے۔ میں پلٹ کر دیکھنا چاہتی ہوں، لیکن نامعلوم کیوں ایسا نہیں کر سکتی پھر دل ہی دل میں کہتی ہوں:

"اسے دیکھے میری بیزار، مجھے کیا پڑی ہے، جو اسکی طرف دیکھوں" لیکن دل اس خیال کا ساتھ نہیں دیتا۔ آنکھیں اسکے مسکراتے ہوئے چہرے کی بلائیں لے لینے کو بے قرار ہو جاتی ہیں، دماغ کہتا ہے "اس میں کونسے ایسے لعل ٹنکے ہیں جو میں اسے بار بار دیکھوں میں تو نہیں دیکھتی"

اور ساتھ ہی بے اختیاری کے عالم میں پلٹ کر اسے دیکھ لیتی ہوں، پھر خود ہی دوسری طرف دیکھنے لگتی ہوں، اسکی نگاہیں میرا تعاقب کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، اور میں خود بخود خفیف سی ہو جاتی

ہوں، دل کہتا ہے:۔

"ایک دفعہ اور دیکھ لوں پھر نہیں دیکھوں گی"

لیکن خود ہی جواب دیتا ہے:۔

"آخر وہ کوئی چیز یا گھر ہے جو میں اسے بار بار دیکھوں"

اس پر خود بخود مسکرانے لگتی ہوں، اسے پھر پلٹ کر دیکھتی ہوں دل اور دماغ کی عظیم کشمکش ایک بھاری بوجھ کیطرح میری روح پر مسلط ہو جاتی ہے، اور میں تیز تیز قدموں سے چل کر کلاس روم میں چلی جاتی ہوں کیسی پرلطف تھی یہ کشمکش، کاش! ماضی ایک دفعہ ان لمحات کو پھر اگل دے!

اس کے بعد آہستہ آہستہ زندگی ایک نشہ خیز موسیقی میں بدلتی گئی، جیسے جیسے لمحات کے پردے اٹھتے گئے، ویسے ویسے مجھے اپنے دل کی ملکی میٹھی خلش کا احساس شدید ہوتا گیا، ایک ایسی خلش کا احساس جسے میں زندگی کے بدلے بھی نہیں دے سکتی!

میرا کمار سائیکل پر سوار تھا، میں تانگے میں تھی، وہ کبھی تانگے کے آگے نکل جاتا، اور کبھی تعاقب کرنے لگتا، میں اسے کنکھیوں سے دیکھتی، لیکن جب اسکی اچٹتی ہوئی نگاہیں میرے چہرے پر پڑتیں میں شرم سے کانوں تک سرخ ہو جاتی، اسوقت مجھے وہ بڑا ہی پیارا معلوم ہو رہا تھا، کاش میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکتی!

میں گھر پہنچ گئی، اور وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے پرنام کرکے چلا گیا۔ میں جانتی تھی کہ اسنے مجھے پرنام کیا ہے۔ لیکن میں نے اس پر ظاہر نہ ہونے دیا میں چاہتی تھی کہ ہاتھ جوڑ کر اسکے سامنے جھک جاؤں لیکن نام نہاد نسائیت بھی تو ایک بڑی قوت ہے۔ اس کی کشادہ پشت پر کوٹ کی سلوٹیں کیسی بھلی معلوم ہو رہی تھیں!

وہ چلا گیا، اور میں سارا دن اسکی یاد میں محو رہی کتابوں کا مطالعہ تو بجائے خود رہا۔ کتاب کی طرف انگلی اٹھا کر بھی دیکھنا مشکل معلوم ہوتا تھا، دل یہی چاہتا تھا کہ اس کی بھولی صورت کو آنکھوں کے سامنے بٹھاؤں، اور اس سے باتیں کئے جاؤں کبھی چاہتی کہ اسکے گھر چلی جاؤں کبھی ارادہ کرتی کہ کل جب بھی وہ کالج میں ملے۔ اسے پرنام کروں، اسکا مزاج پوچھوں، اور پھر کہہ دوں کہ کمار مجھے تم سے محبت ہے! لیکن ساتھ ہی یہ خیال آتا کہ اس حرکت سے کہیں وہ مجھے اوباش لڑکی ہی نہ سمجھ لے۔

دوسرے دن کالج جاتے وقت میں نے دیکھا کمار ہمارے مکان سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑا تھا آج اس کے سر پر انگریزی ٹوپی تھی، سیاہ رنگ کی، اسکا سرخ و سفید رنگ، اس ٹوپی کے سائے میں کیسا بھلا معلوم ہوتا تھا جی چاہتا تھا کہ اسکی پوجا کرنے لگوں۔ لیکن نہ معلوم کیوں میں اس سے آنکھ تک نہ ملا سکی۔

بہت سے دن گزر گئے۔ کمار مجھے روز ملتا۔ اب مجھ میں اس سے آنکھ ملانے کی جرأت پیدا ہو گئی تھی، وہ مجھے مسکرا کر دیکھتا۔ کس قدر دلفریب تھی، اسکی مسکراہٹ! کاش یہ میرے لئے وقف ہو جاتی! لیکن ... ... قسمت قسمت!

اب میں کبھی کبھی اسکی طرف دیکھنے لگتی لیکن خود ہی شرمندہ ہو کر دوسری طرف منہ پھیر لیتی، میں اس کے سامنے مسکرانے سے ڈرتی تھی، تعلقات بڑھتے رہے، اور میں اپنے کمار کے نزدیک تر ہوتی گئی، اب میں اس کے ساتھ ایک آدھ بات بھی کر لیتی۔ اگر مجھے پھول پیش کرتا، تو وہ بھی لے لیتی۔ اگر مجھے محبت کے اس خونیں انجام کی خبر ہوتی تو وہ پھول حفاظت سے اپنے پاس جمع رکھتی، شاید یہی سوکھی پتیاں اب تسکین قلب کا سامان بن جاتیں۔ لیکن جب تقدیر اور انسانی قوتوں کی جنگ ہو تو فتح تقدیر ہی کی ہوتی ہے۔ انسان بے چارہ تڑپ ہی سکتا ہے اور بس۔

آفتاب کے طلوع و غروب کے ساتھ ساتھ ہماری بے تکلفی بڑھتی رہی اور آخر وہ دن آ پہنچا، جب میرے کمار نے مجھے اپنے ساتھ سیر کرنے کو کہا اندھا کیا مانگے دو آنکھیں، میں تو اسدن کے لئے بیقرار تھی لیکن کمار کے اضطراب کا تماشا بھی کچھ کم پرلطف نہیں ہوتا تھا، میں نے کمار کو تڑپانا چاہا، اور نا مک نخرے کرنے لگی۔ کمار نے میری منتیں کیں میرے سامنے ہاتھ جوڑے، پرماتما اور دنیا بھر کے تمام دیوتاؤں کے واسطے دیئے اور تب جاکر میں نے ہاں کہی۔

صلاح یہ ٹھہری کہ چاندنی رات میں دریا پر چلیں۔

میں نے شام کے وقت اپنی بہترین ساڑھی پہنی، ماما کو کہہ دیا کہ سینما جا رہی ہوں دیر سے لوٹوں گی اور شام کے دھندلکے میں لارنس گارڈن کی طرف ہولی۔ یہیں کمار سے ملنے کا وعدہ تھا۔

کمار موٹر میں بیٹھا بڑی بے تابی سے میرا انتظار کر رہا تھا مجھے دیکھتے ہی مجھ پر برس ہی تو پڑا میں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اور پچھلے سے موٹر میں بیٹھ گئی موٹر ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

دم کے دم میں ہم دریا کے کنارے پر تھے۔ راوی کی روایتی نرم نرمی مستانہ اٹکھیلیوں سے شعر و رومان کی دنیا کو جگاتی چاند کی سیمیں شعاعوں کو فن کے اس پار لئے جا رہی تھی، چاروں طرف ہو کا عالم تھا لیکن اس خاموشی میں بھی ایک دلفریب حسن تھا۔ سر بفلک درختوں کے جھنڈ جو تنہائی میں شاید مجھے لرزہ براندام کر دیتے۔ سرور و کیف کے لہراتے ہوئے فردوس معلوم ہو رہے تھے۔ اور ان سب سے بڑھ کر چاند — دنیائے طلسم کا حسین راجہ —— روشن جبیں ستاروں کے جھرمٹ میں بیٹھا سکوت کے گہوارے میں آرام کی نیند سونے والی دنیا کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

ہم دونوں ہنستے ہوئے موٹر پر سے اترے۔ آج میرا دل خلافِ معمول مسرور تھا مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کمار نشاط و کیف کی اس مدہوش کن جنت پر حکمرانی کرنے والا دیوتا ہے اور مجھے اپنی سرمدی سرمستیوں میں جذب کر لینے کے لئے اپنی مملکت میں لے آیا ہے۔ اسی اثنا میں وہ دریا کے کنارے ریت پر بیٹھ گیا۔

"کیسا پیارا منظر ہے" وہ بولا

"ہاں" میں نے کہا "لیکن کمار...... میں کچھ کہنا چاہتی تھی شاید اپنے قلبی حسیات کو الفاظ کا جامہ پہناتی۔ لیکن میں خاموش ہو گئی معلوم نہیں کیوں؟

"کہو لاجو!" کمار نے اپنی جذبات سے بھری ہوئی مترنم آواز میں کہا "ہاں تو لیکن......"

"کچھ نہیں" میں بولی۔

"کچھ تو ہے!"

"تمہاری.... " میں یکدم جھجک گئی۔ میں کمار کی سوگند کھانا چاہتی تھی لیکن جھینپ کر بولی "کچھ بھی تو نہیں" اور میں نے مسکرا کر کمار کی طرف دیکھنے کی کوشش کی مگر میری آنکھیں خود بخود جھک گئیں۔ کمار میرے قریب کھسک آیا۔

"نہیں لاجو!" اس نے کہا "آج تو تمہیں بتانا ہی ہوگا!"

"کیا بتانا ہوگا" میں نے بے ساختہ کہہ دیا۔

"یہی جو کچھ تم کہنا چاہتی تھیں؟"

"میں تو کچھ بھی نہیں.......

"غلط" کمار نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "اچھا تو پھر میں کہوں" اسکی نگاہیں میرے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ اور میں مارے شرم کے زمین میں گڑی جاتی تھی۔

"جواب تو دو"

"ہاں ہاں" میں نے اسکی طرف دیکھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا "کہو بھی کچھ"

"میں...." اور کمار یکدم خاموش ہو گیا

"میں ایک کہانی سناؤں تمہیں بڑی ہی پیاری"

"اچھا" مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے دل پر سے ایک بھاری بوجھ اتر گیا ہے۔ کمار کہنے لگا۔

"ایک تھا بھکاری .... معمولی بھکاری۔ وہ ایکدن چلتا چلتا ایک بہت بڑے راجہ کے محل کے پاس جا پہنچا۔ کیا دیکھتا ہے۔ کہ محل کی ایک کھڑکی کھلی ہے۔ اور اسمیں راجہ کی بیٹی بیٹھی ہے راجہ کی بیٹی ایسی سندر تھی، ایسی سندر تھی کہ یہ چاند بھی اس کے سامنے پھیکا پڑ جائے۔ تو خیر اس بھکاری نے اسے دیکھا۔ اور بہت دیر تک اسکی طرف دیکھتا رہا، راجہ کی بیٹی بھی اسکی طرف دیکھتی رہی، ایکدن ایسا ہوا کہ...... کہ بھکاری نے اپنی جھولی میں سے ایک پھول نکالا۔ اور راجہ کی بیٹی کو دیا۔ راجہ کی بیٹی نیچے اتر آئی۔ اور بولی "بھکاری میں تم سے پریم کرتی ہوں"... بھکاری نے کہا "میرے من مندر کی دیوی میں تیری پوجا کرتا ہوں"....... راجہ کی بیٹی بولی "میرے بھکاری مجھ سے........ شادی کر لے۔ اور........"

"بالکل جھوٹ، بالکل غلط!" میں نے زور سے تالی بجا کر کہا "پر ماتما

کے لئے کمار! اگر جھوٹ ہی بولنا تھا، تو ایک حد تک بولا ہوتا۔ بھلا عورت ایک مرد سے اس طرح کی باتیں کہہ سکتی ہے؟"

"تم سنو تو" کمار نے جھینپتے ہوئے کہا۔ "بات یہ ہے کہ راجہ کی بیٹی کو اس سے محبت تھی۔"

"خواہ کچھ بھی ہو عورت ایسی باتیں نہیں کر سکتی۔"

"اچھا لاجو!" کمار نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "عورت ایسی باتیں کبھی نہیں کر سکتی؟"

"عورت خواہ کسی کی محبت میں دیوانی کیوں نہ ہو رہی ہو، ایسی باتیں کبھی نہیں کرے گی۔"

"تو پھر کس طرح اپنی محبت کا اظہار کرے گی؟"

میں اس سوال کی تہ میں کام کرنے والے جذبے کو بھانپ گئی میرا دل چاہتا تھا، کہ اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دوں، اور میرے دل پر جو گزر رہی ہے، کمار کو سناؤں، لیکن میں نہیں سمجھ سکتی کہ میں کیوں منفعل سی ہو گئی اور سر جھکا کر بولی:

"میں کیا جانوں!"

"لاجو!" کمار نے میٹھی اور دھیمی آواز میں کہا۔ اس کے بازو میری گردن میں حمائل ہو گئے میری آنکھیں اور جھک گئیں۔ اور میری انگلیاں ریت پر لکیریں بنانے لگیں۔ آہ! محبت کا اظہار کرنا بھی کتنا کٹھن کام ہے۔

"لاجو!" کمار نے پھر اسی کانپتی ہوئی آواز میں کہا "مجھے ..... میں ...... لاجو! تم مجھے بڑی اچھی لگتی ہو!"

مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ کہ محبت کے فرشتے کسی دوسری دنیا سے مجھے ابدی مسرت و لافانی کامرانی کا مژدہ سنا رہے ہیں۔

* * *

کمار مجھ سے روز ملتا، اور ہر وقت اپنی لافانی محبت کا اظہار کرتا رہتا۔ کتنے اچھے دن تھے وہ، کیسی دلکش راتیں، لیکن انکی یاد کتنی بھیانک کسقدر دلخراش! گذری ہوئی مسرت کیوں مصیبت بن جاتی ہے۔ آخر کیوں؟

ایک دن کمار کو نہ جانے کیا سوجھی بولا "لاجو! آؤ ہم دونوں شادی کر لیں۔"

مجھے ایسا محسوس ہوا، گویا کمار کے ہونٹوں نے میری روح کا عزیز ترین راز چرا لیا ہے۔

میں نے پلٹ کر اسکی طرف دیکھا۔ اسکی آنکھیں، اسکی کشادہ پیشانی کی من موہنی سلوٹیں، اسکے تمتماتے ہوئے رخسار، اس کے جذبات سے کانپتے ہوئے ہونٹ خاموشی کی زبان میں کہہ رہے تھے ؎

اے کاش کہ تو اور میں ——— اے کاش کہ میں اور تو
اک پھول سا بن جائیں ——— نکہت میں کھو جائیں

اور میں بے اختیار مسکرا دی۔ لیکن اس کے فوراً بعد مجھے اپنے ہندوستانی ہونے کا تلخ احساس ہوا

"ہم ہندوستان میں ہیں" میں نے غمگین آواز میں کہا۔ "اور جب تک سماج اپنے قوانین کو پورا نہ کرا لے گی، ہم دونوں ایک جگہ نہ ہو سکیں گے۔"

"سماج!" کمار نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "سماج دو روحوں کے درمیان حائل نہیں ہو سکتی!"

"لیکن کمار . . . . ."

"لیکن ویکن کچھ نہیں لاجو!" کمار نے پرجوش انداز میں کہا۔ "ہماری روحیں ایک دوسرے میں جذب ہو جانے کے لئے بیقرار ہیں میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔ ہماری شادی آج ہی ہو گی۔"

"تم ذرا صبر کرو۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "امتحان کے بعد گھر جاؤں گی، تو ماتا کو کہہ سنکر راضی کر لوں گی، بڑا خطرہ تو ذات پات کا ہوتا ہے، ہم دونوں کھتری ہیں۔"

"اونہوں" کمار نے ملتجیانہ کہا۔ "اب میں زیادہ دیر تک جدا نہیں رہ سکتا، میں تو آج ہی شادی کرونگا۔"

"اور ماتا پتا کی اجازت کے بغیر یہ سب کس طرح ہو جائیگا؟"

"دو روحوں کے ملاپ کے لئے ظاہری رسم و رواج کی ضرورت نہیں ہوا کرتی، ہم دونوں مل کر بتا دیں گے، کہ سماج کے آہنی قانون محبت کے سامنے موم کی ناک بن جاتے ہیں۔"

"لیکن ماتا پتا کا حکم بھی تو آخر بڑی طاقت ہے؟"

"ماتا پتا کیا جانیں پریم کی ریت، میں دس بجے آؤنگا تیار رہنا۔"

اور وہ چلا گیا۔

میں عجیب سی ادھیڑ بن میں پڑ گئی، پنڈت پروہت، وادم تالی، باجے گاجے۔ اور ماتا پتا کی اجازت کے بغیر شادی رچا لینے کا خیال میرے لئے عجیب تھا۔ لیکن اپنے کمار سے ہمیشہ کیلئے مل بیٹھنے کا خیال کچھ کم نشہ خیز نہ تھا۔ وہ میٹھی مسکراہٹ، وہ دل موہ لینے والی باتیں، اور وہ پیاری صورت صرف سماج کے چند سنگین اصولوں کی قربانی پر میری ہو سکتی تھی۔ سودا سستا معلوم ہوتا تھا۔ میں تیار ہو گئی۔

رات کے ساڑھے گیارہ بجے میرا کنہیا ہاتھ میں پھولوں کے دو ہار لئے ہوئے آیا۔ اس نے ایک میرے گلے میں ڈال دیا، اور دوسرا میں نے اسکی گردن میں پہنا دیا۔ اس نے دونوں ہاروں کو گرہ دے دی اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا،

"اب ہم دونوں کی شادی ہو گئی۔ اب ہم کبھی بھی جدا نہ ہونگے" اور اس نے میرے ہونٹوں کو چوم لیا۔ لیکن میں کسی نامعلوم خطرے کو محسوس کر کے سہم گئی۔ سماج کی کڑی زنجیروں میں جکڑا ہوا دل یکدم آزادی کی دیوی کو دیکھ کر گھبرا سا گیا۔ اور میں پھر انہیں زنجیروں میں آڑ لینے کو لپٹی۔

"لیکن یہ گناہ ہے" میں نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہم دونوں سماج کی نظروں میں ذلیل ہو جائیں گے۔"

"او لاجو!" اس نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔ "سماج بھاڑ میں جائے"

کمار نے اس دن تو مجھے یہی کہا تھا کہ یہ ہماری شادی کی پہلی رات ہے۔ اور اس کے بعد اسی نے کہا، کہ یہ بھیانک گناہ تھا۔ میں ابھی تک نہیں سمجھ سکی، کہ ان دونوں میں سچی بات کونسی ہے۔ لیکن میرا دل کہتا تھا، وہ ہماری شادی کا پہلا دن تھا، اور میری زندگی کے خوابناک آغاز کا خوفناک انجام۔

اسکے بعد جو کچھ ہوا، اس کے خیال سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لیکن تصویر کو مکمل کرنے کے لئے ان سب واقعات کا اعادہ ضروری ہے۔ اس لئے کلیجے پر پتھر رکھ کر لکھتی ہوں:

کمار کا جوش محبت کم تو نہیں ہوا، البتہ مجھے یہ احساس تو ضرور ہوتا تھا کہ، اب اسکی آنکھیں ویسی نہیں رہیں۔ وہ آتا تو دو چند منٹ بیٹھ کر ادھر ادھر کی بے کیف سی باتیں کرتا اور چل دیتا۔

اب اس کا آنا جانا بھی کم ہونے لگا۔ میں اس بے رخی کا سبب پوچھتی تو وہ کہتا،

"امتحانات کے دن قریب ہیں، فرصت نہیں ملتی" میں چپکی ہو رہتی۔

امتحان ہوئے اور کمار امتحان دیکر مجھ سے ملے بغیر چلا گیا۔ میں اس بات سے سخت پریشان ہوئی۔ رہ رہ کر سوچتی، کہ کمار مجھے بھول تو نہیں گیا لیکن فوراً ہی اس خیال کو فاسد خیال کیطرح دماغ سے نکال دیتی اور کوشش کرتی، کہ مجھے اسکی محبت پر پورا اعتماد ہو جائے۔

چھٹیاں ہوئیں، اور مجھے اپنے گاؤں واپس آنا پڑا۔ جس طرح میں نے یہ دن کاٹے ہیں، کچھ میں ہی جانتی ہوں۔ صبح بیدار ہوتے ہی مجھے یقین ہوتا کہ کمار کا خط آئے گا۔ لیکن ساتھ ہی خیال آتا، کہ اسے ہمارے گاؤں کے نام تک کا پتہ نہیں۔ اس خیال سے میری ساری امیدیں خاک میں مل جاتیں۔ پھر میں یہ سوچتی، کہ محبت کبھی انسان کو نچلا نہیں بیٹھنے دیتی۔ وہ ضرور ایک نہ ایک دن مجھے ڈھونڈتا ڈھونڈتا ادھر آ نکلے گا۔ میں سارا سارا دن انہیں خوش فہمیوں میں مبتلا گوش بر آواز رہتی لیکن کمار کی دلکش آواز ایک دلخراش یاد میں بدل چکی تھی۔ اور بس:

جوں توں کر کے دن گذرے اور کالج پھر کھلا۔ میں پھر اسی فضا میں آ گئی جسکی ہوا کا ہر ذرہ میرے کمار کے نقرئی قہقہوں سے معمور تھا لیکن یہاں آ کر مجھے اپنے فیل ہونے کی خبر سننا پڑی، کمار پاس ہو گیا تھا۔ میں نہیں جانتی مجھے کیوں اسکی کامیابی پر اتنی خوشی ہوئی، میں پھولے نہ سماتی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا، کہ میں خود بڑے اعزاز سے پاس ہو گئی ہوں۔ اب مجھے پوری امید تھی، کہ کمار مجھ سے ملنے کے لئے یا کم از کم یار دوستوں کو دعوت کھلانے کے لئے ضرور آئے گا۔ لیکن دن مہینوں میں بدل گئے۔ اور کمار کے آنے کی امید ایک خوشگوار خواب کیطرح میرے ذہن کے عمیق گوشوں میں محفوظ رہی۔

میں دوسرے سال بھی فیل ہو گئی، اور پتا جی کے کہنے پر کالج چھوڑنا پڑا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا گویا مجھ سے میری زندگی چھینی جا رہی ہے میں نے پتا جی کو کہا، کہ میں اس سال ضرور پاس ہو جاؤں گی، لیکن میری کون سنتا تھا۔ مجھے واپس گاؤں میں آنا پڑا۔ لیکن میرے خیال کو بڑی کون پہچان سکتا تھا؟

میرے بیاہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ بڑے بڑے امیر گھرانوں کے رشتے آئے۔ لیکن میں بیاہتا تھی، پتی کی غیر حاضری میں دوسری شادی کس طرح کر لیتی۔ سہیلیوں کے ذریعہ یا خود ماتا جی سے کہکر رشتہ لوٹا دیتی۔

اسی طرح دو سال اور گزر گئے، اور ابھی تک میری شادی نہیں ہوئی تھی۔ شہر میں نوجوان لڑکیاں کھپ سکتی ہیں۔ لیکن گاؤں میں جوان لڑکیوں کا دیر تک ناکتخدا رہنا بڑا ہی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ کر پتا جی کو خوب خوب سناتے۔ پتا جی یہ سب کچھ سنتے تھے، لیکن میری دلشکنی کے خیال سے مجھ سے کچھ نہ کہتے۔

ایک روز قسمت نے اور رنگ دکھایا، ست کی جھلک دکھا کر مجھے ہمیشہ کے لئے آہوں اور آنسوؤں کے سپرد کر دیا۔

ایک اور رشتہ آیا۔ لڑکے کا نام کمار تھا، اور لڑکے کی تصویر وہی تھی، جو میں نے کئی دفعہ کمار کے کمرے میں دیکھی تھی۔ لیکن یہ رشتہ پتا جی کو کچھ ایسا پسند نہ آیا۔ نہ تو لڑکے کے والدین کے پاس جائداد تھی، اور نہ ہی لڑکے کی تنخواہ ایک نازونعم سے پلی ہوئی لڑکی کی ضروریات کی متحمل ہو سکتی تھی۔ لیکن یہ میرا کمار تھا۔ میں نے جھٹ غربت نوازی کی آڑ لی اور کسی نہ کسی طرح پتا جی پر ظاہر کر دیا، کہ میں اسی سے شادی کروں گی۔

ہماری شادی ہو گئی، اب سماج کے تمام قوانین پورے ہو گئے تھے، اور گناہ کا خیال میرے دل سے نکل گیا تھا۔ میں مسرت سے لبریز سرخ چادر میں لپٹی کمرۂ عروسی میں بیٹھی تھی، اور سوچ رہی تھی، کہ کمار کو خوب خوب آڑے ہاتھوں لونگی اور پوچھونگی کہ شادی کرنے کے بعد بیویوں کو چھوڑ کر اس طرح بھاگ جایا کرتے ہیں۔

لیکن کمار کے پاؤں کی چاپ سنتے ہی میرا غصہ یکدم اتر گیا میں نے سوچا، کہ اگر کمار مجھے بھول گیا ہوتا تو یہ شادی ہی کیوں ہوتی۔ میرا دل چاہتا تھا، کہ کمار کے قدموں پر جھک جاؤں، لیکن کمار سے منتیں کروانے کا خیال اس خواہش پر غالب آ گیا۔ اور میں نے سانس روک لیا۔

کمار آہستہ آہستہ میرے قریب آیا۔ چند لمحوں تک خاموشی سے میرے پاس کھڑا رہا۔ اور پھر میری پشت پر ہاتھ رکھ کر بولا:۔

"میں نے کہا...... اس چادر میں گرمی لگتی ہوگی؟"

اُف کتنی دلی ہمدردی میں ڈوبے ہوئے تھے یہ الفاظ۔ میں بے تاب ہو گئی، اور جلدی سے گھونگٹ اٹھا کر بولی:۔

"پتی دیو!"

کمار نے مجھے حیرت سے کھلی ہوئی آنکھوں کے ساتھ دیکھا۔ اور سمٹ کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ حیرت نے اُسے کس قدر مستند بنا دیا تھا۔

"دیکھا! میں نے مسرت بھری ہوئی آواز میں کہا: میں تمہیں۔۔ اوں آپ کو...... آپ کو نہیں بھولی" اور ساتھ ہی میں پلنگ پر سے اٹھ کر کمار کے قریب آ کھڑی ہوئی۔

"تم" کمار کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"ہاں ہاں پتی دیو! آپ کی لاجو" وہ ایک قدم اور پیچھے ہٹ گئے۔

"اوہ ناراض ہو گئے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہاں غلطی تو میری ہی ہے۔ پہلے مجھے اپنے دیوتا کے چرن لینے چاہئیں"

اور میں انکے قدموں پر جھک گئی، میں کتنی خوش تھی، میرے دل کی سب سے بڑی تمنا آج پوری ہونے کو تھی، ابھی میرے ہاتھ انکے قدموں سے مس بھی نہ ہونے پائے تھے۔ کہ انہوں نے اپنے پیر پیچھے کھینچ لئے اور سمٹ کر ایک طرف ہو گئے۔ میں نے انکے چہرے کی طرف دیکھا، اس پر غم و غصہ کے شدید جذبات مرتسم تھے۔ میں خفیف سی ہو گئی، شاید یہ میری اضطراری حرکتیں، میرے دیوتا پر ناخوشگوار اثر ڈال رہی تھیں، لیکن میں اپنی خفت کو چھپانے کے لئے کھڑی ہو گئی، اور جھوٹی مسکراہٹ سے بولی:۔

"بڑے کٹھور ہو! پتھر کے دیوتاؤں سے بھی زیادہ کٹھور! پجارن کو اپنا فرض بھی ادا نہیں کرنے دیتے۔"

"تم مجھے چند منٹ کے لئے زندہ رہنے دو" کمار نے ماتھا پکڑتے ہوئے کہا۔ اور کسی تھکے ہوئے آدمی کی طرح مسہری کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر گر پڑا۔

"کیا ہوا" یکدم میرے منہ سے نکلا اور میں گویا کرسی کی طرف کھنچ گئی۔

"ہٹ جاؤ الگ مجھ سے" کمار نے غصے اور نفرت سے بھری ہوئی آواز میں کہا "ڈومڈ ڈاین!"

یہ لفظ نہ تھے۔ زہر میں بجھے ہوئے خنجر تھے۔ جو میری روح میں اتر گئے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"پتی دیو! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ ۔ ۔ ۔ ۔"

"پتی دیو" کمار نے غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "لاجونتی تمہیں میرے سامنے آتے ہوئے شرم آنی چاہئے۔ تم وہ وقت بھول گئی ہو شاید جب ہم دونوں کے درمیان نامحرمی کی خلیج حائل تھی، اور تم نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم نے اسے بھیانک گناہ سے پاٹ دیا تھا، تم جیسی آوارہ عورت میری پتنی بنے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میری پتنی — اُف پرماتما! ۔ ۔ ۔ ۔ مگر" وہ یکدم کرسی پر سے اچھل پڑا ۔ ۔ ۔ "مگر میں تمہیں ایک منٹ کے لئے بھی اس گھر میں نہ رہنے دونگا"

یہ الفاظ بجلی بنکر میری ذہنی قوتوں پر گرے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے ہونٹ کہہ رہے ہیں:

"بھیانک گناہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بھیانک گناہ" میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔

کمار لپک کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ ڈھولک کی آواز، اور عورتوں کے مسرور قہقہے خوفناک نشتروں کی طرح میری سماعت سے ٹکرا رہے تھے۔ چند لمحوں کے بعد خوشی اور مسرت کا یہ شور اور حیرت و استعجاب کے ناقابل فہم غلغلے میں ڈوب گیا، میرا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا اور میں کرسی کا ہتہ پکڑ کر فرش پر بیٹھ گئی۔

* * *

میں شاید ساری رات اسی طرح بیٹھی رہی میرے ذہن میں کوئی خیال نہ تھا۔ مجھے کسی غم یا کسی خوشی کا مطلق احساس نہ تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے قریب ہی کہیں بجلی گری ہے جس سے میرا دماغ سن ہو کر رہ گیا ہے۔

دوسرے دن بھی میری یہی حالت تھی۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ آپ نے مجھے بازو سے پکڑ کر تانگے پر بٹھا دیا، مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ آپ کسی کنویں میں سے بول رہے ہیں

"جہاں کی چڑیل ہے تو وہیں جا کے مر" شاید یہی تھے آپ کے الفاظ!

مجھے کچھ یاد نہیں کہ میں کہاں "لائی گئی" میرے اتری اور کیوں اتری البتہ جب میرے حواس درست ہوئے تو میں نے اپنے آپ کو باغ میں پایا۔ میرے احساسات تیز ہو رہے تھے باغ کا ہر ذرہ مجھے انتقام کا پیغام دیتا معلوم ہوتا تھا، لیکن پھر نا معلوم کیوں کالج کے وہ رنگین لمحات میری آنکھوں تلے پھر گئے۔ محبت کے مقدس بندھن کا خیال آگیا۔ میں جانتی ہوں کہ نام، دی کی یاد محبت کے لطیف جذبات کو کچل دیگی۔ اور میں کمار سے نفرت کرنے لگونگی، یہ اقتضا بشری ہے لیکن میں اسدن کیلئے زندہ نہیں رہنا چاہتی، جسدن میں اپنے کمار سے نفرت کرنے لگوں۔

پوجیہ پتا! آپ نے بڑے تحمل سے میرے اس راز کو سنا ممنون ہوں، ایک عرض کو اور مان لیجئے۔ میں مر رہی ہوں، جھوٹ نہیں کہونگی، میں نے آجتک اپنے آپ کو کمار کی امانت سمجھے رکھا ہے اور کسی غیر کی ہوا تک کو اپنے قریب نہیں بھٹکنے دیا۔ مجھ پر اتنی دیا کیجئے، کہ میری لاش یا میرے پھولوں کو کسی غیر مرد کا ہاتھ نہ لگنے دیجئے۔ نہیں تو میں جنم جنم کے لئے دھتکار دی جاؤں گی، میرے سوامی مجھ بھاگوں جلی پر اتنی مہربانی تو ضرور کر دیں گے انہیں بھی کبھی مجھ سے محبت تھی۔

اب رخصت ہوتی ہوں، میرے، پتی کو میری طرف سے کہہ دیجئے،

"میرے دیوتا! تمہیں آخری دفعہ پرنام"

بدنصیب

لاجونتی

جناب سید مقبول حسین احمد پوری

گیان گیت

(۱)
جب سے ہوئے ہم پریم پجاری
نین بنے درشن کے بھکاری
شیام ہیں درشن کے ادھکاری[1]
شیام سے آس ہماری اب تو شیام سے آس ہماری!

(۲)
بھول گئے سب جیون کا غم
اپنے سروپ[2] میں مست ہوئے ہم
آپ ہی پریم ہیں آپ ہی پریتم
ہم ہوئے اپنے پجاری اب تو ہم ہوتے اپنے پجاری!

(۳)
اب نہیں جیون ہم پر بھاری
آپ ہوئے اپنے ادھکاری
اپنی ہی آتما سے کی یاری
اپنی ہی آتما پیاری اب تو اپنی ہی آتما پیاری!

[1] صاحبِ اختیار
[2] خودی

جناب شاکر علی صاحب

دوستوسکی

۱۸۲۱ء میں وہ روس کے ایک خیراتی شفاخانہ میں پیدا ہوا۔
۱۸۴۲ء میں اس نے اپنا پہلا ناول غریب لوگ لکھا
اپریل ۱۸۴۹ء میں ایک اشتراکی انجمن میں حصہ لینے کے جرم میں اپنے اکتالیس ساتھیوں کے ساتھ پکڑا گیا۔۔۔۔ سزائے موت قرار پائی۔

دسمبر ۱۸۴۹ء میں Semyonovski Square میں اسکو اور اس کے بیس ساتھیوں کو سزا کا حکم سنایا گیا۔ اس کے بعد ہر ایک کو چومنے کیلئے صلیب دی گئی۔ پھر ان کی آنکھیں بند کر کے برابر برابر بلیوں سے باندھ دیا گیا۔ جب سپاہیوں کو بندوقیں بھرنے کا حکم دیا جا رہا تھا تو ایک افسر گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا۔۔۔۔ سزائے موت قید سے تبدیل ہو گئی۔

دوستوسکی خود لکھتا ہے:۔

"۲۲ دسمبر کو مجھے جیل کی کوٹھری میں فیصلہ سنایا گیا۔۔۔۔ سزائے موت! کب؟ یہ نہیں بتایا گیا۔ مشکل سے آدھ گھنٹہ گذرا ہو گا کہ جیلر آیا اور مجھے تیار ہونے کا حکم دیا۔ بڑی نگہداشت سے مجھے صحن میں لایا گیا۔ جہاں میرے ساتھیوں میں سے ۱۹ موجود تھے۔ اس وقت صبح کے کوئی سات بجے ہونگے۔ ہمیں گاڑیوں میں بٹھلایا گیا۔ ایک میں چار چار۔ ہر ایک گاڑی کے ساتھ ایک ایک سپاہی بھی تھا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" ہم میں سے کسی نے دریافت کیا۔

"یہ میں نہیں بتا سکتا۔" سپاہی نے کہا۔

گاڑی کی کھڑکیاں برفباری کی وجہ سے دھندلی ہو رہی تھیں اس لئے باہر بھی کچھ دکھائی نہ دیتا تھا آخرکار ہم Semyonovski Square پر پہنچ گئے۔ بیچ میں ایک اونچا سا مچان تھا،

جس پر ہمکو چڑھایا گیا اور دو دو کی قطار میں کھڑے کر دیئے گئے۔ منصف مچان پر چڑھا، اور موت کا حکم پڑھ کر سنانے لگا۔ سزا اس کے فوراً ہی بعد دیجانے والی تھی۔

فیصلہ میں متواتر بیس مرتبہ یہ منحوس لفظ دہرایا گیا۔ سزائے موت سزائے موت!!

یہ لفظ میرے ذہن میں اسطرح بیٹھ گیا تھا کہ اس کے سالہا سال بعد تک میں سوتے سوتے چونک اٹھتا۔ یہ محسوس ہوتا۔ جیسے اسے کوئی پھر دہرا رہا ہے

منصف نے فیصلہ سنانے کے بعد کاغذ کو طے کر کے جیب میں رکھا اور مچان سے اتر کر چلا گیا۔ اسی وقت سورج بھی بادلوں سے نکل آیا میں نے سوچا نہیں یہ ناممکن ہے وہ ہمیں نہیں ماریں گے" یہی چپکے سے میں نے اپنے ساتھی سے بھی کہا لیکن اس کے جواب میں اس نے صرف تابوتوں کی طرف اشارہ کر دیا۔ جو مچان کے قریب ایک تھا۔ میں ڈھکے ہوئے رکھے تھے۔ میری تمام امید ختم ہو گئی، اور موت کے آنیوالے ہولناک لمحہ کا انتظار کرنے لگا لیکن میں نے ذرا بھی پریشانی کا اظہار نہ ہونے دیا اور اپنے ساتھی سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا اس نے مجھے بعد میں بتایا کہ میرا چہرہ ابھی کچھ زیادہ پیلا نہ تھا۔

تھوڑی دیر بعد پادری اوپر آیا۔ اور ہم سے پوچھا کہ کوئی مجرم اپنے گناہوں کا اعتراف کرنا چاہتا ہے۔ ہم میں سے صرف ایک نے اس دعوت کو قبول کیا لیکن جب اس نے صلیب پیش کی تو سب نے اسکو بوسہ دیا

پیتروو سکی اور دو اور جو ہم میں سے زیادہ خطرناک سمجھے جاتے تھے بلیوں سے پہلے ہی سے بندھے ہوئے تھے اور ان کے چہروں پر ایک

قسم کا تھیلہ چڑھا ہوا تھا۔ سپاہی بندوق چھپائے منتظر کھڑے تھے۔ فائر کے لئے!

میں نے سوچا کہ میری زندگی کے اب صرف پانچ منٹ اور باقی ہیں۔ یہ کیشن پانچ منٹ!

میں گرجا کی سنہلی برجی کو تاک رہا تھا جو سورج کی کرنوں میں چمک رہی تھی میرے ذہن میں ایکدم یہ خیال پیدا ہوا یہ کرنیں بھی وہیں سے آرہی ہیں جہاں میں خود پانچ منٹ میں پہنچ جاؤں گا۔

مجھے میں ایکدم بجھ سی ہوئی، لیکن میں دیکھ نہیں سکتا تھا کہ کیا وجہ ہے میری آنکھیں بہت کمزور تھیں۔ میں نے خیال کیا کہ کوئی غیر معمولی بات ضرور ہے۔ آخر میں نے ایک افسر کو دیکھا جو سفید رومال ہلاتا گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا آرہا تھا۔ اسے بادشاہ نے ہماری جاں بخشی کے لئے بھیجا تھا بعد میں معلوم ہوا کہ سزائے موت کا حکم، ہمیں صرف دھمکانے کیلئے دیا گیا تھا۔ تاکہ عمر بھر کے لئے سبق ہوجائے لیکن یہ سبق ہم میں سے بعض کے لئے بہت مہلک ثابت ہوا۔ گر نگر یعف کو جب پل سے کھولا گیا، تو اسکا دماغ صحیح نہ تھا۔ اس کے علاوہ ہم سے ہر ایک پر اس کا کچھ نہ کچھ اثر آخر عمر تک باقی رہا مچان پر چڑھانے سے پیشتر ہمارے تمام کپڑے اتروا لیے گئے تھے۔ اور ہمیں بیس منٹ سے زیادہ دیر تک ۲۲ درجے کی سردی میں صرف ایک ہلکی قمیص میں کھڑا رکھا گیا۔ جب ہم جیل خانے واپس آئے تو ہم میں سے کئی کے کان اور انگلیاں سوجی ہوئی تھیں، ایک کے پھیپھڑے پر ورم چڑھ آیا تھا، جو دق پر جاکر ختم ہوا لیکن میں ہے مجھے یاد نہیں، کہ مجھے سردی کا ذرا سا بھی احساس ہوا ہو۔

ہماری سزائے موت سائبیریا میں آٹھ سال کی قید اور ایک عرصہ دراز کی جلاوطنی میں تبدیل ہوگئی۔

۱۸۴۹-۵۰ء۔ چار سال سائبیریا کے جیل خانے میں بیتے مجرموں کی رفاقت میں! مزید چار بحیثیت سپاہی کے۔

۱۸۶۶ء۔ جرم اور سزا

کی اشاعت میں گزرے اور اسکی کامیابی میں:—

۱۸۶۶-۸۱ء۔ اب باوجود ایک کامیاب اور مشہور ناولسٹ ہونے کے اسکی مالی حالت بہت خراب رہی۔ اس زمانہ میں وہ بھوک اور قرضداروں کا ہمیشہ شکار رہا۔ کئی مرتبہ قرضداروں سے پیچھا چھڑانے کی خاطر روس کو الوداع کہنا پڑا۔ اور ایک دفعہ صرف دو سکوں کے لئے اپنے کوٹ اور قمیص کو رہن رکھنے پر مجبور رہا۔

۱۸۸۱ء میں اس نے انتقال پایا اور اس کے چالیس ہزار ہم وطنوں نے اس کو اس کی آخری آرام گاہ تک بڑی عزت کے ساتھ پہنچایا۔

دوستوئسکی مرگیا لیکن اس کے بولے ہوئے بول اور لکھے ہوئے الفاظ کی بازگشت اب بھی سنائی دیتی ہے۔

(مختار)

جناب احمد ندیم قاسمی

سرزمین تصوّر

مرے ندیم کہاں آگیا ہے میرا خیال ؟ — بلند و پست پہ چھایا ہوا ہے کس کا جمال ؟
یہ کس کے نور سے پُرنور ہے دماغ مرا ؟

مرے ندیم یہ سینے میں اضطراب ہے کیوں ؟ — یہ ذرّے ذرّے میں پوشیدہ آفتاب ہے کیوں ؟
یہ کس کے عکس سے پھر جل اٹھا چراغ مرا ؟

مرے ندیم افق پر ہیں بادلوں کے نشاں — کہ کہکشاں پہ تخیّل کے کارواں ہیں رواں
جلو میں جن کے فرشتے ہیں گیت گاتے ہوئے !

یہ عرش ہے کہ مری رفعتوں کا پا انداز ؟ — یہ چاند ہے کہ صبوحی کا اک شکستہ ساز ؟
یہ تارے ہیں کہ مرے شعر جگمگاتے ہوئے

مجھے یہ کون افق سے صدائیں دیتا ہے ؟ — ہوا کے بھیس میں میری بلائیں لیتا ہے ؟
یہ کس نے تھام لیا ہے مرے گریباں کو

یہ کون پھاند پڑا چاند کے سفینے سے — یہ کس نے بھینچ لیا مجھ کو اپنے سینے سے
یہ کس نے پونچھ دیا میری چشمِ گریاں کو !

ابھی تو سر تھا مرا نقش پائے جاناں پر، — عتاب کھیلتا پھرتا تھا روئے تاباں پر
حریم ناز میں مجھ کو ابھی تو بار نہ تھا !

مرے ندیم اچانک یہ انقلاب ہوا، — وہ ذرّہ خاک کا ہمدوشِ آفتاب ہوا
جسے خود اپنی حقیقت پہ اعتبار نہ تھا

یہ سرزمینِ تصوّر ہے اے دلِ غمگیں !
جھکی ہوئی ہے یہیں عقل و آگہی کی جبیں

جناب سید راحت مولائی
بی اے (علیگ)

خود نمائی

مجھے اسکی ابتدا اچھی طرح یاد ہے۔ یہ واقعہ سنیچر کی شام کا ہے میں حسب دستور سہ پہر کو دفتر سے لوٹا اور قیام گاہ پر پہنچکر معمولا تنہا ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد اسوقت جبکہ میں اپنے دفتری چست کپڑے بدل کر چہل قدمی کے لئے ڈھیلا ڈھالا لباس پہن رہا تھا، بغیر کسی خاص سبب کے۔ . . ایک دم رک گیا، اور آئینہ میں اپنے عکس پر میری نظریں جم گئیں، اور میں سوچنے لگا: میرے بال کتنے سفید ہو گئے ہیں — میرا چہرہ کس قدر بدل گیا ہے —— میں بوڑھا ہو رہا ہوں شاید اور اس میں کسی شک وشبہ کی بھی گنجائش نہیں۔ کیونکہ میری عمر اس وقت ۵۰ کے لگ بھگ تھی۔ لیکن آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میری زندگی قطعاً ایسی نہیں جس کا کچھ بھی کسی سے بھی تذکرہ کیا جاسکے . . . . . زندگی و —— ویران خستہ آشفتہ و ماندہ زندگی بالکل اس کے خلاف جیسی کہ میں نے کبھی اپنے عالم شباب میں سوچی تھی تصور کی تھی

یہ شاید خلاف فطرت نہیں، کہ اس قسم کا خیال میرے دماغ میں اس وقت آیا۔ کیونکہ یہ سنیچر کی شام کا واقعہ ہے اور سنیچر کی شام ہمیشہ میری اس عجیب غریب زندگی سے واصل و وابستہ رہتی ہے۔

تمام ہفتہ دفتر کے کاموں میں گزرجاتا، اور ایک لمحہ بھی اتنا نہ ملتا کہ دماغ کو کچھ آرام پہنچا سکوں۔ اور یوں دفتری زندگی میں سب ہی کیسا لیکن سنیچر کی شام اپنے اندر عزیز ایسی ساعتیں رکھتی ہے جب ایک دفتری تک تھوڑی دیر کے لئے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہ اپنی مرضی کا مالک ہوتا ہے جہاں چاہے جائے، جہاں لطف پا سکے پائے۔ چنانچہ میں بھی اس شام کو ٹہلنے نکل جایا کرتا مگر مجھے احساس ہوتا کہ میرے ارد گرد کی تمام دنیا ایک راز مجسم بنی ہوئی ہے — ایسا راز مجسم کہ جس کی کنہ قطعاً بعید الفہم ہے۔ پھر فوراً سوچتا کہ اگر یہ دور اور گھومتا پھرتا نکل جاؤں تو ممکن ہے میں راز و حیرت کے ان حدود میں داخل ہو جاؤں جنکا وجود اسقدر یقینی ہے۔ اور اس خیال سے میں بسا اوقات رات کے گیارہ گیارہ بجے بلکہ اس سے بھی بعد تک گھومتا رہتا یہاں تک کہ میں اسقدر تھک جاتا اتنا درماندہ ہوتا کہ اپنے ان اسرار باطل پر بستر کو ترجیح دینے لگتا اور خوش قسمتی سے اسوقت دل و دماغ ان سے خود بخود خالی بھی ہو جاتے۔

میں ہمیشہ ٹہلنے جایا کرتا، اور وہ اس لئے کہ میں کچھ طبعاً رازوں کا متلاشی بھیدوں کا جویا واقع ہوا تھا۔ میری فطرت ہی کچھ پراسرار حیرت سے تعمیر پائی تھی بدقسمتی سے میرے دوستوں میں سے کسی ایک میں بھی نہ تو کوئی راز یا بھید کی بات تھی، نہ ان میں اس کے سمجھنے کی صلاحیت وہ بالکل صاف دل اور صاف گو تھے۔

مجھ میں مافی الضمیر کو فوراً کہدینے کا مادہ بہت کم ہے۔ شاید بالکل نہیں ہے۔ میں نے شروعات تو یہ کی کہ میں خود کو آئینے میں دیکھنے کھڑا ہو گیا۔ لیکن بجائے اس سے آگے چلنے کے اپنی زندگی کے اولین عہد کا ذکر چھیڑ بیٹھا۔ کیوں؟ آپ پر یہ بوجھ کیوں ڈالنے لگا؟ مجھے یہ حق کب ہے؟ خیر معاف کیجئے، ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ مجھے اس کی ابتدا صحیح طور پر یاد ہے۔ اس حادثہ کی ابتدا جس کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں اور دراصل اسکی ابتدا وہیں سے ہوتی ہے جہاں میرے دماغ میں جنید کا خیال آیا۔ جنید ہی وہ استثنا تھا جس کا ابھی میں نے تذکرہ کیا ہے مجھے کیا شاید ساتھیوں میں کسی کو بھی اس میں شبہ نہ تھا کہ جنید کے اندر ایک راز تھا ایک تکذیب تھی ایک خاص کیفیت تھی جو دیکھنے والوں کو یہ محسوس کرنے پر مجبور کر دیتی تھی کہ اسکی زندگی کا ہر لمحہ حیرت انگیز واردات یا قیامت زا واقعات سے وابستہ ہے . . . . . لیکن یہی زندگی کی فضا وں میں سانس لیتا ہے جو

میں گزارنا چاہتا تھا۔ اور جس کے متعلق میں محسوس کرتا تھا کہ میں مخل نہ ہونگا وہ اور میں ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ وہ شرارتیں ایجاد کرنے میں بلا کا تیز انسان تھا۔ اس کے دماغ کی نبض شاید کسی وقت بھی سست نہیں ہوتی تھی۔ اسے برقیات سے ہمیشہ شغف رہا۔ وہ برقی شعبدے بھی وہ وہ ایجاد کرتا۔ کہ انکو دیکھ کر ہم لوگ ششدر رہ جاتے اور کبھی غور کرنے سے بھی وہ ہمارے گمان میں نہ آتے۔ جب کبھی کسی کو اسکی نہیں چھپائی ہوئی برقی لہر سے جھٹکا لگتا۔ تو وہ ہنستے ہنستے لوٹ جاتا ایک مرتبہ نہ جانے کس طرح اس نے برقی تاروں کو ایک کتاب کے نیچے جوڑ دیا۔ جو استاد کی میز پر رکھی ہوئی تھی۔ اور جب پڑھاتے پڑھاتے ماسٹر صاحب کتاب کو اٹھانے لگے، وہ بھی خود کو اس برقی جھٹکے اور جنید کے بے محابا قہقہے سے محفوظ نہ رکھ سکے۔ تمام لڑکوں کے سامنے استاد سے گستاخی؟ جنید وقتی طور پر اسکول سے نکال دیا گیا۔ لیکن میں آج تک اس گستاخی کی اہمیت نہیں سمجھ سکا ہوں۔ یہ تھا اسکی سرجانیت کا بدلہ، اسکی جدت طرازانہ فطرت کا، نہ معلوم اس کی شوخ طبیعت کا انجام۔

جنید مجھ سے عمر میں کچھ بڑا تھا۔ اور میرے دل میں ایسے ممتاز فرد یا ایسے گستاخ شاگرد جو بعد کو ثابت کیا گیا، کے متعلق کچھ بھی جاننے کی کوئی تمنا پیدا ہی نہیں ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن جب وہ دوبارہ اسی سکول میں لے لیا گیا۔ تو کسی باعث میں اور وہ دوست ہو گئے۔ یا تو مجھے وہ پسند آیا۔ یا میں اسکو پسند آیا۔ بہرحال کچھ عرصہ تک ہم دونوں ایک دوسرے کو جاننے کی کوشش کرتے رہے۔ کچھ جان بھی گئے۔ لیکن پوری طرح جاننے سے قبل بالکل اتفاقیہ اور اس سے زیادہ بدقسمت طور پر ہماری دوستی ختم ہو گئی۔ اور آہستہ آہستہ ملاقاتیں بھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ میں پھر فضول باتوں میں جا پڑا۔ کیونکہ میں جنید کے متعلق تو یہ سب کچھ جانتا تھا اس سے قبل بھی اور اسوقت بھی جب میں خود کو آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ پھر معاف کر دیجئے اب میں واقعہ وہ واقعہ شروع کرتا ہوں۔ لیکن آپ مجھے معاف کیوں کریں؟ اسلئے کہ میرے لئے جو کچھ بھی ہوں لیکن آپ کے لئے ان بھونڈے سے معترضہ جملوں سے اس خیال تک پہنچنے میں آسانی ہوگی جو اسوقت میرے دماغ میں آیا جب کہ میں نے جنید کو رد کیا۔ اس آسانی میں بھی آپ کے دوش بدوش ہوں۔ اچھا تو سنئے میں زندگی میں کسی نئی چیز اور کسی جدید تبدیلی کی آرزو رکھتا تھا۔ میری دلی خواہش تھی کہ ہمیشہ ایک ہی گنبد کے اردگرد گھومے جانے، ایک ہی لکیر کو پیٹتے رہنے اور صرف کولہو کا بیل بننے کی بجائے میں اپنے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تجربے کے [illegible] میں جھونک دوں۔ اور میرے پاس اس کا صرف ایک ذریعہ تھا جس میں امید کی کچھ جھلک نظر آتی تھی۔ پھر میں نے اسقدر سختی سے، اتنی بد خلقی سے اس کی طرف سے منہ کیوں پھیر لیا؟ اور بالکل دوسری جگہ ایک قطعی ناکام جستجو کیوں شروع کی؟ میری غلطی ——— فاش غلطی! میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ میں سینچر کی شام کو تنہا جایا کرتا تھا میں نے ہر مرتبہ ایک ہی ناامیدی کے بعد اس آوارہ گردی کی بجائے جنید کی ہم جلیسی حاصل کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ اس کو کیوں نہیں تلاش کیا؟ اور کیوں اس کے وجود کو پہچانتے ہوئے بھی میں نے ان چند یا بہت سے بلاخیز نظاروں کو جاننے کی سعی نہیں کی؟ جو کہ یقیناً اس کی زندگی کے ڈرامہ کا ایک اہم اور خاص جزو ہونگے۔ یا شاید پس منظر ہی ہوں؟ اس سے انکار نہیں کہ اسوقت جنید زندگی کی تگ و دو میں مجھ سے بہت آگے تھا۔ وہ باوقار بھی تھا اور دولتمند بھی نمایاں طور سے انجنیری کی ڈگری لینے کے بعد وہ ایک مشہور برقی ادارہ کے منتخب اور چیدہ اشخاص میں آگیا تھا۔ وہ اسکی روح رواں بنا ہوا تھا باوجود اس وقار و دولت کے وہ کبھی بھی رسمی انسان نہ تھا۔ وہ ایسا بلند فطرت وجود تھا جس کے لئے حیات معمول کے تمام لوازمات، قطع نظر اپنی عملی قدر و قیمت کے، صرف بیکار ہی نہیں تھے بلکہ کوئی معنی ہی نہیں رکھتے تھے۔ اور اس احساس میں علاوہ اسکی فطرت کے اس کے انہماک اور اسکی مصروفیتوں کو بھی دخل تھا۔ اس کے لئے صرف معاش پیدا کرنا ضروری تھا۔ اور اس میں اس نے جامعہ کے اپنے تمام ہم سبقوں کو شکست دے دی تھی۔ اور ایسی جگہ آناً فاناً پہنچ چکا تھا۔ جو چند ہی اور مخصوص منتخب لوگوں کے لئے مقدر تھی۔ لیکن درحقیقت اسکا دماغ کہیں اور تھا۔ وہ کسی اور ہی دنیا میں اڑتا پھر رہا تھا وہ نادر تصورات و

ایجادات کا والہ و شیدا بن ہوا تھا۔ شاعری، انسانیات، حیاتیات، منطق اور علم الکلام اس کا خاص موضوع بن گئے تھے اور اسکی یہی تحصیلی خصوصیت کوئی اور عصبی مہارت نہیں تھی جسکو دیکھ کر ایک شخص خواہ مخواہ اس نتیجہ پر پہنچتا تھا کہ اسکی زندگی ضرور عام اور شاید پست سطح سے الگ ہونی چاہیئے —— ماورائے انسانی، مافوق البشری زندگی ——

اس لحاظ سے جنید ہماری معاشری مقابلی حیثیت اور سماجی منصب و وقار پر ذرا بھی دھیان دینے والا انسان نہ تھا۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ ہماری دوستی کے اختتام میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا پھر کوئی ایسی چیز تھی جس نے ارادتاً مجھے ایک ایسے عزیز اور بے بہا ذریعہ سے جدا کر دیا تھا جسکی بدولت اور جس کی معیت میں مجھے سب کچھ مل جانے کی امید تھی اور ہو سکتی تھی

آئینہ کے سامنے کھڑے ہوئے جس وقت میں نے خود سے یہ سوال کیا۔ تو مجھے فوراً یہ خیال ہوا کہ جیسا کہ میں اسوقت سوچ رہا ہوں اسی طرح میں اسوقت اسکو کبھی بھی اپنی تمناؤں کے حصول کا ذریعہ نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے تو اسکو ایک ایسا وجود تصور کیا تھا جس کے قبضے میں وہ سب کچھ تھا جسکے تصرف میں وہ سب کچھ ہے جو میرے پاس نہ تھا اور جس کی آرزو اور طمع میں مرا جا رہا تھا پھر کیسے اسکی پناہ میں آنے کی بجائے اسکو اپنا دشمن نہ سمجھتا؟ یہ خیال بڑا ناخوشگوار تھا۔ اور میرے لیے کیا شاید ہر ایک کو یہ خیال اپنے متعلق ناپسند ہوگا لیکن ہر لمحہ گزرنے کے ساتھ مجھے یہ یقین ہوتا جا رہا تھا کہ میرے اس سوال کا جواب میری اسی حالت کے کہیں آس پاس ہے۔ "آس پاس" اس لئے کہہ رہا ہوں کہ انسانی کمزوری یا انسانی بزدلی کلیۃً اس کو جواب قرار دینے سے روک رہی ہے۔ بہرحال مجھے اس پر رشک آتا تھا نہیں اپنی حالت کا یہ اظہار بھی نرم لہجے میں ہے اور حقیقت سے بھی بعید اس لئے مجھے واقعی اس پر حسد ہوتا تھا۔

کیا میں نے ایک غلط فہمی میں جنید سے جدا ہو کر مختلف راستہ اختیار کر لیا تھا؟ کیا یہ صحیح تھا کہ زندگی جتنی زیادہ تند و تیز جنید یا کسی اور کے لئے تھی، اتنی میرے لیے نہیں تھی؟ ——— شاید آپ نے

ان خیالات کے انجام پر کچھ سوچا ہو۔ آج میں نے دوبارہ کرنے کا فیصلہ کیا جو برسوں پہلے کرنے میں ناکام رہا تھا۔ "میں ابھی جاؤں گا اور جنید سے ملونگا" — وقت بھی مناسب و موزوں تھا۔ لاریب چند برس کے بعد یہ عمل بہ تاخیری ہو چکا تھا مگر پھر بھی سنیچر کی شام کو یہ ارادہ قائم ہوا تھا۔

باوجود اس کے جب میں اس کے عالیشان مکان کے قریب پہنچکر اس کے ارد گرد گھوم رہا تھا، میں نے محسوس کیا کہ بہت سے شکوک میرے دل میں پیدا ہو رہے ہیں اور مجھے اکسا رہے ہیں۔ جیسے جیسے مجھے اسکا اصل دروازہ تلاش کرنے میں کچھ مشکلات کا سامنا ہوتا ویسے یہ شکوک برابر بڑھتے جاتے۔ میں نے بہت سے لوگوں سے دریافت کیا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی اسکی وجہ نہیں جانتا تھا کہ کیوں اتنی بڑی عمارت کو کسی متناسب دروازہ سے محروم رکھا گیا ہے؟ میں اپنی اس تلاش کو چھوڑنے والا ہی تھا کہ میری نگاہیں ایک مختصر سے دروازے کیطرف کھنچ گئیں جس پر باریک باریک حروف میں کندہ تھا "جنید منزل"۔ کچھ جھجکتے ہوئے، کچھ سہمے ہوئے میں نے دروازہ کھٹکھٹایا ایک بار، دو بار کئی بار مگر کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے دروازہ کو ہلکا سا دھکا دیا۔ وہ چوپٹ کھل گیا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ ایک پٹے ہوئے راستہ سے ہو کر میں صحن میں پہنچا۔ اس صحن کی دوسری طرف زینہ تھا، جو شاید سامنے والی بالائی منزل کیطرف جاتا تھا۔ بالائی منزل کے تین سبز دروازے تھے۔ جو ایک چھجے پر کھلتے تھے۔ میں اب بھی جھجک رہا تھا، سہم رہا تھا، ڈر رہا تھا، اتنا بڑا گھر اور بالکل تنہا قطعی ویران۔ آخر جنید کس حصہ میں رہتا ہوگا؟ زیریں کمروں میں تو کسی انسانی بود و باش کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ میں نے پھر جرأت کی۔ اور زینہ پر چڑھنے لگا شروع کے دونوں دروازے اس طرح بند تھے جیسے ان کو کبھی کھولا ہی نہیں جاتا۔ میں نے خیال کیا شاید صرف تیسرا دروازہ ہی کھولنے اور بند کرنے کے کام میں لایا جاتا ہو۔ اور وہی کمرہ کا اصل راستہ ہو۔ میں نے اسکو کھٹکھٹایا۔

بہتر ہوگا اگر یہ ظاہر کر دوں، کہ میرا حادثۂ زندگی اسی جگہ وقوع پذیر ہوا۔ زندگی میں پہلا موقعہ تھا، کہ میں نے اس جگہ خود بخود اپنے اندر

ایک عجیب سی چیز، بالکل عجیب اور ناقابل بیان چیز محسوس کی۔ میں ملاقاتوں کے سلسلے میں انتہائی حساس اور کچھ عصبی بھی واقع ہوا ہوں اور بالخصوص اسوقت جب میں کسی کے دروازہ کے آگے کھڑے ہوکر اسکا انتظار کروں، ایسی حالت میں میرا تمام اعصابی نظام منتشر ہو جاتا ہے۔ مجھے ہزار ہا خوف و خطرات اپنا شکار بنا لیتے ہیں اگر یہاں سے کوئی شخص نکلا اور اس نے مجھے زجر و توبیخ کی؟ کیا میں صحیح مکان پر آیا ہوں؟؟ کیا وہاں جنید منزل ہی لکھا تھا؟ کیا میں ٹھیک وقت اور ٹھیک دن آیا ہوں؟؟ میں اپنے تصور میں دروازہ کیطرف آتے ہوئے کسی کے قدموں کی چاپ سن رہا تھا یقیناً...... جنید کے ہونے چاہئیں جسکی عمر اب پچاس کے قریب ہوگی، جس کی عمر جب میں نے آخری مرتبہ دیکھا تھا، تو ۳۰ سال بھی نہ تھی، اتنے سالوں کا یہ عرصہ اس کے اوپر کس طرح اثر انداز ہوا ہوگا، کیسا گذرا ہوگا؟"

لیکن آواز دراصل کسی کی بھی نہیں تھی، وہ تو ایک وہم تھا، میرے وہم میں مایوس ہوکر آخری مرتبہ دروازہ کھٹکھٹانے ہی کو تھا، کہ یک لخت اور بغیر کسی آواز کے دروازہ کھلا اور میرے سامنے ایک —— میرا خیال ہے، کہ مرد کے لئے سب سے بڑا معمہ، اسکی تخیلی و تصوری کارکردگیوں کا سرچشمہ عورت ہے اور ہمیشہ سے ہے۔

—— اسوقت جنید کہاں چلا گیا تھا، میں کھڑا تھا، اور ایک حیرت و استعجاب کے عالم میں خالق کی اس نازک و پاک صنعت کو دیکھ رہا تھا۔ بظاہر بے خبر، مگر میرے اندر میرے ضمیر کی گہرائیوں میں ایک جذبہ بیدار ہو چکا تھا، ایک عجیب ہلکی ہلکی سی لا معلوم لہر پیدا ہو چکی تھی، وہاں میرے سامنے بالکل مقابل، ایک گز سے بھی کم فاصلہ پر وہ سب کچھ موجود تھا جس کی میں اپنے جذبات کی تمام شدت اور روح کی تمام پاکیزگی کے ساتھ آرزو کر رہا تھا۔ اگر یہ نہیں تو کم از کم وہ چیز تو تھی ہی جسکو اگر میں پہلے پا چکا ہوتا، تو اپنی کوششوں کو اپنی امیدوں کو، تاریکی و مایوسی کے بھیانک سنسان ویرانے میں اس طرح کبھی بھی واماندہ نہ کرتا۔ کبھی کبھی اس قدر نہ بھٹکتا پھرتا، جنید میری آج سے ۲۰ سال قبل کی آرزوؤں، تمناؤں کے ظلمت راز پر بے پناہ نور ڈالتے اور اسکو خود جگمگا دینے میں کامیاب ہو چکا تھا، وہ خود معموں، اور رازوں سے بنا ہوا انسان تھا

اگرچہ میں نے اس سے کبھی اسکی عمر دریافت نہیں کی مگر وہ اس وقت کسی طرح پچیس سال سے کم نہیں معلوم ہوتی تھی جوانی، شرم سنجیدگی مجھے دیکھ کر کچھ لجانا، کچھ سمٹنا، اس کے اندر بہت سی چیزوں کا بیک وقت اجتماع تھا، وہ کوئی حسین لڑکی، خوبصورت دوشیزہ نظر نہیں آتی تھی، بلکہ ایک سنجیدہ پختہ عورت، قبل اس کے کہ میں اپنے ہوش و حواس یکجا کر دوں، وہ مسکراتی ہوئی بولی:-

شاید آپ جنید صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔ میرا خیال ہے وہ باہر گئے ہوئے ہیں، آئیے، تشریف لائیے"

اس طرز و عبارات میں ایک طرح کی سکون آمیز محبت ملی ہوئی تھی، اور میں کسی حالت میں بھی اس قابل نہیں تھا، کہ اس محبت نواز دعوت کی مزاحمت کر سکوں، اس لئے کمرہ کے اندر داخل ہو گیا، جیسے ہی میں اسکے قریب سے گزرا، اس نے اپنا ہاتھ آہستہ سے میرے بازو پر رکھ دیا۔

وہ مجھے ایک وسیع، سادہ اور دلکش کمرے میں لے گئی، اور بغیر کسی رسم و تکلف کے ایک کرسی کیطرف اشارہ کرتے ہوئے، چائے بنانے میں مصروف ہو گئی، کبھی کبھی وہ میری طرف دیکھتی، اور مسکرا دیتی —— مسکرا دیتی اس طرح کہ گویا جس حالت میں میں خود کو اجنبی محسوس کرتا ہوں، وہ اس کو اچھی طرح جانتی ہے۔ میری تمام زندگی تجرد میں گذری تھی، مجھے آجتک کبھی ان احساسات و ہیجانات کا خیال بھی نہیں ہوا تھا جو اسوقت میرے اندر شاید ایک تلاطم سا یا ایسی ہی کوئی چیز برپا کئے ہوئے تھے۔ میرا خیال ہے جب میں جوان تھا، اسوقت شاید ان جذبات کا خوابوں میں لطف اٹھایا کرتا تھا لیکن وہ خواب بھی اسوقت بالکل ویران سی محسوس ہو رہی تھیں کیونکہ انکی بھیانک خلوتوں کو آباد کرنے کی صلاحیت کسی نسوانی وجود میں نہ تھی، نہ کبھی کسی جوان عورت نے میرے ان حسین خوابوں کو مرہون تعبیر ہی کیا تھا ان حسین تیتریوں میں جنہوں نے کبھی کبھی اڑتے اڑتے میری خوابوں کی دنیا کو آہستہ سے چھو دیا ہو۔ کچھ دلچسپ رنگ

تھیں لیکن میرا خیال ہے کہ ان میں جذباتی تاثرات سے زیادہ خودکشی پوشیدہ تھی، خودنمائی چھپی ہوئی تھی۔ دوسروں کے اندر مہر و وفا کا مادہ بے شک تھا مگر وہ کسی دلکشی سے محروم تھیں ——— لیکن ———!!

——— لیکن یہاں مجھے ... کا ایک شبہ نظر آ رہا تھا۔ گویا میں سال کی طویل بے خبری کے بعد یکدم مجھے سب سے خوابوں کی تعبیر مل رہی تھی۔ میں جنید کو قطعاً بھول چکا تھا اور یہ وہ خود تھی جس کی بار یک آواز نے جنید کو دوبارہ یاد دلا دیا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ جنید صاحب کی عدم موجودگی سے کچھ اداس ہو گئے ہیں۔ اس نے کہا "کیا آپ کو کسی خاص کام کے سلسلے میں ان سے ملاقات کرنی تھی؟"

اس سوال پر میں نے اپنے دل اپنی روح میں کشادگی سی محسوس کی، گویا کسی مدت دراز کی بند کی ہوئی چیز کا منہ کھول دیا جائے اور وہ ... پڑنا چاہتی ہو۔ میں چاہتا تھا کہ میں اسے سب کچھ بتا دوں۔

"ہاں بھی اور نہیں بھی" میں نے ذرا مبہم لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا اور وہ اس امید میں کہ وہ مجھ سے ضرور اس کی تفصیل پوچھے گی ... کرسی پر بیٹھ کر میری طرف حسین و صداقت مآب نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی:۔

"تو مجھ سے فرمائیے یا شاید آپ مجھے بتانا نہ چاہتے ہوں!"

"ہاں آپ کے لئے وہ دلچسپی کا باعث ضرور ہو سکتی ہے" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ میری اعصابی کمزوری دور ہو چکی تھی۔

"تو مجھ پر اعتماد کیجئے" وہ میری مسکراہٹ کا اپنی آنکھوں کی بے پناہ چمک سے جواب دیتی ہوئی بولی۔ اسکے انداز سے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ اسکے سننے کے لئے کچھ بے چین اور کچھ متجسس سی ہے۔

اور میں نے اپنی داستان کہنی شروع کر دی۔ کبھی انتہائی محویت میں اسکی آنکھیں میرے اوپر جمی ہوتیں اور کبھی اس کا سر ایک طرف کو جھک کر یہ ظاہر کرتا کہ اس کا ذہن تمام خیالات سے خالی ہو گیا ہے۔ کبھی کبھی اسکی نگاہیں زمین پر اس طرح جم جاتیں گویا اسکے تمام خیالات میری داستان میں فنا ہو چکے ہیں۔

میں داستان ختم کر چکا مگر اس دوران میں اس کے لب کسی خاص لفظ یا کسی خاص اظہار سے آشنا نہ ہوئے۔ وہ کسی گہرے خیال میں سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اسکے بعد وہ اٹھی اور میرے قریب آکر فرش پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنی کہنی میرے گھٹنے پر ٹیک دی اور میرے اوپر ایک ایسی نگاہ ڈالی جو الفاظ سے کہیں زیادہ واضح طور پر اس کے دلی خیالات کا اظہار کر رہی تھی۔ اسکی نگاہ کہہ رہی تھی کہ "واقعی میں سب کچھ سمجھتی ہوں اور مجھے کیوں نہ سمجھنا چاہئیے ——— مجھے جو خوابوں کی تعبیر ہے" ——— اور میں نے پھر اسکے اندر وہ یقین اور وہ اعتماد محسوس کیا جس سے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ جانتی ہے کہ کیا کرنا چاہئیے اور کیا وقوع پذیر ہوگا۔ اور یہ کہ مجھے کسی کوشش، کسی کاوش کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ تمام معاملات کو اس پر چھوڑ دینا چاہئیے۔

میں نے کہا "بہت کچھ اپنے متعلق کہنے کے بعد کیا آپ کے متعلق کچھ دریافت کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں؟"

اس نے سر کو تھوڑا سا جھکاتے ہوئے پوچھا "آپ میرے متعلق کچھ جاننا چاہتے ہیں؟"

"ہاں ہاں! یہی کہ آپ کا جنید سے کیا تعلق ہے؟"

یہ سوال کرنے کے بعد پہلی مرتبہ انتہائی شدت کے ساتھ مجھے محسوس ہوا کہ میری یہ جرأت کس قدر بے ڈھنگی اور بے موقعہ تھی۔ اس نے گفتگو شروع کرتے وقت اپنے متعلق کچھ نہ کہہ کر میرے ساتھ ایک عجیب پُراسرار برتاؤ کیا تھا۔ لیکن خود اس کا اثر میرے اوپر اس قدر مرتسم ہو گیا تھا کہ اسوقت تک مجھے اسکے متعلق کوئی سوال کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ اس نے اپنا سر اٹھایا۔ اور اپنی ان ہی پُرسکون و صاف گو نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی:۔

"آپ کیا سمجھتے ہیں کہ کیا ہو سکتا ہے؟"

چند لمحوں تک اسکی نظریں میرے اوپر جمی رہیں پھر آہستہ آہستہ اس کا سر ایک مرتبہ اور جھک گیا۔ اس نے کلائی ابھی تک میرے گھٹنے پر رکھی ہوئی تھی، اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی ہیجان انگیز چیز میرے تمام جسم میں برقی لہروں کی طرح دوڑ رہی ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس پر بھی دو حالتیں طاری ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اپنی حساس

مگر صادق نگاہیں میرے چہرہ پر اس طرح جما دیں، کہ گویا اس کے لئے کوئی ایسا راز نہیں ہے، جو ہر شخص اچھی طرح نہ سمجھ سکے اور دوسری دہ زمین پر گڑی ہوئی متفکر نظریں، جن سے یہ اظہار ہو رہا تھا، کہ وہ اس پر غور کر رہی ہے، کہ میں نے اس سے کیا کیا کہا۔ اور وہ اس کے جواب میں کیا کیا کہنا چاہتی ہے اور میں اس کے اس انداز میں جو انتہائی لطیف تھا، ایک نوع کی سچائی، ایک قسم کی صداقت اور ایک طرح کی راستی پا رہا تھا۔

"تو کیا،" میں نے دریافت کیا، "آپ جنید کی رفیقۂ حیات ہیں؟"

"کیا آپ جنید صاحب سے رفیقۂ حیات کی توقع رکھتے ہیں؟"

"مجھے کیا علم، میں نے ابھی عرض کیا ہے، کہ میں نے جنید کو ۱۰ برس سے نہیں دیکھا ہے۔"

"نہیں میں انکی رفیقۂ حیات نہیں ہوں" وہ آخر کار بولی

"شاید آپ ان کے ساتھ رہتی ہیں" میں نے کہا "مہربانی کرکے آپ یہ نہ سمجھیں کہ . . . ."

"جیسے میں سمجھ ہی لونگی" اس نے اپنا ہاتھ میرے گھٹنے پر سے ہٹا کر میرے منہ پر رکھتے ہوئے کہا

"ہاں میں انکے ساتھ رہتی ہوں" وہ بولی "لیکن مجھ کو وہ کچھ پسند نہیں"

یہ اندازہ کرکے کہ میرے جذبات مجھے کن کن پستیوں اور کن کن گہرائیوں یا پھر کن کن پستیوں تک لے گئے ہیں میں حیرت زدہ ہوکر رہ گیا۔

"پھر آپ اس کے ساتھ کیوں رہتی ہیں؟" میں نے استفسار کیا

"میں ان سے جدا نہیں ہو سکتی" اس نے جواب دیا اور اس کے لہجے میں ایک اداسی تھی "میں ہر چیز کے لئے انکی ممنون ہوں، میں جب انکو ملی ہوں، اس سے قبل کچھ بھی نہ تھی، وہ ہمیشہ ہی کہتے ہیں کہ انہوں نے مجھکو سدھارا ہے، اور اب میں انکو سدھارونگی"

"تم اسکو سدھارو گی؟" میں نے دھرایا "وہ کس طرح؟"

اس نے میرے سوال کا کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ عمداً احتراز کر رہی تھی، وہ ایک پُراسرار طریقہ سے مسکراتی ہوئی بولی:-

"میں جب انکو ملی ہوں اس سے قبل کچھ بھی نہ تھی"

"مجھے یقین ہے کہ تمہیں" میں نے ذرا زور دیتے ہوئے کہا۔ کیونکہ میرے اندر ایک انتہائی تلخ عداوتی جذبہ ارادہ کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ ایسا جذبہ و ارادہ، جس سے میں آجتک قطعاً نابلد تھا۔ مگر جس کی ترغیب پر میں ہر ممکن طریقہ سے جنید کی قدر کو کم اور اسکے اعتبار کو ادنیٰ کرنے کے لئے آمادہ ہو چکا تھا۔

"نہیں" وہ اپنے سر کو نفی میں ہلاتے اور نظروں کو زمین پر جمائے ہوئے بولی، اور ایک ہی ثانیہ کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ رو رہی ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنی آنکھیں میری طرف اٹھائیں۔ اسکے پپوٹے نم آلود ہو رہے تھے، اس کی پلکوں پر آنسوؤں کے موتی جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ نہ معلوم کس جذبہ سے متاثر ہوکر میرے بازو کھل گئے۔ اور وہ ان میں بالکل اسی طرح کھنچ آئی، جیسے مقناطیس سے لوہا کھنچ آئے، میرا سر اس کے سر سے ملا ہوا تھا۔ . .

اس شام کو جب میں اس چھوٹے سے دروازے سے نکلا میں نے محسوس کیا کہ میرے اندر ضرور کوئی ایسی تبدیلی واقع ہوگئی ہے جس کے امکان کا وہم و گمان بھی مجھے اس دروازے میں داخل ہونے سے پہلے نہیں ہوا تھا مجھے محبت ہوگئی تھی —— دیوانہ وار محبت —— مجھے!!! جو اس ہی شام کو، کچھ دیر پہلے آئینے میں اپنا عکس دیکھکر اپنے شباب سے مایوس ہو چکا تھا اپنی جوانی کی یاد کو پس پشت ڈال چکا تھا۔

دوسری ملاقات میں میرے سامنے اور واقعات بھی منکشف ہوئے ایسے واقعات جنہوں نے مجھے ان تمام باتوں سے جو کہ میں نے اب تک سنی تھیں، یا وہ نتیجہ کیا یعنی اس کے اور جنید کے تعلقات کی اہمیت۔ میں شاید کبھی وہم میں بھی وہ باتیں نہیں لا سکتا تھا۔ وہ ہمیشہ یہی کہتی کہ وہ جنید کو نہیں چھوڑ سکتی کیونکہ اس کے اوپر جنید کے بڑے احسانات ہیں

"میں نہیں جانتی کہ بغیر انکے میرا کیا حال ہوگا" اس نے کہا "وہ

ہمیشہ کہا کرتے ہیں کہ میں ان کی حیات کا کارنامہ ہوں، انکی زندگی کا سہارا ہوں، انہوں نے مجھے کھو دیا، تو وہ اس صدمہ سے جانبر نہ ہو سکیں گے اور بالخصوص اسوقت"

"اسوقت کیوں؟" میں نے بے چینی سے پوچھا

وہ ایک لمحہ ٹھہری، اور پھر بولی:۔

"آپ نہیں کہہ سکتے، وہ مجھے تعلیم دے رہے ہیں اور اگر میں نے ان کو اسوقت چھوڑ دیا تو . . . . . "

"تمہیں تعلیم دے رہے ہیں کیا تعلیم دے رہے ہیں؟"

وہ کمرے کی دوسری طرف پہنچی اور ایک وسیع پردہ کو ہٹاتے ہوئے اس نے مجھے ایک بڑا خوبصورت ستار دکھایا، اور وہیں بیٹھ گئی اور ستار اٹھا کر بجانے لگی، چند ہی منٹ کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ ایک ماہر فن ستار زن ہے۔ مجھے موسیقی سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے لیکن ستار کے لئے میں اپنے دل و دماغ میں بڑی گنجائش پاتا ہوں، اور میں نے ملک کے مشہور ماہرین فن کے فن کو پرکھا ہے اسوقت مجھے اندازہ ہو رہا تھا، کہ وہ ان میں سے کسیطرح بھی کسی سے کم نہیں تھی۔ اسکی انگلیوں کی جنبش جیسے مچھلیاں سطح آب پر انتہائی مسرت سے دوڑتی پھریں، اس کے چہرہ کا اتار چڑھاؤ جیسے وہ ہر راگ میں خود کو بھی ویسے ہی فنا کئے ہوئے ہے، جیسے ایک سننے والا ہو سکتا ہے اس کے سینہ کا نشیب و فراز، جیسے ہر تال اور ہر سُر اس کے اپنے ہی جذبات کی ایک الاپ ہے، اسی کی . . . . روح کی ایک پکار ہے یہ سب چیزیں ثابت کر رہی تھیں کہ وہ ایک مشاق و ماہر فنکار ہے

جب وہ اپنا راگ ختم کر چکی تو وہاں سے اٹھی اور بغیر کوئی لفظ کہے اپنی پہلی جگہ آ بیٹھی۔

"میں اب سمجھا کہ تمہیں جنید کیا تعلیم دے رہا ہے!" میں نے بے تابانہ کہا۔

"وہ آئندہ بہار . . . کے مقابلۂ موسیقی میں مجھے شریک کرنا چاہتے ہیں" اس نے کہا "شاید اب آپ یہ سمجھ گئے ہونگے، کہ اگر میں ان کو اسوقت چھوڑ دوں . . . ."

"تو کیا جب جنید یہ کہتا ہے کہ تم اسکو سدھاروگی تو اس سے یہی مراد ہوتی ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

اس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا، مگر وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی جس سے میں نے یہ اندازہ کر لیا کہ اس کا جواب اثبات میں ہے۔

"لیکن براہ کرم!" میں نے اسی بیتابی سے کہنا شروع کیا "یہ تو بتلاؤ کہ جنید تم کو تعلیم کس طرح دے سکتا ہے، وہ تو ستار زنی بالکل ہی نہیں جانتا!"

"وہ تو نہیں جانتے، مگر سب سے پہلے انہوں نے خود ہی مجھے تعلیم دینی شروع کی تھی، وہ مسلسل پانچ سال تک مشق کراتے رہے اور اس کے بعد انہوں نے مجھے دیگر ماہرین فن کی شاگردی میں دے دیا!"

"تو پھر یہ دیگر ماہرین فن تم سے خوب واقف ہوں گے" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں!" اس نے جواب دیا "فی الواقع وہ میرے متعلق اچھی طرح جانتے ہیں!" اور پھر فوراً ہی میری طرف دیکھتے ہوئے حجاب و دلیری، حیا و تمسخر کے ملے جلے جذبات کے ساتھ، جو میں نے نہ اس سے پہلے کبھی دیکھے تھے نہ آئندہ کبھی دیکھوں گا، وہ زیر لب آواز میں بولی:۔

"لیکن میں بتا دوں . . . . آپ راز ضرور!"

میرا خیال ہے کہ یہ تیسری یا چوتھی مرتبہ کا واقعہ ہے، جب ہماری محبت پروان چڑھی، مجھے امید ہے کہ آپ مجھے "پروان چڑھی" کے الفاظ استعمال کرنے کی اجازت دیں گے۔ حالانکہ بہت سے انسان شاید میرے اس دلیرانہ اظہار و اعتراف پر چڑ بڑ . . . مجھے یہ نہیں کہ میں اس پروان چڑھنے کی تفصیل بیان کرنے سے جی چراتا ہوں، یا میرے ذہن سے، اس رنگین لمحہ کی یاد نکل گئی ہے، لیکن یہ میرا تجربہ اسقدر کورانہ تھا کہ مجھے اس سے پہلے کی تمام گذری ہوئی باتوں میں ایک تاریکی سی محسوس ہونے لگی، اس واقعہ میں خود اتنی خیرگی تھی، کہ ہر گذشتہ و آئندہ واردات کا نظر آ جانا ناممکن سا تھا۔

میں سمجھتا ہوں، کہ انسان کی تعمیر ہی کچھ اس نہج پر ہوئی ہے، کہ وہ موجودہ چیزوں سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ یہ اسکی فطرت ہے کہ وہ ان چیزوں سے اور آگے بڑھے یہ تغیر خارجی بھی ہوسکتا ہے اور ذہنی بھی۔ چنانچہ میرے "انجذاب حسن" میں ایک اضطراب زا حالت پیدا ہوچکی تھی، میرے تعلقات کی بنیاد، وہ چاہے جیسی بھی ہو، مگر میرا ضمیر چاہتا تھا، کہ اسکو اور زیادہ وسیع ہونا چاہئے۔ میری ملاقاتوں میں جتنا تواتر و استحکام پیدا ہوتا، اتنی ہی میری یہ آرزو ہوتی، کہ وہ اور زیادہ ہوں چند ہفتوں کے لئے میں واقعی تمام ہستی مسرتوں سے ہمکنار رہا اور ان ہفتوں میں مجھے معلوم ہوگیا، کہ مسرت کیا چیز ہے اور دنیا کے کتنے آدمی ہیں، ان سچی مسرت کے حاصل کرنے کی جرأت و بے باکی ہوتی ہے یہ احساس کہ وہ ہے وہ میری ہے، وہ مجھ سے والہانہ محبت کرتی ہے وہ آنے والی سنیچر کی شام کو پھر ہم دونوں وظیفۂ محبت (میرے لئے تو وہ وظیفۂ محبت سے بھی زیادہ اہم تھا) دہرائیں گے۔ میرے لئے کچھ کم نہ تھا زمین پر میرے قدم اگر کسی "دیوتا" کے سے نہیں تو کم از کم نیم دیوتا کی طرح پڑنے لگے تھے۔ جنید کس قدر بدنصیب اور ساتھ ہی سیاہ کار بھی تھا۔ اس نے ایک جوان عورت کو نتھے سے پرند کی طرح قید کر لیا تھا، مگر جیسے جیسے میری محبت عمیق ہوتی گئی، میرے اندر ایک تغیر رونما ہوتا گیا۔

آج مجھے اس تک پہنچنے میں کچھ غیر معمولی تاخیر ہوگئی تھی لیکن جب میں اس چھوٹے سے دروازہ کے قریب پہنچا، تو یہ دیکھ کر کہ وہ خلاف معمول کھلا ہوا ہے، میں بے حد متحیر ہوا۔ میں حسب معمول اندر داخل ہوکر صحن کو طے کرتا ہوا اوپر چڑھ گیا اوپر پہنچکر میں نے دیکھا، کہ آج وہ ایک کھڑکی بھی کھلی ہوئی ہے، جس کے متعلق میرا خیال تھا، کہ مکان تعمیر ہونے کے بعد اسکو کبھی کھولنے کی زحمت ہی نہیں کی گئی، یہ چیز اور زیادہ تعجب انگیز تھی، لیکن میں نے خیال کیا، کہ شاید اس نے تازہ ہوا، اور سورج کی روشنی سے حظ اندوز ہونے کے لئے اس کو وقتی طور پر کھول دیا ہو۔ اسی وقت میرے دماغ میں ایک عجیب خیال پیدا ہوا، ایسا خیال جو بالعموم بچوں یا پھر ایسے محبت کرنے والوں کے دلوں ہی میں پیدا ہوسکتا ہے، جن کے لئے تمام دنیا دلکشیوں اور دلفریبیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اسوقت فطرتاً میں نے بھی چاہا، کہ اپنی محبوبہ کو اس طرح دیکھوں، کہ وہ مجھے نہ دیکھ سکے۔ اور یہ بھی کہ وہ تنہائی میں، جب کہ اس کے پاس کوئی نہ ہو کیسی معلوم ہوتی ہے۔

وہاں کھڑے ہوکر مجھے سوائے اپنے ہی دل کی دھڑکنوں کے کوئی اور آواز سنائی نہیں دی، ہر طرف سکوت مسلط تھا، لیکن فوراً ہی میں نے کھڑکی کے قریب ہی اسکی آواز سنی، بالکل اسی کی آواز جو باوجود ایک دیوار بیچ میں حائل ہونے کے مجھے صاف صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ کسی سے کہہ رہی تھی

"نہیں پیارے ہرگز نہیں میں تم سے کہہ چکی ہوں، اگر انہوں نے مجھے کھودیا تو وہ اس صدمہ سے جانبر نہ ہوسکیں گے اور بالخصوص اس وقت . . . . . ."

یہ ہی الفاظ تھے۔ جو اس نے کبھی مجھ سے کہے تھے۔ اور بالکل اسی لہجے میں، میں اپنی اسوقت کی دماغی حالت کو اس سے زیادہ واضح الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا، کہ جب میں نے یہ الفاظ سنے تو وہ فوری جذبہ جو میرے اندر پیدا ہوا، ایک قسم کی اندرونی شادمانی، اندرونی امنگ کا تھا، یہ ہے، سچی محبت کا نظارہ خوشی سے میرا سینہ پھٹا جا رہا تھا، وہ مجھ سے کس قدر محبت کرتی تھی، کہ وہ میری عدم موجودگی میں ان ہی الفاظ سے تسکین قلب کر رہی تھی، جو ہم نے کبھی آپس کی گفتگو میں استعمال کئے تھے۔ شاید وہ یہ بھی محسوس کر رہی ہو، کہ میں اس کے مقابل بیٹھا ہوا ہوں اور ہم دونوں باتیں کر رہے ہیں۔ اگر وہ اس حالت کو پہنچ گئی ہے، تو وہ یقیناً میری ہے اب میرے اندر اس کے متعلق حصول مقصد کی دھندلی سی امید یقین کی صورت اختیار کرچکی تھی۔

تھوڑی دیر تک میں اسی مسرور بے خودی کے عالم میں کھڑا رہا لیکن اب جب کبھی میں اس موقعہ اور اس لمحہ کا خیال کرتا ہوں تو اپنی اس مسرور بے خودی کو کسی ایسی ہستی سے تشبیہ دینے پر مجبور ہوجاتا ہوں جو کسی انتہائی بلند چوٹی پر کھڑی ہو، وسیع دنیا کو دیکھ رہی ہو، اور اسکی پستی پر ہنس رہی ہو اور دوسرے ہی لمحہ اسکو وہاں سے پاش پاش ہونے کے لئے پھینک دیا جائے۔ فوراً ہی میں نے ایک آواز

سنی نہ میری آہ، نہ کسی مریض کی آواز جو کہہ رہی تھی،

"پیاری رحم کرو! ہوگا اگر تم نہیں کرو گی تو شاید پھر میں زندگی بھی برداشت نہ کرسکوں"

جب جسمانی درد حد سے تجاوز کر جاتا ہے ہم بے ہوش ہو جاتے ہیں لیکن ذہنی تکلیف میں ایسا نہیں ہوتا۔ ہمارے پاس اس تکلیف کا علاج ہوتا ہے اور وہ یہ ہی کہ ہم وقتی طور پر اس سے بے حس ہو جاتے ہیں ہم محسوس ہی نہیں کر سکتے ہم جانتے ہیں کہ کوئی صدمہ وقوع پذیر ہو چکا ہے لیکن اس دوران میں ہم اسکے احساس کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اس وقت بھی یہی ہوا میری تمام دنیا ایک لمحے میں مٹ گئی۔ میری تمام تمناؤں پر آن واحد میں پانی پھر گیا۔ میری ساری امیدیں خاک میں مل گئیں۔ مگر میں وہیں کھڑا رہا۔ ساکن و خاموش جیسے کچھ ہوا ہی نہیں میں نے نہایت ہوشیاری اور حد درجہ احتیاط کے ساتھ کھلی ہوئی کھڑکی کے اندر سے جھانکنے کی کوشش کی۔ اور ان دونوں کو دیکھ لیا۔ وہ ایک سیاہ فام انسان تھا، اور مجھے علم نہیں کہ وہ کون تھا، اور اسکی شکل کیسی تھی، کیونکہ اسکی پشت کھڑکی کیطرف تھی یہ یقینی ہے کہ وہ جنید نہیں تھا کیونکہ مجھے خوب یاد ہے کہ وہ خوب گورا چٹا آدمی تھا وہ خود زمین پر بیٹھی ہوئی، اسی نظر سے اسے دیکھ رہی تھی جس کی لطافت، صداقت اور راستی سے میں بھی اتنی مرتبہ واقف ہو چکا تھا مجھے یاد ہے کہ میرے تمام جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی شاید الفاظ اس سنسنی اور اس حالت کے بیان کے متحمل نہ ہو سکیں۔

لیکن جیسے ہی مجھے یہ خیال آیا کہ میرا اس حالت میں زیادہ دیر تک کھڑکی پر رہنا اور ان میں سے کسی کا مجھے وہاں دیکھ لینا، بڑی غیر مناسب اور بھدی سی بات ہے۔ میں نے اپنا سر ہٹا لیا اور زینے کو دبے قدموں سے طے کر کے نیچے اترا، اور مکان واپس چلا آیا

میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ اس خاص واقعہ سے میں یہ کہنے کے قابل ہو گیا تھا کہ میں مسرت کو جان گیا ہوں، مگر آنیوالے چند ایام نے مجھے انتہائی اذیت کی تلخی بھی چکھا دی ایسی جاں گسل اذیت کی کہ مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اسکی عدم موجودگی ہی میرا جوہرہ چوڑ کر دیگی میری حالت بڑی ابتر ہو گئی تھی میں انتہائی اضطراب و کرب میں سربسجود ہو جایا کرتا۔ اور خدا سے دعا کرتا کہ "او پاک پروردگار!!! اگر تو چاہتا ہی ہے تو میں اس جانگاہ صدمہ کو برداشت کروں گا لیکن میں اس قابل نہیں مجھ میں اتنی طاقت کہاں کہ میں اس کو تھوڑے سے عرصہ تک بھی برداشت کرسکوں۔

اگلی سنیچر کی شام کو میں پھر اس کے آستانہ پر حاضر ہوا لیکن آج بہت پہلے، اس نے کشکشانے پر دروازہ کھولا، اور جیسے ہی اس نے مجھے دیکھا اس کا چہرہ پھر اسی صداقت و محبت کا آئینہ بن گیا جسکو میں نے اپنے لئے اپنے خیالوں میں مخصوص کر رکھا تھا جس نے ایک سے کئی مرتبہ زیادہ میرے متاع ہوش و حواس کو لوٹا تھا، اس کے اس قرب کے نظارہ نے میرے اندر اس قدر زبردست تشنج پیدا کر دیا۔ اور میں بغیر اس خیال کے کہ آیا وہ ہی میری اذیتوں کا باعث تھی یا نہیں؟ اس پر اتنے وحشیانہ طریقہ سے اپنی تمام بدعائیں صرف کر دینا چاہتا تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے میں خود اپنے مقصد میں اپنے جذبات سے مغلوب ہو گیا۔

اس نے حسب معمول دروازہ بند کر دیا اور محبت بھرا ہاتھ میرے بازو پر رکھتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کیا لیکن بیٹھنے کی بجائے میں نے اپنی جیب سے ریوالور نکالا، اور اس پر ایکدم کئی گولیاں چلا دیں، اس کے منہ سے آدھا لفظ بھی نہ نکلا! وہ زیادہ دیر تک کھڑی بھی نہیں رہ سکی، بلکہ فوراً ہی زمین پر ڈھیر ہو گئی اسکے لبوں سے ایک ایسی ہلکی سی آہ ضرور نکلی جو اکثر کمان کی شست کو چھوڑنے سے نکلا کرتی ہے۔ یہی اس کا آخری پیام محبت تھا۔

میں نے فوراً دروازہ کھولا، اور وہاں سے فرار ہو گیا۔

دن گزرتے گئے۔ یہاں تک کہ ایک ہفتہ، پورا ہفتہ گزر گیا، اخبارات کی اطلاعات سے میں اس نتیجہ پر بھی پہنچا کہ کسی کو میرے جرم ہی کی خبر نہیں ہوئی جنید کہاں چلا گیا تھا؟ کیا وہ کسی کو مردہ ملی نہیں؟ — تفتیش کیوں نہیں ہوئی؟؟ کیا اس کو جنید نے خود کہیں غائب کر دیا تھا؟

دوسرے ہفتہ پیر کے روز جیسے ہی کہ میں اپنے دفتر سے باہر نکلا میری نظر اخبار کی ایک موٹی سرخی پر پڑی، لکھا تھا کہ:

"ایک شاندار کردار کا خاتمہ۔ —— مکان پر

بجز سب سے پہلا کام میں نے اپنے ملازم سے اخبار مانگنے ہی کا کیا تھا۔ اس کو پڑھ کر مجھے معلوم ہوا کہ یہ شاندار گرد رکا خاتمہ تھا۔ دراصل جنید کی موت کی اطلاع تھی، وہ اپنے کمرے میں گولی سے مرا ہوا ایسے حالات میں پایا گیا جن سے اس کی خودکشی کا خیال ہوتا تھا۔

فوراً ہی میرے دماغ میں اس کے الفاظ گھومنے لگے: "اگر انہوں نے اب مجھ کو کھو دیا تو وہ اس صدمہ سے جانبر نہ ہو سکیں گے ———"

اور اس کے کھونے کا نتیجہ تھا۔ بظاہر تو ایسا ہی معلوم ہوتا تھا۔ تب تو ان کو اس کے متعلق بالیقین معلوم ہو گیا۔ اور کسی اور کو بھی وہ واقعہ معلوم نہیں ہوا ——— یہ بات ذرا قابل اعتبار نہ تھی۔ اور اس لئے میں نے خود سے فیصلہ کر لیا کہ اب میری باری ہے۔

لیکن پھر بھی کچھ وقوع میں نہیں آیا۔ میری زندگی پھر اپنی اصلی حالت پر آ چکی تھی اگر گذشتہ واقعہ کے متعلق کوئی خیال باقی تھا تو "جنید کی خودکشی کا سبب؟" کیا اسے محبت تھی؟ کیا اس نے حرکت مقابلہ کے اعلان کی شرم کی وجہ سے خودکشی کر لی؟ ———

کچھ روز کے بعد میں نے اخبار میں جنید کی موت کی تفصیل پڑھی یہاں کسی تفصیلی حوالہ کی ضرورت نہیں۔ صرف یہی کافی ہے جس طرح عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ اکثر فطین وطباع آدمی آخر عمر میں پاگل ہو جاتے ہیں، بالکل اسی طرح اسکے متعلق بھی یہ فیصلہ کر دیا گیا تھا کہ اس نے خودکشی اختلال دماغی کے باعث کی۔

لیکن اس سے تین امور روشنی میں آئے، جنہوں نے مجھے بے حد متحیر و متعجب کیا۔ اولاً یہ امر بغیر کسی شک و شبہ کے پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا تھا کہ جنید تنہا رہتا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ کمرہ جس سے میں اس قدر...... واقف تھا، جہاں میں نے دنیا کے سب سے بڑے جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ اس کا دارالعمل تھا۔ اس دارالعمل میں بہت سے کیمیا لیے اور برقی آلے پائے گئے۔ بالخصوص ہزاروں کی تعداد میں برقی خنیزے جو ابھی تک سائنس کی دنیا میں غیر معروف تھے وہاں ملے۔ علاوہ ان کے انسانی ہڈیوں کی بھی ایک خاصی تعداد

اور ایک اور خاص چیز بھی جس کے متعلق انسانی دل ہونے کا فیصلہ صادر کیا گیا۔ اسی دارالعمل میں میں۔ ساتھ ہی یہ بھی طے ہوا کہ یہ انسانی دل جنید نے خود ہی کسی ایسے طریقہ سے بنایا تھا، جو سائنس والوں کو دعوت عمل دے رہا تھا۔ میری بات یہ تھی کہ یہ دل دنیا والوں کے لیے مصنوعی ہو، مگر میں جانتا ہوں کہ یہ وہ ہی ہوگا جس کو جنید نے اپنے عملی تجربوں کے لئے اس کے جسم سے علیحدہ کر کے، اس کا جسم یا ہڈیاں نکال کر صرف گوشت زمین میں دفن کر دیا

میں نے جب یہ اطلاعات پڑھیں، آپ ہی سوچئے، میرے حیرت و استعجاب کی کوئی حد رہی ہوگی۔ دنیا کتنی جلد اور کتنی آسانی سے بیوقوف بن سکتی ہے اور بنائی جا سکتی ہے۔ میری نظروں کے سامنے یہ غیر معمولی نظارہ معہ اپنی تمام جزوی تفصیلات کے اور ان دو شاہدوں کے جو مجھ سے بہت دور جا چکے تھے، تمام صاف موجود تھا لیکن میں نے اس پر جس قدر غور کیا۔ اتنی ہی میرے سامنے ایک اور تصویر بھی گردش کرتی معلوم ہوئی، اور وہ میری اپنی ذات تھی، خودشناسی کی ——— خودشناسی کی کونسی گہرائیاں میں نے ان حسین و صادق آنکھوں کے سمندر میں نہیں دیکھی تھیں۔ کونسا رحم اور پیار میں نے اس ملکوتی مسکراہٹ میں نہیں پایا تھا جو میرے ہی باحیا دل کے گوشوں کی ہمدردی میں پیدا ہوئیں تھیں۔ اور ——— اور کیا وہ خود خدا کی ——— ہاں ہاں خدا کی پیدا کی ہوئی مخلوق نہیں تھی، جو دنیا میں میرے خیال سے صرف اسلئے آئی ہو کہ اگر اور کئی نہیں تو کم از کم میری ہی تنہائیوں کو لبریز حیات کر دے، میری ہی خلوتوں کو جلوتیں بنا دے میری ہی عزلت گزینیوں کو اپنے سیمیں قہقہوں سے گونجا دے۔ اور کیا یہ تمام واقعات ہونیوالے نہیں تھے؟ کیا یہ وقوع پذیر نہیں ہوئے؟ کیا میں نے انکو ثابت نہیں کر دیا؟ لیکن یہ ثبوت کہاں سے آیا؟ کون اس ثبوت کے پردے میں روپوش ہے؟ کون ان واقعات کے پیچھے جلوہ نما ہے؟ وہ ہی ذات ——— وہ ہی ایک ذات ——— افوہ ری خودنمائی۔

نوٹ:- اس افسانہ کے تمام کردار اور اس کا پلاٹ صرف افسانوی ہیں۔ حقیقت سے انکا کوئی تعلق نہیں۔ راحت

جناب روش صدیقی

تقریب

(اشتیاق قرب)

نہ مرا شوق اسیرِ ہوس نظّارہ نہ مرے ضبط کو تابِ نگہِ آوارہ
نہ مجھے عشق کو افسانہ بنانے کا جنوں نہ مجھے حسن کو دیوانہ بنانے کا جنوں
پھر بھی حسرت ہے کہ تم سے نہ کبھی دور رہوں

دل مرا انجمن شاہد رعنائے فراق ہر نفس تارِ نقاب رُخِ لیلائے فراق
محرمِ رازِ حجاباتِ جدائی ہوں میں! مرتبہ دانِ مقاماتِ جدائی ہوں میں
پھر بھی حسرت ہے کہ تم سے نہ کبھی دور رہوں

اضطرابِ دلِ دیوانہ گراں میرے لئے! شوخیٔ مستیٔ پروانہ گراں میرے لئے!
سوزِ خاموشِ وفا حاصلِ الفت ہے مجھے! آہ! محبوب بہت گوشۂ خلوت ہے مجھے!
پھر بھی حسرت ہے کہ تم سے نہ کبھی دور رہوں

جذبۂ عشق و وفا خاک بسر، خاک نشیں جلوۂ تمکنتِ ناز ہے افلاک نشیں
مہر تک شبنمِ مجبور کی پرواز کہاں؟ میں کہاں اور لطافت کدۂ ناز کہاں؟
پھر بھی حسرت ہے کہ تم سے نہ کبھی دور رہوں

شوخیٔ شعلۂ فرقت کی قسم ہے مجھ کو آہ! دامانِ محبت کی قسم ہے مجھ کو
خلوت آرائے جمالِ غمِ پنہاں ہوں میں خواب اظہارِ محبت سے گریزاں ہوں میں
پھر بھی حسرت ہے کہ تم سے نہ کبھی دور رہوں

جانتا ہوں، کہ جدائی ہے سزاوارِ وفا! ہجر سے دور نہیں منزلِ اسرارِ وفا!
حاصلِ عشق، تصورگہِ تنہائی ہے! ہوسِ قرب تو اک عالمِ رسوائی ہے!
پھر بھی حسرت ہے کہ تم سے نہ کبھی دور رہوں

مصنفہ: پروفیسر رام کمار ورما　　مترجمہ: جناب یزدانی جالندھری

دس منٹ

افرادِ تمثیل

مہادیو ——— ایک معمولی آدمی
بلدیو ——— مہادیو کا دوست
شانتی ——— بلدیو کی بہن
ایک پولیس انسپکٹر اور چار سپاہی

جگہ:- کانپور سے ۴۰ میل دور۔ **زمانہ:-** ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد

منظر:- (آدھی رات کا وقت۔ ایک آراستہ و پیراستہ کمرہ۔ شمالی اور جنوبی جانب دو دروازے ہیں، شمالی دروازہ بہت چھوٹا ہے جس کا تعلق باہر جانیوالی سرنگ سے ہے۔ جنوبی دروازے کے نزدیک کھڑکی ہے، جو بند ہے۔ کمرے کے عین وسط میں ایک میز ہے۔ جس کے دونوں طرف دو کرسیاں پڑی ہیں سامنے ایک گھڑی لگی ہوئی ہے جس میں دو بجکر پندرہ منٹ ہوئے ہیں۔ کمرے کے ایک گوشے میں ایک پرانا پلنگ بچھا ہوا ہے۔ اس پر ایک ادھیڑ عمر آدمی بہت معمولی کپڑے پہنے سو رہا ہے اسکی عمر تقریباً پینتیس (۳۵) برس ہے۔ اسکے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار نمایاں ہیں چاروں طرف سکون طاری ہے۔ کمرے میں ہلکی سی روشنی پھیلی ہوئی ہے)

ایک آواز:- (باہر سے) مہا۔۔ ۔۔دیو۔۔۔۔ مہا ۔۔دیو!

(مہادیو غنودگی کے عالم میں سر اٹھاتا ہے، آنکھیں ملتا ہوا بھنویں سکوڑ کر دروازے کی طرف دیکھتا ہے)

وہی آواز:- مہادیو! (آخری "واو" بالکل دھیما ہے)

مہادیو:- آدھی، رات کو بھی چین نہیں (دروازے کے پاس پہنچ کر خفگی انگیز لہجہ میں) کون ہے اسوقت؟

وہی آواز:- (گھبرائی ہوئی) بلدیو!

مہادیو:- (حیرت سے) ایں بلدیو! تم اس (دروازہ کھولتا ہے) وقت یہاں؟ (چونک کر پیچھے ہٹتے ہوئے) آ۔۔۔۔ (مدھم آواز میں) لئے۔۔۔؟ یہ کیا۔۔۔۔۔۔؟

(بلدیو داخل ہوتا ہے۔ وہ پچیس برس کا نوجوان ہے۔ اس کے کپڑے خون سے رنگے ہوئے ہیں، کرتے کا بالائی حصہ پھٹا ہوا ہے، ہاتھ میں چھری ہے، جو ہاتھ کانپنے کے باعث لباس میں الجھ رہی ہے۔ اسکے منہ پر ہوائیاں چھوٹ رہی ہیں، وہ سہمی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہے)

بلدیو:- (گھبرائی ہوئی آواز میں) مہادیو، میں نے خو۔۔۔ن۔۔۔ کر دیا!

مہادیو:- (ششدر ہو کر) خون کر دیا؟ کس کا؟؟ کب؟؟؟

بلدیو:- (سنبھل کر) نہیں۔۔ ۔۔نہیں، میں نے خون نہیں کیا کسی دوسرے آدمی نے خون کر کے چھری میرے ہاتھ میں دیدی ہے میں بے قصور ہوں، کون کہتا ہے میں نے خون کیا ہے؟ ایں؟

مہادیو:- ابھی تمہیں نے تو کہا تھا، یہ تمہارے کپڑے (بلدیو کے کپڑے

ہاتھ سے چھوتا ہے)

بلدیو:- (نرم ہوکر) میں نے کہا تھا؟ تو ہاں میں نے خون کردیا اس پاپی مہیش کا، میری بہن کو بری نظروں سے دیکھنے والے رہو! چباتے ہوئے) کمینے کا، نفرت آلود، ہنس کر، ہوں۔ چھپ کر آیا تھا جب زمانے کی آنکھیں سو رہی تھیں اور صرف چار آنکھیں جاگ رہی تھیں ـــ دو میشور کی اور دو میری اپنے دل کو سیاہ، جب میں اپنے دل کو سیاہ لباس میں چھپا کر آیا تھا۔ (جھٹک کر) اس طرح جھٹ سے ہاتھ میں نے ایک ہی وار میں سے پورا جھکا دیا، دیکھتے ہو یہ چھری اور کا میان کے رنگ میں رنگے ہوئے یہ کپڑے!

(چہرے پر فخر اور غرور کی جھلک)

مہادیو:- (غصے سے) تمہاری بہن کو بری نظر سے دیکھتا تھا وہ؟ تم نے چھری کہاں پھونکی؟

بلدیو:- چھری! اس کی بغل میں ہوں!

(ہوا میں چھری کا وار کرتا ہے)

مہادیو:- بغل میں؟ نادان آنکھوں میں بھونک دینی چاہیے تھی تاکہ وہ گنہگار آنکھیں دنیا کا نور نہ دیکھ سکتیں جن آنکھوں میں گناہ کا خون تھا ان آنکھوں میں بہن کی بے عزتی کا خون ہونا چاہیے تھا۔ چھی! انتقام لینا بھی نہ آیا! (گھورتا ہے)

بلدیو:- (ضد سے) میں یہ بھی کرسکتا ہوں ـــ ابھی۔ پھر جاتا ہوں۔ (تیار ہوتا ہے)

مہادیو:- یہ الفاظ تو تم اس طرح کہہ رہے، جیسے وہ وہیں پڑا ہوگا پولیس نہ جانے اسے کب کا اٹھا لے گئی ہوگی

بلدیو:- پولیس کو وہ نہیں مل سکتا! جب تک میں اس کا جوڑ جوڑ کاٹ کر نہ پھینک دوں مجھے سکون حاصل نہ ہوگا۔ میں نے لاش چھپا رکھی ہے۔ وہیں پاس کی سب سے گھنی جھاڑی میں

مہادیو:- لیکن اسے اب اذیت کیا دوگے۔ اب تو وہ کمینہ مر ہی گیا ہوگا۔ اب اسے مارنے سے حاصل؟

بلدیو:- (برہمی سے) نہیں نہیں، مجھے انتقام لینا سیکھنے دو۔ اس کی آنکھیں اب بھی کھلی ہونگی گویا اس کی شہوانی پیاس ابھی نہیں بجھی۔ اُف توبہ! ـــ تمہارے روکنے پر بھی میں شمالی دیوار کے چھوٹے دروازے سے جاتا ہے۔ عقب سے فقرے کی تکمیل کرتا ہے) ضرور جاؤں گا۔ دل کی آگ (آہستہ آہستہ دور ہوتی ہوئی مدھم آواز میں) تو بجھا . . . سکوں گا۔

مہادیو:- (کھڑکی کھول کر دیکھتا ہوا) گیا ـــ چلا گیا؟ آہ پاپی سنسار!

(مہادیو سوچتا ہوا پلنگ پر بیٹھ جاتا ہے جنوبی دروازے پر پھر دستک ہوتی ہے)

مہادیو:- (متذبذب سے) کون ہے؟ (مضطرب ہوکر) میرے لئے یہ رات بھی دن ہے۔

(کھڑکی پر دستک ہوتی ہے)

مہادیو:- (دروازے کے نزدیک جاکر) کون ہے؟ نام بتاؤ۔

آواز:- پولیس۔

مہادیو:- پولیس؟ پولیس کا اسوقت میرے یہاں کیا کام؟

آواز:- (زور سے) دروازہ کھولو۔

(مہادیو دروازہ کھولتا ہے، پولیس انسپکٹر داخل ہوتا ہے وہ تیس برس کا موٹا تازہ آدمی ہے، مونچھیں چڑھی ہوئی ہیں اور پوری وردی پہنے ہوئے ہے۔ اس کے ہاتھ میں پستول ہے، ساتھ چار سپاہی ہیں اور سب کے سب باوردی۔ سپاہیوں کے ہاتھ میں بھالے ہیں)

پولیس انسپکٹر:- (آتے ہی) سارے ہتھیار رکھ دو۔

(پستول سامنے کرتا ہے)

مہادیو:- (پیچھے ہٹ کر) کیسے ہتھیار؟ کس کے ہتھیار؟

انسپکٹر:- (گھورتے ہوئے) اچھا! تم اکیلے ہی ہو! تمہارا نام مہادیو ہے؟

مہادیو:- ہاں

انسپکٹر:- تمہارے گھر ابھی کوئی آدمی آیا تھا!

مہادیو:- شاید۔

انسپکٹر:۔ شاید میں نے دور سے دیکھا تھا، ایک آدمی اس طرف آرہا تھا۔

مہادیو:۔ (آہستہ سے) آدمی۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔ تھا۔

انسپکٹر:۔ تو شیطان تھا؟

(غرور سے کرسی پر بیٹھتا ہے)

مہادیو:۔ نہیں، دیوتا۔ دیوتا تھا — اپنی بہن کی عزت و عصمت کی حفاظت کرنے والا ایک دیوتا۔

انسپکٹر:۔ دیوتا! اس کے کیا معنی؟!

مہادیو:۔ دیوتا کے کیا معنی ہوتے ہیں؟

انسپکٹر:۔ خاک (پاؤں مار کر) بارہ اور دو بجے کے درمیان ایک خون ہوا ہے، خون کے دھبّے پڑے ہوئے پائے گئے ہیں گشت کرتے وقت میرے جوتے خون سے لت پت ہو گئے۔ عین اسی وقت، ایک آدمی اس گھر کی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ لاش کوشش کے باوجود نہیں ملی۔ نہ جانے وہ کہاں ہے؟

مہادیو:۔ (نہایت سکون سے) وہ انسان کے سوا اور کسی کا خون نہیں ہو سکتا؟

انسپکٹر:۔ میں اسے انسان ہی کا خون کیوں نہ تسلیم کروں، جب وہ آدمی مشکوک حالت میں آدھی رات کے وقت بھاگا ہے۔ مجھے ابھی لاش کو تلاش کرنا ہے۔ یہ سوچکر کہ جب تک میں لاش کی تلاش کروں، قاتل کہیں بھاگ ہی نہ جائے میں پہلے اس آدمی کو پکڑ لینا چاہتا ہوں، پھر خواہ وہ بیگناہ ہی ثابت کیوں نہ ہو جائے۔ وہ آدمی کہاں ہے؟ اسی نے بارہ اور دو بجے کے درمیان خون کیا ہے: (سوچکر) ہاں ٹھیک اسی وقت خون ہوا ہے۔

مہادیو:۔ (بے خوفی سے) ہوا کرے اس سے میرا کیا تعلق (دیوانگی میں) اسی خون کو لیکر صبح کلفت مسکرا اٹھے گی، اسی سرخی سے ساری دنیا میں نور چھا جائے گا۔ وہی خون دنیا کے کونے کونے میں زندگی کا پیام (صبح کی دلکش ہوا میں بکھیر دیگا۔

انسپکٹر:۔ (تیز لہجہ میں) یہ کیا بک رہے ہو؟ (منہ بنا کر) ایسر ڈانٹ سنو! جو کچھ پوچھتا ہوں ٹھیک ٹھیک بتاؤ! جو آدمی ابھی ابھی یہاں آیا تھا، وہ کہاں گیا؟

مہادیو:۔ (سوچتے ہوئے) وہ دس منٹ بعد آئے گا۔ ٹھیک دس منٹ بعد، آپ اس وقت آئیے۔

انسپکٹر:۔ (طنز سے) آپ مہربانی کرکے مکان خالی کردیں تو مکان کی تلاشی لوں گا، وہ خواہ دس منٹ میں آئے۔ خواہ بیس میں آپ سمجھے نا؟

(شان سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے)

مہادیو:۔ اچھا آپ کے پاس تلاشی کا وارنٹ ہے؟

انسپکٹر:۔ (غرور سے) میرا حکم ہی وارنٹ ہے جناب۔

مہادیو:۔ (سکون سے) آدھی رات کے وقت یہ آپ کی زیادتی ہے میرے پاس ہی تو ایک کمرہ ہے۔ جہاں تک آپکی نظر جاتی ہے اتنا ہی حصہ میرے اختیار و تصرف میں ہے اسی کو دیکھ لیجئے کہیں دکھائی دیتا ہے کوئی خونی؟

انسپکٹر:۔ بس تمہارے تصرف میں اتنی ہی جگہ ہے؟

مہادیو:۔ اس مکان میں صرف اتنا ہی حصہ بچ رہا ہے، باقی گر گیا ہے اسکے پیچھے میدان ہے۔

انسپکٹر:۔ (نرم ہو کر) دیکھو اگر تم اصل حقیقت بتا دوگے، تو بھاری انعام پاؤ گے۔ سمجھے؟ ورنہ شبہ میں میں تمہیں کو گرفتار کر لونگا

مہادیو:۔ (آگے بڑھ کر) خوشی سے گرفتار کر سکتے ہیں آپ۔ لیکن میں دھرم کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں بالکل بے گناہ ہوں

انسپکٹر:۔ میں دھرم ورم کچھ نہیں جانتا۔ سچ سچ بتاؤ، تم خونی کے بارے میں کیا جانتے ہو؟

(مہادیو کو تیز نگاہ سے دیکھتا ہے)

مہادیو:۔ (جرأت سے) کہہ رہا ہوں آپ دس منٹ بعد آئیے دو بجکر چالیس منٹ پر

(گھڑی کی طرف دیکھتا ہے)

انسپکٹر:۔ اور اگر میں دس منٹ یہیں ٹھہروں تو؟

مہادیو:۔ (سوچکر) تو شاید وہ نہ آئے۔

انسپکٹر:- کیوں؟
(تجسس آمیز نگاہ اِدھر اُدھر ڈالتا ہے)

مہادیو:- پولیس اور خونی میں کتے اور بلی کا تعلق ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا کرتے ہیں۔

انسپکٹر:- (مسکرا کر) ایبونرنگ نان سنس! اچھا میں تمہاری تلاش دس منٹ بعد لوں گا (سپاہیوں سے) دیکھو! اس مکان کو چاروں طرف سے گھیر لو میں اس عرصہ میں لاش کا پتہ لگاتا ہوں جس سے میرا شک رفع ہو جائے میں ابھی آیا۔

سپاہی:- (سلام کر کے) بہت اچھا۔
(جاتے ہیں)

انسپکٹر:- (طنز سے) اچھا آپ دس منٹ آرام کر سکتے ہیں۔
(انسپکٹر جاتا ہے۔ مہادیو دروازہ بند کر لیتا ہے کچھ دیر میز کے نزدیک سر جھکائے کھڑا رہتا ہے شمالی دروازے سے آواز آتی ہے۔ مہادیو آہستہ سے جا کر دروازہ کھولتا ہے بلدیو داخل ہوتا ہے۔ اب اس کے کپڑے پہلے سے بھی زیادہ خون میں شرابور ہیں)

بلدیو:- (مسرت آمیز لہجے میں) پار ہو گئی، چھری دونوں آنکھوں کے پار ہو گئی۔ اب شاید دوسرے جنم میں وہ کسی کو بری نظر سے نہ دیکھے۔

مہادیو:- (سنجیدہ ہو کر) ممکن ہے آئندہ جنم میں وہ اندھا ہو گناہ آلود نظر سے دیکھنا کیسا؟

بلدیو:- (اپنے ہی خیالات میں محو آنکھیں پھاڑ کر) اوہ! خون سے تمام زمین سرخ ہو گئی تھی گویا میرے اس کام کو دیکھ کر وہ بھی کھلکھلا اٹھی تھی۔ میں بھی دل کھول کر ہنستا ہوں
(منہ بنا کر ہنستا ہے)

مہادیو:- (سنجیدگی سے) اسی مسرت سے سرخ ہو کر کل صبح سورج ہنسے گا۔ گلاب ہنسے گا۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ کلیاں بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں ایک کام کرو۔

بلدیو:- (اشتیاق سے) وہ کیا؟

مہادیو:- یہ فتح کے رنگ میں رنگے ہوئے کپڑے اتار دو (صندوق سے نئے کپڑے نکالتے ہوئے) یہ لو نئے کپڑے انہیں پہن لو اس دنیا کی پلکوں میں شک کی پتلیاں ہیں۔

بلدیو:- (دلبری سے) رہنے دو۔ اس کا جواب میں اپنے گلے کے خون سے دونگا۔

مہادیو:- ارے (انصاف لڑنے والے دشمن کو اپنے گلے کے خون سے جواب دینا چاہیے۔ مگر یہ انصاف کی جنگ نہیں تم نے خواہ کتنے ہی بڑے گنہگار کے انصاف کے پیش نظر خون کیا ہو لیکن جان لینے کے باعث تمہیں کچھ نہ کچھ سزا ملے گی ضرور چاہیئے تو یہ تھا کہ منصف تمہیں تمہارے اس دلیرانہ فعل پر انعام دیتا لیکن کیا کبھی ایسا ہونا ممکن ہے؟

بلدیو:- (سوچ کر) اچھا، تم (قمیص اتارتے ہوئے) نہ مانو گے تمہاری ضد بڑی سخت ہے۔ اب تو (نئی قمیص پہنتے ہوئے) تم خوش ہوئے!

مہادیو:- تھوڑی دیر آرام کرو۔ دس منٹ تک (کچھ سوچ کر) نہیں دس منٹ تک کیا کرو گے؟ جاؤ اپنی بہن کی خبر لو۔

بلدیو:- (پرسکون لہجہ میں) وہ تو اپنی ماتا کے پریم کی مانند خاموش اور معطر دنیا میں گلگشت کر رہی ہے۔ میں اسے آرام اور سکون کے اس چشمے سے نکال کر بیداری کے پتھر پر کیوں پھینک دوں؟ صبح سورج کی کرنیں اسے خود ہی جگا دیں گی!

مہادیو:- نہیں! بھائی کے ہاتھ سورج کی کرنوں سے زیادہ نرم اور پریم بھرے ہیں۔ مہاتما تلسی داس نے حقیقی بھائی کے بارے میں کیا لکھا ہے؟

بلدیو:- (حیرت سے) تو کیا مجھے ٹھہرنے نہ دو گے؟

مہادیو:- بھائی! یہاں ٹھہرنے کی بجائے بہن کی خیریت معلوم کرنا نہایت ضروری ہے۔ جس بہن کی عزت و حرمت کی قیمت ایک انسانی جان سے زیادہ ہے۔ اسکی خیریت معلوم کرنے کے بارے میں اتنی بے پروائی کیوں ہو؟ اس سے ملنے کے بعد پھر تم یہاں

اگر مجھ سے باتیں کر سکتے ہو۔

بلدیو:۔ (خون آلود کپڑے اور چھری . . . کر اٹھاتے ہوئے) اچھا بھائی! جاتا ہوں، تھوڑی دیر بعد آؤنگا۔ اگر پولیس کو میری بُو پہنچی تو . . . . . . !

مہادیو:۔ (تجسس آمیز لہجے میں) یہ کپڑے اور چھری کیوں لئے جاتے ہو؟ بہن کے پاس ان کا کیا کام؟!

بلدیو:۔ (شکستہ دل ہو کر) تم میری خواہش ہمیشہ اسی طرح رد کر دیا کرتے ہو۔

(بلدیو ایک کونے میں کپڑے اور چھری رکھ کر شمالی دروازے سے باہر چلا جاتا ہے)

مہادیو:۔ (سوچکر) یہ . . . .

(کرسی پر بیٹھ کر گنگناتا ہے)

میری سانسوں کی آواز میں
گونجے میرا ایثار
گونجے میرا ایثار

(جنوبی دروازے پر دستک)

جیون (پھر دستک) میں . . . .

مہادیو:۔ ٹھہرو!

(خون آلود کپڑے پہنکر ہاتھ میں چھری لے لیتا ہے دروازہ کھولتے ہوئے)

کون ہے؟

(انسپکٹر پستول لئے ہوئے داخل ہوتا ہے)

انسپکٹر:۔ خونی کدھر ہے؟ (مہادیو کو خون آلود کپڑوں میں دیکھکر) ایں . . . . خونی . . . . . .

مہادیو:۔ (استقامت سے) میں ہوں خونی۔

انسپکٹر:۔ تم ہو خونی؟ (حیرت سے اسکی طرف دیکھتا ہے) سپاہیوں نے ابھی تمہارے کمرے میں کچھ باتوں کی بھنک سنی تھی۔

مہادیو:۔ میں گا رہا تھا۔

انسپکٹر:۔ ہوں (گھورتا ہے) تم خونی ہو!

مہادیو:۔ دیکھتے نہیں، یہ کپڑے اور یہ چھری!

انسپکٹر:۔ کیا تمہیں خونی ہو؟ تم تو کہتے تھے، دس منٹ بعد خونی آئے گا۔

مہادیو:۔ ہاں، دس منٹ بعد تمہیں خونی ملا یا نہیں؟ خونی تمہارے سامنے کھڑا ہے اور تم شک و شبہ میں گرفتار رہو۔ لاش دیکھی؟ اس کی بغل اور آنکھوں میں زخم ہے۔

(تیز نگاہ ڈالتا ہے)

انسپکٹر:۔ (سر ہلاتے ہوئے) ہاں پاس ہی ایک کانٹے دار جھاڑی میں لاش بڑی طرح گھائل ملی ہے۔ اس کی آنکھیں پھوڑ دی گئی ہیں اور اسکی بغل میں چھری گھونپ دی گئی ہے۔

مہادیو:۔ (آگے بڑھ کر) اور وہ چھری یہ ہے

(چھری دکھاتا ہے)

انسپکٹر:۔ (سپاہیوں سے) گرفتار کر لو اسے، اور پولیس تھانے لے چلو اس کے مکان میں تالا ڈالو۔ اس کے کوئی رشتہ دار تو ہیں نہیں تھانے جا کر معاملہ طے ہوگا

(سپاہی مہادیو کو گرفتار کر لیتے ہیں۔ جنوبی دروازے سے آواز آتی ہے۔)

مہادیو: (آہستہ لہجے میں) مہادیو!

انسپکٹر:۔ (تیزی سے) کون ہے؟

(باہر سے) اسکا دوست بلدیو

(باہر سے آہستہ آواز) اس کے دوست کی بہن واسنتی

انسپکٹر:۔ (زور سے) اسوقت مہادیو کسی سے نہیں مل سکتا۔ وہ خونی ہے۔ (سپاہیوں سے) چلو جلدی

(سب جاتے ہیں)

(باہر آہستہ لہجے میں مہادیو کا نام خاموشی میں گونجتا ہے۔)

(پردہ)

جناب امینِ حزیں سیالکوٹی

لطفِ زیست



خروش و پنجہ و دندانِ شیرِ نر کی قسم
نگاہِ باز کی اور اس کے بال و پر کی قسم
شہیدِ لذتِ کردار کے جگر کی قسم

بغیر "جراتِ بیباک" لطفِ زیست نہیں

فلک کی انجمنِ شب کے نور کی سوگند
ضیائے شمس و قمر کے ظہور کی سوگند
درونِ سینہ کے بینا و باور کی سوگند

بغیر "دیدۂ ادراک" لطفِ زیست نہیں

قسم ہے اسکی کہ ہے جس کا نام نجمِ سحر[1]
قسم ہے اسکی کہ نازک ترین ہے جو گوہر[2]
قسم ہے اس کی جو ہے عندلیب کا دلبر

بغیر "دامنِ صدچاک" لطفِ زیست نہیں

سرورِ نغمۂ جانسوزِ ساز کی سوگند
جنونِ پختۂ مجوبائے راز کی سوگند
کسی کے ناز کی اپنے نیاز کی سوگند

امیں بغیر "دلِ پاک" لطفِ زیست نہیں

[1] صبح کا ستارہ
[2] شبنم

جناب مسعود جاوید

نگہت کے خطوط

پروین پیاری!

کتنے عرصے کے بعد تمہارے جمود میں جنبش پیدا ہوئی ہے! —

پروین! کیا میری تباہی جذبات کے لئے ناقابل برداشت حقیقت کافی نہیں کہ میں مر نہیں سکتی؟ — پھر اگر تم ہی اس اذیت میں اضافہ کرو گی تو میرے دل کا کونسا آنسو دامن پر ٹپکنے سے رہ جائے گا؟ دیکھو! یوں ستایا نہ کرو ورنہ پھر میرے صبر و ضبط کو ناتواں کہنے کا حق بھی تمہیں نہ رہے گا!

تمہاری معصوم محبت ریز تحریر میری نظروں کے سامنے ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ جینے کا گیا گذرا زمانہ مجھے واپس مل رہا ہے، خدا کے واسطے اگر یہ احساس صرف فریب تمنا بھی ہو تو بھی اسے شدید تر بنانے جاؤ کیونکہ شعور حال کے ساتھ ساتھ ہی مجھے بالکل یہ معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی میرا گلا دبائے چلا جاتا ہے۔

میری حالت کیا پوچھتی ہو پروین! — پوچھنے کا وقت تو کہیں کھو گیا۔ اب تو بلا پوچھے رہنے — اور روتے جانے کا زمانہ ہے۔ آنکھ میں ذرۂ ریگ گر جانے سے جو کرب و بے چینی ہوتی ہے وہ مستقل طور پر میری روح میں سما گئی ہے۔ راگ مدھم سروں سے شروع ہو کر ایک خاص بلندی تک پہنچ جاتے ہیں، اور اس بلندی سے پھر خاموشی کی طرف ڈھلکتے چلے آتے ہیں، لیکن میری زندگی کا الم انگیز راگ سکوت سے دور ہی ہٹتا چلا جاتا ہے، کون جانتا ہے کہ ابتدا کی طرف رجوع ہوگا یا نہیں؟

میں گھبرا گئی ہوں پروین — گھبرا گئی ہوں، ان المناک نگاہوں سے!! — کاش کوئی بتا سکتا کہ اگر عظمت آب مشرق کی ایک معصوم و حیا پرست بیٹی، زندگی کے ان محشر خیز طوفانوں میں گھر جائے جن کو سہنے کی قوت وہ استعمال نہ کر سکنے ہی پر مجبور رہے۔ تو وہ کس طرح [illegible] گذاری تو وہ [illegible] کرے؟

[illegible] — [illegible] کی طرح: — یہ کیسے [illegible] سے بھولے پروین — اگر تم نے یہ الفاظ شکک ریزی کی حالت میں نہ لکھے ہوتے تو یقین کرو مجھے تمہاری حسیات کی زندگی پر بھی شک ہو جاتا — تم کیا جانو سکھی یہ لکھو کیسا جان لیوا ہے!!

رات وہ آئے تھے گھر — نہ معلوم کتنی طویل بھیانک راتوں کے بعد — بارہ بج چکے تھے [illegible] کا مطالعہ کر رہی تھی انکے پاؤں کی آہٹ کو — دماغ سے پہلے دل پہچان جاتا ہے، سینے میں دھڑکن سے ہو گئی اور بے اختیار تمہارا وہی لطیف بے چینی سی محسوس ہوئی جو کہ اولین مرتبہ ان کے پاؤں کی آہٹ سننے پر ہوئی تھی خادمہ کبھی کی سو چکی تھی، میں نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر آئے تو میں نے سلام کیا۔ نہ معلوم کتنے عرصے کے بعد ان کے لبوں پر سلام کا جواب ایک خفیف تبسم کے ساتھ نمودار ہوا میری کیفیت نہ پوچھو کیا تھی — کبھی ہوائی تیز ہو تو کیا کسی ننھی سی بتی کو تھرتھراتے دیکھا ہے تم نے؟

انہوں نے کھانا کھایا — میں پنکھا جھلاتی — دو پہر — پھر وہ سو گئے — دنکارتوں کو پاؤں سے مسل مسل کر بجھانا اسی چیز کو کہتے ہیں پروین۔

پھر ایسی۔ تیس تو بہت سی گذر گئیں مجھ پر — تم کہاں تک سنو گی — صبح کے بعد میری تنہائیوں کو صرف دو انیس ملے ہیں — کتاب اور تارے: — اور ان دونوں کی غمگساریوں نے کالی کالی راتوں میں ہمیشہ میری بیداریوں کا ساتھ دیا ہے — آہ سکھی! اب تو یہ ساری زندگی ہی ایک بھیانک رات ہے جسے جاگ جاگ کر کاٹنا ہے کاش سوسائٹی کی آنکھیں ستارے بن کر میرے سکرات کو دیکھ

سکتیں۔

میں یہ ہرگز نہیں کہتی پروین! کہ انکی عادت میں کوئی اخلاقی عیب ہے۔ وہ نیک ہیں — پورے پورے نیک — میری آزادیوں پر کبھی کوئی پابندی عائد نہیں کرتے اور مادی ضرورتوں میں کبھی مجھ کو مجبور نہیں رکھتے لیکن بہن — خادمہ بن جانے کا صدمہ بھی تو نہیں ہو سکتا — شریک زندگی کے مفہوم میں شریک احساسات کا پہلو بھی تو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے اور میرے مذاق میں بعد المشرقین ہی سہی — ان کی اور میری فطرت یکسر بیگانہ ہی سہی — لیکن رومانیت کا عنصر اگر مشترک ہو تو پروین اسی کے لئے عورت جنت سے بھی روگردانی کی جرأت کر سکتی ہے۔

ان زخموں کی حیثیت کے احساس سے پہلے ہی مجھے اس روحانی نشتر کا علم تھا لیکن جب سوسائٹی اور خاندان کی ہمنوائی مشرقیت سے جا ملنے لگے تو لڑکی کیا کر سکتی ہے! مگر یوں نہیں کہتی یہ ان کا احتیاط ہے اور باعث فخر بھی — میری نگاہوں کے سامنے وہ رات اب تک روشن ستاروں کی طرح موجود ہے جب میری زبان کی معمولی سی جرأت میرے مستقبل کو تبدیل کر سکتی تھی میں دلہن بنی ہوئی اپنی سہیلیوں کے متبسم حلقے میں بیٹھی تھی تمام گھر میں خوشی کا شور و غل برپا تھا لیکن میری بی اماں مجھ سے چھپ چھپ کر رو رہی تھیں — پھر یکایک وہ اہم اور انتہائی اہم لمحہ آ پہنچا جو ہر لڑکی کی عورت کی زندگی میں آتا ہے — میری مسہری کے برابر اگر کسی نے رسمی طور پر اجازت طلب کی سچ مانو پروین اسوقت ایک بار تو جی میں آیا میرے دل سے تڑپ کر لبوں تک آ گئی لیکن مسلم دوشیزہ کی فطرت نے مجھ سے کہا — نادان یہ بولنے کا وقت نہیں رضائے والدین پر سر تسلیم خم کر دینا ہی سرفرازی ہے! — زبان کو حرکت نہ ہوئی اور نہ معلوم نہیں میرے قریب سے کس نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو بادل ناخواستہ مجھے کہنا چاہیئے تھا۔

اس بات کو آج دو سال سے زاید ہو گئے — اور میں نہیں کیا بتاؤں کہ اتنی مدت تک یوں چپکے چپکے سسکتے رہنے کے بعد اب میری خاکستر حیات میں کیا رہا ہے۔ جس طرح مجھ سے پہلے میری دو بہنیں ان پر نثار ہو چکیں، اسی طرح میں بھی آہستہ آہستہ اپنی زندگی کی منتخب بہاریں قربان کر رہی ہوں — آہ!

نہ جی سکنا مگر جینا — نہ مر سکنا مگر مرنا!
یہی ہے داستاں دل یہی ہے داستاں میری

مگر میں نے ارادہ کر لیا ہے پروین! کہ اپنی تقدیر سے زور آزمائی کرونگی آخری دم تک — دیکھنا ہے کہ میری حسیات کی تپش ان کے دل تک کب تک نہیں پہنچتی اگر میں اس جد و جہد میں ختم ہو گئی تو سمجھ لینا کہ تمہاری برباد نکہت کامیاب رہی، اور اس کی کامیابی کا دلگداز ثبوت خونی آنسو ہونگے!

پیاری ہمراز! خدا کرے تم اچھی ہو اور جواب جلد دو۔

سوگوار حیات
نکہت

جان نکہت!

تعریق سے شاید تمہیں تکلیف ہوئی ہو پروین! — مگر میں مجبور تھی — اچھا معاف کر دو — اسدفعہ تمہارے اشکوں کے لئے میرا افسانہ بہت مختصر ہو گا۔ لیکن... اگر اسی کو کسی رسالہ میں شائع کر دیا جائے۔ تو سماج اپنی ستم فرمائیوں پر اپنا سر پیٹ لیگا!

کئی دن سے مجھے بخار تھا — بخار سے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی، بشرطیکہ شدید بھی ہو، کیونکہ اس صورت میں میرے ہوش و حواس معطل سے ہو جاتے ہیں۔ اور مجھے اپنی آہ و کراہ کو بھول جانے کا موقع مل جاتا ہے۔

رات بخار بہت شدید تھا، اور میں نیم بے ہوشی کے عالم میں انگاروں کے بستر پر پڑی تھی۔ رات بڑی بھیانک تھی۔ بارش زوروں سے ہو رہی تھی، اور بجلی کی کڑک سے دل سہما جاتا تھا! کوئی دو بجے کا وقت تھا۔

خادمہ بے چاری میرے پاس بیٹھی بیٹھی کافی خستہ ہو چکی تھی، میں نے اسے سونے کی اجازت دیدی تھی، اب — دوسری طرف "وہ" اپنا لمبا کرتا اتارے خراٹے لے رہے تھے۔

یکایک مجھے شدید پیاس محسوس ہوئی، اتنی طاقت نہ تھی کہ صحن کے اس طرف جا کر پانی پی سکتی۔ اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ کر بے چاری خادمہ ہی کو آواز دی۔ "ان" کو جگانے کی مجال میں نہ کر سکتی تھی۔ بارش کا شور ـــــ میری نحیف آواز ـــــ پھر خود خادمہ کی بے پناہ نیند ـــــ نتیجہ یہی ہوا کہ وہ نہ جاگی میری پیاس تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ تمہیں کیسے بتاؤں پروین! کہ اسوقت میرے سینے میں کتنے نشتر اترتے جا رہے تھے۔ سوچتی تھی ـــــ میرے ننھیال میں کتنی بدنصیب ہوں شاید مجھے ہی تو میری بی اماں نے اپنے زانو پر سلا سلا کر راتیں آنکھوں میں کاٹی ہیں۔ غالباً میں ہی تو تھی جس کے ذرا سے درد پر بھائی جان ڈاکٹروں کو پریشان کر دیتے تھے ـــــ نہیں وہ نگہت تو مر چکی ـــــ مار ڈالی گئی ـــــ برباد کر دی گئی ـــــ اب تو نگہت یہ ہے کہ بخار کے آتشکدے میں تنہا تڑپ رہی ہے، اور گرچہ باہر زمین کا ہر ایک ذرہ بارش کی لطافتوں سے سیراب ہو رہا ہے۔ لیکن اسے ـــــ اس نگہت کو ـــــ پانی پلانے والا بھی کوئی نہیں۔ میں نے بہت چاہا پروین مگر آنسو نکل ہی آئے اور پھر اسوقت تک تھمے۔ جب تک سینے میں لرزنے کی ذرا سی بھی سکت باقی رہی۔ میں رو چکی تو سکون ہوا آنسوؤں سے بھیگے ہوئے لبوں کو دانتوں میں دبا لیا کیونکہ سسکیاں دم توڑے ڈالتی تھیں اور پھر یکایک میں نے سوچ لیا کہ اب کوئی آواز نہ دونگی ـــــ خواہ یونہی آنسوؤں سے پیاس بجھا بجھا کر مرنا پڑے ـــــ مگر یہ عزم مجھ جیسی حقیر ہستی کی توقوں سے کہیں زیادہ تھا تشنگی بے پناہ ہوتی گئی اور آخرکار مجبور ہو کر میں اپنی دکھتی ہوئی کمر اور لرزتے ہوئے ہاتھ پاؤں کے باوجود آہستہ آہستہ صحن کیطرف بڑھی، بوندوں کے خوف سے میں نے چاہا، کہ ذرا عجلت سے صحن کو عبور کر لوں، لیکن اس ارادے کے ساتھ ہی میرا پاؤں پھسلا اور پروین تمہاری نگہت ـــــ بے یار و مددگار نگہت ـــــ گر پڑی ـــــ یہ معلوم ہوا کہ دنیا ایک دہشت ناک رفتار سے گھوم گئی ہے اور چاروں طرف خوفناک چیخیں بلند ہو رہی ہیں۔

مجھے معلوم نہیں، میں وہاں سے کیسے اٹھی یا اٹھائی گئی ـــــ سر پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ شکر ہے کہ اندازہ ہی ہوتا ہے کہ خادمہ کے ہاتھ سے بندھی ہے ـــــ چاہتی تو ان سے پوچھ لیتی ـــــ لیکن پروین! میں نے نہیں چاہا ـــــ نہ جانے کس خوف سے نہیں چاہا ـــــ آہ میری معذوری!!

یہ جانتی ہوں کہ ان کی یہ بے نیازی ارادی نہیں ـــــ اور اس لئے ـــــ ان کے سامنے خود کو مظلوم کہنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتی وہ یہ محسوس ہی نہیں کر سکتے کہ ان باتوں میں بیگانہ وشی کا اظہار میرے احساسات کس کے احساسات کو مجروح کر سکتا ہے ـــــ اور یہ چیز کا اندازہ ماحول ہے جہاں ان کی فطرت نے پرورش پائی ہے ـــــ آہ! وہ بالکل معصوم ہیں۔

اچھا رخصت! ـــــ اب ان کے آنے کا وقت ہے اور مجھے انکے اہتمام میں لگنا ہے۔ بخار اب بھی ہے اور چوٹ کیوجہ سے سر بری طرح دکھ رہا ہے۔ لیکن اپنی تکلیف کیوجہ سے انکو بے آرام دیکھنا میں برداشت نہیں کر سکتی ـــــ تم اسے حماقت کہتی ہو لیکن میرے دل کی زبان میں اسی حماقت کو پرستش کہتے ہیں ـــــ اور اگر عورت شوہر کی پرستش نہیں کر سکتی تو خدا کی پرستش بھی اس کی قدرت سے بعید ہے

تمہاری جاں بلب بہن
نگہت

غمگسار!

کس قدر طویل مدت کے بعد تمہیں خط لکھنے بیٹھی ہوں ـــــ اُف پورے چھ ماہ! ـــــ تم متفکر ہو گی ـــــ میں پشیمان ہوں ـــــ تم سوچتی ہو گی کہ نگہت فراموش کار ہے۔ لیکن شاید تمہیں معلوم نہیں کہ بعض اوقات جس چیز کو "فراموش کاری" سمجھ لیا جاتا ہے وہ خود فراموشی ہوتی ہے میں نے کوشش کی تھی کہ جسطرح سوسائٹی نے مذہب و فطرت سے بغاوت کر کے میری زندگی کی نوخیز امنگوں کو دیدہ و دانستہ اپنے لغو و مہمل اصولوں پر قربان کر دیا ہے۔ اسی طرح میں بھی "راہ و رسم منزلہا" سے یکسر قطع نظر کر کے انانیت اور خود فراموشی کو اپنا مسالک بنا لوں

اور اس آگ میں چپکے چپکے ہی سلگ سلگ کر راکھ ہو جاؤں لیکن تمہاری غمگساریوں اور لطف پاشیوں کے خلوص نے میرے عزم مستقل کو لغزش دی اور مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ مجھ سے محبت کرنیوالی ہستی کو کھو دینا میرے بس کی بات نہیں

اگر مجھے روتے ہوئے دیکھ کر رونے میں تمہیں کچھ اذیت نہیں ہوتی تو پروین آؤ آج تم بھی خوب خوب رلاؤ، اشک ریزی کی تمام قوتیں جمع کرلو اور میں خون بنا کر آنکھوں سے بہاؤں کیونکہ شاید اسی طرح تمہیں صحیح طور پر اس چیز کا اندازہ ہو سکے گا کہ کتنے کلیجے کا خون ہو جا چکے ہیں۔

آج سے پہلے تم نے مجھے جس رنگ میں دیکھا تھا، وہ اب باقی نہیں رہا۔ میں وہ سب کچھ کر چکی جو ایک شریف لڑکی اپنے شریک حیات کے جذبات و احساسات کی پاسداری کے لئے کر سکتی ہے لیکن جس طرح [illegible] اسی طرح ان کی [illegible] نظر آتی ہے میں تھک گئی ہوں پروین اور میری ساری تعمیری قوتیں بھی بے جان ہو کر مرجھا گئی ہیں —— پھر اب میں نے کیا سوچا ہے؟ ہاں سوچ لیا ہے اور وہ کچھ جو تم نے خواب میں بھی نہ دیکھا ہوگا آؤ تمہیں بتلا دوں وہ چیز بھی جو میں تمہیں نہ بتانا چاہتی تھی۔ تم میرے اس عزم کی مخالفت کرو یا موافقت، مجھے پروا نہیں —— مجھے کسی کی پروا نہیں اب پروین!

رسم و روایت کے زہریلے اثرات سے اپنے دماغ کو ایک لمحے کے لئے آزاد کر لو اور سنو —— صید افگنوں کی جاں ستاں ناوک اندازیوں سے تنگ آکر ایک مجروح شیرنی کیا کیا کرتی ہے —— ایک گربۂ مسکین کو کسی تنگ و تاریک کوٹھری میں بند کر کے ذبح کرنا چاہو تو اس وقت وہ کیا کیا کرتی ہے؟ —— کیا کرنے پر مجبور ہوتی ہے؟ بس سوچ لو یہی عزم آخری میں نے کر لیا ہے۔ اب تک نیایش و پرستاری میں جبین شوق کو خاک بنائے رکھا، اب یہی جھکی ہوئی گردن جذبۂ انتقام کی تمام خودسری کو لئے ہوئے بیدار ہو گئی ہے۔ اب تک انگاروں کی طرح دہکتی رہی، اب شعلوں کی طرح بھڑک

اٹھنا چاہتی ہوں، کبھی تمنا تھی، اور زبردست تمنا کہ انکی حسیات کی تاریکی میں گھر ہو سکے تو چاند کی خنک و سیمیں کرنیں چرا کر جمع کروں انکی ذہنیت میں ایک سبک لچک پیدا کر کے وسیع کر دوں۔ لیکن اب یہ سب کچھ نہیں —— اب میں ہر چیز کو ٹھکرا کر پاش پاش کر دینا چاہتی ہوں —— محبت کی قوتیں شکست پا چکی ہیں —— اب انتقام کی باری ہے —— انتقام! —— انتقام ان سے نہیں —— بلکہ سوسائٹی سے —— اندھی اور ظالم سوسائٹی کے اندھے اور ظالم اصولوں سے! —— تم سراسیمہ کیوں ہوتی ہو پروین —— مجھے مجرم سمجھتی ہوگی تم؟ —— آہ سکھی تمہیں معلوم نہیں کہ اس سوسائٹی کے دیو نے کتنی بے گناہ ہستیوں کو اپنے خونخوار جبڑوں میں مسل ڈالا ہے اور ہنوز اسکی تشنگی کو تسکین نہیں ہوئی۔ سینکڑوں معصوم و بے گناہ لڑکیاں اس خونی چکی میں پوری پوری بیدردی کے ساتھ پسی جا رہی ہیں۔ انکی ہڈیاں چٹ چٹ ... کر کے چور چور ہو رہی ہیں۔ ان کی زندگی کا نوجوان خون فوارے کی طرح بلند ہو رہا ہے۔ اور ان کے اعضا پس پس کر گوشت کے گھناؤنے لوتھڑوں میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ لیکن اس خونی چکی کو چلانے والے قہرمانی ہاتھ پوری قوت کے ساتھ اس خونچکاں شغل میں منہمک ہیں اور اس مہذب دنیا کے مہذب بھیڑیوں میں کوئی اتنی جرأت انسانیت نہیں رکھتا کہ اس قتل عام کیخلاف احتجاجی آواز —— یا محض ایک خوف انگیز چیخ ہی بلند کر دے۔ میں پوچھتی ہوں تہذیب و آزادی کے علمبرداروں سے کہ کیا ان کے تمام بلند بانگ دعاوی میں اس مقتل کا دروازہ بند کرنے کا کوئی پروگرام ہے؟ میں سوال کرنا چاہتی ہوں مذہب و ملت کے رہنماؤں سے کہ کیا ان کے اصولوں میں اس قہرمانیت کے خلاف کوئی قوت کار نہیں؟؟

تم جانتی نہیں پروین! —— ہمارے مہذب سماج [illegible] درجے کی منافقت و خودغرضی کی پرورش کے ذرائع ہیں۔ مرد نے جب کبھی مہذب فطرت کے خلاف کچھ کرنا چاہا ہے تو اسی قسم کے رنگین حجابات کا سہارا ڈھونڈا ہے —— تہذیب نام ہے اس حجاب نفس پروری کا جسمیں ہر غیر فطری اور خود غرضانہ حرکت کو

جوانکا ایاس مل جاتا ہے —— آزادی کا مقصد ہے، اپنے کام ودہن و نفس کے ذرائع تسکین کو مہیا کرنے میں کوئی رکاوٹ پیدا ہونے دینا —— عورت ہمیشہ ان مظالم کے ہاتھوں ستائی گئی مذہب نے اسے آزادی بخشی تو سوسائٹی نے اپنے خود ساختہ اور روائتی اصولو ں کے ذریعہ اسے سلب کر لیا۔ آج ہندوستان کے طول و عرض میں کتنی ایسی لڑکیاں ہیں، جن کی ازدواجی زندگی کی تعمیر میں خود انکی منشا اور رضا کا کوئی دخل ہے؟ —— والدین سماج کے خوف سے مجبور ہو کر صرف حسب و نسب اور دولت و ثروت کے لئے اپنی لاڈلی اولاد کو اس شرمناک قربان گاہ پر بے دریغ ذبح کر رہے ہیں۔ انکی ذہنیت میں یہ چیز ہے ہی نہیں کہ شادی صرف اسیوقت جائز ہو سکتی ہے، جب طرفین میں محبت اور اگر محبت نہیں تو موافقت ضرور ہو۔ اسی چیز سے آگاہ ہونے کیلئے مذہب نے یہ طریقہ بتایا تھا کہ طرفین سے رائے لی جائے لیکن ہماری اندھی سوسائٹی اس کا کبھی خیال بھی نہیں کرتی میں یہ نہیں کہتی پروین کہ شادی سے پہلے طرفین کو کورٹ شپ کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے —— میرا یہ مقصد ہرگز نہیں میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ جن کی شادی ہو ان سے ہی رائے طلب کی جائے اور پھر والدین اپنے وسیع تر تجربہ کی بنا پر اس رائے پہ تنقید و تبصرہ کر کے ایک موافق یا مخالف نتیجہ پر پہنچیں۔ تم ہی کہدو اگر تمہارے دانشمند ماں باپ اس چیز کو مدنظر رکھتے تو کیا پروین تمہاری ازدواجی زندگی اسقدر مسرور کن ہو سکتی تھی؟ —— یہ سب بھی چھوڑو —— کم از کم اتنا ہی خیال رکھا جائے کہ جن لوگوں میں آپس میں نفرت ہو ان کو شادی کے بابرکت رشتے میں منسلک نہ کیا جائے —— مگر آہ یہ سب کچھ کیا تم کو کہہ رہی ہوں —— کیسے جاؤں —— وہاں کون سنتا ہے؟ سوسائٹی کے ہنگاموں میں درد و کراہ کی ان چیخوں کا کوئی گذر نہیں۔ ہم چلاتے چلاتے اپنے پھیپھڑوں کا خون کر دیں تب بھی سوسائٹی کی ظالم دیوی اپنی طرب پسند نظروں کو ادھر نہ اٹھائے گی۔ پروین میری رگ رگ میں جوش و غضب کا التہاب سیماب کیطرح تڑپ رہا ہے۔ اگر مجھ میں قدرت ہوتی تو اس پورے عشرت کدے کو زلزلہ بن کر مسمار کر دیتی کاش کسی طرح کوئی کہدے کہ اے سماج کے خون آشام درندو! —— انسانیت کی شرم کرو ورنہ وہ دن بھی قریب ہے کہ ہم مقتولوں کا خون رنگ لائے گا اور فطرت کا سنگین انتقام تم پر نازل ہوگا۔

خط طویل ہو گیا —— میں نہ جانے کیا کیا لکھ گئی۔ کیا کروں سکھی یہ سیلاب رو کے نہیں رکتا۔ بھیا کو اسی برباد نگہت کا سلام کہدینا! تمہارے جواب کی منتظر ہوں۔

تمہاری دکھیا
نگہت

پیاری پروین!

مکتوب محبت زینت نظر ہوا —— واقعی تم نے خوب خوب دادِ غمگساری دی ہے اس ایک ہفتے میں نہ معلوم کتنی بار اسے پڑھ چکی ہوں صرف اس لئے کہ رونے کا اور کوئی ذریعہ میسر نہ تھا۔ تم متعجب ہوگی کہ یہ کیا لکھ رہی ہوں —— مگر تم تعجب نہ کرو سکھی پہلے مجھے انکی حرکتیں دیکھ دیکھ کر صدمہ ہوتا تھا لیکن میری ذہنیت کے ساتھ ساتھ جس کا تذکرہ پہلے خط میں کر چکی ہوں، یہ چیز بھی باقی نہیں رہی اب انکی باتیں دیکھتی ہوں اور نفرت و حقارت سے ہنستی ہوں۔ جتنا ہنستی ہوں اتنی ہی یہ نفرت بڑھتی جاتی ہے —— پھر مزہ یہ ہے کہ وہ اس نفرت کو بھی محسوس نہیں کرتے۔ اس ہنسنے کو رونا سمجھ لو یا کچھ اور —— بہرحال اب تو ہنسنا ہے، اور اسی قسم کا —— تم میرے ساتھ بہت کچھ رو چکی ہو —— آؤ اب میرے ساتھ کچھ ہنس بھی لو۔

رات وہ کوئی دس بجے مکان آئے۔ میں حسب معمول کتاب پڑھ رہی تھی دروازے میں قدم رکھنے کے بعد اولیں کام انہوں نے یہ کیا کہ کرتہ اتار ڈالا۔ اور دوسرا یہ کہ —— "کھانا دیدو بھئی!"

میں کتاب پڑھتی رہی۔ ملازمہ نے کھانا ان کے سامنے رکھدیا انہوں نے بلا پس و پیش تن تنہا اپنے کام و دہن کی خاطرداری شروع کر دی اور کوئی نصف گھنٹے بعد پورے دسترخوان میں خیر واسطے اللہ اور اللہ کے رسول کا نام چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے ——

—— پھر بیٹھ گئے اور پانی پی کر ایک بلند بانگ ڈکار لی۔ میں سب کچھ کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی —— اب انہوں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ کبھی باورچی خانہ کی طرف تو کبھی الماریوں کیطرف کچھ دیر سوچا اور پھر ذرا مطمئن انداز میں، شاد ہوا، نہ معلوم کس سے کہ

"ارے بھئی —— وہ پرانا گڑ کہاں ہے؟"

میں نے کہا —— "گڑ کیا ہوگا اس موسم میں؟"

انہوں نے فی البدیہہ فرمایا —— "ذرا منہ میٹھا کرنا تھا۔"

ملازمہ نے منہ میٹھا کرایا۔ منہ چلاتے ہوئے میری طرف آئے "رکھو کیا پڑھ رہی ہو جی تم؟ —— دیکھیں تو۔"

میں نے کتاب ان کے ہاتھوں پر ڈالدی۔ دیکھتے ہی بولے "ارے بھئی! یہ تو انگریزی کی کتاب ہے۔ ہماری سمجھ میں کیا خاک آئے گی —— میں نے فوراً پوچھا "اچھا اردو کی کسی کتاب کا نام بتایئے جو آپ کی سمجھ میں آگئی ہو۔"

وہ مفکرانہ انداز میں اپنا سر کھجاتے ہوئے بولے "الف لیلیٰ" یہ کہا —— اور پھر میری کتاب دیکھ کر بولے —— "ہاں یہ کونسی کتاب ہے بھئی —— نام کیا ہے؟ کس شعبہ علم کی بات بتاتی ہے اور . . . ."

میں نے کہا —— "توبہ! ذرا ٹھہر ٹھہر کر سوالات کیجیے۔ آپ نے تو مشین گن کیطرح سوالوں کی بوچھار کر دی —— سنیئے —— اس کا نام ہے عورت اور ایک امریکی مصنف کی تصنیف ہے۔"

انہوں نے ذرا سنجیدہ منہ بنا کر کہا "اس میں کیا لکھا ہے؟"

میں نے فوراً انگریزی میں کہدیا "marriage in order to be valid must be based on love"

انہوں نے کہا "جی اردو میں —— اردو میں؟"

میں بولی —— "شادی کی صحت و جواز کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ محبت پر مبنی ہو"

یہ سن کر وہ چپ سے ہو رہے پاندان کے پاس گئے اور پان بناتے ہوئے ذرا بصیرت افروز انداز میں فرمایا۔

"تم انگریزی کی کتابیں نہ پڑھا کرو، ورنہ خیالات خراب ہو جائیں گے"

میں نے کہا "خیالات خراب ہو جائیں گے یعنی ابھی تک میرے خیالات خراب نہیں ہوئے۔ پھر جب اتنی مدت تک انگریزی کی کتابوں نے صحت خیالات کو نقصان نہیں پہنچایا، تو آئندہ کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟"

انہوں نے کچھ جواب نہ دیا، صرف یہ کہکر رہ گئے "منطق میں نے پڑھی نہیں"

میں نے پوچھا "جو آپ نے پڑھا کیا ہے؟"

ذرا تنک کر بولے "پڑھتے کیا —— یہی اردو فارسی پڑھی ہے"

میں زور سے ہنس پڑی۔ نفرت کے پورے جذبات کیساتھ۔ مگر وہ سمجھے کہ انکی لطافت مزاح کی داد دے رہی ہوں —— انکی زندگی کا یہ پہلو تم نے نہ دیکھا ہوگا اب تک —— میں نے بھی اس کو آج سے پہلے اس زاویہ نظر سے نہ دیکھا تھا۔ پہلے میں ان چیزوں کو دیکھ کر اپنا خون جلتا ہوا محسوس کرتی تھی اور روتی تھی —— اب ان چیزوں کو اپنے جذبۂ نفرت و استکراہ کا کھلونہ سمجھتی ہوں اور ہنستی ہوں۔ یہ بھی میرے انتقام کا ایک پہلو کیا اچھا ہو کہ تم کچھ دنوں کو میرے پاس آجاؤ اور حماقت و نفرت کے اس تصادم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر میرے ساتھ ساتھ سماج کے زعم معاملہ اندیشی کا مضحکہ اڑاؤ۔

تمہاری دوست —— "نگہت"

جناب ناہور سامری

بے نیازی

جبتک میں تھا حقیقتِ دنیا سے بیخبر
آشفتہ اُسکے عشق میں برسوں رہا کیا!

وہ اپنی کبر و ناز میں مجھ سے کھنچی رہی
میں اس کی آرزو میں ہمیشہ گھلا کیا

اک مرتبہ بھی آہ، مگر پا سکا نہ بار
گو سجدہ نیاز میں برسوں جھکا کیا

اب جب کہ اصل روپ میں وہ آگئی نظر
اب جب کہ بے نیازِ محبت ہوا ہوں میں

پھرتی ہے التفات کا ارماں لئے ہوئے
حالانکہ دل سے محو اُسے کر چکا ہوں میں

لیکن نہ آؤنگا کبھی اس کے فریب میں
رازِ طلسم ہوش رُبا پا گیا ہوں میں

جناب لطافت مشہدی

عزمِ بلند

اُجڑے ہوئے وطن کو بسانے لگا ہوں میں
ہر غنچہ آرزو کا کھلانے لگا ہوں میں

رگ رگ میں جس سے روحِ شجاعت ہو بیقرار
وہ گیت خاص لے میں سنانے لگا ہوں میں

جامِ مئے حیات کی شیرینیوں سے پھر
ہندوستاں کی پیاس بجھانے لگا ہوں میں

کہدو یہ اہلِ دہر سے فرصت نہیں مجھے
اک مشورے کو عرش پہ جانے لگا ہوں میں

لیکر جلو میں کیفِ جوانی کے کارواں
اے ہند! تیری بزم پہ چھانے لگا ہوں میں

ہر لے میں جسکی رازِ مسرت ہو مضطرب
اس بانسری کو منہ سے لگانے لگا ہوں میں

ہندوستان فخر کرے جس پہ عمر بھر
وہ گیت جھوم جھوم کے گانے لگا ہوں میں

جناب حق نواز اختر

آمرِ پولینڈ

کامریڈ جوزف پلوڈسکی

پولینڈ کا یہ نجات دہندہ بمقام زولو ضلع سوانسکی میں ۵ دسمبر ۱۸۶۷ء کو کتم عدم سے عالم وجود میں آیا۔ اسکا خاندان اپنی نجابت و شرافت کیوجہ سے علاقہ بھر میں مشہور و معروف تھا۔ وہ کسی زمانہ میں خوب متمول تھا۔ لیکن پلوڈسکی کی پیدائش کیوقت اسکی مالی حالت نہایت دگرگوں ہو رہی تھی، کیونکہ خاندان کے چند افراد ۱۸۶۳ء کی بغاوت میں حصہ لینے کیوجہ سے حکومت کی نظروں میں موردِ الزام ہوکر طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کر رہے تھے۔ چنانچہ پلوڈسکی کا والد اس کی پیدائش سے پہلے اپنی آبائی جاگیر کو خیرباد کہہ چکا تھا۔ اور ولنیو میں اقامت پذیر تھا۔

کہا جاتا ہے کہ بڑے آدمیوں کی مائیں بھی بڑی ہوتی ہیں چنانچہ پلوڈسکی کی شخصیت میں اسکی ماں کی تربیت کو بہت حد تک دخل حاصل ہے۔ اس کا اولیں استاد اس کی والدہ ہے جس نے اس کے دل میں جذبہ حب الوطنی کوٹ کوٹ کر بھر دیا۔ اور پولینڈ کی تاریخ اور مشہور محب الوطن شاعر کیزنسکی کا کلام گھر پر ہی اسے پڑھایا۔ پلوڈسکی کو اسوقت کے مشہور محب الوطن شاعر سلوکی کے شاگرد ہونے کا بھی فخر حاصل ہے۔

جب اس کو اسکول میں داخل کیا گیا تو اس نے چند ہی دنوں میں معلوم کر لیا کہ تاریخ پولینڈ کے واقعات کو بہت غلط لکھ کر دیا گیا ہے اور حقیقت پر بری طرح پردہ ڈالا گیا ہے۔ یہ دل ہی دل میں کڑھتا اور سوچتا کہ پولینڈ کے لوگ فرانس کی طرح بغاوت کیوں نہیں کر دیتے؟

اسکی حریت پسند طبیعت اسکو زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکی۔ چنانچہ جب وہ ۱۸۸۵ء میں یونیورسٹی میں داخل ہوا تو تعطیلات کے دوران میں گھر واپس آ نے پر اس نے ایک پمفلٹ گورنمنٹ کے برخلاف شائع کیا۔ جس کی وجہ سے ارباب یونیورسٹی نے اسے یونیورسٹی سے نکال دیا۔ ان ہی ایام میں اس نے چند انقلابی کتب کا مطالعہ کیا۔ ان کتابوں کے مطالعہ نے اس کے خیالات میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا کر دی۔ اور اس کا رجحان انقلابی تحریکات کیطرف بہت زیادہ ہو گیا۔ چنانچہ اس نے ولنو کے مزدوروں سے تعلقات بڑھانے شروع کر دیئے۔ ۱۸۸۷ء میں پلوڈسکی اور اس کے بھائی کو سینٹ پیٹرزبرگ میں رسوم پر قاتلانہ حملہ کرنے کے الزام میں ماخوذ کر لیا گیا۔ ازاں بعد اس جرم کی پاداش میں پانچسال کے لئے سائبیریا میں جلاوطن کر دیا گیا۔ سائبیریا کو جانے کا قافلہ تیرہ نفوس پر مشتمل تھا جن میں تین عورتیں بھی شامل تھیں۔ پہلے انکو ارکنسک کے زندان میں محبوس رکھا گیا۔ یہاں ان کے ساتھ جیل کے افسروں کا سلوک نہایت برا تھا۔ چنانچہ ایک دن "تنگ آمد بجنگ آمد" کے مصداق انکے ایک قیدی ساتھی نے جیل کے ایک ملازم کی تھوڑی سی مرمت بھی کر دی۔ اس واقعہ کو مسلح بغاوت قرار دیا گیا۔ اور پلوڈسکی کو اس کا سرغنہ سمجھا گیا۔ جسکی پاداش میں اسکو ایک سال کی مزید صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔

اس قید کے دوران میں اس نے ہربرٹ سپنسر اور کارل مارکس کی تصانیف کا مطالعہ کیا۔ اسکے دل و دماغ میں سوشلزم کے خیالات بس چکے تھے۔ اور چھ سال کے بعد جب اسکو زندان سے رہائی نصیب ہوئی، تو ونو میں ۱۸۹۳ء، سوشلسٹوں کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی، جس کے اجلاس میں یہ قرارداد پاس ہوئی کہ پارٹی

...ن شائع ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اس قرارداد کے مطابق ماہ جولائی ...ء کو جماعت کا پرچہ مزدور "Robotnik" کا پہلا پرچہ شائع ... اسکی اشاعت اور تقسیم کرنے کا تمام بوجھ پلوڈسکی کے کندھوں پر تھا اور اس مقصد کے لئے اسکو تمام روس اور پولینڈ کا دورہ کرنا پڑتا تھا۔

۱۸۹۳ء سے لے کر ۱۹۱۰ء تک کے واقعات۔ ۱۸۹۵ء میں اخبار B[illegible] بھی نکالا گیا۔ جو مزدور طبقہ میں نہایت مقبول ہوا۔ اس اخبار کے پرزور مقالات نے مردہ قوم میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی۔ اور روز بروز سوشلزم عوام میں ہردلعزیز ہونے لگا۔ چنانچہ پولش سوشلسٹ پارٹی نے ۱۸۹۹ء میں ۳۰۰۰۰ ہزار خلاف قانون پمفلٹ شائع کئے اور ملک کے لوگوں تک پہنچائے۔ ہرچند زار کے جاسوس جابجا موجود تھے۔ اور سرحدوں پر خاص طور پر کڑی نگرانی تھی لیکن پرچہ بدستور شائع ہو کر تقسیم ہو رہا تھا لیکن ۱۹۰۰ء میں پولیس پریس کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گئی۔ اور اسی دن دوسرے کے مقام پر نیا پریس قائم کر دیا گیا۔ اور پرچہ حسب سابق شائع ہونے لگا۔

اس سلسلہ میں ایک مزے کی حکایت بیان کی جاتی ہے۔ جب پریس پر پولیس نے قبضہ کر لیا۔ تو ایک افسر نے طنزاً کہا۔ کہ اب سوشلسٹ پرچہ شائع نہیں کر سکتے۔ تو پلوڈسکی نے مسکرا کر جواب دیا "کہ پرچہ چھپ رہا ہے اور ابھی ابھی پریس سے آیا چاہتا ہے"۔ چنانچہ اسکا قول سو فیصدی درست ثابت ہوا۔ کیونکہ ...ی نام پرچہ شائع ہو گیا۔ لیکن اب ان حالات کے تحت میں پرچہ ممبران تک پہنچانا آسان کام نہ تھا۔ اس لئے اس دقت کو مدنظر رکھتے ہوئے سرائیں مقرر کی گئیں۔ جہاں جماعت کے ارکین جمع ہوتے تھے۔ اور پرچہ ان تک پہنچایا جاتا تھا۔

اپریل ۱۹۰۰ء میں پلوڈسکی کو "ہم سوشلسٹ کیا چاہتے ہیں" پمفلٹ کی اشاعت پر وارسا کے قلعہ میں محبوس کر دیا گیا۔ اس قید نے اسکو سائبیریا کی یاد دلا دی۔

وارسا کے قلعہ سے فراری:- یہاں اس کی نہایت کڑی نگرانی کی جاتی تھی اگرچہ رشتہ داروں کو ملاقات کی اجازت تھی۔ لیکن جیل کے افسر ہر وقت موجود رہتے تھے۔ اس لئے کوئی خفیہ پیغامات پہنچانا ناممکن تھا۔

لیکن کچھ عرصہ کے بعد ایک نیا سیاسی قیدیوں کے محافظ دستہ کا افسر مقرر ہو کر آیا۔ یہ شخص نہایت رحمدل اور سادہ لوح تھا۔ اسکے دل میں سیاسی قیدیوں کے لئے خاص ہمدردی تھی۔ اسلئے اس کے ذریعہ خفیہ طور پر نامہ و پیام ہونے لگے۔

بالآخر یہ تجویز سوچی گئی۔ کہ پلوڈسکی کسی ایسی بیماری کا بہانہ کر لے جسکا علاج یہاں نہ ہو سکتا ہو۔ تاکہ حکام کو مجبوراً اسے یہاں سے تبدیل کرنا پڑے۔ بڑے غور و خوض کے بعد جنون اور دیوانگی کا بہانہ تراشا گیا۔ اس کے بعد ایک سائبیرین ڈاکٹر کو گانٹھا اور قرار پایا کہ ڈاکٹر مریض کا طبی معائنہ کرتے ہوئے عمداً دیا سلائی کی ڈبیہ قیدی کے کمرہ میں چھوڑ دے۔ تاکہ اس طریق سے مریض کو تمام سازش کے نشیب و فراز سے خبردار کر دیا جائے۔ چنانچہ مذکورہ مریض کیلئے پیٹرز برگ بھیجنے کے احکام نافذ ہو گئے۔ جس گاڑی سے پلوڈسکی پیٹرز برگ جا رہا تھا۔ اسی گاڑی پر اس کے رفیق بھی سفر کر رہے تھے۔ تاکہ کسی نوع اپنے ساتھی کو رہا کرا سکیں۔ ...ڈسکی نے جو کہ پیٹرز برگ میں میڈیکل یونیورسٹی کا طالب علم ہونے کے علاوہ پولش سوشلسٹ پارٹی کا ممبر بھی تھا۔ پلوڈسکی کی رہائی کا بیڑا اٹھایا۔ خوش قسمتی سے اپریل ۱۹۰۱ء میں سینٹ نکولس ہسپتال کا ہاؤس سرجن مقرر ہوا۔ پلوڈسکی کو ایک پولش ڈاکٹر کی وساطت سے اس تمام تجویز سے مطلع کر دیا گیا۔

یکم مئی ۱۹۰۱ء کو جبکہ ہسپتال کا افسر انچارج غیر حاضر تھا اور سٹاف کے دیگر ارکان قریب ہی ایک میلہ دیکھنے گئے ہوئے تھے ...ڈسکی نے اسکو زریں موقعہ خیال کیا۔ اور مریض کو معائنہ کی غرض سے طلب کیا۔ پلوڈسکی کو بھیس بدلنے کے لئے کپڑے مہیا کئے گئے تھے۔ ایک گھنٹہ کے بعد پاگل خانہ سے دو شخص باہر نکلے جن میں ایک پلوڈسکی تھا جس نے ایک روسی کسٹم آفیسر کا بھیس بدلا ہوا تھا۔ یہاں سے وہ فوراً کیو کیطرف روانہ ہو گیا اور اخبار

'Robotnik' کے دفتر میں شب باش ہوا۔ اور چند ماہ کے بعد لندن چلا گیا۔ وہاں اس نے پی، پی، ایس کے ہیڈکوارٹر کی تاسیس رکھی۔

فروری ۱۹۰۴ء میں روس کو جاپان سے برسرپیکار ہونا پڑا سوشلسٹوں کے لئے یہ موقع تھا کہ وہ اپنے آپ کو منظم کرلیں چنانچہ پولیسہ سوشلسٹ پارٹی کے اراکین کی تعداد ۴۵۰۰ تک پہنچ گئی، اگرچہ آزادی حاصل کرنے کا بھی بہترین موقع تھا لیکن ناتجربہ کاری اور عدم تنظیم و نسق میں یہ قدم نہ اٹھایا گیا۔ اس وقت مارشل پلوڈسکی ریگا میں مقیم تھا۔ شہنشاہ روس نے اہل پولینڈ سے مدد کے لئے ایک اپیل شائع کی۔ جونہی یہ اپیل پلوڈسکی کی نظروں سے گزری، اس نے اسکی مخالفت پر کمر ہمت باندھ لی۔ اس نے اہل ملک سے وطن کے نام پر درخواست کی کہ وہ لڑائی میں قطعاً کوئی حصہ نہ لیں۔ اس مقصد کے لئے اسے پیٹرزبرگ بھی جانا پڑا تاکہ رائے عامہ میں اس جنگ کے برخلاف جذبات پیدا کرسکے وارسا اور پیٹرزبرگ میں بچہ بچہ پلوڈسکی سے واقف تھا مزید برآں پولیس نے ہر تھانہ اور شہر میں اس کے فوٹو بھیجدیے تھے تاکہ گرفتاری میں آسانی ہو لیکن اس کے باوجود وہ وارسا ہی میں مقیم رہا۔

بغاوت وارسا۔ اتوار کے دن نومبر ۱۹۰۴ء کو مزدوروں اور طالب علموں کا ایک بہت بڑا جلوس مرکز شہر سے نکلا جن کے ہاتھوں میں بڑے بڑے جلی حروف میں لکھے ہوئے قطعات تھے، "ہم زار کے سپاہی نہیں بننا چاہتے" اور جب پولیس نے ان کو روکنا چاہا۔ تو انہوں نے گولیوں سے اس کا جواب دیا۔ یہ پہلی مکمل بغاوت تھی، جو ۱۸۶۳ء کے بعد وقوع پذیر ہوئی اس میں گیارہ آدمی ہلاک اور ۴۰ اشخاص زخمی ہوئے تھے ادھر جب ۲۲ جنوری ۱۹۰۵ء کو مزدوروں کا ایک جلوس اپنی شکایات لیکر زار کے سرمائی محل کیطرف بڑھا تو اس پر گولی چلائی گئی۔
۱۹۰۴ء میں پلوڈسکی ٹوکیو پہنچا تاکہ روس کے برخلاف پولینڈ کے لوگوں کی ایک فوج طیار کرنے میں جاپان سے صلاح و مشورہ لے۔ اور امداد طلب کرے۔ اگرچہ اس کو اس مقصد میں نمایاں کامیابی نہ ہوئی لیکن اس جنگ کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ سوشلسٹوں کی تعداد ۴ ہزار سے چالیس ہزار تک پہنچ گئی۔ اور عوام میں جذبۂ حب الوطنی اور عام سیاسی بیداری پیدا ہوگئی، ان دنوں پلوڈسکی نپولین کی زندگی کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ انہی دنوں اس نے یہ تحریک شروع کی کہ تمام ملک کو فوجی تربیت دیجائے۔ اور اس کام میں پولش رنگیل جماعت نے اسکی امداد کی چنانچہ گلیشیا کے مقام پر فوجی سکول بھی قائم کیا گیا سال ۱۹۰۸ء کے بعد وہ کراکو میں چلا گیا اور وہاں پرانے شعرا کے کلام کا نہایت ذوق و شوق سے مطالعہ کرنے لگا۔ جیسے ہی جنگ عظیم کے شعلوں نے یورپ کے خرمن امن کو جلا کر راکھ کردیا۔ پلوڈسکی بھی دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ اس آگ میں کود پڑا۔ اس نے جرمنی کا حلیف بنکر روس کے خلاف ہتھیار اٹھائیے۔ لیکن بعد میں اسے جرمنی اور آسٹریا سے بھی برسرپیکار ہونا پڑا پولینڈ کے لیڈروں کی اکثریت اس بات کی خواہاں تھی۔ کہ پلوڈسکی کی فوج کی کمان آسٹرین کمانڈر کے ہاتھ سونپ دیجائے۔ اور جرمنی کے بادشاہ کو کمانڈر انچیف تسلیم کرلیا جائے۔ جنرل وان بسیلر نے اس کو تسلیم کرلیا۔ لیکن پلوڈسکی نے قطعی انکار کردیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو وسیل اور اس کے بعد مگڈبرگ کے قلعہ میں قید کردیا گیا۔ وہ ۱۹۱۷ء سے اگست ۱۹۱۸ء تک یہاں مقید رہا۔

دسمبر کا مہینہ تھا۔ کہ ایک دن دو جرمن افسر اس کے کمرہ میں داخل ہوئے اور اس کو رہائی کا مژدہ سنایا۔ نیز یہ بھی کہا۔ کہ شہر میں بغاوت ہوگئی ہے اور اس کے لئے یہی بہتر ہوگا۔ کہ وہ سیدھا برلن کا رخ کرلے۔ قید کے دوران میں پلوڈسکی نے اپنی سوانح حیات تحریر کی تھی، جسے وہ قلعہ میں بھول آیا تھا۔ لیکن، گر اس کا دوست جنرل سوسنکی غلطی سے اپنے کاغذات میں اس کو نہ لاتا، تو بہت ممکن تھا کہ دنیا ان واقعات سے روشناس نہ ہوتی، جب پلوڈسکی جرمنی سے پولینڈ میں آیا۔ تو اسوقت جرمنی، ہنگری۔ آسٹریا کی نگاہیں پولینڈ پر لگی ہوئی تھیں۔ کونسل آف ریجنسی ملک کا بندوبست کرنے سے یکسر قاصر تھی۔ پولینڈ کی سیاسیات میں پلوڈسکی کی اہم شخصیت

کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور اب وہ کسی جماعت کا نمائندہ نہ تھا بلکہ تمام ملک کا لیڈر اور لوگوں کی آنکھوں کا تارا۔ ...ن پولینڈ کی آزادی کا بہترین محافظ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ملک کی باگ ڈور اس کو سونپ دی گئی۔ اس کے پیش نظر دو اہم کام تھے ... ملک کی سرحدیں قائم کرنا۔ ثانیاً اندرون ملک میں مکمل امن و امان قائم رکھنا۔

ملک کی سرحدوں پر بندوبست کے لئے سپاہ کی ضرورت تھی۔ اس موقعہ پر بھی اس کے ان رفیقوں نے جنہوں نے سائبیریا کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں اور میدان جنگ میں ساتھ دیا تھا، اس کے کام آئے۔ اور حق رفاقت ادا کیا۔ اندرون ملک کے بندوبست کے لئے نیشنل کونسل کی بنیاد رکھی اور ملک کے تمام نمائندوں نے متفقہ طور پر پلوڈسکی کو ملک کا ڈکٹیٹر تسلیم کر لیا۔

جنگ روس و پولینڈ:۔ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۱ء تک کی زندگی خالص طور پر مشکلات سے بھرپور تھی۔ کیونکہ اس کی تمام تر توجہ جنگ کے معاملات کی طرف مبذول تھی، کیونکہ اسے یقین کامل تھا کہ ملک کی نوزائیدہ پارلیمنٹ کو ملکی معاملات کے سلجھانے کے لئے ایک عمر درکار ہے۔ ان دنوں یورپ کی ہر ایک سلطنت کو ہر لحظہ انقلاب کا خدشہ تھا۔ لیکن پلوڈسکی نے ملک کی حفاظت کے لئے سرحدوں کو خوب مضبوط کر لیا تھا۔ اور انکی کڑی نگرانی کی جاتی تھی بالشویکوں کو پے در پے شکستیں دے کر ان کے حوصلے پست کر دیئے تھے جہاں وہ اپنی فوج سمیت گزرتا۔ فتح و کامرانی اس کے قدم چومتی۔ مارچ ۱۹۲۱ء میں اس جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ اب پولینڈ ایک آزاد ملک تھا۔ اگرچہ ۱۹۲۲ء کے انتخابات میں ڈیموکریٹک پارٹی کا زور تھا۔ لیکن وہ ایک سال سے زیادہ نہ قائم رہ سکی۔

۱۹۲۳ء میں پلوڈسکی پبلک لائف سے دستبردار ہو کر سلوجیک (وارسا) کے مقام پر قیام پذیر ہوا۔

حکومت پر قبضہ:۔ تین سال کی مسلسل غیر حاضری کی وجہ سے ملک کی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی تھی لوگوں کی ایک بہت بڑی جماعت اس بات کی حامی تھی کہ ملک کی باگ ڈور پلوڈسکی ہی سنبھالے چنانچہ مئی ۱۹۲۶ء میں سشرلا کے مقام پر پلوڈسکی کی فوج اور حکومت کی فوجوں کے مابین لڑائی ہوئی۔ لیکن حکومت کی فوجوں کو شکست فاش ہوئی۔

۱۲ مئی کو بعد دوپہر دارالسلطنت پر مارشل پلوڈسکی کا قبضہ ہو گیا دوسرے دن پروفیسر Mascicki صدر جمہوریہ پولینڈ منتخب ہوا اور پلوڈسکی ڈکٹیٹر مقرر ہو گیا۔

جناب طالب انصاری صاحب

غزل

ان مست نگاہوں کا اثر دیکھ رہا ہوں
یہ ہوش نہیں ہے میں کدھر دیکھ رہا ہوں

جب حسن کی پابندِ بیتاب نظر تھی
اب حسن کو پابندِ نظر دیکھ رہا ہوں

آتے ہیں نظر تیرے خط و خال کے جلوے
میں آئینۂ شمس و قمر دیکھ رہا ہوں

آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے آنسوئے خوں سے
آلودہ خوناب جگر دیکھ رہا ہوں

فرقت میں تری دل کے تڑپنے کا تماشا
دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں

پھرتے ہیں تصور میں وہ اس ناز و ادا سے
جیسے میں انہیں پیشِ نظر دیکھ رہا ہوں

بیچین ہوں بیتاب ہوں بیخواب ہوں طالب
تکمیلِ محبت کا اثر دیکھ رہا ہوں

جناب میاں عبدالحی ایم اے

ہماری زبان اُردو

روز ازل ہی سے قدرتی طور پر ہر ایک زبان اور ادب کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ اس لئے اگر ہم کسی زبان کے حالات پر غور کریں تو اس ضمن میں لازمی طور پر اس زبان کے ادب کا بھی ذکر آجائے گا۔ بہرنوع اپنی مادری زبان (اردو) کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کرنے سے قبل یہ معلوم کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ کہ اس دنیا میں مختلف زبانوں کا وجود کیونکر عمل میں آیا۔ اس سلسلہ میں ہمارے پاس کوئی تاریخی ثبوت تو موجود نہیں۔ کیونکہ بظاہر ہر ایک شخص یہی کہے گا۔ کہ نبی نوع انسان کے عالم وجود میں آنے کے ساتھ اس کے ذریعہ گفتگو کے لئے زبان بھی پیدا ہوگئی۔ یہ سچ ہے لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر حضرۃ آدمؑ کی تخلیق کے ساتھ اس دنیا میں صرف ایک زبان وضع ہوئی، تو پھر اولاد آدمؑ میں اسقدر بے شمار زبانیں کیوں رائج ہوگئیں۔ جب کہ انسانی فطرت و عادت ابھی بدستور ویسی ہے؟

ایسے مواقع پر علم نفسیات کے ماہر ہماری مشکل کشائی کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے۔ کہ دراصل پہلے پہل کوئی زبان بھی رائج نہ تھی مثل مشہور ہے۔ کہ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے"۔ چنانچہ جب اولاد آدمؑ کو آپس میں بات چیت اور اظہار خیال وغیرہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، تو انہوں نے مختلف اشیاء کی اصوات کے مطابق پھر مختلف چیزوں کی بابت اپنے گمان کے موافق انواع و اقسام کے نام و مقام وغیرہ وضع کرنے شروع کر دیئے۔ مثلاً بادل کا گرجنا ہوا کا سرسرانا۔ شیر کا چنگھاڑنا۔ کتے کا بھونکنا۔ کوے کا کائیں کائیں کرنا۔ سب اسی قسم کے الفاظ متعدد آوازوں کی نقل کے نتیجہ پر انسانی زبان میں منتقل ہو کر اب ہماری گفتگو کا ایک اہم جزو بن گئے ہیں اس سلسلہ میں کسی مفکر کا نظریہ معلوم کرنا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ کہ حضرت آدمؑ کے ظہور سے لیکر بہت کافی عرصہ تک صرف ایک ہی زبان یا بولی رائج تھی۔ سالہا سال گزر..... گئے۔ مگر دنیا کی زبان ایک ہی رہی۔ یہ خیال رہے کہ یہ واقعات قبل از تاریخ کے ایام سے منسوب ہیں اور ایک طویل عرصہ میں حضرۃ انسان نے کمال درجہ کی ترقی حاصل کر لی تھی۔ یہاں تک کہ بعض آثار قدیمہ کو دیکھکر موجودہ علوم و فنون کے ماہر بھی انگشت بدنداں ہو جاتے ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے۔ کہ کہنے کو تو عصر حاضر بہت ترقی کر چکا ہے لیکن فی الحقیقت زمانہ ابھی اس گزشتہ ترقی کی گرد تک کو بھی نہیں پہنچا۔ جو آج سے کروڑوں سال قبل حضرۃ..... انسان کو حاصل تھی۔ اگر یقین نہ آئے تو غور کیجئے کہ جب شہر بس کر اجڑ جاتے ہیں تو کیا اسی طرح کسی ملک یا زمانہ کی تہذیب و تمدن بن کر بگڑ نہیں سکتی؟ ـــــ "ہر کمالے را زوالے" دنیا کا ایک مسلمہ اصول ہے پس ہماری موجودہ دنیا نے بھی اچھی طرح بگڑ اور زوال پذیر ہو چکنے کے بعد اس گزشتہ عروج کے مقابلے میں ابھی بہت کم ترقی کی ہے یا بالفاظ دیگر بمشکل تمام ابھی "سنبھالا" لیا ہے۔

اس گزشتہ زمانہ میں ترقی و تمدن کا اصل گہوارہ ملک عراق تھا۔ جسکا دارالخلافہ ان دنوں بابل تھا۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا: ادھر تو "انسانیت" عالم شباب میں تھی۔ اور ادھر بابل میں انسانی تہذیب و تمدن کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ اہل بابل کو اپنی ...... عقل و فراست پر بیحد ناز تھا۔ انہوں نے اپنی لیاقت و قابلیت کے زور پر بعض ایسی عجیب و غریب اشیاء بنائیں۔ جو آج لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتیں۔ انکی اور باقی سب چیزوں کو جانے دیجئے۔ ان کے معلق باغات ایک ایسی اختراع تھی جس کا ثانی آجتک نہیں ہوا!

بالآخر جب اہل بابل اپنے تمام کمالات دکھا چکے اور گرد و نواح کے تمام ممالک و قبائل پر ان کا سکہ بیٹھ گیا، تو ان کو خیال گزرا کہ اب روئے زمین پر کوئی ایسا خشکی کا ٹکڑا نہیں ہے۔ جسے وہ تسخیر کر سکیں۔ البتہ اب صرف نیلے آسمان کی ہی ایک ایسی مملکت باقی رہ گئی ہے۔ جو ہنوز ہمارے ہاتھوں میں نہیں آئی۔ پس انہوں نے یہ ارادہ کر لیا کہ وہ بہ جلد آسمان کو فتح کر کے چھوڑیں گے مگر پھر ان کو یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ اب اسقدر بلندی پر کیونکر پہنچیں؟ بالآخر یہ تجویز ہوئی کہ ایک عظیم الشان اور بلند ترین مینار تعمیر کیا جائے جس کی چوٹی آسمان سے جا ملے تاکہ اس کے ذریعے وہ آسمان کو فتح کر سکیں۔

عرضکہ اس قسم کے مینار کی تعمیر آخر کار شروع ہو گئی اور ہزاروں اور لاکھوں معمار و مزدور کام پر لگا دیئے گئے کئی دن بیتے۔ مہینے اور سال گزر گئے۔ اور اتنے عرصہ میں معماروں اور مزدوروں نے مینار کی تعمیر کا کام بدستور جاری رکھا۔ اور بناتے بناتے اسے کافی بلندی پر لے گئے۔ یہاں تک کہ نیچے زمین پر کھڑے ہو کر مینار کی طرف منہ اٹھا کر دیکھنے والے کو اپنی پگڑی اور ٹوپی سنبھال کر دیکھنا پڑتا تھا۔ مینار تھا کہ خدا کی پناہ! اینٹوں پر اینٹیں لگتی چلی جا رہی تھیں مگر ہنوز مینار آسمان تک نہ پہنچ سکا تھا۔ اور پہنچتا بھی کیونکر جب خدا کو یہ منظور ہی نہ تھا؟

اب ادھر دیکھئے۔ کہ چونکہ خدا کو ان کا یہ ارادہ پسند نہ تھا۔ پس ابھی وہ لوگ اس کی تکمیل کی امید میں ہمہ تن مصروف تعمیر ہی تھے کہ خدا نے ان تمام لوگوں کی زبان اور بولی ہی بدل دی یعنی ان کو ایک دوسرے کی بات ہی سمجھ سکنے کے ناقابل بنا دیا مثلاً معمار اگر چونا مانگتے تھے تو مزدور اینٹیں پکڑاتے تھے۔ اگر ایک شخص پانی مانگتا تھا، تو دوسرا اینٹ دیتا تھا۔ الغرض اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ۔ اب ایسی صورت حالات میں بھلا مینار کی تعمیر کیونکر پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتی تھی مجبوراً تعمیر کا کام چھوڑنا پڑا۔

اگرچہ یہ روایت ایک افسانہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تاہم اس میں حقیقت و واقعیت کی جھلک ضرور دکھائی دیتی ہے۔ بہت ممکن ہے۔ کہ مینار بابل کی تعمیر سے قبل تمام دنیا کی ایک ہی زبان ہو۔ اور پھر اس عجیب و غریب مینار کی تعمیر کے وقت اس کے صناعین کی زبان کے اختلاف کے سبب ان کی نسلوں میں بھی موروثی طور پر وہی زبانیں رواج پا گئی ہوں۔ اور اختلاف زبان کی اصل وجہ تعمیر مینار ہی سے شروع ہوئی ہو۔ اور آج ملک ملک اور چپہ چپہ پر جو ہزاروں قسم کی مختلف بولیاں اور زبانیں رائج ہیں۔ تو اسکا سبب بھی شاید وہی مینار ہو۔ چنانچہ آج بھی ہم یہ دیکھتے ہیں، کہ جہاں کہیں لوگوں میں کسی امر پر شدید اختلاف رونما ہو جائے تو ہم اسے "مینار بابل" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اب گویا "مینار بابل" ہمارے ہاں ایک ضرب المثل یا محاورہ بن کر رہ گیا ہے۔

اس کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہے۔ کہ ہماری اپنی مادری زبان اردو، زبان کی ابتدا کیونکر ہوئی؟ آیا اس کا بانی بھی "مینار بابل" سے بھاگا ہوا کوئی عراقی ہے۔ یا محض نفسیاتی اصولوں پر ہی قدرت نے اس زبان کی مناسب تربیت و پرورش اور غور و پرداخت کی ہے؟ —— اگر غور سے دیکھا جائے، تو انسان کے دل میں کسی چیز کے دیکھنے یا سننے یا کسی حالت یا واقعہ سے پیش آنے سے ذوق و شوق، عشق و محبت، حیرت و استعجاب، طیش و غضب، رنج و الم، مسرت و انبساط وغیرہ کی جو کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان سب کے اظہار کے لئے کوئی ایسا ذریعہ ہونا چاہیئے۔ جس سے دوسرے پر مطلب ظاہر ہو سکے۔ اور ان سب سے بڑھ کر بعض اپنی ذاتی ضروریات ایسی ہوتی ہیں۔ جن کے پورا کرنے کے لئے انسان کوئی نہ کوئی صورت اختیار کرتا ہے۔ بس اسی طرح زبانوں کے ظہور پر غور کیجئے۔ تو معلوم ہو گا۔ کہ بعینہ یہی حال اظہار مقصد کے لئے پیش آیا۔ ہر ملک ہر خطہ اور ہر قریہ نے اپنی ضرورت و حیثیت کے مطابق ترویج و وضع زبان میں ہاتھ بٹایا اور جہاں تک ہو سکا۔ سب اہل ملک نے اپنی اپنی مادری زبان کی توسیع میں حتی المقدور خدمات انجام دیں۔ یہ خدمت کسی خاص شخص پر احسان نہ تھا۔ بلکہ اس سے انکو اپنا ذاتی فائدہ مد نظر تھا۔ تاکہ اس ملک و قوم کے فرزند اپنے اظہار خیال کے لئے ایک ایسا مفید آلہ قائم کر سکیں۔ جس سے ان کو اپنا مدعا و مقصد

اپنے عزیز و اقارب اور اڑوس پڑوس کے لوگوں پر بآسانی ظاہر کرنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ غرض اسی طرح ایک خاص زبان، ایک خاص ملک کے باشندوں میں فروغ پاتی رہتی اور بتدریج اس میں پختہ اور سلجھ جاتی، کیونکہ اسکے ماہر بھی طبیعتیں اختراع اور صنعت و ایجاد میں اعلیٰ درجہ رکھتی تھیں۔ ملک سخن میں انشا پردازی کا ایک نیا طلسم خانہ کھولتے۔ اور ہمسایہ ملکوں کی زبانوں کی آمیزش سے اس میں بین الاقوامی سطالب کے۔ لئے مزید وسعت پیدا کرتے

اب اس مندرجہ بالا نظریہ کی روشنی میں ہم اپنے ملک کی متحدہ زبان (اردو) کی تاریخ پر غور کرتے ہیں۔ جہاں تک چھان بین کی گئی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ پہلے پہل مسلمانوں کے آنے سے قبل بھارت ورش کی مادری زبان سنسکرت تھی جس میں رامائن مہا بھارت، بھگوت گیتا، چاروں وید اور دیگر مذہبی نیز علمی و ادبی تصانیف تحریر کی جا چکی تھیں۔ جب مسلمان یہاں آئے تو اپنے ساتھ ایک جدید تہذیب و معاشرت اور علم و تمدن لائے۔ مگر انہوں نے اسے بھارت واسیوں پر جبراً عاید کرنے کی کبھی کوشش نہ کی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ پہلے پہل ایک فارسی شاعر امیر خسرو نے بھاشا کی ترکیب قائم کر کے مکرنی، انمل، دوسخنی قسم قسم کے گیت اور پہیلیاں وغیرہ ملک کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور اسکے بعد سلطان حسین شرقی جو فن موسیقی کا بے نظیر ماہر تھا، اپنی پوری توجہ اس طرف منعطف کرتا ہے۔ پھر اسکے کچھ عرصہ بعد سکندر لودی بعض ملکی مصالح کے سبب یہاں کے باشندوں کو فارسی پڑھنے کی رغبت دلاتا ہے۔ وہ شاید اس لئے کہ اسوقت سرکاری زبان فارسی مقرر ہو چکی تھی۔ اور اس کو دفتری کاموں کے لئے منشیوں اور متصدیوں کی شدید ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان دنوں ادھر تو ہنود کی زبان پر عربی اور فارسی کے الفاظ چڑھ گئے۔ اور ادھر مسلمانوں کی زبان پر ہندوستان کی اسوقت کی مروجہ زبان نے اثر کیا اور اس باہمی میل جول کی وجہ سے اس میں روانی پیدا ہو گئی۔

اس حقیقت کے ثبوت میں ایک آدھ تاریخی واقعہ پیش کرنا بے جا نہ ہوگا۔ چنانچہ جب ظہیر الدین بابر بادشاہ ہندوستان آتا ہے۔ تو باوجودیکہ وہ ایک ٹھیٹ مغل ہے اور اس کی مادری زبان بھارت ورش کی مروجہ زبان سے بالکل مختلف ہے مگر وہ بھی اس سے متاثر ہوتا ہے چنانچہ اس کے ترکی دیوان کا جو نسخہ نواب رامپور کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ وہ ۹۳۵ھ ہجری کا تحریر شدہ ہے۔ اس میں بابر کا ایک شعر ہے جس کا ایک پورا مصرع اور دوسرے مصرع کا ایک ٹکڑا اردو میں ہے۔

پھر اس کے بعد بابر کے پوتے جلال الدین اکبر بادشاہ کے زمانہ میں یہ میل جول اور بھی بڑھ گیا۔ اکبر کی زمانہ سازی اور مدبرانہ چالوں نے ہنود کے سب رسم و رواج اختیار کر لئے۔ پیشانی پر قشقہ لگایا۔ ہاتھوں میں راکھی باندھی۔ اسی پر اکتفا نہیں بلکہ راکھی بندھن کی رسم سال بسال دھوم دھام سے ہونے لگی۔ ادب و سخن کی مجلسوں میں فارسی شعرا کے دوش بدوش کویشروں اور گویوں اور پنڈتوں نے بھی جگہ پائی، جو چیزیں ہندوستان کی پیداوار تھیں، ان کے نام قدرتی طور پر ہندی تھے۔ پس وہ بہت جلد زبانوں پر چڑھ گئے۔ اور فارسی عبارتوں میں بھی ہندی الفاظ بے تکلف استعمال ہونے لگے۔ مثال کے طور پر۔ جھروکہ۔ درشن۔ پھول کٹار۔ تلوار گھوڑا۔ ہاتھی۔ پالکی۔ جھالر۔ کہار۔ ڈاک۔ پٹواری۔ راجہ۔ چودھری پہر۔ دوپہر۔ گھڑی۔ پل۔ گھڑیال اور اسی قسم کے سینکڑوں الفاظ و اصطلاحات سلاطین مغلیہ کی شاہی زبان میں رل مل کر رہ گئے۔ اسکے بعد دوسری نسل میں جو نور الدین جہانگیر بادشاہ کی رنگیلی طبیعت نے رنگ دکھایا تو شراب تک کا نام رام رنگی رکھ دیا۔ اسکے بعد شہاب الدین شاہجہاں نے عمارتوں کے ہندی و فارسی کے ملے جلے نام تاج محل۔ لال قلعہ وغیرہ وضع کئے۔ اسکے بعد کہتے ہیں کہ حضرت محی الدین اورنگ زیب عالمگیرؒ نے مذہبی عقیدت اور محبت اسلامی میں کلمات طیبات میں کثرت سے ہندی الفاظ استعمال کئے۔

جہانگیر بادشاہ، ابراہیم عادل شاہ کا ہمعصر تھا۔ اس وقت دلی و لکھنؤ یا آگرہ و رامپور میں اردو زبان کا سراغ نہیں ملتا تھا البتہ دکن

میں اسکی بنیادیں قائم ہو رہی تھیں۔ مگر یہ خیال رہے کہ اسوقت یہ زبان طفولیت کے عالم میں تھی۔ جسکا اندازہ محمد قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ، اور نصرتی کا کلام مطالعہ کرنے سے بآسانی ہو سکتا ہے

بہرکیف اکبر و جہانگیر کی زمانہ ساز مدبرانہ طرز حکومت سے ہندوستان کی تقریباً سب قومیں فارسی پڑھنے لگی تھیں۔ اور چونکہ اختلاط ہندوؤں مسلمانوں سے کافی بڑھ چکا تھا۔ پس اس میل جول کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اس نئی مخلوط زبان نے جو آج "اردو" کے نام سے موسوم ہے میدان ترقی میں ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ لیکن پھر بھی یہ زبان عام نہ ہو سکی۔ بلکہ خاص خاص حلقوں یا صحبتوں یا زیادہ سے زیادہ گیتوں تک محدود رہی اسکی وجہ یہ تھی۔ کہ ان دنوں (جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے) سرکاری زبان فارسی تھی۔ بادشاہی فرمانوں سے لے کر دفتر کے احکام تک اسی زبان میں جاری ہوتے تھے۔ اسی میں عرائض اور مقدمات کے کل امور طے ہوتے تھے اور طبقہ امرا و شرفا میں باہمی خط و کتابت بھی اسی فارسی زبان میں ہوتی تھی۔ غرضیکہ کیا ہندو کیا مسلمان سب کے دلوں پر فارسی زبان کا اس قدر رعب و اقتدار چھایا ہوا تھا کہ ملکی زبان یعنی اسوقت کی اردو یا ہندوستانی کو بے علم یا کم علمی کی علامت سمجھتے تھے۔ چنانچہ اسوجہ سے اردو زبان کو علمی دربار تک رسائی حاصل نہ ہو سکی۔ اور کافی مدت تک ہندوستان کے دار السلطنت (دہلی) اور اسکے گرد و پیش کے شہروں اور قصبوں میں فارسی کا سکہ رواں رہا۔ لیکن اطراف ملک (دکن وغیرہ) میں یہ حالت نہ تھی۔ وہاں کچھ ایسے اسباب پیدا ہو گئے تھے۔ کہ ہندوستان کی نئی مخلوط زبان (اردو) کی جڑ مضبوط ہو گئی۔ اور کچھ اسوقت کے واقعات و حالات نے بھی اسکی کافی معاونت کی۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ محمد شاہ تغلق کی بدنظمیوں سے دکن میں بہمنیوں کی ایک نئی عظیم الشان سلطنت قائم ہو گئی۔ اور قرعہ سلطنت علاؤ الدین حسن گانگو کے نام پڑا۔ اس نے شروع ہی سے برہمنوں کو مالی و ملکی عہدے دیکر امور حکومت میں شامل کر لیا۔ مال کا دفتر ملکی زبان میں ہونے لگا۔ اور اسوجہ سے ملکی اور فارسی زبانیں بہت جلد مخلوط ہونا شروع ہو گئیں۔ چنانچہ جب اصناف سخن میں اردو نظم عالم وجود میں آئی، تو اس کے ظہور کا سہرا بھی دکن کے سر ہی بندھا۔

ادھر دہلی میں شاہی و سرکاری زبان لازمی طور پر فارسی ہی رہی۔ اور اسی زبان میں شاعروں اور ادیبوں کو اپنے جوہر قابلیت چمکانے کا موقع ملتا رہا۔ اور تیموری و ترکی طریقوں پر آئین و قوانین سلطنت کی بنیاد باقی رہی۔ یہاں تک کہ محمد شاہ رنگیلا جسکی سات پشتوں نے ہندوستان کی آب و ہوا میں پرورش پائی تھی، اور ان میں سے ایک نے بھی ترکستان و ایران کی ہوا تک نہ کھائی تھی وہ بھی ترکی زبان بولتے۔ اور فارسی کو اپنی مادری زبان سمجھتے۔

مگر یہ حالت ان بادشاہوں کی نہ تھی، جو اطراف ہند (مثلاً دکن وغیرہ) میں برسر حکومت تھے۔ وہاں کچھ ایسے خاندان بھی تھے جو خالص ہندی النسل تھے۔ یا چار پانچ پشتوں کے بعد ہندی ہو گئے تھے۔ بالخصوص دکن میں یہی حال تھا۔ وہاں کے صفحات تاریخ ملکی جھگڑوں سے بھرے پڑے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اہل دکن کو ان دنوں غیر ملکیوں کی ہر چیز سے نفرت تھی۔ اور سودیشی و بدیشی کا جذبہ اسوقت وہاں بہت زور پر تھا۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ اہل دکن اپنی مستقل ہستی قائم کرنے کے لئے زبان و سخن میں بھی غیر ملکیوں سے الگ رہنا چاہتے تھے۔ غرض آہستہ آہستہ ابراہیم عادل شاہ والئے بیجاپور کے زمانہ میں فارسی آمیز دکنی زبان کا رواج ہونا شروع ہوا۔ وہ خود راگ اور موسیقی کا بڑا ماہر تھا۔ یہاں تک کہ اس زمانہ کے بڑے بڑے گویئے اس کے آگے پانی بھرتے تھے۔ اور اسے اپنا جگت گرو کہتے تھے۔

ابراہیم کو نہ صرف خود راگ اور راگنیوں کو ترکیب دینے کو اپنی زبان میں شعر کہنے کا شوق تھا۔ بلکہ جو کچھ وہ تصنیف کرتا گویوں کو گا کر سناتا تھا۔ اور پھر وہ راگی اور گویئے اس کے شعروں اور گیتوں کو یاد کر کے اور گا کر پھیلاتے تھے۔ رفتہ رفتہ ملکی زبان میں رچ کر نہ خالص ہندی تھی، بلکہ عربی، فارسی اور ہندی الفاظ کے امتزاج سے ایک نئی زبان قائم ہو گئی تھی۔ طبع آزمائی کرنے کا شوق

عام ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ فارسی بحروں ہی میں شعر کہے جانے لگے ادھر گولکنڈہ میں محمد قلی اسی ابراہیم کا معاصر نہایت علم دوست اور ہنر پرور بادشاہ تھا۔ اور اعلیٰ پایہ کا شاعر تھا۔ اسکے مرنے پر اس کا بھتیجا اور داماد سلطان محمد قطب شاہ تخت و تاج کا مالک ہوا۔ اور پھر اسکی وفات کے بعد اس کا بیٹا عبداللہ قطب شاہ بادشاہ ہوا۔ اور وہ بھی شاعر اور صاحب دیوان تھا اس وقت کی زبان کا انداز دکھانے کے لئے اس کا ایک شعر نموناً یہاں پیش کرتا ہوں ؎

"اے پری پیکر ترا مکھ آفتاب
دیکھتا ہوں تو رہے نہ مجھ میں تاب"

غرضکہ یہ زبان ان دنوں ابھی اوائل عمری ہی میں تھی اور دراصل ریختہ بھی اسی شے کا نام تھا۔ بہرحال اس زمانہ میں بہت سے ایسے باکمال شاعر اور انشا پرداز پیدا ہوئے ہونگے جنہوں نے اس زبان کی کافی خدمت کی ہوگی۔ کیونکہ مثل مشہور ہے۔ کہ جیسا راجہ ویسی پرجا؛ یعنی جس طرف بادشاہوں کا میلان ہوتا ہے اسی جانب لوگوں اور رعیت کے خیالات بھی لازمی طور پر منعطف ہو جاتے ہیں۔ مگر پھر حیدرآباد کی تباہی کے بعد اکثر لوگوں نے اورنگ آباد میں پناہ لی۔ اور چونکہ عالمگیر بادشاہ کی عمر کا بیشتر حصہ وہیں بسر ہوا۔ اس لئے دہلی اور اکبرآباد کے بہت سے امرا و علما اور مشائخ بھی اورنگ آباد میں رہے۔

اب ادھر دہلی میں یہ حال تھا۔ کہ عالمگیر کے مرنے کے بعد اس کے بیٹوں اور پوتوں وغیرہ میں سلطنت مغلیہ کے حصے بخرے ہونے شروع ہو گئے۔ اور چند ہی ایام میں جوتوں میں دال بٹنے لگی۔ کافی عرصہ تک دوڑ دھوپ کے بعد محمد شاہ کو کچھ روز اطمینان سے حکومت کرنا نصیب ہوئی۔ مگر کہاں؟ — بالآخر رنگیلے کی طبیعت نے رنگ دکھایا۔ امرائے دربار تو پہلے ہی برسوں سے خانہ جنگیاں کرتے کرتے تھک چکے تھے۔ چنانچہ پھر کیا تھا سب ہتھیار پھینک کر عیش و عشرت میں پڑ گئے۔ شاعری اور بیفکری تو مثل مشہور ہے۔ سب صاحب فضل و کمال دہلی میں آکر جمع ہو گئے۔ اور یہاں انکا خوب رنگ جما۔ اور زندگی بھر تک اس زبان کی خدمت و پرورش کرتے رہے ایسے شاعروں اور ادیبوں کا یہاں ذکر کرنا طوالت سے خالی نہیں۔ اصل مقصد محض داستانِ اردو بیان کرنے کا یہ ہے۔ کہ اس زبان نے کیسے فروغ حاصل کیا؟

پہلے پہل اردو زبان کا نام ریختہ تھا۔ پھر اردوئے معلیٰ کا خطاب پا کر ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی۔ کسی حد تک اس کے فروغ کا ایک سبب یہ بھی ہوا۔ کہ .... شروع میں انگریز حکام کو اپنے ملکی مصالح کے سبب اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی، کہ جو انگریز ولایت سے تازہ وارد ہوتے ہیں انکو اردو زبان سکھائی جائے۔ اور چونکہ اسوقت بھی اردو زبان میں اس مطلب کی کتابیں موجود نہ تھیں۔ اس لئے ایک انگریز ڈاکٹر گلگرسٹ کے زیر اہتمام اس کام کو شروع کیا گیا۔ دہلی اور لکھنؤ سے زبان داں جمع کئے گئے۔ اور اردو زبان کو وسعت اور ترقی دینے کے لئے اس زبان میں قصوں اور کہانیوں کی کتابیں لکھوائی گئیں۔ چنانچہ بعض فارسی اور عربی نیز سنسکرت اور انگریزی وغیرہ کتابوں کے ترجمے کئے گئے۔ اور خود ڈاکٹر جان گلگرسٹ نے اردو زبان کی لغت اور قواعد قلمبند کئے۔

بعض نقاد کہا کرتے ہیں۔ کہ اردو زبان کی ابتدا فارسی زبان کی انتہا سے جا ملی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ درست ہو مگر دراصل اردو زبان کی ساری تاریخ صرف اس ایک فقرہ میں بیان کی جا سکتی ہے۔ کہ اس کی ماں "بھاشا" سی شیریں بولی تھی۔ اور یہ بالآخر فارسی و عربی نیز انگریزی کی گود میں پلی بڑھی، اور برسوں تک بھارت ورش کے گہوارہ میں جھولتی رہی اور اب یہ درجہ بڑی مشکلوں سے حاصل کیا ہے۔

ضروری اطلاع:۔ ڈراما نمبر اپریل اور مئی کا مشترکہ نمبر ہے اس لئے اپریل کا پرچہ شائع نہیں ہوگا۔ قارئین مطلع رہیں

(منیجر)

جناب خواجہ حسن عباس
بی اے

سیدھی لکیر

جب وہ اپنے کمرے کے فرشی بستر پر لیٹا اپنی پتلی پتلی دراز ٹانگیں سکیڑے حقہ گڑگڑا کر کہتا: "نعیم مجھے یہ تلخ زندگی بڑی پیاری ہے" تو مجھے اپنے غم نصیب دوست کی جوان ہمتی پر رشک آنے لگتا۔

اسکی موٹی موٹی شربتی آنکھوں میں گذشتہ دورِ عشرت کی ایک دھندلی سی جھلک اسباب کی گواہ تھی۔ کہ وہ کبھی دنیا کے رنگین بازاروں میں بھی سانس لے چکا ہے۔ اس کا ساغرِ جوانی چھکا۔ اور بار بار چھلکا، مگر وہ اپنی لغزشوں سے قطعاً بے پروا تخیلات کی بے تاب لہروں پر ایک کاغذی نیا کی طرح بہتا چلا گیا۔ وہ فطرتاً آزاد تھا۔ اور اپنی اس آزاد روی کی لے میں وہ اکثر آسمانی ستارز کی بے چارگی پر بھی مسکرا دیتا ——

کبھی اسکی زندگی گوناگوں تفریحات کے آغوش میں بسر ہو رہی تھی —— سیم وزر کی بہتی ہوئی لہروں میں مئے تند کی تلخیاں جوا اور آزاد مزاج لڑکیوں سے گہری محبت —— سماج کے لئے وہ ایک آوارہ انسان تھا، اور سماج اسکی نظروں میں تاش کا ایک بنڈل، جس کے پتے ہر بار مل کر ایک دوسرے کے مخالف وار کرتے ہیں۔ اس کا ہر کام ہی کچھ ایسا نرالا تھا۔ کہ اسکے جاننے والے اسکی زندگی کو ایک ٹیڑھی لکیر سمجھنے لگے تھے وہ لیل و نہار کی طرح گردش میں رہتا۔ اور فریب دنیا کے وزنی حادثات بھی اسے پابزنجیر نہ کر سکے۔ اسی میں یہ سحرکاری تھی کہ زندگی کے ٹوٹے پھوٹے تاروں سے بھی اپنی دلسوزی کے نغمے پیدا کر لے!

انہی دنوں کی بات ہے کہ ایک دفعہ وہ مجھے ایک رات شہر کے بڑے قہوہ خانہ میں ملا۔ ایک ضخیم کتاب اس کی بغل میں تھی۔ اور وہ نشہ میں چور تھا۔ اور اس نے مجھے میرے دوستوں کے سامنے ہی بتا دیا۔ کہ وہ ایک رنڈی کے مکان پر گیا تھا میرے ایک دوست نے یہ جملہ سنکر اسکے چمکتے ہوئے چہرے پر تنقیدی نگاہ ڈالی، اور وہ مخمور جذبات کے اشتعال سے تھرتھرا کر بولا:

"صاحب! یہی حسن فروش ہستیاں جو اپنی ہتھیلی پر زندگی کی جنس گراں لئے پھرتی ہیں ہماری نجات دہندہ ہیں۔ ان کا سماج پر بڑا ہی احسان ہے۔ فرمائیے! اگر یہ نہ ہوں تو ہم مجرد اپنے سفلی... جذبات کی پیاس بجھانے کے لئے کن ذلیل حرکات کے مرتکب ہوں یقین جانئے کہ ان کا وجود تعمیر جہاں کے لئے ناگزیر ہے"

وہ اسی گرمی میں سگرٹ نکال کر تیزی سے کش لگانے لگا۔ یہ دراصل میرے دوست کی بھول تھی۔ جو اس کی بات کو قابلِ گرفت سمجھ لیا۔

اسے کیا معلوم تھا کہ میرے شرابی دوست کا ذہن روسی افکار کی گرفت میں ہے۔ اس کی نگاہ میں مذہب بھی ایک افیم تھی۔ جو صدیوں سے انسانوں کو روحانیت کی اوٹ میں پلائی جا رہی تھی اور نظریہ جزو سزا کو وہ مذہبی دیوانوں کی خود غرضی کا ایک کھیل سمجھتا تھا —— !

میں نے بات پلٹنے کے لئے اسکی کتاب لے کر یونہی ورق گردانی شروع کر دی۔

"جانتے ہو! یہ کہاں سے ملی؟ ——

"کیوں؟ —— " میں حیرت سے اسکا منہ تکنے لگا۔

"آج شام سٹیشن پر جو گیا تو ویلر بک سٹال سے یونہی اٹھا لی

کتاب پسند آگئی، مگر جیب میں اس وقت اتنے پیسے نہ تھے. کہ خرید سکوں. صبح قیمت ادا کردوں گا!——

اسکے جواب نے مجھے ایک لمحہ کے لئے کچھ یونہی ساکت کر دیا مجھے وہ وقت یاد آگیا. جب ایک بار اس نے پبلک کال آفس میں ٹیلیفوں پر اپنی آواز کا جواب نہ پاکر ریسور جدا کردیا، اور خود ہی اطلاع دیکر کانی رقم بطور ہرجانہ کے ادا کردی——

اس کی دلچسپ باتوں نے ہمیں کچھ دیر قہوہ خانہ میں بٹھائے رکھا اور جب ہم باہر نکلے تو ہم نے دیکھا. کہ ایک بڑی سی توند والا انسان ننھے منے ہاتھوں میں ایک غریب مزدور کا پھٹا ہوا گریبان تھامے سے بری طرح کوس رہا تھا. وہ بیچارہ وزنی آہنی سلاخوں کا بنڈل سر پر اٹھائے آرہا تھا. کہ اس "مجسمہ خدائی" کو راہ چلتے یونہی دھکا سا لگ گیا. اور اب اسی جرم کی پاداش میں وہ اسے زبردستی نکالنے کی کوشش کر رہا تھا مزدور کے سینے کی ابھری ہوئی دراز ہڈیاں، کانپتے ہوئے خشک ہونٹ اور سراپا بےچارگی بتا رہی تھی کہ ایک فاقہ کش غریب کی زندگی ہر وقت موت کے دامن میں ہوتی ہے—— میرا دوست دفعتہ آگے بڑھا، اور بھوکے پیاسے مزدور کو رعونت کی گرفتار سے آزاد کراکر بولا "نعیم سندوں کی غریب دنیا ہنوز کسی لینن کی تلاش میں ہے!"—— اس کے الفاظ میں کتنا گہرا احساس تھا!

—— اس کے لئے زندگی کا سب سے بڑا حادثہ اس کی شادی تھی —— نوجوان دلہن نے ہر طرح مخل ہوکر اس کی گردشوں کا پردہ اٹھانا چاہا. مگر شوہر کا طلسم حیات نہ پاسکی:

اچانک زندگی نے ایک کروٹ لی اور اب اسکی زندگی سیم وزر کی شعاعوں سے دور ہونے لگی اس کی آسودہ حالی بدل گئی. مگر اس کے آزاد خیالات بدستور اسی شاہراہ حیات پر اس کے نقش پا کی تلاش میں آوارہ تھے—— اس کی صحت گرنے لگی، اور وہ کشمیر کی پرفضا وادی کی طرف تندرستی کی تلاش میں چلا گیا.

اب کے اس کی طبیعت کی نیرنگی نیا رنگ لائی، دوران سفر ہی میں ایک پہاڑی دوشیزہ پر طبیعت راغب ہوگئی اور وہ اپنے مقصد سفر سے بےپروا اپنی جوان محبوبہ کی رعنائیوں سے چند ماہ کھیل کر ڈھلتی جوانی لئے واپس چلا آیا.

وہ اب حوادث کی پناہ میں تھا. وہ مسکراتا رہا اور مصیبتوں کی آگ اس کی ہستی کو خاکستر بناتی گئی، اور اب انہی بجھی ہوئی چنگاریوں کو شعلوں میں بدلنے کے لئے وہ کسی آزاد ماحول کی تلاش میں بہت دور نکل گیا —— وہ برابر جلتا رہا. حتیٰ کہ اس کی جھلسی ہوئی رگوں میں بہتا ہوا خون آتش سیال بن گیا.

اس نے سماج کے خود ساختہ قوانین کی خود غرضی کے خلاف بغاوت کی اور اپنے پرسوز دلائل سے سماج کے خداؤں کو انگاروں پر لوٹا دیا. وہ برابر جلتا رہا. لیکن ایک فرد واحد کی بغاوت ہمہ گیر اثر جلدی نہ دکھا سکی —— وہ اسی کشمکش میں ایک دائمی مریض بن گیا.

جب وہ مجھے پچھلے دنوں ملا. تو اس کا بظاہر مسکراتا ہوا زرد چہرہ پچکے ہوئے گال، اور ابھری ہوئی ہڈیاں دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے. اپنی اس تبدیلی کا احساس میری نگاہوں میں پاکر وہ حسب معمول مسکرا دیا. اور کہنے لگا کہ نعیم اصول کی خاطر جان کی قربانی کوئی بڑی بات نہیں، میں اپنے سادہ لوح بھائیوں کو، انسانیت فروش سماج کے ظالم پنجہ سے ضرور آزاد کراؤں گا تاکہ انکی بدولت آئندہ نسلیں زندگی کی سیدھی راہ پر چل سکیں. میں نے دنیا دیکھی ہے. امارت اور غربت دونوں ندیوں میں جی بھر کر نہایا ہوں، اور جانتا ہوں کہ.... وہ غریب جس کی جیب میں ایک بار روپے نہیں کھنکے اسے اپنی غربت کا صحیح احساس نہیں ہوسکتا. اور وہ امیر جس نے پھٹے پرانے کپڑوں میں کبھی رات نہیں بسر کی، اپنی امارت کا پورا مزہ نہیں اٹھا سکتا——"

اس کے الفاظ نے مجھے چونکا دیا. اور مجھے اسباب کا پورا احساس ہوگیا. کہ ایک آزاد زندگی بظاہر کتنی ٹیڑھی سہی

لیکن اصول کے نقطۂ نظر سے سیدھی لکیر ہوتی ہے۔ چکا ہے —— لیکن میں اسے سماج کی کھوئی ہوئی دولت
لوگ اب بھی کہتے ہیں۔ کہ وہ زندگی کی راہ سے بھٹک سمجھتا ہوں

جناب اختر ہوشیارپوری، بی اے

معصوم اقرار

تو نے اس طرح سے کچھ جرم کا اقرار کیا
باتوں باتوں میں مری رُوح کو بیدار کیا!

مجھ کو شرما کے بتانا یہ "مری بھول ہوئی"
باوفا تم کو نہ جانا یہ مری بھول ہوئی"

تھرتھرانا وہ زباں کا وہ پریشاں ہونا
ہائے وہ اپنی شرارت پہ پشیماں ہونا

اب تلک ہے تری گفتار کی کانوں میں مٹھاس
جس سے قائم ہے مری دردِ محبت کی اساس

ہائے معصوم وہ الفاظ وہ پُرکیف صدا
اب تلک دل میں ہے اُس فقرۂ رنگیں کی ادا

آہ وہ تیری شرارت میں حیا کا انداز
لُو کے اک گرم سے جھونکے میں صبا کا انداز

اُف وہ پیشانی کہ جس طرح سے کندن کی چمک
اُف وہ آواز کہ جس طرح سے کلیوں کی چٹک

وہ حجابوں میں تبسم کی ضیائیں توبہ
وہ نزاکت میں شرارت کی ادائیں توبہ

بات کے ساتھ نگاہوں کو جھکانا تیرا
ہائے معصوم جوانی کا زمانا تیرا

تیری پاکیزگیٔ شوق کے قرباں ہوں میں
تیری دوشیزگیٔ ذوق کے قرباں ہوں میں

تیرے لہجے سے محبت کی ہوا آتی تھی
تیری آواز میں حوروں کی صدا آتی تھی

زہرِ فرقت کو تھا تریاقِ ترا کیفِ سخن
لگ گئی اور بھی میرے دلِ محزوں کو لگن

میں ہوں اور تیرا تصور ہے خدا جانتا ہے
سوزشِ دل کو بھلا دوسرا کیا جانتا ہے

R. L. NO. 3521

علمی، ادبی و تنقیدی ماہوار مرقع

ادب لطیف

مصوّر لاہور

ایڈیٹر

چودھری برکت علی بی۔اے

منظور کردہ محکمہ تعلیم پنجاب صوبہ سرحد و ریاست حیدرآباد دکن

مکتبۂ اُردُو لاہور کا

کثیر الاشاعت و ارزاں ترین ماہنامہ

ادب لطیف

رسالہ ادب لطیف لاہور

جُون سنہ ۱۹۳۹ء

ادارۂ تحریر

چودھری برکت علی بی، اے

میرزا ادیب بی اے

مقام اشاعت

مکتبۂ اُردُو لاہور

قیمت فی پرچہ چار آنے

مینیجنگ پرنٹر پبلشر چودھری نذیر احمد

کتبہ ممتاز القلم حامد حسین گھوڑے شاہ لاہور

چندہ سالانہ مع ضخیم سالنامہ و افسانہ نمبر تین روپے چار آنے علاوہ محصول ڈاک

چندہ ممالک غیر سے آٹھ شلنگ

فہرست

جلد ۹ | بابت ماہ جون ۱۹۳۹ء | نمبر ۴

چودھری برکت علی بی اے پرنٹر پبلشر اینڈ مالک نے برانچ کو اپریٹو کمرشل پرنٹنگ پریس وطن بلڈنگ لاہور سے چھپوا کر دفتر ادب لطیف میکلوڈ روڈ لاہور سے شائع کیا

اشارات

مہاراشٹر کے اردو پرست حضرات کی خدمت میں

قارئین ادب لطیف "مکتبہ اردو" نے اردو کی نشر و اشاعت کے لئے جس نئی سکیم کا اجراء کیا ہے اسکا مجمل حال آپ نے ڈرامانمبر کے صفحہ اول میں پڑھ لیا ہے۔ مکتبہ اردو کے پیش نظر صرف اردو کی اشاعت ہے اور اس سلسلے میں وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں پے در پے مالی نقصانات ہوئے ہیں مگر اس کے باوجود کارپردازان مکتبہ اردو کا قدم پیچھے نہیں ہٹا۔ بلکہ اردو کو ہر جگہ پھیلانے کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اسی جذبے کے زیر اثر نئی سکیم بروئے کار آئی ہے قارئین کرام جانتے ہیں کہ ہندوستان کے کئی حصے ایسے ہیں جہاں اردو صرف اس وجہ سے ترقی نہیں کر سکی کہ اس مقصد کے لئے قطعاً کوئی ذریعہ اختیار نہیں کیا چنانچہ مہاراشٹر کی سرزمین میں اب تک اردو کی نشر و اشاعت کی کوشش نہیں کی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں چند اردو پرست حضرات تو موجود ہیں مگر ذرائع دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے ان کی "اردو پرستی" اردو کے لئے زیادہ کارآمد و حیات افزا ثابت نہیں ہو سکی۔ اب مکتبہ اردو کے کارکنوں نے مصمم ارادہ کیا ہے کہ اردو کو ہندوستان کے ہر ہر گوشے میں پھیلایا جائے اور پہلا میدان عمل یہی مہاراشٹر کی سرزمین ہے۔ ہمارے محترم ناظم اقبال "اردو سٹ" لے کر مجوزہ سکیم کے مطابق مہاراشٹر کا دورہ کریں گے۔ اور انتہائی کوشش سے کام لے کر اردو کی منتخب کتابیں ہر ایک شخص کے ہاتھوں میں پہنچائیں گے۔

سٹ کی قیمت گیارہ روپے ہے۔ اقبال صاحب یہ مکمل سٹ اردو کے ہر سرپرست کی خدمت میں پیش کریں گے۔ اور پہلی قسط ساڑھے تین روپے ان سے لے لیں گے بقیہ رقم خریدار بحساب ۸/۔ بالاقساط دیں گے۔

قارئین کرام جانتے ہیں۔ کہ اس سکیم کے پس پردہ مالی فائدے کا تصور تک بھی نہیں غور کیجئے گیارہ روپے کی کتابیں اسطرح پیش کر دینا محض اردو کی خدمت نہیں تو اور کیا ہے؟؟

سکیم صرف اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب اردو کے محترم سرپرست اردو سٹ کے محترم ناظم صاحب کی ہر ممکن امداد فرمائیں۔

ہم مندرجہ ذیل معزز حضرات کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ وہ اردو کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں کرم فرمائی سے کام لیں گے!

مخلص

چوہدری نذیر احمد

بھوپال

میاں اسلام الدین صاحب جالندھری چیف جسٹس

پونہ چھاؤنی

خانصاحب عبدالقدیر خاں صاحب ایم ایل اے عبدالرؤف عبدالقدوس ٹمبر مرچنٹ

پونہ شہر

حکیم جمیل احمد صاحب و حاجی اسمٰعیل ابراہیم صاحب

احمد نگر شہر

احمد نگر چھاؤنی

جناب شیخ عنایت و حبیب اللہ صاحب کلاتھ مرچنٹ و کرانہ مرچنٹ

ڈھونڈ

سیکرٹری فرم پنجابی

ضلع بیڑ

چوہدری سردار خاں صاحب گتہ دار و شہاب الدین فاروقی

گیورائی

جناب عمر بن علی چاؤش رئیس اعظم گیورائی۔

جالنہ

جناب سید افضل علی صاحب وکیل و حمید الدین صاحب وکیل

اورنگ آباد

حضرت درد کاکوری

مکتبہ اردو کا عظیم الشان اقدام

وقت کی ایک اہم ضرورت

ادبی سٹ کا انتخاب

اردو جس ہلاکت بکنار دور سے گذر رہی ہے۔ وہ پبلک کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں مخالفان اردو کا زہر آلود تعصب ایک طاقتور سیلاب کی صورت اختیار کر کے اسے ایک حقیر تنکے کی مانند بہالے جانے پر تلی ہوئی ہے۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار ہے۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ تشویشناک سے تشویشناک صورت حالات پیدا کر رہی ہے ضرورت ہے کہ بہی خواہان اردو اپنی تمام تر توجہات اردو کی بقا کے اہم ترین مسئلے پر مرتکز کر دیں۔ مخالفت حقیر ہونے کے باوجود مخالفت ہے۔ اور اس سلسلے میں کسی چیز کے متعلق "حسن ظن" انجام کار تاسف کی صورت اختیار کر لیتا ہے!

موجودہ دور میں جہاں ہمیں اردو کی مخالف طاقتوں کا مقابلہ کرنا

ہے وہاں ہمیں اپنوں کی توجہ بھی اس اہم ترین مسئلے کی طرف مبذول کرانا ہے۔ ہمارے کانوں میں ہمیشہ یہ شکایت پہنچی ہے کہ ملک کے زر پرست تاجر شرمناک تاجرانہ ذہنیت کا ثبوت دیتے ہوئے حیا سوز لٹریچر کی ترویج میں مصروف ہیں اور اس طرح نوجوان دماغوں میں بداخلاقی کے جراثیم پیدا کر رہے ہیں اس طرح جہاں قومی تنزل کی پرورش ہو رہی ہے۔ وہاں اردو کے مستقبل کو بھی تاریک کیا جا رہا ہے۔ آج ہر مخالف بانگ دہل کہتا ہے کہ اردو میں پست معیار لٹریچر پیش کیا جا رہا ہے۔ جو قوم و ملک کیلئے زہر سے بھی زیادہ مہلک ہے!

مجھے ستمبر ۴۸ء سے لیکر مئی ۴۹ء تک بمبئی، خاندیس، مہاراشٹر، دکن، میسور، مدراس کے اکثر مقامات پر زبان اردو کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں جانے کا موقعہ ملا۔ میں نے ہر مقام پر بہی خواہانِ اردو سے گفتگو کی۔ وہ اردو کی لسانی عظمت، شیرینی، فصاحت، بلاغت کے معترف ہیں مگر اس کیساتھ ہی ان حضرات کو اس بات کی سخت شکایت ہے کہ ہماری زبان میں فحش لٹریچر نشیب کی طرف بہتے ہوئے پانی کی مانند بڑھتا جا رہا ہے جس کا مطالعہ دماغوں کو تاریک، دلوں کو پامال اور ہمتوں کو پست کر رہا ہے۔ عریاں پسندی قوم کی اخلاقی پستی پر شاید ہے اور اس عریانی کی ذمہ دار وہ قابل نفرت ذہنیت ہے۔ جو تاجرانہ اغراض کے ماتحت فحش لٹریچر کو فروغ دینا زندگی کا سب سے بڑا مقصد سمجھ رہی ہے۔ میں نے ان تمام حضرات کی شکایات کو تحمل سے سنا، ٹھنڈے دل سے ان پر غور کیا۔ اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس وقت جہاں مخالفانِ اردو کے مقابلے میں مدافعانہ اقدامات کی اشد ضرورت ہے وہاں زر پرست اور عریاں پسند تاجرانہ ذہنیت کا سدباب کرنا بھی ہمارا فرض ہے!

دورے سے واپس آنے کے بعد میں نے عزیز بھائی چودھری نذیر احمد صاحب پروپرائٹر مکتبۂ اردو، ادب لطیف لاہور سے گفتگو کی پھر ملک کے چند صاحب الرائے اردو پرست حضرات سے مشورہ کیا اور اپنی مجوزہ سکیم انکی خدمت میں پیش کی اور آج میں نہایت مسرت کیساتھ اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ ان حضرات نے اس تجویز کو بھی پسند کیا۔ اور ہر طرح آمادہ عمل ہوئے۔ سکیم یہ ہے کہ مکتبۂ اردو بہترین کتابوں کا سٹ شائع کیا کرے گا۔ جو ادب کے ہر موضوع پر مشتمل ہوگا اس سٹ میں افسانہ، تاریخ، نظم، سوانحعمری، تنقید، ڈراما الغرض ہر موضوع پر ایک کتاب محیط ہوگی! اس طرح یہ سٹ ایک قسم کے دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) ہوگا۔

ایک سٹ مکمل ہو چکا ہے جو میں اردو پرست حضرات کی خدمت میں پیش کروں گا۔

شرائط یہ ہیں۔

سٹ کی قیمت گیارہ روپے ہے۔ ادبی سٹ کے ہر سرپرست کو مکمل سٹ دیتے وقت ساڑھے تین روپے پیشگی دینا ہوگی۔ باقی رقم ڈیڑھ روپیہ پانچ مسلسل قسطوں میں دینا ہوگی اس طرح ہر نیا سٹ ان کی خدمت میں ہر سال پیش کیا جایا کرے گا۔ امید واثق ہے اردو نواز حضرات حسب دستور میری ہمت افزائی فرمائینگے۔

مکتبہ اردو کے ارباب حل و عقد نہایت دریا دلی سے کام لے کر اس کام کو شروع کر رہے ہیں۔ مندرجہ بالا تجویز کے مطالعہ کے بعد آپ بھی ان کی دریا دلی کے معترف ہو گئے ہوں گے۔

اس صورت میں ہر ایک اردو دان کا فرض ہے کہ وہ مکتبۂ اردو کے کام کو فروغ دے کر اردو کی نشر و اشاعت میں حصہ لے!

میں اپنے تمام محترم و معزز بہی خواہانِ اردو سے قوی توقع رکھتا ہوں کہ وہ دستور سابق اردو کی نشر و اشاعت میں میرا ہاتھ بٹائیں گے۔ موجودہ صورت حالات میں جب کہ اردو کو مٹانے کی منظم کوشش کی جا رہی ہے۔ اردو دان پبلک کا یہ سمجھ لینا کہ اردو خود بخود ترقی کرتی رہے گی۔ حقیقت کو جھٹلانا اور خود کو غلطی میں مبتلا کرنا ہے۔ ہم نے صورت حالات سے متاثر ہو کر یہ اقدام کیا ہے اور اگر آپ کو اردو سے ہمدردی ہے تو آپ کا فرض ہے کہ اس اقدام کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کریں۔ تاکہ ہمارے لئے زیادہ وسیع میدان عمل پیدا ہو!

کارکنانِ مکتبہ اردو نے نہایت قابل صاحب الرائے حضرات کے مشورے کے بعد ادبی سٹ شائع کیا ہے۔ جس میں آپ ادب کے ہر اہم موضوع پر ایک بسوط کتاب پائینگے!

میں اپنے تمام محترم ہمدردوں کا بصمیم قلب شکریہ ادا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ بہی خواہانِ اردو میری ہمت افزائی فرماتے رہیں گے!

فہرست ادبی سٹ

(۱) چاند کا گناہ (۲) ترکی جمہوریہ (۳) نغمۂ حرم (۴) طلسم خیال۔
(۵) لینن (۶) کمپنی کی حکومت (۷) شہنشاہ حبشہ (۸) عورتوں کے افسانے
(۹) حاجی لق لق کے افسانے۔ مخلص: محمد اقبال سلیم گاہندری

ایف، ڈبلیو، بین — مترجمہ علی احمد صاحب

پریم پیاسی

(۱)

آج سے ایک ہزار برس پہلے جنوب کے گھنے جنگلوں کے پرے ایک راجہ کی راجدھانی تھی. لیکن اتنی بڑی ریاست اور حکومت راجہ اور رانی کی نظروں میں خار تھی، اس لئے کہ ان کا کوئی وارث نہ تھا لیکن مہیشور کی کرپا سے اس آخری جیون میں ان کی آشا پوری ہوئی رو دالک بڑھ کر ایک خوبصورت اور تنومند جوان ہوا اسوقت تک راجہ اور رانی دونوں کے بال پک چکے تھے. اور انکی آخری آرزو صرف یہ رہ گئی تھی. کہ اب اپنے پتر کی شادی رچائیں. لیکن جب رو دالک سے پوچھا گیا تو وہ ہنسا اور بولا. کہ پھول کے مرجھانے کے بعد کون اس کو لیکر پھرے گا. یہ استریاں کیا ہیں. پھول جو صرف اس قابل ہیں کہ انکو جمع کیا جائے. جسوقت وہ تازہ اور شگفتہ ہوں اور جس سمے وہ مرجھا جائیں. انکو پھینک دیا جائے عقلمند صرف وہی ہے جو شہد کی مکھیوں سے شہد، مں طرح حاصل کرے اکہ انکی نیش زنی سے محفوظ رہے علاوہ اس کے عورتیں پربت آگنی اسوری اور مدیرا ہیں. جو صرف دور ہی سے دیکھنے سے سندر معلوم ہوتی ہیں.

ان شبدوں کو سنکر ماتا پتا غم سے پتھر ہو جاتے. وہ سمجھ گئے کہ ان کے پتر کے دل میں عورت کے لئے جگہ نہیں ——

آخر اسی غم میں وہ مر گئے.

× × × × ×

اب رو دالک راجہ تھا ایک روز وہ شکار کرتا ہوا ایک گھنے جنگل میں جا نکلا. اس کا گھوڑا شکار کے تعاقب میں اونچے اونچے درخت اور خار دار جھاڑیوں میں سے گزرتا ہوا جنگل کے عین درمیان پہنچ گیا. اور ندی کے قریب ایک پرانے بڑ کے درخت کے قریب رک گیا. جس کی شاخوں سے لٹکتی ہوئی لانبی جڑیں زمین کے سینے پر ناگنوں کیطرح لہرا رہی تھیں. کچھ دور ایک پرانا شکستہ مندر دکھائی دے رہا تھا جس کے ستونوں میں قدامت کیوجہ سے خم آگیا تھا. اور جس کی سیڑھیوں کے پائیں کو ندی کا نستر اجل اپنے دامن سے جھاڑ رہا تھا کنول کے منوہر پھول پانی کی گود میں جھولا جھول رہے تھے. راجہ گھوڑے سے اتر پڑا. اور آہستہ آہستہ چلنے لگا. اس نے اور پھر اس کے گھوڑے نے ندی سے خوب سیر ہو کر پانی پیا پھر راجہ گھاس اور پتیوں سے گھوڑے کے پسینے کو پوچھنے لگا. ابھی وہ اپنے گھوڑے کی نگہداشت میں مصروف ہی تھا. کہ پیچھے سے اس نے کچھ کھڑکھڑاہٹ سنی اور ساتھ ہی کسی کے چلانے کی مدھم آواز. راجہ نے گھبرا کر پیچھے دیکھا. اور یکایک جیسے کسی نے اس پر جادو کر دیا ہو. وہ اپنے گھوڑے، اپنی ہستی، اور دنیا کی تمام چیزوں کو بھول گیا. کچھ فاصلہ پر پھولوں کے ایک خوشنما درخت کے قریب اس نے ایک عورت کو دیکھا. شاید وہ جنگل کی پری تھی، اس کے گداز بازو اور پاؤں عریاں تھے سنہرے بالوں سے نیلے پھولوں کا ایک لانبا ہار شانوں پر سے ہوتا ہوا سینے پر آکر لوٹ رہا تھا. بالوں کی گھنگھور گھٹائیں، اور اس کی نیلی ستاروں کی طرح گول آنکھیں بجلیوں کی طرح چمک رہی تھیں. گال پتل کے پتوں کی طرح ابھرے ہوئے، اور ہونٹ لالے کے پھولوں کے مانند سرخ تھے حیرت سے اس کے رخسار درخت سے لگے ہوئے پھل کیطرح لال ہو گئے تھے ابھرے ہوئے سینوں کے درمیانی نشیب میں کنول کا ایک نیلا پھول لگا تھا. اور ان چھوٹی پہاڑیوں پر محبت کے ڈاکو کسی بھولے بھٹکے راہرو کی گھات میں منڈلا رہے تھے. اسکا بایاں ہاتھ درخت

کی ایک شاخ پر تھا، دوسرا ہاتھ ایک دوسری نرم شاخ کا گھیرا لیتے ہوئے اس کے چہرے کے سامنے آکر رک گیا تھا۔ اس طرح کہ درمیانی لانبی انگلی اس کے ہونٹ کے نچلے حصے کو مس کر۔۔۔ رہی تھی۔ راجہ کی نظر اس کی نازک باہوں اور ہاتھ کے شاعرانہ دائرہ میں محصور ہو گئی تھی۔ وہ سراپا حسن ایک مورتی کی طرح خاموش کھڑی اسے تک رہی تھی دائیں پاؤں کے پنجوں پر اس کے جسم کا سارا بوجھ تھا اور بایاں پاؤں ٹھیک اس کے پیچھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے حسین ہرنی کلیلیں بھرتے بھرتے یکایک کسی آنیوالے خطرہ کے خوف سے رک گئی ہو۔ وہ مجسم عورت تھی بجز اس کے کہ جیسے کنول کا پھول اس کے سینے پر دل کے دھڑکنے کی وجہ سے موجوں کی طرح اچھل رہا تھا۔

نہ جانے کتنی دیر تک دونوں ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھتے ہوئے خاموش کھڑے رہے۔ دونوں ایک دوسرے میں جذب ہو کر محبت کے خوابوں کی اس بارگاہ میں پہنچ گئے تھے، جہاں برس لمحے معلوم ہوتے ہیں اور وقت سسکیاں لیتا ہوا، مردہ پڑا رہتا ہے۔ آخر اس نے اس سحر کو توڑا، اور اسقدر نرم لہجے میں جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا بولی:

"یقیناً تو کوئی آدمی ہے۔"

ہاں اے اپسرا" راجہ نے حیرت سے جواب دیا۔

اس نے پھر پوچھا: اور تیرے ساتھ یہ کیا ہے؟

اور راجہ نے کہا: "یہ میرا گھوڑا ہے۔"

تب اپنے دونوں ہاتھوں کو ملا کر اور ہتھیلی کو بجاتے ہوئے وہ بولی۔۔

"اچھا کچھ دیر ایسے ہی خاموش کھڑے رہو مجھے دونوں کو غور سے دیکھنے دو۔ اسلئے کہ میں نے آجتک نہ تو کسی آدمی کو دیکھا اور نہ ہی کسی گھوڑے کو:

اس کی خواہش کے مطابق وہ ساکت کھڑا ہو گیا، اور دونوں ایک دوسرے کا معائنہ کرتے رہے۔ اسکی نیلی آنکھیں راجہ کے دل کی گہرائیوں تک پہنچ گئی تھیں۔ اور اس میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں راجہ فرطِ مسرت میں سر سے پاؤں تک لرز اٹھا، اور اپنے دل میں

کہنے لگا: "میں نے بھی کبھی عورت کو نہیں دیکھا۔ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ عورت کو دیکھ رہا ہوں گویا میری عمر کا ہر لمحہ اب تک ضائع ہوتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ میرے تاریک جیون کی نیا یکایک سورج کے دھارے میں بہنے لگی ہے پھر خاموشی کو توڑتے ہوئے اس نے کہا

"اے نیلے پھولوں سے لدی ہوئی عورت کیا تیری ان گہری نیلی آنکھوں نے جو معصوم بچوں کی آنکھوں کے مانند ہیں، کبھی کسی آدمی یا گھوڑے کو نہیں دیکھا۔"

وہ چونکی، جیسے کوئی سپنے سے بیدار ہوتا ہے۔ پھر قریب آئی اور ہاتھ اٹھایا گویا۔۔۔ وہ اس کے بازوؤں کو پکڑ لینا چاہتی ہے۔ لیکن اس نے صرف اپنی ایک انگلی سے اس کے شانوں کو چھوا۔ راجہ کے بدن میں بجلی سی دوڑ گئی پھر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ بولی۔

"لیکن اے خوبصورت بہادر اور بڑی آواز والے آدمی! میں ان چیزوں کو کس طرح دیکھتی، اس لئے کہ نہ تو اس جنگل کے باہر میں کبھی جاتی ہوں اور نہ کوئی اس طرف آتا ہے۔ بڑے بڑے درخت جیسے کہ جنگل کے جانور اور میرا بوڑھا باپ یہی میری کل کائنات ہے

راجہ نے کہا: "تمہارا باپ: کیا وہ کوئی انسان نہیں ہے؟

اس نے جواب دیا: "نہیں! اگر تم انسان ہو، تو وہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ بوڑھا ——— بہت بوڑھا ہے۔ اور مجھ سے بھی زیادہ چھوٹا ہے۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال سفید ہیں اس کے بازو اور ہاتھ پاؤں ہڈی کی طرح سخت اور پتلے ہیں۔ وہ ہمیشہ ایک جگہ پتھر کی طرح بے حس اور خاموش بیٹھا رہتا ہے اور کسی بوڑھے درخت کی طرح کمر کو جھکائے ہر وقت عبادت میں مصروف رہتا ہے۔ اس کا سر اور بدن دونوں برابر ہیں لیکن تو لانبا، سیدھا، مضبوط اور خوبصورت ہے اور میری طرح جوان ہے اور قد میں مجھ سے بہت بڑا ہے۔ میں مشکل سے تیرے کاندھوں تک پہنچ سکتی ہوں، شیروں کی طرح بال چیتوں جیسے بازو، تیری ہر چیز مجھے عجیب معلوم ہوتی ہے۔ میرے خیال میں ایسی شکل کبھی نہ آتی تھی، اس لئے کہ میں ہمیشہ انسانوں کے بارے میں سوچا کرتی، پہروں غور کرتی کہ وہ کیسے ہوں گے لیکن میرے تصور کی حسین سے حسین شکل بھی ایسی نہ تھی جیسا کہ تو ہے، تمہارے اعضا

مقابلہ میں میرے مانند میرے ہاتھ پاؤں کتنے چھوٹے اور کمزور ... زندگی ہستی وسیع اور میری ہستی چھوٹی اور مختصر ہے"

جب تک وہ کہتی رہی، راجہ اسے دیکھتا رہا۔ اور جب وہ خاموش ہو گئی تو جوشِ مسرت سے ہنس پڑا، اور کہنے لگا،

"اے خوبصورت نیلی آنکھوں والی سائرہ۔ تجھکو اپنی شکتی کا اندازہ نہیں ہے اور نہ تو جانتی ہے، کہ وہ کن چیزوں میں پوشیدہ ہے۔ اچھا یہ کہہ تیری کوئی ماں بھی تھی، یا تو پھولوں کی طرح جنگل کے کسی درخت سے پیدا ہو گئی؟"

تب اس نے کہا" نہیں میری ماں تھی، لیکن بہت زمانہ ہوا وہ چلی گئی۔ میری ماں ایک دیوی تھی، اسے اندرا نے میرے باپ کو لبھانے کیلئے اس جنگل میں بھیجا تھا۔ جو اسے دن رات عبادت میں مصروف دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ تب وہ آ کر کچھ عرصہ تک میرے پتا کے پاس رہی تب وہ چلی گئی ——— مجھکو اور بوڑھے باپ کو اس جنگل میں چھوڑ کر اڑتی ہوئی آسمانوں کی طرف چلی گئی"

راجہ نے کہا" میں تیرے پتا پر دوش نہیں لگا سکتا شاید اپنے حسن کے جادو سے اس نے تیرے پتا کو مسحور کر لیا ہو یقیناً وہ اپنی ہونے والی لڑکی سے زیادہ سندر اور کومل رہی ہوگی اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تجھے دیکھ کر اس کے بے پناہ حسن کا اندازہ ٹھیک ٹھیک لگا سکتا ہوں ... ٹھہر بیٹھ مجھے اپنے گھوڑے کو کسی درخت سے باندھ لینے دے پھر اگر تو اجازت دیگی۔ تو ہم دونوں بیٹھ کر کچھ دیر باتیں کریں گے ... ہوں گا اور تجھکو وہ تمام باتیں بتاؤں گا جو تو نہیں جانتی۔ تجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں اور کچھ کہنا بھی ہے، تو صرف اپنے ہی متعلق"

تب مسکراتے ہوئے اس نے کہا" اچھا اس کو باندھ آؤ"

راجہ نے ایک لحہ تک اسے غور سے دیکھا اور پھر کہا،

"نیلی آنکھوں والی کیا تو مجھ سے ڈرتی نہیں؟"

اور بغیر کسی بدگمانی کے راجہ کی طرف حیرت سے دیکھتی ہوئی وہ بولی ——— "ڈر کس کا۔ کیا آدمی بھی آدمی کو نقصان پہنچا سکتا ہے؟"

راجہ نے اسکی مسکراتی ہوئی آنکھوں کی کھڑکیوں سے اس کی معصومیت اور اسکے روح کی پاکیزگی کو دیکھا اور زرا خوشی سے قہقہہ مار کر ہنسنے لگا، اور ہنستے ہوئے اپنے دل میں کہا" آہا اسکی مدہوش کن سادگی کتنی لطیف ہے اپنی معصومیت کی بدولت افسوس وہ نہیں جانتی کہ مردوں کی ۔ ایسی ہستی ہے جو ان پر حکومت کرسکتی ہے:"

اور تب وہ اس سے مخاطب ہوا" حسین جنگلی پھول! اگر میں تجھے توڑ لینے کی کوشش کروں، اور اپنے گھوڑے پر بٹھا کر تجھے لے بھاگوں تب بھی ڈرنے کی بات نہیں، اس لئے کہ تیرا خیال ٹھیک ہے۔ انسان انسان کو دکھ دینا نہیں جانتا، چونکہ سب ایشور ہی کی بنائی ہوئی مخلوق ہی تو ہیں —— اور مردوں کو اسی لئے قوی اور بہادر پیدا کیا، کہ وہ تجھ جیسی نازک اور کومل ہستیوں کی حفاظت کریں"

پھر راجہ نے دل میں کہا" کاش میرے بھٹکے ہوئے ساتھی مجھے شام تک تلاش نہ کر سکیں۔ اور پرماتما کی دیا سے میں اس کنیا کے دل پر قبضہ پا لوں، اور اسکو اپنے ساتھ چلنے پر راضی کر لوں —— اور اگر ایسا نہ ہو تو اس کے ساتھ اس جنگل میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہنے لگوں، اسکی خاطر میں اس جنگل کا کوئی ہرا بھرا درخت ہی بن جاؤنگا تاکہ اس کی نظروں میں تو رہوں۔ خواہ وہ اسے جڑ سے اکھاڑ کر پھینک ہی کیوں نہ دے"

تب اس نے گھوڑے کو ذرا ایک درخت سے باندھ دیا، اور دونوں مل کر سبز گھاس سے لدی ہوئی ان سیڑھیوں پر بیٹھ گئے جنکے قدموں کو ندی کی موجیں آ آ کر چوم رہی تھیں۔

—— ۰ ۲ ۰ ——

راجہ دیر تک اس کو دیکھتا ہوا خاموش بیٹھا رہا لیکن وہ اس کو اس سے زیادہ حیرت سے دیکھتی رہی، ایک پل کے لئے بھی اسکی نگاہ اس کے چہرے سے نہ ہٹی، اور یکایک راجہ نے اس سے پوچھا "نیلی آنکھوں والی کیا تو بتا سکتی ہے، کہ تجھ سے اس جنگل میں باتیں کرتے ہوئے کتنی دیر گذری"

تب اس نے کہا" زیادہ نہیں صرف چند لمحے"

راجہ بولا" تو غلطی پر ہے۔ کئی ہزار سال سے زیادہ عرصہ گذر چکا"

اور جب جنگل کی دوشیزہ نے اسے حیران ہو کر دیکھا، تو راجہ نے کہا "اُف تو کتنی حسین ہے، تیری آنکھیں حیرت سے بھری ہوئی

ہیں اور میرے بدن میں رُوح مسرت کی فراوانی سے لرز رہی ہے۔ موہنی! دیکھ اس بہتی ہوئی ندی نے جب سے جنم لیا ہے اسوقت سے اسی طرح موجیں مار رہی ہے اور یہاں میں ہوں تیرے لئے سب سے پہلا انسان، کیونکہ اس سے پہلے تونے کسی انسان کو نہیں دیکھا اور ادھر تو ہے میرے لئے سب سے پہلی عورت جس سے میں باتیں کر رہا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اب تک دنیا کے پہلے انسان کی طرح تاریکی میں تیرے بغیر ٹھوکریں کھاتا رہا گھومتا رہا خستہ حال، شوریدہ سر اور اکیلا۔ آخر تجھے پالیا، جو عورت نہیں بلکہ عورت کے روپ میں کوئی پوتر دیوی ہے اور جب میں تیرے مکھ کیطرف دیکھتا ہوں تو خوشی سے میری آتما کا ذرہ ذرہ مسکرانے لگتا ہے۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے ہردے کے مندر میں صرف تو ہی تو بس رہی ہے اور یہ سب صرف چند لمحوں میں ہوا۔ یہ لمحے جیون کا ایک نیا دروازہ ہمارے لئے کھول رہے ہیں۔ شاید یہی ہمارا آغاز اور یہی ہمارا انجام ہے؟

تب اس نے کہا" میں تیرا مطلب نہیں سمجھ سکی، لیکن کہے جا گفتگو کا سلسلہ ختم نہ کر تاکہ میں تجھکو دیکھتی رہوں، اور تیری میٹھی آواز ہمیشہ سنتی رہوں"

اور راجہ نے کہا: نیلی آنکھوں والی! اگر تو نہیں سمجھ سکی، تو کوئی ہرج نہیں، ہو سکتا ہے کہ میرے منہ سے بے تکے اور بے معنی الفاظ نکل رہے ہوں، اس لئے کہ تیرے جادو بھرے نینوں نے میرے ہوش وحواس چھین لئے ہیں۔ اور میں نہیں جانتا کہ مجھے کیا کہنا چاہئے لیکن اب تیری باری ہے۔ اس خاموش سونے جنگل میں تو اکیلی کیا کرتی ہے۔ کیا میرے سوا اور کوئی تیرا ساتھی بھی ہے؟

تب وہ بولی، میرے ہردے کو شانتی دینے والے بہت ہیں جنگلی ہرن راج ہنس جو مندر کی گری ہوئی دیوار پر نظر آرہے ہیں، چڑیاں جو دن بسیرے کو روز یہاں آتی ہیں، اور پھول جنکی خوشبو سے میں اپنے بالوں اور کپڑوں کو بساتی ہوں، ان کے علاوہ مجھے اور بھی بہت سے کام رہتے ہیں۔ کبھی گھومتی ہوئی جنگل میں بہت دور چلی جاتی ہوں کھیلتے ہوئے بندر اور بھاگتی ہوئی گلہریوں کو پہروں دیکھتی رہتی ہوں، جب تھک جاتی ہوں، تو بیٹھ کر اپنے ہی بالوں سے کھیلتی ہوں، انگلیوں میں لپیٹتی ہوں، پھر کھول دیتی ہوں، پھر شانوں پر بکھرا لیتی ہوں، اور کبھی اس کی درازی سے بیزار ہو کر انہیں کس کر باندھ دیتی ہوں، کیونکہ یہ میرے قد سے زیادہ بڑے ہیں۔ کبھی اپنے پتا کو دیکھنے جاتی ہوں، لیکن ان سے ڈرتی ہوں، اس لئے کہ اس کا شریر تو وہیں رہتا ہے مگر اس کی رُوح عالم بالا کی سیر کرتی رہتی ہے اور کبھی جب جوا لکھم جاتی ہے۔ تو ندی کے کنارے پاؤں لٹکا کر بیٹھ جاتی ہوں، اور اس کی تہہ میں نیلے آکاش پہ تیرتے ہوئے بادلوں کو دیکھا کرتی ہوں اور ندی خود میری سکھی ہے۔ اس لئے کہ روز میں اسمیں اشنان کرتی رہتی ہوں، اور پہروں سوچتی ہوں کہ یہ کہاں سے آتی ہے۔ اور کہاں جاتی ہے۔ برکھا میں تو اس کا رنگ ہی بدل جاتا ہے غصہ سے سرخ ہو جاتی ہے۔ دن بھر شور کرتی اور بڑبڑاتی ہے۔ اور کبھی ـــــ جب چندرما اپنے سندر روپ سے پردہ سرکا لیتی ہے تو میں درختوں کی آڑ میں چھپ کر ان ہاتھیوں کو دیکھتی ہوں جو ندی کے کنارے پانی کیلئے راتوں کو منڈلاتے رہتے ہیں"

راجہ نے پوچھا: کیا جانور تجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچاتے؟

تب اس نے جواب دیا" نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتے، وہ سب میرے باپ کو خوب جانتے ہیں، جو ان کی زبان جانتا ہے۔ وہ سب اس سے ڈرتے ہیں اس لئے کہ اگر وہ ان کو بددعا دیدے، تو وہ ہمیشہ مصیبتوں کا شکار رہیں"

راجہ بولا" ہاں جو تجھے دکھ پہنچائیں حقیقت میں وہ اس قابل ہیں کہ انکو زمین کے ساتویں طبق کے نیچے ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا جائے، میں تیرے بوڑھے باپ کا شکر گزار ہوں کہ وہ اپنی دعا کی شکتی سے تجھکو ہر مصیبت سے محفوظ رکھتا ہے، ان تمام چیزوں کے باوجود تیری زندگی تنہا اور بے مقصد تھی، کیا تو نے کبھی ایسا نہیں چاہا، کہ تیرا ساتھی تیرے ہی جنس سے کوئی ہو، جو تیرا دل بہلایا کرے؟

تب ایک خاص انداز سے اس نے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔

(باقی آئندہ)

عبدالکریم بی۔ اے

میری انٹونٹ

سوموار ۱۴ اکتوبر ۱۷۹۳ء کو پیرس کی انقلابی عدالت میں ایک مقدمہ چل رہا تھا ایسا مقدمہ جس کی مثال پتھر کی ان بوسیدہ دیواروں نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ میری انٹونٹ۔ لوئی شانزدہم کی بیوہ کا مقدمہ۔ عالی تبار ملکہ بے یار و مددگار، تن تنہا عدالت کے کٹہرے میں کھڑی اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کر رہی تھی۔ گذشتہ شب اس پر فرد جرم لگادی گئی تھی۔ انسانی قسمت کے ایسے دردناک انقلاب کے اظہار کے لئے کونسے الفاظ موزوں ہو سکتے ہیں؟ صرف خاموشی!

اس قسم کے الم انگیز اور خوفناک نتائج کی حامل مثل شاید ہی کبھی مرتب کی گئی ہو۔ گرد و پیش کا منظر ایک بھیانک تصویر پیش کر رہا تھا۔ ہر چیز سے نحوست ٹپک رہی تھی۔ مثل کا سرنامہ زہر ناک تھا ہیبت ناک قصر عدالت ہر چیز گویا موت کا پیغام تھی صفائی کے جو گواہ طلب کئے گئے تھے، وہ خود مہیب موت کا اعلان کر رہے تھے۔ لمبا دھڑنگا کاؤنٹ اٹینگ جو خود کو محب وطن ثابت کرنے کے لئے بیقرار تھا۔ بچاؤ کا کوئی پہلو نہیں پا سکتا تھا۔ اور بیلی جو اس کے جواب میں کہ آیا وہ ملزمہ کو جانتا ہے، اسکی طرف تعظیماً جھک کر جواب دیتا ہے۔

"ہاں، میں میڈم کو جانتا ہوں" بالکل بیکس تھا سابق وزن دست اور سابق وزیر جنکی قسمت کا ستارہ ڈوب چکا تھا۔ وہاں حاضر تھے۔ ہر طرف افسردگی ہر جانب مایوسی اپنے بیگانے سب دشمن۔

میری انٹونٹ فرانس کی ملکہ اس انتہائی بیچارگی کے عالم میں بھی مطمئن نظر آ رہی تھی، فرد جرم سنکر اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے خفیف ترین آثار بھی نمودار نہیں ہوئے۔ گاہے گاہے، اسکی انگلیوں میں جنبش پیدا ہو جاتی، جیسے پیانو بجا رہی ہو، وہ اپنے شاہانہ وقار اور شان و شوکت کو بالکل برقرار رکھے ہوئے تھی۔ اس کے چہرے سے عزم صمیم مترشح تھا، اسکا لہجہ متین، سنجیدہ اور اسکے جواب بے جھجک تھے جن سے اگرچہ حقارت اور نفرت ٹپکتی تھی "تاہم اس نے وقار کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا" "تم انکار پر مصر ہو؟ انکار سے فائدہ۔" "لیکن میں جو پہلے کہہ چکی ہوں وہی سچ ہے اور مجھے اس پر اصرار ہے۔"

نفرت انگیز ہیبرٹ نے کئی باتوں کے بارے میں شہادت دی جن میں ایک انٹونٹ اور اس کے لخت جگر کا معاملہ بھی تھا جس کے متعلق اس سے زیادہ کچھ کہنے کا زبان کو یارا نہیں ملکہ نے ہیبرٹ کو جواب دیدیا۔ ایک ثالث نے اس طرف جیوری کی توجہ دلائی کہ اس نے اس خاص بات کا کوئی جواب نہیں دیا اسکے جواب میں رقت آمیز لہجے میں ملکہ نے کہا:

"میں نے اسکا جواب نہیں دیا ہے۔ کیونکہ ایک ماں کے خلاف ایسے اتہام کا جواب دینے سے فطرت انکار کرتی ہے۔ میں ان تمام ماؤں کی توجہ اس طرف دلاتی ہوں، جو یہاں ہیں"۔ رابس پیرے ایک مشہور بیرسٹر نے جب یہ سنا۔ تو اس نے ہیبرٹ کی ہیبت پر بہت پیچ و تاب کھائے، مگر کیا ہو سکتا تھا؟

آخر بدھ وار کی صبح چار بجے دو دن اور دو راتوں کے متواتر سوال و جواب، تہمت تراشیوں، ریاکاریوں، مکارانہ چالوں کے بعد نتیجہ برآمد ہوتا ہے "سزائے موت! کچھ کہنا چاہتی ہو؟"

ملزمہ نے زبان سے کچھ کہے بغیر سر ہلا دیا۔ آخر شب کے چراغ ٹمٹما رہے ہیں۔ اور اسکی شمع حیات بھی گل ہو رہی ہے۔ عدالت میں سوائے اس جگہ کے جہاں وہ کھڑی ہے روشنی دھندلی ہے — وہ خاموشی کے ساتھ موت کی آغوش میں ابدی نیند سو جانے کے لئے چلی جاتی ہے۔

دو جلوس جن کو تیس سال کا وقفہ ایک دوسرے سے جدا کرتا

ہے۔ عجیب و غریب تفاوت کے باعث ہماری توجہ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ پہلا ایک خوبصورت شہزادی کا جلوس ہے۔ جو پندرہ برس کے سن میں اپنی ماں کے شہر سے الوداع ہو رہی ہے پہلو میں انگوں سے بھرا دل لئے ہوئے ایسی امنگیں جو شاذ و نادر ہی کسی کنواری کے دل میں اٹھی ہونگی۔ وہ ایک ملکی شاہد کھتا ہے جو صبح کو شہزادی وی آنا سے رخصت ہوئی۔ اور گاڑی کی پچھلی نشست پر غم سے نڈھال ہو کر گر پڑتی ہے۔ چہرہ آنسوؤں میں بھیگا ہوا کبھی ہاتھوں سے کبھی رومال سے آنکھوں کو ڈھانپ رہی ہے۔ اور بار بار سر باہر نکال کر اپنے "باوا جداد" کے ان محلات پر نگاہ واپسیں ڈال رہی ہے جہاں پھر کبھی لوٹنا نصیب نہ ہوگا۔ وہ سسکیوں اور ہچکیوں کے درمیان رعایا کے سامنے اپنے غم و شکریہ کے اظہار کیلئے اشارہ کرتی ہے ہر طرف آنسوؤں کا ایک بے پناہ سیلاب امڈ آتا ہے۔ لوگوں کی چیخیں نکل جاتی ہیں۔ عورتیں اور مرد غم کے اس اظہار میں برابر کے شریک ہیں۔ ان ولدوز چیخوں کی صداؤں سے وی آنا کے کوچہ و بازار گونج اٹھتے ہیں۔ آخر سر ماؤں کی پلی شہزادی کی گاڑی آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور مجمع منتشر ہوتا ہوا اپنے گھروں کو لوٹ جاتا ہے

پندرہ برس کی دبلی دوشیزہ شہزادی اب اڑتیس برس کی سالخوردہ بیوہ بن چکی ہے جس کا تاج و تخت چھن چکا ہے۔ جس کے بال وقت سے پہلے سفید ہو چکے ہیں یہ آخری جلوس ہے . . .

. . . مقدمے کا فیصلہ سنائے جانے کے چند ہی منٹ بعد پیرس کی تمام چوکیوں میں نقارے پیٹ کر فوجوں کو تیار رہنے کا حکم سنایا جاتا ہے۔ طلوعِ آفتاب کے ساتھ ہی مسلح فوجوں کی نقل و حرکت شروع ہو گئی ہے۔ اور پلوں کے سروں پر چوراہوں میں نیز ایوانِ عدالت سے قصرِ انقلاب تک تمام راستے میں ضروری مقامات پر توپیں نصب کردی گئی ہیں۔ متعدد دستے بازاروں میں گشت لگا رہے ہیں گیارہ بجے پیرس کی جلاد انطوانیت ملکہ کو بلانے جاتی ہے۔ وہ معمولی سفید لباس پہنے ہوئے ہے۔ اسے قتل گاہ تک بالکل ایک معمولی مجرم کی طرح بیجایا جاتا ہے۔ دست و پا بستہ، گاڑی پر ایک پادری کی معیت میں پیادہ و سوار فوج کے بے شمار دستوں کی حفاظت میں . . . . . ہر طرف اور فوج کی دوہری قطاروں کی طرف جو تمام راستے کے ساتھ ساتھ متعین ہیں، وہ کوئی توجہ نہیں دیتی اس کے بشرے سے اس کی قلبی حالت کا پتہ لگانا ممکن نہیں نعرہائے "جمہوریت زندہ باد، ظالم برباد ہو" اب تک بڑے جوش کے ساتھ لگائے جا رہے ہیں لیکن اس پر کچھ اثر نہیں کرتے وہ پادری کے ساتھ اعتراف گناہ کے بارے میں خاموشی اختیار کئے رکھتی ہے۔ وہ زیادہ تر مکانوں کے اوپر لہراتے ہوئے سہ رنگے انقلابی جھنڈوں کو دیکھتی رہتی ہے۔ یا مکانوں کے سامنے کی تحریروں کو قصرِ انقلاب میں پہنچنے پر اسکی نگاہیں بے اختیار شاہی محلات کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ اسوقت اس پر ایک ہیجان کی سی رقت طاری ہوتی ہے لیکن وہ فوراً سنبھل جاتی ہے۔ اور بڑی دلیری کے ساتھ پھانسی کے تختے پر چڑھ جاتی ہے۔ ٹھیک سوا بارہ بجے ملکہ کا سر تن سے جدا ہو جاتا ہے۔ جلاد اس کا سر لوگوں کو دکھاتا ہے۔ فضا نعرہائے "زندہ باد جمہوریت" سے دیر تک گونجتی رہتی ہے۔

اطلاع

جن حضرات کو ختم میعادِ خریداری کی چٹھیاں لکھی گئی ہیں اور جن کی میعادِ خریداری اس ماہ ختم ہو رہی ہے۔ ہماری چٹھیوں کا کوئی جواب نہ آنے پر انہیں اگلا پرچہ بذریعہ وی پی بھیجا جاوے گا ضروری ہے کہ وہ حضرات وی پی وصول پائیں یا وی پی سے پیشتر منی آرڈر ارسال کر دیں۔

مسعود جاوید

نگہت کے خطوط

نشاط روح :

تمہارا مکتوب شوق ایک ہفتے سے آیا ہوا رکھا ہے اور میں نے مدت اس لئے اب تک جواب نہیں لکھا کہ میری تعویذ نگاری کی متعلق تمہارا جذبۂ شکوہ گذاری کہیں مضحمل نہ ہو جائے جس نامراد قلب کی نذیت میں نے کبھی دست تسلی کا خواب بھی نہ دیکھا ہو ۔۔۔ جس بدبخت زندگی نے کبھی اس سپردگی بے اختیار کا تجربہ نہ کیا ہو جس کے مقدس وجود کا اعتراف کر کے مذہب و اخلاق نے بھی عورت کے لئے کچھ دیر کیلئے ترک حیا کو گوارا کر لیا ۔۔۔ اس نامراد قلب اور بدروح زندگی کیلئے ایک محبت کرنے والی ہستی کی شکوہ سنجیاں کیا کچھ ہیں، اس کا جواب تم مجھ سے نہ پوچھو پروین ۔۔۔ میں چاہتی ہوں کہ خاموش رہوں اور تم کبھی ہنس کر کبھی برہم ہو کر اپنی محبت کے سانچے جھنجھلا جھنجھلا کر شکایات لطیف کی رنگینیاں تخلیق کرتی رہو کبھی اپنے معصوم تبسم کی بوچھار میں مجھے شرابور کر دو اور کبھی اپنی کیوپڈ کی کمان جیسی محبت آفریں پیشانی پر سیمین شکنیں ڈال کر مجھے اپنے خلوص کی پوری قوتوں کے ساتھ سخت سست کہتی چلی جاؤ۔ اور پھر تبسم نہ کھینچنے کی کوششوں میں ناکام ہو کر جب تم خود بھی مضحمل ہو کر بیٹھ رہو تو میں اپنے پشیمان آنسوؤں کے درمیان مسکراتی ہوئی تمہاری بلوریں گردن میں اپنے بازو حمائل کر دوں!! ۔۔۔ تم ہنس رہی ہو پروین؟ میری دیوانگی پر؟ ۔۔۔ ہاں خوب ہنسو ۔۔۔ ازدواجی تعلقات کے پرتمکین گریہ پرور سال ستاروں اور اشکوں کی موجودگی میں بسر کرنے کے بعد اب میں بھی ہنسنا چاہتی ہوں۔ آہ! تم جانتی نہیں سکھی، محبت کی اس خلقی تشنگی کو جو انسان اور خصوصاً عورت کے خمیر میں حلول کر دی گئی ہے۔ محبت عورت کا جبلی مذہب ہے اور جس طرح انسان دنیا میں کسی مذہب کا پابند ہوئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، اسی طرح عورت کے لئے اسکا یہ جبلی مسلک ناگزیر ہے۔ عورت کسی حال میں ہو اس کی روح کا یہ مقدس تقاضا ناگزیر ہو کر رہتا ہے۔ ازدواج سے پہلے وہ اپنی گڑیا کو چاہتی ہے اور اپنے قریب ترین اعزا کو ۔۔۔ ازدواج پر وہ شوہر کی پوجا کرتی ہے اور پھر اپنی اولاد کا پریم ۔۔۔ اور اسکی محبت کا یہ آخری مظہر ہی بلند ترین شے ہے۔ پھر اگر کوئی عورت ۔۔۔ پریم کی ماری دکھیا عورت ۔۔۔ سماج کی ستائی ہوئی نیم جان عورت اپنے شوہر کی نگاہوں کی نرمی اور کیفیت سے اپنی محبت کو ارتقا کے بلند ترین درجے پر پروان نہ چڑھا سکنے پر مجبور کر دی جائے تو تم ہی بتاؤ کہ وہ تڑپ تڑپ کر خود ہی اپنا گلا نہ گھونٹ لے تو کیا کرے۔ اور اگر مذہب و اخلاق کے قوانین کا احترام کر کے وہ اس جواں مرگی سے دست کش ہو کر زندہ بھی رہے تو اسے خود کو فریب حیات دینے کا ذریعہ تم جیسی بے لوث دوستوں کے علاوہ اور کہاں مل سکتا ہے۔ مجھے احساس ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو لیکن کبھی کبھی اپنی نامرادیوں کے تحت یہ احساس بھی ایک خودفریبی معلوم ہوتا ہے۔ اور تمہاری محبت کا یقین پھر اس وقت تک نہیں آتا جب تک تم اپنے معصوم شکووں کا کوئی شیریں و جاں آفریں تیر میرے دل کی گہرائیوں میں پیوست نہیں کر دیتی ہو ۔۔۔ ایک بے حس چٹان پر ننھی ننھی موجوں کا کیا اثر؟ جب تک کہ کوئی طاقتور سیلاب اس چٹان سے متصادم نہ ہو! ۔۔۔ پھر مجھ سے زیادہ بے حس چٹان کا اطلاق اور کس پر ہو سکتا ہے اور تمہاری شکایت ہائے رنگین سے زیادہ اور کس چیز کو طاقتور سیلاب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟

تم پوچھتی ہو کہ میں شعر بھی کہہ لیتی ہوں کہ نہیں؟ ۔۔۔ کتنا معصوم استفسار ہے! تم نے یہ ۔۔۔ ہاں کیوں نہ کیا کہ تم رو بھی لیتی ہو، کہ نہیں۔؟ اسمیں کلام نہیں کہ اتنی مدت تک میری دوست اور ہمراز رہنے کے باوجود تم نے میری دردسرائی کو نہیں سنا شاید اسی لئے کہ میں خود بھی اسے شنیدنی تصور نہیں کرتی۔ لیکن کیا تم اب تک صرف اس قدر بھی تصور نہیں کر سکیں، کہ نگہت کی زندگی کا ہر نفس ایک تان ہے سوہنی

کی — ایک راگنی ہے کسی برہ کی ماری نیوگنی کی —— یہ حقیقت ہے کہ محبت اور شاعری میں چولی دامن کا ساتھ ہے خصوصاً اس قسم کی شاعری میں جسے صرف "میرا بائی" کی نوحہ سرائیوں سے تعبیر کیا جاسکتا ہے —— اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ محبت کا قلب اب تک اس لذیذ جسک سے نامانوس ہے —— اور اس لئے شاید کوئی کہدے کہ تو شعر کیسے کہہ سکتی ہے۔ لیکن اگر شاعری صرف جذبات حزن و طرب کی ترجمانی ہے۔ تو میں کہوں گی کہ میرے دل سے زیادہ حزن و ملال اور کہاں ملے گا؟ —— میں محبت سے محروم ہوں —— صحیح —— لیکن پنے ملیں اس جاں سوز محرومی کا احساس بھی تو رکھتی ہوں۔ کیا ایسا جذبات کو بر انگیختہ اور لبوں کو مترنم کر دینے کیلئے کافی نہیں؟

بایں ہمہ میں نے اب تک جو کچھ کہا ہے اسے شاعری نہیں سمجھی میرے پاس ان پریشان خیالیوں کا کافی ذخیرہ جمع ہو چکا ہے۔ رات کے سناٹے میں —— دوپہر کے سکوت میں —— شام کی خاموشیوں میں —— سوتے جاگتے —— دل کی چند دھڑکنیں تڑپ کر الفاظ کی صورت میں لبوں سے باہر نکل پڑتی ہیں۔ جن کے اندر نہ کوئی ربط ہوتا ہے۔ اور نہ کوئی سلسلہ —— وزن اور قافیہ کا وجود نہ ہوتا تو میں ان کو نثر ہی کہدیتی۔ خدا جانے یہ کیا ہے؟ —— تم مصر ہو تو سنائے دیتی ہوں، مگر صرف یہ پوچھنے کے واسطے کہ تم ان منتشر خیالوں کو کیا سمجھتی ہو —— لیکن پہلے یہ خوب سمجھ لو کہ ان نوا ہائے جذبات کا مخاطب کوئی نہیں۔ کرب کراہ کی یہ آوازیں کس کے سنانے کو بلند کی گئی ہیں۔ اس کا جواب خود مجھے بھی معلوم نہیں۔ —— میں نے تو جو کچھ محسوس کیا کہدیا۔

رات میرے سر میں سخت درد تھا، اور کسی طرح نیند نہ آتی تھی۔ "وہ" حسب قاعدہ میری تکلیف سے بے نیاز اپنا لمبا کرتا اتارے پڑے سو رہے تھے۔ ان بے چین لمحات میں تنہائی کے احساسات کو دور کرنے واسطے میں نے مجبوراً "ادب لطیف" کا سالنامہ دیکھنا شروع کیا۔ لیکن درد کے باعث ذرا سی دیر میں سر گھومنے لگا۔ مجبوراً رسالہ بند کر دیا اور چپ چاپ لیٹ گئی۔ مندرجہ ذیل اشعار اسی وقت کی کیفیات سے متعلق ہیں:—

یہ کرم بھی کم ہے کیا صیاد کا × قید کی وسعت میں بھی آزاد ہوں
آنکھ میں آنسو ہیں جاں خوں ہو رہی ہے × پہلے فریادی تھی اب فریاد ہوں
مر رہی ہوں اور مر سکتی نہیں × ہائے اب تک میں تمہیں کیوں یاد ہوں
میری بربادی سے نسبت ہے تمہیں × ورنہ میں بربادیِ برباد ہوں

. . . .

دل بھی اب رونے لگا ہے اے ندیم
دیکھ لے آنسو میں سرخی آگئی
تم سے تو اچھی تمہاری یاد ہے!
آئی اور آکر ہمیں بہلا گئی!

. . . .

اب کہاں خونِ تمنا کی وہ پیہم بارشیں
اب تو دامن کی طرف دیکھ کے رو لیتی ہوں

. . . .

تمہیں نہ چاہو تو بتلاؤ پھر کہاں سے آئے
وہ صبر جس کو تمہاری نگہ نے لوٹا تھا
جو لب تک آکے خموشی میں کھو گئی ہائے
اس ایک آہ میں کس کو خبر ہے کیا کیا تھا

. . . .

ناچیز آنسوؤں کی اللہ رے قدر و قیمت
ہم حال کہہ رہے ہیں وہ مسکرا رہے ہیں

یہ ہے میری وہ درد سرائی، جس کے سننے کے واسطے تم اسقدر بے تابیوں کا مظاہرہ کر چکی ہو۔ اب تم خود ہی کہدو کہ بھلا یہ کوئی سننے کی چیز ہے!

"وہ" کیسے ہیں؟ —— اس کا جواب میں دوں تو کیا؟ — کاش تمہیں اپنا کلیجہ دکھا سکتی، کہ اس پر کتنے زخموں کا اضافہ ہو چکا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے تیر و سناں کی طرف سے اپنے پہلو کو بے حس و سنگیں بنانے کی کوشش کرتی ہوں، لیکن پھر بھی جمود کی اس تہہ کے نیچے سوئی ہوئی انسانی کمزوری تو دور نہیں کیجا سکتی

ہاں یہ خبر صحیح ہے کہ میں دو بار سینما جا چکی ہوں۔ تم جانتی ہو کہ میں سینما کے خلاف کس درجہ شدید جذبات رکھتی تھی —— وہ

جذبات آج بھی موجود ہیں۔ میرے نزدیک سینما آج بھی ایک مخرب مذاق اور دشمن اخلاق چیز ہے۔ لیکن جسطرح ایک جاں بلب مریض کے واسطے شراب کا استعمال جائز ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ لہو ولعب اور نشاط نفسی کے ذرائع میرے واسطے کھل گئے ہیں۔ پھر میں ہاں اس لئے نہیں جاتی کہ فلم کی عشوہ فروش اداکاریوں سے محظوظ اور اسکے افسانے کی عیش پرستیوں سے متکیف ہوں ——حاشا ہرگز نہیں —— باورکرو میرے واسطے تو سینما کے پرتکلف ہال کو ایک قبرستان میں بیٹھنا برابر ہے۔ آہ —— سماج کے خوں ریز اصولوں نے میرے مسرت و تفریح کے تمام جذبات کو ذبح کر ڈالا ہے جس عورت کے پہلو میں اپنے شوہر کی بےحسی اور بے نیازی ہمیشہ ایک خون آشام کانٹے کیطرح کھٹکتی ہو، وہ سینما کی تفریح سے کیا حظ اندوز ہو گی؟ —— شوہر عورت کا دیوتا ہے۔ اور جب یہ دیوتا ہی ایک پتھر کی مورتی بن جائے، تو پھر ساری دنیا بھی تبسم ہی تبسم بن جائے تو کیا —— آہ! پروین

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
ایک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

کہو ہمارے بھیا تو اچھے ہیں نا؟ —— ان کے پارہ ہائے جذبات سئے ہوئے تو مدت ہو گئی۔ اگر احساسات رشک اجازت دیں تو میرا سلام کہہ دینا ان سے۔

تمہاری نگہت

سرمایۂ انبساط!

خوب! —— قسم کھاتی ہو کہ اب کبھی شکوہ نہ کرو گی، —— گویا یہ جواب دیا ہے تم نے میری محبت کی ان بیچارگیوں کا جو تمہاری شکایات کو میرے لئے باعث تسکین بنائے ہوئے ہیں؟ —— تم بہت شوخ ہو چلی ہو پروین! اگر ان معصوم شرارتوں کا یہی ارتقاء رہا، تو مجھ جیسی نحیف و نزار کے پاس تو تڑپنے کی بھی سکت نہ رہے گی شاید سٹیونسن نے کہا تھا —— "وہ محبت کرنا کچھ نہیں، محبت کیا جانا البتہ کچھ ہے۔ مگر محبت کے بدلے محبت کیا جانا سب کچھ ہے —"

اور اب غالباً تم اسی "سب کچھ" کو حاصل کر کے پندار پرست ہو گئی ہو ہاں ضرور ہو جاؤ، مگر اتنا خیال کر لو کہ آخر دنیا کا یہ نظام بھی قائم رہنے دو گی یا نہیں؟ مصر کی ماہ جبیں ملکہ قلوپطرہ نے، حساس مجال کے نشہ میں بدمست ہو کر سلطنتوں کو ٹھکرا کر پامال کر دیا۔ ورسینکڑوں جوانیوں کو صرف یک لمحی نشاط کی خاطر زہر کے جام پلوا دیئے —— خدا نہ کرے کہ تم قلوپطرہ بنو۔ لیکن کیا میری زندگی کو بھی تم انطونی کیطرح مسحور کر دینا چاہتی ہو اور اسقدر مسحور کہ میں سب کچھ چھوڑ کر تمہاری ہو جاؤں اگر خدا نا کردہ یہی ارادہ ہے تو میرے علاوہ خود تمہارے "ان" کا . . .

بس اللہ ہی بیلی ہے۔ شاعر تو وہ پہلے ہی سے ہیں —— اور تم جانتی ہو کہ شاعری سے آگے دوسری منزل مجذوبیت ہی کی ہے!! —— یہ کوئی ہمارے وہ نہ باشد کہ "زمیں جنبد زماں جنبد نہ جنبد گل محمد" —— آیا عقل شریف میں؟

افسانے؟ —— جی ہاں افسانے مجھے بہت محبوب ہیں میری نظریں رسائل میں اولین کام یہی کرتی ہیں کہ افسانے تلاش کریں تم نے یہ تذکرہ تاسف چھیڑا ہے۔ تو اب صاف صاف بھی سن لو رسائل میں یہ بلاناغہ شائع ہونے والی داستانیں جن کو افسانہ کہا جاتا ہے پچانوے فیصدی خرافات سے زیادہ نہیں ہوتیں تم خود جانتی ہو کہ افسانہ جب تک حیات انسانی سے مربوط نہ ہو فنی لحاظ سے "افسانہ" نہیں ہو سکتا۔ ہمارے افسانے حیات انسانی سے مربوط تو ہیں۔ مگر صرف اس شعبۂ حیات میں جس کے جذبات سے بیخود ہو کر نغمہ سنجیاں کرنا ایک ترقی یافتہ قوم ہی کو زیب ہے۔ ہمارے افسانے صرف واردات محبت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اور وہ بھی بعض اوقات پست ترین انداز میں —— یہی وجہ ہے کہ تم بلا مبالغہ ہر ایک افسانے کا مطالعہ کئے بغیر ہی یہ بتا سکتی ہو کہ اس میں ایک ہیرو ہو گا، ایک ہیروئن دونوں میں سے کوئی ایک محبت کرے گا یا دونوں —— اور انجام ہو گا شادی پر یا موت پر! —— یہ ہے وہ عالمگیر خاکہ جس پر اردو کے کم و بیش تمام تر افسانے محیط نظر آتے ہیں —— یہی سبب ہے کہ ان میں یکسانیت اور یکرنگی ہوتی ہے —— تنوع نہیں —— جس طرح زندگی کا کوئی ایک واقعہ ایک شاعر سے اشعار موزوں کرا لیتا ہے

اسی طرح وہ ایک افسانہ نگار کے قلم کو کہانی تخلیق کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ لہٰذا یہ ظاہر ہے کہ ایک کامیاب افسانہ زندگی کے کسی حقیقی یا قیاسی و امکانی واقعہ کی تفسیر ہونا چاہیئے۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ اگرچہ زندگی کا کوئی ایک واقعہ دوسرے سے ملتا جلتا نہیں ہوتا، مگر ان واقعات کی یہ افسانوی تصویریں بالکل ایک دوسرے کا عکس معلوم ہوتی ہیں ——کیوں ؟—— صرف اس لئے کہ ہمارے افسانے بہت کم زندگی کے حقیقی یا امکانی واقعات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ افسانہ نگاروں میں مشاہدہ حیات اور تنقید زندگی کی اہلیت ہی نہیں حالانکہ ایک افسانہ نویس کے لئے نقاد حیات کا فرض اتنا ہی لازم ہے، جتنا کہ دیکھنے کیلئے آنکھیں —— اگر کوئی چاہے تو کیا ہمارے سماج کے حدود میں افسانہ نویس کے لئے کچھ کم سامان موجود ہے ؟ معصوم دوشیزہ لڑکیوں کے خشک حلقوم پر فرمانبرداری بزرگوں کی عظمت کا تیز خنجر رکھ کر بے از دواج کے سلسلے میں جو ذبح کیا جاتا ہے —— جب رسم کی قربان گاہ پر مذہب و خلاق کے صحیح اصول بھینٹ چڑھانے کیلئے انتخاب شوہر کے مرحلے میں مشرقی حیا پروردہ دوشیزہ کی خاموشی کو نیم رضا سمجھ لیا جاتا ہے —— جب صرف دولت اور وقار نسبی کیلئے سماج نوجوان ہستیوں کی زندگی خود ان کے والدین کے ہاتھوں ہمیشہ کے واسطے برباد کر دیتا ہے —— کیا ان تمام مواقع کے اندر افسانہ نویس کو اپنے قارئین کی ضیافت و بصیرت کا کوئی سامان نظر نہیں آتا ؟ ؟ —— اس میں شک نہیں کہ افسانے کیلئے کم از کم میرے خیال میں "محبت" ناگزیر ہے۔

افسانہ نویسی ایک فنِ لطیف ہے اور تمام فنونِ لطیفہ جمالیات کے اظہار کا آلہ ہیں لیکن اس میں کلام نہیں کہ جو افسانہ صرف عاشقانہ انجام پر ختم ہوتا ہے۔ وہ خواہ قارئین کے جمالیاتی ذوق کی تشنگی فرو کر دے لیکن "نقاد حیات" ہونے کے اہم ترین فرض کو انجام نہیں دے سکتا۔

توبہ ! —— میں نہ جانے کیا کیا لکھ گئی۔ تم کہتی ہوگی عجب دیوانی ہے ایک بات پوچھ کر دامن چھڑانا دشوار ہو گیا۔

میں افسانہ لکھتی ہوں یا نہیں ؟ —————— واہ ! یہ تم نے خوب سوجھی ! افسانہ نگاری پر میں نے اردو اور انگریزی کی چند کتابیں ضرور دیکھی ہیں۔ لیکن اسکا مطلب یہ ہرگز نہیں، کہ میں خود بھی کوئی کہانی تخلیق کر سکتی ہوں ——————

—— میری زندگی تو خود ایک جانگداز افسانہ ہے قدرت کے قلم کا —————— اور اسے تحریری صورت میں پہنچنے کے لئے ابھی دُور نہ افسانہ نگاروں کی ذہنیت کے انقلاب کی ضرورت ہے۔

"نگہت پریشاں"

نالۂ دل

اختر انصاری
بی اے آنرز

ہائے وہ بستیاں اجڑتی ہیں اُف مری آنکھیں چھلکی پڑتی ہیں
اے دل اپنی متاع سے ہشیار اُن کے نظروں سے نظریں لڑتی ہیں
شکوہ کیوں کیجئے کہ تقدیریں یونہی بنتی ہیں اور بگڑتی ہیں
رات بھیگی ہے اور ہوائے خنک ٹھنڈی ٹھنڈی پھواریں پڑتی ہیں

لیکن اختر تیری آنکھوں سے
کیسی چنگاریاں سی جھڑتی ہیں

سید ضمیر جعفری
بی اے

... کی طرف جاتے ہوئے

سلام اے بزمِ غم! اب محفلِ عشرت کو جاتا ہوں
ہجومِ یاس میں سرچشمۂ راحت کو پاتا ہوں
مری جنّت جہاں ہے، میں اسی جنت کو جاتا ہوں
اڑا جاتا ہوں میں، اک نغمۂ بے تاب کی صورت
کسی زہرہ بدن کے "آسمانی خواب" کی صورت

یہ وادی نو بہاروں کی، یہ وادی نغمہ زاروں کی
یہ وادی، رودباروں کی یہ وادی آبشاروں کی
یہ وادی ماہ پاروں کی، یہ وادی چاند تاروں کی
مرے خوابوں کی شہزادی اسی وادی میں رہتی ہے
وہ روحِ جانِ آبادی اس آبادی میں رہتی ہے

وہاں خوابیدہ قسمت کو جگانے جا رہا ہوں میں
بلایا جا رہا ہوں، اور بلانے جا رہا ہوں میں
خود اپنے ہاتھ سے بگڑی بنانے جا رہا ہوں میں
بہت دلشاد جاتا ہوں، بڑا مسرور جاتا ہوں
لپکتا کوندتا، مانندِ برقِ طور جاتا ہوں

جہاں وہ حور ــــ "حورِ آسمانی" بن کے رہتی ہے
شباب و شعر کی رنگیں کہانی بن کے رہتی ہے
زمیں پر ۔ چاند تاروں کی جوانی بن کے رہتی ہے

چلا جاتا ہوں سیلِ کیف و مستی کے سہارے پر
بہی جاتی ہے، میری رُوح اس گنگا کے دھارے پر

میں جاؤں گا اور اپنے عشق کے نغمے سناؤں گا
وہ میرے گیت گائے گی، میں اسکے گیت گاؤں گا
اور اپنی رس بھری تانوں سے تارے توڑ لاؤں گا

مری دُنیا بنے گی اک بہار و رنگ کی دُنیا
شباب و شعر و مستی ـــ نغمہ و آہنگ کی دنیا

ستم کو بھول جاؤں گا، جفا کو بھول جاؤں گا
زمانے کے ہر اندوہ و بلا کو بھول جاؤں گا
محبت کی قسم ہے میں خدا کو بھول جاؤں گا

میرزا ادیب

غلاموں کی بغاوت

برفی سائبن کے شمالی حصے میں جہاں پہاڑوں کا سلسلہ ایک سرے سے شروع ہو کر دوسرے سرے کی لامتناہی وسعتوں میں گم ہو جاتا ہے، ظالم سردار "ضولت" کے چند غلام الاؤ کے گرد بیٹھے سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے جسموں کو حرارت پہنچا رہے تھے۔ پہاڑی علاقہ اور پھر صبح کا وقت، وہ سردی تھی کہ الاماں! تیز و تند ہوا کے جسم خراش جھونکے زرد زرد شعلوں کو تھپیڑے لگاتے، چہروں پر نشتر زنی کرتے، انسانی زندگی کے لئے ناقابل برداشت اذیت کا سامان پیدا کر رہے تھے۔ بدنصیب غلام کبھی اپنے چہرے آگ کے بالکل قریب لے جاتے اور کبھی سیاہ رنگ پاؤں شعلوں پر رکھ دیتے، آہ! وہ اپنے لرزتے ہوئے، کانپتے ہوئے جسموں کو شعلوں ہی کے سپرد کر دینا چاہتے تھے —— شعلوں ہی سے لپٹ جانا چاہتے تھے۔

اتنے میں ایک چھوٹا سا لڑکا بھی سمٹا سمٹایا، دبکا دبکایا بیٹھا تھا۔ چند لمحے خاموشی طاری رہی۔ پھر ایک غلام نے آگ سے گرم ہاتھ اٹھا کر چہرے پر پھیرتے ہوئے کہا: "ایسی ذلیل زندگی سے تو موت ہزار درجہ بہتر ہے۔ معلوم نہیں قدرت کس بات کا ہم سے انتقام لے رہی ہے خونخوار بھیڑیا خدا کا قہر ہے۔ مظلوموں کی آہیں اور بد دعائیں آج تک اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں۔"

"قدرت کے انتقام کو شکست دینا انسانی طاقت سے باہر ہے۔" دوسرے نے کہا۔ اور ابھی وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ قریب سے ایک آواز "خونخوار بھیڑیا" کہتی ہوئی سنائی دی۔ تمام کھڑے ہو گئے۔ اور گرتے پڑتے پہاڑ پر چڑھنے لگے۔ دو تین منٹ کے بعد الاؤ کے پاس صرف ایک بوڑھا اور لڑکا رہ گئے۔ ایک تو پہلے ہی وہ شدتِ سرما سے کانپ رہے تھے۔ اب متذکرہ بالا الفاظ سن کر اور اپنے ساتھیوں کو اس طرح بھاگتے دیکھ کر ان پر لرزہ طاری ہو گیا۔ بوڑھا پہاڑ کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے بوڑھے کمزور ہاتھ برف جیسے سرد پتھر پر لرزنے لگے۔ سرد جھونکے اس کے جھریدار نیلے پیلے گوشت میں سے خنجر کی طرح گزر گزر کر، کمزور ہڈیوں کے ساتھ ٹکرا رہے تھے۔ لڑکا بھی اس کے قریب کھڑا تھا۔ اس نے بچے کو دیکھ کر کانپتے ہوئے لہجے میں کہا: "سہیل —— یہاں سے بھاگ —— جاؤ!"

"کہاں بابا!" لڑکے کے لبوں سے نکلا۔

"کہیں —— چھپ جاؤ —— جلدی کرو —— خونخوار بھیڑیا آ رہا ہے!"

پاؤں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ لڑکا بھاگ کر ایک طرف چلا گیا۔ ایک آدھ منٹ گزرنے کے بعد ضعیف انسان نے سامنے دیکھا —— دو سرخ، غضبناک اور شعلہ ریز آنکھیں ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اس نے ایک ہاتھ سینے پر رکھ لیا اور اپنی نگاہیں ایک ٹیلے پر جما دیں۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ زمین پہاڑوں کو اپنے سینے پر اٹھائے عمیق گہرائیوں میں ڈوب رہی ہے۔

ایک گرجتی ہوئی آواز سنائی دی۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ ٹیلا جس پر اس نے نگاہیں جما رکھی تھیں۔ دھوئیں کے ایک کثیف بادل کی طرح دو آتشیں شعلوں میں غائب ہو گیا۔ وہ

خونخوار آنکھیں اس کے چہرے کے قریب آگئی تھیں "کیوں بوڑھے پاجی! یہاں آگ تاپ رہے ہو۔۔۔؟" صولت نے گرج کر کہا۔

"حضور! میں بوڑھا۔۔۔ بوڑھا۔۔۔" آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ آواز اس کے حلق میں اٹک گئی۔ اور وہ اپنے ظالم آقا کے چہرے پر صرف ملتجیانہ نظریں ڈال کر رہ گیا۔

"تم کام کرنا نہیں چاہتے پاجی!" . . .

یہ کہتے ہوئے صولت نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اور اپنا ہاتھ ایک خادم کی طرف بڑھایا۔ خادم نے چابک اس کے ہاتھ میں دیدی۔ بدقسمت بوڑھے نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر صولت اور چابک کو دیکھا۔ آخری بار اس کی التجا آمیز نگاہوں نے زبانِ خاموشی سے بھیڑیے کی شعلہ ریز نظروں سے رحم کی بھیک مانگی۔ اور اپنے ہاتھ صولت کے ہاتھوں کی طرف بڑھائے۔

"شائیں" کی آواز پیدا ہوئی۔ اور اس کے جھُرّی دار ہاتھ پر چابک کا نشان اس طرح نظر آنے لگا۔ جس طرح جلے ہوئے جنگل پر دھوئیں کی ایک کثیف چادر چھائی ہوئی ہو۔ ظلم کی مشین اپنا کام کرنے لگی۔ اور ضعیف جسم کی کھال پرزے پرزے ہونے لگی۔ ظالم سردار کے لئے اس قسم کے ظلم کا مظاہرہ روزمرہ کا معمول تھا۔ قدرت نے اُسے پیدا ہی اس لئے کیا تھا۔ کہ وہ بے کس انسانوں کی کھال ادھیڑے، کمزور مخلوق کے سینے کو اپنے پاؤں کے نیچے کچلے اور خلقِ خدا کے خون سے ہولی کھیلے۔ کونسی سفاکی تھی جس سے اس کے خونخوار دل نے پرہیز کیا تھا، کون سا ستم تھا جس سے اس کا دامنِ حیات بے داغ تھا!

آج سے نو سال پیشتر اس نے "ارضِ سایہین" پر بے کسی کی حالت میں قدم رکھے تھے۔ اس کے ساتھ تین چار آدمی تھے۔ شبانہ روز محنت کے بعد وہ غاروں میں سے چند چمکتے ہوئے ٹکڑے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ صولت کی زندگی کی پہلی کامیابی تھی۔ اس کے بعد اس کی دولت کے انبار میں اضافہ ہونے لگا اور جیسے جیسے اس کی طاقت بڑھتی گئی اُس کے مظالم بھی بڑھتے گئے۔ اُسے ظلم سے کون روک سکتا تھا!

"ارضِ سایہین" ایک مختصر سا علاقہ تھا۔ تین طرف سے پہاڑوں میں گھرا ہوا۔۔۔ آبادی سے کوسوں دُور!

صولت کا جہاز سال میں ایک مرتبہ ہیرے اور جواہرات لے کر روانہ ہوتا تھا۔ اور کچھ مدت کے بعد علاوہ ضروریاتِ زندگی کے چند اُن بدنصیب انسانوں کو بھی لے آتا تھا۔ جنہیں صولت یا اس کے ساتھی لالچ وغیرہ دے کر جہاز میں سوار کر لیتے تھے۔ صولت اِن بدبختوں کو زرخرید غلام سمجھتا تھا۔ اور ان پر ایسے ایسے ظلم کرتا۔ جن کا تصور بھی ایک "مہذب ذہن" میں نہیں آ سکتا۔

صبح سے لے کر شام تک یہ بےکس غلام ہل چلا کر اس کے کھیتوں اور باغوں کو سرسبز کرتے۔ اور بڑے بڑے پتھروں سے اس کے عالیشان مکانات تعمیر کرتے۔ اگرچہ ہر ایک غلام مشقت کے بارِ گراں کے نیچے کچلا جا رہا تھا۔ پھر بھی اگر کوئی شکوہ کرتا یا چند منٹ کے لئے آرام لیتا۔ تو ظالم صولت کی چابک سے اس کی کھال اُدھڑنے لگتی۔ ظالم صولت کبھی یہ خیال بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کہ اس کی عدول حکمی ہو سکتی ہے۔

"ارضِ سایہین" میں اُس کے دو نام تھے۔ ایک محترم آقا، اور دوسرا خونخوار بھیڑیا۔ ہر ایک شخص اس کے سامنے اسے محترم آقا کہتا اور ہر ایک غلام اس کی عدم موجودگی میں اُسے خونخوار بھیڑیا پکارتا۔ وہ یقیناً خونخوار بھیڑیا تھا۔ انسانیت کا گوشت کھانے والا، بےکسوں پر پے در پے ظلم ڈھانے والا، سفاک، ظالم، خونخوار بھیڑیا!!!

دن گزرتے جا رہے تھے۔ اور ہر دن کے گزرنے پر اس کی خونخوارانہ خو میں ترقی ہو رہی تھی، وقت بیت رہا تھا۔ اور وقت کے ہر لمحے پر مظلوموں کی مظلومیت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

مظلوم بوڑھا گر پڑا۔ اس کے جسم سے خون نکل نکل کر جم گیا تھا۔ مگر ابھی تک بھیڑیے کے سفاک دل کی تشنگی نہیں بجھی تھی۔

اس کے ساتھی چپ چاپ یہ دہشت انگیز منظر دیکھ رہے تھے مظلوم

مامولیت اور سروں پر بھاری بھاری پتھر اُٹھائے گزر رہے تھے۔ کسی میں یہ جرأت نہیں تھی۔ کہ اس ظالم کا ہاتھ پکڑے کسی میں یہ حوصلہ نہیں تھا۔ کہ بوڑھے کو دہشت انگیز موت کے منہ سے بچا لے۔ صولت کو "الہٰ ظلم" سمجھا جاتا تھا۔ اور الہٰ ظلم کے اتنہا مظالم نے ان گان بیکس کے ضمیروں کو مُردہ دماغوں کو سوچنے سمجھنے سے قاصر اور دلوں کو بے حس بنا دیا تھا۔

بوڑھا مر چکا تھا۔ اور اب صولت دوسرے غلاموں کو دیکھ رہا تھا۔

"کمزور و ضعیف انسان کو مر ہی جانا چاہیئے" صولت نے چند لمحے توقف کرنے کے بعد کہا۔

"ہاں محترم آقا! جب وہ مشقت ہی نہیں کر سکتا۔ تو اس زندگی کی کیا ضرورت ہے؟" اس کے ایک ساتھی نے کہا۔

"اور پھر ہماری حکم عدولی؟"

"آپ درست فرماتے ہیں محترم آقا! ضعیف انسان کو ضرور مر جانا چاہیئے" دوسرے ساتھی نے کہا۔

صولت مُڑا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ چلنے لگا۔ بوڑھے کی خون آلود لاش وہیں پڑی تھی۔ غلام پتھر اٹھائے جا رہے تھے۔ ننھا لڑکا سہیل کہیں چھپا ہُوا تھا۔ —!!

(۲)

سہیل جھونپڑی میں پھٹا پُرانا، میلا کچیلا لحاف اوڑھے سوکھے ہوئے گھاس پر کروٹیں لے رہا تھا۔ خوفناک خواب جو اس نے رات کے ابتدائی حصے میں دیکھے تھے۔ اس کے دل و دماغ پر خوف و دہشت طاری کر رہے تھے کبھی تو وہ محسوس کرتا کہ صولت نے اس کی گردن کو دبوچ رکھا ہے۔ اور کبھی اپنے بابا کی بے رحمانہ و سفاکانہ موت کا دہشت ناک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا۔ یہ دہشت انگیز منظر دیکھتے ہی یہ چیخ مار کر وہ اُٹھ بیٹھتا۔ اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا۔ ننھا سا دل، ناتجربہ کار دماغ اور یہ ہولناک خواب! آخرکار وہ

چیخ چیخ کر رونے لگا۔ جھونپڑی میں اس وقت کوئی بھی نہیں تھا چند منٹ کے بعد دروازہ کھلا۔ اور ایک بیمار غلام اندر داخل ہوا۔

"رو کیوں رہے ہو سہیل؟" اس نے سہمے ہوئے بچے کے پاس آ کر کہا۔

"ڈر لگتا ہے!" سہیل نے کہا۔

مریض نے آہ بھری اور پدرانہ شفقت سے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا: "میری گود میں سو رہو!"

"میں چچا کے پاس جاؤں گا" اس نے روتے ہوئے کہا۔

"تمہارا چچا ابھی آ جائے گا!"

چند منٹ تو سہیل خاموش رہا۔ پھر چیخ چیخ کر رونے لگا طوعاً کرہاً بیچارے مریض نے سہیل کو گود میں اٹھایا اور جھونپڑی کے باہر آ کر چلنے لگا۔ کچھ دیر وہ چلتا رہا۔ پھر اچانک ایک شخص اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور اجنبی چپ چاپ واپس چلا گیا۔ اور مریض پھر چلنے لگا۔ چند منٹ کے بعد وہ ایک جھونپڑی کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے دروازے پر دستک دی ——————
دروازہ کھلا اور ایک شخص باہر آیا۔

"یہ چچا چچا کر رہا ہے!" مریض نے سہیل کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"اِسے کیوں لے آئے —— خیر" دروازہ کھولنے والے شخص نے کہا۔ اور سہیل کو اندر لے گیا۔

جھونپڑی میں ایک پتھر کے اوپر مٹی کا چراغ جل رہا تھا جس کی مدھم روشنی ایک چھوٹے سے گوشے میں تاریکی کو چوس رہی تھی۔ پتھر کے پاس سہیل کا چچا کھڑا تھا۔ اور پتھر کے اردگرد چھ سات غلام بیٹھے تھے۔ اس کا چچا کہہ رہا تھا:—

"یہ تو تم پر واضح ہو گیا۔ کہ ہم یہاں کیوں اکٹھے ہوئے ہیں۔ ظالم بھیڑیے نے ہمارا خون چوس لیا ہے۔ اور اب اُس کے

ظالم دانت ہماری ہڈیوں میں پیوست ہو رہے ہیں۔ کونسا ستم ہے جو اس نے نہیں کیا؟ کونسا ظلم ہے۔ جو اس نے نہیں توڑا؟ ہم خون پسینہ ایک کر کے اس کے کھیتوں کی پرورش کرتے ہیں۔ اس کے باغات کو پھلوں سے بھرتے ہیں۔ اور اس کے شاندار مکانات بناتے ہیں۔ مگر اس محنت و مشقت کا عوض کیا ملتا ہے؟ یہی کہ ہماری کھالوں کو ادھیڑا جاتا ہے۔ روٹی کے سوکھے ٹکڑے کھانے کو ملتے ہیں۔ اور رہنے کے لئے ایسی جھونپڑیاں دی جاتی ہیں۔ جن میں ذلیل کتے بھی سانس لینا گوارا نہ کریں۔ آج ہمیں اس چیز کا فیصلہ کرنا ہے۔ کہ اسی طرح ذلیل کتوں کی مانند زندگی بسر کرنا ہے یا آزاد رہ کر جینا ہے؟

ننھا سہیل ایک گوشے میں چپ چاپ کھڑا تھا۔ اس کا چچا کہے جا رہا تھا۔

"بے حس مظلوم کی زندگی ایک قابلِ نفرت اور ایک قابلِ حزن زندگی ہے۔ کیونکہ بے حس مظلوم ہی ظالم کو ظلم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اگر مظلوم ظلم نہ سہے۔ تو ظالم کیونکر ظلم کر سکتا ہے؟ یہ ہماری بزدلانہ خو کا نتیجہ ہے۔ کہ خونخوار بھیڑیئے کی خونخواری بڑھتی جا رہی ہے"۔ اس کا لہجہ پُرجوش ہو گیا تھا، اس کی آنکھیں سُرخ تھیں اور ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"آج تک تم آہوں اور آنسوؤں کے کمزور ہتھیاروں سے ظالم صولت پر حملہ آور ہوتے رہے ہو۔ مگر کبھی کامیاب نہیں ہو سکے۔ — اور کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ آنسو پانی کے معمولی قطرے ہیں۔ اور آہیں ہوا کی حقیر لہریں، کیا تم ان ہتھیاروں سے چٹان کو اپنی جگہ سے ہٹا سکتے ہو؟ — اگر تم اس چٹان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتے ہو۔ تو اپنے اندر پہاڑ کی قوت پیدا کرو۔ یاد رکھو۔ تم نے آج تک صولت کے ظلم برداشت کر کر کے اس کی سفاکانہ خو کی پرورش کی ہے — تم خود اُس کی ذلیل غلامی پر قانع رہے ہو — اگر قانع نہ رہتے۔ تو آج غلام کیوں ہوتے؟ یاد رکھو: غلامی انسانیت کی سب سے بڑی توہین ہے۔ بے حس غلام انسانیت کے دروازے پر، ایک ذلیل کتا ہے۔ جسے اس دروازے پر اس وقت تک، دھتکارا جاتا ہے۔ جب تک وہ غلام ہے۔ ذرا سوچو کیا آج تم غلام بن کر کتوں سے بھی زیادہ ذلیل نہیں ہو؟"

سب کی گردنیں فرطِ شرم سے جھک گئیں۔

"غلامی انسانیت سوز ذلت، مظلومیت لئے ایک طرف کھڑی ہے۔ اور دوسری طرف آزادی، زندگی کی روح، زندگی کی شادابی اور زندگی کی عزت و حرمت لئے تمہاری منتظر ہے۔ بتاؤ کس طرف جانا چاہتے ہو؟"

"آزادی، آزادی!!" غلاموں نے ہاتھ اٹھا اٹھا کر کہا۔

"تو چلو آزادی کی طرف!"

"ہم تیار ہیں!" مجمع نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"مگر یہ کیونکر ہو سکتا ہے!" یہ الفاظ اس شخص نے کہے جس نے سہیل کیلئے دروازہ کھولا تھا۔

سہیل کا چچا ایک قدم اور آگے بڑھ آیا۔ اس کی آواز اور پُرجوش ہو گئی۔ "تمہارے جسموں میں صرف ظلم برداشت کرنے ہی کی قوت ہے۔ ظلم کو روکنے کی قوت نہیں؟ تمہارے بازو صرف زخمی ہونا ہی جانتے ہیں۔ تلوار اٹھانا نہیں جانتے — تم — ؟"

"نہیں نہیں" مجمع نے جواب دیا۔

"تو پھر بہادر جوانوں کی طرح زندگی اور موت کا فیصلہ کرو۔ زندہ رہو تو آزاد رہ کر، ورنہ غلامی کو مٹاتے ہوئے مٹ جاؤ!"

مجمع میں سے ایک شخص اٹھا اور کہنے لگا "یہ درست ہے۔ کہ ہم انتہائی ظلم برداشت کر رہے ہیں۔ مگر ہم کر بھی کیا سکتے ہیں؟ قدرت ہی نے ہمیں ایسی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا ہے!"

اتنا سنتے ہی صفدر کی آنکھیں فرطِ رنج و غصے سے، اور سرخ ہو گئیں۔ وہ ایک قدم اور بڑھ آیا۔ اور کہنے لگا "قدرت نہ کسی کو غلام بناتی ہے۔ اور نہ کسی کو آزاد کرتی ہے۔ انسان کی

قسمت کا فیصلہ اُس کے اپنے ہاتھوں میں ہے۔ اپنی زندگی کا فیصلہ قدرت کو سونپ دینا زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہے —— حالات نہیں بدلا کرتے، انسان بدلا کرتے ہیں۔ جو شخص آزاد ہونا چاہتا ہے۔ وہ آزادی کے لئے جنگ کرتا رہے گا۔ یہاں تک کہ موت اس کے اور اس کے مقصدِ زندگی کے درمیان دیوار حائل کر دے —— انسان کی زندگی، اصول کی زندگی سے وابستہ ہے۔ مرنے والا مر جاتا ہے۔ مگر اس کا اصول زندہ رہتا ہے۔ اور یہی انسانیت کا انتہائی عروج ہے۔ یاد رکھو۔ انسانیت کی جبین خون کے انہی قطروں سے چمکتی ہے۔ جو آزادی کی راہ میں بہائے جائیں۔ ہم سے پہلے جو لوگ یہاں آئے اور اپنی زندگی کو ظالم صولت کے جور و استبداد کے سپرد کر دیا۔ ہم انہیں بزدل کہتے ہیں۔ اگر ہم بھی غلامی پر قانع رہ کر ظلم برداشت کرتے رہے تو آنیوالے لوگ ہمیں صرف ایک ہی لفظ سے یاد کریں گے۔ اور وہ ہے بزدل۔ تم صولت کے ظلم برداشت کر کے، اپنے اوپر ہی ظلم نہیں کر رہے۔ بلکہ آنے والے لوگوں پر بھی ظلم کر رہے ہو —— اپنے ہونے والے بچوں پر ظلم کر رہے ہو۔ وہ تمہیں کیا کہیں گے؛ وہ تمہیں کس نام سے یاد کریں گے؟؟

مجمع کا جوش بڑھ گیا تھا —— سب کھڑے ہو گئے تھے۔

"میں خوش ہوں۔ کہ تم نے انسانی مقصد کو سمجھ لیا ہے۔ مگر سوال یہ ہے۔ کہ صولت کا چہرہ دیکھتے ہی تم پر لرزہ تو نہیں طاری ہو جائے گا؛ جان کے خوف سے کوئی ذلیل حرکت تو نہیں کر بیٹھو گے؛ اور اس پر حملہ کرنے کی بجائے تمہارے بازو شل تو نہیں ہو جائیں گے؟؟"

"ہرگز نہیں —— ہم صولت پر ٹوٹ پڑیں گے۔ اور اس وقت تک علیحدہ نہیں ہونگے۔ جب تک کہ اس کے خون کا آخری قطرہ بھی خاک پر نہیں بہ جائے گا!" ایک غلام نے بپھرتے ہوئے شیر کی طرح گرج کر کہا۔

"مگر ہتھیار؟" دوسرا غلام بولا۔

"یہ مانا کہ ظالم اپنے ظلم کو زندہ رکھنے کے لئے مظلوم کو بے دست و پا کر دیتا ہے۔ مگر اس پر بھی مظلوم آزادی حاصل کر سکتا ہے۔ تمہارے پاس خنجر نہیں تلواریں نہیں، مگر فصلوں کو کاٹنے والی درانتیاں تو موجود ہیں۔ چھوٹے چھوٹے چاقو تو موجود ہیں —— اگر تمہارا جذبہ آزادی خلوص حاصل کر چکا ہے۔ تو تم انہی ہتھیاروں سے ظلم کو مٹا سکتے ہو —— اور اگر غلامی پر قانع رہنا چاہتے ہو۔ تو ساری دنیا کے ہتھیار بھی تمہارے لئے حقیر تنکوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے؛ بس اب زیادہ وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں —— جو شخص آزادی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس پُرخار راستے پر قدم رکھے:"

"ہم سب تیار ہیں" —— مجمع بیک آواز بولا۔

"تو آؤ عہد و پیمان کریں —— کیا تم میں سے ہر شخص حلف اٹھانے کے لئے تیار ہے؟"

"میں ظلم کو مٹا دوں گا:"

ہر شخص نے آگے بڑھ کر یہی الفاظ دہرائے۔ اب سہیل باقی رہ گیا تھا۔ اس کا دل بے اختیار چاہتا تھا۔ کہ آگے بڑھ کر یہی الفاظ کہے —— مگر اس کے قدم جمے رہے نہ معلوم کیوں؟

"صبح جب تم پہاڑ پر پتھر اٹھانے جاؤ۔ تو اپنی اپنی آستینوں اور کپڑوں میں ہتھیار لے جاؤ۔ میں اس پر حملہ کر دوں گا —— اس وقت تم بھی اپنا فرض ادا کرنا۔ بس یہ ہے پروگرام —— یقین رکھو۔ کل صبح ہماری نئی زندگی کی صبح بھی طلوع ہو گی!"

"اچھا میں بھی یہی کہنا چاہتا ہوں!" سہیل نے آخر کار آگے بڑھ کر کہا۔

"سہیل! میں تو تمہیں بھول ہی گیا تھا —— خبردار جو کچھ تم نے یہاں سنا ہے۔ کسی سے نہ کہنا!"

"تو اچھا! میں بھی کہوں؟"

"کیا؟"

"میں ظلم کو مٹا دونگا —— ؟"

"ابھی تمہاری باری نہیں آئی ——" یہ کہتے ہوئے صفدر نے سہیل کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اور اُسے گود میں اٹھا لیا "یہ چراغ گُل کر دو —— کل صبح ہماری زندگی کے اُفق پر آزادی کا آفتاب طلوع ہوگا!"

ایک شخص نے چراغ بجھا دیا۔ اور وُہ آہستہ آہستہ باہر نکل گئے —— !

مٹی کے ایک چھوٹے سے تودے کے اوپر کھڑا نگاہیں سامنے پڑتے ہوئے آبشار پر جمائے سہیل رات کے واقعات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "میں ظلم کو مٹا دوں گا۔" یہ الفاظ بار بار اس کے کانوں میں گونجتے تھے۔ اور وُہ بار بار محسوس کرتا تھا کہ اپنے چچا کے پہلو میں کھڑا ہے۔ اور اس کے سامنے ہر ایک غلام خنجر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھا کر یہی الفاظ دہرا رہا ہے۔ یہ بات تو اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ کہ اس کا چچا اور دیگر غلام ظالم صولت کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔ کہ خونخوار بھیڑیا ان کے ہاتھوں ہلاک ہو جائیگا اس کا خیال تھا۔ کہ صولت تمام دنیا کا بادشاہ ہے۔ اور جو شخص اس کا حکم نہیں مانتا۔ وُہ فوراً ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ اس کے چچا نے اسے گھر پر ہی رہنے کے لئے کہا تھا۔ مگر وُہ یہاں آ کھڑا ہوا تھا اس کی خواہش تھی۔ کہ چچا کے پاس جا کر دیکھے۔ کہ کیا ہو رہا ہے۔ مگر جب دماغ میں آتشیں شعلے کی طرح یہ خیال آتا۔ کہ وہاں صولت آ جائے گا۔ تو اس کا دل دھڑکنے لگتا۔ اور قدم اٹھانا دوبھر ہو جاتا وہ کسی صورت میں بھی صولت سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ —— اس خیال ہی سے اس کی روح ہوا ہوتی تھی۔

چند منٹ کے بعد وُہ تودے سے نیچے اترا۔ اور اپنی جھونپڑی کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ ابھی وُہ چند قدم چلا تھا۔ کہ اس کے کانوں میں ایک گرجتی ہوئی آواز آئی۔ وہ درخت سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ —— صولت اور اس کا ساتھی اس کے سامنے کھڑے تھے۔

"یہاں کیا کر رہے ہو ——؟" صولت نے لڑکے کو خشمگیں نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ سہیل کے تمام بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔

"بتاؤ!" صولت نے گرج کر کہا۔ اب بھی وہ خاموش رہا۔

"تم اس طرح نہیں بتاؤگے؟" صولت نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔

سہیل کی نگاہوں کے سامنے صولت کی خوفناک شعلہ ریز آنکھیں تھیں اور اس کی دہشت ناک چابک۔ وہ صولت کے استفسار کو بھول گیا۔ وُہ نہیں جانتا تھا۔ کہ صولت نے کیا پوچھا ہے۔ اور نہ اس میں یہ جرأت تھی۔ کہ سامنے کھڑے ہوئے ظالم درندے کو استفسار دہرانے کے لئے کہے۔

"اگر نہیں بتاؤگے۔ تو میں مار مار کر تمہاری چمڑی اُدھیڑ دُونگا۔"

"یہ الفاظ سنتے ہی بچے نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "میں ظلم کو —— مٹا دوں گا!"

"کیا کہا؟" صولت نے سہیل کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔ درد کی وجہ سے سہیل کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ اُس نے آنسو پونچھنے کے لئے ہاتھ آنکھوں کی طرف بڑھائے۔ مگر صولت نے پھر بازو جھنجھوڑا —— بچے کی بانہیں ڈھیلی پڑ گئیں۔

"کیا کہا؟"

"وُہ یہی —— کہتے تھے؟"

"وُہ کون؟" یہ کہتے ہوئے صولت کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"میرا چچا اور ——"

"کیا کہا تھا اُنہوں نے؟"

"اُنہوں نے کہا تھا —— کہا تھا"! لڑکا آگے نہ بول سکا۔

"جلدی بولو!"

"میں ظلم کو مٹا دونگا! اُنہوں نے کہا تھا!"

"کب"؟

"رات کو!"

"وہ کہاں اکٹھے ہوئے تھے؟"

سہیل اس کے جواب میں ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔

صولت نے متفکرانہ اپنی انگلیاں بالوں میں ڈالیں۔ اور لڑکے کے چہرے کو بغور دیکھنے لگا۔ پھر وہ اپنے محافظ کی طرف مخاطب ہوا۔ "سمجھ گئے معاملہ؟ ذلیل غلام شرارتوں سے باز نہیں آتے۔ میرے خلاف بغاوت کر رہے ہیں ۔۔۔ کمینے!" اُسنے محافظ کو خاص اشارہ کیا۔ اور وہ بعجلت چلا گیا۔ سہیل کا دل بڑے زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا۔ کہ بہت بڑی مصیبت آنے والی ہے۔

صولت نے سہیل کا ہاتھ پکڑا اور چلنے لگا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ ایک گنجان درخت کے پاس کھڑے تھے، قریب غلام پہاڑ سے پتھر نیچے لا لا کر رکھ رہے تھے۔ اور پتھروں کے پاس صفدر کھڑا تھا۔ صولت کی آنکھیں خون آلود ہو گئیں۔ بھویں تن گئیں۔ اور اس نے غیر اختیاری حالت میں بچے کے ہاتھ کو زور سے دبایا۔ بچے کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ صفدر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ صولت نے سہیل کے ہاتھ کو چھوڑ دیا۔ اور آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

غلام پتھر رکھ رہے تھے۔ اور ایک دوسرے کو خاص انداز سے دیکھ رہے تھے۔ صولت نے چابک کو حرکت دی۔ اور ظلم کی مشین ایک غلام پر چلنے لگی۔ یکایک صفدر آگے بڑھا۔ مگر اس سے پیشتر کہ اس کے بازو اوپر اٹھیں۔ صولت کے محافظوں نے اُسے اور دوسرے غلاموں کو اپنی آہنی گرفت میں لے لیا۔

"ذلیل غدار! اپنی شرارت کا انجام دیکھ لیا" صولت نے نفرت انگیز قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "میرے خلاف یہ سازش کمینو!"

"کمینہ تو تو ہے۔ جو ان بھیڑیوں کی مدد سے ظلم کر رہا ہے" صفدر نے خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اگر آج بدقسمتی سے ہمارا مقصد ناکام رہا۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں۔ کہ تیرا ظلم زندہ رہے گا"

یہ الفاظ سنتے ہی صولت کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ "تیرے جیسے ہزاروں دیوانے تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ اور میرا بال بھی بیکا نہیں ہوا" صولت نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔

"مگر اب وہ وقت آگیا ہے۔ کہ تیرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے اڑا دیئے جائیں" صفدر نے کہا۔

"گستاخی کی انتہا ہو چکی ہے معزز آقا!" ایک محافظ نے کہنا شروع کیا۔ "ان بچھوؤں کو پاؤں تلے کچل دینا چاہیئے!"

صفدر تڑپ گیا۔

"انسان ہو کر یہ درندگی ۔۔۔ یہ کمینگی" اُس نے محافظ کو مخاطب کر کے کہا۔ "تیرا دل اس قدر تاریک ہو چکا ہے۔ کہ انسانی ہمدردی کی ہلکی سی لہر بھی وہاں پیدا نہیں ہو سکتی ۔۔۔ تیری روح پر ظلم نے اس درجہ قبضہ کر لیا ہے۔ کہ تو انسانیت کا تصور بھی نہیں کر سکتا ۔۔۔"

محافظ نے منہ پھیر لیا۔

"میں ان کمینوں کو عبرتناک سزا دینا چاہتا ہوں۔ ان کے ہاتھوں کو زنجیروں سے باندھ دو!" صولت نے محافظوں کو حکم دیا۔

"جو چاہے کر ۔۔۔ عنقریب انصاف کی چکی تیری ہڈیاں پیس ڈالے گی ۔۔۔ ہمارے ہاتھوں کو جکڑ دے۔ مگر تو جذبۂ آزادی کو نہیں جکڑ سکتا ۔۔۔ آج تو ہمیں عبرتناک سزا دے۔ مگر تیری سزا وہ ہوگی۔ جس سے جہنم کی عقوبت بھی پناہ مانگے!" صفدر نے کہا۔ یکایک اس کی نظر ڈر سے کانپتے ہوئے سہیل پر پڑی۔ اور وہ صرف اتنا کہہ سکا "سہیل!" اس کے بعد اس کے لبوں سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ محافظوں نے سب سے پہلے صفدر کو گرا دیا۔ اور اس کی کھال ادھیڑنے لگے۔ سہیل ڈر کر بے ہوش ہو گیا۔ غلاموں کے سامنے ان کے لیڈر کے ساتھ یہ ظالمانہ برتاؤ کیا جا رہا تھا۔ وہ خود کو چھڑانے کی انتہائی کوشش کر رہے تھے۔ مگر

وجہ کی زنجیروں اور ہتھکڑیوں کی آہنی گرفت نے انہیں بالکل بیکس بنا دیا تھا۔ صفدر نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ اس کے بعد محافظ دستے غلاموں کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور جب انہیں اس قدر زخمی کر دیا۔ کہ وہ ذرہ بھر بھی حرکت نہ کر سکیں۔ تو ہاتھ روک لئے۔

"یہ ہے ہمارے خلاف سازش کرنے کا نتیجہ۔۔۔ ۔ آئندہ جو شخص اس قسم کی ذلیل حرکت کرے گا۔ اس کے ساتھ یہی ہوگا۔۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ تم غلام ہو۔ غلاموں کی طرح زندگی بسر کرو۔" یہ الفاظ کہہ کر صولت پھرا اور بے ہوش سہیل کو ساتھ لانے کا حکم دے کر چلا گیا۔ جس طرح تلاطم کے بعد سمندر کی سطح پُرسکون ہو جاتی ہے۔ اس طرح اس ہولناک منظر کے بعد غلاموں کا جذبہ بغاوت ٹھنڈا پڑ گیا۔ جسمی جسموں کے اندر دل بالکل مُردہ ہو گئے۔ یہ تو انقلاب تھا غلاموں کی زندگی میں۔ ادھر سہیل کے دل میں انقلاب پیدا کیا جا رہا تھا۔ وہ صولت کے ایک محافظِ خاص کی محافظت میں پرورش پا رہا تھا۔ اور اس کے سپرد صرف ایک کام تھا۔ اور وہ تھا جاسوسی۔ جیسے جیسے وہ غلاموں کی خبریں محافظ کے کانوں تک پہنچاتا تھا۔ محافظ کی نظرِ عنایت اس پر زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ اسی طرح دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہو رہے تھے۔

سہیل اب مظلومیت کی بادِ سموم کے تھپیڑے کھاتا ہوا غنچہ نہیں تھا۔ بلکہ وہ صولت کی بہار پرور عنایتوں کے سائے تلے گلِ خنداں کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ اس کی عمر چودہ سال کی ہو گئی تھی۔ اور اپنے فرائض ذمہ داری کے ساتھ ادا کرتے کرتے وہ صولت کے اکرامِ خاص کا مستحق ہو چکا تھا۔ جب کبھی اسے اپنے بابا اور چچا کی بے رحمانہ ہلاکت کا خیال آتا۔ تو اس کے دل پر سوئیاں سی چبھنے لگتیں۔ اس کے ضمیر میں خلش پیدا ہو جاتی۔ مگر اسی اثنا میں صولت کی کرم فرمائیوں اور موجودہ مسرتوں کا سیلاب آتا۔ اور دل کی چبھن اور ضمیر کی خلش کو بہا کر لے جاتا ـــــ اور وہ پھر خاصہ سہیل بن جاتا۔ صولت کا وفادار ـــ غلاموں کے لئے ظالم۔

ترقی کرتے کرتے اس نے اتنا اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ کہ نئے غلام اسے صولت کا بیٹا سمجھنے لگے۔ اسی اثنا میں اس کی زندگی کے افق پر نئی مسرت کا آفتاب طلوع ہوا۔ اسے کائنات کا ذرہ ذرہ مسرتوں سے لبریز نظر آنے لگا۔ اس کی روح ہر وقت سحر انگیز نغموں کے آغوش میں تیرنے لگی۔ ـــ صولت کی اکلوتی بیٹی پہلے اس پر مہربان تھی۔۔۔ مگر اب اس سے محبت کرنے لگی تھی۔۔۔!

(۴)

متواتر مظالم برداشت کر کر کے غلاموں کی قوت احساس مُردہ ہو جاتی ہے وہ اپنی مظلومیت کو قسمت کا لکھا۔ اور ظالم کے ظلم کو منشائے ایزدی سمجھنے لگتے ہیں۔ مصیبتوں سے نجات پانے کا اگر کوئی خیال ان کے ذہن میں آتا ہے۔ تو وہ موت ہے۔ ان کے بزدلانہ جذبات ہر ایک انسانی کوشش کو حقیر گردانتے ہوئے ظلم سے بچنے کے لئے صرف توہم کا دامن پکڑتے ہیں۔ اور صولت کے غلاموں کی زندگی بھی اسی حقیقت کا اعلان کر رہی تھی۔

سہیل ہر روز بیکس غلاموں کی گریہ و زاری و چیخ و پکار سنتا تھا۔ زندہ چیز سے لرزہ خیز واقعے کو ہر وقت دیکھتا تھا۔ مگر مظلوموں کے قریب ہوتے ہوئے بھی وہ ان سے بے حد دُور تھا۔ مسرتوں کے آغوش میں سانس لینے والی زندگی، دُکھوں سے بھری ہوئی زندگی کا کیونکر خیال کر سکتی ہے؟ مگر اس دن سہیل خلافِ معمول متفکر تھا۔ اس دردناک واقعے نے جو ایک دن پیشتر اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا تھا۔ اس کے دل کو بے حد متاثر کیا تھا۔ اور واقعہ یہ تھا۔ کہ ایک غلام عورت نے کھیت کا کام چھوڑ کر اپنے بیمار شیرخوار بچے کو اپنی چھاتی سے لگا رکھا تھا۔ جب ظالم صولت نے دیکھا۔ تو اس کی آنکھوں سے غصے کی چنگاریاں نکلنے لگیں۔ انتہائی بے رحمی سے کام لے کر وہ بے کس ماں کو بید سے مارنے لگا۔ ظالم نے اسی پر اکتفا نہ کیا۔ بلکہ ننھے بچے کو زمین پر گرا دیا۔ ماں نے اسے فوراً اٹھا لیا۔ اس پر صولت کے غصے کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اور اس نے ننھی جان کو کتوں کے آگے ڈال دیا۔ ماں کی مامتا یہ ظلم کیونکر برداشت کر سکتی تھی؟ وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ بڑھی۔ اور بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ کتے اس سے لپٹ گئے۔ اور اسے لہولہان کر دیا۔ وہ اپنے لختِ جگر کی جان بچانے کے لئے بھاگی۔ اور جب اس کی زخمی

…ں نے بالکل جواب دے دیا۔ تو وہ بچے کے اوپر لیٹ گئی۔ کتوں نے …ں اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ خونخوار بھیڑیا اور اس کے درندہ صفت محافظ … منظر کو دیکھ دیکھ کر خاص لطف حاصل کر رہے تھے۔ سہیل کے …ل پر سخت چوٹ لگی۔ وہ بھاگ کر وہاں پہنچا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟ …ں کی مامتا اپنا فرض ادا کر چکی تھی۔ اس نے بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ خون میں شرابور بچہ گھٹنی کے سانس لے کر ماں سے جا ملا۔ رات کو سہیل سو یا۔ تو خواب میں بھی یہی دردناک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ اور جب صبح اٹھا۔ تو اس کی طبیعت بے حد مضطرب -- بے حد بیقرار تھی۔ اس کی مسرور زندگی میں یہ پہلی خلش سی تھی جو برابر بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی منور زندگی پر غم کا یہ پہلا سایہ تھا جو متواتر پھیلتا چلا جا رہا تھا۔ وہ گھر سے باہر نکل آیا۔ اور میدان میں کھڑے ہو کر اپنی موجودہ زندگی کا جائزہ لینے لگا۔

جب آگ جلائی جاتی ہے۔ تو شعلے دھوئیں کی کثیف چادر کے سینوں کو چیرتے ہوئے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح تاریکی کے پیچھے سوئی ہوئی ضمیر کی قوت شعلوں کی طرح لہرا لہرا کر بیدار ہو رہی تھی۔ "یہ ظلم و ستم کیوں اور کب تک؟ دولت کو ظلم کرنے کا کیا حق ہے؟" یہ سوال بار بار اس کے ذہن اور دل سے ٹکراتا تھا۔ کبھی تو موجودہ مسرتوں کا خیال اس کے تمام احساسات کو کچل ڈالتا تھا۔ اور کبھی ضمیر کی طاقت اسے خود سے نفرت کرنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ زرینہ کے عشق کی مسرتوں نے اس کا ایک ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ اور غلاموں کی مظلومیت نے اس کا دوسرا ہاتھ۔ کشمکش سے تنگ آ کر وہ آگے بڑھا۔ اور ایک چشمے کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ پاس ہی سے ایک دلنواز آواز آئی۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ زرینہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"کس خیال میں ہو تم؟" زرینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم یہاں کیوں آ گئیں؟"

"تم جو یہاں تھے!"

"مگر تمہیں یہ کیونکر معلوم ہوا۔ کہ میں یہاں ہوں؟"

"معلوم ہونے والی چیز معلوم ہو جایا کرتی ہے!"

"زرینہ!" سہیل نے ذرا کرخت آواز میں کہنا شروع کیا۔ "کل جو ظلم ہوا ہے وہ جانتی ہو؟"

"میں نے وہ واقعہ سنا ہے!" لڑکی نے غمگین لہجے میں کہا۔

"کاش میں وہاں ہوتی!"

"تو پھر کیا ہوتا؟"

"میں کبھی یہ ظلم نہ ہونے دیتی ---!" یہ کہتے ہوئے اس نے ٹھنڈی سی آہ بھری۔ سہیل کے دل میں ایک نشتر سا چبھا۔ وہ وہاں تھا مگر اس کے باوجود ظلم ہوا۔

"نہ معلوم ابا اتنے ظالم کیوں ہوتے جاتے ہیں!" زرینہ نے دردانگیز لہجے میں کہا۔

"اس لئے کہ کوئی ان کے ظلم کو روکنے والا نہیں!"

"میں انہیں سمجھاتی ہوں -- مگر --"

"وہ کسی کی نہیں سنیں گے -- وہ کسی کی نہیں سن سکتے --- ان کے کان بالکل بہرے ہیں!"

"سہیل!" زرینہ نے اس خلاف توقع اظہار رنج پر کہا "تمہیں وہ بہت عزیز سمجھتے ہیں ---- تم پر تو وہ کسی قسم کا ظلم نہیں کرتے"

"درست ہے مجھے وہ بہت عزیز سمجھتے ہیں ---- مجھ پر کسی قسم کا ظلم نہیں کرتے۔ اس لئے مجھے ان کے خلاف حرف شکایت لب پر نہ لانا چاہیئے!"

سہیل کے لہجے میں طنزیہ رنگ غالب تھا۔ دو تین منٹ کامل خاموشی طاری رہی۔ زرینہ سہیل کے چہرے کو دیکھتی رہی اور سہیل خیالات میں غرق۔ یکایک زرینہ کی آنکھوں میں مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

"سہیل! ایک بات کہوں؟"

"کہو!"

"اس غلام عورت زینب کو جانتے ہو --- وہی جو ہمیں کہانیاں سنایا کرتی ہے؟"

"ہاں، آگے کہو!"

"کل اس نے مجھے ایک کہانی سنائی ہے۔ جس میں ایک مرد نے

اپنی محبوبہ کو دھوکا دیا اور ایک دوسری عورت سے محبت کرنے لگا ۔۔۔ پہلی عورت نے زہر کھا کر جان دے دی۔"

"تو پھر؟"

"میں نے اس قسم کی اور بھی کہانیاں سنی ہیں۔ جس میں مردوں نے عورتوں سے بے وفائی کی ہے۔ ۔۔۔ میرے سہیل! تم تو اُن مردوں میں سے نہیں ہو نا؟"

سہیل نے زرینہ کی آنکھوں کو دیکھا۔ وہ خوبصورت بڑی بڑی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس کا دل بے تاب ہو گیا اور اس نے ہاتھ اپنی محبوبہ کی گردن میں حمائل کر کے کہا "یہ خیال نہ کرو زرینہ! ہماری محبت کامیاب رہے گی۔"

"مگر میں ڈرتی ہوں۔۔۔!"

"ڈرنے کی قطعاً ضرورت نہیں!"

"اچھا قسم کھاتے ہو؟"

"قسم کھانے کی ضرورت کیا ہے۔ تمہارا باپ ظالم ہونے کے باوجود تمہاری محبت کے لئے ظالم نہیں؟"

"اگر مجھے خوف ہے، بادا تم ظالم ہو جاؤ!"

"یہ نہیں ہو گا زرینہ!"

"تو حلف اٹھاؤ کہ آپ ۔۔۔ سے وفا کریں گے!"

سہیل کے جسم میں لرزہ سا پیدا ہو گیا۔ گردش خون میں تیزی آگئی۔ اسے گزشتہ واقعات یاد آنے لگے۔ سب سے پہلے وہ منظر اس کے سامنے آیا جب وہ بچہ تھا۔ اور چچا کو ملنے کے لئے جھونپڑی میں گیا تھا۔۔۔ اور پھر ایک غلام کی زبان سے سنا تھا۔ "میں ظلم کو مٹا دوں گا۔" اس منظر کے بعد دوسرا منظر اس کی نگاہوں کے سامنے آیا۔ یہ منظر وہ تھا جب اس نے بے غیرتی میں اپنے چچا اور دیگر غلاموں ۔۔۔ غلاموں کی کشتی کا واقعہ بھی یاد آگیا۔ جب اس کے چچا نے اپنی بے رحمانہ موت سے پہلے اس کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

"سہیل!"

چند لمحوں بعد اس کی یاد اسے کہاں سے کہاں لے گئی۔

"حلف اٹھا کر کہو۔ میں وفا کروں گا۔" زرینہ نے پوچھا۔

سہیل کے سامنے "میں ظلم کو مٹا دوں گا" کے الفاظ شعلوں کی صورت میں تڑپے۔ اور اس کے کانوں میں "سہیل" کہتی ہوئی ایک آواز آئی۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں" وہ مسکرائی۔ "ہم یہاں محبت کے عہد و پیمان کریں گے۔"

"مگر ٹھہرو!"

"کیوں؟" لڑکی نے خوفزدہ آواز میں کہا۔

"میری طبیعت خراب ہے ۔۔۔ اس وقت مجھے تنہا چھوڑ دو!"

"پہلے جو میں کہتی ہوں وہ کرو!"

"میں اس وقت کچھ نہیں کر سکتا۔ مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

"تمہاری طبیعت خراب ہے۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گی!"

"زرینہ مجھ پر اعتبار کرو!"

"مگر مجھے یقین دلاؤ؟"

"کیونکر؟"

"جو میں کہتی ہوں وہ کرو ۔۔۔ حلف اٹھا کر کہو میں محبت میں وفا کروں گا!"

"اتنی ضد اچھی نہیں!"

"تمہارا اس سے کیا بگڑتا ہے؟" زرینہ نے سہیل کا ہاتھ پکڑ لیا۔

ایک دم سہیل کے سامنے وہی مناظر یکے بعد دیگرے آئے اس کے کانوں میں بار بار یہ الفاظ گونجے "میں ظلم کو مٹا دوں گا!" اس کے ساتھ ہی اس کے چچا کی "سہیل" کہتی ہوئی آواز آئی۔ اس کے لبوں کو حرکت ہوئی۔ یک لخت زرینہ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ اور اس نے سہیل کے ہاتھ کو زور سے دبایا۔ "سہیل! سہیل!؟"

وہیں خاموش کھڑا رہا۔

"سہیل!"

اب اس نے زرینہ کے چہرے کو دیکھا۔

"کیا کر رہے ہو تم؟"

"کیا کیا ہے میں نے؟"

"تم؟" زرینہ کے چہرے پر وحشت چھائی ہوئی تھی!

"کیا کیا ہے میں نے؟"

"گویا تم نہیں جانتے ——— کونسا ظلم تم ڈھانا چاہتے ہو؟"

"او، میں سمجھا" اب سہیل کو معلوم ہوا۔ کہ اس نے چھپ کر وہی الفاظ دہرائے تھے۔ جو غلاموں نے کہے تھے۔ —!

"مجھے اس وقت تنہا چھوڑ دو۔ میری طبیعت بہت خراب —— میری زرینہ، میری اچھی زرینہ!!"

زرینہ نے اشک ریز آنکھیں اس کی طرف اٹھائیں اور چپ چاپ چلی گئی۔ اس کے چلے جانے کے بعد سہیل جتنا ان واقعات پہ غور کرتا۔ اس کے دل کا اضطراب، سینے کی خلش اور روح کی بے قراری بڑھتی جاتی۔ وہ نگاہِ تخییل کے سامنے دیکھتا۔ کہ بے کس سی ماں اپنے ننھے سے بیمار بچے کو گود میں اٹھائے کتوں کے آگے بھاگ رہی ہے —— اور اس کے ساتھ ہی صولت کا سفاک چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتا۔ وہ اس اضطراب انگیز اور خلش آمیز حالت سے نکلنا چاہتا تھا۔ مگر نہیں نکل سکتا تھا۔ آخر یہ خیال اس کے ذہن میں آیا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا — مگر اس دھڑکن میں ایک خاص قسم کی لذت تھی ——!

زرینہ اپنے باغیچے کے دروازے کے قریب کھڑی تھی۔ اسے دو دن سے سہیل نہیں ملا تھا۔ اس لئے اس کے چہرے پر حزن و ملال کے آثار ہویدا تھے۔ یکایک اس کی دائیں طرف چند قدم کے فاصلے پر ایک شاخ کو حرکت ہوئی۔ اس نے ادھر دیکھا اور خوف و حیرت کی ایک ہلکی سی چیخ اس کے لبوں سے نکل گئی۔ سہیل کے کپڑوں پر سرخ داغ پڑے تھے۔ اور آنکھیں خوفناک ہو گئی تھیں۔ زرینہ چند لمحے تو اسے پہچان ہی نہ سکی۔ وہ بھاگ کر اس کے قریب گئی۔ اور پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ خوف، حیرت نے اس کے لبوں پہ مہر ثبت کر دی تھی۔

"تم سہیل؟"

"تمہیں حیرت ہوگی ——— واقعی یہ حیرت کا مقام ہے لیکن ——!"

"اس وقت تم کیا بنے ہو ——— تمہارے ہاتھ خون آلود ——!"

"ایک قاتل کے ہاتھ خون آلود ہی ہونے چاہئیں۔"

"تم قاتل؟؟"

"قاتل بننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا زرینہ!"

"کیا کہہ رہے ہو تم —— قاتل تم؟ کس کو تم نے قتل کیا کہو سہیل!!"

"اس شخص کو جس کی نظروں میں انسان ذلیل کتوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ جس کے مظالم سے انسانیت کا سینہ زخموں سے چور چور تھا۔"

"کون؟" زرینہ کی نگاہوں کے سامنے تاریک سائے منڈلانے لگے۔ ایک خوف آلود توقع اس کے ذہن میں چھا گئی۔ ایک حیرت پرور مایوسی اس کے دل پر قابض ہو گئی ——— اس توقع، اس مایوسی کے درمیان اس کی حالت اس کشتی کی طرح ہو گئی ... جو دریا کی متلاطم سطح پہ ہوا کے تیز و تند جھونکوں میں ہچکولے کھا رہی ہو! "کون؟" اس نے دوبارہ کہا!

"تمہارا باپ —— خونخوار بھیڑیا!"

"میرا باپ؟؟"

"تمہارے باپ کے سوا اور کون خونخوار بھیڑیا ہو سکتا تھا؟"

"کیا کہہ رہے ہو سہیل ——— پاگل ہو گئے ہو؟؟"

"ہاں مجھے میرے ضمیر نے پاگل ہونے پر مجبور کر دیا۔"

"مگر ایسا کبھی ہو سکتا ہے۔ تم اور میرے باپ کو ——"

اپنے آقا کو۔ ؟؟

"اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا!"

زرینہ بُت بنی کھڑی رہی!

"شاید تم میری بات پر اعتبار نہیں کرتیں۔۔ حالانکہ میرے خون آلود ہاتھ تمہیں اس بات کا یقین دلانے کے لئے کافی ہیں۔ مَیں نے ظالم صولت کو قتل کر دیا ہے — مَیں نے ظلم کو مٹا دیا ہے!"

"کتنا ظلم — کتنی دغابازی!"

"دل کھول کر لعنت ملامت کرو۔۔ مگر پہلے میرے چند الفاظ سن لو زرینہ! تم جانتی ہو صولت نے غلاموں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا — اس کے پائے استبداد کے نیچے مظلوم زندگیاں کچلی جا رہی تھیں — وہ ظلم کرتا جاتا تھا۔ اور اس کے ظلم کی پیاس بڑھتی جاتی تھی — اور ہماری کوئی کوشش غلاموں کو اس کے دستِ ظلم سے نہیں بچا سکتی تھی۔ اس کی مرض کا علاج صرف ایک تھا۔ اور وہ تھا موت!"

"تم اور میرے باپ کے قاتل ؟؟"

"ہاں زرینہ! میں تمہارے باپ کا قاتل ہوں — ظلم کو مٹانے کے لیے مجھے یہ انتہائی ناخوشگوار فرض ادا کرنا پڑا"

زرینہ چپ چاپ کھڑی سہیل کو دیکھتی رہی

"اب میں جاتا ہوں — ہمیشہ کے لئے رخصت!" یہ کہتے ہوئے سہیل نے قدم اٹھائے اور باغیچے سے نکل کر چلا گیا۔ زرینہ بے اختیارانہ دروازے پر آکر اسے دیکھنے لگی۔ سہیل تیزی کے ساتھ چلنے لگا۔

زرینہ نے دوڑ کر اس کا دامن پکڑ لیا

"سہیل!"

"زرینہ میں نے ایک ناخوشگوار فرض ادا کر دیا ہے۔ اب دوسرا ادا کرنا ہے۔ مجھے چھوڑ دو۔ موقعہ کی نزاکت مجھے زیادہ ٹھہرنے کی اجازت نہیں دیتی!"

"تم جا رہے ہو ۔۔۔ تو میرا کیا ہوگا — میں کیا کروں گی؟"

"میں نے تم سے بے وفائی کی ہے۔ مگر زندگی کی مسرتیں تم سے بے وفائی نہیں کریں گی!"

"میری زندگی کی مسرتیں تو تم لئے جا رہے ہو!"

"میں قاتل ہوں زرینہ! مجھے اپنے انجام کی طرف جانے دو — تمہارے محافظ اور خادم بے کس غلاموں کو اس جرم کے مرتکب سمجھ چکے ہوں گے۔ اس حالت میں میرا یہاں ٹھہرنا کتنا خطرناک کام ہے!"

"تم نہیں جا سکتے"

"تو پھر؟"

"تم نہ جاؤ — تم — آؤ ہم یہاں سے چلے جائیں!"

"یہ نہیں ہو سکتا زرینہ! مجھے اپنا فرض ادا کر لینے دو!"

"اس وقت محبت کا فرض ادا کرو!"

"مگر انسانیت کا فرض؟ — انسانیت کا فرض کیونکر ادا ہوگا؟؟ — نہیں مَیں نہیں جا سکتا — مَیں یہ بزدلانہ کام ہرگز نہیں کروں گا!"

"مگر سنو سہیل! جو کچھ ہونا تھا۔ وہ ہو چکا۔ اب آؤ یہاں سے چل دیں!"

"مجھے اپنا فرض ادا کرنے دو زرینہ! تمہارے خادم غلاموں پر ظلم کر رہے ہوں گے۔"

"وہ ظلم نہیں کر سکتے — وہ ظلم نہیں کریں گے۔ تم مجھ پر ظلم نہ کرو — تمہارے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتی!"

"یہ خیال خام ہے اسے دماغ سے نکال دو!"

"میں نے تمہارا کیا قصور کیا ہے — مجھ پر کیوں ظلم کرتے ہو" زرینہ کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔

"زرینہ تمہیں ایک قاتل سے ہرگز محبت نہیں کرنی چاہیئے — اور پھر میں قاتل بھی تمہارے باپ کا ہوں!"

سہیل نے غور سے زرینہ کے چہرے کو دیکھا اور چلنے لگا — چند قدم چلا ہوگا۔ کہ پھر زرینہ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"زرینہ! یہ بات مجھے پسند نہیں۔ تم میرے اور میرے فرض کے درمیان دیوار بن کر کھڑی ہو رہی ہو!"

"تو کیا مجھے مار ڈالنا ہی چاہتے ہو — اگر یہ بات ہے تو مجھے قتل کر دو — میں تمہارے ہاتھوں قتل ہونا تمہاری فرقت میں گھل گھل کر مرنے سے زیادہ پسند کرتی ہوں"

سہیل کے آگے زرینہ کی اشک آلود آنکھیں رحم کی درخواست کر رہی تھیں۔ ایک منٹ تک وہ بے حس و حرکت کھڑا رہا۔

"آؤ سہیل! یہاں سے چل دیں!"

سورج طلوع ہو چکا تھا — اور اس کی روشنی کائنات کے ذرے ذرے کو منور کر رہی تھی۔ زرینہ برابر منت و سماجت کر رہی تھی۔

"زرینہ! اس کا کچھ فائدہ نہیں — تمہاری التجا مجھے فرض ادا کرنے سے نہیں روک سکتی — مجھے بہرحال اپنا فرض ادا کرنا ہے!"

"تو محبت کا فرض —"

"میں نے محبت کے فرض پر انسانیت کے فرض کو ترجیح دی ہے!"

سہیل نے اپنا بازو چھڑا لیا — اور دوڑنے لگا۔ زرینہ "سہیل! سہیل!!" کہتی گرتی پڑتی اس کے پیچھے بھاگنے لگی — اس کے پاؤں زخمی ہو رہے تھے — مگر وہ برابر بھاگی جا رہی تھی —

(۶)

میدان میں ظالم صولت کے محافظ و خادم ایک ایک غلام کو زنجیروں سے . . . . . باندھ کر چابک سے پیٹ رہے تھے۔ مظلوم انسانوں کے جسم سے خون بہ رہا تھا۔ اور فضا میں ان کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ ان پر یہ الزام لگایا گیا تھا۔ کہ انہوں نے صولت کو زخمی کر دیا ہے۔ صولت کی موت پر پردہ ڈالا جا رہا تھا۔ یکایک دوسری طرف سے گرد و غبار اٹھا اور سہیل تیزی کے ساتھ بھاگتا ہوا آیا۔ ایک دو منٹ کے بعد محافظوں کے پاس پہنچ گیا۔

"ٹھہرو!" سہیل نے بلند آواز میں کہا۔

محافظوں کے ہاتھ رک گئے۔

"ان کتوں نے محترم آقا کو زخمی کر دیا ہے"۔ محافظ بولے۔ غلاموں نے سر ہلا ہلا کر "نہیں نہیں" کا شور مچایا۔

"صولت کو میں نے قتل کیا ہے!"

سہیل کی زبان سے یہ الفاظ سنتے ہی مجمع پر سنسنی چھا گئی۔ "موت کا قاتل میں ہوں!"

غلام آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ محافظوں کی نگاہیں اس کے خون آلود ہاتھوں پر جم کر رہ گئیں۔ سہیل ایک تودے پر چڑھ گیا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اس نے دایاں ہاتھ اوپر اٹھایا اور کہنے لگا۔

"صولت — ایک خونخوار بھیڑیا تھا — اور آج وہ مر گیا ہے — تمام غلام آزاد ہیں —"

غلاموں کے چہروں پر سرخی دوڑ گئی۔

"میں نے اسے قتل کر دیا ہے — انسانوں پر ظلم کرنے والا کبھی زندہ —" وہ فقرہ مکمل نہ کر سکا۔ ایک محافظ نے اس کے سینے میں خنجر بھونک دیا۔ غلام تڑپ کر اٹھے۔ سہیل نے سینے سے خنجر نکالا۔ اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ اور دوسرا ہاتھ زخم پر رکھ کر کہنے لگا۔

"بیٹھے رہو — کوئی ہنگامہ نہ ہو۔ آج سے تم آزاد ہو — ہو — تم پر کوئی ظلم نہیں کر سکتا۔ ظلم کرنے والا مر گیا ہے —!"

ایک طرف سے "سہیل! سہیل!!" کہتی ہوئی آواز آئی۔ سہیل آگے بولتا گیا "کنارے پر جہاز کھڑا تمہارا انتظار کر رہا ہے — جاؤ! تم آزاد ہو"

مگر غلام مغلوب الغضب ہو چکے تھے۔ برسوں کا سویا ہوا جذبہ انتقام بیدار ہو چکا تھا۔ وہ ایکدم اٹھے اور محافظوں پر ٹوٹ پڑے۔ ہجوم میں سے "سہیل! سہیل!!" کہتی ہوئی آواز آئی۔ سہیل نے ایک طرف دیکھا۔ اس کی محبوبہ مغلوب الغضب لوگوں میں پس رہی تھی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر بول نہ سکا۔ اور دھم سے گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی زرینہ کی آواز بھی ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔

"کیوں رو رہی ہو؟"

"کچھ نہیں"

"بتاؤ"

"[illegible]"

"مجھے بھی نہیں بتاؤ گی"

آنکھوں میں آنسو [illegible] ایک دن [illegible] کے ساتھ بھکارن نے جواب دیا

"ہاں [illegible] معلوم ہوتے ہیں"

[illegible] بھکارن سے [illegible]

بھکارن نے ہاتھ پھیلایا تو وہ [illegible] کی انگلیاں سے چھو گئیں وہ [illegible] ایک سنسنی سی [illegible]

— ۲ —

"سنو"

"ہاں بولو"

"تمہیں میری قسم"

"میری بیوقوفی"

"ایک بات سن لو"

"کہو"

"کس سے کہوں؟ [illegible]"

"میں [illegible] ہوں [illegible] نہیں ہوں"

"جاؤ میں [illegible] نہیں [illegible] گا۔"

"میں جانتی ہوں [illegible] میری [illegible]"

"[illegible] ہو گئیں یہ بڑی عادت ہے"

"تم کچھ کہتے ہی نہیں دنیا کیا کہے"

"ادھر آ کر سنو"

"کہو"

"کیا میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں [illegible]"

"اچھا"

جس طرح ایک سچا مذہب پرست عبادت گاہ میں جاتا ہے، اسی طرح بھکارن بھی ہر شام دھرم سالہ پہنچ جاتا۔ وہ دوشیزہ بھکارن بھی اپنے باپ کے ساتھ ٹھیک وقت پر آ جاتی۔ اب کبھی وہ دیر سے پہنچتی بھکاری کی بے چینی بڑھ جاتی۔ وہ دروازے کی طرف بڑی بے تابی کے ساتھ اس کا انتظار کیا کرتا [illegible] کی چند گھڑیاں کس طرح گزرتیں [illegible] ہو جاتا [illegible] ہر طرف [illegible]

[illegible] بھکارن کے آتے ہی سب بے چینی کافور ہو جاتی [illegible] تسکین ہو جاتی وہ اپنے دل میں ایک گدگدی محسوس کرتا۔ کبھی بسنت کی [illegible] کبھی بسنت کی پیاری پیاری [illegible] مگر بھکاری کی زندگی اس کشتی کے مانند تھی جو موجوں پر بہتی [illegible] موجیں [illegible] بہائے جائیں وہ بہتی چلی جاتی ہے۔ بھکاری [illegible] کا انتظار کر رہا تھا کہ دیکھیں [illegible] جاتی ہیں۔

ایک دن اس نے بھکارن سے کہا:

"تمہارے پتا کی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے پھر کیا تم اکیلی ہی رہو گی؟"

"تمہارا اس سے مطلب؟" بھکارن نے تنک کر جواب دیا۔

"مطلب کیوں نہیں، جب کوئی [illegible]" بھکاری کہنے لگا۔

"میں تمہاری کون ہوتی ہوں، جو میری فکر میں دن رات بے چین [illegible] ضرورت ہو تو اپنے ماموں کے پاس رہوں گی"

"میں تمہارے ماموں کا سر توڑ دوں گا" بھکاری چڑ کر کہنے لگا۔

"بڑے آئے [illegible] توڑنے والے، اب میرے ماموں کچہری میں بھیک مانگتے ہیں [illegible] ان سے اچھی دوستی ہے بڑے صاحب ہر اتوار [illegible] دے دیتے ہیں" بھکارن نے دوسری دن [illegible] مسکرا کر جواب دیا۔

"[illegible] ہے [illegible] کیوں توڑنے لگا [illegible]"

"[illegible] کاش [illegible] پڑھ جاسکتا" بھکارن نے بھی دل کی بے چینی دبا کر کہا۔

"[illegible] قسمت میں ہو گی، کاش [illegible] مجھے [illegible] سے مطلب؟"

[illegible] بھکارن نے اتنا کہا اور اپنے پتا کے پاس چلی گئی جو

[illegible] میں پڑا کراہ رہا تھا، وہاں جا کر وہ آہستہ آہستہ [illegible] اس کا دل [illegible] آ رہا تھا۔ وہ اپنے دل کو سمجھانا چاہتی تھی مگر [illegible]

[illegible] ایک چھوٹا سا چراغ بجھنے کے قریب تھا۔ اور ایک پروانہ [illegible] کو ختم کر دینا چاہتا تھا لیکن چراغ کی [illegible] پروانے کو جلا گئی۔ رات آدھی [illegible] ہوا کے ایک جھونکے سے چراغ کی زندگی ختم کر دی [illegible] ہوئے کلیجے کو سکون [illegible] میں اندھیرا چھا گیا۔ ایک کونے میں [illegible] پاس بیٹھی [illegible] بھکارن آنسو بہا رہی تھی۔ دوسرے کونے میں چپ چاپ [illegible] بھکاری پڑا تھا

— ۳ —

"بڑی سردی ہے"

"[illegible] نہیں جاتی! بابوجی رات کیسے کاٹیں گے یہ [illegible]" ...... !

"ہاں بڑی سردی ہے۔ ایک کمبل ہو تو ...... کام [illegible]"

"ہاں"

"کیا کہا تم نے؟ ایک کمبل! کہاں سے لاؤں کمبل، تھوڑا سا [illegible] بھی لے تو کوئی بابوجی کی حفاظت ہو سکے، اف کیسی ٹھنڈک ہے میں مر جاؤں گی۔"

"کیا کروں؟ کہاں سے لاؤں؟ ...... کمبل ......"

"[illegible] ہو تمہیں بھی آرام ملے"

"[illegible] روپیہ میں کمبل ملے گا؟"

"یہی پانچ چھ روپے میں"

"باپ رے! اتنی قیمت، میں تو سمجھی تھی کہ ڈیڑھ دو روپے میں"

"سستا کمبل بیکار ہوتا ہے، جاڑا نہیں جاتا"

"بیتا جی کی بڑی تکلیف! باپ رے ایسی سردی [illegible]"

[illegible] ذرا اونچی کالی رات فضا میں برف کے چھوٹے چھوٹے [illegible] تھے ہوا ایسی تھی کہ ہڈیوں کو چیرتی ہوئی نکل جائے

ورنہ کا پتہ پتہ کانپ رہا تھا بھکاری نے ٹھنڈی سانس بھر کر سوچا [illegible] اسے ایک کمبل جائے تو پھر کسی [illegible] بھکارن کے [illegible] کے لئے وہ پڑھا [illegible] کاٹ [illegible] بھکارن کو فائدہ [illegible] فائدہ [illegible] بھکارن کا پتا اور بیٹا [illegible] خوشی سے کیا کچھ نہ سب کچھ [illegible] سے رات کو سوچ [illegible] کمبل کے لئے [illegible] کا سامنا کرنا پڑتا [illegible] بار آج [illegible] کیا [illegible] کے لئے اتنا بھی نہیں کر سکتا [illegible] کے لئے [illegible] سب دن پچھ نہ بھول جائے [illegible] کا [illegible] دن ٹھوکر کا نشانہ [illegible] کیا کہ گئی وہ اپنے دل میں [illegible] شرمندہ ہوا [illegible] دل کی کمزوری [illegible] کس کے [illegible] بیچارگی بیکسی اور مفلسی کا راجہ بھکاری [illegible] لیکن یہ بات نہایت تکلیف پہنچا رہی تھی کہ وہ بھی بھکارن کے ساتھ مفلسی کے باعث گردن جھکائے انہی خیالوں کی دنیا میں [illegible] کوئی صبح کی سفیدی پھیلتے ہی [illegible] خیال بھکارن کی طرف گیا وہ [illegible] تمام [illegible] اپنے پتا کو اٹھا کر چپ چاپ بیٹھی دیکھ [illegible] تھی [illegible] بھکارن سے یہ منظر نہ دیکھا گیا [illegible] دل میں عہد کیا کہ بغیر ایک کمبل لئے [illegible] بھکارن کو منہ دکھائے گا [illegible] ہوا بھکاری [illegible] کی طرف چلا۔ اس کے پاس صرف پانچ [illegible] پیسے تھے اور آج اسے پانچ چھ روپے کا سودا کرنا تھا۔ [illegible] میں وہ اتنے روپے کیسے لا سکے گا؟

— ۴ —

دن ایک خواب کی طرح ختم ہو گیا بھکاری سارا دن [illegible] کے نیچے بیٹھا سوچتا رہا کہ وہ کمبل کیسے حاصل کرے۔ سامنے خوبصورت اور شاندار دکانوں کی قطار تھی شیشہ کی الماریوں میں بے شمار کمبل [illegible] لوگ آتے اور چپ چاپ کمبل خرید کر چلے جاتے۔ ایک صاحب آئے ساتھ چار پانچ چھوٹے بچے

"کدھر ہے؟"

"یہ ہے"

"لاؤ"

"دے تو رہی ہوں"

"مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا"

"آنکھوں میں اندھیرا معلوم ہوتا ہے کیا؟" ایک دبی ہنسی کے ساتھ بھکارن نے جواب دیا۔

"ہاں! آج سے معلوم ہونے لگا ہے"

"آج سے"؟ بھکارن نے ہنسکر کہا۔

بھکاری نے ہاتھ پھیلایا تو دوشیزہ کی پیری انگلیاں اسے چھوگئیں۔ اور اس کے جسم میں ایک سنسنی سی پھیل گئی۔

—— ۲ ——

"سنو تو"

"اوں ہوں"

"تمہیں میری قسم"

"پھر وہی بیوقوفی"

"ایک بات سن لو"

"کہو"

"کس سے کہوں؟ دیوار سے؟"

"سن تو رہی ہوں، کہو میں بہری نہیں ہوں"

"جاؤ میں کچھ بھی نہیں کہوں گا"

"میں جاتی ہوں، نہ کہو میری بلا سے"

"ناراض ہوگئیں یہ بری عادت ہے"

"تم کچھ کہتے ہی نہیں تو میں کیا کروں"

"ادھر آکر سنو"

"کہو"

"کل میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔ ہے اجازت؟"

"اچھا"

جس طرح ایک سچا مذہب پرست بلاناغہ عبادت گاہ میں جاتا ہے، اسی طرح بھکاری بھی سرِشام وحرم سا لپہنچ جاتا۔ وہ دوشیزہ بھکارن بھی اپنے باپ کے ساتھ ٹھیک وقت پر آجاتی۔ جب کبھی وہ دیر سے پہنچتی بھکاری کی بے چینی بڑھ جاتی۔ اور وہ بڑی بے تابی کے ساتھ اس کا انتظار کیا کرتا۔ اور انتظار کی چند گھڑیاں کس طرح گزرتیں اسکا دل ہی جانتا۔ وہ رنجیدہ ہوجاتا اسے ہر طرف اداسی نظر آتی لیکن بھکارن کے آتے ہی سب بے چینی کافور ہوجاتی۔ ساری اداسی ہنسی میں تبدیل ہوجاتی۔ وہ اپنے دل میں ایک گدگدی محسوس کرتا کتنی ہی برسات کی کالی کالی راتیں کتنی ہی بسنت کی پیاری پیاری دوپہریں آئیں اور گزر گئیں مگر بھکاری کی زندگی اس کشتی کے مانند تھی جو موجوں میں گھر گئی ہو۔ موجیں اسے جس طرف بہالے جائیں وہ بہتی چلی جاتی ہے۔ بھکاری دکھ اور درد کی موجوں کا انتظار کر رہا تھا۔ کہ دیکھیں کدھر بہالے جاتی ہیں۔

ایک دن اس نے بھکارن سے کہا:

"تمہارے پتا کی حالت روز بروز خراب ہوتی جارہی ہے پھر کیا تم اکیلی ہی رہوگی؟"

"تمہارا اس سے مطلب؟" بھکارن نے تنک کر جواب دیا۔

"مطلب کیوں نہیں خوب کہتی ہو؟" بھکاری کہنے لگا۔

"میں تمہاری کون ہوتی ہوں، جو میری فکر میں دن رات بے چین ہو رہے ہو! میں اپنے ماموں کے پاس رہوں گی"

"میں تمہارے ماموں کا سر توڑ دوں گا" بھکاری چڑ کر کہنے لگا۔

"بڑے آئے سر توڑنے والے! میرے ماموں کچہری میں بھیک مانگتے ہیں، پولیس والوں سے انکی دوستی ہے۔ بڑے صاحب ہر اتوار کو چار آنے دیتے ہیں" بھکارن نے دل ہی دل میں مسکرا کر جواب دیا

"وہ ٹھیک ہے، میں تمہارے ماموں کا سر کیوں توڑنے لگا۔ میں ... ہوں۔ ... کون ہوں میں خود ہی کانشی جانیوالا تھا، پر نہ جا سکا" بھکاری نے اپنے دل کی بے چینی دبا کر کہا۔

"ہٹو میرے سامنے سے! میں تم سے نہیں بولونگی! کانشی جاؤ یا پریاگ! مجھے اس سے مطلب"

بڑی تیزی سے بھکارن نے اتنا کہا اور اپنے پتا کے پاس چلی گئی، جو

دوسرے کونے میں پڑا کراہ رہا تھا۔ وہاں جاکر وہ آہستہ آہستہ رونے لگی اسکا دل اندر آرہا تھا۔ وہ اپنے دل کو سنبھالنا چاہتی تھی لیکن سنبھال سکی تھی۔

مٹی کا ایک چھوٹا سا چراغ بجھنے کے قریب تھا۔ اور ایک پروانہ اسکے ارد گرد چکر لگا لگا کر اپنے آپ کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔ لیکن چراغ کی لو اتنی تیز نہ تھی کہ اپنے پریمی کو جلا سکے۔ رات آئی اور ہوا کے ایک ہلکے سے جھونکے نے چراغ کی زندگی ختم کر دی۔ جلتے ہوئے کلیجے کو سکون ملا۔ دھرم سالے میں اندھیرا چھا گیا۔ ایک کونے میں اپنے تیاکے پاس بیٹھی ہوئی بھکارن آنسو بہا رہی تھی۔ دوسرے کونے میں چپ چاپ آنکھیں بند کئے ہوئے بھکاری پڑا تھا۔

(۳)

"بڑی سردی ہے"

"اف! اب سہی نہیں جاتی! باوجی رات کیسے کاٹیں گے میں تو مر جاؤنگی۔ لیکن۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !"

"ہاں بڑی سردی ہے! ایک کمبل ہو تو! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کام تو مشکل ہے؟"

"ہاں"

"کیا کہا تم نے؟ ایک کمبل! کہاں سے پاؤں کمبل؟ تھوڑا سا پیال بھی ملے تو کافی ہے باوجی کی حفاظت ہو سکے! اف کیسی ٹھنڈی ہوا ہے، میں مر جاؤں گی!"

"کیا کروں؟ کہاں سے پاؤں پیال۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کمبل۔ ۔ ۔ ۔ کمبل ہو تو تمہیں بھی آرام ملے!"

"کتنے روپیہ میں کمبل ملے گا؟"

"یہی پانچ چھ روپے میں"

"باپ رے اتنی قیمت! سمجھتی تھی کہ ڈیڑھ دو روپے میں"

"سستا کمبل بیکار ہوتا ہے! جاڑا نہیں جاتا!"

"تیا جی کی بڑی فکر ہے! باپ رے ایسی سردی ـــــ"

پوس ماگھ کی ڈراونی کالی رات۔ فضا میں برف کے چھوٹے چھوٹے ذرات اڑ رہے تھے۔ ہوا تو ایسی تھی کہ ہڈیوں کو چیرتی ہوئی نکل جائے درخت کا پتہ پتہ کانپ رہا تھا۔ بھکاری نے ٹھنڈی سانس بھر کر سوچنا شروع کیا۔ اسے ایک کمبل چاہئے اپنے لئے نہیں ـــــ تو پھر کس کے لئے؟ اس بھکارن کے لئے۔ اسکے تیا کے لئے۔ وہ بوڑھا زندگی یا بچ کمبل اوڑھ کر رات کاٹے گا۔ لیکن اس سے بھکاری کو فائدہ؟ تو کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ لیکن جب اسے بھکارن کا تیا اوڑھیگا۔ تو بھکارن کتنی خوش ہوگی۔ اور اسکی خوشی ہی اس کے لئے سب کچھ ہے۔ بھکاری نے رات کو سوچ لیا۔ کہ اسے کیا کرنا ہے ایک کمبل کے لئے اسے کتنی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پہلی بار آج اسے اپنی بیچارگی کا احساس ہوا۔ کیا وہ اپنے پریم کے لئے اتنا بھی نہیں کر سکتا؟ ایک معمولی کمبل بھی جب اس کے لئے پہاڑ ہو۔ ہائے تو کس بل پر کسی بھولی بھالی دوشیزہ کا دل موہ لینے کیلئے رات دن منصوبے گانٹھا کرتا ہے۔ اسکی محبوبہ کیا کہے گی، وہ اپنے دل میں بہت شرمندہ ہوا۔ اسکے دل کی ملکہ سمجھ لیگی کہ وہ کس کے دل کی رانی ہے جو مجبوری لاچاری، بیکسی اور مفلسی کا ریجھ ہے بھکاری مجبور تو تھا ہی، لیکن یہ بات اسے نہایت تکلیف پہنچا رہی تھی کہ وہ اپنی بھکارن کے سامنے مفلسی کے باعث گردن جھکا دے۔ انہی خیالوں کی دنیا میں اس نے رات کاٹی۔ صبح کی سفیدی پھیلتے ہی اس کا خیال بھکارن کیطرف گیا، وہ اپنے تمام چیتھڑے اپنے تیا کو اوڑھا کر چپ چاپ بیٹھی دکھ کی گھڑیاں گن رہی تھی، نہ آگ تھی، نہ کپڑے، بھکاری سے یہ منظر نہ دیکھا گیا۔ اس نے اپنے دل میں عہد کیا کہ بغیر ایک کمبل لئے اپنا منہ بھکارن کو نہ دکھائے گا یہی بڑبڑاتا ہوا بھکاری بازار کیطرف چلا۔ اسکے پاس صرف پانچ چھ آنے کے پیسے تھے۔ اور آج اسے پانچ چھ روپے کا سودا کرنا تھا۔ آٹھ دس گھنٹوں میں وہ اتنے روپے کیسے کما سکے گا؟

(۴)

دن ایک خواب کی طرح ختم ہوگیا۔ بھکاری سارا دن ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر سوچتا رہا کہ وہ کمبل کیسے حاصل کرے۔ سامنے خوبصورت اور شاندار دکانوں کی قطار تھی۔ شیشہ کی الماریوں میں بے شمار کمبل پڑے تھے، موٹروں کی ریل پیل تھی لوگ آتے اور چپ چاپ کمبل خرید کر چلے جاتے۔ ایک صاحب آئے، ساتھ چار پانچ چھوٹے بچے

بچے تھے۔ دوکاندار نے خوشی سے بڑھ کر خوش آمدید کہا۔ دیکھتے دیکھتے وہ کئی گرم شال اور کمبل خرید کر چلے گئے۔

دوسرے صاحب آئے انہوں نے کئی کمبل خریدے اور بھورے رنگ کا کمبل خود پہننے کے لئے خرید کر واپس چلے گئے سامنے ایک سپاہی موٹا سا کمبل اوڑھے چلا آرہا تھا ہماری نگاہوں میں تمام دنیا کمبل پوش دکھائی دینے لگی۔ مگر تمام دنیا میں صرف وہی بدنصیب تھا جس کے پاس کمبل نہ تھا وہ تمام کمبل والوں کو گالیاں دینے لگا

رات آئی بھکاری کا دل اپنی بیوی کے لئے تڑپنے لگا لیکن مت ... خود کمبل لئے چین کہاں۔ اب تو وہ کمبل لیکر ہی اپنی رانی کے سامنے سر اونچا کرکے کھڑا ہوگا جس طرح ایک بہادر سپاہی کارنمایاں انجام دیکر اپنے سردار کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔

سوچتے سوچتے رات ختم ہوگئی لیکن کمبل ہاتھ نہ لگا۔ اسی طرح بھکارن کے کئی دن اسی تنگی میں ختم ہوگئے اس نے دھرم سالے کی طرف قدم بھی نہ اٹھایا۔ اسکا دل تڑپ تڑپ کر رہ جاتا۔ اس کا دل ہر دم یہ یاد دلاتا کہ اسکی محبوبہ نے پہلی بار اشارے سے جو چیز مانگی تھی اس کو پورا نہ کرنا بے وفائی میں داخل ہے بھکاری کمبل لیکر اپنی عزت بڑھانا چاہتا تھا اپنی بے پایاں محبت کا ثبوت پیش کرنا چاہتا تھا اپنے پیسوں سے کچھ خرید کر کھاتا اور خاموشی سے پڑے پڑے کمبل کی دکان کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھا کرتا۔ قریب قریب ایک ہفتہ تو ختم ہوگیا بھکاری اکتا گیا۔

پھر رات آئی

ہمیشہ کی طرح ماگھ کی بھیانک رات اور آتی گھنگھور گھٹا کیساتھ غضب کی سردی بھی بادل انتہائی غصے سے گرجنے لگا سارا شہر کانپنے لگا۔ رات بڑھتی ہی گئی اور دیکھتے دیکھتے سناٹا چھا گیا۔ دوکانیں بند ہوگئیں سارا شہر گرم کمبل اوڑھ کر سوگیا کم سے کم بھکاری کو تو ایسا معلوم ہونے لگا، سردی نے پھر اسے ایکبار کمبل کی یاد دلائی۔

رات کی تاریکی لحہ بہ لحہ بڑھ رہی تھی۔ بھکاری آہستہ آہستہ کمبل کی دکان کیطرف بڑھنے لگا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ رواں رواں کانپ رہا تھا۔ کلیجہ منہ کو آرہا تھا۔ وہ کمبل کی دوکان کے پاس آیا ادھر ادھر دیکھ کر اپنے کپڑوں میں سے کچھ نکال کر آہستہ سے شیشوں کو توڑ دیا۔ ایک ہلکی سی آواز فضا میں کھو گئی۔ ایک سیکنڈ میں بھکاری نے اپنے آپ کو کمبلوں کے پہاڑوں میں پایا۔

اس نے بہت سے کمبلوں کو چھوا، کتنا لطف آرہا تھا۔ خوشی سے اسکا دل اچھلنے لگا۔ اب اسے یہ فکر لاحق ہوگئی کہ ان کمبلوں میں سے کونسا کمبل لے۔ جلدی میں اس نے ایک موٹا کمبل اٹھالیا اور ادھر ادھر دیکھ کر اپنا راستہ لیا۔ وہ سیدھا دھرم سالے کی طرف اڑا جا رہا تھا گویا اس کے پیروں سے پر لگے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر وہ ضرور اپنی بھکارن کا دل موہ لے گا، وہ کتنی خوش ہوگی۔ اور پھر ایکبار اسی طرح اپنی درد بھری آنکھوں سے اسکی طرف دیکھکر مسکرا پڑے گی۔ وہ اپنے آپ کو چھپاتا ہوا بڑی تیزی سے بھاگا جا رہا تھا سامنے دھرم سالہ نظر آیا۔ وہ خوشی میں پھولا نہ سمایا۔ بڑی عجلت کے ساتھ دھرم سالہ میں داخل ہوا، اسکی آنکھیں کسی کو تلاش کرنے لگیں۔

دھرم سالہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ دل شکستہ ہوکر چلایا۔ "تم" کہاں گئی وہ؟

فوراً ہی ایک کونے سے جواب ملا "کون ہے؟"

بھکاری کہنے لگا "تم کون ہو اور یہاں جو ایک بوڑھا اور اسکی لڑکی رہتی تھی کہاں گئے؟"

"نہیں نہیں جانتا! بوڑھا شاید مرگیا اور لڑکی کو اس کا کوئی رشتہ دار آکر لے گیا لیکن تم ہو کون؟"

"آہ!!!"

بڑی زور سے بادل گرجا ہوا کے ٹھنڈے جھونکے کیساتھ موسلا دھار بارش ہونے لگی بھکاری جہاں تھا وہیں بیٹھا رہا۔ رات آہستہ آہستہ اپنا سفر ختم کررہی تھی

کرشن چندر ایم اے

بچپن

رفیع کو تیتریوں سے بہت محبت تھی یوں تو رفیع کو ہر چیز سے محبت تھی جو خوشنما نگار رنگ کی تیتریوں کو باغ میں اڑتے دیکھ کر اسکا دل کا یک بے تاب ہو جاتا اور وہ انکے پیچھے خوشی کی وحشیانہ چیخیں مارتا ہوا پھولوں کی کیاریوں کو روندتا ہوا بھاگا بھاگا پھرتا، اور جھٹ سے اپنی پھندنے والی ٹوپی سر سے اتار کر لاجوردی رنگوں والی ایک تیتری کو اس میں قید کر لیتا۔ پھر آہستہ سے حیرت اور پیار بھری نگاہوں سے تیتری کی طرف دیکھتا۔ اسے اپنی چھوٹی چھوٹی نازک انگلیوں میں پکڑ کر ادھر ادھر گھوماتا۔ تیتری کے پر پھڑپھڑاتے اور یکا یک اسکا دل رحم کے جذبات سے اتنا بھر جاتا۔ کہ اسکی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگتے اور وہ اسے یکلخت چھوڑ دیتا۔ تیتری اڑتی ہوئی دور سونف کے پودوں پر سے شفتالوؤں کے درختوں کی چوٹیوں سے گزر جاتی۔ رفیع حیرت بھری نگاہوں سے اڑتی ہوئی خوبصورت تیتری کی طرف دیکھتا۔ کتنی اچھی تیتری تھی! محبت اور افسوس۔ یکا یک ایک اور تیتری، سبز اور چمکیلے پروں والی پہلی تیتری سے بھی زیادہ حسین اور درخشاں سنگھرج کے پھولوں کے اوپر اڑتی ہوئی دکھائی دیتی، اور وہ اپنی چھوٹی چھوٹی ٹانگوں سے لمبی لمبی چھلانگیں مارتا ہوا سنگھرج کے تختوں کی طرف دوڑنے لگتا۔ اسے واقعی تیتریوں سے محبت تھی۔

اسے آڑوؤں سے بھی محبت تھی اور سیبوں سے بھی، اور لال لال رنگ کے شربتی انگوروں سے بھی، جب درختوں پر سیب سونے کی گیندوں کی طرح چمکتے، اور لمبی لمبی سبز بیلوں میں پہاڑی انگور یاقوت کے دانوں کی طرح دمکتے، تو انہیں دیکھکر رفیع کا دل کسی نامعلوم خوشی سے کانپنے لگتا۔ صرف دل ہی نہیں، بلکہ ٹانگیں بھی، وہ چاہتا کہ وہ جلدی جلدی درخت کی اونچی شاخوں پر چڑھ جائے اور ہر ایک آڑو کو اپنی نکر کی ننھی ننھی جیبوں میں بھر لے۔ ہر سیب کو انگوروں کے ہر خوشے کو اپنے گالوں کے اندر یا شاید اپنے دل کے اندر چھپا لے وہ نہیں چاہتا تھا۔ کہ دنیا کا کوئی اور فرد بھی اسکے سیبوں، آڑوؤں، انگوروں اور ناشپاتیوں کی طرف نگاہ بھی اٹھائے۔ اسے یقیناً ان سے محبت تھی اور باغ کے مالی کو یہ اچھی طرح معلوم تھا۔

اور پھر اسے اپنی انا سے بھی محبت تھی۔ جب اماں انا کو کبھی جھڑک دیتیں، اور انا اداس صورت بنائے آنچل کے ایک کونے سے آنسو پونچھتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی جاتی، تو رفیع ادھر ادھر دیکھتا ہوا سہم سہم کر قدم اٹھاتا ہوا، چپکے سے انا کے کمرے میں چلا جاتا اور انا کی سیاہ گھگھری کا کونا پکڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ وہ اداس معصوم اور پیار بھری نگاہوں سے اپنی انا کی طرف دیکھتا، اور وہ انا کو چپ کرانا چاہتا وہ اسے ڈھارس دینا چاہتا۔ لیکن پتہ نہیں کیوں وہ کچھ نہ کر سکتا۔ پھر یکا یک اس کا گلا بھر آتا اور انا کو روتے دیکھ کر وہ بھی بے اختیار سسکیاں لینے لگتا۔ پھر انا اسے اپنی گود میں لے لیتی اسے اپنے بازوؤں میں زور سے بھینچ کر چھاتی سے لگا لیتی۔ اپنے گیلے رخسار اسکی نرم نرم گالوں سے لگا لیتی اس کا منہ اتنی بار چومتی کہ اسکی کا دم رکنے لگتا پھر آہستہ آہستہ انا کی سسکیاں بند ہو جاتیں اور اس کے آنسو خشک ہو جاتے — ہاں اسے اپنی انا سے بہت محبت تھی۔

لیکن انا سے محبت کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اسے امی اچھی نہ لگتی تھیں امی تو اسکی جان تھی، لیکن وہ کیا کرے، اماں ہی اسے ہر وقت اپنے پاس نہ رہنے دیتی تھیں "جاؤ ننھے باغ میں کھیلو، جاؤ ننھے سکول جا رفیع میر کو،" وہ جب دیکھتا امی کسی نہ کسی کام میں مصروف ہوتیں امی کچن میں جائیں تو وہ پیچھے بھاگتا۔ اور کروشیا یا سلائیاں لے کر بیٹھتیں تو وہ صوفے کا کونا پکڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ اور امی کے بالوں سے کھیلنے لگ جاتا۔ اماں جھڑک دیتیں "ننھے تم نے سبق نہیں یاد کیا۔ اور

وہ سہم جاتا۔ "جاؤ کام کرو۔" اور وہ دھیمے دھیمے قدموں سے واپس لوٹ جاتا۔ اسے تو اماں سے محبت تھی لیکن اماں ہی اسے ہر وقت پیار نہیں کرتی تھیں، جب گھر میں مہمان عورتیں آتیں تو وہ مچل جاتا اور بار بار اماں کے پاس جا کھڑا ہوتا۔ لیکن اماں اسے یونہی پچکار کر کہہ دیتیں "رفیع بیٹا۔ باہر کھیلو۔"

ہاں کبھی کبھی وہ اماں کی گھرکیوں کی بھی پروا نہیں کرتا تھا اماں طشتری اٹھائے ہوئے ابا کے لئے کھانے کے کمرہ میں تراشے ہوئے پھل لیجا رہی ہوتیں۔ کہ وہ انکی ٹانگوں سے لپٹ جاتا۔ شریر ننھے شریر رفیع کہنے سے کیا ہوتا تھا۔ وہ اردو کی تیسری کتاب اٹھائے ہوئے اماں کے ارد گرد شور مچاتا ہوا بھاگتا، اور نہیں ایک قدم بھی آگے نہ بڑھنے دیتا۔ تھک کر اور ہار کر وہ اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیتیں، اماں کی میٹھی اور رحم بھری نگاہیں دیکھ کر وہ انکی گردن سے لپٹ جاتا "میری اچھی امی"۔

وہ اباجی کو بھی بہت چاہتا تھا۔ گرچہ اسے پتہ تھا کہ ابا بہت بڑے آدمی ہیں۔ وہ نرم لہجے میں بہت کم بات کرتے ہیں، پھر بھی وہ انہیں بہت چاہتا تھا۔ اگر وہ دورے پر جاتے تو وہ ہمیشہ ضد کرتا "مجھے بھی ساتھ لیجاؤ ابا، لیجاؤنا ابا، اچھے اباجی۔ اباجی" لیکن ان منتوں سماجتوں کا اباجی پر ہمیشہ کم اثر ہوتا تھا، اور تو اور وہ شام کو سیر کرنے کے وقت بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ چلے جایا کرتے، اور بیچارا رفیع چپکا ہی رہتا، ابا دورے سے واپس آتے تو وہ کتنی دیر ہی ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ کر ابا کی راہ دیکھتا رہتا، اور جب ابا دور سے ہی گھوڑے پر سوار ندی کے قریب کی پگڈنڈی پر نظر آ جاتے، تو وہ فرط مسرت سے چلا اٹھتا، اباجی آئے، وہ آئے، وہ آئے، ہاں وہ اباجی کو بہت چاہتا تھا۔

لیکن محبت تو اسے نیلا سے ہی تھی، نیلا بیگم فتح دین چپراسی کی لڑکی تھی، عمر میں شاید رفیع سے ایک برس بڑی ہی تھی شاید اسی وجہ سے وہ بیچارے رفیع کی پروا تک نہ کرتی تھی، ممکن ہے کہ کوئی اور وجہ بھی ہو، لیکن اس کا رفیع کو پتہ نہ تھا۔ بہرحال رفیع کو جتنی نیلا سے محبت تھی، اتنی نیلا اس سے بیگانہ تھی، اس نے تو آج تک کبھی رفیع سے بات بھی نہ کی تھی، بلکہ جب کبھی وہ رفیع کے پاس سے گزرتی، (اور رفیع کو ایسے موقعے بہت کم آئے ہونگے) تو سر اٹھا کر اپنے خوبصورت گھونگروالے بالوں کو جھٹکا کر اسکے پاس سے گزر جاتی، غریب رفیع کو اسوقت بہت ہی ذہنی تکلیف ہوتی تھی، وہ اس چھوٹے سے قصبے کے ہر ننھے لڑکے سے ہنس ہنس کر بات کرتی تھی۔ مگر بیچارے رفیع کو ہی یہ مسرت حاصل نہوئی تھی۔

یوں تو یہ کوئی بہت بڑی بات نہ تھی، رفیع کی معصوم زندگی میں چند ہی ایک ایسے تکلیف دہ لمحے آتے تھے، ورنہ دن بھر تو وہ نیلا کو کم وبیش یاد بھی نہ رکھتا تھا سکول کی قید، ماسٹر کی گھرکیاں حساب کے سوال جمع تفریق ضرب تقسیم۔ باغ میں اچھل کود، رات کو وہ جب تھک کر بستر پر ہوتا تو بس پھر صبح امی ہی اسے مشکل سے جگاتی تھیں۔

لیکن جب نیلا سامنے آ جاتی، یا وہ جب باغ میں پھولوں سے اکیلا کھیلتا کھیلتا اکتا جاتا، تو نیلا کی حسین گڑیا جیسی صورت کا خیال کر کے وہ ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا، اور اس کا جی چاہتا، کہ وہ خود نیلا کو بلا لے، بھلا وہ اسے کیا کہے گی، اچھا تو بھلا وہ اس سے ہی کیوں نہیں بولتی۔ ایکدن جب وہ یونہی کھیلتا کھیلتا ندی کے کنارے چلا گیا تھا۔ جہاں ندی پہاڑ کے قدموں سے ٹکرا کر اپنا بہاؤ تبدیل کرتی ہوئی جنوب کی طرف مڑ جاتی تھی تو وہاں اس نے ایک تنگ سے بہت بڑے درخت کے نیچے بہت سے اپنے ہمجولی دیکھے۔ کئی پتنگیں چڑھا رہے تھے، کئی بانسریاں بجا رہے تھے کئی بچھڑی ہوئی بھیڑ بکریوں کو آوازیں دے دے کر واپس ملا رہے تھے۔ دو تین ندی کے کنارے نہا رہے تھے۔ اور ندی کے نیلے پانی میں تیرنے کی ناکام کوششیں کر رہے تھے۔ ایک طرف منوہر، صادق حسنی، نوراں، کیتھری اور بہت سے لڑکے لڑکیاں ریت کے ٹیلے کھود کھود کر عالیشان محل بنا رہے تھے۔ رفیع بھی ان کے ساتھ جا کر کھیلنے لگا۔ ان میں نیلا بھی تھی، وہ بہت دیر تک ان کے ساتھ کھیلتا رہا۔ لیکن معلوم نہیں کیوں نہ اس نے نیلا سے بات کی، نہ نیلا نے اس سے۔ کھیلتے کھیلتے نیلا اور کیتھری پتنگ کے قریب

چلی گئیں۔ اور پتنگ چڑھانے لگیں، رفیع حیرت سے انکی طرف دیکھنے لگا، اس نے آجتک کبھی پتنگ نہ چڑھائی تھی، اتنی اونچی، اسے تو پتنگ پر بیٹھنے سے بھی ڈر لگتا تھا۔

صادق بانسری بجا رہا تھا، رک کر بولا آؤ پتنگ پر چڑھو گے

رفیع انکار نہ کر سکا، خاصکر نیلا کے سامنے جو دوسری پتنگ سے اتر کر اب پاس کھڑی مسکرا رہی تھی۔

رفیع ڈرتے ڈرتے پتنگ پر چڑھا لیکن اب اسے پتنگ کو آگے بڑھانے کا ڈھب نہ آتا تھا۔ ناچار کہنے لگا مجھے چھوڑ لادو،

یہ سنکر بہت لڑکے لڑکیاں ہنس پڑے۔ رفیع کو ایسا معلوم ہوا کہ نیلا کی ہنسی ان سب میں سے بلند تھی، وہ شرمندہ سا ہو گیا اور پتنگ سے اتر آیا، اور سیدھا گھر کی طرف چلا گیا۔ وہ غمگین اور اداس جا رہا تھا، اسے کسی پر غصہ نہ تھا، صرف اسے بار بار نیلا پر غصہ آ رہا تھا گھر پہنچتے پہنچتے اسکی سسکیاں تیز ہو گئیں۔ اور جب وہ بڑے پھاٹک کے اندر داخل ہوا، تو وہ زار و زار رو رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" امّاں نے پوچھا۔

"کیوں رو رہے ہو بیٹا؟"

"بیٹا رفیع کیا بات ہے؟"

"میرے رفیع کو کس نے مارا ہے؟"

"ننھے تم اتنی دیر کہاں کھیلتے رہے، یہاں بیچارا مالی ڈیڑھ دو گھنٹے سے تمہاری تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے، بولو رفیع ننھے۔"

لیکن ننھا رفیع دیر تک روتا رہا آخر جب وہ چپ ہوا۔ تو سسکیوں کے درمیان میں رک رک کر بولا۔۔

"میں۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ ایک پتنگ۔۔۔ ایک پتنگ لگوا دو امی"

نیلا رفیع کے ہاں کئی بار آئی کبھی امی سے مٹھائی لینے کے لئے کبھی کرتی کپڑوں کا جوڑا لینے کے لئے، کبھی پکے ہوئے اخروٹ دینے کے لئے، جو اس کے گھر کے آنگن میں اگے ہوئے درخت پر لگتے تھے لیکن رفیع اسے دیکھتا ہی رہ جاتا۔ کئی بار رات کو سوتے وقت جب اماں اسے پریوں کی کہانیاں سناتی، تو وہ سوچا کرتا، کہ کیا پریاں نیلا کی طرح خوبصورت اور مغرور ہوا کرتی ہیں۔ لیکن اس سوال کو اماں سے پوچھنے کا اسے کبھی حوصلہ نہ ہوا۔ نیلا اسے ایک مورت کی طرح پیاری لگتی تھی، کبھی وہ سوچتا۔ اسکے گال کتنے لال ہیں اس کے ہونٹ اس کے اپنی گالوں یا ہونٹوں کا رنگ تو اتنا صاف نہ تھا، اچھا تو اگر وہ بھی نیلا کی طرح خوبصورت بن جائے تو کیا پھر بھی نیلا اس کو نہ بولے گی، یہ خیال اسے اسوقت آیا، جب کہ وہ سنبلو کی ایک اونچی جھاڑی کے قریب کھڑا ہوا پکے ہوئے سرخ سرخ سنبلو توڑ توڑ کر کھا رہا تھا، ان سنبلوؤں کا رنگ کتنا سرخ تھا، سنبلو کھاتے کھاتے اس نے چار پانچ سنبلو توڑ کر اپنی گالوں پر مل لئے، اور اپنے ہونٹوں اور ٹھوڑی کو بالکل لال کر لیا پھر یکایک اسے دوسری جھاڑی کے قریب ایک خوبصورت تیتری دکھائی دی، اور وہ نیلا کے متعلق سب کچھ بھول گیا۔ وہ کتنی دیر تک تیتریاں پکڑنے میں مصروف رہا۔ آج اس نے سات خوبصورت تیتریاں پکڑیں۔ اور انہیں پھر اس نے اپنے چھوٹے سے رومال میں جمع کر لیا اور انہیں گھر لے گیا۔

اماں نے پوچھا، یہ منہ کیوں لال کر رکھا ہے۔ شاید آج پھر سنبلو کھاتے رہے ہو، میں نے تمہیں کئی بار سمجھایا ہے، کہ سنبلو نہ کھایا کرو، لیکن تم مانتے ہی نہیں، کیوں؟ ان بیچاری تیتریوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟

جب رفیع کو ایک دو طمانچے پڑے تو وہ زور زور سے رونے لگا۔

عید کے دن فتح دین کی لڑکی حسب معمول ایک رومال میں خوبانیاں باندھ کر رفیع کے گھر دینے آئی رفیع گھر پر موجود نہ تھا وہ باغ میں باڑھ کے قریب چنبیلی کے پھولوں کے پودوں سے پھول توڑ رہا تھا، اور ہار بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ نیلا جب خوبانیاں دیکر باغ کے قریب سے گزری، تو رفیع کو باڑھ کے قریب بیٹھے دیکھکر رک گئی، وہ مزے سے ہار بنانے میں مشغول تھا۔

رفیع بیچارے کو پتہ ہی نہ تھا، کہ نیلا پاس ہی کھڑی ہے یکایک نیلا نے باڑھ سے ایک ٹہنی توڑی، رفیع نے سر اٹھا کر دیکھا، نیلا

تھی اس کا چہرہ شرم سے لال ہو گیا، اس نے ہرن کا بچہ چھوڑ دیا اور اٹھ کر بازو سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

نیلا بولی "تمہارا نام رفیع ہے؟"

"ہاں رفیع!"

"رفیع!"

"ہاں رفیع!"

"رفیع کیا نام ہے!" نیلا نے اپنی چھوٹی سی ناک کو ہوا میں اونچا کر کے کہا

"میرا نام نیلا ہے"

نیلا بولی "میرا نام نیلا ہے، ہم وہاں رہتے ہیں" انگلی سے اشارہ کر کے "وہ ان اخروٹ کے درختوں کے پیچھے"

رفیع کہنے لگا "ہمارے ہاں خوبانی کے پیڑ بہت اچھے ہیں"

نیلا بولی "ہمارے ہاں خوبانیاں بہت اچھی ہوتی ہیں"

رفیع کہنے لگا "ہمارے باغ میں بھی بہت اچھی خوبانیاں ہیں"

نیلا نے سر ہلا کر کہا "جھوٹ، ہماری خوبانیاں سب سے میٹھی ہوتی ہیں"

رفیع کچھ دیر خاموش رہا، پھر بولا "میں پتنگ بڑھا سکتا ہوں بہت اونچی اڑا سکتا ہوں"

"اچھا!" نیلا نے ایسے کہا، جیسے اسے اس بات کا یقین نہ آ رہا ہو

"میں اپنے باغ کے ہر درخت پر چڑھ سکتا ہوں"

"ہوں!"

"میں —— میں چنبیلی کے ہار بنا رہا ہوں، یہ دیکھو"

نیلا بولی "ہم تم سے اچھے ہار بنا سکتے ہیں" ادھر دکھاؤ پھول"

رفیع نے نیلا کا ہاتھ پکڑا اور ساتھ بڑھ کے ... پھر دونوں تیز تیز ہار بنانے لگے، ہار بناتے بناتے نیلا ہنسنے لگی،

رفیع نے حیران ہو کر پوچھا "کیوں ہنستی ہو، کیا بات ہے؟"

نیلا ہنستے ہوئے کہنے لگی ... "تم کتنی بھدے سے ہار بنا رہے ہو ... ہار بھی نہیں بنا سکتے، اور کیا؟"

رفیع کو جو غصہ آیا، تو اس نے نیلا کے ایک طمانچہ لگا دیا۔ نیلا کہاں ہنس رہی تھی، کہاں اب زور زور سے رونے لگی، نیلا کو روتے دیکھ کر رفیع بہت پریشان ہوا، کیا کرے کیا نہ کرے، اگر امی کو پتہ لگ گیا، کہ اس نے نیلا کے طمانچہ لگایا ہے، تو پٹ جائے گا، چنانچہ وہ نیلا کی منتیں کرنے لگا۔

"اچھا نیلا جانے دو، مت روؤ، میں کہتا ہوں مت روؤ، دیکھو میرے پاس تیتریوں کے تین سو پر ہیں، وہ اندر ڈبے میں بند رکھے ہیں، میں وہ سب تمہیں دے دوں گا، اب تم نہ روؤ، میں تمہیں ابھی لا کر دیتا ہوں۔"

رفیع دوڑتا دوڑتا گھر گیا اور تیتری کے پروں والا ڈبہ لے آیا، اور ڈبہ کھول کر نیلا کے سامنے رکھ دیا، کتنے اچھے پر ہیں، یہ دیکھو دیکھو نیلا، مت روؤ، اور یہ سب پھول اور ہار بھی تمہارے ہوئے۔ رفیع نے ایک دو ہار اٹھا کر نیلا کے گلے میں پہنا دیئے۔

نیلا روتے روتے ہنسنے لگی۔

اس دن سے نیلا اور رفیع اکٹھے کھیلتے رہے۔ انہوں نے جھاڑیوں سے سنبلو چن چن کر کھائے، انگور کی بیلوں پر چڑھ کر سونے کی طرح چمکنے والے انگوروں کے خوشے توڑے۔ نیلا کے گھر اخروٹ کے درخت کے سائے تلے ٹھیکرا ٹھیکری کھیلا۔ اور کھیل کے دوسرے محبوب و مرغوب کھیل کھیلے ندی کے کنارے جا کر گڈریوں کے ساتھ ناچے .... پینگیں چڑھائیں بانسریوں کے گیت سنے کبھی کبھی رفیع دولہا بنا تھا، اور نیلا دلہن، اور گھاٹی کے دامن میں ننھے ننھے گڈریے براتی بنے ہوئے شور مچاتے ہوئے کاغذ کی ونلیاں بجاتے ہوئے بھاگتے پھرتے تھے ایک عجیب نظارہ ہوتا تھا اور جب کبھی نیلا کھیل ہی کھیل میں شوخی یا شرارت سے کسی دوسرے گڈریے کی دلہن بن جاتی، یا کسی جاہ کی بنتی، تو رفیع کا جھگڑا ہوتا، اور کھیل میں حصہ لینے سے انکار کر دیتا، لڑائی پڑ جاتا یا نیلا سے روٹھ جاتا روٹھے ہوئے کو منانے کے لئے نیلا کو بہت بہت منتیں کرنی پڑتی تھیں، اور بہت سخت سخت قسمیں کھانی پڑتی تھیں۔

اس طرح تین سال گزر گئے، اس خوبصورت وادی میں دو ننھے دلوں نے پاک اور معصوم محبت کا ایک میٹھا سہانا، اور پیارا سپنا

رہی۔ وہ سپنا جو پہاڑی جھرنوں کے گیتوں کی طرح دلفریب تھا، وہ محبت جو ستاروں کی طرح روشن اور بلند تھی پھر یکایک رفیع کے والد کی تبدیلی کسی اور جگہ ہو گئی، اور رفیع اور نیلا نے دھڑکتے ہوئے دلوں اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ایک دوسرے کو الوداع کہی۔ رفیع نے جاتے وقت وہ چیز بھی نیلا کو دیدی جسے وہ اپنی جان سے بھی عزیز رکھتا تھا۔ یہ ایک چاقو تھا۔ جس کا پھل بہت تیز اور چمکدار تھا اور دستے پر رنگ برنگ کے سیپ لگے ہوئے تھے۔ اور نیلا؟ ...... نیلا نے بھی اپنی سبز منکوں کی مالا جسے وہ ہر وقت اپنے گلے میں پہنے رکھتی تھی، اتار کر رفیع کو دیدی اور یہ سب کچھ چھپ چھپ کر ہوا۔ لیکن ٹھیک اسوقت کہ جب رفیع کے گھر کے لوگ روانہ ہونے کو تھے۔ اور رفیع کو ایک گھوڑے پر سوار کیا جا رہا تھا نیلا سسکیاں لیتی ہوئی رو پڑی۔ رفیع کا دل بے تاب ہو گیا۔ لیکن اسوقت اس نے نہایت ہمت سے کام لیا۔ اس نے اپنی آنکھوں کے آنسو روک لئے اور منہ پھیر کر آسمان کی جانب دیکھنے لگا جہاں سفید سفید بادل ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے جا رہے تھے۔

تیرہ سال اور گزر گئے اور پھر ایکبار رفیع کے والد کی تبدیلی اسی حسین وادی میں ہوئی، جہاں نیلا رہتی تھی، رفیع کے دل میں بچپن کے خواب جاگ اٹھے۔ اور اس عہد کی معصوم خوشیاں، اور اس زریں زمانے کی تمنائیں دل میں کروٹیں لینے لگیں کیا وہ نیلا کو بھول گیا تھا؟ کیا کالج کی ہنگامی زندگی نے اسکے دل پر بچپن کا کوئی بھی نقش باقی رہنے دیا تھا کیا اب بھی وہ نیلا کو اسی طرح چاہتا تھا؟ ان سب کا جواب شاید خود رفیع بھی اچھی طرح سے نہ دے سکتا تھا ہاں شاید نیلا کو تقریباً بھول ہی گیا تھا۔ لیکن بالکل نہیں وہ سبز منکوں کی مالا ابھی تک اس کے پاس تھی، اور کسی قیمت پر بھی وہ اسے اپنے آپ سے جدا نہ کر سکتا تھا۔

کالج کے پرمسرت لمحوں میں بھی اس نے اکثر نیلا کو یاد کیا لیکن یونہی، کبھی وہ اپنے بچپن کے دلکش کھیلوں کو یاد کر کے مسکرا دیتا۔ عجب زمانہ تھا۔ نہ ہاکی، نہ فٹ بال ٹینس، پھر بھی کتنی مسرت تھی ان کھیلوں میں۔ اور نیلا وہ ننھی شوخ سی گڑیا تتلا کر باتیں کرتی ہوئی ایک عجیب دلکش ادا سے ہنستی ہوئی۔

لیکن اب جب گرمیوں کی چھٹیوں میں اس نے گھر آ کر نیلا کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ آخری بار جب اس نے نیلا کو دیکھا تھا، تو وہ ایک ننھی سی پری تھی جو اس کی طرف دیکھ دیکھ کر روتی جاتی تھی، اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے آنسو پونچھتی جاتی تھی، پھر تیرہ سال تک اس کے تخیل میں نیلا کی یہی تصویر رہی وہ خود لڑکپن سے شباب میں آ گیا، اسکے والد کے سر کے بال سفید ہو گئے۔ باغ میں ناشپاتیوں کے وہ درخت جو آج سے تیرہ سال پہلے نہایت پتلے اور چھوٹے قدوں کے مالک تھے آج اپنی شاخیں آسمان کی طرف بلند کئے کھڑے تھے اور نیلا۔۔۔ وہ ننھی سی گڑیا؟

لیکن جلد ہی وہ نیلا کو دیکھ کر حیران رہ گیا، وہ باغ میں ایک سیب کے درخت کے نیچے کتاب کھولے بیٹھا ہوا تھا، کہ کوئی اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا ہاں یہ نیلا ہی تھی، سرو کی طرح بلند قامت شباب کی رعنائیوں کا مرقع جمیل، اسکے لبوں پر ایک معصوم سی مسکراہٹ تھی، جو شاید سورج کی کرنوں سے مل کر بنی تھی۔ اسکی گود میں ایک ہنستا ہوا بچہ تھا

رفیع اٹھ کھڑا ہوا۔

نیلا بولی "تم نے مجھے پہچانا بھیا؟"

رفیع کے منہ سے نکلا۔ نیلا؟

نیلا ہنسنے لگی وہی دلکش ہنسی، بچہ رفیع کو دیکھ کر کلکاریاں مارنے لگا، اور زور زور سے بازو ہلانے لگا۔

رفیع نے آگے بڑھ کر اور بچے کے شانوں کو چھو کر کہا۔ یہ تمہارا لڑکا ہے نا، کتنا خوبصورت ہے، اسکا کیا نام ہے؟

نیلا نے کانپتی ہوئی آواز میں آہستہ سے کہا، ہاں اس کا نام ہے رفیع، محمد رفیع۔

کتنی ہی دیر رفیع خاموش کھڑا رہا، نہ اسکے پاؤں تلے زمین تھی اور نہ سر پر آسمان، وہ خلا میں گھوم رہا تھا نہایت تیزی سے گھوم رہا تھا، پھر یکایک ایک جھٹکے کے ساتھ وہ بچپن کی زندگی میں لوٹ آیا وہ چھوٹا سا تھا، ننھا رفیع، اور نیلا کے ساتھ بھاگ بھاگ کر تیتریاں

پکڑ رہا تھا۔ نیلا اور وہ سنبلو کی شاخوں پر جھکے سنبلو کھا رہے تھے ندی کے کنارے اونچے تنگ پر جھوٹا جھول رہے تھے گڈریے ... بانسریاں بجا رہے تھے۔ گڈریے براتی بنے ہوئے تھے۔ اور نیلا اسکی دلہن۔ . . . .

بچے نے رفیع کے چہرے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا

با . . با . . با . با . . . .

رفیع بچے کی طرف جھکا ہوا اس نے آہستہ سے اپنی جیب کے اندر سے کوئی چیز نکالی یہ سبز موتیوں کی ایک مالا تھی۔ آہستہ سے اس نے یہ مالا بچے کے گلے میں ڈال دی

نیلا کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ لیکن رفیع نے نہایت ہمت سے کام لیکر اپنے آنسوؤں کو اپنی آنکھوں میں روک لیا۔ اور نگاہیں اٹھاکر گھٹی سے اوپر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں سفید سفید چمکتے ہوئے بادل ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے جا رہے تھے۔

اثر چکوالی بی۔اے

خموشی

نہ کہہ کہ میری محبت میں سوز و ساز نہیں   نہ کہہ کہ میری محبت جنوں طراز نہیں
نہ کہہ کہ میری خموشی میں دلکشی ہی نہیں   دلِ خراب کو احساس دوستی ہی نہیں
غلط کہ ننگِ وفا ہیں تعلقات مرے   گداز و کیف سے خالی ہیں واردات مرے
غلط کہ میری امیدوں میں احتشام نہیں   غلط کہ مجھکو محبت کا احترام نہیں

میں دست کش نہیں ہرگز تری محبت سے   ہیں یاد مجھکو فسانے تری نگاہوں کے
شکستِ ضبط ہے توہینِ رسمِ اُلفت کی   کہ حشر خیز ہیں خاموشیاں محبت کی

خموش رہ کے مجھے تجھ سے عشق کرنا ہے
محیطِ غم سے مجھے اس طرح گزرنا ہے

عزیز احمد

"نغمہ"

وہ آئی طور کے جلوؤں کو شرماتی ہوئی آئی
جہانِ آرزو کو آج گرماتی ہوئی آئی

حیات افزا تبسم جانفزا ہونٹوں پہ رقصاں ہے
ہزاروں بجلیاں رگ رگ میں دوڑاتی ہوئی آئی

فضا میں تیرتی ہیں نغمہ مدہوش کی موجیں
رباب چنگ کے تاروں کو تڑپاتی ہوئی آئی

بہکتی آہ بھرتی ہر قدم پر زیر لب ہنستی
فسانہ الفت رفتہ کا دہراتی ہوئی آئی

کسی نے کہہ دیا تھا ہوش سے بیزار ہے دنیا
حریم ناز کے پردوں کو سرکاتی ہوئی آئی

چمک تاروں کی آنکھوں میں نظریں گدگدی نہال
زمانہ کو گراں خوابی سے چونکاتی ہوئی آئی

فضا میں چھا گئے برق و شرر کے چار سو جلوے
صبا کے دوش پر زلفوں کو بکھراتی ہوئی آئی

چمن پابوس ہوتا ہے بہار آنکھیں بچھاتی ہیں
ادائے مسکراتی پھول برساتی ہوئی آئی

مہ کامل تری بے کیف یہ مے باریاں کب تک
وہ آئی چاندنی راتوں کو شرماتی ہوئی آئی

جمیل احمد کندھاپوری

باغی ڈراما نگار ہنرک ابسن

آج سے ایک صدی پیشتر دنیائے عالم میں ناروے کا کوئی درجہ نہ تھا لوگ اسے حقارت آمیز نظروں سے دیکھا کرتے تھے مگر کسے خبر تھی کہ یہی ناروے دنیائے ادب کا ایک غیر معروف مقام ایک دن ہنرک ابسن Henrik Ibsen جیسا عدیم النظیر شاعر اور باکمال ڈراما نگار پیدا کرے گا

دور حاضرہ کا سب سے ممتاز اور زبردست ڈراما نگار جس نے جدید دنیائے ڈراما کی بنیادیں ہی متزلزل کر دیں بلکہ اپنے بے مثل ڈراموں سے تمام یورپ میں انقلاب کی آگ بھی روشن کر دی۔ آج سے ایک سو دس سال پیشتر ناروے کے ایک چھوٹے سے گاؤں Skien میں ۲۰ مارچ ۱۸۲۸ء کو پیدا ہوا اس کا باپ گاؤں کے سربرآوردہ رئیسوں میں سے تھا لوگ اس کو قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے [illegible] اس کی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ جب ابسن آٹھ سال کا ہوا تو اس کے باپ کی کل کائنات نیلام ہو گئی جس کے باعث سب گھر والوں کو وہ مقام چھوڑ کر Venstop چلا جانا پڑا۔ یہاں پہنچ کر وہ نہایت غربت و افلاس کی زندگی بسر کرنے لگے، اور ابسن اپنے ایام طفلی میں بھوک اور فاقہ کشی جیسی مصیبتوں سے روشناس ہوا۔

ابسن بچپن ہی سے نہایت متین سنجیدہ اور خاموش طبع واقع ہوا تھا اپنے ہم عمر ساتھیوں کے برعکس اسے کھیل کود سے سخت نفرت تھی تمام بچے تو مکان سے باہر اچھل کود اور قسم قسم کے کھیلوں میں وقت گزارتے مگر یہ ہونہار لڑکا باورچی خانہ کے پاس ایک چھوٹے سے کمرے میں چھپ کر تمام دن کتابوں کا مطالعہ کرتا رہتا۔ اسکی بہن نے اس کے بچپن کے حالات بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہم لوگوں کو اس سے مطلق ہمدردی نہ تھی اور حتی الامکان ہم اس کو تنگ کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ چونکہ ہم لوگوں کی خواہش اس کو اپنے ساتھ کھیل کود میں شریک کرنے کی ہوتی اس لئے ہم مل کر اس کے کمرے کے در و دیوار پر پتھر اور برف کے ڈھیلے پھینکتے، اس خیال سے کہ شاید پریشان ہو کر باہر آئے اور کھیل کود میں ہمارا ساتھ دے۔ مگر وہ کبھی ٹس سے مس نہ ہوتا ہاں جب اس کا غصہ ضبط سے باہر ہو جاتا تو وہ کمرے سے نکل کر صحن تک صرف ہمارا تعاقب کرتا اور جب ہم خوفزدہ ہو کر فرار ہو جاتے، تو وہ پھر حسب سابق اپنے کمرے میں چلا جاتا۔ اور کتابوں کے ساتھ اپنا دل بہلانے لگتا۔ چونکہ وہ فطرتاً نہایت متحمل اور نیکدل واقع ہوا تھا اس لئے سنجیدہ ہونے کے باوجود بھی ہمیں کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچاتا!"

زندگی کے چودہ سال گذر چکنے کے بعد ابسن نے نقاشی کو بطور پیشہ اختیار کرنا چاہا مگر اسکے لئے پیسوں کی ضرورت تھی، اور اسکے والدین کی جیبیں خالی تھیں۔ چنانچہ اس کے سارے ارمان خاک میں مل گئے اور آخر مجبور ہو کر وہ ایک سال بعد ایک دور دراز مقام پر ایک طبیب کے ساتھ بطور عطار کے رہنے لگا یہاں اس نے پورے پانچسال گزار دئے۔ شعر و شاعری اور علم و ادب کا شوق اسکے دل میں سب سے پہلے یہیں پیدا ہوا، چنانچہ اپنے فرصت کے اوقات وہ ادبیات کے مطالعے کے علاوہ نظمیں لکھنے میں بھی صرف کرنے لگا۔ روز بروز اسکا شوق بڑھتا گیا یہاں تک کہ وہ اپنا بیشتر وقت نوشت و خواند میں گزارنے لگا سن بلوغت کا ایک سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کیلئے اسے ایک امتحان کی تیاری میں مشغول ہونا پڑا مگر اس دوران میں بھی وہ سسرو کی تقریریں یاد کرتا رہا۔

مادار تجار تو روپے حاصل کرنے کی دھیڑبن میں مصروف رہا کرتے، مگر یہ نوجوان جس کے ہونٹوں سے وہاں کے باشندوں کے خیال میں ابھی دودھ کے نشان بھی خشک نہیں ہوئے تھے ادبیات کے خواب دیکھتا۔ ظاہر ہے سماج یوں کسی کو ترقی کی راہ پر گامزن نہیں دیکھ سکتی چنانچہ گاؤں والوں کے دلوں میں اس کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اٹھی ایسی نفرت جس میں ضد کی آمیزش ہوتی ہے۔۔

ابسن کی خوش نصیبی سے سمندر قریب ہی تھا جس سے عملی دنیا کی وحشت بخش ہوائیں آتی تھیں، ہاں وہ کبھی کبھی گاؤں کے شور و شغب سے نکل کر چلا جاتا اور ساحل پر خراماں خراماں ٹہلتے ہوئے دور، حدِ نظر سے دور شفق کے پار نگاہیں جمائے، شمالی موجوں کے دردناک نغمے سنا کرتا۔

رفتہ رفتہ ابسن کی طبیعت اچاٹ ہوتی گئی، ایک چھوٹے سے قصبے میں زندگی کے دن گذارنا اس کو نہایت غیر شاعرانہ سا فعل معلوم ہوا، اسکے بھرے دل میں جو حوصلے اور نئی نئی امنگیں موجزن تھیں اس چھوٹے سے غیر مقام میں رہ کر شاید وہ اپنے بلند حوصلے پورے نہ کر سکتا تھا۔ اپنی شاہراہ ترقی اس کو کسی اور جگہ دکھائی دیتی تھی، چنانچہ ۱۸۵۰ء میں وہ کرسچینیا چلا گیا، اور وہاں مضامین لکھ کر گزر اوقات کرنے لگا۔

اس کے پاس تین ایکٹ کی ایک مختصر سی ٹریجیڈی Catilina بھی تھی، جو قافیہ وغیرہ سے آزاد تھی، اسی سال بڑی دشواریوں سے وہ اسے شائع کرانے میں کامیاب ہوا مگر ظالم نقادوں نے اس کا خیر مقدم نہایت غصہ و حقارت سے کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ صرف ۴۰ کاپیاں فروخت ہو سکیں، ایک کاپی کا خریدار جس نے کتاب نیکر نوجوان ادیب کی ہمت افزائی کی تھی معمولی دکاندار تھا۔ جس نے کتاب اس کے باطنی اوصاف کے باعث نہیں، بلکہ اس لئے خریدی کہ اس کا کاغذ پارسل بیٹھنے کیلئے نہایت موزوں اور عمدہ تھا۔ ابسن کو جب اس کی خبر ملی، تو اس نے نہ صرف اس دکاندار سے کتاب واپس خریدی، بلکہ روپے دیکر پبلشر سے بھی کتاب کی تمام کاپیاں واپس لے لیں۔

۱۸۵۰ء میں کرسچینیا میں وہ اس ارادے سے گیا تھا، کہ وہاں پہنچ یونیورسٹی امتحان کی تیاری کرے۔ مگر اس کی توقع اور امید کے خلاف جب سٹیج ہونے پر اسکا ایک مختصر او معمولی سا ڈراما بلیک میں بے حد مقبول ہوا، تو اس نے ہمیشہ کے لئے امتحان میں شریک ہونے کا خیال ترک کر دیا۔ اور مصمم ارادہ کر لیا۔ کہ وہ اپنی تمام زندگی گلستانِ علم و ادب کے اندر تنے اور نو کھتے پودے اگانے میں صرف کر دے گا۔ چنانچہ شہر کے ایک سنسان اور معمولی حصے میں اس نے بود و باش کے لئے ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا۔ وہ روپے جو اس کو اپنے ڈرامے کے ذریعے سے ملے تھے جلد ہی صرف ہو گئے اور اب اس کی زندگی نہایت کلفت و مصیبت کے ساتھ گذرنے لگی حتی کہ کھانے پینے تک کو بھی کچھ نہ رہا اور اسے مجبوراً پے در پے فاقہ کشی کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ ہمسایوں کے طنز آمیز حملوں سے بچنے کے لئے وہ کھانے کے وقت گھر سے باہر نکل جایا کرتا کہ لوگ سمجھیں کہ وہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے ہوٹل گیا ہے، اور پھر جب اس طرح تھوڑا وقت گذر جاتا تو وہ پہلے سے بھی زیادہ گرسنہ واپس آ جاتا، اگرچہ اس کے ہمسائے یہی سمجھتے کہ وہ شکم سیر ہو کر واپس آگیا ہے

الغرض بڑی بڑی دشواریوں کے بعد ۱۸۵۱ء میں برجن کے ایک نئے تھیٹر میں ابسن کو ایک جگہ ملی اور وہ ڈرامائی شاعر Dramatic Poet کے عہدے پر فائز ہو گیا اس کے یکسال بعد تھیٹر کے منیجروں نے اس نوعمر ڈائرکٹر کو اپنے اخراجات سے تین ماہ کے لئے سفر پر روانہ کیا، تاکہ وہ بیرونی ممالک میں جا کر سٹیج کے نئی تجارب حاصل کرے۔

دس سال تک یعنی اپنی ذہنی نشو و نما کے رومانی دور میں ابسن نے اس قومی تحریک میں نہایت ہی سرگرم حصہ لیا، جو ناروے کے اندر ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۴ء تک زور و شور سے جاری رہی، اس دوران میں اس نے اپنے وطنی ڈرامے قلمبند کئے جو جذبۂ حبِ وطن سے پُر ہیں اور کافی شہرت حاصل کی۔

قومیت کے لئے ابسن کا سچا جوش و خروش اس امر سے آشکارا ہوتا ہے کہ اس نے ایک سوسائٹی اس غرض سے قائم کی جو بیرونی اثرات کا سدِ باب کرے، اور قومیت کی میرٹ آرٹ

کی عمر میں بھی نقل کرے۔

قومیت کے موضوع پر کافی سے زیادہ خامہ فرسائی کر چکنے کے بعد ابسن کے دل میں ایک نیا ڈرامہ لکھنے کی خواہش ہوئی جسکا پس منظر موجودہ زندگی ہو چنانچہ اس نے ڈرامہ "محبت کی کامیڈی" پیش کیا جس میں منگنی شادیوں کے خلاف زہر میں بجھے ہوئے طنز کے تیر برسائے۔ [illegible] خیال [illegible] عام [illegible] قسم کی [illegible] الوقت شادیوں کو نہایت تحسین کی نگاہ سے دیکھتے [illegible] اس ڈرامے میں ابسن نے [illegible] بت پرست [illegible] سے تمام محبت بالالتزام شادی کے بعد فنا ہو جاتا ہے [illegible] شادی کو محبت کا مزار [illegible] ابسن نے عوام کی محبت کے خلاف [illegible] بغاوت [illegible] اس سے عشق [illegible] نہیں ملتی [illegible] کا خیال ہے کہ [illegible] محبت تمام [illegible] سے بے نیاز اور بالاتر ہوتی ہے اور اس [illegible] کے مطابق سچی محبت [illegible] اصل [illegible] کی [illegible] [illegible]

ابسن [illegible] اس [illegible] نظر سے ہی دیکھیں [illegible] طرح سے بھی [illegible] بحیثیت [illegible] کے [illegible] تصویر پیش کرنے [illegible] کی کوشش [illegible] اس کے اس ڈرامے [illegible] اور سوان گلڈ [illegible] اپنی جینوں پر بغیر کسی قسم کی شکنیں پیدا کئے ہمیشہ کیلئے جدا ہو جانے کو بسر و چشم راضی اور آمادہ ہو جاتے ہیں [illegible] انکی محبت نہ صرف پاک صاف بلکہ ابدی [illegible] لازوال [illegible] ہر قسم کی آلائش سے بے نیاز ہے محبت ان کے خیال کے مطابق ذاتی مسرت کا ذریعہ نہیں بلکہ یہ ایک جذبۂ عشق حقیقی کا [illegible] اور کبھی نہ ختم ہونے والے ایک جذبے کو اپنی روزمرہ کی چلتی پھرتی مکروہ زندگی سے ملوث کر کے تباہ کرنا نہیں چاہتے وہ عشق کے متعلق پھیلے ہوئے موجودہ رسمی زاویہ نظر کو حقارت سے ٹھکرا دیتے ہیں اور اس سے اجتناب کرتے ہوئے [illegible]

شاہراہ پر گامزن ہو جاتے ہیں جو ان کو منزل عشق حقیقی کی طرف لے جاتی ہے۔

اس قسم کے خیالات سے ہم افلاطون کے Sym Posium اور زندہ جاوید شاعر اطالیہ ڈانٹے Vila Nacua [sic] میں بھی دوچار ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں مسیحیت کے ابتدائی دور میں بھی وہ رہبانیت جن کے سینوں میں نور عشق منور ہوتا تھا خدا کو ناظر جان کر اپنی رضا اور خوشی کے ساتھ ہمیشہ [illegible] زندگی گزرنے کا عہد کیا کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کا ڈرامہ جس کا بنیادی نظریہ سماج کے بنائے ہوئے قوانین کی مخالفت ہو [illegible] بھی آسانی سے قبولیت حاصل نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ڈرامہ کے شائع ہوتے ہی ابسن پر لوگوں نے ہر سمت سے لے دے شروع کر دی۔ ناروے کے ایک اخبار نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ محبت کے ایسے انوکھے نظریے کی توقع ہم دہقانی بوڑھیوں سے تو کر سکتے ہیں مگر ایک شاعر کے دماغ میں ہرگز اسکی گنجائش نہ ہونی چاہیئے [illegible] میں محبت کا جو نظریہ مصنف نے پیش کیا ہے وہ صرف غیر اخلاقی ہے۔ بلکہ غیر شاعرانہ بھی۔

ایک دوسرے اخبار نے اس ڈرامہ کے متعلق جس کے قلمبند کرنے میں ابسن نے اپنی زندگی کے پورے تین سال گزار دیئے تھے ان خیالات کا اظہار کیا کہ ——— ڈرامہ ناکتخدائی کی تعریف میں ڈوبا ہوا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کیتھولزم نے ابسن کے دل [illegible] گھر کر لیا ہے [illegible] جس میں اس بات پر خاص زور صرف کیا گیا ہے کہ انسان کی زندگی ہمیشہ انفرادیت کے تنگ دائرے میں محدود رہنی چاہیئے" ——— غرضکہ سب ہی کی متفقہ رائے یہ ٹھہری کہ یہ ڈرامہ حد درجہ مہمل اور ہر لحاظ سے قابل نفرین ہے۔

ملک میں اس ڈرامہ نے نفرت وغیرہ کا طوفان بپا کر دیا ہوا تھا اور آمدنی کی حیثیت سے جب ابسن نے بحری سفر کے لئے گورنمنٹ سے قرض کی درخواست کی تو یونیورسٹی کے پروفیسروں میں سے ایک نے [illegible] کہ "وہ شخص [illegible] کی کامیڈی جیسی کتاب کا

مستحق ہو تا ض پانے کا حقدار نہیں، بلکہ وہ اس لائق ہے کہ ایک ہتھوڑے سے اسکی کافی تواضع کیجائے'

۱۸۶۲ء میں برگن کا تھیٹر دیوالیہ ہوگیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا وہ ملازمت ابسن کے ہاتھوں سے جاتی رہی جس کے ذریعہ سے اسے مستقل اور معقول آمدنی ہوجایا کرتی تھی۔

اب پھر وہی غربت تھی اور وہی فاقہ کشی۔ . . . . یہ دو ایسے دشمن تھے۔ جو بار بار ابسن پر حملہ کردیتے۔ غرضکہ اس دفعہ بھی افلاس اور تنگدستی نے اسے بہت ستایا۔ یہاں تک کہ جب اس کی ضروریات حد سے تجاوز کرنے لگیں تو اس کے بعض احباب نے کوشش کی کہ اسے کم ازکم تحصیلدار کی جگہ ہی مل جائے مگر ان کی سعی مشکور نہ ہوسکی۔ اب مصیبت کے ہولناک سمندر سے مخلصی پانے کی ابسن کو اسوقت صرف ایک راہ نظر آتی تھی، صرف یہی ایک کہ جس طرح بھی ہو وہ جلد ناروے سے نکل جائے۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا تھا، کہ اگر وہ کچھ دیر بھی یہاں ٹھہرا تو تباہ ہو جائے گا۔ کبھی کبھی اسکے دل میں یہ خیال آتا کہ وہ ایک خطرناک قبر کے کنارے کھڑا ہے . . . . اور وہ قبر اس مقام کو سمجھتا جو ناروے کے وسیع قبرستان میں واقع ہے۔"

الغرض بڑی بڑی دشواریوں اور مختلف سرکاری دفاتر میں ملاحظہ شامل کرنے کے بعد وہ شاہی خزانے سے اپنے سفر کیلئے ایک مختصر سی رقم حاصل کرنے میں کامیاب ہوا

۲ اپریل ۱۸۶۴ء کو شاعر نے کرسچنیا کو خیر باد کہا جسوقت اس سے جہاز روانہ ہوا – اور ابسن نے اپنے وطن ناروے پر آخری نگاہ ڈالی، تو اسوقت اس ملک کے لئے اس کے دل میں نفرت تھا۔ بلکہ ایک لامحدود جذبہ حقارت جو وہ ناروے والوں کے خلاف اپنے دل میں محسوس کر رہا تھا۔

ناروے سے وہ روما پہنچا۔ اپنے مشہور ڈرامے "ہمان" کے ہیرو کی مانند اسے یہاں ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ ایک صد مینار کے اندر سے نکل کر فرار ہوگیا ہے جہاں وہ پابزنجیر تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا۔ جیسے اس نے ناروے میں کبھی آفتاب

کی شعاعیں ہی نہ دیکھی تھیں۔ اس غلام کی مانند جسے ابھی ابھی آزادی ملی ہو۔

اطالیہ میں اس نے اپنی مشہور نظم برانڈ لکھنا شروع کی۔ اسی نظم میں ایک جگہ ابسن گرجا کے ایک پادری کی زبان سے اپنے جیسے بلند حوصلہ لوگوں کو دلخراش جبر کہلواتا ہے — "اف! ضدی نہ بنو۔ . . . . بلند حوصلوں کی طرف تمہیں اپنی عنان توجہ منعطف نہ کرنی چاہئے۔ پیدائش کے وقت ہی تمہاری قسمتوں پر ناکامی کی مہر ثبت کر دی گئی ہے! کیا تم اپنی زنجیریں توڑ سکتے ہو؟ تمہیں اپنے روزمرہ کے فرائض انجام دینے ہیں! تمہیں انجیل مقدس کا مطالعہ کرنا ہے!۔ . . بس ان چیزوں کے علاوہ ہر بڑی اور اعلیٰ چیز تمہارے لئے ضرر رساں ہے! آخر تخیل کی غذائیں تمہارے کس کام کی چیزیں ہیں؟ . . . . بہتر یہی ہے، کہ تم اپنے گھر کے چولہوں کو صاف ستھرا رکھو۔ میرے بچو! تم کدھر اور بلندی کس قسم کی توقع کرتے ہو۔ بھلا اور بھال سے کس چیز کے متمنی ہو؟"

اس کے بعد ابسن نے ملک کے سامنے اپنا دوسرا ڈرامہ Alliance of youth پیش کیا۔ اس میں بھی جمہور یعنی عام پبلک کے بوسیدہ خیالات کے پرخچے اڑائے گئے ہیں اور ان کے نازیبا افعال پر دلیری کے ساتھ نکتہ چینی کی گئی ہے ناروے میں سب سے پہلی مرتبہ جب ۱۸ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو یہ ڈرامہ ایک مشہور تھیٹر میں سٹیج کیا گیا تو اسوقت ابسن بندرگاہ سعید میں تھا، پردہ اٹھتے ہی جیسے ہی ابتدائی سطور پبلک کے گوش گذار ہوئیں، ہال میں شوروغل کا طوفان برپا ہوگیا، اور جب ہنگامہ حد سے تجاوز کر گیا تو منیجر کو مجبور ہوکر تماشہ روک دینا پڑا۔ اسکے بعد سامنے کا پردہ گرا دیا گیا، اور منیجر نے خود سٹیج پر سامنے آکر عاجزی سے کہا، کہ "اگر آپ چاہتے ہیں، کہ تماشا جاری رہے، تو ازراہ کرم ذرا صبر اور خاموشی سے کام لیں"

چنانچہ پبلک نے اس کی عرض قبول کرلی، اور تماشہ دوبارہ شروع ہوا، تین ایکٹ تو ڈرامہ بغیر کسی خلل اندازی کے جاری رہا مگر چوتھے ایکٹ میں جب ڈرامہ کے ایک کردار Bastian

monge نے کہا کہ تمہیں معلوم ہے قوم کسے کہتے ہیں؟ — قوم عبارت ہے ان ذلیل آدمیوں سے جو غلامانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ بس اتنا سننا تھا کہ تماشہ بینوں کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی سب غصہ سے لال پیلے ہوگئے اور ہال یکبارگی محشرستان بن گیا۔ غرضکہ Alliance of youth جیسے قابل تعریف ڈرامے کا ناروے والوں نے ایسا نفرت انگیز اور جگر پاش خیر مقدم کیا۔

۵۱ سال کی عمر میں ابسن نے اپنا زندہ جاوید ڈراما گڑیا کا گھر A Doll's house لکھا۔ جس کو جملہ ناقدان فن نے اس کا شاہکار اور لازوال ادبی کارنامہ قرار دیا ہے۔ یہ پہلا ڈراما ہے جو اس عدیم النظیر ڈرامانگار کو سکینڈینیویا کی حدود سے باہر بھی مقبول و مشہور بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوا ویسے ناروے میں وہ اپنے رومانی اور تاریخی ڈراموں اور بالخصوص برینڈ کی زبردست کامیابی کے باعث کافی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ مگر اس تازہ ڈرامے نے اس کو تمام یورپ میں مقبول و معروف بنا دیا۔ غالباً سب سے پہلی مرتبہ یہ ڈراما کوپن ہیگن میں سٹیج کیا گیا۔ پھر ۱۸۸۹ء میں بمقام لندن اور ۱۸۹۴ء میں بمقام پیرس اس کی کامیاب تمثیلیں ہوئیں۔ اور ڈراما کے موضوع نے ہر جگہ سنسنی پھیلا دی۔

ابسن آزادی نسواں کا بہت بڑا حامی اور علمبردار تھا چنانچہ اس ڈراما کا بنیادی نظریہ بھی اسی آزادی نسواں کی حمایت ہے اس ڈراما کی ہیروئن نورا نے اسی حصول آزادی کی خاطر ہمیشہ کیلئے اپنے شوہر اور اپنے ننھے ننھے بچوں کو خیر باد کہہ دیا۔ ظاہر ہے کہ ایسا انجام ملک میں سنسنی پھیلائے بغیر ہرگز نہ رہ سکتا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور ابسن پر ہر طرف سے کافی لے دے ہوئی۔

ابسن نے نہ صرف اس ڈراما بلکہ اپنے دیگر نثریہ ڈراموں میں بھی — سماج کی کمزوریوں کی طرف انگشت نمائی کی ہے ان کمزوریوں کو دور کرنے کے ذرائع بتانے کی زحمت اس نے گوارا نہ کی۔ یہ فرض اس نے ان لوگوں کے لئے چھوڑ دیا۔ جو ڈرامانگار نہیں تھے۔ ابسن نے گویا مرض دریافت کر دیا ...... علاج کی ذمہ داری اس نے دوسروں پر چھوڑ دی۔ اس کے خیال میں ایک ڈرامانگار کا اہم ترین فرض یہ تھا کہ وہ سماج کی برائیوں کو بدردی سے بے نقاب کرے اور سدھارنے کی تدابیر دوسروں کیلئے چھوڑ دے۔

جب ۱۸۸۲ء میں بھوت اشاعت پذیر ہوا۔ تو ابسن کے ذاتی احباب بھی اسکی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے۔ اور اخبارات و رسائل کے ظالم بے رحم نقادوں ... نے تو اسقدر زہریلے اور نفرت انگیز تبصرے لکھے کہ محبت کی کامیڈی والے تبصرے ان کے آگے ماند پڑ گئے۔ اس کے بعد اس کے دوسرے ڈرامے "جنگلی بط" کا بھی ویسا ہی نفرت انگیز خیر مقدم کیا گیا۔

آخر ابسن اسقدر تنگ آ گیا کہ اسے جذبہ تنفر سے مغلوب ہو کر ایکبار یہ کہنا پڑا۔ کہ ناروے کی آبادی دو لاکھ انسانوں پر نہیں۔ بلکہ دو لاکھ گیدڑوں اور بلیوں پر مشتمل ہے۔

ابسن نہایت زبردست کیرکٹر کا حامل تھا۔ اس کا سب سے درخشندہ ثبوت یہ ہے کہ ملک میں ہر گوشہ میں اس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا گیا۔ مگر اس نے اس بغاوت کو ذرہ بھر اہمیت نہ دی۔ اور کبھی بھی اس سے متاثر نہ ہوا جو راہ وہ اپنے لیے منتخب کر چکا تھا۔ اس پر تمام و کمال سختی سے گامزن رہا۔ دنیا کی کوئی طاقت بھی اس کے آہنی ارادے کو متزلزل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اس چیز سے کبھی وہ نہ گھبرایا۔ دنیا میں اسکا کوئی ہم خیال نہیں۔ بلکہ اس نے تو ایکبار صاف الفاظ میں کہدیا۔ کہ "مضبوط ترین انسان وہی ہے۔ جو تنہا کھڑا رہتا ہو"

آخر دشمنوں اور حریفوں نے منہ کی کھائی۔ اور یہ باغی ڈرامانگار کامیاب و کامران ہوا وہی دشمن جنہوں نے ایکدن اسکی مخالفت کی تھی۔ آخر اس کی عدیم النظیر قابلیت اور پراثر شخصیت کے سامنے سرنگوں ہوگئے۔ انہوں نے اس کے سامنے اپنے سپر ڈال دیئے۔

اطالیہ میں ہی ابسن نے دو نہایت عمدہ اور قابل ستائش ڈرامائی نظمیں Brand اور Peer Gynt قلمبند کیں جنہوں نے یکے بعد دیگرے شائع ہو کر اسکی شہرت میں چار چاند لگا دیئے۔ یہ نظمیں اسقدر مقبول و مشہور ہوئیں، کہ ناروے والوں نے بھی آخر کار اپنا سر عقیدت ابسن کی قابلیت کے سامنے خم کر دیا۔ اور اس کے بدترین حریف بھی رفتہ رفتہ اسکی بے مثل دماغی کاوشوں کی مدح سرائی کرنے لگے۔ ابسن کو اب سرکاری پنشن ملنا شروع ہوئی اور اس طرح تنگدستی

...ندن کا دور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

۱۸۹۱ء میں یہ جلاوطن ڈراما نگار ناروے واپس آیا اور اپنے ...یام وطن کی آغوش میں گزارنے کیلئے اس نے کرسچنیا ...ت اختیار کر لی اپنی عدم موجودگی میں وہ تمام یورپ کے اندر مشہور ...تھا اس لئے جب وہ اپنے ... گھر واپس آیا، تو اس کا نہایت ...یانہ خیر مقدم کیا گیا۔ وہی لوگ جو اس کی مخالفت کرتے تھے، اب ...گیتوں میں اسکی قصیدہ خوانی کرنے لگے۔ ۱۸۹۸ء میں اس کی سترویں ...گرہ نارو ے والوں نے نہایت دھوم دھام سے منائی، اور اس کے ...سال بعد کرسچنیا تھیٹر کے سامنے اس کا ایک مجسمہ پبلک کی طرف ...ب کیا گیا۔ پھر ایک طویل علالت کے بعد جب ہنرک ابسن ...۱۹۰۶ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ تو پبلک نے اپنے خرچ ...نہایت شاندار طور پر اس کی تجہیز و تکفین کی۔

...سن کے ایک سوانح نگار نے اسکی صورت و شکل کے متعلق ...ہے کہ اس کا قد میانہ تھا اور اسکی شخصیت زبردست۔ اس کے ...بالائی حصہ بہت مضبوط تھا، اور ضعیفی کے باوجود اس کے چہرے ...گرد بھورے رنگ کے بال بھرے رہتے تھے۔ اسکے خاردار ابروؤں ...اس کی ان آنکھوں سے جن پر ہمیشہ عینک چڑھی ہوتی تھی، اس ...ارادے کا استحکام آشکار ہوتا تھا۔ ابسن کے تن بدن سے... ...بنگ نمایاں ہوتی تھی۔

...زندگی میں شاذ و نادر ہی وہ کبھی علیل ہوا، حتیٰ کہ ضعیفی میں بھی ...کسی مرض کا شکار نہ بنا، وہ صحت مجسم تھا، طوفان، آندھی ...ی یا بارش، کسی چیز سے اس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا، پابندی اوقات کا وہ ہر کام میں بہت زیادہ خیال رکھتا، اور یہ اس کا وہ وصف تھا ...کا ثانی تمام روئے زمین میں بھی تلاش کرنے پر نہیں مل سکتا۔

موسم گرما میں ابسن سات بجے ہی بیدار ہو جایا کرتا تھا ...سرما میں قدرے تاخیر سے۔ کپڑے تبدیل کرنے میں وہ عموماً بہت ...لگاتا تھا کیونکہ اس کی عادت تبدیلیٔ پوشاک کے دوران میں ...مرے کے اردگرد خراماں خراماں ٹہل کر اپنے ڈراموں کے پلاٹ پر غور کرنے کی تھی، اس سے فارغ ہو چکنے کے بعد وہ ہلکا سا ناشتہ کھاتا، اور ٹھیک نو بجے نہایت پابندی کے ساتھ ڈراما لکھنے میں مصروف ہو جاتا۔ پھر جب ایک بج جاتا تو وہ لکھنا ترک کر کے چہل قدمی کے لئے باہر نکل جاتا، کیونکہ دن کا کھانا نوش کرنے سے قبل وہ ٹہل لینے کا عادی تھا۔ سہ پہر کا وقت وہ مطالعہ میں صرف کیا کرتا تھا اور پھر معمولی مقدار میں کچھ کھا پی کر... سویرے ہی بستر استراحت پر دراز ہو جایا کرتا۔ غرضکہ یہ اس پروگرام کا معمولی سا خاکہ ہے، جس پر وہ سختی سے عمل کیا کرتا تھا۔

ابسن نہایت متین اور خاموش طبع واقع ہوا تھا۔ اگر اس کے سامنے دو چار حضرات جمع ہو جاتے، تو وہ کبھی زبان کشائی نہ کرتا اور حتی الامکان خاموش رہنے کی سعی کرتا تھا۔ لکھنے لکھانے کے علاوہ اور کسی کام میں اسکی طبیعت نہ لگتی تھی۔

وہ عموماً تنہا ٹہلنے کا عادی تھا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ تمام راہ کسی نہ کسی موضوع پر غور و خوض کیا کرتا تھا۔ اور جب اسے ہر طرح سے تشفی ہو جاتی تھی، تو پھر اس پر کچھ لکھنے کو بیٹھتا اور جب تک وہ ٹھیک طرح سے اپنے موضوع کے نشیب و فراز پر غور نہ کر لیتا کبھی اس پر قلم نہ اٹھاتا

اس کیلئے تصنیف کا سب سے بہتر زمانہ موسم گرما تھا۔ سرما وہ صرف پلاٹ کی تعمیر و تشکیل میں صرف کیا کرتا تھا، اور جو پلاٹ اسے جاڑے میں ہاتھ آ جاتے، ان پر وہ گرما میں خامہ فرسائی کرتا۔ اس نے اپنی تقریباً تمام تصانیف گرما میں ہی لکھی ہیں۔

سب سے دلچسپ بات یہ ہے۔ کہ جب وہ کوئی ڈراما لکھنے بیٹھتا تھا تو کھانا نہایت ناکافی مقدار میں کھاتا، بس صبح کے وقت تھوڑی سی روٹی اور ایک پیالہ قہوہ نوش کر کے لکھنے کو بیٹھ جاتا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر اس نے زیادہ کھا لیا، تو پھر وہ ٹھکانے سے کچھ نہ لکھ سکے گا۔

کمرہ بند کر کے لکھنے کی اسے عادت نہ تھی کیونکہ دوران تحریر میں کبھی کبھی وہ کمرے کے اندر اور باہر ٹہل کر پائپ پینے لگتا۔ اسکے علاوہ اور کسی وقت وہ ہرگز پائپ نہ پیتا تھا۔۔۔ لکھنے کے اوقات میں وہ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھنے کا عادی تھا۔ البتہ کبھی اس کی بیوی وہاں آ جایا کرتی۔ مگر اس کی ذات سے اسکو کوئی مزاحمت نہ ہوتی تھی۔

مترجمہ وجودی

حضرت وارث شاہ کی
ہیر کا ایک ورق

دوسری زبانوں میں ایسے ادبی جواہرات موجود ہیں کہ اہلِ زمین ان پر فخر کرتے ہیں ہم انگریزی، فرانسیسی، روسی، جاپانی اور ایسی ہی دوسری زبانوں کے تراجم پیش کر کے سمجھتے ہیں کہ ہم نے بہت بڑی علمی و ادبی خدمت سرانجام دی۔ مگر ہم اس بات کو نظرانداز کر دیتے ہیں کہ ہمارا ملک بھی ہم سے کچھ مطالبہ کرتا ہے۔ وہ بھی چاہتا ہے کہ ہم اپنی ملکی زبانوں کے تراجم۔۔ پیش کر کے انکو چار چاند لگائیں۔

افسوس ہے کہ ہم نے اپنی ملکی زبان پنجابی کو اسقدر پیچھے چھوڑ دیا ہے کہ اس کے استعمال کو اپنی شان کے خلاف ہی نہیں سمجھتے۔ بلکہ اسکو علم دوست حضرات کے سامنے پیش کرنا ایک قسم کا گناہ بھی خیال کرتے ہیں۔ اس زبان میں بعض ایسے ایسے گوہر نایاب پوشیدہ ہیں کہ دادِ دیئے بغیر چارہ نہیں۔ ہم آج کی صحبت میں حضرت وارث شاہ کی ہیر کا ایک ورق پیش کرتے ہیں۔ اس میں اس واقعہ کا ذکر ہے جب ہیر سسرال کے گھر ہے۔ اس کا عاشق رانجھا اس سے کوسوں دور اس کے فراق میں تڑپ رہا ہے۔ اور ہیر اسکے فراق کی گھڑیاں گن گن کر گزار رہی ہے۔ وہ اپنے عاشق کو پیغام بھجواتی اور خط لکھتی ہے۔ اس کے برابر میں اسکا عاشق رانجھا اسکو خط لکھتا ہے۔ (وجودی)

ہیر قاصد کو پیغام دیتی ہے

(۱)

اے او جانی قاصد!
خدا کے لئے
تم میرے پیارے رانجھے سے
میری داستانِ غم اس طرح بیان کرنا کہ تیرے فراق میں
میں بہت دبلی ہو گئی ہوں۔
اور قریب مرگ معلوم ہوتی ہوں ــــ مجھ بدقسمت کو

(۲)

ظالم خدا نے
دشمنوں کے گھر میں
پیدا کیا
اب تو
تیرا راستہ دیکھتے دیکھتے
میری آنکھیں
درد بھی کرنے لگیں
اے میرے مالک!
کبھی اپنی صورت مجھے دکھا جا

(۳)

تیرے بغیر۔
میں رات دن۔
جاگتی رہتی ہوں
میرے اس بیان کے گواہ
میری آنکھوں کے۔
دونوں گڑھے ہیں۔
اے میرے مالک!
جلدی آ۔
میرا دین بھی جا رہا ہے اور دنیا بھی۔
آ۔ اور میرے دین اور دنیا کو بچا لے۔

کہ محبوبہ قریب مرگ ہے۔
تو نے اسے
خدا معلوم
کیا دھوکا دے کر
لوٹ لیا ہے۔
تو نے اس پر
جادو کر دیا ہے۔
ایک گھڑی بھی۔
اس کو چین نہیں۔
تو نے۔
کوئی ایسا۔
محبت کا تیر چلایا ہے ——— کہ
تیرے رقیبوں سے
اس کو محبت بالکل نہیں ہوتی۔
اگرچہ لوگوں نے بہت ہی کوشش کی

(۲)

تیرے رقیب کو۔
وہ پاس تک پھٹکنے نہیں دیتی۔
وہ تو۔
اس کے پاس تک نہیں جاتی
جب وہ۔
اس کے قریب جانے کا۔
ارادہ ہی کرتا ہے۔
تو اسی وقت
وہ برہم ہو جاتی ہے۔

(۳)

تیرے انتظار میں۔
وہ رات بھر جاگتی ہے۔
تارے گن گن کر۔

(۴)

میں ہمیشہ
تجھے پکارتی رہتی ہوں۔
میں کوے اڑاتی ہوں۔
اور تیرا انتظار کرتی ہوں
میری قسمت میں یہی لکھا ہے۔
اگر تم
میرے جسم کے چمڑے کا
جوتا بنا کر
اپنے پاؤں میں پہننا چاہو۔
تو بھی
مجھے کوئی عذر نہ ہوگا۔

(۵)

اگر تم
میرا امتحان کر رہے ہو۔
تو پیارے۔
اب آجاؤ۔
پھر تمہارا دیر بعد آنا۔
کس کام آئے گا؟
جب میں نہ ہوں گی۔
میں اپنے پیارے رانجھے کے پاس
کس طرح جاؤں؟
جسم میں طاقت نہیں ہے
اور پاس دام نہیں۔

رانجھے کو ہیر کا خط ملتا ہے

(۱)

قاصد نے آکر۔
رانجھے کو خط دیا۔

وقت گزارتی ہے۔
اس کی زندگی کی مثال
یہ ہے۔
جیسے حضرت نوح کی کشتی۔
طوفان میں ہو۔
بیٹھتے بیٹھتے
وہ تیرا ہی نام لیتی ہے۔

(۴)

ہم جوگی بن کر بھی۔
اس شہر میں۔
جہاں ہیر رہتی ہے۔
آ بسا ؤ۔
محبوب سے۔
دو گھڑی مل کر۔
اپنی زندگی کا لطف حاصل کرو۔
اے حضرت وارث شاہ!
اس وقت سب کام درست ہو جاتے ہیں
جب خدا مہربان ہو۔

ہیر کے خط کا پڑھا جانا

(۱)

تیری محبوبہ نے۔
تیرے نام
خط لکھا ہے۔
اس میں۔
سوز و گداز بھر دیا ہے۔
رانجھے نے اس خط کو۔
جھٹ پٹ پڑھایا۔
خوش ہوا۔

اور دل سے
ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

(۲)

اے میاں ملاں!
تو میرا درد اور فراق سے بھرا ہوا خط لکھ
وہ درد اور فراق۔
جو آسمان سے تارے توڑ دیتا ہے
اس خط میں لکھنا۔
وہ گلہ کرنا۔
وہ دل کا درد کہنا۔
جو پیارے۔
اپنے پیارے کو لکھتے ہیں۔

(۳)

قاصد خط دے کر۔
فارغ ہوا۔
تو پیارے نے
خدا کا شکر ادا کیا۔
اے حضرت وارث!
میں اس کی قدرت کے
قربان!
کام وہی سر انجام پاتا ہے۔
جو خدا کو پسند ہو۔

رانجھے کا ہیر کی طرف خط لکھنا

(۱)

آخر اس حسین نے۔
یہ جواب لکھا کہ۔
جب ہمارے دل میں
اس کی محبت پیدا ہوئی۔

جب ہم کو
حُسن کے چوروں نے لوٹ لیا
اسی روز سے۔
ہم فقیر ہو گئے۔

(۲)

پہلے پیارے کو
دعا سلام قبول ہو۔
پھر یہ معلوم ہو۔
کہ حضرت!
آپ ہم کو تو
مذاق کے کوئیں میں ڈال گئے۔
ہم نے،
مال و جان تک
پیش کر دیا۔
اور تم!
رشتۂ محبت ہی کو
توڑ کر چلے گئے۔

(۳)

اب
ہم سے کوئی۔
سیدھے منہ۔
بات بھی نہیں کرتا۔
جب سے پیارا
میرے پاس سے چلا گیا۔
ہمارا بسنا۔
خدا کو۔
ایسے آدمیوں میں منظور ہوا
جو محبت کا نام تک نہیں جانتے۔
محبت کرنے والے۔
ہم سے بھاگ کر۔
اس طرح چلے گئے۔
جس طرح نور اڑ کر
چلا جاتا ہے۔

(۴)

میری قربانیوں کی
پروا نہ کرتے ہوئے
انہوں نے۔
رقیبوں کے ساتھ راہ لی
اب رقیب کے گھر۔
خوشی سے جا کر بیٹھ گئی ہیں
جب ہم نے۔
اپنی حسن و خوبصورتی۔
ان پر نثار کر دی۔

(۵)

وہ!
خود تو،
پردہ میں
محبوب بن کر جا بیٹھے
اور اس کے انتظار میں۔
ہماری آنکھوں کی بینائی بھی۔
کھو گئی۔
اے حضرت وارث شاہ!
وہ ہم کو پیچھے تو چھوڑ گئے ہیں!
مگر جب ہم۔
ان کے پیچھے دوڑنے والے۔
اُن سے جا ملے۔
تو دشمنی پیدا کرنے والوں کا
بس نہ چلے گا۔

اور وہ ہمارے ہی ہو جائیں گے۔

ہیر کی طرف رانجھے کے خط کا مضمون!

(۱)

ہم خیریت سے ہیں۔
اور تمہاری۔
خیریت چاہتے ہیں
اب تم
میرا حال اس طرح لکھو۔
خدا اور راستہ دکھانے والے کی
مہربانی کے بغیر
ہماری مصیبتوں کو
بھلا کون آسان کر سکتا ہے؟

(۲)

موجو چوہدری جیسے
معزز شخص کا بیٹا
اور
جیسے کے والد کے۔
مویشی چراتے!؟
اس پر بھی۔
دھوکا دے کر۔
خود تو ڈولی میں بیٹھ کر۔
رقیب کے ساتھ چلی گئی
بھلا اب۔
ان کنواریوں کا
کون اعتبار کرے!؟

(۳)

یہ جادو کے زور سے۔
رسّی کو سانپ بنا دیں۔
اور آسمان کے تاروں کو
ٹوکری کے نیچے چھپا دیں۔
والدین کے گھر بیٹھ کر تو۔
یہ جاؤں کو فقیر بنا دیتی ہیں۔
اور سسرال کے گھر جا کر
وہ خوب خوشی سے رہتی ہیں۔

(۴)

خود تو۔
یہ دلہن بن کر۔
سب کچھ بھول جاتی ہیں۔
اور اپنے چاہنے والوں کو۔
نیم جان چھوڑ جاتی ہیں۔
معززین کے بیٹوں کو
مویشی چرانے والا بنا کر۔
خود جا کر۔
معزز بن جاتی ہیں۔

(۵)

وہاں۔
جب کوئی
ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے۔
تو خود بن سنور کر۔
بیٹھ جاتی ہیں
اے حضرت وارث شاہ۔
بھلا یہ ہم سے۔
کب ہار مانیں گے۔
جب راجہ بھوج جیسوں سے
انہوں نے ہار نہ مانی۔

راجہ مہدی علیخاں

ایک رُوَمان

جھٹپٹے کے وقت شیشم کے درختوں کے تلے
مِل رہی تھی جب ہوا سرو شاخوں کے تلے
جب زمینِ خُلد منظر کیف سے مَعمُور تھی
شام کی دیوی محبت کے نشے سے چُور تھی

گاؤں کی ویراں سڑک پر مجھکو اک لڑکی ملی
نیلگوں ملبوس میں مُورت چُھپی تھی نُور کی
سَاتھ اپنے دُھول اڑائے جسطرح موجِ صبا!
جس طرح سے پھُول کیساتھ ایک کانٹا ہو لگا
نوجواں بھی آرہا تھا ایک اُس کے ساتھ ساتھ

وحشی جنجوعہ

قیدی کی ڈائری

۱۵ اپریل آج مجھے مسلح سپاہی اپنی حراست میں جج کے سامنے لے گئے۔ راستے میں مجھے بے شمار گالیاں دی گئیں اور ایک ظالم نے تو اپنے ڈنڈے سے بھی کام لیا۔ جس کی یادگار اب تک میرے پہلو میں موجود ہے میرا قصور کیا تھا؟ مجھے تیز چلنے کے لئے مجبور کیا گیا۔ میں نے انکار کر دیا۔ بھلا فکر میں ڈوبا ہوا انسان کبھی تیز بھی چل سکتا ہے؟ میں راستے میں اپنے مستقبل کے متعلق سوچ رہا تھا اور پولیس والے اپنے رعب و داب کے متعلق........ میرا اندھا باپ لاٹھی ٹیکتا ہوا میری بیوی کی رہبری میں مجھے آخری بار ملنے کیلئے آیا۔ لیکن بے نیل و مرام لوٹا میں جج کے سامنے پیش ہوا مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی۔ میرا وکیل ایک اپٹوڈیٹ جنٹلمین تھا وہ اپنی عینکوں کے بالائی شیشے سے میری طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھتا۔ جس سے میں کانپ اٹھتا۔ مجھے بے قصور ثابت کرنے کے لئے اس نے ہرچند کوشش کی۔ لیکن بے سود۔ میں جانتا تھا کہ میرے ان روپوں کی قیمت جو بطور فیس ادا کئے گئے تھے، صرف لفاظی ہوگی اور بس بہت بڑے وکیل کی لفاظی... ! کیسا ہی بگلا بھگت تھا وہ وکیل ....اور اس کا وہ منشی! اگر میرے ہاتھ آ جائے تو اس کی مینڈھیاں اکھیڑوں اس نے خوب پھانسا۔ وکیل الیشاٹ ویسا ہے اس نے تخت دار سے سینکڑوں مجرموں کو اتارا ہے۔ ہزاروں کو قید خانے کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں سے نکال لایا ہے۔ اور پھر فیس بھی کچھ نہیں صرف پانچسو روپیہ۔ پانچ سو روپیہ ہندوستان کی سرزمین میں پانچسو پائیاں بھی غریب کے گھر سے نکلنا مشکل ہیں لیکن یہ روپیہ؟ میری آزادی کی قیمت تھی نئی زندگی کا معاوضہ تھا۔ اس لئے مجبوراً سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ جج نے مخالفین کے بیانات قلمبند کرنے کے بعد میری آزادی قانونی زنجیروں میں جکڑ کر جیل خانے کی تاریک کوٹھڑی کے حوالے کر دی۔ اور مجھے ایکسال کی طویل قید!...... طویل کیوں نہ کہوں آزادی کی گود میں پرورش پانے والے طائر نوگرفتار کیلئے قفس کی زندگی کا ایک ایک پل کتنا مشکل ہے! یہ وہی جانتا ہے ایک سال کی قید! کیوں؟ کس لئے؟ کس جرم کی پاداش میں؟..... میرے دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی، وہ میرا خون تھا ہم ایک ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے لیکن ......اس نے میری مسرتوں کے گلشن کو بیدردی سے پامال کرنے کی کوشش کی، وہ لالچی کتا مجسمہ عفت عصمت کی دیوی، شرم و حیا کی پتلی میری بیوی رضیہ کو اس نے بدنگاہ سے دیکھا۔ اس کے حسن سے متاثر ہو کر وہ انسانیت تک کو بھول گیا۔ مجھے پتہ چل گیا۔ ایکدن میں نے اسے رضیہ سے اظہار محبت کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ اس سے کہہ رہی تھی "شرم کرو۔ میں تمہاری بھابی ہوں" لیکن وہ ہوس کے نشے میں اندھا ہو رہا تھا اپنی خواہشات کی تکمیل نہ ہوتی دیکھ کر وہ زبردستی پر اتر آیا۔ میں غصے سے کانپنے لگا۔ میں نے چاقو نکالا، اور چاہتا تھا کہ اسے ہمیشہ کے لئے موت کی آغوش میں ہی سلا دوں لیکن وہ تاڑ گیا۔ اور وہاں سے بھاگ گیا۔ دوسرے دن پولیس والوں نے مجھے اقدام قتل کے جرم میں گرفتار کرنا چاہا۔ میں نے کچھ پس و پیش کرنا بے سود سمجھا۔ اور اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا۔

۱۸ اپریل۔ جیل خانے کی چہار دیواری میں میرا دم گھٹا جا رہا ہے آہ! آزادی!! آزادی!!! تیرا نام ہی فردوس بریں ہے۔ آسمانی فضا میں اڑنے والے طیور کتنے خوش ہیں، جھونپڑی میں آزادی کی زندگی گزارنے والا غریب مزدور جو اپنی تقدیر سے لڑ رہا ہے۔ کتنا ہی خوش قسمت ہے اور جن کا ہر قدم اور ہر فعل دوسروں کی مرضی پر منحصر ہے۔ کتنے بدنصیب خیر!...... یہ ایکسال بھی گزر سکتا ہے۔ اگر اس مہربان اللہ

پ کا خیال نہ ہو، جو بیٹے کے خیال میں نڈھال ہو رہا ہوگا۔ ملاؤں
یا اہیوی کا دھیان نہ ہو، جو خاوند کے فراق میں دن رات گھل رہی
دگی پاگل اگر انہی خیالات میں کھو یا رہا، تو شاید اسی قید میں تیری روح
ہمیشہ کی قید سے آزاد ہو جائے گی۔

۱۹، اپریل۔ آج جیل خانے میں ہر ایک قیدی نے مجھ سے اپنا تعارف کرایا۔ ان میں ہر قسم کے قیدی ہیں، سفاک قاتل، خوفناک وسیے رحم ڈاکو، دغا باز اور سنگدل چور۔ ان کے چہرے مکروہ اور بھیانک ہیں۔ کچھ قیدی کونوں میں سر جھکائے کسی فکر میں ڈوبے ہوئے ہیں، شاید یہ اپنے ماضی پر کف افسوس مل رہے ہیں، یا مستقبل کے متعلق سوچ رہے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے خیال ہی نہیں بلکہ یقین ہے یہ وہ لوگ ہیں، جن کا ضمیر آزاد ہے۔ جن کی روح گناہوں کی کثافت سے پاک ہے۔ یہ کسی کی خود غرضی کا شکار ہوئے ہیں۔ کئی ایک نے تو اپنے ماضی کے ظلم و ستم کی داستان اس دلیری سے سنائی کہ مجھے ان سے نفرت ہو گئی۔ ایک قیدی نے تو مجھ سے دوستی ہی گانٹھ لی۔ وہ جعلی سکے بنانے کے جرم میں گرفتار ہوا ہے۔ کہتا ہے کہ میری زندگی بڑے مزے سے گزر رہی تھی، روپوں کی کمی نہ تھی، لوگ دوست کہلاتے ہیں اور میں دوست بناتا تھا۔ لیکن میرے ایک مکار اور فریبی دوست نے مجھے دھوکا دیا، اور اس راز سے پولیس کو آگاہ کر دیا۔ میں پکڑا گیا۔ اس زمانے میں کوئی کسی کا دوست نہیں سب فریبی اور مطلب کے بندے ہیں۔ میں نے دل میں سوچا کہ دوسروں کو فریبی کہتا ہے۔ لیکن خود ذات شریف کی ماضی کی تاریخ کے اوراق جعلسازیوں اور فریب کاریوں سے سیاہ ہیں۔ یہ ہیں وہ لوگ جو دوسروں کے تنکے کو دیکھتے ہیں۔ لیکن اپنی آنکھوں کا شہتیر انہیں نظر نہیں آتا۔

۱۵، جولائی۔ آج جب سب قیدیوں میں کھانا تقسیم ہو رہا تھا ایک قیدی نے چپکے سے روٹی چرا لی۔ لیکن جیلر نے دیکھ لیا۔ بس اس بیچارے کی شامت آگئی ہنٹروں سے مار مار کر اسے ادھ موا کر دیا قیدیوں کو شکایت ہے۔ اس شکایت کے سننے کے لئے افسران بالا کے کان بہرے ہو گئے ہیں، اور بھلا ان قیدیوں کی سنتا ہی کون ہے؟ شکایت ہے کہ کھانا اچھا نہیں ملتا، سارا دن محنت و مشقت اور پھر کھانے کو دو چپاتیاں چنے کی۔ . . . تھوڑا سا گوبھی یا شلغم کے پتوں کا سالن اور ایک پیالہ پانی کا مشکل سے نصیب ہوتا ہے اور کتنے ناشکرے ہیں یہ قیدی! آزاد دنیا کے باشندوں میں بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو غریب کے نام سے پکارے جاتے ہیں جن کو تین دن کے فاقے کے بعد ایک وقت کی روٹی مشکل سے نصیب ہوتی ہے۔ وہ بھی پیٹ بھر کر نہیں۔ ان کی بھوک کی گود میں بلکتے ہوئے بچوں کے رونے کی آواز سے انکی سوئی ہوئی قسمت نہیں جاگتی۔ محنت و مشقت سے چور ہو کر جب ذرا آرام لینے کے لئے وہ کسی پتھر کا سہارا لیکر بیٹھتے ہیں تو اپنی قسمت کا خیال آتے ہی ایک سرد آہ بھرتے ہیں۔ لیکن یہ آہ کائنات میں ہلچل پیدا کر سکتی ہے تاروں بھرا فلک اس سے لرزہ براندام ہو سکتا ہے لیکن دست قسمت پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ . . . . قدرت مجبور ہے۔ سنا ہے کہ دوسرے ممالک میں قیدیوں کے لئے آرام و آسائش کا ہر سامان مہیا ہے۔ ہوادار کمرے، اچھے اچھے کھانے، آرام دہ بستر لیکن مجھے تو اعتبار نہیں آتا۔ قیدی پھر بھی قیدی ہے۔ قید کرنے کیلئے قانون ہے۔ لیکن قید خانے میں آرام کرنے کیلئے کوئی قانون نہیں۔ شاید یہ مصائب قیدی کو سدھارنے کے لئے ہوں لیکن آزادی چھیننے سے زیادہ اور کونسا دکھ دیا جا سکتا ہے؟

۱۲، اگست۔ اب تو جیلخانے سے قدرے مانوس ہو گیا ہوں لیکن جب کبھی باہر سڑک پر لوگوں کو شاداں و فرحاں ٹہلتے ہوئے دیکھتا ہوں تو پھر آزادی کا خیال آ جاتا ہے۔ اگرچہ میں یہ جانتا ہوں، کہ اس مسرت کی نقاب کے عقب میں ایک فکر مند اور غمگین چہرہ ہے جس پر اشک آلود آنکھیں اپنی تقدیر کو رو رہی ہیں لیکن انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ انسان جب تنہائی سے نکل کر دنیا کے شور و شغب میں گم ہو جاتا ہے۔ تو اس کے دل سے فکر اور غم مٹ جاتا ہے۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے اپنی ارد گرد کی چیزوں بلکہ اپنے آپ کو بھی بھول کر مسرت کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ لیکن تنہائی میں جا کر پھر وہی غم۔

۹، ستمبر۔ ایک نیا قیدی زنجیروں میں جکڑا ہوا لایا گیا۔ وہ زور زور سے نعرے لگا رہا تھا۔ بھارت ماتا کی جے۔ مہاتما گاندھی کی جے۔ پولیس کے سپاہی اسے تنگ کر رہے تھے لیکن پھر بھی ایسا کرنے سے وہ باز نہ

آیا۔ میں نے سمجھا کہ یہ قومی لیڈر ہے لیکن جفاکش اور ارادے کا پکا جو نا گندم فروش لیڈر نہیں۔ قوم کا وہ سرگرم رہبر نہیں، جو اپنے حلوے مانڈے کیلئے دوسروں کی جان وطن کی چوکھٹ پر قربان کرتے ہیں۔ جو وطن خطرہ میں ہے" "سوراج ہمارا پیدائشی حق ہے۔ "مسجد شہید گنج کو واگزار کئے بیٹھنٹ" نعرے لوگوں کے بیقرار مجمع کے سامنے کہہ کہہ کر لوگوں کے جذبات اور غصے کو مشتعل کر دیتے ہیں۔ اور پھر! اس آگ کو لگا کر دور سے ہی دوسروں کے جھونپڑوں کو جلتے ہوئے دیکھکر اپنی کامیابی پر خوش ہوتے ہیں۔ ہاں! تو میں اپنی خیالات میں غرق تھا کہ دروازے کی آواز سے چونک پڑا۔ میں نے دیکھا کہ قیدی کو چھوڑ کر سپاہی دروازہ بند کر رہے ہیں۔ قیدی میرے پاس ہی بیٹھا تھا۔ جب سپاہی چلے گئے تو اس نے مجھے اے بھارت کے سپوت! کہکر مخاطب کیا۔ پھر اپنی رام کہانی بیان کرنا شروع کر دی۔ اس نے کہا کہ میں ایک بہت بڑا آدمی ہوں۔ لاکھوں کی جائداد کا مالک۔ لیکن ملک کی غلامی کو میں نہ دیکھ سکا۔ میرے دل میں قوم کا درد تھا۔ میں نے اپنے وطن کو آزاد کرنے کا عزم کر لیا۔ اپنے لیکچروں سے غفلت کی نیند سوئی ہوئی قوم کو جگایا۔ انکے مردہ دلوں میں ہلچل پیدا کی۔ ان کے تن بدن میں غصے کی آگ لگا دی۔ میں ایک مشہور مقرر ہوں میرے الفاظ تیر و نشتر سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔ میں نے ان نشتروں سے بھارت کے سپوتوں کے دماغ کو چیرا، اور ان سے غفلت کا مواد نکال کر انہیں اس قابل بنایا کہ وہ اپنی برائی بھلائی کو سوچ سکیں" وہ یہی کہہ رہا تھا کہ دوسرے کونے سے ایک شخص چلا اٹھا۔ جھوٹ! بالکل جھوٹ!! تو مکار اور فریبی ہے۔ تو لوگوں کو دھوکا دیکر اپنا الو سیدھا کرتا ہے۔ اتنا جھوٹ! کل تجھے پیٹ پالنے کیلئے سوکھے ٹکڑے تک نصیب نہ تھے۔ تو لوگوں کی غفلت، زمانے کی روش اور اپنی چرب زبانی سے فائدہ اٹھا کر لیڈر بن بیٹھا۔ تیری ہر جگہ عزت ہوتی ہے، تیرے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے جاتے ہیں۔ مگر تو فریبی ہے، تیری ظاہری حالت نے لوگوں کو دھوکا دیا۔ بیشک تو ایک آتش بیان مقرر ہے۔ لیکن ایک بزدل اور کمینہ لیڈر تیرے ہی ان آتشیں الفاظ نے میرے غصے کی آگ کو بھڑکایا۔ اور میں اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے اس موت کے سمندر میں کود پڑا۔ لیکن ڈوبا نہیں۔ کنارے لگ گیا۔ کنارہ یہ جیلخانہ ہے۔ تو اسوقت تماشا دیکھ رہا تھا" اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اور وہ کانپ رہا تھا۔ "تو موت کی گود میں دم توڑتے ہوئے زخمیوں پر ہنس رہا تھا۔ انکی بہادری کے لئے نہیں بلکہ اپنی کامیابی پر" یہ سنکر لیڈر نے سر جھکا لیا۔ آہ۔ دنیا میں رہ کر میں دنیا کو نہ سمجھ سکا۔ لیکن جیلخانے میں آکر میں نے دنیا پر نگاہ ڈالی۔ تو مکاری اور فریب کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔

۱۰ ستمبر۔ آج اس سوراخ سے اوہ! یہ سوراخ تو نہیں روشندان معلوم ہوتا ہے۔ لیکن روشندان اتنا تنگ! روشندان ہی ہوگا جیلخانے کے روشندان اتنے نہ ہوں تو اور کیا۔ یہ لال قلعہ تو ہے نہیں۔ میں نے سامنے نگاہ اٹھائی آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اُف یہ رومان انگیز منظر!! اس پیمانہ میں شراب محبت دو آتشہ ہو چلی ہے۔ پیمانہ تو ہے۔ لبالب، ہونٹوں سے لگا سکتا ہوں، لیکن ساقی کے بغیر مزہ کہاں۔ ساقی۔ جس کے ہاتھ میں قدرت نے میری مسرت کا جام دے دیا ہے میری غمگین تنہائیوں کی ہم جلیس میری رفیقۂ حیات رضیہ۔ جس کے مرمریں اور صبیح جسم پر بدنگاہیں پہنچنے سے پہلے ہی دہکتی ہوئی سلاخیں جھونک کر اندھی کر دیجائیں۔ جان زار تیری یاد اس بوڑھے باپ کی محبت پر غالب آگئی، جس کی آغوش شفقت میں میرا بچپن آرام سے گزرا ہے، اور جس نے تجھ جیسی چاند سی دلہن میرے لئے محبت پدری کا چراغ لیکر ڈھونڈ نکالی۔ لیکن میں اسکی تعلقوں میں بس کر زندگی کے لطف سے ناآشنا تھا تیرے تیر نظر سے گھائل ہو کر میں نے زندگی کی لذتوں کو پا لیا ہے۔ لذتوں کو جو گناہوں کی تلخی کو انسانی دماغ سے ہمیشہ کے لئے نکال پھینکتی ہے۔

۱۱ مارچ۔ گذشتہ رات ایک عجیب واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ فکر و فاقہ کے مارے ہوئے مجرم بے فکری کی آغوش میں سکھ کی نیند سو رہے تھے۔ تھوڑی دیر کیلئے انہیں دنیا کے افکار سے رہائی حاصل ہو گئی تھی میں دنگ رہا تھا۔ کہ اتنے میں کسی کے شور بے ہنگام سے میں چونک پڑا۔ ایک قیدی کسی گیت سے اپنے دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔ وہ کسی کی بیوفائی کا گلہ کر رہا تھا۔ سینہ چیر کر زخم دکھانا چاہتا تھا۔ لیکن بیہودہ

رات کی تاریکی میں معلوم نہیں اس کا خیال کیوں ایسی وادی میں جا بھٹکا جہاں انسانی سکھ آوارہ پھرتا ہے۔ دن بھر بیگار میں اپنا خون صرف کرنے والے بے گناہ مجرم جو کسی فردوسی نغمہ میں کھوئے ہوئے تھے۔ اور خوفناک مجرم جو اپنے مستقبل کی بھیانک تصویر دیکھ کر خوفزدہ ہو رہے تھے چونک پڑے۔ دروازے پر پہرہ دینے والے سپاہی سرکار کے نمک خوار جو رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر تھوڑی دیر کے لئے گرسیدمی کرنا چاہتے تھے ٹھہر ٹھہر اگر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ناشایستہ گالیاں، موٹی موٹی مغلظات جو اکثر پولیس والوں کے حافظہ کی نوٹ بک میں ایسے ہی موقعوں کے لئے ہی درج رہتی ہیں۔ زبان سے نکل کر کانوں سے ٹکرانے لگیں سکیں مجرم کے لبوں پر مہر سکوت لگ گئی۔ نیند کے نشے میں مست قیدی پھر اس پتھریلے فرش پر کروٹیں لینے لگے...... صبح ہمیں کھلے میدان میں جبری ورزش کے لئے لے گئے۔ رات والے زندہ دل شخص کے لئے پتھر کوٹنے کا حکم صادر ہوا، اور شام تک اس بیچارے پر وہ ستم ڈھایا گیا۔ کہ توبہ ہی بھلی۔

۱۵ اپریل۔ آج میں جیلخانہ سے آزاد ہوا۔ ایک خواب ہے خوفناک دل ہلا دینے والے خواب سے...... بیدار ہوا، جو ایک خاص مدت تک مجھ پہ طاری رہا۔ خواب ؟ اُف اس خواب کی دنیا سے میں جلد نکلنا چاہتا تھا۔ اس خواب میں میں نے کیا دیکھا ؟ دنیا کی حالت مکر و فریب، ظلم و ستم۔ دنیا کسی کی نہیں جو اس کے تعاقب میں بھاگتا ہے، دنیا اس سے الگ تھلگ رہنا چاہتی ہے۔ اور جو اس سے آگے بھاگتا ہے۔ دنیا چاہتی ہے، کہ اپنی تمام رنگینیاں اس کے دامن میں ڈال دے...... ..

میرا باپ میری بیوی کی رہبری میں مجھے قید خانے کے دروازے پر ملا۔ لیکن میرا بھائی ! وہ شاید کسی جگہ اپنے خیالات میں محو خاموش انتقام کی تجویزیں سوچ رہا ہوگا۔ وہ سوچتا ہوگا۔ کہ اب ضمیر کی لعنت و ملامت ؛ اور اس کمبخت بھائی کی نظروں کی تاب لانا مشکل ہے۔ وہ خیال کر رہا ہوگا۔ کہ اب صفحۂ دنیا سے اس کا نقش ہستی مٹا دوں۔ یہ خون دنیاوی رشتے کی آڑ میں ہمیشہ کے لئے دنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہو کر رہ جائے گا۔ لیکن اس کا یہ خوف بیہودہ ہے۔ جیلخانہ کے پے درپے مصائب نے مجھے اس قابل بنا دیا ہے کہ میں اسے خندہ پیشانی سے معاف کر سکتا ہوں۔ اسے پھر اس سینے سے لگا سکتا ہوں جس میں بے قرار دل انتقام کے لیے تڑپ رہا تھا.... .... باپ نے مجھے گلے سے لگا لیا، وہ اپنی ماضی کے غموں کو خوشی کے آنسوؤں کے طوفان میں بہا دینا چاہتا تھا۔ وہ دل کی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ کہ یہ میرا جگر گوشہ ہے۔ لیکن ظاہر بیں نگاہوں سے میری تبدیلیاں نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ آنکھیں تو اس سے چھین لی گئی تھیں۔ دنیا کے رشتے دل کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ لیکن دنیا کی تبدیلیاں ظاہر بیں آنکھوں سے ہی نظر آ سکتی ہیں۔ میرے باپ کی غیر فانی محبت کے سیلاب میں میری رفیقۂ حیات کا اظہار محبت بھی بہہ رہا تھا، ایک کا سینہ مجھے بھینچے ہوئے تھا۔ تو دوسرے کا دل مجھے اپنے آپ میں گم کر لینا چاہتا تھا، ہمیشہ کے لئے.........

سجاد ہاشمی

بادۂ شیراز

شرابِ آہِ من آتش زدہ کاشانۂ خود را | بغارت دادہ ام امشب متاعِ خانۂ خود را
نمیدانم چہ گویم روئے ساقی را بہ بدمستی | بہ از ماہِ مبیں گویم اگر پیمانۂ خود را
اگر زاں چشمِ شوق ایں گونہ کیفِ عشوہ می بارد | لبِ مستی کند نرگس تہی خمخانۂ خود را
جبینم کعبہ مے ریزد، سجودم عرش مے بارد | بدہ صد آب و رنگ از سجدہ ام بتخانۂ خود را

شدی سجادؔ سرگرداں بہ کوئے عشق مہرویاں
تو رسوا ساختی آخر دل دیوانۂ خود را

پنڈت خنداںؔ مرحوم کی آخری نا تمام غزل

خنداںؔ مرحوم اردو کے نہایت کامیاب شاعر تھے۔ سوز و گداز آپ کی شاعری میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے! افسوس آج دستِ موت نے ہم سے ایک مخلص ترین دوست اور ایک بہترین شاعر چھین لیا۔

ذیل کی غزل شاعر مرحوم نے رحلت سے قریباً دو ماہ پیشتر جناب مشتاق جیلی اور حضرۃ سراج الدین ظفرؔ بی اے ایل ایل بی کی موجودگی میں کہنی شروع کی تھی۔ یوں تو نظم کا ہر شعر الہامی ہے۔ مگر مطلع اول اور مقطع خاص طور پر سرمایہ دار الہام ہیں۔

خنداںؔ صاحب نے تا دمِ واپسیں تکلیفوں کا مقابلہ خندہ پیشانی سے کیا اور ایک لمحہ کیلئے بھی بے چینی ظاہر نہ کی۔

ہمیں مرحوم و مغفور کے عزیزوں سے ہمدردی ہے

(ایڈیٹر)

بہ ایں حالِ زبوں جینے کا ساماں کر رہا ہوں میں
جو ہو سکتا ہے تیرے غم پہ احساں کر رہا ہوں میں

ہر اک داغِ محبت کو فروزاں کر رہا ہوں میں
مقدر کی سیاہی میں چراغاں کر رہا ہوں میں

یہ لمحاتِ مصائب اور تصورِ تیری محفل کا!!
بیابانوں میں گلگشت گلستاں کر رہا ہوں میں

ازل سے نیتِ ساحل ہے، ہر دم یادِ ساحل ہے
مگر کشتی کو نذرِ موجِ طوفاں کر رہا ہوں میں

قریبِ مرگ ہوں خنداںؔ مگر لب پر تبسم ہے
یہاں تک احترامِ دردِ پنہاں کر رہا ہوں میں

مصنفہ فرانسیسی شاعر لامارتین — مترجمہ "مش" مظفر پوری

خدا سے فریاد

پاک پروردگار! دیکھ تیری قلمرو میں ہر طرف شر پھیل گیا ہے بدی کا اژدہا تیری سلطنت میں اپنا خوفناک منہ پھاڑے ہر طرف زہر اگلتا پھر رہا ہے۔ بتا کیا تو نے ہر ذی حیات کو ——— عقل و فہم رکھنے والے انسان کو، صرف مصائب جھیلنے کے لئے پیدا کیا ہے ——— یہ زمین و آسمان، ارواح و مادیات اور تمام اشیاء کیا اسی لئے پیدا کی گئیں کہ آہیں بھریں، دکھ سہیں اور درد و غم کے سمندر میں ڈوبی رہیں ———؟

اگر خالق اکبر کا مقصدِ تخلیق یہی ہے تو ———

اے تمام جاندارو! اور بے جانو، اور اے اللہ کی صورت پر پیدا ہونے والے انسانو! تم سب بیک وقت اپنی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھاؤ، اور چلا چلا کر اس خدائے دو جہاں سے فریاد کرو، کہ اے معبود! ہم پر کیوں مصیبتوں کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں!

اے ازلی و ابدی قوتِ حیات! ہم تجھے کیا کہکر پکاریں؟ کس نام سے تجھے موسوم کریں؟ تو وہی ہے، جسے ہم کبھی تقدیر کہتے ہیں اور کبھی فطرت کبھی نیچر کہکر پکارتے ہیں اور کبھی محیر العقول ناموسِ اعظم کا خطاب دیتے ہیں۔ وہ تو ہی ہے، جس کے حضور میں ہم کانپتے ہیں، اور ایک مجروح پرندے کی طرح پھڑپھڑا کر دم توڑ دیتے ہیں۔ تجھی سے بغاوت کرتے ہیں، تجھی سے لرزہ براندام رہتے ہیں، اور تجھی سے محبت کرتے ہیں۔ غم ہو یا مسرت تو ہمیشہ ہمارے سامنے ہے۔ تو ہمیشہ تو ہی ہے!

لیکن اے قہار و جبار! بتا ہم نے ایسا کون گناہ اور کون جرم کیا تھا، کہ ہمیں اسکی پاداش میں زندگی دیدی گئی، اور ہمیں پیدا کر کے اس زمین پر چھوڑ دیا گیا؟ کیا ہم نے کبھی زندگی کی آرزو کی تھی؟ تجھ سے کبھی درخواست کی تھی کہ ہمیں پیدا کر دے؟ ہم تو عدمِ محض تھے۔ کیا عدمِ محض بھی وجود کی خواہش کر سکتا ہے؟

اے تمام لطیف زندگی اور ٹھوس وجود رکھنے والو! جانورو اور بے جانو! آؤ اور سب معبودِ حقیقی کے سامنے جمع ہو جاؤ، جو تمہاری آہوں فریادوں، سسکیوں، آنسوؤں، چیخوں اور گناہوں سے خوش ہوتا ہے۔

اے درد و غم سے اکھڑی ہوئی آوازو! مردوں کی ہڈیو! بیماروں کی آہو! بیواؤں کی سسکیو، یتیموں کے آنسوؤ! تم سب اٹھو، بلند ہو کر آسمان کا بند دروازہ کھٹکھٹاؤ، اور پوچھو کہ پروردگار! یہ تمام آلام و مصائب ہم پر کیوں نازل کئے گئے ہیں؟

اے زمین چیخ، اے آسمان گونج، اے اندھیرے غار جس میں موت اپنے شکار رکھاتی ہے، تو بھی چلا، تم سب پکارو، اور پروردگار سے کہدو، کہ ہم گواہی دیتے ہیں تقدیر کے ظلم کی، جس نے ہم سب کو خود ہی پیدا کر کے مصیبت و غم کے بھوکے شیر کے آگے ڈال دیا۔

پروردگار! ڈال دے ظالم تقدیر کو دوزخ کے دہکتے ہوئے انگاروں میں!

اختر انصاری
بی۔اے
[illegible]

قطعات

داغِ محبت

مجھ سے اک دن کہا محبت نے میرے پیارے! اِدھر تو آؤ تم
میں تمہیں ایک داغ دیتی ہوں تاکہ مجھ کو نہ بھول جاؤ تم

چاندنی رات

چاند تیری بلائیں لیتا ہے پھول تجھ پر نثار ہیں سارے
میری خواہش یہ ہے کہ نذر کروں توڑ کر آسمان کے تارے

زبان

قلب زندہ ہے لفظ ہیں بیجان کیجئے کیا اگر نہ چپ رہئیے
جس کو دُنیا "زبان" کہتی ہے! اس کو جذبات کا کفن کہئیے

کرم نامہ

ٹانکے زخمِ جگر کے ٹوٹ گئے آنسوؤں میں ہے خون کی سرخی
خوب کی تم نے پرسشِ احوال خط نے اچھی یہ غمگساری کی

ادارہ

نقد و نظر

مدینہ جوبلی نمبر۔ کتابت و طباعت دلکش و دلآویز صفحات ۱۴۸، قیمت ۸ ر۔ ارسال زر کا پتہ: منیجر صاحب اخبار مدینہ بجنور۔ یو پی

مدینہ، بجا طور پر ہندوستان کا مایۂ ناز جریدہ ہے۔ اور اپنے اجراء سے لیکر اب تک اس کا جو قدم بھی اٹھا ہے، وہ ترقی ہی کی طرف اٹھا ہے اخبار ملک و قوم کا راہبر ہوتا ہے۔ اور یہ اسوقت تک ملک و قوم کی صحیح معنوں میں راہبری نہیں کرسکتا جب تک ترقی پسندانہ رجحانات کا حامل نہ ہو اور ہمیں یہ دیکھکر بہت مسرت ہوتی ہے کہ مدینہ اپنے فرائض بڑی ایمانداری و خلوص کے ساتھ ادا کر رہا ہے۔ زیر نظر نمبر مدینہ کا عدیم النظیر جوبلی نمبر ہے جو ۲۶×۲۰ تقطیع کے ۱۴۸ صفحات پر چھپا ہوا ہے ان صفحات میں ہر قسم کا مضمون شامل ہے۔ مدیران محترم نے مسائل حاضرہ سے متعلق بہترین مضامین کو اخبار میں جگہ دی ہے۔ بالخصوص اشتراکیت اور اردو زبان پر جو مضامین ہیں وہ ہر لحاظ سے کامیاب و مفید ہیں۔ رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو نے "اردو زبان ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا نتیجہ ہے" کے اہم عنوان پر ایک نہایت مفید و عالمانہ مقالہ تحریر فرمایا ہے ڈاکٹر محمد عمر فاروقی، ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی کا مضمون "ہم کیا بولیں"؟ ایک محققانہ اور کارآمد مضمون ہے۔ اسی طرح جناب حبیب احمد صدیقی نے "ہماری علمی زبان" پر جنتوں کا سودائے خام تراپنے خیالات کا اظہار کرکے پبلک کی راہبری کی ہے۔ جناب سید مرتضٰے صاحب قادری کا مضمون "اردو ٹائپ" بھی افادی نقطۂ نظر سے بہت مفید مقالہ ہے۔ ملک کے مشہور شاعر جناب پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق کا مضمون "اردو کی عشقیہ شاعری" بہت کامیاب اور قابل تحسین تحقیق ہے۔ اشتراکیت پر جناب ڈاکٹر محمد اشرف جناب منظر رضوی اور جناب محمد ہاشم قدوائی کے مضامین جامعیت کے لحاظ سے بہت کامیاب کوششیں ہیں۔ حصہ نظم بھی بہت بلند ہے۔ جناب ماہر القادری، حضرت اعجاز صدیقی، جناب شوری بھوپالی، حضرت میکش اکبرآبادی کی نظمیں بہت دلآویز ہیں۔ جوبلی نمبر میں ۲۲ کے قریب فوٹو بھی دیئے گئے ہیں مختصر یہ کہ مدینہ کا جوبلی نمبر اردو ادب میں ایک مفید اور اہم اضافہ ہے۔ ہم ادارہ "ادب لطیف" اور "رومان" "ادب لطیف" کی طرف سے ادارۂ مدینہ کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ (م ۱۰)

محبت کا افسانہ۔ مصنفہ لطیف الدین احمد، کتابت و طباعت دلآویز و دیدہ زیب، صفحات ۲۹۴ قیمت دو روپے، کتاب مجلد ہے، ملنے کا پتہ: عظیم الحسن صاحب محلہ خنو ۔۔۔ آگرہ۔

جو حضرات اردو ادب سے ذرہ بھر بھی مس رکھتے ہیں وہ یقیناً حضرت لطیف الدین احمد کی ادیبانہ عظمت کے معترف ہونگے آپ ملک کے چوٹی کے ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ زیر نظر آپ کا ایک نہایت دلچسپ و دلآویز ناول ہے جس میں فاضل ناول نگار نے ازدواجی زندگی کے ہر رخ اور ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے کتاب کا ماحصل یہ ہے۔ "اس صبح کے بعد ہم دونوں نے کیا سیکھا؟ ہم نے یہ سیکھا کہ ازدواج کیا نہیں ہے۔ ازدواج کسی مذہبی، معاشری قانون یا رسم و رواج کی خانہ پری کا نام نہیں خطبۂ نکاح اور منتروں کے دوہرانے کا نام نہیں۔ کسی معاہدہ کو یا قید و پابندی کا نام نہیں بلکہ وہ ایسی حالت کا نام ہے۔ جس میں تغیر ہوتا ہے۔ جس میں روئیدگی ہے۔ جس میں حرکت عمل ہے اور جس کے اندر دو تضاد باہم گرمدغم ہوجاتے اور ایک بنجاتے ہیں:"

ازدواجی زندگی کی کشتی کو ہزاروں طغیانیوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اسکے راستے میں کئی جوار بھاٹے آتے ہیں۔ گرداب کئی رکاوٹیں حائل کردیتا ہے مگر یہ کشتی نہ جھکتی ہے، نہ ڈولتی ہے۔ بلکہ اسی سکون سے بہی چلی جاتی ہے۔" ناول نگار کی بلندیٔ تخیل و رنگینیٔ نگارش ملاحظہ فرمائیں۔

"آفتاب کے اپنی آرامگاہ میں جانے کے جذبے سے کائنات دھڑکتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ خوابگاہ خورشید کے سرخ رنگ پردے طلائی ستونوں پر لٹکے نظر آتے تھے۔ پگھلا ہوا سونا جسکی تھرتھراہٹ چمک رہی تھی ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ ان پہاڑی چوٹیوں کے اس طرف

نور کا ایک فوارہ اچھل اچھل کر پنجے حوض میں گر رہا ہے، اور وہ حوض لبریز ہو کر چھلکا چاہتا ہے۔

"ساری کائنات خوشی اور محبت کی بستی بن گئی تھی، میں نے وردانہ کو زیب تر کر لیا۔ اسکی نبضیں تیز ہو گئی تھیں۔ اس کے رخساروں میں بھی صبح کی ایک جھلک جلوہ گر تھی"

اس ناول میں اور اردو کے باقی تمام ناولوں میں ایک اور خاص فرق بھی ہے۔ اس ناول میں یا تو ہیرو کی زبان سے واقعات دہرائے گئے ہیں یا ہیروئن کی زبان سے اور یا بہت کم کسی اور شخص کی زبان سے اور ظاہر ہے یہ ناول نویسی کا نیا طریقہ ہے۔ م۔ا

ریڈیو ڈرامے:۔ مصنفہ جناب فضل حق قریشی دہلوی کتابت و طباعت نہایت اعلیٰ، صفحات ۱۹۲ قیمت ۱۲؍ ملنے کا پتہ عزیزی بکڈپو قرول باغ دہلی۔

ریڈیو ڈرامے، اردو کے جلیل القدر افسانہ نویس و تمثیل نگار جناب فضل حق قریشی کے ان ڈراموں کا مجموعہ ہے جو دہلی یا دیگر ریڈیو سٹیشنوں سے براڈکاسٹ ہو کر ہر جگہ بے حد مقبول ہو چکے ہیں، جناب فضل حق قریشی کو گوناگوں جذبات کی عکاسی میں مہارت تامہ حاصل ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے قلم سے جو چیز نکلتی ہے وہ جذبات نگاری کے لحاظ سے خاص چیز ہوتی ہے۔ ان ڈراموں میں بھی یہ خصوصیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ مجموعے میں کل بارہ ڈرامے ہیں، اور ہر ایک اپنے موضوع کے لحاظ سے کامیاب ہے۔ اس میں طربیہ اور مزاحیہ ڈراموں کے ساتھ ساتھ حزنیہ ڈرامے بھی ہیں۔ اور ہر ایک دل و دماغ پر لطیف اثرات طاری کرتا ہے

مجموعے کے آغاز میں اردو کے مقبول ترین مزاح نگار جناب شید صدیقی کا دیباچہ بھی شامل ہے جو بذات خود نہایت دلچسپ چیز ہے۔

اس مجموعے کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگائیے، کہ زیر نظر کتاب تیسرا ایڈیشن ہے۔ م۔ا

انسداد گداگری۔ مصنفہ جناب وجودی کتابت و طباعت نہایت اعلیٰ، صفحات ۱۹۴، قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ، مینجر صاحب نظامیہ بکڈپو، بٹالہ (پنجاب)

گداگری ایک لعنت ہے، جو ہندوستان پر مسلط ہے۔ اس لعنت نے ہمارے ملک کو جس طرح تباہ کیا ہے، اس کا اندازہ وہی شخص لگا سکتا ہے۔ جو ملک کے موجودہ اقتصادی و سیاسی حالات سے آگاہ ہو حقیقت یہ ہے کہ جہاں ہماری پستی و تنزل کے کئی اسباب ہیں، وہاں گداگری نے بھی ہندوستان کو پست کر دیا ہے۔ گداگری نہ صرف ملک کے اقتصادی حالات پر ایک نہایت زہریلا حملہ کرتی ہے۔ بلکہ یہ لعنت افراد قوم کے ذہن کو بھی بالکل پست کر دیتی ہے۔ اور اس کے پنجے میں پھنس کر انسان ذہنی طور پر بالکل مردہ ہو جاتا ہے۔ گداگر ایک چلتی پھرتی لعنت ہے ایک چیختی چلاتی بدبختی ہے۔ اور ایک حرکت کرتی ہوئی بے غیرتی ہے۔ موجودہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک پر نظر ڈالئے، آپ کو اول تو وہاں گداگر نظر ہی نہیں آئیں گے اور آئیں گے بھی تو بہت ہی کم، مگر اس ہندوستان ــ اس غلام آباد ــــ اور اس لعنت کدۂ تنزل میں تو چپے چپے پر گداگروں کے دل کے دل کھڑے بدنصیب ہندوستان کی انتہائی بدنصیبی کا اعلان کر رہے ہیں! اس میں کوئی شک نہیں کہ گداگری کا سرچشمہ غیر ملکی تسلط، اور اقتصادی بدحالی ہے۔ مگر یہ حقیقت بھی جھٹلائی نہیں جا سکتی کہ ہندوستان کے بیشتر گداگر محض خاندانی رسم کے مطابق گداگری کو مقصد حیات بنائے ہوئے ہیں! اسوقت گداگری کو دور کرنے کی سخت ضرورت ہے، کاش ہمارے راہنمایان ملک اس طرف توجہ فرمائیں۔

ہم جناب وجودی صاحب کے ممنون احسان ہیں، کہ انہوں نے اس اہم مسئلے پر ایک نہایت جامع و مکمل کتاب لکھی، کتاب ایک سو دس عنوانات مختلفہ پر مشتمل ہے۔ اور ہر عنوان نہایت اہم ہے۔ وجودی صاحب نے دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب کے انسداد گداگری کے متعلق احکام لکھ کر یہ ثابت کیا ہے، کہ گداگری ہر مذہب میں سخت ذلیل سمجھی جاتی ہے۔ آپ نے گداگروں کی مختلف دکھر بشیا قسمیں بھی درج کی ہیں، اور ہر قسم کے گداگر کی ذہنی کیفیت کھینچی ہے! ہر شخص کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ م۔ا

میر مشاعرہ:- مصنفہ پروفیسر عشرت رحمانی ایم۔اے، کتابت وطباعت خوشگوار، صفحات ۶۰، قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ جدید بکڈپو نیرنگستان دریا گنج دہلی۔

یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ جب کسی قوم پر ادبار و تنزل کی ملعون گھٹائیں چھا جاتی ہیں، تو اس قوم کے افراد زندگی کے حقیقی مقاصد سے اس طرح دور ہو جاتے ہیں گویا انہیں ان مقاصد سے کوئی تعلق ہی نہیں نہ صرف یہ بلکہ وہ حقیقی مقاصدِ حیات سے یکسر علیحدہ ہو کر ان پست و لغو مشاغل میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جو ایک طرف تو زندگی کی رہی سہی صلاحیتوں کو تباہ کر کے رکھ دیتے ہیں، اور دوسری طرف زندگی کے حقائق سے آگاہ ہونے کا بھی موقعہ نہیں دیتے۔ علامہ اقبال نے سچ کہا ہے ؎

آ تجھکو بتاؤں میں تقدیرِ امم کیا ہے۔
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر،

چنانچہ اس صورتِ حال میں بدنصیب قوم کے بدنصیب افراد ذہنی غلامی کی زنجیروں کو مضبوط سے مضبوط کرتے چلے جاتے ہیں۔ قارئین کرام انیسویں صدی کے ربع اول کے ہندوستانی رؤسا کی عیاشانہ زندگی سے یقیناً آشنا ہونگے۔ ان کی عیاشیوں نے قوم کی ذہنی تخریب میں جو حصہ لیا ہے وہ بھی عالم آشکار ہے۔ زیرِ نظر ڈرامے میں پروفیسر عشرت رحمانی نے اسی قسم کے ایک خوش دل نگرپست دماغ رئیس کی عیاشانہ مصروفیات کا نہایت کامیابی کے ساتھ خاکہ کھینچا ہے، گویا کتاب کے ہیرو میر صاحب "لکھنوی نزاکت، لطافت" کا ایک چلتا پھرتا نمونہ ہے جسے زندگی کے حقائق سے قطعاً کوئی تعلق نہیں، جو ملک کے موجودہ سیاسی و اقتصادی حالات سے بالکل ناواقف ہے، اور جو صرف نزاکت آب مصروفیتوں ہی کو اپنی دنیا سمجھتا ہے، بلکہ سمجھنے پر مجبور ہے.......... ملک کے موجودہ سیاسی حالات کے آہنی پنجے میں اسی طرح غلام قوم کی ذہنی صلاحیتوں کو تباہ و برباد کیا جاتا ہے!

میر صاحب قبلہ داغ دہلوی کی بازاری شاعری کے عاشق ہیں اور وہ اس قسم کی شاعری ہی کو شاعری کا کمال سمجھتے ہیں، چنانچہ عجیب عجیب نزاکتوں سے کام لیکر مشاعرے کی تیاریاں کرتے ہیں۔ ان کے ہم جلیس بھی انہیں کی طرح نزاکت پسند دل کے مالک ہیں، مشاعرہ ہوتا ہے اور اسی لکھنوی آن بان کے ساتھ ہوتا ہے شعرا کی حرکات و سکنات جہاں مضحکہ انگیز ہیں، وہاں عبرت انگیز بھی — آخر عجیب انداز میں مشاعرہ ختم ہوتا ہے۔

محترم پروفیسر صاحب نے نہایت کامیابی کے ساتھ اپنا فرض پورا کیا ہے ڈراما ختم ہوتے ہی انسان لکھنوی نزاکتوں سے بیزار ہو جاتا ہے — یہ ڈراما آل انڈیا ریڈیو دہلی سے براڈکاسٹ ہو کر ہندوستان کے گوشے گوشے میں مقبول ہو چکا ہے۔ قارئین ضرور مطالعہ فرمائیں! ،م۔ا،

کالیداس اور ودیا:- مصنفہ جوش صاحب انبالوی، صفحات ۸۰، کتابت وطباعت اعلیٰ، کتاب مجلد ہے، قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ۔ ودیا پبلشنگ ہاؤس، انبالہ چھاؤنی۔

یہ ایک ناٹک ہے جس میں کالیداس کی زندگی کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ سب سے پہلا اعتراض تو کتاب پر یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی زبان نہایت ادق اور سنسکرت آمیز ہندی ہے۔ جسے اردو کہنا حقیقت کو جھٹلانا ہے اس میں شک نہیں، کہ کالیداس سنسکرت زبان کا ڈرامانویس تھا، اور یہ ناٹک اس عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ جب کہ ملک کی زبان سنسکرت تھی، مگر اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے، کہ اب کے اس عہد کے متعلق جو کچھ لکھا جائے، وہ سنسکرت ہی کی قسم کی کسی زبان میں ہو۔ شروع میں جناب مولانا وقار کا دیباچہ ہے۔ جس میں وہ فرماتے ہیں، کہ اسکی زبان نہایت صاف، شستہ اور رواں ہے، اور شستگی زبان کے اعتبار سے انہوں نے نہایت لطافت اور متانت پیدا کر دی ہے" نہ معلوم وقار صاحب زبان کی صفائی، شستگی اور روانی سے کیا مراد لیتے ہیں اور شستگی زبان کے اعتبار سے لطافت و متانت ان کے ذہن میں کیا حقیقت رکھتی ہے! بہرحال یہ حقیقت ہے کہ وقار صاحب نے ذمہ دارانہ دیباچہ نہیں لکھا، دیباچہ میں جا بجا انہوں نے لفظ "ڈرامیائی" لکھا ہے، شاید ڈرامیائی سے انکی مراد ڈرامائی ہے؟! م۔ا

شہید میکسویٹنی، مولفہ پنڈت اندر دوی کپل صاحب، کتابت وطباعت

خوشگوار قیمت عہ ملنے کا پتہ اردو بک سٹال امرت سر۔

آئرلینڈ کے زندہ جاوید محب وطن ٹرنیس میکسوینی کے حالات زندگی کا یہ مجموعہ ہندوستان کے موجودہ دور ابتلا و کشمکش میں خاص طور پر مفید ہے۔ اس کتاب کے مولف جناب پنڈت نند دوی کپل صاحب کی کوشش سے ہمارے ادب میں ایک ایسی کتاب کا اضافہ ہوگیا ہے جو غلام ہندوستان کے تنگ و تاریک سیاسی راہوں میں راہنمائی کی روشنی ڈال سکتی ہے! اور جس کے مطالعے سے غلام باشندے کئی اہم سبق حاصل کرسکتے ہیں۔ سب سے بڑا سبق جو اس کتاب سے حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں آزادی اور استخلاص وطن کی راہ میں ہر قسم کی قربانی اور ہر طرح کے ایثار کے لئے آمادہ رہنا چاہیئے! جب تک ہم اس راہ میں اپنی جان تک قربان کرنے پر تیار نہ ہوں آزادی کا حاصل ہونا ایک خواب پریشاں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا!

کتاب کو اکیس اہم ابواب پر مشتمل کیا گیا ہے۔ اور ہر باب میں آئرلینڈ کے اس بطل اعظم کی زندگی کا کوئی نہ کوئی پہلو پیش کیا گیا ہے! کتاب کا انداز بیان دلچسپ ہے زبان بہت سلیس اور عام فہم ہے۔ م م

حیا۔ سالگرہ نمبر: زیر ادارت محترمہ کنیز فاطمہ حیا۔ کتابت و طباعت نہایت اعلیٰ قیمت ۸ ملنے کا پتہ دفتر رسالہ حیا لکھنؤ۔

حیا۔ ایک نسوانی رسالہ ہے۔ جو ملک کی مشہور ادیبہ محترمہ کنیز فاطمہ حیا کی زیر ادارت نہایت کامیابی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے جو رسالہ محترمہ حیا جیسی جلیل القدر شاعرہ کی ادارت میں شائع ہو رہا ہو اس کی کامیابی و ترقی کے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے! محترمہ حیا صاحبہ پرچے کو ترتیب دینے میں بہت صاف ستھرا مذاق رکھتی ہیں۔ اور حیا کا ہر پرچہ پہلے پرچے سے زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ زیر نظر حیا کا سالگرہ نمبر ہے جس کے متعلق یہی کہہ دینا کافی ہے

زسرتا بقدم ہر کجا کہ می نگرم!
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

ہر مضمون و نظم دلکش و دلاویز ہے۔ رسالے میں تصاویر بھی ہیں۔ بہر حال حیا کا سالگرہ نہایت کامیاب نمبر ہے! (م-۱)

ہل۔ زیر ادارت شری ناتھ سنگھ۔ کتابت و طباعت نہایت اعلیٰ سالانہ چندہ للعہ فی پرچہ ۲ر۔ ملنے کا پتہ۔ انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد۔

ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے۔ جہاں قریباً پچاسی فی صدی آبادی کھیتی باڑی کرکے ہی گزران اوقات کرتی ہے۔ جب یہ حالت ہے تو لازماً ہمارے راہنماؤں کو دیہات سدھند کی طرف سب سے زیادہ توجہ دینی چاہیئے۔ کیونکہ جب تک کسانوں کی حالت درست نہیں ہوگی، ہندوستان کی پستی میں قطعاً کوئی فرق نہیں آئے گا۔ چنانچہ اسی مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد کے کارکنان محترم نے ایک مفید رسالہ شائع کرنا شروع کیا ہے۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے "ہل" یکسر زراعتی رسالہ ہے۔ جس میں شروع سے لیکر آخر تک زراعت سے متعلق ہی مضامین دیئے جاتے ہیں۔ اسوقت ہمارے پیش نظر "ہل" کا فروری نمبر ہے۔ جس میں متعدد نہایت کار آمد زراعتی مضامین دیئے گئے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر کے این داس کا مضمون "دیہاتی کنویں اور گندگی سے ان کی حفاظت"۔ عبدالحی عباسی کا مقالہ "جانوروں کی پرورش اور ترقی دیہات"۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کا مقالہ "نئی تعلیم، نئی زندگی"۔

ٹائیٹل پیج پر ایک رنگین تصویر ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور رنگین تصویر بھی رسالے کے آغاز میں ہے۔ قریباً قریباً ہر مضمون کو مصور کیا گیا ہے۔ جس سے رسالے کی افادیت میں خاص اضافہ ہوگیا ہے۔

بہر حال کارکنان انڈین پریس یہ رسالہ شائع کرکے ملک کی ایک اہم خدمت انجام دے رہے ہیں۔ (م-۱)

عذرا کے خطوط، مصنفہ اے۔ ایچ آغا کتابت و طباعت خوشگوار قیمت آٹھ آنے ملنے کا پتہ۔ نیشنل بکڈپو اینڈ ایجوکیشنل پبلشرز لاہور۔

اس کتاب کے مصنف جناب آغا اشرف ایک ذہین نوجوان ہیں اور یہ کتاب آپ کے برسوں کے تجربات زندگی کا ما حاصل ہے! کتاب ایک الہڑ مگر حساس اور متفکر عورت کے ان عبرت انگیز خطوط کا مجموعہ ہے جو وہ وقتاً فوقتاً اپنے دوست کو بھیجتی رہتی! معلوم ہوتا ہے الفاظ کے چوکھٹوں میں ایک زخم نصیب عورت کے آنسو جھلملا رہے ہیں! ایک نوجوان کی پہلی کوشش ہے اس لئے ہمیں انکی ہمت افزائی کرنی چاہیئے موجودہ کوشش سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آغا صاحب اگر مشق جاری رکھیں تو مستقبل میں اردو کے ایک مایۂ ناز ادیب ثابت ہونگے [illegible] (م-۱)

مکتبہ اردو کی ہر دلعزیز مطبوعات

سانچی اور تین [illegible]
[illegible]

[illegible] کا [illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible] مجلد [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

شہنشاہ [illegible] [illegible]

عورتوں کے افسانے ہندوستان کی عورتوں [illegible]
[illegible]
کوثر چاندپوری [illegible]

پھول اور کانٹے [illegible]
[illegible]

[illegible] کرشن چندر کے افسانوں کا مجموعہ جس نے فلسفہ اور زندگی کی [illegible] [illegible] ترجمانی کی ہے … موجودہ معاشرت [illegible]
کرشن چندر [illegible] مجلد ایک روپیہ

[illegible] [illegible]
[illegible]

شعلے [illegible] افسانے [illegible]
[illegible] مجلد [illegible]

پیش پرچھائیں [illegible] حالات [illegible]
[illegible] مجلد [illegible]

چمپئی کی خلوت داستان [illegible] ہندوستان [illegible]
[illegible] غلام [illegible]
[illegible] مجلد ڈیڑھ روپیہ

[illegible] [illegible] دنیا بھر کے نقادانِ ادب کے بہترین [illegible] افسانے [illegible]
[illegible] اردو میں منتقل نہیں ہوئے تھے۔
[illegible] مجلد [illegible]

تین پیسے کی چھوکری [illegible] افسانوں میں [illegible]
[illegible] افسانوں کا مطالعہ [illegible] ضروری ہے۔
قاضی [illegible] مصنف [illegible] مجلد ڈیڑھ روپیہ

ننگ رزم ہندوستانی [illegible] جنگی [illegible] کا پہلا مجموعہ۔ شجاعت اور غیرت کے جذبات ابھارنے والی کتاب۔ دوسرے ایڈیشن میں [illegible] نظمیں بھی شامل ہیں۔
وقار انبالوی مجلد آٹھ آنے

دنیا کی عورتیں اور دیگر افسانے یہ کتاب خاص طور پر لڑکیوں اور عورتوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ [illegible] بالکل ہماری معاشرت و تمدن کے مطابق ہے [illegible]
کوثر چاندپوری مجلد ایک روپیہ

مکمل فہرست طلب فرمائیں

R. L. NO. 3521

علمی ادبی و تنقیدی ماہوار مرقع

مصور ادب لطیف لاہور

ایڈیٹر

چودھری برکت علی بی اے

سالانہ چندہ
3,8/-

فی پرچہ
-/4/-

دار الاشاعت
منزلہ اردو ۱۴ سرکار روڈ لاہور

منظور کردہ محکمہ تعلیم پنجاب، صوبہ سرحد و ریاست حیدرآباد دکن

مکتبۂ اردو لاہور کا

کثیر الاشاعت و ارزاں ترین ماہنامہ

رسالہ ادبِ لطیف لاہور

جولائی سنہ ۱۹۳۹ء

ادارۂ تحریر

چودھری برکت علی بی، اے

میرزا ادیب بی، اے

مقامِ اشاعت

مکتبۂ اُردو لاہور

قیمت فی پرچہ چار آنے

کتبہ ممتاز القلم حامد حسین گھوڑے شاہ لاہور

زرِ سالانہ بمعہ ضخیم سالنامہ و افسانہ نمبر و ڈراما نمبر تین روپے آٹھ آنہ علاوہ محصول ڈاک

زرِ سالانہ ممالک غیر سے ۸ شلنگ

فہرست

جلد ۹ | بابت ماہ جولائی ۱۹۳۹ء | نمبر ۵

چودھری برکت علی بی اے، پرنٹر و پبلشر و ایڈیٹر نے برائے کوآپریٹو کیپیٹل پرنٹنگ پریس وطن بلڈنگ لاہور سے چھپوا کر دفتر ادب لطیف سرکلر روڈ لاہور سے شائع کیا

ادارہ:-

اشارات

ادبی سٹ:- قارئین نے ڈراما نمبر میں ادبی سٹ کی سکیم کے متعلق پڑھا ہوگا جون کے ایشوع میں بھی اسکی تفصیل درج ہے۔ اور جیسا کہ توقع تھی ہماری سکیم کو بڑی مسرت کے ساتھ پڑھا گیا ہے ملک کے طول و عرض سے اس سکیم کی تائید میں خطوط پہنچ رہے ہیں۔ ان خطوط میں ہمارے نئے مہربانوں نے سکیم کو ہمہ گیر بنانے کی طرف توجہ کی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس مفید سکیم کو ہندوستان کے ہر گوشے میں پھیلایا جائے۔ ظاہر ہے یہ چیز ہماری توقعات سے علیحدہ نہیں۔ ہماری انتہائی خواہش ہے کہ اپنے وجود کو اردو ادب کے لئے زیادہ سے زیادہ کار آمد بنائیں اور اس کے لئے ہمارے دائرہ عمل کو اتنا وسیع ہونا چاہیئے۔ کہ ملک کا ہر کونہ اس سے متاثر ہو سکے یوں تو ہمارے مہربانوں کے تائیدی خطوط کا ماحصل مگر سب سے زیادہ مسرت ہمیں یہ دیکھ کر ہوئی ہے کہ بعض خطوط نئے علاقوں سے موصول ہوئے ہیں، جہاں اردو کے جاننے والے بہت کم ہیں۔ کہ: ہاں اردو کی اہمیت ایک بے معنی چیز ہے۔ ان حضرات نے لکھا ہے۔ کہ ایسی مفید سکیم کو ہمارے دور افتادہ علاقوں سے شروع کیا جائے! بعض نے تو سکیم کا مطالعہ کرتے ہی ممبری کی درخواست کے ساتھ پہلی قسط بھیج دی ہے! یہ چیز یقیناً اس حقیقت و صداقت پر شاہد ہے کہ ہماری سکیم ہمہ گیر تائید کی مستحق ہے۔ اور دوسرے اردو کو اتنی مقبولیت حاصل ہے۔ کہ ایسے علاقوں میں بھی جہاں اردو بظاہر کالعدم کی حیثیت رکھتی ہے، اردو کی سچی تڑپ رکھنے والے لوگ موجود ہیں۔

ذیل میں ہم ایک محب اردو جو خاندیس کے رہنے والے ہیں کے خط کا اقتباس پیش کرتے ہیں:-

محترمی!

میں ایک ایسے علاقے میں رہتا ہوں، جہاں اردو کو جاننے والے بہت کم ہیں مگر میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ اردو کی خدمت میں کیونکر۔ وہ بڑی میٹھی اور آسان زبان ہے۔ جب میرے یا میرے کسی دوست کے سامنے اردو کی کوئی اچھی سی کتاب آتی ہے تو ہم بہت خوش ہوتے ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ جب کبھی ہم بڑے شوق سے کسی کتاب کا اشتہار پڑھ کر کتاب منگواتے ہیں اور کتاب بڑی واہیات ثابت ہوتی ہے۔

میں اور میرے دوست آپکی سکیم کی بڑے زور کے ساتھ تائید کرتے ہیں۔ پہلی قسط بھیج رہا ہوں، میرے جیسے کی کتابیں بھیجیں شاید آپ یہ کہیں کہ سٹ کی قیمت تو گیارہ روپے ہے اور ہم کیوں پانچ روپے میں اتنی کتابیں بھیج دیں یہی محسوس کرکے میں نصف روپے بھیج رہا ہوں۔ آپ بیشک نصف سٹ بھیج دیں۔

کیا اقبال صاحب پہلے یہاں نہیں آئیں گے یہاں انہیں کافی کامیابی ہوگی!"

ظفر حسین

اس خط سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا۔ کہ ادبی سٹ کی سکیم کتنی کشش اپنے اندر رکھتی ہے۔ مگر ہم اس امر کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کہ ہماری اردو ہی فطرتاً اتنی دلکش، آسان اور موثر زبان ہے۔ کہ جو کچھ اس کی طرف ذرہ بھر بھی توجہ کرے وہ اسکی شیرینیوں سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا!

آپ ملک میں اردو کی مخالفت کے مظاہرے دیکھ رہے ہیں اس کا مطلب لازماً یہ ہے کہ بعض حضرات محض مہاسبھایانہ ذہنیت کے ماتحت یہ روش اختیار کر چکے ہیں صوبائی تعصب ہی نہیں ایسے قابل اعتراض اتحاد کش رویہ اختیار کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ نہ صرف صوبائی تعصب بلکہ مذہبی تعصب بھی برسر کار ہے۔ ہمارے محترم دوست غلطی سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے جو قرآنی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے درانحالیکہ یہ سفید جھوٹ ہے اور حقیقت سے پرلے درجے کا اغماض اگر وہ حقیقت سے آشنا ہو جائیں۔ تو آج ہی لسانی تعصب ان کے دلوں سے دور ہو جائے اور اسی تعصب کو دور کرنے کے لئے اردو کے محبان مخلص پیہم و مسلسل کوشش کر رہے ہیں۔ خدا کرے انکی کوشش جو وطن کے لئے بیحد مفید ہے۔ کامیاب ہو جائے!!

ادب لطیف کا عدیم النظیر افسانہ نمبر:- ادب لطیف کے افسانہ نمبر اس قدر مقبول ہو چکے ہیں، کہ اب کے افسانہ نمبر کی بجائے ڈراما نمبر شائع ہوا تو لوگوں نے افسانہ نمبر کی اشاعت پر بھی زور دینا شروع کر دیا ہر روز ڈاک سے متعدد خطوط ایسے موصول ہوتے ہیں۔ جن میں افسانہ نمبر کی اشاعت پر خاص اصرار کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ اپنے قارئین کے پیہم اصرار کے پیش نظر ادارہ ادب لطیف نے اپنی کوششیں افسانہ نمبر

کی تعبیریں لگادی ہیں۔ ہمارا یہ عدیم النظیر افسانہ نمبر اپنے جملہ صوری محاسن کو لئے ہوئے اپنی تمام معنوی خصوصیات کے ساتھ ستمبر کے پہلے ہفتے میں شائع ہوکر قارئین کی خدمت میں پہنچ جائے گا۔

آئندہ نمبر میں ہم افسانہ نمبر کے چند مندرجات کے متعلق کچھ لکھیں گے

مکتبہ اردو کی علمی سرگرمیاں

مکتبہ اردو کے کارکن ادبی سٹ کی سکیم کو ہر جگہ کامیاب بنانے میں مصروف ہیں۔ اور سکیم کا سب سے اہم حصہ یہ ہے۔ کہ تقریباً ہر ماہ ایک کتاب شائع کی جائے اس سے نئی کتابوں کی اشاعت میں خاص سرگرمی کا اظہار کیا جا رہا ہے ادھر ادارہ ادب لطیف' افسانہ نمبر کو کامیاب ترین بنانے میں منہمک! قارئین منتظر تھے کہ مکتبہ اردو کے خطوط جلد سے جلد ان تک پہنچ جائیں اور اب مسرت کے ساتھ ہم اعلان کرتے ہیں۔ خطوط شائع ہوگئے ہیں اگلے اشاعت کی پشت پر کتاب کا ٹائٹل پیج ملاحظہ فرمائیں۔ رنگین اور دلآویز ٹائٹل پیج کے علاوہ کتاب میں متعدد تصویریں بھی ہیں۔

ایک ہنگامہ خیز اعلان۔ مکتبہ اردو کی طرف سے

عنقریب دُنیا کی نادر ادیبہ مسز پرل بک کی شہرہ آفاق تصنیف The good earth کا ترجمہ تمام ظاہری محاسن کے ساتھ شائع ہوگا۔

مسز پرل بک کی تصانیف نے دنیائے ادبیات میں ایک تہلکہ پیدا کر دیا ہے۔ اور اسکی دماغی کاوشیں دنیا کی کئی زبانوں میں منتقل ہو چکی ہیں۔ "دی گڈ ارتھ" اس نامور ادیبہ کا وہ زندہ جاوید کارنامہ ہے جس پر موصوفہ کو نوبل پرائز ملا ہے۔ اس ناول میں چینی زندگی کو اس کامیابی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ کہ آپ ایک لمحے کے لئے بھی یہ یقین نہیں کریں گے۔ کہ یہ کسی غیر چینی دماغ کی کاوش ہو سکتا ہے اس ناول کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگائیے۔ کہ یہ نہ صرف دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ بلکہ اسے فلمایا بھی جا چکا ہے

ترجمہ اردو کے جلیل القدر انشاپرداز حضرت احسان بی اے کا رہون منت ہے۔ احسان صاحب کو اصل خوبیاں برقرار رکھنے میں ید طولےٰ حاصل ہے اور آپ کے ترجمے رسالوں میں شائع ہوکر بے حد مقبول ہو چکے ہیں۔ یہ ترجمہ انہوں نے بڑی محنت سے کیا ہے

نوشتہ ورڈز ورتھ

مترجمہ سید اشرف کاظمی

"وہ"

وہ انسانی قدموں سے نا آشنا راستوں پر رہتی ہے۔
ڈو کے رواں چشموں کے قریب
حسین دوشیزہ، جس کے حسن کی رعنائیوں کو سراہنے والا تو کوئی تھا ہی نہیں۔
اور پیار کرنے والے بہت کم!
بنفشے کا حسین پھول۔ . . . . کائی سے ڈھکے ہوئے پتھر کے پاس . . . . . نگاہوں سے نیم نہاں
اس ستارے کی طرح حسین جو آسمان کی وسعتوں پر تنہا ضیا بار ہوا
اس نے گمنامی میں ہی زندگی کی گھڑیاں ختم کر دیں۔
اور جب بے رحم موت نے اسے اپنے تاریک آنچل میں چھپالیا۔
تو کوئی جان بھی نہ سکا۔
لیکن اب جبکہ وہ قبر کی سکوت آفریں تنہائیوں میں ابدی خوابوں میں مدہوش ہے
تو میرے سینے میں درد و کرب کی ہیجان برپا کر دینے والی لہریں موجود ہیں
مگر کوئی اس درد کی شدت کو کیا جانے!

محمود اسرائیلی

تسطیر بر غزل حضرت اسد اللہ خاں غالبؒ

تسطیر اردو شاعری میں نئی چیز ہے۔ یہاں تخمیس کا عام رواج ہے۔ جس میں شعر سے قبل تین مصرعوں کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ مگر تسطیر کو عرب میں بہت مقبولیت حاصل ہے۔ اس میں شاعر کے پہلے اور دوسرے مصرعوں کے درمیان دو مصرعے اس خوبی سے کھپائے جاتے ہیں کہ ہر مصرع مکمل شعر بن کر قطع بند کا لطف پیدا کر دیتا ہے۔ گویا چار مصرعوں میں پہلا اور چوتھا مصرعہ اصل شعر کا ہوتا ہے اور دوسرے اور تیسرے مصرعوں کا اپنی طرف سے اضافہ کیا جاتا ہے مندرجہ ذیل تسطیر میں حضرت غالب رح کے مصرعوں پر نشان لگا دیا گیا ہے :-

---

غم دنیا سے گر فرصت بھی پائی سر اٹھانے کی　　مجھے مہلت کہاں ہے دو گھڑی آرام پانے کی
گھڑی بھر کو تجھے دل سے بھلایا بھی تو کیا ظالم　　فلک کو دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

لپٹنا پرنیاں میں شعلہ آتش کا آساں ہے　　کہ اس میں پھر بھی کچھ قوت ہے حدت کو دبانے کی
یہ ممکن ہے کہ کاغذ شمع کا فانوس بن جائے　　ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوز غم چھپانے کی

انہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا　　ضرورت ورنہ ایسی تو نہ تھی کچھ باغ جانے کی
نگہ نیچی کئے وہ مسکراتے اپنی محفل سے !!　　اٹھے تھے سیر گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

ہماری سادگی تھی التفات ناز پر مرنا　　دل ناداں کو عادت ہے فریب حسن کھانے کی
یہی ایفائے وعدہ تھا تو اس وعدے کو کیا کیجئے　　ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

لکد کوب حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی　　نہ پوچھو اس پہ افتادیں پڑی ہیں کیا زمانے کی
اب اس سے آہ اپنا بار غم بھی اٹھ نہیں سکتا　　مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

کہوں کیا خوبی اوضاع دنیائے زماں غالب　　مری قسمت کی خوبی ہے، شکایت کیا زمانے کی
کسے مخلص سمجھئے، یا محبِ باصفا کہیئے !!　　بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

میرزا ادیب

"وہ سات مجرم"

صحرانورد کے خطوط شائع ہو چکے ہیں۔ یہ اس سلسلے کی پہلی جلد ہے۔ فی الحال یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے لئے روک کر نیا سلسلہ شروع کیا جاتا ہے۔

اس نمبر میں اس کا ابتدائیہ شائع ہو رہا ہے۔ پہلا مکمل باب جو بذاتِ خود صحرا نورد کے ہر خط کی مانند مکمل افسانہ ہو گا، افسانہ نمبر میں نکل رہا ہے۔

وہ سات مجرم بھی ہماری اور آپ کی طرح انسان ہیں۔ مگر ان کی دنیا ہماری دنیا سے مختلف ہے، ان کے جذبات مختلف ہیں ان کے افعال اور کردار مختلف ہیں، خالق نے انہیں انسان بنایا۔ مگر خالق کی پیدا کی ہوئی دنیا نے انہیں حیوان سمجھا۔ اور مخلوق کا فیصلہ خالق کے فیصلے پر غالب آ گیا۔

(میرزا ادیب)

"نمودِ سحر"

یکایک بدنصیب قیدی کے جسم میں ایک لرزش سی دوڑ گئی، چودہ سال کی طویل، حوصلہ فرسا اور حوصلہ شکن مدت میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ اس کے کانوں میں اس قسم کی آواز تھرتھرائی ۔۔۔ ایک لمحے کے لئے تھرتھرائی اور پھر ہوا کی لہروں میں تحلیل ہو گئی۔

وہ اپنی کمزور کہنیوں کے بل سر کو بلند کر کے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کئی لمحے قید خانے کی سنگین دیواریں اور آہنی سلاخیں اس کی نگاہوں کے سامنے رینگتی رہیں۔ آخر مایوس ہو کر اور آواز کو فریبِ تخیل سمجھ کر اس نے سر لکڑی کے تختے پر رکھ دیا۔ مگر اس حالت میں بھی اسکی نگاہیں سامنے قید خانے کی دیوار پر گڑی ہوئی تھیں۔

آج سے چودہ سال پیشتر وہ ایک بہت بڑے جرم کی پاداش میں سپاہیوں کی تلواروں کے سائے تلے یہاں ۔۔۔ اس وحشت ناک مقام پر لایا گیا تھا۔ چند ماہ بعد چھ اور مجرم بھی اس اندھیرے غار میں دھکیل دیئے گئے۔ مگر اس کے ساتھیوں نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ وہ چھ کے چھ ایک ایک کر کے اس اندھیرے غار سے نکل کر موت کی اتھاہ تاریکیوں میں ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئے۔ اس نے اپنے سامنے ہر ایک کو سسک سسک کر تڑپ تڑپ کر، ایڑیاں رگڑ رگڑ کر آخری سانس لیتے ہوئے دیکھا ۔۔۔ ہمیشہ کے لئے اس تاریک اور خوفناک قید خانے کو چھوڑتے ہوئے دیکھا، مگر وہ تنہا انسان سب کچھ دیکھنے کے باوجود، رہائی کی ہر امید سے مایوس ہونے کے باوجود جیئے جا رہا تھا!

وہ گلتی ہوئی ہڈیوں، اور سیاہ جھریاں پڑے ہوئے گوشت کے بھیانک پردوں کا ڈھانچہ، غار کے کسی گوشے میں اگا ہوا ایک افسردہ پودا تھا۔ جس پر کبھی کبھی ہوا کا کوئی جھونکا پہاڑ کے شگاف میں سے داخل ہو کر چند لمحوں کے لئے ایک لرزش سی پیدا کر دے۔ یا وہ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں چند بار کھانس کر اور دو ایک بار پیٹ کے بل رینگ کر زندگی کا ثبوت دیتا ہوا، نحیف و نزار مگر تیزی کے ساتھ جلتا ہوا ایک چراغ تھا جس کا بادبان شعلوں کے آتشیں سانسوں سے بھر رہا ہو!

اس کے کان ہر لمحہ ایک خاص آواز سننے کے لئے بیتاب تھے۔ اسکی آنکھیں ہر گھڑی ایک خاص منظر دیکھنے کی منتظر تھیں، اور اسی موقعے کے انتظار میں وہ نحیف و نزار جسم موت کی ٹھوکریں کھا کھا کر سانس لے رہا تھا۔ اس کی ہر ربطِ حیات کے تمام تار ٹوٹ چکے تھے۔ مگر ابھی ایک تار سلامت تھا۔ یہ تار ۔۔۔ یہ حقیر ۔۔۔ بہت جلد ٹوٹ جانیوالا ور

رہا موت کے حملوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اس کا چراغِ حیات بجھ چکا تھا۔ لیکن ابھی اس چراغِ حیات کا نہایت مدھم — نہایت حقیر شعلہ موت کے جھونکوں کی آغوش میں لرز رہا تھا۔

ایکبار پھر وہی آواز گونجی۔

قیدی کی بوڑھی رگوں میں خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔ اور اس کے لمبے لمبے، نیلے نیلے ناخن، دیوار میں ایک ابھرے ہوئے ٹیلے پتھر پر، جس کے ایک سرے پر سمندری جھاگ کی مانند کوئی سفید سی چیز جمی ہوئی تھی، رگڑ رگڑ کر مدھم سی خراشیں ڈالنے لگے۔ اس نے گردن اٹھا کر روشندان کی طرف دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے سینے کی ستہ ہڈیوں سے درد کی لہریں ٹکرائیں۔ اس پر کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ فضا میں کھانسی کی آواز اس طرح گونجنے لگی، جس طرح کسی ٹوٹی پھوٹی سنسان کھنڈر میں خزاں رسیدہ سوکھے سوکھے پتے گر گر کر کھڑکھڑا رہے ہوں۔ وہ کھانستا رہا، اور جب کھانسی قدرے رکی، تو اس کے منہ سے ایک سیاہ سی چیز نکل کر ٹھوڑی کے موٹے موٹے گرد آلود بالوں پر جم گئی۔ قیدی نے اپنی پھٹی ہوئی کفنی سے منہ کو پونچھا — کفن کے علاوہ جا بجا خون کے دھبے پڑے ہوئے تھے — اور اب ان میں چند اور دھبوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔

چند منٹ اور گزر گئے۔ سانس لیتی ہوئی لاش موت کے غار کے دہانے پر جا پہنچی!

آواز پھر گونجی،

قیدی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس طرح چمک اٹھیں جس طرح رات کے اندھیرے میں بجلی کی روشنی سے کسی جھیل کا ایک گوشہ ایک لمحہ کے لئے روشن ہو جائے!!

وہ اپنی زخمی کہنیوں پر جسم کا بوجھ ڈال کر دیوار سے کچھ آگے کھسک آیا۔

آواز کی بجائے اب مسلسل شور بلند ہو رہا تھا۔

قیدی پیٹ کے بل رینگنے لگا۔ اس کا کمر سے نچلا حصہ مفلوج ہو چکا تھا۔

شور میں سے "آمین" کہتی ہوئی آواز بلند ہوئی، اور قیدی کے دل و دماغ میں ایک طوفانِ اضطراب بن کر پھیل گئی۔

قیدی کی نحیف کہنیوں سے خون بہہ رہا تھا۔ پیٹ کے زخم رگڑ کھا کر پھوٹ رہے تھے مگر وہ زخموں کی تکلیف سے بے پروا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

اب "آمین!" کا شور بلند ہوا۔ قیدی کی کہنیاں اور تیزی سے جسم کو گھسیٹنے لگیں۔ اسکا دل، اس کا دماغ، اس کی روح، اسوقت کانوں میں آ گئی تھی۔ وہ مجسم گوش بن گیا تھا صرف ایک لفظ سننے کے لئے صرف ایک مژدہ سننے کے لئے!

شور بلند سے بلند ہوتا جا رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ قیدخانے کے باہر کی ہر چیز چیخ رہی ہے۔

قیدی آہنی سلاخوں کے قریب پہنچ گیا۔ اس کی دائیں کہنی کی ہڈی نکل آئی تھی۔ اس نے سلاخوں سے باہر دیکھا۔ لوگوں کا ایک بے پایاں ہجوم قیدخانے کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔

قیدی تڑپ کر آگے بڑھا — اور آگے بڑھا، ابھی وہ سلاخوں سے کچھ دور ہی تھا،

"آمین آزاد — ہمارا وطن آزاد!" ایک شور بلند ہوا، قیدی کی آنکھیں پھیل گئیں، — اس نے ایک لمبی آہ بھر کر باہر مضطرب مجمعے کی طرف دیکھا۔ اور اپنا سر سلاخوں سے لگا دیا۔

مہیب خراش شور کے ساتھ قیدخانے کے تالے ٹوٹنے لگے، دروازے ٹوٹنے لگے۔ دیواریں گرنے لگیں۔

ہر طرف قیامت خیز شور — ہر جانب ہنگامہ رستخیز

چند منٹ کے بعد آخری تالہ بھی ٹوٹ گیا۔ کفدر وہاں باغی کمرے میں آ موجود ہوئے۔ سب کی نگاہیں مضطربانہ ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں۔

شور یکایک تھم گیا۔

ہجوم کے سامنے قیدی کی لاش پڑی تھی۔

قیدی کا ایک ہاتھ اوپر اٹھا ہوا تھا۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا تھا — اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں!!

تسونگ ناد
چینی شاعر

محلات اور جھونپڑیاں

ترجمہ محمد اشرف خاں عطا

اے نووارد مسافر!

تو میرے وطن کی وسعتوں میں کیف آفریں رعنائیوں اور نظر افروز خوبصورتیوں کو ڈھونڈ رہا ہے لیکن یہ سامانِ طرب نشاط میرے وطن چین میں نہیں ملیگا فلاکت زدہ انسانوں کے ملک میں خوبصورتی، رعنائی اور نظر افروزی کے سامان ڈھونڈنے والے نووارد مسافر! دیکھ ان اونچے اونچے محلات کی منڈیروں پر مسرت و شادمانی کی پریاں رقص کناں ہیں۔ اور مرمریں کمروں سے چنگ رباب کی وجد آفریں اور حیات افروز تانیں بلند ہو رہی ہیں۔

لیکن ان فلک بوس محلات کی مرمریں دیواروں کے نیچے فاقہ کش، غم نصیب مزدوروں کی بے گور و کفن نعشیں سرمایہ دار کے ظلم کی بھیانک تصویر پیش کر رہی ہے۔

شہر سے دور کھلی فضا میں دور تک پھیلی ہوئی خس کی جھونپڑیوں کی طرف نظر اٹھا۔ جو چھتوں سے محروم ہیں ——— مزدور اور کسان کے فاقہ کش بچے موسم سرما میں سکڑ کر بیٹھے ہیں۔

+ ———— + ———— +

اے نووارد مسافر!

کنارِ آب کے گلہائے رنگا رنگ کو دیکھ کر خوش نہ ہو۔ ان کی پنکھڑیوں میں شہیدانِ وطن کا خون ملا ہوا ہے۔

یہ فلک بوس سبز پوش پہاڑ جن کے دامن میں دریا بہہ رہے ہیں اور پھول کھل رہے ہیں، اپنے پہلو میں میرے ملک کی غربت و افلاس کے جانگداز افسانے لئے ہوئے ہیں۔

+ ———— + ———— ×

میرا ملک، ہاں پرانی ریشہ دوانیوں اور توہم پرستیوں کا مرکز چین نوجوانوں سے خالی ہے۔

میرے ملک کی وسیع و عریض زمین پر بوڑھوں کی حکومت ہے، جو دن رات گناہوں کی وادیوں میں محوِ خرام ہیں۔

وہ اپنے لرزہ آفریں اور انسانیت سوز گناہوں کا کفارہ، جوانوں کا خون بہا کر ادا کرتے ہیں۔

یہ بوڑھے لوگ گھروں کی چار دیواری میں بیٹھے بادۂ احمر کے خم پر خم لنڈھا رہے ہیں۔

لیکن نوجوان دولہا، جس کے ہاتھوں میں مہندی ابھی خشک نہیں ہوئی، میدانِ کارزار میں اپنی جان دیکر بوڑھوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کر رہا ہے

+ ~ ———— + ———— +

نوجوان۔ بہادر۔ جری۔ نڈر۔ محبِ وطن چینی۔

زندان کی آہنی سلاخوں کے عقب میں چین کی نئی تاریخ مرتب کرنے میں مصروف ہے، وہ ایک ایسے خواب کی تعبیر دیکھنا چاہتا ہے جس نے اس کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔

وہ مستقبل کی خوبصورت تصاویر کو حال کے آئینہ میں دیکھ کر باغ باغ ہو رہا ہے۔ اسے اس چیز کی پروا نہیں۔ کہ جہاد حریتِ وطن میں شہادت پانے کے بعد اسکی بے گور و کفن نعش کتوں اور چیلوں کی خوراک بن جائے گی، بلکہ وہ جانتا ہے۔ کہ خونِ شہادت کا ہر قطرہ ملوکیت کے تابوت کے لئے کیل ثابت ہوگا۔ لاریب!

چین کا غیور نوجوان باطل کی تاریکیوں میں حق و صداقت کا نور پھیلا رہا ہے۔

وہ حریتِ کاملہ کا سچا علمبردار ہے۔

نوشتہ: کارلیٹن بیلس

مترجمہ: سید راحت مولائی

کیریبی کا قیصر[۱]

(امریت کے موجودہ دورِ ترقی میں اربابِ نظر یورپ کے صرف ان ہی دو بڑے بڑے آتش فشاں ہونے کی طرف متوجہ ہیں جنہوں نے یورپ میں ایک تہلکہ مچا رکھا ہے۔ لیکن ایک تیسرا آمر بھی لوگوں کو اپنی ستم رانیوں کی جھلکیاں دکھا دکھا کر اگر خوفزدہ نہیں تو حیران و متعجب ضرور کر رہا ہے جس کی طرف ابھی بہت کم نظر پہنچی ہیں۔ آج اپنے ناظرین کے اضافۂ معلومات کے لئے اس کے کچھ حالات پیش کرتا ہوں

جمہوریہ ڈومینکی اور جمہوریہ ہیٹی دونوں جزیرۂ ہیٹی میں برابر کے شریک ہیں۔ اس جزیرہ کے مغرب میں کیوبا اور مشرق میں پورٹو ریکو واقع ہے۔ لیکن اس مجموعہ جزیرہ کی آبادی کا تقریباً ⅓ حصہ باشندگان سینٹو ڈومنگو پر مشتمل ہے۔ اس جمہوریہ ڈومینکی کا صدر جنرل رفائیل لیونیڈاس ٹروجلو مولینہ ہے۔ جس کی عمر چوالیس سال سے کسی طرح کم نہیں۔ اس جنرل کے اعزاز میں شہر ڈومنگو کا نام بدل کر شہر ٹروجلو کر دیا گیا ہے۔ ۱۹۳۵ء کے اعداد و شمار کے مطابق جمہوریہ کی آبادی پندرہ لاکھ ہے۔ جس میں یورپی، افریقی، ہندوستانی اور شامی تمام اقوام شامل ہیں۔ یہ لوگ عام طور پر ہسپانوی زبان بولتے ہیں سرکاری زبان بھی ہسپانوی ہے۔ یہاں کے لوگ پاپائیت کے قائل ہیں۔ ہیٹی کی آبادی پچیس لاکھ ہے سنہ ۱۹۱۶ء تا ۱۹۲۴ء تک ڈومینکی جمہوریہ اور ہیٹی دونوں ریاستہائے متحدہ امریکہ کے بحری جہازوں کے قبضے میں تھے۔ لیکن اب وہاں بھی دوایوانی حکومت (سینیٹ کونسل اور اسمبلی) کا دور ہے۔ مگر سیاسی رہنما جو اس نام نہاد جمہوریت کے کرتا دھرتا ہیں۔ اتفاقیہ طور پر ہی انتخاب کی زحمتیں گوارا کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ کا الیکشن دائمی صورت رکھتا ہے شاید یہاں قہوہ بکثرت ہوتا ہے شکر سازی عام صنعت ہے۔ اکثر جگہوں پر معدنیات کے بیش بہا خزانے بھی ہیں)

راحت

وسط اکتوبر میں مجھے ایک امریکن کا خط ملا۔ جو سینٹو ڈومنگو سے آیا تھا۔ اس میں اس نے واقعات کے خوفناک قتل و غارت کی تفصیل لکھی تھی۔ جہاں ڈومینکی فوج اور پولیس شراب کے نشہ سے مدہوش ہو کر امن پسند ہیٹیوں (Haitians) پر جن میں مرد، عورت، بچے، جوان اور بوڑھے سب ہی شامل تھے۔ حملہ آور ہوئی۔ اور سخت وحشیانہ طریقوں سے تقریباً پانچ ہزار جانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس خط میں اس امر کا اظہار بھی تھا کہ کاتب نے بچشم خود ان گاڑیوں کو دیکھا ہے۔ جن سے خون ٹپک رہا تھا۔ اور جن کے اندر مقتول لاشیں اس سمندر کی طرف لے جائی جا رہی تھیں۔ جہاں شارک مچھلیاں ان کو اپنی خوراک بنانے کے لئے ساحل والوں کی عنایتوں کی منتظر رہتی ہیں۔ ہزاروں لاشیں اوپر تلے چنی گئیں اور اس کے بعد ان پر آتش گیر مادہ ڈال کر آگ لگا دی گئی۔ یہ ڈھیر کئی کئی روز تک اپنی بدبو اور اپنی روشنی سے اردگرد کی فضا کو متعفن و متوحش کئے رہے۔ یہ جرائم صرف سرحدی علاقوں ہی میں رونما نہیں ہوئے۔ بلکہ تمام ڈومینکی جمہوریہ میں اکتوبر کے شروع ہفتے میں ان کا ارتکاب ہوا۔

سب سے بڑی حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اس ظلم و استبداد کی کوئی اڑتی ہوئی اطلاع بھی امریکن پریس کو نہ پہنچی اور معاملہ ڈومینکی جمہوریہ کے اندر ہی اندر یک لخت گول کر دیا گیا۔ جرم کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے یہ کس طرح یقین نہیں آتا کہ خود کیریبی اخباروں کا "اخبار و اطلاعات" کا صفحہ ناکافی تھا۔ اس لئے قدرتاً میں اس نتیجہ پر پہنچا۔ کہ ہیٹی اور ڈومینکی جمہوریہ کے مابین کوئی ایسا غیر معمولی حادثہ وقوع پذیر ہو گیا ہے جس سے کاتب خط اپنے جذبات کی شدت کو ضبط نہ کر سکا۔ اور اس نے جذباتی رو میں ایک معمولی سے واقعہ کو اس قدر زبردست اہمیت دیدی۔

کچھ دنوں بعد نیو یارک کے ہسپانوی زبان کے پریس میں میں نے یہ خبر پڑھی کہ ہیٹیوں کی ایک کافی تعداد کو ڈومینکی کاشتکاروں نے قتل کر دیا ہے۔ اس کا مطلب صرف ایک ہو سکتا تھا۔ اور وہ تھا سرکاری سازش حکومتی اشتراک۔ کیونکہ جنرل ٹروجلو مولینہ کی آمریت اس قدر منظم باقاعدہ

---

[۱] جنوبی امریکہ، وسطی امریکہ، کیوبا اور مغربی جزائر ہند سے گھرے ہوئے بحر اوقیانوس کے ایک حصے میں کئی جزائر واقع ہیں۔ ان کو جزائر کیریبی کہا جاتا ہے۔ ان جزائر میں کیوبا، ہیٹی، سینٹ ڈومنگو، پورٹو ریکو، جمیکا (ٹرینیڈاڈ)، سینٹ لوسیا اور ڈومینیکا بہت نمایاں اور اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ (راحت)

ہے کہ کوئی ڈومینیکن بغیر سرکاری رضامندی کے معمولی سی بھی انگشت نمائی نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی کوئی ڈومینیکن سوائے اراکین فوج و پولیس کے اپنے پاس ہتھیار رکھ سکتا ہے۔ اس خبر کے شائع ہونے کے بعد دوسرے اخباروں میں بھی اس کا چرچا ہونے لگا۔ اور اس طرح سینٹوڈومنگو سے چاروں طرف اطلاعات پھوٹ پڑیں

۱۰ نومبر ۱۹۳۷ء کو نیویارک ہیرلڈ ٹریبون کے اول صفحہ پر بڑی موٹی موٹی سرخیوں کے ساتھ اس وحشیانہ قتل و خون کی پوری تفصیلات شائع ہوئیں۔ ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ کس طرح بچوں کو نیزوں پر اچھالا گیا۔ عورتوں کو موت کی نیند سلایا گیا۔ اور مردوں کو خنجر بھونک بھونک کر جان سے مارا گیا۔ ان تمام تفصیلات کی تصدیق ان ہزاروں اور لاکھوں مصیبت زدہ ہیٹیوں سے ہوئی جو ڈومینیکن فوج کے اس وحشیانہ ظلم پر اپنی اپنی جانیں لیکر بھاگ گئے تھے اور کسی طرح ملک کی سرحدوں تک پہنچ کر خود کو بچا سکے تھے۔

یہ خوفناک قیامت صغریٰ ان لوگوں کے لئے شاید تعجب انگیز نہ ہو جو دنیا کی سیاست سے کچھ واقفیت و وابستگی رکھتے ہیں۔ اور جانتے ہیں کہ قریباً ۶ سال سے جب سے کہ ٹروجیلو بر سر اقتدار ہوا ہے سینٹوڈومنگو میں کیا کیا حشر برپا ہو چکے ہیں۔ اس کے زمانہ حکومت میں قتل و غارت، اور بربریت و استبداد کی ایک ایسی مثال قائم ہو چکی ہے۔ جس نے عہد قدیم کی بہت سی داستانوں کو دماغ سے محو کر دیا ہے۔ صرف امریکہ ہی نہیں، شاید دنیا بھر کی تاریخ میں اس سے زیادہ ظلم و ستم کی مثال نہیں مل سکتی یہاں ہلاکو اور چنگیز خاں کی بدنام عالم خون آشامیاں بھی مات ہیں نپولین اور نادر شاہ کے تاریخی حملے بھی حقیقت میں اور ابدالی اور منگولوں کی مشہور داستانیں بھی افسانہ بنکر رہ جاتی ہیں۔

ہسپانوی امریکی جنگ کے خاتمے سے لیکر ۱۹۱۴ء تک جو زمانہ گذرا ہے وہ امریکی ادب میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس وقت کا جذباتی و افسانوی ہیرو ہے۔ اس کا پلاٹ بہت سادہ ہوتا تھا۔ بدمعاش کسی ایسے آمر کو بنا دیا جاتا تھا جو چھوٹے سے قد کا ہو۔ اس کے سر پر بڑا سا ہیٹ رکھا ہو، مونچھیں تنی ہوئی اور ہاتھ میں چمکتی ہوئی تلوار لٹکی ہو۔ کچھ خطابات بھی پائے ہوں، جوڑا بھی تمغات سے بھی مزین ہو جہالت کوٹ کوٹ کر بھری ہو، حرص، ظلم، بدی اور انتہائی مکاری کا نمونہ ہو ہمارے چھوٹے رڈیارڈ کپلنگ ان جوانمردوں کی ستائش کرتے تھے جو نیلے لباسوں میں قسمت کو آزماتے، ملیریا اور وحشی جانوروں کا مقابلہ کرنے اور دشمنوں کی گولیوں کو بچوں کی سی بےفکری اور ہنسی خوشی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے سینوں پر کھاتے تھے۔ ہمارے بہادر اپنے ہموطن سست، کاہل اور بودے انسانوں کے لئے عجلت، باضابطگی، قاعدہ اور دلیری پیدا کرنے کا باعث ہوتے اور اپنے دشمنوں کو نہایت فیاضی و تحمّل کے ساتھ ہدایات دیتے۔ گویا اپنی بہادری، عجلت، خوش قسمتی، باضابطگی اور بہت سے سنہری بالوں والا ہیرو اپنے دشمنوں کی تمام چالبازیوں اور حیلہ تراشیوں پر غالب آتا۔ خطۂ بنات کی دختر عسل و چرب کو خطرہ سے نکالتا۔ اور اس طرح حسن و عشق اور عزت و دولت حاصل کرتا۔ اس عبارت میں جو سراپا ہے وہ جنرل ٹرولینہ ہی کا ہے۔

لیکن بعض اوقات حقیقت بھی ایسی ہی تعجب انگیز و حیران کن ہوتی ہے جیسے کہ افسانہ۔ اگر کوئی شخص رچرڈ ہارڈنگ ڈیوس کے متخیلہ و متصورہ معاملات کی اپنی دنیا میں صحیح مثال دیکھنا چاہتا ہے، تو وہ جنرل ٹروجیلو مولینہ کی ذات ہے جو اپنے ظلم و اقتدار کا پنجہ ایک برائے نام جمہوریہ سینٹوڈومنگو پر جمائے ہوئے ہے وہ ہماری افسانوی روایات کی ایک ترقی معکوس ہے۔ جس نے ہمارے کردار پر کبھی نہ مٹنے والا داغ لگا کر آنے والی نسلوں کے لئے ایک بدترین مثال قائم کر دی ہے۔ جس نے اپنی بہادری اور جواں مردی کو بزدلی اور نامردی میں تبدیل کر دیا ہے۔ وہ واقعۃً "عساکر کا سردار اعظم" ہے۔ لیکن یہ سردار اعظم وہ خطاب ہے، جو اس نام نہاد جمہوریہ کی کانگریس نے جس کا وجود جنرل مولینہ کے ہاتھ میں ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں۔ اس ظالم کی خدمت میں پیش کرکے گویا خود امتیاز حاصل کر لیا ہے اس کے علاوہ محسن الملک یونیورسٹی کا فاضل ومتبحر یعنی اعزازی فاضل "معاشیات و سیاسیات" اور ایک ایسی دفاعی کشتی جو جنگ سے کہیں پہلے وقتوں کی ہے، اور جس میں ایک بھونڈے سے عرشہ پر چند شکستہ گنیں بھی رکھی ہوئی ہیں: "امیر البحر" بھی ہے اور یہی نہیں بلکہ وہ ایسی تدبیریں بھی کر رہا ہے۔ جن سے وہ اس جمہوریہ کا صدر دوام —— (Life President) ہو جائے۔

اس نے نئی دنیا کی سب سے پرانی یونیورسٹی کے ساتھ ایک عجیب معاملہ کیا۔ اور اپنی عقل و فراست سے یہ فائدہ اٹھایا کہ اس دار العلوم نے یہ معاملہ شروع ہونے کے ایک ہفتہ بعد ہی اسکو معاشیات و سیاسیات کی اعزازی ڈگری سے نواز دیا وہ معاملہ یہ تھا کہ اس نے سینیٹر جیسی موٹا جونیز کا تمام علاقہ کاشت دس ہزار اسٹرلنگ کے عیوض میں خریدا، اور فوراً ہی ریاست کے ہاتھ ایک لاکھ اسٹرلنگ کا فروخت کر ڈالا۔ اس پر وزیر زراعت کمیرولن ٹینونے آمر کی اس پبلک سپرٹ کو سراہتے ہوئے لوگوں کو بتلایا کہ اس طرح اسقدر قیمتی قطعۂ اراضی دیکر ٹروجیلو نے جمہوریہ کی ترقی تعلیم زراعت کے لئے ایک آسانی بہم پہنچا دی ہے۔ تمام جمہوریہ ٹروجیلو کے لئے جذبات تشکر و امتنان کیساتھ اس کے اس عمل پر خوش تھی کسی کو یہ خیال تک بھی نہیں ہوا کہ ریاست کو دس ہزار اسٹرلنگ کی قیمت کی ایک چیز کے لئے ایک لاکھ اسٹرلنگ دینی پڑ گئی، ادا کرنے پڑے ہیں۔

ٹروجیلو کا نو سالہ لڑکا بھی جو اس کی پسندیدہ و محبوبہ عورت کے بطن سے ہے طفلی کے زمانہ ہی میں فوج کا کرنل بنا دیا گیا۔ اور ایک کرنل کی پوری تنخواہ پانے لگی۔ چند سال گزرے کہ کانگریس نے جس کو دارالسلطنت میں ایک ... سے پہلے دریافت کرنے والے کے نام کی مناسبت سے کولمبس پکارا جاتا ہے۔ اسی ریمفس (Ramfis) کو ٹروجیلو کا لڑکا جو کرنل ریمفس کہا جاتا ہے "قابل ترین بچہ" (Illustrious child) کا خطاب دیا ہے۔ کانگریس کی تجویز کے الفاظ یہ ہیں کہ "اے یاران ہمعصر! یاد رکھئے وہ مردار ... خوش خلافی جس سے مقدونیہ کے فلپ اعظم نے قرونیہ کے میدانوں میں سکندر کا مقدس و متبرک شجر سدا بہار قبول کیا!" اور یہ کہ کس طرح "اس باپ کا دل اس ... باپ کا دل جس کی حب الوطنی، جس کے شعور و فراست، اور جس کے ... کے ہاتھوں میں ہماری جمہوریہ کی قسمت دے دی گئی ہے۔ ہماری ... نذر نثار سے متاثر ہوگا۔ جو ہم نے اس لڑکے کی خدمت میں پیش کی ہے؟"

ٹروجیلو نے اپنے نام کا ایک بالکل نیا صوبہ قائم کیا ہے، اور ملک کے سب سے بڑے شہر کا نام بدل کر اپنے نام پر رکھا ہے۔ بہت سے پلوں اور دیگر رفاہ عامہ کے کاموں میں اس کا نام نظر آتا ہے۔ حالانکہ ان کی تعمیر کا تعلق اس سے بہت ہی کم ہے اور زیادہ تر اس کے زمانہ سے پہلے کے تعمیر یافتہ ہیں۔ تمام سرکاری ملازمین اور شہری باشندوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ اس کا ایک بت نصب کرائیں اور اس کے ذاتی استعمال کے لئے ایک عالیشان عمارت بنوائیں۔ سب بہت سے مستبد حکمرانوں کی طرح اس کو بھی اپنے ملک اور دیگر جمہوریت کا فی تحفات مل چکے ہیں، جو گویا اس کی عزت و حکومت کے اعترافات ہیں۔ یہ تحفات ایسے ہیں کہ شاید ان کا مقابلہ وہ انسان اپنے تحفات سے کبھی ... جو ہوش سنبھالتے ہی بنی نوع انسان کی بھلائی اور خدمت شروع ... اور مرتے وقت تک کرتا رہے۔

... چھوٹی سی گرم سلطنت کا خود غلط حکمران ایک ایسا انسان ہے جس میں خوف و خود نمائی کی کشمکش نے مل کر استبدادیت کا خطرناک ترین ... پیدا کر دیا ہے۔ جب وہ ملاقاتیوں کو حاضری کی اجازت دیتا ہے تو چار بندوقچی ہر آنے والے پر چھوٹی کلوں کی بندوقیں رجن کے لئے مترجم کے ... "کلندوقوں" کا بہترین لفظ وضع کیا جا سکتا ہے) تانے کھڑے رہتے ہیں۔ جاتے وقت ملاقاتی اس کی طرف پشت نہیں کر سکتے بلکہ ان کو پیچھے کی طرف چلنا پڑتا ہے۔ اس کو کسی کا اعتبار نہیں، وہ لوگ جو اس کے ذی ... صاحب اور سلطنت کے اعلیٰ مرتبت اراکین ہیں۔ یک لخت جیل میں ڈال دیئے جاتے ہیں۔ یا ان کے خاندان والے ان کو گھاس اور کیچڑ میں ... پاتے ہیں۔

چند سال ہوئے ایک ڈومی نیکی مرحوم لڑکی کی لاش ریاستہائے متحدہ سے وطن کو اس لئے بھیجی گئی کہ اس کو خاندانی قبرستان میں دفن کر دیا جائے لیکن یہاں یہ افواہ گرم ہو چکی تھی کہ اس لڑکی کی لاش میں کوئی سازشی اور بغاوتی تدابیر پوشیدہ ہیں۔ جن پر ڈومینیکی لوگوں کو عمل پیرا ہونے کی سخت تاکید کی گئی ہے۔ چنانچہ سمندری چنگی پر اس لاش کو اتروا لیا گیا۔ اور ان تدابیر کی تلاش لاحاصل میں اس لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوا ہوگا کہ ٹروجیلو کا شان و شوکت سے مضحکہ خیز عشق، احمقانہ تکبر اور بغاوت سے خوف کتنا محزون و تاریک پہلو رکھتا ہے۔

لیکن ان چیزوں سے قطع نظر اور بہت سی باتیں دلچسپ بھی ہیں۔ ہر اس شخص کو جو زندہ رہنا چاہے انتہائی چاپلوس اور خوشامدی بننا پڑتا ہے اور وہ خوشامد اور چاپلوسی جو سچا درد ملت رکھنے والوں اور قوم کے صحیح ہمدردوں کی دل شکستگی اور ان کے نازک احساسات کو مجروح کرنے کا باعث ہو دیگر حلقوں میں لطف و انبساط پیدا کرتی ہیں۔ بعض اوقات تو یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ بنی نوع انسان کی ساری تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسی مافوق البشر ہستی ہوئی ہے جس کی اس طرح ڈالی کھینچی ہو۔ ان لوگوں میں جن کے بظاہر ٹروجیلو کی خدمت میں غیر معمولی عز و وقار کے تحائف پیش کرنے اور بے انتہا تعریفوں کے پل باندھنے کا ناخوشگوار فرض سپرد ہوا ہے وہ بدنصیب، سابق صدر آرک بشپ نوئل بھی ہے جس کو ایک مرتبہ امریکی حلقۂ سیاسیات کے دباؤ پر یہ عہدہ مل گیا تھا۔ سب سے آخری انتخاب صدارت کے موقعہ پر جو نشانات لوگوں میں تقسیم ہوئے تھے۔ ان پر "خدا اور ٹروجیلو" کے الفاظ کندہ تھے۔ اور اس روز سے تمام اخبارات کچھ اس انداز سے جو سابق قیصر کے دل میں بھی رشک و حسد کی آگ بھڑکا دے۔ ہمیشہ "ٹروجیلو اور خدا" کے جملہ کا اظہار کر رہے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ڈومینیکی پریس کا روزانہ مطالعہ بنی نوع انسان کی مجبورانہ بے عزتی و کم قدری کی تعلیم کے مترادف ہے۔ وہ اخبارات جو آج اپنی زندگی قائم رکھنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اس امر کے لئے مجبور ہیں کہ ہر اشاعت کے سب سے پہلے صفحہ کو سیاہ جھنڈے کے نشان سے آراستہ کریں اور اس میں اس امر کی ہر ممکن تعریف کے راگ گائیں۔

ہیٹیوں کے اس قتل و خون سے بہت پہلے ٹروجیلو کے سیاسی دشمنوں اور ان لوگوں نے جو ہزاروں کی تعداد میں دنیا کے دیگر بہت سے حصص میں جلاوطنی کی زندگی گذار رہے ہیں۔ یہ اعلان کیا تھا کہ ان مقتولین کی تعداد جو اس آمر کی وحشت و بربریت کا شکار ہو چکے ہیں، کئی ہزار تک پہنچتی ہے۔ ان مقتولین میں وہ ڈومینیکی بھی شامل ہیں۔ جو آسمان ادب و صحافت کے آفتاب ... دنیائے ... بیچارے

قیدی برسوں سے جیلوں میں بند پڑے ہیں۔ یونی سس حیورا تک جس نے ملک پر انتہائی تعقدہ تخلیق حکومت کی تھی۔ اور آخرکار ۱۹۶۱ء میں قتل کر دیا گیا تھا کبھی ان انتہائی غارت گری و جان کشی کے اعمال کے ارتکاب کی جرأت نہ کر سکا تھا جو آج ٹروجیلو کے بیٹے بچوں کا کھیل بنے ہوئے ہیں۔ اور نہ ہی اس کے خلاف اس قدر غم و غصہ اور نفرت کا اظہار کیا گیا تھا۔ اس طویل طویل فہرست میں جو جمہوریہ ڈومینیکن کے باشندوں کے خون سے رنگی ہوئی ہے اور جس کے تھوڑے سے حصے کے اظہار کی کوشش اس مضمون کے دامن سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ ملک کے نادرِ روزگار بڑے بڑے صحافت داں اور مشہور شعراء بھی شامل ہیں۔ ان کا قصور صرف اتنا تھا، کہ وہ آمر کے مدح خواں نہ تھے اور اس پر اعتراضات کرتے تھے یا اس کے خلاف لوگوں کے دلوں میں عدم اطمینان کا احساس پیدا کرتے تھے۔ اس فہرست میں وہ لوگ بھی ہیں۔ جو حکومت سابقہ کے معتمد عہدیدار اور معتبر امراء تھے۔ اور جنہوں نے موجودہ حکومت میں پیش پیش حصہ لینے میں یا تو کوتاہی سے کام لیا یا نہایت وفاداری سے شریک رہے۔ دونوں کا انجام ایک ہی ہوا۔ مزید اس فہرست میں وہ کاشتکار و زمیندار بھی ہیں، جنہوں نے سپاہیوں کے اس عمل پر کہ وہ ان کے مویشی اور فصل چرا لیتے ہیں، اور حکومت کے اس اقدام پر کہ اس نے ان کی جائدادیں ضبط کر لی ہیں، کچھ بھی اعتراض کیا۔ گو یا ہر دو افعال قانوناً ناجائز ہیں، ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا موت کو دعوت دینا ہے یہیں پر بس نہیں بلکہ اس خونیں فہرست میں ان طالب علموں اور استادوں، ان کاروباری لوگوں اور سوداگروں، غرض کہ ہر پیشہ اور ہر درجہ کے لوگوں کے نام بھی نظر آتے ہیں، جن کے اندر تھوڑا سا بھی جوش اور ذرا سی بھی صداقت تھی، ان سب لوگوں کا جرم صرف اتنا تھا۔ کہ وہ نئی حکومت کے خلاف لوگوں کو بھڑکاتے تھے۔ اور اس کے مظالم کو بخوشی نہیں قبول کرتے تھے

ایک سرکاری خفیہ مسلح اور سخت دل گروہ جس کا نام لا ۴۲ اسواسٹے رکھا گیا ہے۔ کہ اب سے قبل وہاں ایک بیالیسواں امریکی بحری دستہ فوج تھا، جس نے سینٹو ڈومنگو میں اپنے اعمال و افعال کی ایک تلخ ترین یادگار چھوڑی ہے۔ صرف اس کام کے لئے مقرر ہے۔ کہ وہ لوگوں کی مار پیٹ کرتا ہے تاکہ کوئی سرکش نہ ہو سکے۔ جن لوگوں پر حکومت کے دشمن ہونے کا معمولی سا بھی شبہ ہو ان کو لاپتہ کر دے۔ اور زیادہ مشکوک لوگوں کو بے تکلف قتل کر ڈالے مشہور شاعر و جیلیو رینا اور اس کی بیوی کا افسوسناک قتل وہ سیاہ ترین عمل ہے جس نے ہسپانیہ اور تمام لاطینی امریکہ میں غم و غصہ کی آگ بھڑکا دی ہو جیلیو جو اپنی حب الوطنی، وسیع النظری، صاف گوئی اور صحافتی بلندی کے لئے عالمگیر شہرت کا مالک تھا۔ اسے اس قتل سے بہت پہلے بحالت قید جیل ہی میں دق

کا شکار ہو چکا تھا۔ واضح رہے کہ اس وقت اس کو اس امریکی بحری دستہ فوج نے گرفتار کیا تھا جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اس کو اور اس کی بیوی کو نہایت بے دردی سے گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ اس سے چند سال پہلے تقریباً چھ سو ڈومینیکن کاشتکاروں کو موکا اور پورٹو پلاٹا کے صوبے میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ان بیگناہوں کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے بڑے بڑے شکر سازی کے اداروں کو اپنی اراضیات غصب کر لینے سے روکا تھا۔ ان کے علاوہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے۔ کہ کئی ہزار اور قیدی بھی تہ تیغ کر دیئے گئے، ہزاروں کو ناقابل برداشت اذیتیں دی گئیں، اور لاکھوں کو نگوا کی جیل کی کال کوٹھڑی میں جلا کر مار ڈالا گیا۔

کیوبا اپنے سردار گراؤسن مارٹن کی قیادت و ماتحتی میں سینٹو ڈومنگو سے تعلقات منقطع کرنے پر مجبور ہو گیا، کیونکہ وہاں کے باشندوں کے ساتھ بھی برا سلوک کئے گئے تھے۔ ٹروجیلو کے مقتول ملازمین میں دو پورٹو ریکی بھی تھے اور بڑی بڑی بدکلامیوں اور پر ذلت توتو میں میں کے بعد ان مقتولین کے چند رشتہ داروں کو ریاست کی تاخیری امداد حاصل ہو سکی تھی۔ گو اس امداد کا کوئی خاص اثر و نتیجہ نہیں ہوا۔ تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ تقریباً پچاس عورتوں نے ایک نہایت خوشامدانہ عرضداشت تیار کی، اور اس میں آمر سے اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کی رہائی چاہی۔ اس عرضداشت کے لفظ لفظ سے ان غمگین و الم ناک روحوں کی دردآمیز اور حسرت بھری حالت ٹپکی پڑتی تھی، جنہوں نے اپنی جگر دوز اور زہرگداز آہوں کے پہلو بہ پہلو ایسے جملے بھی استعمال کئے تھے۔ جیسے انتہائی دور اندیش نکتہ بیں سیاس۔ جواں مرد بہادر حکمراں ــــ مافوق البشر وغیرہ وغیرہ۔ پھر بھی ان قیدیوں کو آزاد نہیں کیا گیا۔ اور اس پر مستزاد یہ ہوا کہ دستخط کنندگان میں سے بہت سی عورتوں کو جو بہنیں تھیں، قتل کروا دیا گیا

ٹروجیلو کا عروج :- ٹروجیلو علاوہ اور باتوں کے دراصل طائفیت ذہنی عسکریت اور امریکی بحری قوت کی تخلیق ہے۔ سب سے پہلے اس نے اور اس کے بھائیوں نے مل کر ایک گروہ قائم کیا۔ جو سارے علاقے میں اپنی شرارتوں اور بدکرداریوں کی وجہ سے بدنام ہو گیا۔ اس گروہ کو Pandilla da Pepits کہتے تھے۔ اور ٹروجیلو چپیتہ (Chapita) کے نام سے مشہور تھا، اس کے جلاوطن مخالفین اس کو اب بھی اسی نام سے پکارتے ہیں۔ اس نے اور اس کے بھائیوں نے جو اب ریاست کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں، بہت سے موقعوں پر قانون شکنیاں کیں، اس کے دو سوانح نگاروں گوٹے اور سانشیز کے اقوال کے مطابق ٹروجیلو نے ۱۹۱۶ء میں سان کرسٹوبل کے سرکاری ڈاک خانہ سے تمام سرکاری روپیہ چرا لیا۔ اور ایک عرصہ تک سینٹ طاس میں خفیہ اور جلاوطنی کی ی

سے گزرتا رہا۔ یہاں تک کہ صدر کاسیرز کے خلاف بغاوت کے وقت آگے بڑھنے کا موقعہ مل گیا۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد وہ اور اس کا بھائی لزائیل دونوں مویشی چرانے کی کوشش میں گرفتار کر لئے گئے۔ ۱۹۱۸ء میں اس نے ایک آقا کی طرف سے چیک پر جعلی دستخط کر دیئے جس کی پاداش میں اس کو چھ ماہ کی سزا بھگتنی پڑی۔

رہائی کے بعد اس نے نیشنل گارڈ میں شرکت کر لی یہ گارڈ امریکی دخل کاروں نے خفیہ اطلاع رسانی کے لئے قائم کیا تھا۔ اس نے اپنی اس نئی جگہ سے فائدہ اٹھا کر بہت سے خلاف قانون قمار خانوں اور عیش گاہوں کی حفاظت کے عوض میں کافی روپیہ وصول کیا۔ لیکن کچھ ایسے اسباب کی بنا پر جو معرض تحریر میں نہیں لائے جا سکتے، اور جن کی وجہ سے وہ ایک امریکی افسر کے مقاصد کے حصول میں بڑا کارآمد ثابت ہوا اسی امریکی افسر نے اس کو بچانے کی کوشش کی تھی، وہ ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔

کچھ عرصہ تک وہ سن آندریز کے مرکز شکر سازی کے گارڈ میں کام کرتا رہا لیکن پھر اس نے نیشنل گارڈ میں ایک معمولی رنگروٹ کی حیثیت سے شرکت کر لی۔ وہ ابتدا ہی سے بے رحم و مستعد تھا۔ اور یہاں اس نے بہت جلد ترقی شروع کر دی، وہ اپنی سنگدلی، ڈاکہ زنی کے باعث رسوا ہو چکا تھا، کئی مرتبہ اس کے بالا دست افسروں نے اس پر زنا اور چوری کے الزامات لگائے لیکن ہر دفعہ مذکورہ بالا امریکی افسر اس کا معاون ثابت ہوا

امریکی بحری فوج کی واپسی کے بعد ٹروجیلو بدستور نیشنل گارڈ میں کام کرتا رہا اور اپنی چالبازیوں سے ترقی کے زینہ پر چڑھنے لگا۔ اس نے اپنے ایک افسر کو اس کے ہی ایک غضبناک ملازم سے بہکا بہکا کر قتل کروا دیا۔ ایک دوسرے افسر کو چند دستاویزات کے جھوٹے اور جعلی ہونے کی سزا میں نکلوا دیا۔ ان دستاویزات میں ٹروجیلو کو ایک انقلابی سازش کا شریک کار بتلایا گیا تھا اس طرح آہستہ آہستہ قدم بقدم وہ نیشنل گارڈ پر اپنے پورے پورے اقتدار کے لئے راستہ صاف کرتا رہا۔ اس کے یہ خواب بغیر تعبیر کے نہ رہے چنانچہ اس گارڈ کی حکومت اس کے ہاتھ میں آتے ہی اس نے اس کا نام نیشنل آرمی عسکر قومی رکھا۔ اور پھر اس عسکریت کے پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا جس کو امریکی حکومت نے اٹھا دیا تھا۔

ڈاس کمیشن کی ۱۹۲۹ء تحقیقات پر ڈاس کمیشن کا ایک ممبر امریکہ کا موجودہ انڈر سیکرٹری آف سٹیٹ سمنر ولیس بھی تھا۔ ملک کی مالی حالت کو درست کرنے اور نئے امریکی قرضہ کی بنیاد رکھنے کے لئے عمل کیا گیا۔ اس امر کی کوشش کی گئی کہ فوج کو مبالغہ آمیز اخراجات، اور ٹروجیلو کے زیر انتظام قیمتوں کی زیادتی اور کثیر روپے کی ضبطی کی وجہ سے ایک سرے سے اڑا ہی دیا جائے۔ اگرچہ کمیشن کی آخری رپورٹ میں کسی مخصوص الزامات کا اظہار نہیں کیا گیا۔ تاہم فوج کے اخراجات کو کم کرنے پر زور دیا گیا۔ بہت سے افسروں کو جن میں کپتان بائز بھی شامل تھا جزیرے سے اپنی جانیں بچا کر بھاگنا پڑا۔ کیونکہ انہوں نے کمیشن سے اصل واقعات چھپانے سے انکار کر دیا تھا۔ اور کمیشن کی کوششیں کو ناکام بنانے کی بھی سعی کی تھی۔ تحقیقات میں بہت سی عجیب عجیب باتوں کا انکشاف ہوا مثلاً یہ کہ فوج کے کپڑے دھونے کے کارخانہ کا انتظام ٹروجیلو کی ایک رشتہ دار کرتی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ قدرتاً زیادہ شرح پر یہ کام کرتی ہوگی فوج کے رجسٹروں میں بہت سے ایسے بیکار آدمیوں کے نام بھی درج تھے، جو تنخواہ تو پوری پاتے تھے لیکن جنہوں نے کبھی بندوق کاندھے تک پر نہیں رکھی تھی۔ ۱۶ اسٹرلنگ میں سے جو ایک سپاہی کی معینہ تنخواہ تھی، یہ اندازہ کیا گیا کہ آٹھ سے دس اسٹرلنگ تک ٹروجیلو کی جیب میں چلے جاتے تھے۔ وہ سپاہی جنہوں نے کبھی اس عمل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی یا تو حفاظت خانے میں بھیج دیئے جاتے تھے یا غائب ہو جاتے تھے۔

فوج کو اڑا دینے کی کوشش سے افراتفری پیدا ہو گئی۔ ڈاس کمیشن نے اپنی نافہمی کی وجہ سے گو ان کی کوششوں میں کسی قسم کی غداری یا بے ایمانی کا شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس وقت کی حکومت واسکویز کے لئے قبر کھود دی فروری ۱۹۳۰ء میں ٹروجیلو نے تمام فوج کی معیت میں بغاوت شروع کر دی رفائیل اسٹریلا اربینا کو کٹھ پتلی کی طرح وقتی صدر کی حیثیت سے اس وقت تک قائم رکھا گیا۔ جب تک کہ ایک خاص قسم کا فوج کے زیر اثر الیکشن ہو۔ اور اس میں ٹروجیلو کو کرسی صدارت دے دی جائے۔ چنانچہ یہی ہوا، اس کے بعد اسٹریلا اربینا نائب صدر بنا دیا گیا۔ اس انتخاب صدارت میں سب سے زیادہ پرلطف بات یہ تھی کہ ٹروجیلو کو مندرجہ فہرست رائے دہندگان سے کہیں زیادہ ووٹ ملے، شاید شیطان کی ذریات بھی اپنی رائے دینے آئی ہوں عدالت العالیہ کے ایک جج نے جب ان انتخابات کو خلاف قانون و فاسد قرار دیا تو اس غریب پر اسقدر مصائب آئے کہ آخر کار اس کو وہاں سے جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ حال ہی میں فرمانبردار و مطیع اربینا کو بھی آمر کی خونیں اغراض روکنے کی کوشش کی وجہ سے اپنی جان کی خاطر جزیرہ کو خیرباد کہنی پڑی۔

عسکری حکومت: ٹروجیلو نے اسی فوج کے ذریعہ سے جو باشندگان کی حفاظت کے لئے تیار کی گئی تھی۔ اور جس کو نیشنل گارڈ یعنی قومی محافظ کا نام دیا گیا تھا۔ ہر مخالف کا سر کچلا، اور آج بھی اسی طرح کچل رہا ہے۔ ضبطی اور اجارے جو کہ اس وقت تک صرف عسکری حلقوں ہی کی نمایاں خصوصیت تھی، اب قومی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ ٹروجیلو نے اپنے اس بلند مرتبہ اور

اپنی اس اعلیٰ حیثیت کو اپنی ذاتی امارت و دولت کے لئے استعمال کیا ہے وہ خود یا اس کے عزیز ہر قسم کے کھانے اور دیگر ضروریات زندگی کی رسد کے اجارہ دار ہیں۔ بوچڑ خانوں میں ٹروجیلو کے سوا کوئی اور شخص مویشی فروخت نہیں کر سکتا۔ تمباکو اور اس کی قسموں کی تجارت کلیتہً اسی کے ہاتھوں میں ہے اسکے پاس تمام ریشمی کپڑے کا اجارہ ہے۔

ڈومنیکا میں زندگی گزارنا اسقدر گراں ہو گیا ہے کہ معمولی معمولی اجناس تک کی خفیہ درآمد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے حال ہی میں ایک بہت بڑے غیر ملکی بنک کے خلاف انالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ کیا گیا تھا کیونکہ اس نے ملک میں کچھ ایسے قرضے جمع کرنا شروع کئے تھے۔ جن میں ٹروجیلو خود شریک تھا۔ بڑی بڑی جاگیروں کی ضبطی کی بھی عجیب عجیب داستانیں مشہور ہیں۔ امریکی کاروباری اداروں کے ایجنٹ اور ناقدین ٹروجیلو کی ذاتی تجارت کا مقابلہ کرنے کی سزا میں جیلخانے بھیجدیئے گئے۔ ان پر سیاسی سازش کا الزام لگایا گیا۔ اور کبھی ان کی عرض و معروض اور ان کے مقدمہ کی سماعت نہیں کی گئی۔

آخری ترتیب و ترمیم ہوکر امریکی بحری فوج ہٹنے کے وقت ۱۹۲۴ء میں تیار ہوئی تھی۔ اس کے مطابق جمہوریہ پر تقریباً دو کروڑ اسٹرلنگ بیرونی قرضہ جات تھے جن میں سے ساڑھے پانچ فیصدی ایسا سونا تھا جس کے سود سے یہ قرضہ ادا کیا جاتا۔ یہ قرضہ ۱۹۳۲ء ۱۹۴۲ء میں بشرح ایک سوا ایک فیصدی واجب الادا ہو جاتا ہے۔ صدر ریاستہائے متحدہ کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ محصولات جنگی ہر قسم کے جمع کرنے کے لئے اپنا آدمی مقرر کرے تاکہ ادائیگی کی ضمانت ہو سکے۔ اصل پر ادائیگی ۱۹۳۰ء تک شروع نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن اس سال ٹروجیلو برسر اقتدار ہوا۔ اور روپیہ ادا کرنے سے معذور رہا۔ اور مزید دو سال تک روپیہ ادا کرنے کا اعلان کیا۔ حکومت ہو اس سے رضامند اور اس سے متفق الرائے ہو گئی۔ لیکن پھر ۱۹۳۲ء میں مزید چھ ماہ کی توسیع دیدی گئی۔ حال ہی میں دستاویز داروں سے ایک معاہدہ ہوا ہے جس کی رو سے سالانہ ادائیگی کو بہت ہی کم کر دیا گیا ہے۔ اور محصولات جنگی پر امریکی تصرف مزید ۱۴ سال کے لئے بڑھا دیا گیا ہے۔

اصل مہلت مانگنے اور دیئے جانے کے اسباب کمزور نہ تھے عالمگیر کساد بازاری کیوجہ سے ڈومینیکی شکر، قہوہ اور تمباکو کی صنعتوں کو بڑا نقصان پہنچا تھا۔ ۱۹۳۰ء کے خوفناک طوفان باد نے جزیرہ کے کافی حصہ کو بری طرح برباد کر ڈالا تھا۔

ہیٹیوں کا قتل بظاہر دو وجوہ کی بنا پر معرض وجود میں آیا ہے اولاً آسمان سے نئے انتخاب کا قرب۔ باوجود ٹروجیلو کی فولادی حکومت کے سازش و بے اعتمادی اور اس کے خلاف بغاوت کے امکان کی افواہیں روز بروز گرم ہوتی جا رہی ہیں۔ ٹروجیلو غیر ملکی مشکل کو دبا کر ملکی نفاق دبانا چاہتا ہے۔ یہی وہ عقل مندانہ طریقہ ہے۔ جس پر چند سال ہوئے پیرو کے وحشی آمر سانشیز سیرو نے عمل کیا۔ جب کہ اس نے لیٹیشیا کی گھری سہ کو کولمبیا کے سر تھوپا۔ یہ ہی وہ ہوشمندانہ فن ہے۔ جو اسی ملک بنا و دیں کام میں لاتا ہے۔ اور اکوئیڈر میں ہمیشہ کون و فساد کی آگ سلگتی رکھتا ہے اور یہی وہ زیرکانہ تدبیر و شعور ہے۔ جس پر یورپی آمرین عمل پیرا ہیں جو عوام الناس پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لئے ہمیشہ پڑوسی ملکوں کے خلاف تلواریں بلند کرتے رہتے ہیں ٹروجیلو ارادۃً قریب قریب صدر ورگس کی برازیل والی مثال کی تقلید کرتا اور فاشیت کے اصول کے مطابق خود کو مستقل آمر قرار دینا چاہتا ہے۔ ہیٹیوں کے قتل سے یہی نہیں ہوا کہ ملک کی توجہ جنگ کے امکانات کی طرف رجوع ہو گئی۔ بلکہ اس نے ڈومینیکیوں کو یہ بھی یاد دلا دیا کہ ٹروجیلو کے عہد حکومت میں معمولی سی مخالفت بھی خون و آتش میں غرق کر دیجائے گی۔

دوسری وجہ قتل ٹروجیلو کے جرمنی سے سریع الاثر اور عملی تعلقات کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ تمام جنوبی آمرین چاہے وہ ریاستہائے متحدہ کو کتنی ہی دوستی کے فریب کیوں نہ دیں۔ اور روزولٹ کے جمہوری خیالات کی کتنی ہی حمایت و تائید کیوں نہ کریں۔ لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ وہ لوگ تمام جمہوریت پسند خیالات کو اپنے وجود اور اپنی قوت و حکومت کے لئے خطرناک ترین بدعات سمجھتے ہیں سو اگر وہ ایک طرف ریاستہائے متحدہ سے خندہ پیشانی کے ساتھ آتے ہیں۔ تو دوسری طرف جرمنوں اور اطالویوں اور اکثر جاپانیوں سے بھی خفیہ گفت و شنید کے سلسلے قائم رکھتے ہیں۔ ٹروجیلو کے جرمنی سے تعلقات متواتر روز بروز مستحکم ہوتے جا رہے ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہٹلر کی حکومت سینٹو ڈومنگو پر ایسی نظریں ڈال رہی ہے۔ جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اس کو کسی بین الاقوامی آویزش و کشاکش کے وقت سینٹو ڈومنگو کو، جو کہ نہر پناما کے قریب واقع ہے ایک دوستانہ جنگی اساسی بنیاد بنا لینے کے امکانات نظر آ رہے ہیں۔ ٹروجیلو نے حال ہی میں جرمنی سے سرحد ہیٹی پر چالیس ہزار جرمنوں کو آباد ہونے اور کاشت اور دیگر ضروریات کے لئے آراضیات دینے کے معاہدہ کی تکمیل کی ہے ان ہیٹیوں میں جو قتل کئے گئے ہیں، بہت سے وہ ہیٹی بھی تھے۔ جو ان آراضیات پر اپنا قبضہ و دخل جمائے ہوئے تھے۔ جو ٹروجیلو جرمن بسنے والوں کو دینا چاہتا تھا۔

بدقسمتی سے ٹروجیلو کی تمام حرکات و سکنات اور اس کے تمام

...ن ر خلل، روزولٹ کی ان تمام کوششوں پر جو وہ مغربی نصف ... رہ میں جمہوریت، امن اور غیر طرفداری کی موافقت اور ترویج میں ... میں لا رہا ہے ایک ضرب کاری ثابت ہوتے ہیں۔ نرد جلو در اصل ... نازی تحریک کی مزید توسیع کی نیابت کر رہا ہے۔ برلن، روما کا محور ... اب جاپان کی شمولیت سے ایک مثلث کی شکل اختیار کر چکا ہے ایک ... نوکدار کونوں والا بھالا بنا ہوا ہے، اور یہ کانٹے روز بروز ان ممالک سوائے ... کے قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں، جنہوں نے ابھی تک برلن ... اور روما نے مستبد حکمرانوں کی ہیبت ناک بے پناہ قوت کو تسلیم نہیں ... کیا ہے۔

... حبش نے سیاسی حلقے میں بھی داستان قتل و خون کا اعتراف ... ہے۔ در اصل جنگ نہیں چاہتا۔ اگرچہ صدر ولسنٹ بذاتہ قریب قریب ایک آمر ہی کی حیثیت رکھتا ہے مگر اس نے فوجی تیاریوں پر روپیہ صرف نہیں کیا ہے۔ اس کے پاس قومی حفاظت کے لئے صرف ایک متحرک چھوٹی سی فوج ہے۔ جو کسی زبردست یا واقعی جنگ کے جدید سامان حرب سے بھی آراستہ نہیں اور شاید حفاظت کے لیے بھی ناکافی ہے۔ لیکن اگر قضیہ طول پکڑ ہی گیا، تو خیال کیا جاتا ہے کہ حبشی لوگ جو ذوتی ٹیکیوں سے تعداد میں کہیں زیادہ ہیں عنقریب یا بدیر تمام جزیرہ کو تہس نہس کر ڈالیں گے۔ اور اس پرانی حکومت کا جھنڈا گاڑ دیں گے۔ فی الحال حبش شاید ہر وہ معاوضہ قبول کر لے جو اس کو اس کے شہریوں کے قتل کے عوض میں دیا جائے اور جو بظاہر قابل قبول بھی ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ ترو جیلو نے جزیرہ پر ہونے والی جنگ کا بیج بو دیا ہے۔ اور شاید جمہوریہ ڈومی نیکا کے زوال اور اس کی موت کا بھی

اعتراف میں نے ترجمہ میں کافی تصرف سے کام لیا ہے اور وہ صرف اس لئے کہ زبان کی پیچیدگی سے کہیں مطلب خبط نہ ہو جائے اور اصل مقصد ضائع ہو۔ لیکن یہ تصرف ایک دو جگہ ہی کرنا پڑا ہے۔ باقی ترجمہ لفظی ہے۔ **راحت**

نوشتہ :- ایڈگرامین پو　　مترجمہ : سید موسیٰ کلیم

جنون

عصبی کمزوری۔ . . . ہاں یہ خطرناک حد تک بڑھ گئی ہے۔ لیکن جنون ؟ . . . . . . یہ آپ مجھ پر کیا الزام لگاتے ہیں۔ عصبی کمزوری نے میرے قوائے ذہنی کو کمزور نہیں، بلکہ ضرورت سے زیادہ قوی بنا دیا ہے . . . . . . اور قوت سامعہ . . . اس میں غیر معمولی ترقی ہوگئی ہے۔ کائنات بسیط اور فضائے بعید کی ہر آواز سے میرے کان آشنا ہیں۔ جنت کی سرود آمیز صدائیں اور دوزخ کی پرہول آوازیں . . . . میں نے سنی ہیں . . . . . . پھر . . . . پھر کیا آپ خود دیوانے نہیں ہیں، جو مجھے دیوانہ کہتے ہیں لو . . . . . . سنو . . . . . . سنو . . . . میں کسقدر متانت و سنجیدگی سے اپنی ساری داستان دہراتا ہوں . . . . ———

یہ بتانا میرے لئے قریباً ناممکن ہے۔ کہ کب یہ خیال میرے دل و دماغ پر چھا گیا۔ . . . . . لیکن ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ وہ دن اور رات ہاں . . . . دن اور رات . . . . ہر وقت میرے حواس پر مسلط ہوگیا تھا — کیا اس میں کسی خوفناک جذبے کو دخل تھا ؟ مطلق نہیں . . . . برخلاف اس کے مجھے اس بوڑھے سے محبت تھی، — اس نے کبھی مجھے نقصان نہیں پہنچایا تھا . . . . . . کبھی میری توہین و تضحیک نہیں کی تھی . . . . . اور آپ یہ بھی غلط سمجھ رہے ہیں۔ کہ مجھے اس کی دولت نے اندھا کر دیا تھا۔ . . . . . نہیں . . لیکن ایک چیز . . . خطرناک . . . . . . انتہائی خطرناک . . . . اس کی دھندلی بے نور آنکھیں تھیں . . . . . . جو گدھ کی آنکھوں سے بہت مشابہ تھیں . . . . اُف ! . . . . وہ خوفناک آنکھیں جن پر ایک مدھم جھلی چڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھی، اور جب کبھی ان آنکھوں سے میری آنکھیں لڑتیں۔ تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ وہ میرے سارے جسم کا خون سمیٹ کر میری آنکھوں کے راستے سے کھینچ لے رہی ہیں — اور کبھی . . . . . کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا۔ وہ میرے دل کو چھید رہی ہیں . . . . . ایک ٹیس — نامعلوم — خوفناک ٹیس میرے دل میں پیدا ہو جاتی تھی . . . . چنانچہ . . . رفتہ رفتہ . . . . . . میرے دل میں یہ خیال . . . . . . یہ ارادہ . . . . . یا یوں سمجھئے کہ یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ان آنکھوں سے . . . ان تیروں سے . . . . . . نجات حاصل کروں . . . . . جو میرے دل میں سوراخ کر رہی تھیں۔ ان آنکھوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نجات پانے کا ایک ہی طریقہ تھا، . . . . غریب بوڑھے کی جان . . . . . اور میں اس کے لئے تیار تھا۔ میں نے مصمم ارادہ کر لیا، کہ بوڑھے کا خاتمہ کر دوں — ہاں خاتمہ . . . . بتائیے آپ میری جگہ ہوتے تو آپ کو اس سے بہتر اور کوئی تدبیر سوجھ سکتی تھی . . . . . ؟

کیا اب بھی آپ مجھ کو دیوانہ تصور کرتے ہیں . . . ؟ جناب دیوانہ آدمی کچھ نہیں جانتا — میری فراست کا ابھی آپ کو اندازہ نہیں ہوا . . . . کاش آپ مجھے دیکھتے . . . . . آپ دیکھتے — کتنی عقلمندی کتنی دوراندیشی — کتنی احتیاط — کتنی چالاکی کے ساتھ میں نے اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے قدم اٹھایا، مجھے اس بوڑھے کی حالت پر اسقدر رحم شاید عمر بھر نہ آیا ہو جس قدر کہ اس کو ختم کرنے سے ایک ہفتہ پہلے آیا — ہر رات کو — آدھی رات گذر جانے کے بعد — میں اس کے کمرے کا دروازہ کھولتا — نہایت آہستگی کے ساتھ — اور جب دروازہ اتنا کھل جاتا، کہ میرا سر سما سکے تو نہایت خاموشی سے قندیل کو اندر داخل کر دیتا — قندیل — اتنی دھیمی جیسے بجھی ہوئی ہو، — بالکل خاموش — پھر آہستہ سے سر داخل کرتا — ہاں ! جھانک کر دیکھتا — اوہ — اگر آپ میرے اس عمل کو دیکھتے تو یقیناً ہنستے — میں نہایت آہستگی کے ساتھ حرکت کرتا — اتنا آہستہ — اسقدر آہستہ — کہ اس "جھانکنے" کے عمل میں پورا ایک گھنٹہ صرف ہوتا — اور اتنی خاموشی سے کہ بوڑھے کی نیند میں خلل نہ ہوتا — . . . .

کیا اب بھی آپ مجھے دیوانہ تصور کرتے ہیں — ؟ — اب بھی — ؟ بتائیے کہ کیا ایک دیوانہ آدمی اتنی احتیاط، اتنی چالاکی اور اسی عقلمندی سے یہ کام انجام دے سکتا ہے — ؟ ؟ . . . .

خیر جب میں اپنا سر کمرے میں داخل کر دیتا، تو نہایت خاموشی کے ساتھ قندیل کی روشنی بڑھاتا — صرف اسقدر کہ ایک مدھم شعاع اس کی — اس کی خونخوار — گدھ کی سی آنکھوں پر پڑے یہ عمل میں نے مسلسل سات طویل راتوں تک کیا — اور ہر رات کو اسوقت جب کہ آدھی رات گذر چکی ہوتی — لیکن افسوس کہ میں نے اس کی آنکھوں کو بند پایا . . . . ہر مرتبہ — اور مجھے

وہی کی صورت دیکھنی پڑی ——— اس لئے۔ . . . . . اس لئے کہ —
— وہ بوڑھا نہیں تھا جس نے میری رُوح کو بے چین کر رکھا تھا . . . بلکہ وہ اسکی آنکھیں . . شیطانی آنکھیں تھیں ——— ہر صبح کو جب میں بوڑھے سے ملتا اور دریافت کرتا کہ رات کیسی گذری تو . . . وہ قوت یہ شبہ ظاہر کرتا کہ میں ہر رات کو ٹھیک بارہ بجے اس کے کمرہ میں جھانک کر دیکھتا ہوں ———

آٹھویں رات کو میں نے معمول سے زیادہ احتیاط کے ساتھ دروازہ کھولا ——— میں نے اتنی آہستگی کے ساتھ حرکت کی . . . . . کہ گھڑی کی سوئی بھی میرے مقابلہ میں تیز حرکت کرتی ہے۔ اس رات سے پہلے مجھے اپنی ذہنی و دماغی قوتوں کا ——— اپنی عقلمندی کا اندازہ نہیں ہوا تھا — مجھے اپنی فاتحانہ مسرتوں پر بمشکل قابو پانا پڑتا ——— یہ معلوم کرکے کہ میں کمرے کا دروازہ کھول رہا تھا . . . . . آہستہ . . . . . . آہستہ اور وہ بوڑھا میری پر اسرار حرکات خواب میں بھی نہ دیکھ سکتا تھا — لیکن بالآخر میں اپنی خوشی پر قابو نہ پا سکا، اور ایک باریک ——— مدھم قہقہہ ——— میرے حلق سے نکل ہی گیا ——— شاید اس بوڑھے نے سن لیا ہو کیونکہ اس نے بستر پر کروٹ لی . . . . شاید اب آپ خیال کریں کہ میں واپس آ گیا . . . . ہا ہا . . . . . لیکن نہیں . . . اس کے کمرے میں غضب کا اندھیرا تھا (کیونکہ چوروں کے خوف سے اس نے کھڑکیاں بند کر رکھی تھیں) میں جانتا تھا کہ اس کو دروازے کے کھلنے کا علم نہیں ہوا . . . . میں دروازے کو کھولتا ہی رہا ——— آہستہ ——— آہستہ . . . .

میں نے کمرے میں سر داخل کیا ——— اور قندیل کو روشن کرنے ہی والا تھا کہ میرا انگوٹھا پھسل گیا . . . اور ٹن کی آواز سے بڈھا اپنے بستر پر اچھل پڑا ——— اس نے پوچھا ——— "کون ہے؟" میں نے بالکل خاموشی اختیار کی ——— کوئی جواب نہ دیا . . . . کامل ایک گھنٹے تک میں نے اپنے کسی عضو کو حرکت نہ دی ——— وہ ابھی تک اپنے بستر پر بیٹھا کسی آواز کے سننے کا انتظار کر رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح میں کئی راتوں تک دیوار کو کان لگا کر موت کی گھڑیوں کی آواز سنا کرتا تھا ——— یکایک میں نے ایک ہلکی سی کراہنے کی آواز سنی ——— دل ہلا دینے والی آواز . . . . کسی تکلیف کی وجہ سے ———؟ نہیں ——— رنج کی وجہ سے ——؟ یہ بھی نہیں ——— البتہ ایک ایسی مدھم آواز تھی جو روح کی گہرائیوں سے اٹھتی ہے ——— میں اس آواز کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں نے کئی دفعہ عین آدھی رات کے وقت ——— جبکہ ساری دنیا محو خواب ہوتی ——— وہ میرے دل کی گہرائی سے اٹھتی ——— خوفناک طریقے پر گونجتی ہوئی ۔ میرے عناصر میں انتشار پیدا کر دیتی۔ میں نے کہا کہ میں اس آواز کو . . . . اچھی طرح جانتا ہوں مجھے اس بوڑھے کے احساسات سے واقفیت تھی اور اس سے ہمدردی . . . .

بوڑھا بہت دیر تک بستر پر حالت خوف میں لیٹا رہا، اور پھر کروٹ لی . . . . میں اس کے احساسات کی تہ تک پہنچ گیا ——— وہ یہ کوشش کر رہا تھا کہ اپنے خوفزدہ خیالات کو بے بنیاد سمجھے مگر یہ اس کی ناکام کوشش تھی ——— وہ اپنے آپ سے کہہ رہا تھا ——— "کوئی بھی نہیں ہے . . . . روشندان سے ہوا کا ایک جھونکا آ گیا ہوگا . . . یا . . . . یا ——— ایک چوہا رینگ گیا ہوگا . . . . . . یا جھینگر کی آواز ہوگی" یا وہ اپنے آپ کو تسلی دینے کے لئے ان مفروضات سے کام لے رہا تھا۔ لیکن سب بے سود ——— اس لئے کہ "موت" اس کے سر پر اس طرح منڈلا رہی تھی، جیسے چیل کسی مردار پر . . . . غرض صیاد اپنے صید کے لئے جال بچھا چکا تھا۔ اور وہ کمرے میں میرے سر کی موجودگی کو محسوس کر رہا تھا۔

میں نے بہت دیر تک خاموشی سے انتظار کیا . . . . . . خاموشی اور صبر کے ساتھ . . . . . . آخر میں نے فیصلہ کیا کہ قندیل کو بہت . . . . . بہت ہی مدھم طریقہ پر روشن کیا جائے۔ چنانچہ میں نے قندیل کا پٹ ہٹا دیا ——— ہوشیاری اتنی ہوشیاری کے ساتھ کہ آپ اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے ——— ور ایک منفرد ——— مدھم ——— مکڑی کے جالے کے تار کی مانند باریک ——— شعاع قندیل سے نکلی اور . . . . اور اس خوفناک، خونخوار آنکھ پر پڑی، وہ کھلی ہوئی تھی ——— پوری کھلی ہوئی تھی ——— پوری کھلی ہوئی . . . . اور جب میں نے اس پر نظر ڈالی تو . . . . تو میں سر سے پاؤں تک غضبناک ہو گیا . . . . . میں نے ان آنکھوں کو غور سے گھور کر دیکھا . . . . مدھم نیلی آنکھیں . . . . اور ان پر ایک پراسرار جھلی . . . . میری رگوں کے خون میں انجماد پیدا کر دینے والی ——— میں اس کے چہرے اور آنکھوں کے سوا کچھ نہ دیکھ سکتا تھا ——— اس لئے کہ روشنی کی مدھم شعاعیں صرف اسی حصہ پر پڑ رہی تھیں . . . .

اور کیا میں نے آپ سے یہ نہیں کہہ دیا ہے کہ جس کو آپ جنون ——— یا دیوانگی تصور کرتے ہیں ——— وہ میرے حواس کی انتہائی چالاکی ہے ———؟ اب میرے کانوں میں ایک دھیمی مسلسل آواز آ رہی تھی . . . ایسی جیسے گھڑی میں سے آتی ہو ——— جو ایک روئی کے اندر چھپا کر رکھی

گئی ہو ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن میں اس آواز کو بھی خوب جانتا ہوں ۔ یہ اس بوڑھے کے دل کی حرکت تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس آواز نے میری حالت میں ایسا اشتعال پیدا کر دیا ، جیسا کہ ایک سپاہی کے اندر بگل کی آواز جرأت اور جوش پیدا کر تی ہے ۔ لیکن میں بالکل ساکت و صامت رہا ، میں نے سانس بھی بمشکل لی ، اور قندیل کو معمولی حرکت دیئے بغیر کھڑا رہا ۔ میں نے روشنی کی مدھم شعاع کو آنکھ پر جمائے رکھا ــــ اس دوران میں میں نے محسوس کیا کہ اس جہنمی دل کی آواز تیز ہوتی جا رہی ہے ــــ ہر لحہ ــــ وہ تیز اور بلند ہوتی جا رہی ہے ۔" اس بوڑھے کا خوف بڑھتا جا رہا ہے" میں نے محسوس کیا ــــ وہ آواز بڑھتی جا رہی ہے ــــــ بڑھتی جا رہی ہے

۔ ۔ دیکھ رہے ہیں آپ میرے حسی و ذہنی قوتوں کا مظاہرہ ــــ ؟ اور اب بھی آپ مجھے دیوانہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ اس کا تو میں نے اعتراف کر لیا ہے کہ عصبی کمزوری ــــ مجھ میں ضرور ہے ــ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ خیر ـــ ! ـــ آدھی رات کی ہولناک تاریکی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ویران گھر کی خاموشی ـــ اور ایسی عجیب و غریب آواز نے مجھ پر ناقابل بیان خوف طاری کر دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں بدستور خاموش کھڑا رہا تھوڑی دیر تک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن حرکت تیز ۔ ۔ ۔ ۔ تیز تر ہو گئی ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے خیال کیا کہ اب دل پھٹ جائے گا اب مجھ میں نئے خوف کا احساس پیدا ہوا ــ کہیں یہ آواز ہمسایہ کے کانوں تک نہ جا پہنچے ــ کیونکہ یہ خطرناک طریقے پر بڑھتی جا رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

غریب بوڑھے کا آخری وقت آ پہنچا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے ہیبتناک چیخ کے ساتھ روشنی تیز کر دی اور چھرتی کے ساتھ بوڑھے پر لپکا ــــ اس نے خوف سے ایک مرتبہ نعرہ کی چیخ ماری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صرف ایک مرتبہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں صرف ایک مرتبہ ۔ ۔ ۔ میں نے بلا کی تیزی کے ساتھ بوڑھے کو گھسیٹ کر نیچے ڈالا اور اس پر بستر ڈال کر تقریباً کچل دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے لبوں پر ایک فاتحانہ تبسم رقص کر رہا تھا ۔ یہ دیکھ کر کہ میں نے ایک بڑی حد تک اپنے کام کو بحسن و خوبی انجام دے دیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن کئی لمحوں تک روئی میں لپٹی ہوئی گھڑی کی طرح ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دل کی آواز سنائی دیتی رہی ۔ مگر اس سے مجھے اب زیادہ اندیشہ نہیں تھا ۔ کیونکہ یہ دیوار کے پار سنائی نہ دیتی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بالآخر یہ آواز بند ہو گئی ۔ وہ بوڑھا مر چکا تھا ، میں نے اس پر سے بستر ہٹایا ـــ اور اس کی نعش کا خوب معائنہ کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں وہ برف کی مانند سرد ـــــ مردہ پڑا تھا میں اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر کئی لمحوں تک انتظار کرتا رہا ۔ مت کا جمود طاری تھا ـــ اب اس کی وہ نیلی شیطانی آنکھیں

مجھے نہیں ستائیں گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اگر اب بھی آپ مجھے مجنون ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیوانہ تصور کرنے کے فریب میں مبتلا ہیں تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس وقت آپ کی آنکھیں ضرور کھل جائیں گی جب آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ میں نے کتنی احتیاط ، ہوشیاری اور عقلمندی کے ساتھ نعش کو چھپایا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رات گزر رہی تھی ــــ میں نے تیزی ــــ لیکن خاموشی کے ساتھ کام کیا ۔ سب سے پہلے میں نے لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ــــ میں نے ہاتھ پاؤں اور سر کو جسم سے جدا کیا ــــ تب میں نے کمرے کے فرش سے تین تختے اکھیڑے اور نہایت حفاظت کے ساتھ ان کے نیچے اپنی زندگی کے اس باقیماندہ بوجھ کو دبا دیا تب میں نے اتنی چالاکی ، اتنی ہوشیاری اور اتنی عقلمندی کے ساتھ اوپر سے تختے رکھے کہ کوئی انسانی آنکھ ــــ اس کی نیلی شیطانی آنکھ بھی ــــ شبہ نہیں کر سکتی تھی ــــ مجھے کچھ دھونا دھلانا بھی نہیں پڑا ۔ خون کا کوئی دھبہ ــــ عضو کا کوئی حصہ ــ کچھ بھی نہیں ، کیونکہ اس کے لئے میں نے پہلے ہی نہایت دور اندیشی سے کام لیا تھا ــــ ایک ٹب سے یہ مشکل آسان ہو گئی تھی ــ ــ

جب میں نے اپنا پورا کام ختم کیا ، تو اس وقت چار بجے تھے ــ لیکن ابھی آدھی رات کا سا اندھیرا تھا ۔ جونہی گھڑی نے چار بجائے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا ــــ میں نہایت اطمینان سے دروازہ کھولنے کے لئے چلا ــــ اب مجھے کس بات کا اندیشہ تھا ــــ ؟ ۔ ۔ ۔ تین آدمی داخل ہوئے ۔ انہوں نے خود اپنا تعارف کرایا ــــ وہ پولیس کے عہدہ دار تھے ــــ انہوں نے کہا کہ رات ہمسایہ نے ایک چیخ کی آواز سنی تھی ــــ وہ کسی شبہ کی بنا پر تحقیقات کی غرض سے آئے ہیں ۔

میرے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی ــــ مجھے کس بات کا ڈر تھا ــــ ؟ ــــ میں نے ان لوگوں کو خوش آمدید کہا ۔ "وہ چیخ کی آواز" میں نے وضاحت کی ۔ "خود میری تھی ــــ میں خواب سے چونک پڑا تھا ــ ــــ "بوڑھا آدمی" میں نے قدرے توقف کے بعد کہا ۔ "گھر پر نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گاؤں میں گیا ہوا ہے ۔" میں نے اپنے مہمانوں کو گھر کا معائنہ کرایا ۔ بالکل اچھی طرح ــــ میں نے ان کی رہبری کی اور آخر میں ہم اس کے کمرے میں پہنچ گئے ۔ میں نے اس کی تجوریاں بتلائیں ــــ جوں کی توں ــــ محفوظ و سلامت ۔ میں نے انتہائی خود اعتمادی اور اطمینان سے اسی کمرے میں ان کے لئے کرسیاں رکھیں ــــ اور خود ــــ اپنی فتح کی وحشیانہ خوشی کے

صداقت میں غرق میں اسی مقام پر کرسی رکھ کر بیٹھ گیا۔ جہاں اس کی نعش دبائی ہوئی تھی۔

ان لوگوں نے کافی اطمینان کر لیا تھا —— میری خوش خلقی نے ان کے قلوب کو مسخر کر لیا۔ اور میں . . . . میں بھی مطمئن تھا —— وہ بیٹھے باتیں کرنے لگے، اور میں بھی —— کافی اطمینان کے ساتھ —— ان کی گفتگو نے دلچسپ موضوع ڈھونڈ لیا تھا . . لیکن تھوڑی دیر کے بعد مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے چہرے کی رنگت بدل رہی ہے . . . . . . اور یہ خواہش پیدا ہوئی کہ یہ لوگ اب چلے جائیں۔ میرے سر میں درد محسوس ہونے لگا۔ —— اور ایک مدھم آواز میرے کانوں میں آنے لگی لیکن وہ لوگ بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے —— . . . . اب وہ آواز زیادہ صاف طور سے سنائی دینے لگی۔ وہ بڑھنے لگی اور تیز —— تیز ہوتی گئی —— میں نے مزید اطمینان کے ساتھ باتیں شروع کیں تاکہ اس آواز کو نہ سنوں —— . . . . . لیکن وہ بڑھتی جا رہی تھی —— اور صاف ہوتی جا رہی تھی۔

بلاشبہ اب میرے چہرے کی رنگت بہت بدل گئی تھی . . . . . . میں نے اپنی تقریر کی روانی میں اضافہ کر دیا —— اور آواز بھی قدرے بلند کر دی —— مگر . . . . . مگر وہ آواز بڑھتی گئی . . . . . آہ . . . . اب میں کیا کر سکتا تھا۔ وہ ایک خوفناک مسلسل آواز تھی، بالکل ایسی جیسے ایک گھڑی کی، جو روئی میں لپٹی ہوئی ہو —— ——

میری سانس تیز تیز چلنے لگی . . . . . ان عہدہ داروں نے ابھی تک اس آواز کو نہیں سنا۔ میں نے اپنی روانی اور تیز کر دی —— آواز اور بلند کر دی —— لیکن اُف! اس آواز میں ترقی ہو رہی تھی —— میں اپنی جگہ سے اٹھا —— اور —— تضیع اوقات پر پر زور بحث کرنے لگا۔ سخت لہجہ اور وحشیانہ حرکات کے ساتھ —— . . . . . . یہ کمبخت چلے کیوں نہیں جاتے —— ؟ میں نے کمرے میں لمبی لمبی ڈگیں بھرنا شروع کیں —— گویا . . . . گویا . . . . . . آدمیوں کی موجودگی مجھے کھائے جا رہی تھی —— . . . . . . لیکن —— لیکن وہ آواز . . . . . وہ تو بڑھتی ہی جا رہی تھی —— . . . . . . اوہ: . . . . خداوندا —— اب میں کیا کر سکتا تھا —— ؟ . . . . . میرے منہ سے جھاگ نکلنا شروع ہو گئی —— . . . . . . میں بہکی بہکی باتیں کرنے لگا —— میں خود کو کوسنے لگا —— اور —— اور فرش پر پاؤں رگڑنا شروع کیا —— لیکن —— آہ! وہ آواز —— وہ تو بڑھتی ہی جا رہی تھی —— . . . . . وہ . . . . . بلند ہوتی گئی —— . . . . . تیز . . . . . بلند . . . . . تیز . . . . بلند آہ . . . . . . او خدا! . . . . وہ بیہودہ انسان . . . . . . ؟ بیٹھے مزے اور اطمینان سے باتیں کر رہے تھے . . . . . . اور مسکرا رہے تھے —— . . . . . "کیا یہ ممکن ہے کہ انہوں نے وہ آواز نہیں سنی؟ —— میرے خدا! . . . . . . نہیں —— ہرگز نہیں —— انہوں نے سن لیا —— انہوں نے شبہ کیا —— جان لیا —— اور —— اور —— میرے خوف اور دہشت سے لطف اندوز ہو رہے تھے —— یہ میں نے خیال کیا —— اور خیال کرتا ہوں —— . . . . میرا یہ درد . . . . —— یہ کہ . . . . یہ نزع کا عالم —— . . . . اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی اذیت نہیں ہو سکتی . . . . اب مجھے ان کا اہانت آمیز تبسم زہر معلوم ہو رہا تھا —— میں برداشت نہیں کر سکتا تھا . . . . میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ مجھے خوب زور زور سے چیخ چیخ کر جان دیدینا چاہئے —— . . . . یہ دیکھئے . . . . . وہ پھر بلند ہوتی جا رہی ہے . . . . بلند . . . . بلند . . . . . بلند . . . . بلند . . . . . . اُف: —— "بدمعاشو" میں نے چیخ کر کہا "اب تم میرا مذاق نہیں اڑا سکتے —— میں جرم کا اقبال کرتا ہوں —— —— ان تختوں کو اکھیڑ دو —— —— یہاں . . . . ہاں یہاں . . . . یہ اس کے مدفون دل کی آواز ہے"!

~~~~~~~~

کلواکرتی ضلع نلگنڈہ و محبوب نگر و ورنگل (دکن) کے حضرات کی خدمت میں گذارش

ایک غریب شخص غلام حسین کو اسکی انتہائی مفلسی و نا داری کے پیش نظر اسلامی ہمدردی کے جذبہ کے ماتحت ہمارے بھائی محمد اقبال صاحب سلیم کا ہندوی نے ماہ جنوری ۱۹۳۸ء میں کنویسر مقرر کیا تھا۔ مگر اس شخص نے انتہائی غیر ذمہ دارانہ کارروائیاں کی ہیں اور دفتر کو اپنی کارکردگی سے مطلع نہیں کیا۔ لہٰذا اطلاع عام کیلئے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ کوئی صاحب اسے ہمارے رسالہ ادب لطیف کا آئندہ دیں جو حضرات ایجنٹ . . . دیکھے ہیں اور انہیں رسالہ نہیں ملتا ہے وہ ازراہ نوازش براہ کرم اپنی نمبر رسید کے حوالہ سے اور تاریخ و رقم پیشگی سے مطلع کریں تاکہ انہیں پرچہ باقاعدہ بھیجا جا سکے۔ احباب مطلع رہیں کہ اسوقت میں ہمارا کوئی کنویسر نہیں۔ غلام حسین ایجنٹ کا آخری . . . ماہ قبل کا پتہ: جدید ملک پیٹ معرفت مولوی عبدالکریم صاحب . . . حیدرآباد دکن، تھا۔ آجکل ہمیں باوجود کوشش کے کچھ پتہ نہیں مل سکا۔ غلام حسین کی . . . اگر یہ اعلان گذرے تو . . . مطلع . . .

منیجر ادب لطیف
~~~~~~~~

فراق گورکھپوری
ایم، اے

خود فراموشیاں

دلوں کو چارۂ دردِ محبت بھول جاتا ہے
وہاں ہر آدمی اپنی ضرورت بھول جاتا ہے

حیاتِ محض پا جاتا ہے ناکامِ محبت بھی
اذیت سے گذر جاتا ہے راحت بھول جاتا ہے

جسے راحت زمانے کی شکیبا کر نہیں سکتی
وہی دل تیرے جورِ بے نہایت بھول جاتا ہے

نگاہِ شوق میں ہوتی ہیں وہ چنگاریاں پنہاں
کہ حسنِ شوخ بھی اپنی شرارت بھول جاتا ہے

غنیمت جان اے دل فرصتِ دیدارِ جاناں کو
محبت کو یہ عہدِ بافراغت بھول جاتا ہے

کہاں کا ہوش کیسی بے خودی، انجام میں آکر
خود اپنا عشق کو رنگِ طبیعت بھول جاتا ہے

یوں ہی کچھ فرض کرکے مائلِ لطف و کرم تجھکو
دلِ اندوہگیں کیوں اپنی حالت بھول جاتا ہے

کہ ایسا دردِ غربت بھی ہے اے دل جسکی اٹھتی ہی
جنونِ عشق کو بھی جوشِ وحشت بھول جاتا ہے

وہ کیا ہے جو نہ یاد آ جائے تحریکِ محبت سے
مگر کیوں وعدۂ روزِ قیامت بھول جاتا ہے

تغافل حسن میں ہوتا ہے۔ لیکن اس طرح کوئی
محبت بھول جاتا ہے مروت بھول جاتا ہے

دلِ مایوس پر آتا ہے ایسا وقت بھی جس میں
محبت کو سوادِ شامِ فرقت بھول جاتا ہے

یہ کیسی دلدہی ہے حسن کی کیسی دل افزائی
گناہِ عشق بھی اپنی ندامت بھول جاتا ہے

دلِ وارفتۂ دیدار کی اللہ ری محویت
تصور میں ترے جو تیری صورت بھول جاتا ہے

تعین سے گزر کر حسن کو ہر عالم نظر آئے،
وہ کثرت بھول جاتا ہے کہ وحدت بھول جاتا ہے

بسا اوقات دل کے ساتھ بارِ غم اٹھانے میں
سنا ہے حسن بھی اپنی نزاکت بھول جاتا ہے

فراق اس طرح کھونا رنجِ فرقت میں بجا لیکن
کوئی اس درجہ بھی اپنی حقیقت بھول جاتا ہے

مصنفہ: ایف ڈبلیو بین مترجمہ: علی احمد

پریم پیاسی

گذشتہ سے پیوستہ

...اں میں پہلے یہ نہ جانتی تھی، لیکن اب جبکہ تو آگیا ہے میں محسوس ...ن ...ں کرتی ہوں کہ میں اب تک اکیلی تھی۔ اس لئے کہ اکثر جب میں پانی میں اپنا ...س دیکھتی تو اس سے بات کرتی اور چاہتی کہ وہ میرے سوالوں کا جواب د...، اور کبھی چاندنی راتوں میں اپنے سایے کے ساتھ کھیلتی ...، آرزو کرتی کہ ...ں میں جان آجائے اور کبھی میں اپنے ماحول میں کسی چیز کی کمی محسوس کرتی ...س کی آرزومند ہوتی۔ یہ نہ جانتے ہوئے کہ مجھے کیا چاہئے لیکن اب مجھے ...میں ہے کہ وہ تو ہی ہے۔ اور اب جب میں تیری طرف دیکھتی ہوں اور ...ی آواز سنتی ہوں تو میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتی کہ میں تیرے بنا کیسے ...ہی تھی اور کیسے رہ سکتی ہوں؟

راجہ نے غور سے اسکو دیکھا، اور اپنے دل میں کہا:" کتنی بھولی بھالی ہے اپنے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کا مطلب سمجھے بغیر بولتی چلی جا رہی ہے ...س کے شریر کے روئیں روئیں سے جھلک رہا ہے۔ لیکن وہ نادان ...نہیں جانتی، وہ نہیں جانتی تو نہ جانے میں تو جانتا ہوں، اب میں محبت کے معنی سمجھنے لگا ہوں، اپنے حسن کے اثرات سے بے خبر رہ کر اس نے میرے ...ل کو شعلے کی طرح پھونک دیا ہے۔"

تب وہ بولا:" اے نیلی آنکھوں والی! کیا تو مجھے یہ نہیں بتائے گی؟ کہ اگر ...سے پانی کے عکس میں جان پڑ جاتی، جیسا کہ تو چاہتی تھی اور وہ عورت ...ں ہوتا، تو تو اپنی سکھی کے ساتھ اتنی ہی خوش رہتی جتنی کہ اب ہے؟"

دوشیزہ نے جلدی سے کہا:" نہیں! اب جو کچھ ہے ٹھیک ہے۔"

راجہ خوشی سے کانپ گیا اور پوچھا:" لیکن کیوں؟"

وہ کچھ دیر تک سوچتی رہی اور پھر بولی:۔

" یہ میں نہیں کہہ سکتی، تاہم میں محسوس کرتی ہوں کہ میں اپنی سکھی سے ...اتنی خوش نہ ہوتی اور کیوں؟ میں نہیں جانتی، لیکن اس میں ہرج ہی کیا ..."

اور راجہ جذباتی لہجے میں بولا:" حسینہ! تو سچ کہتی ہے، عورت اور مرد ...ی تخلیق کا مقصد یہی ہے........"

ابھی وہ کہہ ہی رہا تھا کہ کچھ شور سنائی دیا، اور فضا مختلف آوازوں سے گونج اٹھی۔ راجہ نے خوف سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا:" یہ خوفناک آواز کس چیز کی ہے؟"

وہ ہنستے ہوئے بولی:" کچھ نہیں، یہ تو گاتی ہوئی ہوائیں ہیں جو بانسوں کے درختوں میں سے گذر رہی ہیں۔"

(۳)

راجہ نے اطمینان کی ایک لانبی سانس لی، اسے شبہ ہوا تھا، کہ شاید اس کے تمام ساتھی اسکی تلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچ گئے ہیں، وہ بولا۔

" نیلی آنکھوں والی! تو نے اب تک اپنا نام مجھے نہیں بتایا؟"

تب اس نے کہا:" میرا وہی نام ہے، جو میری ماں کا تھا۔"

اور راجہ نے پوچھا:" وہ کیا تھا؟"

عورت نے کہا:" بہت دن ہوئے، جب جنگل میں میرے باپ نے پہلے پہلے میری ماں کو دیکھا تھا، اسوقت وہ ایک پھولوں کی جھاڑی کے پاس کھڑی تھی، اور بھونرے کثرت سے اس کے چہرے کے اردگرد اڑ رہے تھے۔ میرے باپ نے دیکھا، اور اسی مناسبت سے اس کا نام رکھا، اس کے بعد وہی میرا نام ہوا۔"

راجہ نے پوچھا:" آخر وہ نام کیا تھا؟"

اور وہ بولی:" ...لی چمپتا۔"[1]

راجہ نے خوشی سے ہتھیلیوں کو بجاتے ہوئے کہا:" یقیناً تیرا باپ بہت عقلمند ہے۔ تجھ میں اور پھولوں میں کتنی مشابہت ہے اور اب مجھے شک ہوتا ہے کہ تیرا اپسرا کا قصہ درست نہ تھا۔ اس لئے کہ جس کو تو اپنی ماں کہتی ہے، وہ کوئی عورت نہ تھی، بلکہ خوشبودار پھولوں کی ایک مجتمع روح تھی، جس کے گرد بھونرے منڈلا رہے تھے، میرا مطلب یہ ہے اے نیلی آنکھوں والی! وہ مجمع روح تو ہے اور میں بھونرا!"

---

[1] سنسکرت میں لی بھونرے کو کہتے ہیں یعنی ایسا پھول جسکو بھونرے چومیں۔

"تب اس نے کہا" میں اب بھی تیرا مطلب نہیں سمجھی"

اور راجہ نے جواب دیا" اے سمندر کی بیٹی! تیرے دامن میں بکھری ہوئی سیپوں کو گنگنانا چاہئے۔ اس لئے کہ وہ نغمات سے بھری ہوئی ہیں لیکن —" وہ گنگنائیں گی یا نہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا اب تو غالباً تو سمجھ گئی ہو گی کہ میں غلطی پر نہ تھا کہ جب سے میں اور تو اس جنگل میں ملے ہیں برسوں گزر گئے ہیں اس لئے کہ میں اپنی زندگی کے تمام واقعات کو بھول گیا ہوں، اور جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، میری زندگی تو اسی وقت سے شروع ہوتی ہے جب سے میں نے تجھے دیکھا ہے اور تیرا بھی یہی خیال ہے کہ مجھ سے ملنے سے پہلے تیری زندگی بالکل بے لطف اور تنہا تھی — گویا ہم دونوں اب تک سو رہے تھے۔ اور اب جبکہ ہمارے جیون کی سنہری صبح ہو چکی ہے، ہم بیدار ہو رہے ہیں، اب ہم ایک ساتھ مل کر کھیلیں گے۔ میں راجہ بنوں گا اور تو میری رانی ہاں کیا تو نے کبھی راجہ اور رانیوں کے قصے بھی سنے ہیں؟"

وہ بولی" ہاں! میرا باپ جب عبادت میں اتنا مصروف نہ رہتا تھا تو وہ مجھ سے راجاؤں اور رانیوں کی کہانی سنایا کرتا تھا"

اور راجہ نے کہا" اگر میں کہوں کہ میں راجہ ہوں، تو کیا تو میرے ساتھ چلے گی اور میری رانی بنے گی"

وہ ہنسی اور بولی" لیکن میں رانی کیسے بن سکتی ہوں! نہ تو مجھ کو رانی کے کام آتے ہیں اور نہ رانی کا سلیقہ"

راجہ نے پوچھا" بھولی رانی! اگرچہ تو نہیں جانتی، لیکن تجھ میں رانی کی تمام خوبیاں ہیں — اور رانی کے فرائض ہیں ہی کیا ان کا سیکھنا تو بہت آسان ہے۔ اور اس زندگی میں اتنے عیش و آرام ہیں کہ تو ان کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ میرے ساتھ چل، وہ تمام باتیں میں تجھکو سکھا دوں گا جو رانی کو جاننا چاہئے اور اگر تو چاہے، تو میں اسکا ایک خیالی نقشہ تیری آنکھوں کے سامنے ہوا میں کھینچ سکتا ہوں اور یہ تیری زندگی کا آئینہ ہو گا جس کی تند مدیرا ممکن ہے تجھے مدہوش کر دے۔ اس ندی کی جھکتی ہوئی سطح پر کیا تو نے کبھی حبابوں کو نہیں دیکھا۔ ہر حباب اپنے اندر ایک چھوٹی سی دنیا رکھتا ہے اور آسمان کی رنگینیوں کو کچھ دیر منعکس کرنے کے بعد پھوٹ جاتا ہے۔ لیکن آسمان ویسے ہی باقی رہتا ہے۔ یہی حال میرے کھینچے ہوئے نقشے کا ہو گا، یہ لفظوں کی بنائی ہوئی رنگین دنیا بننے کے ساتھ ہی مثل حباب کے ختم ہو جائے گی۔ لیکن اس کے رنگین نقوش تیرے دماغ میں ہمیشہ کے لئے محفوظ رہ جائیں گے"

تب اس نے کہا" اچھا اپنی تصویر کھینچ، اور مجھے اپنا سورگ دکھا" وہ سننے کیلئے تیار ہو گئی اور اپنے گال کو ہتھیلی کا سہارا دیکر اسقدر سنجیدہ نظروں سے راجہ کی طرف دیکھا کہ وہ کانپ اٹھا پھر بولا،

"نیلی آنکھوں والی! آ میری رانی بن جا۔ میں تجھکو ایک عالیشان محل میں رکھوں گا۔ اور اس کو تیرے واسطے سات منزلہ اونچا بناؤں گا جس کے بیل بوٹے سونے اور چاندی کے ہونگے۔ تم میرے ساتھ سنگ مرمر کی بنی ہوئی سیڑھیوں پر چڑھنا۔ اور قیمتی پتھروں سے بنے ہوئے فرش پر چلنا۔ یہ کھردری اجڑی زمین تیرے ان نازک پاؤں کو زیب نہیں دیتی، تو میری رانی بن جا اور میں تجھکو اون اور ریشم کے کپڑوں سے ڈھک دوں گا۔ قوس قزح کی دھاریوں کا رنگین لباس تجھے بہت زیب دے گا اور اس میں تیرا ملتا ہوا چہرہ ایسا دکھائی دے گا۔ جیسے سورج نکل آیا ہے۔ زریں آنچل کی اوٹ میں تیرا عریاں حسن اور نکھر جائے گا۔ آ میرے ساتھ چل۔ میں تیری گردن اور بازوں کو جواہروں سے بھر دوں...... گا۔ اور تیرے کھیلنے کے لئے سمندر کے خزانوں سے سانچی موتیوں اور سیپوں کے انبار لگا دوں گا اور اگر سوئی کے چبھانے سے تیری نازک انگلیوں سے خون کا ایک قطرہ بھی ٹپکا تو اس کی تلافی میں ایک لعل سے کر دوں گا۔ اور اگر آنسو کی کوئی بوند تیری ان نیلی آنکھوں سے ٹپکے گی تو اس کو ہیروں سے تول دوں گا۔ نیلی آنکھوں والی! میری کنیزیں تیری خدمت کریں گی۔ سونے کے برتنوں میں تجھے کھانا کھلائیں گی۔ اور بلوریں گلاسوں میں تیرے پینے کیلئے پانی لائیں گی، اور جب تو چاہے گی تو وہ اپنے دلنواز نغموں سے تیرے کان بھر دیں گی ہاتھی تجھے اپنے اوپر بٹھا کر مستی میں جھومیں گے اور اگر تو چاہے تو چھوٹی کشتیوں میں بیٹھ کر کنول سے لدی ہوئی نہروں میں گشت لگانا یا پھر روئی سے زیادہ نرم بستر پر لیٹ جانا۔ اور دوپہر کی گرمی میں تیری خادمائیں تجھ کو خس کے پنکھے جھلیں گی۔ آ نیلی آنکھوں والی! آ اس لئے کہ میں تیرے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ میں خود تیرے پاس ہر وقت موجود رہوں گا۔ اور تیری خدمت کروں گا۔ میں تیری روح کو آب حیات سے تر کر دوں گا پھر افسانوں اور سپنوں کی عطر بیز خوشبوؤں میں غرق کر کے سحر دلولوں اور جذبات کی جھیلوں کے منظر اور لطیف نزہتوں میں رنگ دوں گا میں تیرے حاصل کرنے کے لئے ساری دنیا کو تہ و بالا کر دوں گا۔ اور ان سپنوں کی کرنوں سے لطف اندوز ہوں گا۔ جن کو تیری نیلی آنکھیں منعکس کرتی ہیں"

راجہ جتنی دیر تک کہتا رہا وہ اس کو گھورتی رہی اور جب وہ خاموش ہو گیا تب بھی وہ کچھ دیر تک اس کو اسی طرح دیکھتی رہی۔ پھر یکایک اس کی نگاہیں راجہ کے چہرے سے ہٹ کر زمین میں گڑ گئیں۔ دراز مژگاں کی چھاؤں میں اس کے گالوں پر ایک رنگ آ رہا تھا، اور ایک جا رہا تھا تب وہ بولی:-

نہیں! تو میری ہنسی اڑا رہا ہے اس لئے کہ میں ناتجربہ کار ہوں
... تو کہتا ہے، تیرے الفاظ صرف حباب ہیں، سندر، مگر جونہی ایک
... سے ٹکراتے ہیں، پھوٹ جاتے ہیں، یہ محض دھوکا ہیں"

راجہ نے متعجب ہو کر کہا: "پھر اسے ساحرہ! میں اپنی رانی کو، خوش ... کے لئے اور کیا کر سکتا ہوں؟"

لیکن وہ خاموش رہی، پھر اپنی نگاہیں اسی طرح زمین پر جمائے ہوئے ...

"... کہ میرے باپ نے بھی ایک رانی کا ذکر کیا تھا، جس کے حالات ... تیری بتائی ہوئی رانی سے بہت مختلف ہیں۔ وہ سارا قصہ تو میں تجھ سے نہیں کہہ ... اس لئے کہ میں کوئی پنڈت نہیں ہوں، لیکن اس نے مجھے ایک راجہ کی کہانی سنائی تھی، جس کو دیس نکالا دیدیا گیا تھا، اور جب دھرتی کے سارے ... سیوں نے اسے ٹھکرا دیا، تو صرف ایک ہی ہستی نے اس کا ساتھ دیا، وہ ... کی رانی تھی، اس رانی نے جلاوطنی میں اس کی سیوا کی، اور سائے کے ... مانند اس کے ساتھ بن بن کی خاک چھانتی رہی، جیسا تو نے کہا ہے اس نے زندگی کا کوئی لطف نہیں اٹھایا، بلکہ خود کو اپنے پتی راجہ کی بدقسمتی کو سونپ ... تیرے خیال میں اس وفا کی دیوی کے لئے وہی سب سے بڑی خوشی تھی، ... جب وہ مرگیا، تو وہ اس کا ماتم کرنے کے لئے زندہ نہیں رہی، بلکہ اسکے ساتھ خود بھی آگ میں جل گئی۔"

(۴)

راجہ حیرت سے سنتا رہا اور جب اس نے پورا قصہ ختم کیا، تو اسے ... مسرت سے چمکتی ہوئی آنکھوں سے دیر تک دیکھتا رہا، وہ نظریں نیچی ... بیٹھی تھی، شاید وہ اپنے کہے ہوئے الفاظ سے شرمندہ تھی۔

راجہ نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا:

"... نیلی آنکھوں والی! تیرے پتا نے جو کچھ کہا ہے، وہ ٹھیک ہے لیکن ... طریقۂ تعلیم جدا ہے۔ میں نے اپنی رانی کے متعلق جو باتیں کہی ہیں، وہ بھی ... ہیں۔ اور اب میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے اپنی رانی کا جو انتخاب ... کیا ہے، وہ بہت ہی موزوں ہے۔ لہٰذا اب تو گرو اور میں تیرا چیلا اب تو مجھے ... بتا، جو میں نہیں جانتا؟"

جنگل کی رانی کھل کھلا کر ہنس پڑی یہاں تک کہ اسکی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے جھلکنے لگے اور پھر بولی:

" تو پھر میرا مذاق اڑانے لگا، میں جنگل کی رہنے والی ایک ایسے پرش کو کیسے تعلیم دے سکتی ہوں، جو شہروں کا رہنے والا ہے؟"

اور راجہ نے جلدی سے کہا: "نیلی آنکھوں والی سندری! یہ سچ ہے۔ لیکن تو نے مجھے اب تک بہت سی چیزیں ایسی سکھا دی ہیں، جن سے میں پہلے واقف نہ تھا۔ اسلئے کہ شہروں کی رہنے والی روحیں بری صحبتوں کی وجہ سے کثیف ہو جاتی ہیں، برخلاف اس کے تیری روح اتنی ہی پاک ہے جتنے تیرے بالوں میں لگے ہوئے پھول۔ ہاں، تو نے رانیوں کے متعلق تو مجھے بہت سی نئی نئی باتیں بتائیں۔ اب کچھ راجاؤں کے متعلق بھی سمجھا، علاوہ اس کے یہ بھی سمجھا کہ جس کو تو اپنے جیون کا ساتھی بنانا چاہتی ہے۔ اسے کیسا ہونا چاہیے؟"

ایک لمحہ تک وہ اس کو دیکھتی رہی، پھر نگاہیں نیچی کرلیں، راجہ نے دیکھا کہ اس کی چاندی سی گردن میں خون تیزی سے چڑھنے لگا، اور سیاہ بالوں کی جڑوں تک پہنچ کر غائب ہو گیا۔ جیسے شفق کی لالی شام کو پورب کے افق پر پھیل کر دن کے ختم ہوتے ہوتے رات کی تاریکیوں میں گم ہو جاتی ہے۔

ایک بے خودی کے عالم میں راجہ نے اپنے دل میں کہا:

"اوہ! یہ چاندنی معصوم دیوی رات کی اس بڑھتی ہوئی تاریکی میں بھی محبت کی صبح سے پہلے اس سورج کی کرنوں کے تصور میں غرق ہے جس کو اس نے کبھی نہیں دیکھا، اور اب میں خود کو اس کا خوش نصیب پجاری کہہ سکتا ہوں، اس لئے کہ میرے سوال سے اس کے بدن میں خون کی گردش تیز ہوگئی ہے۔ لیکن اب ایک بے ربط سوال سے میں اپنی ہرنی کو چونکا سکتا ہوں، دیکھوں وہ اس کا جواب کیا دیتی ہے؟"

اور راجہ نے کہا: "نیلی آنکھوں والی چھوٹی رانی! اگر میرے الفاظ سے تیری دوشیزگی کے جذبات کو ٹھیس لگی ہے، تو مجھے معاف کر، یہ جاننا میرے لئے کافی ہے، کہ ایسا راجہ جو تیرے جیسے پاک خیالات رکھتا ہو وہی تجھ جیسی رانی کے لائق ہے۔ اور اس کو دنیا کے تمام مردوں سے مختلف ہونا چاہیئے۔ جیسے کہ تو خود دنیا کی تمام عورتوں سے جدا ہے"

نگاہوں کو اسی طرح زمین پر جمائے ہوئے اس نے مدھم آواز میں جواب دیا:

"آخر میں دوسری عورتوں سے کن باتوں میں مختلف ہوں؟"

اور راجہ بولا: "نیلی آنکھوں والی! یہ پوچھ کہ کن باتوں میں تو ان سے ملتی جلتی ہے؟ اس لئے کہ اختلاف تو اتنی باتوں میں ہے، کہ ان کا بیان کرنا ایک طویل داستان ہے، پھر بھی اگر تو چاہے تو میں کوشش کروں گا کہ ان میں سے چند کا ذکر کروں، تاکہ معلوم ہو جائے، کہ تو اپنی صنف سے کتنی مختلف ہے؟"

عورت نے کہا: "ہاں کہو میں اس اختلاف کو جاننا چاہتی ہوں"

راجہ نے کہا: "اچھا اب میری طرف دیکھ، تاکہ میں کہنے سے پہلے تجھکو

غور سے دیکھ لوں؟"

جنگل کی دوشیزہ نے اپنی آنکھیں اٹھائیں، پھر مسکرائی، پھر ہنسی اور نیچے دیکھنے لگی۔

تب راجہ نے کہا: "نیلی آنکھوں والی! ہر عورت عورت ہے اور تو بھی ان میں سے ایک ہے۔ یہی ایک خاصیت ہے، جو تجھ میں اور تیری صنف میں مشترک ہے۔ اس کے سوا تیری ہر ادا میں ایک خاص مخصوصیت ہے جو تجھکو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ اس لئے کہ نیلی آنکھیں تو سبھی رکھتی ہیں لیکن تیری آنکھیں نیلی تر ہیں۔ ان کے ہونٹھ سرخ ہیں لیکن تیرے گہرے سرخ۔ ان کی بھنویں سیاہ ہیں لیکن تیری بہت زیادہ سیاہ۔ ان کی ہنسی دلآویز ہے لیکن تیری ہنسی پھول برساتی ہے۔ ان کے بال کالے ہیں لیکن تیرے بالوں کی سیاہی آدھی رات کی سیاہی سے زیادہ ہے ——— تیری گنگناہٹ میں تبسم اور تیرے تبسم میں نغمہ ہے ——— اور یہ باتیں سوا میرے کسی کو حاصل نہیں، اور سب سے بڑی خوبی یہ کہ تیری جنس کی دوسری للنائیں مقید اور تو آزاد ہے"

جب راجہ رک گیا تو وہ بولی۔

"لیکن مجھ میں کونسی خاص بات ہے؟ میں نہیں سمجھ سکی"

اور راجہ نے کہا "پیاری! میں تجھ سے بیان نہیں کر سکتا حالانکہ تجھ میں اور ساری عورتوں میں جزا اور کل کا فرق ہے وہ پلی ہوئی استریاں انسانی نجوں کی زد میں رہ کر سراپا تصنع اور بناوٹ ہو کر رہ گئی ہیں۔ لیکن تو جو آزاد ہرنیوں کی طرح جنگل میں گھومتی پھرتی ہے۔ قدرت کی سادگی کا مکمل نمونہ ہے، اور یہ بات کسی کو حاصل نہیں تو ایک جنگلی انگور کی بیل ہے، جو راجہ کے باغ کے پھولدار درختوں پر چڑھتی چلی جاتی ہے۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ تیری نیلی آنکھوں میں اب تک معصوم بچوں کی سی معصومیت نظر آتی ہے باوجود اس کے تیری جوانی کا عالم شراب تند کے جوش، ور کلی کے پھٹ پڑنے والے شباب کی مانند ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اپنا مطلب تجھے کس طرح سمجھاؤں لیکن دیکھ جوں جوں شام ہوتی جا رہی ہے، ندی کے پانی کی رفتار سست اور ہوا کے جمود کی وجہ سے سطح ہموار ہوتی جا رہی ہے، دیکھ! ادھر ادھر تیرتی ہوئی بطوں کا عکس پانی میں پڑ کر کیسا منعکس ہو رہا ہے۔ اور وہ ان ابھری چٹانوں کے پاس راج ہنس کا جوڑا کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے نیلی آنکھوں والی! یہ قدرت کے تمام مناظر تیری ایک ادا میں پوشیدہ ہیں، تو مجسم فطرت ہے، اس لئے مجھے ڈر ہوتا ہے کہ کہیں تو اپنے ہم جنسوں کی صحبت حاصل کرنے کے لئے یکایک پانی میں نہ کود پڑے، اور مجھے اس جنگل میں تنہا چھوڑ کر غائب نہ ہو جائے۔ . . . . ؟"

اور ابھی وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ پھر کچھ کھڑکھڑاہٹ ہوئی، اور ساری فضا گونج اٹھی، راجہ نے بے چین ہو کر جنگل کی رانی سے پوچھا "یہ کیا ہے؟"

تب وہ بولی "یہ مرغابیوں کے پروں کے پھڑپھڑانے کی آواز ہے جو رین بسیرے کیلئے جنگل کو لوٹ رہی ہیں"

(۵)

راجہ نے اطمینان کی ایک لمبی سانس لی، جیسے کسی بڑے خطرے سے اس کو نجات مل گئی۔ دوشیزہ نے اسکی بے چینی کو محسوس کرتے ہوئے کہا "تو کیوں ڈرتا ہے؟ آخر تیرے ڈرنے کا سبب؟"

اور راجہ نے جواب دیا "پیاری نیلی آنکھوں والی! ہاں میں ڈر گیا تھا، صرف اس لئے کہ کوئی ناگوار واقعہ ہماری گفتگو کو ختم نہ کر دے، ورنہ مجھے موت سے خوفزدہ نہ ہونا چاہیئے۔ جبکہ میں جانتا ہوں کہ میری زندگی کی ابتدا، تجھ سے ملنے کے وقت سے ہوئی ہے۔ اور اب موت ہی ایسی چیز ہے جو مجھے تجھ سے جدا کر سکتی ہے اور ایک کنجوس کی طرح میں اس دولت کو جو تجھ سے گفتگو کر کے حاصل کر رہا ہوں، ہر لحظہ کھو دینے کا خوف رکھتا ہوں، اسی لئے میں ذرا ذرا سی آواز پر چونک پڑتا ہوں، اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، مجھے خوف ہے، کہ تو یکایک پانی میں کود کر غائب نہ ہو جائے، اور سچ کہتا ہوں، میرا بس چلے تو میں تجھ کو کبھی غائب ہو جانے کے خیال سے گھوڑے کی طرح کسی طرف سے باندھ دوں؟"

وہ ہنسی اور بولی "اب اس کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ میں تجھ سے بھاگنا نہیں چاہتی، اور میں کوئی مچھلی تو نہیں ہوں، کہ پانی میں کود جاؤں"

تب اس نے کہا "پیاری! کیا تیرے باپ نے کبھی تجھ سے ان پریوں کا ذکر نہیں کیا، جو پانی کے اندر رہتی ہیں؟ اور اگر نہیں کہا تب بھی میں تم کو ان میں سے ایک خیال کرتا ہوں، جو مجھے دھوکا دینے کیلئے پانی سے باہر نکل آئی ہے۔"

اور اس نے پوچھا "لیکن تیرا ایسا خیال ہوا کیوں؟"

راجہ نے کہا "اس لئے کہ وہ پریاں خوبصورت ہوتی ہیں، جیسی کہ تو ہے اور تیری طرح وہ بھی چشموں اور نہروں کے قریب بیٹھی ہوئی نظر آتی ہیں اور وہ میری طرح بھٹکے ہوئے مسافروں کو لبھا کر انہیں تباہ و برباد کر دیتی ہیں"

اس نے سنجیدگی سے پوچھا "اور وہ کس طرح مسافروں کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں؟"

راجہ بولا "نیلی آنکھوں والی! وہ خود کو تھوڑی دیر تک دکھا کر غائب ہو جاتی ہیں۔ اور پھر کبھی واپس نہیں آتیں، یہ بےدرد حسن والیاں تنہا نہیں جاتیں، بلکہ اپنے ساتھ اپنے بدقسمت شکاریوں کا دل بھی لیجاتی ہیں

یا جنت کے دیوانے انکی تلاش اور انکی یاد میں ہمیشہ بھٹکتے رہتے ہیں۔ اس لئے اے نیلی آنکھوں والی پری! میں تجھ سے پھر کہتا ہوں، کہ اب جبکہ تو نے مجھے مسحور کر لیا ہے۔ تو تجھے ہمیشہ میرے ہی ساتھ رہنا ہوگا۔ ورنہ میں انہی مسافروں کی طرح تباہ و برباد ہو جاؤں گا۔ اور اگر تجھے یہ منظور نہیں تو بتا تو میرے سامنے کیوں آئی؟ اور ڈاکوؤں کی طرح ایک راہ گیر کو لوٹ کر تو نے بہت بڑا گناہ کیا۔"

تب وہ ہنسی اور اس ہنسی کا نغمہ راجہ کے کانوں میں گونجنے لگا۔ پھر آہستہ سے بولی:۔

"لیکن اگر وہ پانی سے کچھ دیر کیلئے باہر نکلتی ہیں، تو اس میں ان کا قصور کیا ہے؟ وہ ہرگز نہیں چاہتیں، کہ بھولے بھٹکے مسافر انہیں دیکھیں اور تباہ ہوں۔ یہ میری خطا ہے، کہ تو نے مجھے دیکھا۔ یہ تیری غلطی ہے کہ تو میرے جنگل میں آیا۔"

راجہ نے گھبرا کر کہا: "نیلی آنکھوں والی! میں تجھ پر کوئی الزام نہیں لگاتا، صرف اس بات کی درخواست کرتا ہوں، کہ مجھکو اس جنگل میں تنہا چھوڑ کر پانی میں کود نہ پڑنا۔"

اور وہ بولی: "لیکن کیا مجھے اس قسم کا کوئی اندیشہ نہیں کرنا چاہئے، کہ تو مجھکو چھوڑ کر چلا جائے گا؟ کیا استری ہی سراسر فریب اور دھوکا ہے۔ اور کیا پانی کی پریوں کی طرح پانی کے مرد نہیں ہوتے؟"

راجہ نے مضطرب ہو کر جواب دیا: "نیلی آنکھوں والی سندری! اگر میں تجھکو چھوڑ کر چلا جاؤں تو کیا تجھے کوئی غم ہوگا؟"

جواب دینے سے پہلے وہ کچھ دیر رکی، اور شرارت آمیز نگاہوں سے اسکو دیکھتے ہوئے بولی:۔

"کیا تو نے یہ نہیں کہا تھا، کہ یہ دنیا مردوں سے بھری ہوئی ہے اور اب ان میں سے ایک مرد آج اس جنگل میں آیا ہے۔ تو کل دوسرا بھی آ نکلے گا؟"

راجہ چونک پڑا، اور اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔ پھر اپنے دل میں کہا۔ ہاں! وہ مجھکو اشتعال دے رہی ہے اور ایسا کرنے میں وہ کتنی حسین معلوم ہو رہی ہے۔ عورتوں کی یہی فطرت تو انہیں جاذب نظر بنا دیتی ہے۔ اور تعجب تو یہ ہے کہ جنگل کی رہنے والی اس دوشیزہ نے بھی صنف کی یہ ادائیں کہاں سے سیکھیں۔ تب اس سے مخاطب ہو کر کہا:

"اے اپسرا کی خوبصورت بیٹی! اپنے دوسرے آنے والوں کو خبردار کر دے اسلئے کہ میں جنگل کے اطراف میں اپنے سپاہیوں کا پہرہ مقرر کر دوں گا اور حکم دوں گا کہ جو مرد ادھر آئے، اسے قتل کر دیا جائے۔"

کچھ دیر تک وہ مسکراتی رہی پھر کہا: "دیکھو! جو کچھ مجھے کہا تھا میں نے کہہ دیا۔ لیکن تو نے مجھ سے کچھ بھی نہیں کہا۔ اور کیا حقیقت میں تو کوئی راجہ ہے، جو کہ اپنے سپاہیوں کو میرے جنگل کے چاروں طرف مقرر دیگا؟"

راجہ نے اپنے دل میں کہا: "یہ بہت چالاک معلوم ہوتی ہے۔ اور مجھکو پرکھنا چاہتی ہے۔ لیکن ابھی میں یہ نہ بتاؤں گا کہ میں کون ہوں۔ اسلئے کہ معلوم ہو جانے پر وہ بجائے میرے میری سلطنت سے محبت کرنے لگے گی۔" اور پھر اس سے کہا:۔

"یقیناً جیسا کہ ہم میں پہلے وعدہ ہوا تھا۔ اگر تو رانی ہے تو میں راجہ ہوں۔ اور میں کسی آدمی کو اپنی رانی کے پاس نہ آنے دونگا۔ میں ایک اچھی ذات کا ہوں اور راجپوت ہوں۔ اپنے خاندان پر مجھے فخر ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا۔ اگر سچ مچ میں کوئی راجہ ہوتا اور جلا وطن کر دیا جاتا۔ لیکن کیا تو ایسی حالت میں میرا ساتھ دیتی، جیسا کہ تو نے کہا ہے؟"

وہ ہنسی اور بولی: "نہیں! لیکن ابھی میں تیری رانی نہیں ہوں میں تیرے ساتھ کیوں پھرنے لگی؟ یہ تیری رانی اور رانیوں کا کام ہے!"

راجہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دل میں کہا: کیا یہ بلا سوچے سمجھے باتیں کر رہی ہے، یا قصداً مجھے پریشان کرنے کو کہہ رہی ہے یا شک سے یہ جاننا چاہتی ہے، کہ میں کسی اور سے تو محبت نہیں کرتا۔ پھر اس سے مخاطب ہوا۔

"نیلی آنکھوں والی! قطع نظر اس کے کہ میں راجہ ہوں یا نہیں! یہ یقینی ہے، کہ سوا تیرے نہ میری کوئی رانی ہے نہ رانیاں۔ سچ تو یہ ہے، کہ نہ تو دنیا میں اب تک میں نے کسی استری سے پریم کیا ہے اور نہ کسی کو اپنی رانی بنانا چاہا ہے۔ اس لئے کہ اب تک تو نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا، کہ میں اگر حقیقت میں راجہ ہوں، تو تو میری رانی بننا پسند کریگی؟"

اور اس نے کہا: "میں بھی ایک اعلیٰ خاندان کی ہوں اور آزاد ہوں لیکن اس بات کا تصفیہ میں خود نہیں کر سکتی میرا باپ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ابھی جملہ ختم بھی نہ ہوا تھا، کہ وہ زور سے چلائی اور کھڑی ہو گئی۔ راجہ خوف سے اسکی طرف یہ کہتے ہوئے بڑھا: "میری رانی تجھے کیا ہوا؟"

وہ اس کے قریب ہو گیا۔ اور دیکھا کہ اس کا چہرہ کمہلائے ہوئے پھول کی طرح زرد ہو گیا ہے، پھر بے قرار ہو کر پوچھا۔

"اے چیتا! کیا معاملہ ہے؟"

لیکن وہ کچھ نہ بولی ندی کو گھورتی رہی، جبکہ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ راجہ اس کو محبت اور یاس سے دیکھتا ہوا دیر تک کھڑا رہا۔ شام کا دھندلکا

[illegible]

قریب ڈوب چکا تھا اور سامنے دور درختوں کی شاخوں کے درمیان سے چند ماچ روں کی طرح دن کے تاجدار کے غائب ہو جانے کا انتظار کر رہا تھا تاکہ رات کی تاریکی میں اس کی حکومت برقرار ہو جائے اور ندی سے بہت دور آسمان کے مغربی گوشے میں ایک اکیلا ستارہ چمک رہا تھا، نیلے اور سیاہ آسمان کی گود میں چمگادڑوں کی قطاریں شور کرتی چلی آ رہی تھیں دن کی خاموش رات کے جنگلی جانوروں کے کچار دن میں ڈوب گئی تھی اور جنگلوں کے تاریک سایوں میں جگنو ادھر ادھر اڑ رہے تھے ـــــ راجہ نے سنا اس کا گھوڑا ہنہنا رہا تھا۔ شاید وہ درخت سے بندھے بندھے تھک گیا تھا، یا رات کی تاریکی کو بڑھتا دیکھ کر اپنے مالک کو گھر چلنے کے لئے بلا رہا تھا۔

(۶)

اور جب وہ دیر تک اسی طرح خاموش رہی تو راجہ نے بے چین ہو کر کہا "پیاری! میں نہیں سمجھتا کہ کیا چیز تیری پریشانی کا باعث ہوئی ہے لیکن میں تجھکو اس خطرہ سے بچانے کے لئے اپنی جان تک دے سکتا ہوں دن ختم ہو رہا ہے اور بہت جلد رات ہو جائیگی کیا تو نے گھوڑے کی آواز نہیں سنی، وہ بھی کہہ رہا ہے کہ اب جانے کا وقت ہو گیا ہے لیکن میں تجھکو چھوڑ کر نہیں جا سکتا، اور میں پھر تجھ سے پوچھتا ہوں کیا تو اس تاریک جنگل کو چھوڑ کر میرے ساتھ نہ چلے گی.... ہم دونوں آج کی طرح ہمیشہ باتیں کرتے رہیں گے اس لئے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں جب سے میں تجھ سے ملا ہوں، تو میرے دل اور میری روح میں بس گئی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں تجھے چند گھنٹوں سے نہیں، برسوں سے جانتا ہوں اور تیرے ساتھ رہ چکا ہوں۔ میں نے تجھ سے جو کچھ... کہا ہے اس سے زیادہ آرام سے رکھوں گا تیرے ہر دکھ اور ہر غم میں شریک ہوں گا، اگر تو اپنے باپ کے اس جنگل کو چھوڑنا نہیں چاہتی تو مجھ پر بھروسہ کر، جب تو چاہے گی تجھے یہاں لے آؤں گا۔ اور مندر کے اس حسین گوشے کو ہم اپنے کھیلنے کے لئے وقف کر لیں گے، اور آج کی یہ شبھ گھڑی مجھے سدا یاد رہے گی، کیونکہ تیری کنول جیسی آنکھوں نے جادو کر کے میرا سب کچھ چھین لیا ہے۔

تب یکایک وہ رونے لگی اور سسکیاں بھرتی ہوئی بولی "اب تجھکو چلا جانا چاہئے۔ ہاں! جس قدر جلد ہو سکے، آخر تو اس جنگل میں آیا ہی کیوں، شاید مجھے برباد کرنے! میری شانتی، میرا چین، میری خوشی سب کچھ چھین لینے کے لئے۔ اس لئے کہ جب تک میں نے تجھے نہیں دیکھا تھا، میں ندی، پھول، درخت سب سے لطف اٹھاتی تھی، لیکن یہی چیزیں اب مجھے [illegible] اور تیرے بغیر نہیں رہ سکتی، اور باوجود اس کے نہ تو میں تجھکو روک ہی سکتی ہوں، اور نہ تیرے ساتھ جنگل سے جانے پر راضی ہو سکتی ہوں"

اور راجہ نے مایوس ہو کر کہا "افسوس! تو کیوں میرے ساتھ نہیں جا سکتی؟"

تب اس نے کہا "میرا باپ جس سے کہے گا مجھ کو اس سے شادی کرنی ہوگی، لیکن تو نے آ کر مجھے حیرت میں ڈال دیا ہے، تیری آہ، تیری گفتگو، تیری آواز سن کر میں سوا تیرے خیال کے تمام باتیں بھول گئی اور پھر مجھے خیال آیا کہ مجھ سے میرے باپ نے مجھ سے کہا تھا لیکن اب اس سے فائدہ! تمام امیدیں خاک میں مل گئیں اور میں پھر التجا کرتی ہوں کہ مجھے چھوڑ کر تجھے فوراً چلا جانا چاہئے، اور مجھے بھول جانے کی کوشش کرنا اور میں بھی تجھے بھول جانے کی کوشش کروں گی۔ جیسے کہ میں نے تجھے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا اس لئے کہ میں اپنے باپ کی نافرمانی نہیں کر سکتی اس نے میرے پتی کا انتخاب کر لیا ہے"

راجہ چلایا "نیل آنکھوں والی جادوگرنی! یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ کون ہے جسے تیرے باپ نے تیرے لئے منتخب کیا ہے؟"

تب اس نے روتے ہوئے جواب دیا "دور بہت دور شمال میں جہاں جنگل کی سرحد ختم ہوتی ہے، وہاں ایک راجہ رہتا ہے ایک راج کرتا ہے ایک روز وہ جنگل میں آئے گا اور مجھ کو میرے باپ سے طلب کریگا یہ بات میری ماتا نے میرے باپ سے کہی تھی، اس نے اندرا سے میرے بیاہ کے متعلق پوچھا تھا۔ اور اندرا دیوی نے ہمیشہ سے یہ بات دریافت کی تھی، جو علم غیب رکھتا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ یہ بات غلط نہیں ہو سکتی لہٰذا اب تک بھی میں نے جو کچھ جو کچھ کیا ہے، وہ بڑا جرم تھا، اور مجھکو تجھ سے کوئی سروکار نہ رکھنا چاہئے۔ اب تک دیوانگی کی حالت میں میں ایک غیر شخص سے گفتگو کرتی رہی۔ یہ میرے لئے کسی طرح بھی مناسب نہ تھا۔ اس لئے کہ میں ایک راجہ سے پہلے ہی منسوب ہو چکی ہوں اور اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو بھول جائیں"

راجہ حیرت کے ساتھ اس کو دیکھتا رہا۔ اور اس نے دیکھا کہ وہ رو رہی ہے، پھر کچھ غرور اور کچھ خوشی سے اس نے اپنے دل میں کہا۔ یقیناً یہ کوئی اعلیٰ خاندان کی ہے۔ اور کوئی بیش قیمت ہیرا ہے۔ جب ہی تو وہ میرے ساتھ چلنے کو تیار نہیں ـــــ اپنی خوشی سے زیادہ اس کو اپنے فرض کا خیال ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنا نام ظاہر کروں۔ میں اس کا امتحان کروں گا۔ اس طرح جیسے کہ سونے کو آگ پر رکھ کر پرکھا جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ امتحان میں پوری نہ اترے تب کیا ہوگا، میں اسے معاف کر دوں گا اس

لے اپنے مقابلہ میں میں اسکو مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتا. لیکن اگر وہ اپنی بات پر قایم رہے اور میری بات نہ مانے. تب میں جاؤں گا. یہ سپیر بالکل بیتاب ہے.

اور تب وہ اس سے مخاطب ہوا۔" اے چمپتا! اس رودالک کا خیال چھوڑ دے جو کالی بدری کے مانند یکایک ہماری مسرت کے لہلہاتے باغ کو روند ڈالے گا اور ہم دونوں کی آشائیں ان سے گر کر ان بجلیوں کی نذر ہو جائیں گی. اور رودالک یہ ہے کون؛ جو مقدر سے یوں تا کو محبت سے دیوتا سے لڑانا چاہتا ہے. اور کیا میں تجھکو مجبور نہیں کر سکتا۔ اس کا خیال چھوڑ دے. جسکو تو نے کبھی نہیں دیکھا. اور ابتک تو نے اس کا کہیں وجود ہے بھی یا نہیں؛ ہو سکتا ہے. کہ وہ تیری ماں کا کوئی سپنا ہو. تو کیا اس سپنے کی خاطر تو اپنی اور میری، دونوں کی اُمید کا خون کر دے گی. وہ ایک لمحہ کے لیے رکا اور پھر کہنے لگا دیکھ فرض اور محبت کی کشمکش میں الجھ کر تو نے اب تک کوئی رائے قایم نہیں کی، بالکل اس پھول کی طرح جو باد مخالف کے تھپیڑوں سے لرزرہا ہو. تو بھی ایک پھول ہے. اور پھول ہی تیری قسمت کا فیصلہ کرے گا. یہ نیلا کنول جسے تیرے سینے کا قرب حاصل ہے. یقیناً اسے تیرے دل کا راز معلوم ہوگا. اور یہی اب ہماری رہبری کرے گا."

یہ کہتے ہوئے راجہ اس کی طرف جھک گیا. اور آہستہ سے بغیر اس کے جسم کو ہاتھ لگائے کنول کو لے لیا. وہ اسی طرح خاموش کھڑی رہی پھر راجہ بولا" ایک پنکھڑی تیرے لئے اور دوسری میرے لئے ... میں پنکھڑیوں کو یکے بعد دیگرے جدا کروں گا، ایک تجھکو دوں گا اور دوسری میں لیتا جاؤں گا. اور اگر آخری پنکھڑی تجھے ملے. تو تجھکو یہیں رہنا ہوگا ... میں اکیلا جاؤں گا. اور اگر آخری پتی مجھ پر ختم ہو تو تجھے رودالک کو چھوڑنا ہوگا جس طرح کہ ٹوٹنے والا پھول اپنی شاخ کو چھوڑ دیتا ہے اور میری ہو کر تجھکو میرے ساتھ چلنا ہوگا"

تب وہ ایک ایک کر کے پنکھڑیوں کو پھول سے جدا کرنے لگا. جو زمین پر گر کر منتشر ہونے لگیں. اور جب وہ شمار کر رہا تھا، تو رانی چمپتا اپنی آنکھوں میں آنسو بھرے اسکو دیکھتی رہی. یہاں تک کہ کنول میں آخر صرف ایک پنکھڑی باقی رہ گئی، اور وہ راجہ کے حصے کی تھی تب یکایک وہ مسکرائی اور بولی؛

" اوہ! تم بہت چالاک معلوم ہوتے ہو. اور ساتھ ہی ساتھ بیدرد بھی. تمہیں معلوم تھا. کہ کنول میں صرف سولہ ہی پنکھڑیاں ہوتی ہیں، اور آخری تمہیں پر ختم ہوگی. تم بڑے بے رحم ہو. اور خود غرض بھی. اس لئے کہ

میرے غم کو بڑھانے کی کوشش کر رہے ہو. اور اپنی ناجائز ترغیب کے ذریعہ چاہتے ہو کہ میں اپنا ارادہ بدل دوں. جاؤ، چلے جاؤ، اس لئے کہ میں اپنا ارادہ نہیں بدل سکتی.

جنگل کی رانی جب یہ کہہ رہی تھی تو اس کا چہرا کوتوا کے پھول کی مانند زرد ہو گیا تھا درخت کا سہارا لیکر وہ کھڑی ہو گئی. اس کی آنکھیں چاندنی میں تاروں کی طرح چمک رہی تھیں پھر وہ بولی؛

" جاؤ! یہ گھوڑا لیکر چلے جاؤ، اس لئے کہ میرا فیصلہ میرے لئے بہت جانگسل ہے شاید میں اسے دیر تک برداشت نہ کر سکوں. اور اس طرح ایک بھولی عورت کو بھگا لے جانے کا الزام تمہارے ہی سر ہوگا"

راجہ اسکو حیرت سے گھورتا رہا. پھر اپنے دل میں کہا؛

" وہ بھولی جنگل کی دوشیزہ جو کچھ دیر پہلے میرے پاؤں کے پاس میٹھی میٹھی باتیں کر رہی تھی، اب اسی جگہ میں ایک ایسی عورت کو دیکھتا ہوں، جس کے پاک جذبات کو میں نے ٹھیس لگائی ہے. جو بگڑی ہوئی رانی کی طرح مجھے چلے جانے کا حکم دے رہی ہے. اور میں ایک مجرم کی طرح اس کے سامنے کھڑا اپنی ناکامی پر ہنس رہا ہوں"

پریم کے سندر سپنے میں کھو کر خود کو وہ اس دیوی کے قدموں پر گرا دینا چاہتا تھا کہ یکایک جنگل گھوڑوں کی ٹاپوں کی صدا سے گونج اٹھا اور چند لمحوں میں دیکھتے دیکھتے سواروں کی ایک بڑی جماعت نے جنگل میں سے نکل کر ان کو گھیر لیا.

(۷)

ایک چیخ مار کر رانی چمپتا پیچھے ہٹ گئی اور حیرت سے کبھی راجہ اور کبھی اس کے سپاہیوں کو دیکھنے لگی. راجہ نے مغرورانہ انداز میں خود سے کہا؛

" میں اپنے ساتھیوں کی اس بے جا مداخلت کو معاف کر دوں گا اس لئے کہ میری بھولی رانی اسوقت بالکل اس بارہ سنگھے کے مانند معلوم ہو رہی ہے جو شکاریوں کو دیکھکر چوکڑی بھرنا بھول گیا ہو. اور جس کی خوبصورت پتلی پتلی ٹانگیں خوف سے کانپ رہی ہوں، اور جس کا بے بس حسن پیچھا کرنے والے کے دل میں گھر کرتا جا رہا ہو. میرے ساتھیوں کی گردنیں بھی اس کے آگے خم ہو گئی ہیں. سچ تو یہ ہے. کہ دنیا پر حکومت کرنیوالی چیز صرف حُسن ہی ہے. اس لئے کہ اگر میں ان کے لئے اجنبی ہوتا، تو یہ کبھی میرا خیال نہ کرتے. برخلاف اس کے میری نیلی آنکھوں والی رانی کے حسن سے متاثر ہو کر وہ سب اس کے غلام بن گئے ہیں. جیسا کہ ایک نظر میں خود اپنے آپ کو بھول گیا تھا"

اور تب اپنے ساتھیوں میں سے راجہ نے ایک کو اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا اور اس سے کہا،

"اس عورت کو سمجھاؤ! یہ کون لوگ ہیں جو سر جھکائے ادب سے کھڑے ہیں۔ ۔ ۔ ؟"

تب اس نے کہا "اے خوبصورت عورت! ہم راجہ رودر الک کے جاں نثار سپاہی ہیں۔ اور تمام دن کی مسلسل دوڑ دھوپ کے بعد اب ہم اس کو ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن اس کامیابی سے ہمیں زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ ہماری آمد راجہ کی مصروفیت میں خلل کا باعث ہوئی۔

اور پھر راجہ نے کہا: "اب میرا گھوڑا لیکر جاؤ اور کچھ دور میرا انتظار کرو اتنی دور کہ میں تم کو آواز دیکر بلا سکوں"

راجہ کے خوبصورت ساتھی کو کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے وہ سب گھنے جنگل میں غائب ہوگئے

اور جب وہ چلے گئے تو کچھ دیر راجہ انی چمپتا کو خاموشی سے دیکھتا ہوا کھڑا رہا۔ جو تعجب اور حیرت کے گرداب میں گم تھی۔ اور تب اس نے کہا،

"نیلی آنکھوں والی! اب جبکہ تو سب کچھ سن چکی ہے اب بھی تجھے اپنے فرض کی ادائیگی میں کچھ تامل ہے؟ اپنے پتا کی آرزو کو پورا کرکے جیوتشی کی پیشین گوئی کو سچ بنا ——— اور اپنے سچے پتی کے ساتھ چلنے کو تیار ہوجا ——— کیا ابھی تک تجھے راجہ رودر الک کا خوف ہے ——— ؟

نیلی آنکھوں والی! مجھے معاف کر میں نے تیری پرکشا کے لئے یہ سب کچھ کیا۔ مجھے اپنے کئے پر پشیمانی ہے۔ لیکن تو نے میری تمام باتوں کو ٹھکرا کر اور اپنے ارادے میں مستقل رہ کر میرے دل میں پہلے سے زیادہ گھر کر لیا ہے۔ تیری روح کی پاکیزگی نے مجھے تیرا پجاری بنا دیا ہے!"

رانی کھڑی سنتی رہی، اس کے چہرے کا ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ کبھی زرد کبھی سفید کبھی سرخ اور کبھی گہرا سرخ، شاید خون کی روانی اس کی رگوں میں تیز ہوگئی تھی اور جب راجہ نے اپنی بانہیں پھیلائیں تو رانی نے خود کو اس کے حوالے کردیا۔ خوشی کے آنسو اس کی آنکھوں کی کٹوریوں سے چھلک کر راجہ کے سینے میں جذب ہوتے جا رہے تھے۔ وہ بہت دیر تک خاموش کھڑے رہے اور پھر راجہ نے اس کے سیاہ بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا:

"نیلی آنکھوں والی! اسوقت تو نے جتنے مردوں کو دیکھا یہ سب تیرے ادنیٰ غلام ہیں، اور ہر وقت تیری خدمت کے لئے حاضر رہیں گے"

رانی نے اپنا سر اٹھایا اس کے لب خوشی سے مسکرا رہے تھے اور آنکھیں مسرت سے چمک رہی تھیں۔ پھر راجہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے کہا،

"اب تو چاہے تو میں تیرے اس سوال کا جواب دے سکتی ہوں جس کو سنکر میں خاموش ہوگئی تھی"

اور راجہ نے پوچھا "کونسا سوال؟"

اور وہ بولی "کیا تجھے یاد نہیں؟ کیا تو نے مجھ سے یہ سوال نہیں کیا تھا کہ وہ آدمی کیسا ہو جس کو میں اپنا شریکِ زندگی بنانا پسند کروں گی؟"

راجہ اس کے اوپر جھک گیا اور اس کو اپنی بانہوں کی آہنی گرفت میں بھینچ لیا۔ جنگل کی رانی کی آنکھیں مسرت سے بند ہوگئیں۔ اور راجہ نے اپنے مرتعش لبوں کی مہر اس کے شہابی ہونٹوں پر ثبت کردی۔ چاندنی رات میں زمین پر ان دونوں کے تاریک سائے ایکدوسرے سے ملتے ہوئے کھو رہے تھے، ان پرچھائیوں کی طرف اشارہ کرکے راجہ نے اپنی رانی سے کہا:

"دیکھ تیری آرزو پوری ہوگئی اور تیرے سائے میں جان پڑ گئی ہے۔"

رانی نے اپنے ہاتھوں کو راجہ کی گردن میں حمائل کرتے ہوئے کہا:

"میرا سایہ نہیں بلکہ میں خود ہوں، اسمیں روح پڑ گئی ہے اور وہ روح تو ہے۔ اگر تو اسوقت مجھے چھوڑ کر چلا گیا ہوتا، تو میں اسوقت زندہ نہ ہوتی۔ اس لئے کہ میں تیرے جاتے ہی ندی میں کود کر جان دے دیتی"

راجہ نے ہنستے ہوئے کہا "کیا میں نے تجھ سے نہیں کہا تھا کہ مجھے خوف ہے تو ندی میں کود کر غائب نہ ہو جائے"

وہ کھل کھلا کر ہنسی اور ہنستے ہوئے بولی "اچھا تو مجھے جانے دو"

دونوں ایک لمحے تک ایکدوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر ان کے بے معنی قہقہے جنگل کی خاموش فضا میں گونجنے لگے۔ آخر کار راجہ نے کہا "اب مجھے اپنی پتنی کو لیکر گھر چلنا چاہئے۔ اس لئے کہ اب تجھ پر تیرے باپ کا حق نہیں رہا، بلکہ میرا اور ہم لوگ پھر کبھی آکر تیرے پتا سے ملیں گے۔ لیکن اب چونکہ میں تیرے بغیر نہیں رہ سکتا" وفادار پتنی نے کہا "جیسی راجہ کی مرضی۔ میں بھی اکیلی اس سنسان جنگل میں نہیں رہنا چاہتی" تب راجہ نے کہا "نیلی آنکھوں والی! آج پہلی مرتبہ گھوڑا دیکھا ہے اور اب تجھے اسی پر چڑھنا ہوگا" ——— مسکراتے ہوئے انی چمپتا نے کہا "لیکن میں گھوڑے پر چڑھنا نہیں جانتی یقیناً میں گر جاؤں گی"

تب وہ بولا "کیا تو خیال کرتی ہے کہ میں اپنے خزانے کو تنہا گھوڑے پر چھوڑ دوں گا، گھوڑا جو آج مجھے اس جنگل میں اکیلا لیکر آیا ہے ——— وہ کو اپنی پیٹھ پر لیکر واپس ہوگا۔"

اور جب راجہ اپنی رانی کو لیکر گھنے جنگلوں میں سے گزر رہا تھا، تو چاندنی رات میں ہوا نے کیا لطف و کیف پھیلا رکھا تھا، رانی کے پھولوں میں بسے سنہرے بال راجہ کے شانوں پر بکھر کر اس کے دماغ کو ابدی سرور بخش رہے تھے۔

—

سید مقبول حسین
(احمد پوری)

"شکوۂ عبث"

ہم محو رہے، بیخود سے رہے، وہ دادِ محبت دے بھی گئے
کیفیتِ غم کا شکوۂ عبث! جو دے گئے تھے وہ لے بھی گئے

---

(۱) یہ آرزو اب تک دل میں ہی
آنکھوں سے لگاتے قدموں کو
اور اشکِ رواں سے جی بھر کے
اے کاش دھلاتے قدموں کو
اس دل کی تمنا کر کے سوا، وہ آئے بھی اور چلے بھی گئے
ہم محو رہے، بیخود سے رہے وہ دادِ محبت دے بھی گئے

---

(۲) اے بادِ سحر پھولوں کی قسم
اس منزلِ پاک سے ہو جو گذر
کہنا کہ بہت اب خوار ہیں ہم
ایسے کہ نہیں کچھ اپنی خبر
تھا سعیِ عمل جو شعار کبھی، افسوس کہ اب اس سے بھی گئے
ہم محو رہے، بیخود سے رہے. وہ دادِ محبت دے بھی گئے

---

(۳) خاموش ہوں اب کیا منہ سے کہوں
وہ طاقتِ گویائی ہی نہیں
دکھلاؤں کسے یہ حالِ زبوں
وہ جذبِ مسیحائی ہی نہیں
یاں شرمِ عبودیت نہ رہی، وہ اپنی امانت لے بھی گئے
ہم محو رہے. بیخود سے رہے، وہ دادِ محبت دے بھی گئے

پروفیسر کنہیا لال کپور
(ایم اے)

علامہ ظہور

(۱)

علامہ ظہور کی وفات کے دو گھنٹے بعد ہی لوگوں نے ان کی زندگی، ان کی شاعری اور ان کے فلسفے پر مضامین لکھنے شروع کر دیئے۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ ملک کا ہر چھوٹا موٹا نقاد، افسانہ نویس، اور شاعر اگر علامہ کا ہم نوا نہیں تو ہم عصر ضرور تھا۔ اخبارات و رسائل نے ظہور نمبر نکالے۔ ادبی مجلسوں نے ظہور ریموریل قائم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ بہی خواہانِ ملت نے ظہور کنڈیگ ٹورنامنٹ، ظہور لانڈری اور ظہور فٹ بال بھی قائم کرنے کی سعیٔ بلیغ کی۔ مقرران آتش نوا نے علامہ کے کلام پر تقریریں کرکے خراجِ تحسین حاصل کیا۔

الغرض علامہ کی موت ہر ایک شخص کے لئے رحمتِ باری ثابت ہوئی جو شخص بھی علامہ ظہور پر مضمون لکھتا ہفتوں اس کا مجلسوں میں اس طرح استقبال کیا جاتا، گویا صاحب علامہ کے گنتی کے چند دوستوں میں سے ایک ہیں۔ شہرت حاصل کرنے کا اس سے بہتر موقعہ شاید ہی کسی کو ملا ہو۔

یہ سب باتیں مرزا ظریف ہر روز دیکھتا، اور پڑھتا، اور دل ہی دل میں کڑھتا کہ وہ شخص جن کو علامہ کی زندگی میں ان کی شکل تک دیکھنے کا بھی موقع میسر نہیں ہوا، ان کی موت کے بعد اس طرح باتیں کرتے ہیں گویا ان کی ساری عمر صرف علامہ کے ہی گھر کٹی۔ مثلاً ایک افسانہ نویس نے جس کا نام تک اس سے پہلے کسی شخص نے نہیں سنا تھا، لکھا "میں اور علامہ ہمیشہ ایک چارپائی پر سوتے تھے۔ اگرچہ علامہ بے حد فربہ بدن واقع ہوئے تھے، اور تنگ چارپائی پر میرے ساتھ سونے کی وجہ سے انہیں کبھی کبھی ساری رات نیند نہ آتی تھی، مگر دلی خلوص کا یہ حال تھا کہ کبھی زبان سے اُف نہیں کی۔ برابر پچاس سال وہ میرے ساتھ اسی کھاٹ پر سوتے رہے" ایک اور صاحب جو کسی گمنام اخبار کے ایڈیٹر تھے اس طرح رطب اللسان ہوئے۔

"علامہ دوپہر کا کھانا ہمیشہ میرے ہاں کھاتے تھے علامہ کو شلغم سے جتنی رغبت تھی، اتنی ہی بینگن سے نفرت تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے ایک رکاب کو، کہ جس میں بینگن کی بھاجی تھی، اس زور سے فرش پر پٹک مارا کہ پنگوڑا میں سویا ہوا بچہ خواب میں چیخ اٹھا"

اس مضمون کو پڑھ کر پروفیسر صاحب جھلا اٹھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ قوم کو یہ جاننے کی اتنی ضرورت نہیں، کہ علامہ کون کونسی سبزیاں زیادہ پسند فرماتے تھے جتنی اس امر کی کہ انہیں پسندیدہ پھلوں کے نام کیا تھے چنانچہ اسی دن انہوں نے اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر ایک نہایت دلچسپ مضمون لکھا "علامہ انگور اور کیلا بڑے چاہ اور شوق سے کھاتے تھے۔ کھجور ان کا من بھاتا پھل تھا مگر انار سے انہیں ازلی نفرت تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دفعہ جب وہ میرے دیوان خانے میں بیٹھے تھے، میں نے غلطی سے انہیں ایک قندھاری انار پیش کر دیا، اس کو دیکھتے علامہ کو متلی شروع ہو گئی، اور پورے دو گھنٹے کے بعد مشکل سے انکی طبیعت سنبھلی"

(۲)

تعجب کی بات یہ تھی، کہ جیسے جیسے دن گزرتے جاتے، علامہ مرحوم کے دوستوں کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا۔ ان کے دوستوں کے زمرے میں ہر قسم اور ہر شعبہ کے لوگ شامل تھے۔ پروفیسر، ادیب، حکیم، پنساری سپاہی باورچی، سائنٹسٹ جو مضمون نگار چھوٹے طبقے سے ہوتا، اور جس کو اپنی کم مائیگی کا زیادہ احساس ہوتا، وہ اپنے مضمون کی تمہید اس طرح باندھتا "علامہ کے ہاں چھوٹے اور بڑے کی تفریق نہ تھی، وہ ایک قلی سے مصافحہ کرکے اتنے ہی خوش ہوتے تھے جتنے ایک شہنشاہ سے میں کئی دفعہ ان کے مکان پر ان سے ملا، اور انہوں نے ہمیشہ خندہ پیشانی سے مجھے شرفِ ملاقات بخشا"

جس مضمون نگار نے اپنے مضمون کو زیادہ دلچسپ بنانا ہوتا وہ علامہ کے متعلق فرضی کہانیاں گھڑ کر مضمون میں ٹھونس دیتا۔ مثلاً ایک صاحب نے جو کسی امریکن بیمہ کمپنی کے ایجنٹ تھے لکھا "ایک دفعہ دورانِ گفتگو میں میں نے علامہ سے کہا، کہ آپ اپنی زندگی کا بیمہ کیوں نہیں کراتے۔ اس پر علامہ مسکرا دیئے، اور کہنے لگے۔ کہ بیمہ وہ کرائے جس کو موت کا ڈر ہو، میں تو موت کو راحتِ ابدی تصور کرتا ہوں، موت تو دروازہ ہے، جس میں سے گزر کر انسان بہشت میں داخل ہوتا ہے اس کے بعد آپ نے بار بار یہ شعر دہرایا ؎

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

علامہ نے یہ شعر کچھ اس طرح ادا کیا، کہ مجھ پر وجد طاری ہو گیا چنانچہ

... دن میں نے تو بہ کی، کہ آئندہ کسی شاعر، فلسفی، یا علامہ کا بیرہ نہیں لونگا ... سیاسی لیڈر سے لکھا۔

علامہ ہمیشہ مجھ سے سیاست پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ان ... ذہن سیاسی مسائل کو سمجھنے کی قابلیت نہ تھی مگر پھر بھی وہ ایک تنہا ... سیاست دان تھے۔ جب پہلے پہلے نہرو رپورٹ شائع ہوئی ... علامہ نے مجھ سے درخواست کی، کہ میں انہیں ساری کی ساری رپورٹ ... پڑھ کر سناؤں۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا"

ایک اور صاحب نے جنہیں مصور ہونے کا فخر حاصل تھا لکھا ... علامہ فن مصوری میں ہمیشہ گہری دلچسپی لیتے تھے۔ ایک دن میں نے ... ان سے پوچھا، کہ آپ کے خیال میں کیا محبت خوبصورتی پیدا کرتی ہے ... خوبصورتی محبت) علامہ نے فرمایا۔ یہ امر بحث طلب ہے بہر حال ... میرے خیال میں محبت خوبصورتی پیدا کرتی ہے۔ مثال کے طور پر اس ... کو دیکھئے کہ جسکو میں نے پال رکھا ہے۔ میرے لئے یہ دنیا کی حسین ترین ... بچی ہے۔ دنیا کی حسین کہ اس کے مقابلے میں دنیا کی خوبصورت سے خوبصورت ... رقاصہ دلہن یا ایکٹرس میری آنکھوں میں ہیچ ہے۔ میں یہ سنکر تصویر حیرت ... بن گیا کہ جس مسئلہ نے مجھے مدتوں پریشان رکھا تھا، علامہ نے ایک ... معمولی مثال سے اس کو میرے ذہن نشین کر دیا"

(۴۴)

مرزا ظریف نے علامہ کو اپنی زندگی میں ایک آدھ بار، دو یا تین سو گز ... فاصلے سے دیکھا تھا، ایک دفعہ جب کہ وہ ایک مجلس کے صدر کے فرائض ... انجام دے رہے تھے اور دوسری دفعہ جب کہ وہ فرسٹ کلاس کے ڈبے میں ... سوار ہو رہے تھے۔

چنانچہ ان دو ملاقاتوں کی بنا پر انہوں نے بھی علامہ پر قلم اٹھانے ... کی جرات کی، ایک لحاظ سے وہ حق بجانب تھے۔ کیونکہ کم از کم انہوں نے ... ان کی شکل تو دیکھی تھی یہ علیحدہ بات ہے۔ کہ انہیں ان سے گفتگو کرنے کا ... موقعہ نہیں ملا تھا۔ اور حقیقت یہ تھی، کہ اگر علامہ دس بیس برس اور زندہ ... رہتے تو ضرور ملاقات ہو جاتی۔ پھر جبکہ ہر ایک آدمی علامہ پر کچھ نہ کچھ لکھ ... رہا تھا، وہ کیوں چپ بیٹھتے۔ چنانچہ رسالہ انجم کے ظہور نمبر میں مرزا ظریف ... نے ۸۰ صفحے کا ایک طویل مضمون رقم کیا۔ جس کے ضروری اقتباسات ... نیچے درج کئے جاتے ہیں

"میں علامہ کو سب سے پہلی دفعہ سر دوہر مرحوم لالہ دیر مرحوم کے ساتھ ... ان کی کوٹھی پر ملا جس وقت وہ مجھے میرا تعارف علامہ سے کرا یا علامہ اس ... وقت اپنی داڑھی میں سے ایک سفید بال مونچنے سے نکال رہے تھے

آپ پہلے ہی دن مجھ سے کچھ ایسے مانوس ہو گئے، کہ رات کو میری دعوت اپنے گھر کی اور کھانا کھلا کر اپنی موٹر میں مجھے میرے گھر چھوڑ آئے۔ اس کے بعد کئی ملاقاتیں ہوئیں، اکثر وہ خود شام کو میرے گھر تشریف لاتے تھے اور آدھی آدھی رات تک اپنی بذلہ سنجی سے مجھے محظوظ کرتے تھے۔ ان موقعوں پر عجیب سماں بندھتا تھا۔ ایک دفعہ علامہ کو ایسی زبردست چھینک آئی، کہ میز پر پڑی ہوئی تینوں موم بتیاں بجھ گئیں۔ اتنے میں ایک بلی کا بچہ پھدک کر علامہ کی ٹوپی پر آ بیٹھا، اور علامہ بھوت بھوت کہہ کر کمرے سے نکل بھاگے۔ . . . .

ایک دفعہ علامہ میرے ساتھ دوکان پر چائے پی رہے تھے۔ کہ ایک لمبی ریش والا مولوی داخل ہوا، اور کہنے لگا کہ" علامہ آپ مزے سے چائے پی رہے ہیں، اور ادھر قوم تباہ ہو رہی ہے"۔ یہ سنکر علامہ کے ہاتھ تھرانے لگے۔ چائے کا پیالہ ان کے ہاتھوں سے نیچے گر پڑا، اور ان کی آنکھوں کو آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ . . . .

ایک دفعہ علامہ غلطی سے پاجامہ الٹا پہنکر میرے ہاں تشریف لائے میرے پاس اس وقت رحیم مرحوم بیٹھے تھے ہم دونوں علامہ کو دیکھکر قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔ مگر علامہ کو پھر بھی اپنی غلطی کا احساس نہ ہوا جب ہم نے پاجامہ کی طرف اشارہ کیا، تو کہنے لگے۔ کہ بھئی جس وقت میں شعر موزوں کرتا ہوں مجھے اپنے لباس کا کچھ خیال نہیں رہتا چنانچہ انہوں نے کوٹ اتار کر دکھایا، کہ قمیص بھی الٹی پہن رکھی ہے۔ . . . . . .

بیمار ہونے سے ایک ہفتہ پہلے انہوں نے میرے ہاں شام کا کھانا کھایا، رخصت ہوتے وقت کہنے لگا کہ" مرا معلوم ہوتا ہے، کہ یہ آخری دعوت ہے"۔ میں ان الفاظ کا کچھ مطلب نہ نکال سکا۔ مگر افسوس کہ یہ الفاظ صحیح پیشین گوئی سے لبریز تھے۔ اسی دعوت کے متعلق مجھے ایک اور بات یاد آ گئی، علامہ جاتی دفعہ بجائے اپنا بوٹ پہننے کے غلطی سے میرا بوٹ پہن کر چل پڑے۔ راستہ میں خیال آیا، اور پھر واپس لوٹے۔

بیماری کے دوران میں اکثر مجھ سے تخلیہ میں بات چیت کرتے تھے۔ مرنے سے چند منٹ پیشتر انہوں نے اپنے تازہ کلام کا مسودہ میرے سپرد کرتے ہوئے کہا" بھائی ظریف! یہ امانت تم ہی سنبھال سکتے ہو دیکھنا اس کی اشاعت میں تاخیر نہ کرنا۔ کیونکہ اس میں قوم کے لئے ایک تازہ پیغام حیات چھوڑ کر مر رہا ہوں"

ان الفاظ کے ساتھ علامہ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ میں نے دیکھا، کہ ان کے چہرے پر ایک عجیب مسکراہٹ تھی۔ ممکن ہے میں نے اس کا مطلب غلط لیا ہو۔ مگر میں سمجھتا ہوں، وہ اس لئے خوش تھے

کہ ان کا آخری کلام المعروف بہ "چراغِ سحری" محتاط ہاتھوں میں دیا گیا تھا؟

(۴)

اس مضمون کے چھپنے کے دو تین دن بعد مرزا ظریف کا شمار علامہ ظہور کے جگری دوستوں میں ہونے لگا۔ اور ہزاروں ادیب، ایڈیٹر، نقاد، ان کے مکان واقعہ کوچہ زرگراں پر "چراغِ سحری" کا مسودہ (کہ جس کو مرزا نے نہایت عرق ریزی سے ایک رات بارہ بجے تک بیٹھکر لکھا تھا۔) دیکھنے کے لئے اکٹھے ہوئے۔

امین حزیں
(سیالکوٹی)

منزلِ شوق

منزلِ شوق میں کیا جانے یہ کیا ہوتا ہے! — دل وہی ہوتا ہے پَر[1] ایک بلا ہوتا ہے

آبلہ پائی سے ہوتا ہے قدم اور بھی تیز — دردسے شوق بہرحال سوا ہوتا ہے

ہفتخواں طے ہوئے جاتے ہیں ادھر آپ سے آپ — بربطِ ذوق ادھر گرم نوا ہوتا ہے

ایک دھن ہے کہ بہرکیف لئے جاتی ہے — یہ بھی محسوس نہیں ہوتا کہ کیا ہوتا ہے؟

سیلِ دریا ہے کہ رکنا جسے آتا ہی نہیں — کوئی طوفان سا طوفان بپا ہوتا ہے!

دشت ہو، بحر ہو تاروں کی فضا ہو کچھ ہو — شوق خود مثلِ خضر راہنما ہوتا ہے

منزلِ شوق کا ہر ذرہ ہے تنویر سرشت
دن کو یہ مہر آئیں شب کو دیا ہوتا ہے

---

[1] میں جانتا ہوں کہ پَر مگر کے معنوں میں متروک ہے۔ لیکن یہاں اس کے بغیر کام نہ چل سکتا تھا۔ اس لئے استعمال کیا گیا۔
(امین حزیں)

از میر غلام ناصر خاں ایم اے

انتقام

(۱)

گاؤں سے باہر ایک بڑے نیم کے درخت کی چھاؤں میں موہن بیٹھا تھا۔ سامنے میدان میں گائیں اور بھینسیں گھاس چر رہی تھیں۔ اس کی مشاق اور تیز نگاہیں تمام جانوروں پر پڑ رہی تھیں۔ اور جب کوئی جانور چرتے چرتے ذرا دور نکل جاتا، تو وہ دوڑ کر اسے گھیر لاتا۔۔۔ اس کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ لیکن گاؤں کی کھلی اور تازہ ہوا میں قدرت کے ہاتھوں اس کی نشو ونما بہترین طریقہ پر ہوئی تھی۔ قد اور جثہ میں وہ اپنے باقی تمام ساتھیوں سے بڑھا ہوا تھا۔ وہ صبح پو پھٹنے سے پہلے اپنے باپ کے مویشی لے کر نکل جاتا تھا۔ اور شام کو چار بجے کے قریب واپس آتا تھا۔ شام کا باقی وقت اس کا اپنا ہوتا تھا، جسے وہ کھیل میں گزارتا تھا۔

اس نے نظر اٹھا کر دیکھا، ایک گائے نزدیک کے کھیت میں داخل ہو گئی تھی۔ موہن اپنی لکڑی لیکر اس کی طرف دوڑا: "اری خبردار کھیت میں جاتی ہے؟" اس نے گائے کو ڈانٹتے ہوئے کہا: "اگر اس نے پکڑ لیا تو تجھے کاٹ ڈالے گا!"

گائے بھاگ کر باقی جانوروں میں مل گئی، اور موہن پھر درخت کے نیچے آ کر تنے سے سہارا لیکر بیٹھ گیا۔ اس وقت وہ کچھ بے چین تھا۔ غالباً اسے کسی کا انتظار تھا۔ وہ بار بار مڑ کر گاؤں کی طرف دیکھتا تھا۔ آخر جب اس کا اضطراب بہت بڑھ گیا، تو اس نے اپنی گٹھڑی میں سے جس میں وہ اپنی روٹی باندھ کر لایا کرتا تھا۔ بانسری نکالی اور بجانے لگا۔ بانسری کی مست آواز چھاتے ہوئے پرندوں کی آواز سے ہم آہنگ ہو کر فضا میں گونجنے لگی۔

یکایک پیچھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ موہن نے بانسری ہونٹوں سے ہٹا کر مڑ کر دیکھا۔ ایک چھوٹی سی لڑکی بغل میں کچھ دبائے آ رہی تھی۔ موہن بانسری ہاتھ میں لئے ہوئے اس لڑکی کی طرف دوڑا، اور نزدیک آ کر بولا: "کیوں ری بملا! لائی چاول؟"

بملا نے اپنی بغل میں سے ایک پوٹلی نکالی اور طفلانہ معصومیت سے سر ہلا کر کہنے لگی: "ہاں ہاں لائی ہوں! یہ دیکھو!"

موہن نے جھٹ اس کے ہاتھ میں سے چاول [illegible] لئے اور [illegible]

ذرا تیوری چڑھا کر بولا: "اتنی دیر کیوں لگائی تو نے؟ تجھے معلوم نہیں تھا کہ میں یہاں انتظار کر رہا تھا؟ بھوک کے مارے برا حال ہوا جا رہا ہے بول، اتنی دیر کیوں لگی تجھے؟ بول!"

اس نے مارنے کو ہاتھ اٹھایا۔ لڑکی سہم گئی، اور خوفزدہ نظروں سے موہن کو دیکھنے لگی۔ جس نے پہلے تو اس کے چاول چھین لئے تھے، اور اب اس کو پیٹنے پر آمادہ تھا۔

"مجھے مارو مت!" بملا نے منت کے لہجہ میں کہا: "ماتا جی ابھی ابھی پتا جی کے لئے چاول لیکر کھیت پر گئی ہیں۔ جب وہ چلی گئیں، تو میں چاول چرا کر یہاں لائی ہوں"

موہن نے اپنا ہاتھ روک لیا اور بغیر کچھ کہے پھر نیم کے درخت کے نیچے آ کر بیٹھ گیا۔ بملا بھی خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے چلی۔ لیکن موہن کے تیور خراب دیکھ کر کچھ فاصلہ پر بیٹھ گئی۔

موہن کا غصہ ابھی تک نہیں اترا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر بملا کی طرف دیکھا۔ اور کہنے لگا: "اتنی دیر تک مجھے بھوکا رکھا۔ دیکھ تو اب میں بھی تجھے اپنے ساتھ نہیں کھلاؤں گا!"

اس نے پہلے اپنی گٹھڑی کھول کر دو موٹی موٹی روٹیاں نکالیں جن پر تھوڑا ساگ رکھا ہوا تھا۔ پھر چاولوں کی پوٹلی بھی کھول کر برابر ہی رکھ لی اور کھانا شروع کر دیا۔

بملا چپ چاپ بیٹھی موہن کو دیکھتی رہی۔ پھر جب اس نے دیکھا کہ اس کے چرائے ہوئے چاولوں کو اکیلا موہن ہی ختم کر دے گا، تو اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ اور وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا کر رونے لگی۔

موہن نے اس کی طرف دیکھا، اور پھر جھڑک کر کہا: "اری اب روتی کیوں ہے؟"

"مجھے بھوک لگی ہے:" بملا نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"بھوک لگی ہے؟" موہن نے کچھ نرم ہو کر کہا: "ایری تو تو کھا کر آئی ہوگی گھر سے!"

بملا نے سر ہلایا: "نہیں میں نے تو صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے"

موہن کو رحم آگیا بولا: "ارے تو تو نے یہ پہلے ہی کیوں نہیں کہدیا۔ چل جلدی سے آ۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تو بھی بھوکی ہے"

ببلا نے ساڑھی کے آنچل سے اپنے آنسو پونچھے اور موہن کے برابر بیٹھ کر کھانے میں شریک ہوگئی۔

کھاتے کھاتے موہن کو کچھ خیال آگیا کہنے لگا "ببلا تجھے یہاں آتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

ببلا بولی: "نہیں تو۔ ہاں راستہ میں موہنی ملی تھی۔ میں نے اسے بھی بلایا۔ مگر وہ کہتی تھی کہ مجھے پتاجی کی روٹی لیکر کھیت پر جانا ہے"

موہن نے کہا۔ "اگر وہ ہوتی تو اسوقت وہ بھی چاول کھا لیتی نا؟"

تھوڑی دیر میں دونوں کھانے سے فارغ ہوگئے۔ اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ ان کی گفتگو بالکل ایسی تھی۔ جیسے دو معصوم فرشتے ایکدوسرے سے مصروف کلام ہوں بعض اوقات دونوں کسی معمولی سی بات پر نہایت زور سے کھلکھلا کر ہنس دیتے تھے۔ انکی روحیں آزاد تھیں۔ اپریل کے مہینے میں چلنے والی اس خوشگوار ہوا کی طرح جس کی عطر بیزی اور مشک ریزی مشام جان کے لئے پیغام نشاط لائی ہے۔

اسوقت دونوں زمین پر آمنے سامنے اوندھے لیٹے ہوئے تھے۔ دونوں کی کہنیاں زمین پر ٹکی ہوئی اور ٹھوڑیاں دونوں ہاتھوں میں رکھی ہوئی تھیں۔ موہن کملا کے چہرے پر نظر گاڑے اسکی باتیں سن رہا تھا۔ وہ مویشیوں کو بھی بھول گیا اور اپنی بانسری کو بھی۔ جو اس کے برابر پڑی تھی۔ اس نیم کے درخت کے نیچے دو معصوم روحیں یکجا تھیں۔ جو سفر حیات کی دلکش ترین اور حسین ترین منزل میں ایک دوسرے کی رفاقت کر رہی تھیں

ببلا نے کروٹ لی اور آنکھیں مسل کر بولی: "مجھے نیند آئی ہے موہن"

موہن نے اپنی چادر کا تکیہ بنا کر ببلا کو دیدیا۔ اور کہا: "لے سو جا یہاں کافی ٹھنڈ ہے"

ببلا نے ہاتھ بڑھا کر چادر اس طرح سے لے لی گویا وہ اسکی اپنی ہی ہے۔ اور اسے سر کے نیچے رکھ کر آرام سے لیٹ گئی۔ موہن بھی درخت کے تنے سے کمر لگا کر بیٹھ گیا۔ اور اپنی بانسری کو ہونٹوں سے لگا کر ایک پھونک ماری، ساتھ ہی اسکی انگلیاں اس بے حقیقت لکڑی کے ٹکڑے پر رقص کرنے لگیں۔

ساری فضا پر موسیقیت چھا گئی۔ ببلا کی آنکھیں آہستہ آہستہ جھکنے لگیں، اور ذرا ہی دیر میں بانسری کے نغموں نے اسے تھپک کر خواب کی پرسکون دنیا میں پہنچا دیا۔ اور پھر موہن کی انگلیوں میں سستی آگئی

بانسری کا نغمہ ختم ہوگیا۔ اور موہن اس ستار نواز مغنیہ کی طرح خاموش ہوگیا۔ جو تمام رات اپنے کمال کا مظاہرہ کرنے کے بعد صبح کے اندھیرے گھنٹوں میں اپنے ستار پر سر جھکا کر سو رہی ہو!

(۲)

شباب نے انگڑائی لی حسن بیدار ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

محو خواب حسینہ نے آنکھیں کھولدیں، اس کا ہاتھ خود بخود ساری پر جو سوتے میں ڈھلک گئی تھی، اور اس کے شکنوں میں اپنے سینہ کے امڈتے ہوئے طوفان کو چھپا لیا۔ اسوقت وہ کچھ کھوئی ہوئی سی معصوم ہوتی تھی، اسکی آنکھیں دور افق پر جمی ہوئی تھیں، اور اس کی نقرئی انگلیاں بیتابی کے عالم میں لکڑی کے ایک ٹکڑے کے ساتھ مشغول تھیں وہ کچھ سوچ رہی تھی۔

یکایک وہ خود بخود سمٹ گئی گویا کسی کی آغوش سے نکلنے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر چونک کر اردگرد نظر ڈالی۔ اور اپنے تئیں تنہا پا کر خود ہی مسکرا دی۔ وہ خواب دیکھ رہی تھی —— ایک رنگین اور دلفریب خواب —!

وہ اسی طرح اپنے خیالات میں غرق بڑی دیر تک بیٹھی رہی سورج افق کے نزدیک پہنچ گیا تھا۔ لیکن اسے بالکل خبر نہ ہوئی۔ وہ اس نیم خوابی سے اسوقت جاگی، جب کسی نے دونوں ہاتھوں سے اسکی آنکھیں بند کرلیں۔ ببلا اچھل پڑی اور کچھ دیر تامل کرکے بولی: "اوہ موہنی تم نے تو میری آنکھوں میں درد کر دیا"

موہنی نے ببلا کی آنکھوں پر سے اپنے ہاتھ ہٹا لئے۔ اور اس کے پاس بیٹھ کر ہنستے ہوئے کہنے لگی: "اسوقت کیا سوچ رہی تھیں تم؟"

"یہاں بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی ابھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ببلا نے سر پھیر کر پیچھے دیکھا تو موہن کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اسکی آنکھیں کسی نوری جذبہ سے چمک اٹھیں۔ لیکن پھر کوئی خیال آتے ہی اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس نے شرما کر نظریں جھکا لیں، اور کچھ اس طرح سمٹ گئی۔ جیسے اب سے تھوڑی دیر پہلے خود بخود سمٹ گئی تھی۔ اس کا سارا بدن کانپنے لگا۔ اور وہ خاموش ہوگئی۔

موہن ببلا کے برابر بیٹھ گیا اور بولا: "ابھی ابھی موہنی کہہ رہی تھی کہ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔ جب میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ تو کہنے لگی کہ ببلا کے سامنے ہی بتاؤں گی"

"ہوں": ببلا نے بغیر نظریں اٹھائے جواب دیا۔

"ارے یہ آج کیا بات ہے؟" موہن نے حیرت سے پوچھا۔ ببلا

[illegible]

اس کا منہ اوپر کو اٹھایا۔ لیکن جب اس کا چہرہ موہن کے چہرے کے سامنے آیا، تو بملا نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ موہن سے آنکھیں ملانا نہیں چاہتی تھی

موہنی یہ سب کچھ دیکھکر اس طرح مسکرا رہی تھی، گویا کوئی بوڑھا آدمی بچوں کی شوخی دیکھ کر خوش ہو رہا ہو۔ آخر اس سے نہ رہا گیا۔ بولی۔

"میں سب کچھ جانتی ہوں موہن! اس کا تعلق بھی اسی بات سے ہے جو میں تمہیں بتانے کو کہہ رہی تھی"

موہنی نے ایک لمبی سی سانس لیکر کہا: "اچھا تو سنو! کل شام۔۔"

موہنی جان بوجھ کر رک رک کر بات کر رہی تھی۔ بملا پہلے تو آنکھوں آنکھوں میں منع کرتی رہی۔ لیکن موہنی نے کچھ پروا نہ کی اور اسی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر باتیں کرتی رہی۔ آخر بملا سے خاموش نہ رہا گیا۔ جلدی سے اٹھکر موہنی کے منہ پر ہاتھ رکھدیا۔

"کیا کرتی ہو موہنی!" اس نے آہستہ سے کہا

موہنی مسکرا کر بولی: "کیوں تمہارا کیا ہرج ہے؟"

بملا نے پہلے کنکھیوں سے موہن کو دیکھا، اور اس کے چہرے پر سرخی چھا گئی۔ پھر آنکھیں بند کرکے اس نے کہا: "مجھے شرم آتی ہے!"

"شرم آتی ہے!" موہنی نے بناوٹی استعجاب سے پوچھا: "کس سے شرم آتی ہے؟" پھر موہن کی طرف اشارہ کرکے کہا: "کیا ان سے؟"

بملا نے جواب نہیں دیا، اور دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا لیا

"ہاں تو کل شام!" موہنی نے پھر کہنا شروع کیا: "تمہارے پتا جی بملا کے گھر گئے تھے، اور اس کے پتا جی سے کہنے لگے۔۔۔۔۔۔"

بملا نے موہنی کے زور سے چٹکی لی۔ بے چاری بلبلا اٹھی۔ "اب تو میں سب کچھ ہی بتاؤں گی" اس نے پیشانی پر و بل ڈال کر کہا۔

"آخر تم نے یہ بات مجھے کیوں بتائی تھی، میں تمہارے گھر سننے کیلئے تھوڑا ہی گئی تھی!" پھر موہن کی طرف منہ کرکے بولی: "تمہارے پتا جی نے اس کے پتا جی سے کہا، کہ دیکھو چودھری موہن اور تمہاری بیٹی بملا کو آپس میں بچپن سے ہی بہت پریم ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان دونوں کی شادی ہو جائے"

"پھر کیا جواب دیا بملا کے پتا جی نے؟" موہن نے بیحد اشتیاق سے پوچھا۔

پیشتر اس کے کہ موہنی کچھ کہہ سکے۔ بملا دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا کر وہاں سے بھاگ گئی۔ موہنی کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی "موہن وعدہ کرو، کہ تم بملا کو واپس لے آؤ گے۔ نہیں تو میں تمہیں آگے نہیں بتاؤں گی"

"میں وعدہ کرتا ہوں" موہن جلدی سے بولا۔

موہنی نے کہا: "بملا کے پتا جی نے کہا، کہ میری تو خود ہی یہی مرضی ہے کہ ان دونوں کا سمبندھ ہو جائے۔۔۔۔۔۔۔۔ تو اب جلدی جاکر بملا کو پکڑ لاؤ"

بملا کچھ دور نکل گئی تھی، موہن اس کے پیچھے آوازیں دیتا ہوا دوڑا اور آخر دو تین ہی منٹ میں اسے جا پکڑا۔

"بملا چلو نا، موہنی تمہیں بلا رہی ہے" اس نے بملا کا ہاتھ پکڑ کر کہا

بملا کی سانس چڑھی ہوئی تھی، اس نے ملتجیانہ انداز سے موہن کو دیکھا اور بولی: "مجھے جانے دو موہن! میں تم سے التجا کرتی ہوں"

موہن کو کچھ رحم آ گیا۔ موہنی کو آواز دیکر اس نے کہا: "موہنی یہ نہیں آتیں۔ اب میں کیا کروں؟"

موہنی نے پکار کر کہا: "تم نے جو وعدہ مجھ سے کیا تھا، وہ پورا کرو"

موہن دوبارہ بملا سے مخاطب ہوا: "بملا چلو نا۔ آخر کیوں خفا ہو؟"

"نہیں موہن میں نہیں جاؤں گی اسوقت!" وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

موہن نے پھر موہنی سے پکار کر پوچھا: "بتاؤ موہنی میں کیا کروں اب؟"

اور موہنی نے وہیں کھڑے کھڑے جواب دیا: "کیا؟ گود میں اٹھا کر لے آؤ، مرد ہو تم سے اتنا بھی نہ ہو سکے گا؟"

موہن نے کچھ دیر تامل کیا، اور پھر جھک کر اسے اپنے مضبوط اور قوی بازوؤں میں اٹھا لیا۔ بملا کچھ دیر اس کی گرفت سے نکلنے کی جد و جہد کرتی رہی، لیکن اپنی تمام کوششیں ناکام ہوتے دیکھ کر اس نے اپنا جسم چھوڑ دیا، اس کی پیشانی پر پسینہ کے قطرے جمع ہو گئے۔ اور اس کا سر نیچے کو ڈھلک گیا۔

موہن بیخودی کے عالم میں اس مرمریں مجسمہ کو اپنی آغوش میں لئے کھڑا تھا۔ اس سے پہلے اس نے بملا کو کبھی گود میں نہیں لیا تھا، اتنی نزدیک سے اسے دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا، اسے بملا سے محبت تھی اسلئے کہ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا، وہ بملا کے ساتھ کھیل کر ہی جوان ہوا تھا، لیکن آج اسے بملا میں کوئی نئی بات نظر آ رہی تھی، اس کے حسن میں ایک نئی کشش اور جاذبیت پیدا ہو گئی تھی۔

بملا ایک بے جان مجسمہ کی طرح اس کی گود میں پڑی تھی، اس کی قوت مدافعت سلب ہو گئی، اور کسی خوش آیند وقت کے تصور سے اس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں، موہن نے اس کے گداز سینہ پر نظر ڈالی، جس کے متناسب اتار چڑھاؤ اور جس کی تیز تیز حرکت نے پہلی مرتبہ اس کے دل میں عشق و محبت کے لطیف احساسات پیدا کئے تھے، پھر اس کی نگاہ بملا

کے خاموش مگر تھرتھراتے ہوئے گلابی ہونٹوں پر پڑی ان ہونٹوں کے تبسم اور ان سے نکلی ہوئی آواز کے ترنم سے اس کے کان اس درجہ آشنا ہوگئے تھے کہ ان کی دلکشی اس کے نزدیک ایک بے معنی سی چیز تھی۔ لیکن آج موہنی کے الفاظ نے اس کی حالت بدل دی تھی، اس کے کانوں میں ایک نیا احساس اور اس کی آنکھوں میں ایک نئی نگاہ پیدا ہوگئی تھی، گرد وپیش کی ہر چیز اسے رومان میں ڈوبی نظر آ رہی تھی، اس کی نظروں کے سامنے سے پردہ اٹھ گیا تھا۔ اور وہ حسن وعشق کی دلفریب وادی کو اس کی تمام رعنائیوں کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔

موہن کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن آواز اس کے حلق میں اٹک جاتی تھی، اس نے ایک گہری سانس لی: "ببلا!" وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا، لیکن اس ایک لفظ ہی میں وہ سب کچھ کہہ گیا۔ اس بے معنی سے نام میں اسکی تمام حسرتیں اور ارمان پنہاں تھے۔ جب دو دل نشۂ محبت میں سرشار ہوتے ہیں، تو ایک ایک لفظ اور ایک ایک اشارہ میں وہ وہ کچھ کہا جا سکتا ہے۔ جس کی ادائیگی کے لئے الفاظ قطعاً ناکافی ہوتے ہیں

ببلا نے اپنی شرمگیں آنکھیں کھول دیں، اس نے پرشوق نگاہ سے ایک لحہ کے لئے موہن کے چہرے کو دیکھا، پھر اس کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی اور اس نے رک رک کر کہا: "کیا کہتے ہو موہن؟"

"ببلا مجھے تم سے پریم ہے" موہن کے دل کی گہرائیوں سے آواز نکلی۔

ببلا کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی "میں تمہاری ہوں موہن" اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا: "اور ہمیشہ تمہاری ہی رہوں گی میں التجا کرتی ہوں کہ ....."

موہن نے جواب نہیں دیا۔ اس نے ببلا کو اپنی گود میں ذرا دبایا اور مسکرا دیا، ببلا بھی مسکرا دی، اور اس نے شرما کر منہ پھیر لیا۔

اس تمام گفتگو میں آدھے منٹ سے زیادہ نہیں لگا ہوگا۔ ادھر موہنی نے پھر آواز دی: "کیا باتیں کر رہے ہو موہن بھیا؟ بس اسی طرح لئے آؤ"

موہن اسی طرح ببلا کو گود میں لئے موہنی کے پاس آیا اور اسے نہایت آہستہ سے زمین پر اتار دیا۔ اس کے بعد جب تینوں زمین پر بیٹھ گئے تو موہنی نے شرارت سے کہا: "اری ببلا! اگر موہن بھیا کی گود میں چڑھنے کو دل چاہتا تھا، تو صاف کیوں نہیں کہہ دیا؟ ان بہانوں سے کیا ہوتا ہے؟"

ببلا شرما کر مسکرا دی۔ بولی: "موہنی! تم مجھے ہر وقت کیوں چھیڑتی رہتی ہو؟"

آسمان کا مغربی گوشہ سرخ ہوگیا تھا۔ موہن نے بانسری ہونٹوں سے لگائی، اور شام کی خاموش اور پرسکون فضا میں ایک دلکش نغمہ گونج اٹھا

(۳)

ان باتوں کو ایک مہینہ ہوگیا۔ محبت کے بھوکے دو دل ہر دفعہ تنہائی میں ملتے تھے۔ موہنی ان کی رازدار تھی وہ معصوم روحوں کو اکٹھا دیکھ کر اس کو بے انتہا مسرت ہوتی تھی۔

لیکن نشاط و انبساط کا یہ دور کچھ دیر پا ثابت نہیں ہوا، امیدوں اور ارمانوں کا مرغزار باد مخالف کے تیز و تند جھونکوں نے برباد کر دیا۔

شام کا وقت تھا کہ گاؤں کا نمبردار ببلا کے گھر سے نکلا۔ ببلا کا باپ اسے باہر تک پہنچانے آیا، اس وقت وہ بہت خوش معلوم ہوتا تھا، اور نمبردار کی ہر بات پر اس کی باچھیں کھل جاتی تھیں۔

نمبردار اس سے رخصت ہو کر چلا ہی تھا کہ اسے پھر کچھ خیال آیا اور مڑ کر آواز دی: "چودھری جی ایک بات اور کہنا ہے مجھے"

ببلا کا باپ ایک زرخرید غلام کی طرح دوڑ کر نمبردار کے پاس آیا اور ادب سے جھک کر بولا: "فرمایئے سرکار! اور کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"میں چاہتا ہوں کہ یہ سب بات جلدی ہی طے ہو جائے" نمبردار نے کہا "گوپال میرا ایک ہی بیٹا ہے"

"جو حکم سرکار کا" ببلا کے باپ نے پہلے سے بھی زیادہ جھک کر کہا۔ "لڑکی آپ کی ہے کل ہی لیجائیے"

نمبردار نے پھر جانے کا ارادہ کیا، لیکن ایک اور بات سوچ کر ٹھہر گیا

"مجھے ایک اور فکر ہے چودھری جی"

ببلا کے باپ نے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا: "وہ کیا فکر ہے سرکار" اُسے یہ ڈر تھا کہ ببلا میں کوئی عیب نکال کر نمبردار معاملہ ختم ہی نہ کر دے۔

"مجھے اس لڑکے کی طرف سے فکر ہے" نمبردار بولا۔ "وہی نا موہن"

ببلا کے باپ نے ایک زمائشی قہقہہ لگایا۔ اور کہا۔ "اونہہ! اس چھوکرے کا کیا ہے؟ اس کا میں آج ہی انتظام کر دوں گا"

"ہاں مجھے بھی خبر تھی کہ ان دونوں کی سگائی ہو چکی ہے"

"اجی سرکار تو اس سے ہوا کیا؟" ببلا کا باپ بولا: "ایک سگائی کیا میں تو پچاس سگائیاں توڑ دوں گا۔ مجھے بھلا کیا معلوم تھا کہ ببلا کو آپ پسند کر لیں گے؟"

"اچھا چودھری! بس اب میں جاتا ہوں" نمبردار جاتے ہوئے بولا

"نمستے سرکار!" ببلا کے باپ نے دونوں ہاتھ جوڑ کر زمین پر جھکتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد جب ببلا باہر سے آئی تو اس کا باپ اس کا انتظار کر رہا تھا اس نے ببلا کو اپنے پاس بلایا۔ اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر

کہا "بیٹی ہلا! میں چاہتا ہوں کہ تم اب موہن سے نہ ملا کرو"

ہلا کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے شرما کر سر جھکا لیا، اور اسکے چہرہ پر ارغوانی رنگ چھا گیا۔ اس کا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا، اور وہ اس وقت کا تصور کرنے لگی جب وہ موہن کی بیوی بن کر اس کی آغوش محبت میں بیٹھی ہوگی، وہ سمجھ گئی کہ اسے موہن سے ملنے سے کیوں منع کیا جا رہا تھا۔ گاؤں کے دستور کے مطابق شادی سے اکیس دن پہلے لڑکے اور لڑکی کو آپس میں ملنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی تو کیا اکیس دن کے بعد وہ سچ مچ موہن کی ہو جائے گی؟ اسے اس بات کا افسوس تھا، کہ وہ اتنے دنوں تک موہن کو بالکل نہ دیکھ سکے گی۔ یہ دن وہ کس طرح گزارے گی؟ انتظار کی گھڑیاں کتنی کٹھن ہوتی ہیں، یہ وہ جانتی تھی یا موہن۔ جب شام سے دوسری شام کا انتظار ہی ان کے لئے دوبھر تھا۔ پھر اسے موہن کا خیال آیا۔ بیچارہ موہن! جب اسے معلوم ہوگا کہ وہ مجھے اکیس دن تک نہیں دیکھ سکتا، تو اس کا کیا حال ہوگا؟ وہ خود اپنی زبان سے کتنی بار کہہ چکا تھا کہ ہلا میں تمہیں دیکھے بغیر ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتا؟ مگر اس بات سے اسکی تسکین ہوگئی۔ اکیس دن وہ موہن کے اور موہن اسکے بغیر گزار سکتا تھا۔ اس کے بعد دنیا کی کوئی طاقت انکو علیحدہ نہیں کر سکے گی۔ دو محبت کی پیاسی روحیں ہمیشہ کے لئے اکٹھی ہو جائیں گی اور رہا موہن جو موجود ہے۔ وہ انکی ملاقات کی کوئی نہ کوئی سبیل ضرور نکال لیگی۔

یہ کچھ سوچ کر ہلا کا دل کا خوش ہوگیا لیکن وہ اپنے باپ کی زبانی بھی یہ بات سننا چاہتی تھی۔

"کیوں پتا جی کیا بات ہے؟" اس نے بھولے پن سے پوچھا۔ وہ مجسم اشتیاق بنی بیٹھی تھی۔ اسکے دل میں امید و بیم کی کشمکش ہو رہی تھی۔

"اب تو نمبردار کی ہونے والی ہے" اس کے باپ نے کہا۔

ہلا کے دل پر بجلی گر گئی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ شاید اس نے کچھ سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہا

"ہاں بیٹی! اب تو نمبر کی ہونے گی۔ ابھی وہ گوپال کے متعلق بات پختہ کر کے گئے ہیں" اس کے باپ نے جواب دیا۔

ہلا کا سر چکرانے لگا۔ جتنے منصوبے اس نے اپنے دل میں باندھے تھے ان سب کا خون ہوگیا۔ اس کی حالت اس پرندے کی سی تھی، جو خواب میں اپنے آپ کو آزادی کے ساتھ پھولوں کی ٹہنیوں پر اڑتا ہوا دیکھے، لیکن جب آنکھ کھلتی ہے، تو خود کو قفس کی تیلیوں میں بند پاتا ہے۔ اس کے باپ نے اسکی تمام آرزوؤں اور ارمانوں پر پانی پھیر دیا۔ اسے موہن کا خیال آیا۔ جب اسے معلوم ہوگا کہ اس کی ہلا اب اس سے چھن جائے گی، تو بھلا اس کی کیا حالت ہوگی؟ اس کا تو دل پھٹ جائے گا۔ پھر اسے اپنے وہ الفاظ یاد آئے، جو اس نے اسوقت کہے تھے۔ جب موہن اسے ایک بے بس بچہ کی طرح اپنی گود میں لئے کھڑا تھا۔ اسوقت اس نے کہا تھا "میں تمہاری ہوں موہن! اور ہمیشہ تمہاری ہی رہونگی" کیا اسے اپنا وہ وعدہ توڑ دینا چاہئے۔ جو اس نے اپنی عمر کے سب سے زیادہ پرکیف لمحہ میں کیا تھا؟ کیا موہن اسے معاف کر دے گا؟ کیا موہن اس وعدہ خلافی کے بعد اس کی صورت دیکھنا گوارا کرے گی؟

وہ کانپ گئی، اس سے ایسا کبھی نہ ہو سکے گا۔ موہن اور ہلا کی پریم میں ڈوبی ہوئی باتیں اس نیم کے درخت نے سنی تھیں جس کے نیچے وہ ہر روز ایکدوسرے سے ملا کرتے تھے ان پرندوں نے سنی تھیں، جو ان دو معصوم روحوں کو دیکھ کر ان کی باتیں سننے کیلئے نزدیک کے درختوں پر بیٹھ جاتے تھے۔ اور باد نسیم کے ان خوشگوار جھونکوں نے بھی جو ان کو دیکھ کر آپس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ جو وعدہ ان تمام چیزوں کو گواہ کر کے کیا جائے، اسکا توڑنا بھلا ممکن ہو سکتا تھا؟ اس نے اپنے باپ کی تجویز کی مخالفت کرنے کا ارادہ کر لیا۔

"پتا جی!" وہ سر اٹھائے بغیر بولی۔ "آپ ایسا نہیں کر سکتے!"

"میں ایسا نہیں کر سکتا؟" اس کے باپ نے حیرت سے پوچھا۔ "اس کا کیا مطلب؟"

"پتا جی گاؤں میں سب جانتے ہیں کہ ــــ"

"کہ تیری شادی موہن سے ہوگی؟" اس کے باپ نے بات کاٹتے ہوئے کہا "اگر میں تیرے متعلق کسی سے وعدہ کر سکتا ہوں۔ تو تیرا باپ ہونے کی حیثیت سے مجھے پورا اختیار ہے کہ اپنا ارادہ بدل دوں۔ اس میں کسی کا کچھ زور نہیں"

ہلا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "میں موہن کو دھوکہ نہیں دے سکتی پتا جی۔ میں اس سے عہد کر چکی ہوں اس کو بڑا دکھ ہوگا"

"مجھے موہن کی کچھ فکر نہیں جائے جہنم میں وہ، میں تو تجھے سکھی دیکھنا چاہتا ہوں" اس کے باپ نے ذرا بگڑ کر کہا۔

"موہن کے ساتھ میں بہت سکھی رہونگی پتا جی" ہلا ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اپنے باپ کی طرف دیکھ کر بولی۔

اس کا باپ اور بھی سخت لہجہ میں بولا "تو خواہ مخواہ ضد کرتی ہے ہلا، جیسا میں کہتا ہوں، تجھے ویسا ہی کرنا پڑے گا"

"میرا دل ٹوٹ جائے گا پتا جی" ہلا نے آخری [illegible]

میں کہا۔

"میری بات کو غور سے سن لے بملا! تو ابھی بچی اور ناسمجھ ہے۔ اپنی اچھائی اور برائی کو نہیں پہچان سکتی۔ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں، کہ تیری بہتری کس صورت میں ہو سکتی ہے۔ گوپال نمبردار کا اکلوتا بیٹا ہے۔ اس کے پاس دولت ہے۔ مویشی ہیں اور بہت سی زمین ہے اسکی ہر جگہ عزت ہے۔ گاؤں میں جہاں جاتا ہے، سب اسے سلام کرتے ہیں نمبردار بوڑھا ہو گیا ہے۔ چار دن کا مہمان ہے۔ اس کے بعد ان تمام چیزوں کا مالک گوپال ہوگا —— اور تو ہوگی، باپ کی موت کے بعد گوپال نمبردار بن جائے گا اور تو نمبردار کی بیوی ہوگی —— سنتی ہے بملا! نمبردار کی بیوی —— تجھے اپنے ہاتھ سے کوئی کام نہیں کرنا پڑے گا۔ تیرا حکم ماننے کے لئے بہت سے نوکر چاکر ہونگے۔ اور پھر جب تیرے پاس دولت ہوگی۔ تو ہمیں بھی اس سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ موہن کے پاس یہ باتیں کہاں ہیں، اس غریب کو کھانے کو روٹی تو میسر نہیں۔ تجھے وہ کیا خوش رکھ سکتا ہے؟ صبح سے شام تک وہ کھیت میں ہل چلاتا ہے۔ تجھے اس کے ساتھ کام کرنا پڑے گا، اور تیرا پھول سا بدن کملا جائے گا۔ خدا نے تجھے محنت کرنے کیلئے پیدا نہیں کیا ہے؟"

"پتا جی۔ بملا نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا؛ من کو سکھی رکھنے کے لئے دھن کی ضرورت نہیں۔ میں دولت کی بھوکی نہیں ہوں؟"

بملا کے باپ نے تیوری چڑھائی: "بملا تو نہیں جانتی تو کیا کہہ رہی ہے" اس نے کہا: "اگر تو گوپال سے شادی کر لے تو تیرے بھاگ کھل جائیں گے —— ہم سب کے بھاگ کھل جائیں گے۔ گاؤں کے سب لوگ میری عزت کریں گے۔ تو خود عیش اور چین سے رہیگی، گوپال تیرے واسطے بہت سا زیور اور خوبصورت کپڑے لا کر دے گا۔ تھوڑے ہی دنوں میں لوگ تجھے نمبردارنی کہیں گے۔ سمجھی!"

بملا نے ابلتے ہوئے آنسوؤں کی دھند میں سے اپنے باپ کے ظالم چہرہ پر نظر ڈالی، جس کی آنکھوں پر لالچ اور حرص نے پٹی باندھ دی تھی دولت کا یہ غلام سمجھتا تھا۔ کہ اصل خوشی روپیہ پیسہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اسے کیا معلوم تھا، کہ جس شخص کے من میں پریم کا سمندر موجیں مار رہا ہو، ہر قسم کی دنیوی آسائش سے بے نیاز ہوتا ہے۔ دولت اس کی دیوی تھی اور وہ اس کا پجاری، اسی دیوی کی قربانگاہ پر وہ اسوقت اپنی معصوم بیٹی کی مچلتی ہوئی آرزوئیں اور تڑپتے ہوئے ارمان بھینٹ چڑھا رہا تھا آہ! اپنی بیٹی کی فطرت سے وہ کس قدر ناآشنا تھا!! اس کے شیشہ جیسے نازک دل، اور اس کے مقدس جذبہ کو وہ کس بے رحمی سے پامال کر رہا تھا

بملا کی حسرت آمیز اور مایوس نگاہ سے اس کے باپ کا دل مطلق نہ پسیجا، وہ بولا: "اسوقت میں باہر جاتا ہوں، تو اس معاملہ پر خوب غور کر لے" یہ کہکر وہ بملا کو تنہا چھوڑ کر واپس چلا گیا۔

(۴)

اس رات بملا کو بالکل نیند نہیں آئی، اپنے باپ کی باتیں اسے رہ رہ کر یاد آ رہی تھیں، اور ان کا ایک ایک لفظ اس کے دل میں نشتر بن کر چبھ رہا تھا۔ آجتک اسے معلوم نہیں تھا، کہ اس کے باپ کو دولت سے اتنی زیادہ محبت ہے۔ لیکن اس کی شام کی گفتگو نے اسکی آنکھوں پر سے پردہ سا اٹھا دیا تھا۔ اور اسے ایک تلخ حقیقت کا احساس ہو چلا تھا۔ موہن کے متعلق بملا کے باپ نے جو الفاظ استعمال کئے تھے ان سے اس کا دل اندر ہی اندر دکھ رہا تھا۔

"مجھے موہن کی کچھ فکر نہیں" اس نے کہا تھا: "جائے جہنم میں؛ میں تو تجھے سکھی دیکھنا چاہتا ہوں"

"میرا باپ میری طبیعت سے کتنا ناواقف ہے!" اس نے دل ہی دل میں سوچا: "اسے کیا معلوم کہ موہن سے علیحدہ رہ کر میں سکھی نہیں رہ سکتی؟"

یہ وہ جانتی تھی، کہ گوپال امیر ہے۔ لیکن اسے دولت کی تمنا نہیں تھی، اس کا دل محبت کا بھوکا تھا، اور صرف موہن ہی اسکی روح کی تشنگی کو بجھا سکتا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے خود اپنا تصور کیا۔ وہ گوپال کی بیوی بن گئی تھی، اس کے بہت سے نوکر تھے وہ ایک خوبصورت ساڑی پہنے ہوئے تھی، اسکا جسم سونے کے زیوروں سے پیلا تھا۔ لیکن اسوقت اسی موہن کی دھندلی سی صورت نظر آئی۔ جو لمحہ بلحظہ صاف ہو رہی تھی موہن اسے دیکھ کر غمگین انداز سے مسکرایا، اس کے ہونٹ ہلے اور بملا نے یہ الفاظ سنے: "بملا کیا پریم کا یہی انت ہے؟"

بملا کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے، اور وہ نقشہ ہی اس کے دل سے جاتا رہا، پھر اسے وہ وقت یاد آیا جب وہ موہن کے کندھوں پر اپنا سر رکھے... بڑی دیر تک بیٹھی رہتی تھی، موہن اس سے پریم کی باتیں کیا کرتا تھا۔ اور وہ مست و بیخود بنی انہیں سنا کرتی تھی جب وہ کبھی نہ ختم ہونے والی بات ختم کر لیا کرتا تھا، تو بملا کو اپنی آغوش میں آہستہ سے دبا کر کہتا تھا: "تم مجھے پاگل سمجھتی ہوگی بملا" جب بملا اس سے پوچھتی: "کیوں پاگل کیوں؟" تو وہ جواب دیتا تھا: "بملا پریم میں انسان دیوانہ ہی ہوتا ہے" اور بملا مسکرا کر اس سے کہتی تھی: "تم بھی کتنے ..." اور یہ کہکر دل کی گہرائیوں میں سے ایک سانس لیتی تھی۔

آہ! اب یہ سب باتیں خواب موہوم کی طرح ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں گی۔ موہن کو اب وہ کبھی نہ دیکھ سکے گی۔ اسکی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی سی بندھ گئی، اور وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

دوسرے دن اس کا باپ صبح صبح اس کے پاس آیا تو تمام رات رونے اور جاگتے رہنے کے سبب سے اسکی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ اس کا باپ یہ دیکھکر بغیر کچھ کہے سنے کھیت کو چلا گیا۔ دن بھر کام کر کے جب شام کو وہ واپس پلٹا تو اس کے پاس ایک گٹھڑی تھی، اس نے وہ گٹھڑی لاکر ببلا کے آگے ڈال دی اور کہا "لے ببلا! نمبردار نے یہ تیرے واسطے ساڑھیاں بھیجی ہیں"

ببلا نے گٹھڑی لے لی، لیکن اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس کی حالت اس ماں کی طرح تھی، جس کا بچہ مرگیا ہو لیکن اس کے کھلونوں کو دیکھ کر اس کے دل میں بچہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہو، اور وہ آنسو بہا لیتی ہو۔

گٹھڑی میں چار خوبصورت اور بیش قیمت ساڑھیاں تھیں۔ لیکن ببلا نے لاپروائی سے انہیں ایک طرف ڈال دیا۔ اس رات اسے بےچینی تھی ضرور، مگر اتنی نہیں جتنی اس سے پہلی رات ہوئی تھی۔ جاگتے رہنے کی وجہ سے اس پر نیند کا بیحد غلبہ تھا، اور چارپائی پر لیٹتے ہی وہ دُنیا و مافیہا سے بےخبر ہو گئی۔

صبح کو جب اسکی آنکھ کھلی، تو دھوپ کافی پھیل چکی تھی، اسکا باپ آج ابھی تک کھیت پر نہیں گیا تھا، اسے ببلا کا انتظار تھا۔ ببلا منہ وغیرہ دھوکر سامنے آئی تو اس کے باپ نے نہایت محبت بھرے لہجہ میں کہا "بیٹی ببلا! ذرا ساڑھی پہن کر ہمیں دکھائی تو ہوتی۔ ایک کونے میں سب کچھ کیوں ڈال دیا؟"

"پتاجی اسوقت کچھ دل نہیں چاہتا" ببلا نے افسردگی کے ساتھ جواب دیا۔

"نہیں بیٹی ابھی پہن لونا۔ میں اسی وجہ سے تو کھیت پر نہیں گیا" اس کا باپ بولا۔

ببلا بادل ناخواستہ اٹھ کر اندر گئی، اور گوپال کی بھیجی ہوئی ایک خوبصورت ساڑھی پہن کر باہر نکلی، اسے دیکھ کر اس کے باپ کی باچھیں کھل گئیں، بولا "بیٹی اس وقت تو کتنی سندر معلوم ہوتی ہے! اور ابھی سے ہی کیا، شادی کے بعد دیکھنا، تو کتنے خوبصورت خوبصورت کپڑے پہنا کریگی" اس نے مصلحتاً زیادہ دیر گفتگو کرنا مناسب نہ سمجھا، اور ببلا کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر کھیت کو چلا گیا۔

ساڑھی اتارنے سے پہلے اس نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی،

اور خود ہی خود اسے اپنے حسن پر حیرت ہو گئی پھٹے ہوئے اور میلے کچیلے کپڑوں میں اسے اپنے متعلق کچھ گمان کرنے کا کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا، آج پہلی مرتبہ اس میں یہ احساس پیدا ہوا تھا، کہ وہ بھی خوبصورت ہے بڑی دیر تک وہ مبہوت سی آئینہ میں اپنی شکل دیکھتی رہی۔ پھر اسے کچھ خیال آیا، اس نے اٹھ کر اپنے بال بنائے اور ان میں ایک پھول لگایا۔ اور پھر آئینہ میں اپنا منہ دیکھا، اس وقت وہ بلا مبالغہ حور معلوم ہوتی تھی، اسکے لمبے اور سیاہ بال ناگن کی طرح اسکی کمر تک لٹک رہے تھے۔ اس کی مخمور آنکھیں بجلیاں گرا رہی تھیں، اس نے غرور سے سر اٹھا کر پیچھے کی طرف دیکھا لیکن وہ بالکل تنہا تھی پھر آئینہ میں اپنی شکل دیکھ کر آپ ہی مسکرا دی، اس کے عارضِ تاباں پر سرخی سی چھا گئی۔ ساڑھی کے باریک شکنوں میں اس کا شفاف سینہ، اور اس کا دلفریب اتار چڑھاؤ صاف نظر آ رہا تھا اس کا چاند سا مکھڑا، گلابی ہونٹ، اور اس کے اٹھتے ہوئے جوبن کی بہار کسی دیکھنے والے کے دل کا صبر و شکیب لوٹ لینے کو کافی تھے۔ اس نے اپنے سراپا پر ایک چھچھلتی سی نگاہ ڈالی۔ اور پھر خود ہی کسی سوچ میں پڑ گئی۔

اسے اپنے حسن اور دلربائی کا احساس ہو چلا تھا، اور اب اس دل میں غرورِ حسن آہستہ آہستہ پیدا ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی جہاں حسن ہو وہاں پرستار بھی ہونگے۔ جہاں شمع جلے گی، وہاں پروانے ضرور آئیں گے۔ اگر اسے دیکھ کر گوپال اپنا دل کھو بیٹھا تھا، تو اس میں تعجب کی بات ہی کیا تھی۔ درحقیقت وہ اس قابل تھی، کہ لوگ سے آنکھوں میں رکھیں، اور دل میں جگہ دیں۔ موہن نے اس سے محبت کر کے اس پر کچھ احسان نہیں کیا تھا۔ بلکہ موہن کی محبت کا جواب محبت سے دیکر خود موہن پر اس نے احسان کیا تھا۔ جب تک اس کی مرضی تھی، وہ موہن سے ملتی رہی اب، گر وہ اس سے ملنا چھوڑ دے، تو موہن کو شکایت کی قطعاً گنجایش نہ ہوگی، وہ موہن سے ملنے پر کچھ مجبور نہ تھی، اس نے موہن کا خیال کیا، جو اس وقت کھیت میں ہل چلا رہا ہوگا، اس کے پھٹے ہوئے کپڑے پسینہ میں تر بتر ہونگے۔ اور اس کے چہرے پر خاک جم گئی ہوگی۔ پھر اس نے ایک ادا سے آئینہ کی طرف مڑ کر اپنا خوبصورت چہرہ، سڈول جسم، گلابی ہونٹ اور بیش قیمت ساڑھی دیکھی، اور خود بخود نفرت کے ساتھ منہ بنایا۔

اس دن رات کو بھی ببلا بالکل نہ سو سکی۔ لیکن پہلی رات کیطرح اس کا دل غمگین نہ تھا، وہ اب دولت، عزت، اور اچھے اچھے کپڑوں کے سہانے خواب دیکھ رہی تھی۔ خدا نے اس کو یہ موقع دیا تھا کہ گاؤں کا نمبردار اس کو اپنی بہو بنانے کی خواہش کر رہا تھا۔ کیا اس موقعہ سے فائدہ نہ اٹھانا کفرانِ نعمت نہ ہوگا؟ اسے حیرت تھی کہ اتنے دنوں وہ

موہن کے ساتھ کس طرح محبت کرتی رہی، موہن کو یہ جرأت ہی کیونکر ہوئی کہ اس سے اظہارِ محبت کرے۔ اس نے یاد کیا، کہ بارہا موہن نے اسے اپنی آغوش میں لیا تھا۔ اور شرم و ندامت سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا، اسے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ اس نے اپنے پھول جیسے جسم پر ہاتھ لگانے کی موہن کو اجازت ہی کیوں دی؟

یہ سچ تھا، کہ وہ موہن سے بہت کچھ عہد و پیمان کر چکی تھی، لیکن اگر وہ وعدہ کر سکتی تھی تو اسے پورا کرنے کا بھی اسے ہی اختیار تھا۔ اب اسے اپنے باپ کے الفاظ کی قدر ہو رہی تھی "موہن کے پاس یہ باتیں کہاں؟" اس نے کہا تھا: "اس غریب کو کھانے کو روٹی تو میسّر نہیں تجھے وہ کیا خوش رکھ سکتا ہے؟ صبح سے شام تک وہ کھیت میں ہل چلاتا ہے۔ تجھے اس کے ساتھ کام کرنا پڑے گا۔ اور تیرا پھول سا بدن کمہلا جائے گا۔ خدا نے تجھے محنت کرنے کے لئے پیدا نہیں کیا ہے" واقعی اس نے یہ سب کچھ سچ کہا تھا۔

اس نے سوچا میرے باپ کو مجھ سے کتنی محبت ہے! میری بہتری اور خوشی کے لئے وہ کس قدر کوشش کر رہے ہیں۔ اور میں نے ان کو صاف جواب دیئے؟ ان کی سب تجویزوں کو رد کر دیا! میں بھی کتنی بڑی بیوقوف تھی، وہ تو انہوں نے عقلمندی سے کام لیکر مجھے سوچنے کی مہلت دیدی، ورنہ اگر میرا جواب نمبردار کو پہنچا دیتے، تو نمبردار اپنے بیٹے کے لئے کوئی اور لڑکی تلاش کر لیتا۔ اور میں پھر اس موہن کے سر منڈھی جاتی تمام دن مجھے محنت کرنا پڑتی، چولہا جھونکتی اور اس کے بچوں کی پرورش کرتی، نہ اچھے کپڑے پہننے کو ملتے، اور نہ زیور، اس غریب کے پاس روٹی کا سہارا تو ہے ہی نہیں، میرے واسطے کپڑے کیا خاک لاتا؟

صبح کو اس کا باپ پھر آیا۔ بملا کا چہرہ بشاش تھا، اور وہ بہت خوش معلوم ہوتی تھی، باپ نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا "بیٹی میں چاہتا ہوں کہ اسی ہفتے سب معاملہ ختم ہو جائے۔ نمبردار کی بھی یہی خواہش ہے، اور گوپال تو ایک ایک گھڑی گن رہا ہے"

بملا نے سر جھکا کر جواب دیا "جیسے آپ کی خوشی ہو پتا جی"

اس کے باپ کی باچھیں کھل گئیں، بولا "شاباش بیٹی، تو نے اس وقت ہماری لاج رکھ لی، اچھی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں میں ابھی نمبردار کے گھر جاتا ہوں"

وہ جانے کے لئے مڑا ہی تھا، کہ بملا نے اسے روک لیا "پتا جی" اس نے کہا۔

"تمہارا کام تو اب پورا ہو گیا کیسے دھیمی کیا ہے؟"

بملا نے دبی آواز میں کچھ شرما کر کہا "پتا جی! گوپال میرے لئے بہت سی ساڑھیاں لا دیگا؟"

"ہاں ہاں بیٹی"

"اور بہت سا زیور بھی؟"

"ہاں ہاں بیٹی"

"بہت سے نوکر میری خدمت کیا کریں گے؟" اس نے پوچھا

"ہاں ہاں" اس کے باپ نے اسے تیقین دلاتے ہوئے کہا۔ "تو اپنے ہاتھ سے کچھ بھی نہیں کرے گی، تیری خدمت کو بہت سے نوکر ہونگے"

"سب میری عزت کریں گے پتا جی؟" بملا نے پوچھا "سب مجھے سلام کیا کریں گے؟"

"ہاں بیٹی! سب تجھے سلام کریں گے"

بملا نے غرور سے سر اٹھایا اور بولی "اور ——— اور موہن بھی پتا جی؟"

"ہاں ہاں موہن بھی بیٹی" اس کے باپ نے زور سے ایک قہقہہ لگا کر کہا۔

(۵)

نیم کے تنے سے سہارا لگئے ہوئے موہن اکیلا بیٹھا تھا، اس کی ٹوٹی ہوئی بانسری اس کے پاس رکھی تھی، وہ کسی گہری سوچ میں تھا، اور اسکی نگاہ دور افق پر جمی ہوئی تھی، اور اس کا سر ایک جانب ڈھلکا ہوا تھا ——— "بھیا موہن!" کسی نے آہستہ سے کہا۔

موہن نے بغیر پیچھے سر پھیرے جواب دیا "کیا کہتی ہو موہنی؟"

موہنی برابر آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ زرد تھا، اور ہونٹ خشک ہو رہے تھے "یہاں اکیلے بیٹھے ہو تم؟" اس نے سسکی لیکر پوچھا۔

"ہاں اکیلا ہی بیٹھا ہوں" اس نے ٹھنڈی سانس لیکر کہا "بملا کی تو شادی ہو گئی نا، اب وہ یہاں کبھی نہیں آئے گی موہنی کبھی نہیں"

موہنی نے محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "موہن بھیا تم رنج نہ کرو۔ بملا تمہاری محبت کے قابل نہیں، اس نے تمہارے مقدس جذبہ کی قدر نہ کی، اس نے تمہیں دھوکہ دیا۔ اور اپنے تمام عہد پیمان توڑ دیئے جو اس نے مجھے گواہ کر کے کئے تھے، آہ! کسے معلوم تھا، کہ اس کے خوبصورت جسم میں پتھر کا دل ہے!"

"ایسا نہ کہو موہنی" موہن نے اداس لہجہ میں کہا "اسے مجبور کیا گیا ہوگا"

موہنی نے غصہ سے زمین پر پاؤں مارا "یہ سب غلط ہے! اس

نے زور سے کہا: "بالکل جھوٹ! اگر اس کی اپنی مرضی نہ ہوتی تو کوئی اسے مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ بھلا ہے کسی کی مجال جو میری مرضی کے خلاف میری شادی کر دے؟"

موہن نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا: "یہ کیا کہہ گئیں تم موہنی؟" وہ بولا۔ موہنی جھینپ گئی۔ شرم کے مارے اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اسے موہن سے بےحد الفت تھی، وہ اسے اپنا بھائی سمجھتی تھی۔ سو وقت اسے رنجیدہ دیکھ کہ موہن کا دل پھٹ گیا ہو وہ اس کے غم میں شریک ہو کر اسے تسلی دینا چاہتی تھی۔

"تم اسے بھولنے کی کوشش کرو موہن بھیا!" موہنی نے کہا: "بھلا ایسی بیوفا لڑکی کے لئے خود کو ہلکان کرنا کہاں کی دانشمندی ہے؟"

"میں اسکی بیوفائی سے اپنی وفا کا مقابلہ کرنا چاہتا ہوں موہنی!" موہن افسردگی کے ساتھ بولا۔ "وہ اپنے عہد و پیمان بھول جائے میں نہیں بھول سکتا!"

"وہ تو کہتی ہے مجھے موہن سے کبھی بھی محبت نہیں ہوئی، اس نے مجھ سے کیوں محبت کی تھی؟"

"وہ سچ کہتی ہے موہنی!" موہن نے افق پر نظر جماتے ہوئے کہا۔ "لیکن اگر ایسا ہی تھا، تو اس نے مجھے دھوکہ میں کیوں رکھا؟ پہلے سے ہی کیوں نہ بتا دیا؟ اگر وہ پہلے ہی یہ سب کچھ بتا دیتی تو آج مجھے اتنی تکلیف نہ ہوتی۔"

موہنی برابر بیٹھ گئی، اور پھر محبت سے موہن کا کندھا دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بولی: "مجھے تم سے دلی ہمدردی ہے موہن بھیا! تمہیں اسطرح دیکھ کر میرا دل اندر ہی اندر کڑھتا ہے!"

موہن نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور آہستہ سے بولا: "موہنی! بھلا سے نسبت کر کے جو نتیجہ میں نے دیکھا اس سے میرا اعتبار عورت کی طرف سے اٹھ گیا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ تمہاری باتوں کا مجھے کس حد تک یقین کرنا چاہیئے!"

موہنی ایک چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح بل کھا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی: "موہن بھیا!" اسکی آواز غصہ سے کانپ رہی تھی۔

موہن نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس نے موہنی کو اتنا خفا ہوتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اسے سخت ندامت محسوس ہو رہی تھی وہ مڑ کر موہنی کے قریب آیا، اور زیر لب بڑبڑا کر بولا: "مجھے معاف کرنا موہنی!"

موہنی نے سر جھکا لیا، اور اسکی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے: "تم نے میرے ساتھ سخت ناانصافی کی ... [illegible]"

کہا: "تمہارے ان الفاظ نے میرے دل کو بہت تکلیف پہنچائی ہے!"

موہن نے اس کے کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے اور بولا: "مجھے معاف کرو موہنی! مجھے سخت افسوس ہے کہ تمہارے معصوم جذبات کو میرے الفاظ سے ٹھیس لگی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہارے پہلو میں اتنا باوفا دل ہے۔"

موہنی نے اپنے آنسو پونچھے، دونوں پھر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر دونوں خاموش رہے۔ پھر موہنی نے [illegible] خاموشی کو توڑ کر کہا: "اب تمہارا کیا ارادہ ہے بھیا؟"

موہن نے کچھ سوچ کر جواب دیا: "موہنی میں اب یہاں نہیں رہ سکتا میں کسی اور گاؤں میں جا بسونگا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو بھیا! مگر کبھی کبھی یہاں ضرور آیا کرنا، تم کو دیکھ کر میرا دل خوش ہو جایا کرے گا!"

"موہنی میں تمہیں ہرگز نہیں بھول سکتا آج مجھے معلوم ہو گیا کہ دو عورتوں کی فطرت کسقدر مختلف ہو سکتی ہے تمہارے پہلو میں صحیح معنوں میں عورت کا دل ہے!" موہن یہ کہکر کھڑا ہو گیا۔ بانسری کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو اس نے دور پھینک دیا۔

"خدا حافظ موہنی!" وہ موہنی کا ہاتھ دبا کر بولا۔

موہنی آنسو بھری آنکھوں سے موہن کی لحظہ بلحظہ دور ہوتی ہوئی شکل دیکھتی رہی۔ جب وہ تاریکی میں چھپ کر اس کی نظروں سے غائب ہو گیا تو اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پکار کر کہا: "خدا حافظ موہن بھیا!"

موہنی آنکھوں کے ابلتے ہوئے سیلاب کو نہ روک سکی۔ اس نے اپنا منہ چھپا لیا، اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، اس نے عمر میں دو ہستیوں سے محبت کی تھی، اور تقدیر نے دونوں کو اس سے چھڑا دیا تھا۔

(۱۸)

بملا کی ماں نے اپنے آنسو صاف کئے اور بولی: "ہائے اب کھائیں گے کہاں سے؟"

بملا کا باپ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامے ہوئے بیٹھا تھا، اس نے کہا: "افسوس سال بھر کی محنت یوں بیٹھے بٹھائے ضائع ہو گئی۔ آگ نے تو ایک تنکا بھی باقی نہیں چھوڑا!"

"بدنصیب عورت نے ایک آہ بھر کے کہا: "اب بڑھاپے میں فاقے بھی تو نہیں ہو سکیں گے!"

بملا کا باپ کانپ گیا: "نہیں ہم فاقے نہیں کریں گے!" اس نے چلا کر کہا۔

. . . .

بملا کا باپ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس کے ذہن میں کوئی تبدیلی آ گئی "تم مجھ پر چھوڑ دو" یہ کہکر وہ باہر چلا گیا۔

آدھی رات کو جب تمام گاؤں والے دن بھر کی محنت کے بعد میٹھی نیند سو رہے تھے۔ نمبردار کے گھر کی طرف سے چور چور کا غلغلہ اٹھا سب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور لاٹھیاں لیکر دوڑ پڑے۔ اندھیرے میں لوگوں نے دیکھا کہ نمبردار کے گھر کی کھڑکی میں سے کوئی آدمی کود کر ایک طرف بھاگا جا رہا تھا۔ سب شور و غل مچاتے ہوئے اس کے پیچھے لپکے۔

یکایک مخالف سمت سے ایک دھندلی سی شکل آتی ہوئی دکھائی دی۔ یہ موہن تھا جو شہر سے واپس آ رہا تھا اپنے نئے مکان کو جانے کے لئے اسے اس گاؤں میں سے گزرنا پڑتا تھا دن کے وقت تو وہ گاؤں سے بچکر ہی نکل جاتا تھا۔ لیکن اب چونکہ رات تھی، اس لئے اسے کسی سے دوچار ہونے کا خدشہ ہی نہ تھا۔ چنانچہ وہ اس گاؤں میں سے ہو کر جا رہا تھا۔ اس نے دیکھا۔ کہ گاؤں کی طرف سے ایک شخص بھاگتا ہوا آ رہا تھا اور اس کے پیچھے بہت سے آدمی چور چور پکارتے ہوئے دوڑ رہے تھے۔

موہن دور سے ہی چور کو پکڑنے کے ارادہ سے راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اور جب چور نزدیک آیا۔ تو اسکی طرف جھپٹ پڑا چور ایک لمحہ کے لئے ٹھٹک گیا، اور پھر لاٹھی اٹھا کر ایک بھرا ہوا ہاتھ موہن کے سر پر مارا، موہن اس اچانک حملے سے بوکھلا گیا۔ لاٹھی اس کے سر پر پڑی اور وہ تیورا کر زمین پر گرا۔ لیکن گرتے گرتے بھی وہ چور سے گتھ گیا، اور اسے بھی اپنے ساتھ لے گرا۔

اتنے میں سب لوگ بھی پہنچ گئے۔ اور چور کو ہاتھوں ہاتھ پکڑ لیا ایک آدمی نے جھک کر گٹھری اٹھالی جو چور کے ہاتھ میں سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑی تھی، اس گٹھری میں کپڑے اور زیور تھے۔ ایک اور آدمی نے روشنی چور کی طرف کر کے اس کا منہ دیکھا۔ یہ بملا کا باپ تھا۔

"میں نے چوری نہیں کی" اس نے چیخ کر کہا "مجھے نہیں معلوم یہ گٹھری یہاں کس طرح آئی؟"

اس کی بات پر کسی کو یقین نہیں آیا۔ سب اسے گھسیٹتے ہوئے ایک کوٹھری میں لے گئے۔ جہاں اسکو بند کر دیا گیا۔ دوسرے دن اس کے خلاف چوری کی رپٹ لکھائی گئی، اور پولیس کے سپاہیوں نے اسے تھانہ میں بند کر دیا۔

(۷)

موہن کو بے ہوشی کی حالت ہی میں موہنی کے گھر پہنچا دیا گیا جہاں وہ بڑی دیر تک بے ہوش پڑا رہا۔ موہنی بہت پریشان تھی ہوش میں ہوتے موہن اس سے ملنے آیا تھا تو اچھا خاصا تھا۔ اور اس سے بڑی دیر تک باتیں کرتا رہا تھا۔ اب وہ زخمی تھا۔ یہ دوسری بار تھی کہ بملا کے باپ نے اسے زخمی کیا تھا۔ جسمانی زخم بھر جاتا۔ لیکن کیا روحانی زخم کا مندمل ہو جانا بھی ممکن تھا؟

ہوش آنے پر جب موہن نے اپنے گھر جانے کی خواہش کی تو موہنی نے یہ کہکر اسے روک لیا۔ کہ جب تک زخم مکمل طور پر ٹھیک نہ ہو جائے۔ تمہارا حرکت کرنا ٹھیک نہیں۔ اس تمام عرصہ موہنی ایک مشفق ماں اور محبت کرنیوالی بہن کی طرح موہن کی تیمارداری کرتی رہی اکثر گزشتہ باتوں کو یاد کر کے وہ آنسو بہا لیا کرتی تھی۔ بملا کی طرف سے اسکے دل میں رنج تھا۔ لیکن اس کے باپ سے تو اسے نفرت تھی خصوصاً جب سے اسے یہ معلوم ہوا تھا۔ کہ اس نے ہی موہن کو چوٹ لگائی تھی۔

ایک دن موہنی جب اندر آئی، تو موہن کسی گہری سوچ میں تھا موہنی نے اسکی توجہ ہٹانے کو ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں یکایک موہن نے گفتگو کا رخ پلٹ دیا، اور بولا "موہنی اس تمام واقعہ سے بملا تو بہت دکھی ہو گی؟"

"ہاں وہ بہت دکھی ہے موہن بھیا!" موہنی نے کہا۔ "اوّل تو تمام گاؤں کے طعنے نہیں سنے جاتے ہونگے۔ کہ باپ بیٹی کے گھر چوری کرنے کو آیا۔ اس پر طرہ یہ کہ نمبردار اور اس کے بیٹے کے بھی تیور خراب رہتے ہیں۔ بات بات پر گوپال کہتا ہے کہ گھر سے نکال باہر کروں گا"

"یہ تو بہت بری بات ہوئی نا پھر؟" موہن نے پیشانی پر بل لاتے ہوئے کہا۔

اور موہنی منہ بنا کر بولی "تو یہ بات اس کے باپ کو پہلے سے نہ سوجھی تھی؟ کیوں گیا تھا بیٹی کے گھر چوری کرنے؟"

موہن نے کچھ دیر تامل کیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دماغ میں کوئی زبردست کشمکش ہو رہی ہے۔ آخر اس نے سر اٹھایا اور کہا "موہنی!"

"کیا کہتے ہو موہن بھیا؟"

"موہنی اب انتقام کا وقت آ گیا، دو مرتبہ بملا کے باپ نے مجھے زخمی کیا، اب میری باری ہے"

"کیا مطلب ہے تمہارا آخر؟" موہنی نے کچھ سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

موہن نے ایک گہری سانس لی اور بولا: "اگلے ہفتہ ببلا کے باپ پر مقدمہ چلے گا، اور مجھے وہاں گواہی کے لئے جانا ہوگا۔"

موہنی نے اپنا سر زور سے ہلایا، گویا وہ سب کچھ سمجھ گئی۔ "ٹھیک! اب سمجھی میں، کیوں موہن بھیا مجھے کچہری میں نہ لے چلو گے؟"

موہن نے محبت سے موہنی کی پیٹھ پر تھپکی دی اور بولا "کیوں نہیں؟ تم بڑی خوشی سے چلو۔"

موہنی خوش ہو گئی۔ موہن کے چہرہ پر بھی ایک ہلکا سا تبسم آیا، پھر اس نے سر جھکا لیا اور کسی سوچ میں غرق ہو گیا۔

(۸)

کچہری کا کمرہ تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ببلا کے باپ پر آج مقدمہ چلنا تھا اور تمام گاؤں امنڈ آیا تھا۔ اس نوعیت کا مقدمہ آج تک پیش نہیں ہوا تھا جس میں کسی شخص کو اپنی بیٹی کے ہاں چوری کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہو۔ کچہری میں ایک طرف موہن بیٹھا تھا اس کا زخم ابھی اچھا نہیں ہوا تھا، اور اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی اس کے برابر موہنی بیٹھی تھی، دوسری طرف کچھ فاصلہ پر ببلا بیٹھی تھی موہن نے اسے دیکھا اور اس نے موہن کو۔ لیکن آنکھ ملتے ہی اس نے سر جھکا لیا، وہ کچھ شرمندہ سی تھی۔

گزرا ہوا زمانہ ایک بار پھر موہن کی نظروں کے سامنے آگیا اس نے آنکھیں بند کر لیں، اور اس کے دماغ کے پردہ پر چند شکلیں آگئیں، ان میں اس نے ببلا اور موہنی کو اچھی طرح پہچان لیا، اسے ایک بڑا سا نیم کا درخت بھی دکھائی دے رہا تھا، جس کے نیچے ان کی ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ اپنا بچپن اور ببلا اور موہنی کے ساتھ کھیلنا کودنا —— آہ! کیسا بے فکری کا زمانہ تھا! پھر اس نے محسوس کیا کہ وہ اور ببلا بڑے ہو گئے۔ اور عمر کے ساتھ ساتھ ان کے احساسات اور جذبات میں بھی نمایاں تغیر ہو گیا تھا۔ وہ منظر بھی اس کی آنکھوں کے سامنے آیا۔ جب وہ ببلا کو اپنی آغوش محبت میں لئے کھڑا تھا۔ ببلا کی نیلگوں آنکھوں میں پریم کا سمندر موجیں مار رہا تھا۔ اور وہ اس سے محبت اور وفا کے اقرار و پیمان کر رہی تھی: "میں تمہاری ہوں موہن" اس نے کہا تھا۔ "اور تمہاری ہی رہونگی، میں وعدہ کرتی ہوں۔"

موہن نے اضطراب کی حالت میں آنکھیں کھول دیں۔ ببلا سامنے بیٹھی تھی۔ وہ اب بھی حسین تھی۔ زمانہ کی بیرحم دستبرد سے اس کی بہار حسن ابھی تک محفوظ تھی۔ اس میں وہی رعنائیاں تھیں جنہوں نے ایک زمانہ میں موہن کو مست و بیخود بنا دیا تھا اس کی مخمور نگاہوں میں اب بھی ساغر و پیمانہ کی جھلک تھی، اور اس کے شباب میں اب بھی حشر سامانیاں تھیں۔ لیکن اب اس کا چہرہ مضمحل سا تھا۔ گزشتہ واردات کے صدمہ کی وجہ سے اس کا رنگ کملا گیا تھا۔ اور موہن سوچ رہا تھا۔ "وہ کتنی دکھی ہوگی!"

زنجیروں کی جھنکار نے موہن کو چونکا دیا۔ چار سپاہیوں کی حراست میں ببلا کے باپ کو لا کر ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہوئی تھیں، اس نے آتے ہی وحشت زدہ نظروں سے موہن کو گھور گھور کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے وہ نقشہ گزر گیا جبکہ موہن اس کے خلاف گواہی دے گا۔ اور عدالت اسے لمبی سزا دے گی۔ نہ معلوم کتنے سال اسے لوہے کی زنجیروں کے پیچھے گزارنا ہونگے!

گھنٹی بجی اور مجسٹریٹ اندر داخل ہوا، اسے دیکھتے ہی ببلا کے باپ نے پکارنا شروع کیا "حضور! میں بے گناہ ہوں۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے" ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر اس کے کہنی ماری، اور اسے خاموش کر دیا۔

سب سے پہلے موہن کا بیان تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر گواہوں کے کٹہرے میں آکھڑا ہوا، اس نے پہلے سر پھیر کر ببلا کی طرف دیکھا، جس کا چہرہ یکایک زرد پڑ گیا تھا۔ پھر ایک فاتحانہ انداز سے مسکرا کر اس کے باپ کو دیکھا۔ جو اس طرح کانپ رہا تھا، اور یہ تھی بھی قرین قیاس بات، اسکے مجرم ضمیر پر یہ بات بخوبی ظاہر تھی، کہ اس نے موہن کے خلاف ہر امکانی کارروائی کی تھی، ایک مرتبہ اسکی آرزوؤں اور امنگوں پر پانی پھیر دیا تھا اس کے حسرت اور ارمان بھرے دل کو چٹکیوں سے مسل کر پھینک دیا تھا اور دوسری مرتبہ اسکی جان لینے کو ہاتھ اٹھایا تھا۔ اب موہن کی باری تھی، انتقام کا وقت آگیا تھا

عدالت نے ملزم کی طرف اشارہ کر کے موہن سے پوچھا "تم اس شخص کو جانتے ہو؟"

موہن نے ملزم کی طرف دیکھا اور بولا "ہاں میں اس شخص کو اچھی طرح جانتا ہوں، مجھے افسوس ہے، کہ میری بیماری کے سبب اس شخص کو اتنی تکلیف اٹھانا پڑی۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" مجسٹریٹ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہی کہ یہ شخص بے گناہ ہے، میری بیماری نے اتنی بہلت ہی نہ دی کہ میں تمام بات صاف کر دیتا۔" موہن نے کہا۔

عدالت نے سوال کیا "تو پھر اصل قصہ کیا ہے؟"

موہن نے کہا: "مجرم میں ہوں، چوری کرنے میں نمبردار کے گھر گیا تھا

اور جب خبر ہو جانے پر میں کھڑکی سے کود کر بھاگا، تو گاؤں والے سب شور مچاتے ہوئے میرے پیچھے دوڑے۔ سامنے سے یہ شخص آ رہا تھا اور شور سنکر میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کو لاٹھی مارنا چاہا لیکن یہ پہلے وار کر چکا تھا۔ پھر مجھے معلوم نہیں کہ کیا ہوا جب مجھے ہوش آیا تو میں نے سنا کہ اس شخص کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔

عدالت کے کمرہ میں شور مچ گیا۔ لوگ چہ مگوئیاں کرنے لگے۔ بیلا کا چہرہ مسرت سے چمکنے لگا۔ اس کے باپ نے اطمینان کی سانس لی۔ موہن مبہوت سی بیٹھی تھی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اور وہ تمام کارروائی سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس کے بعد بیلا کی باری آئی۔ اس نے کہا۔ "رات کے وقت میں سو رہی تھی کہ کسی کے پاؤں کی آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ لالٹین کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ کوئی شخص میری طرف پیٹھ کئے ہوئے صندوق کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب اس نے میری طرف منہ پھیرا تو میں نے پہچان لیا وہی شخص ہے۔" بیلا نے موہن کی طرف اشارہ کیا۔ جو کھڑا ہوا مسکرا رہا تھا۔

بیلا کے باپ نے بیان دیتے ہوئے کہا "میں رات کو منڈی سے واپس گاؤں آ رہا تھا۔ کہ دور سے ایک آدمی دوڑتا ہوا دکھائی دیا۔ جس کے پیچھے اور بہت سے آدمی شور مچاتے ہوئے دوڑ رہے تھے۔ میں راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ تو اس نے مجھ پر حملہ کرنا چاہا۔ لیکن میں نے پہلے سے گرا دیا اس کے بعد سب آدمی آ گئے۔ اور انہوں نے مجھے پکڑ لیا۔"

مجسٹریٹ نے اس کی طرف دیکھا۔ اور پوچھا تم کچھ اور کہنا چاہتے ہو؟

موہن نے مسکرا کر پہلے بیلا کو، اور پھر اس کے باپ کو دیکھا۔ اور "نہیں سرکار! میں نے چوری کر کے ایک گناہ کیا ہے۔ اب جھوٹ بول کر اسے اور بھاری کرنا نہیں چاہتا"

عدالت کی طرف سے موہن کو ایک سال قید بامشقت کی سزا۔

موہنی کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ سپاہیوں نے آگے بڑھ کر موہن کے ہتھکڑی لگا دی۔ لیکن وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اس کا انتقام پورا ہو گیا تھا۔۔۔۔۔۔!!!

شاطر حکیمی کاشی

نوجوان کسان

دھوپ کی شدت سے دریا خشک ہیں صحرا اداس
جانور کچھ پھر رہے ہیں کھیتوں کے آس پاس!

لو کا یہ عالم کہ ننگے سے نہیں ملتی پناہ!
دن کی پیشانی پہ جیسے رات کا عکسِ گناہ

آگ کے شعلے اگلتی ہے زمینِ گل عذار
مجھ کو ڈر ہے سنگ و آہن میں نہ آ جائے گداز

یہ ہوا کے تند جھونکے اور یہ آندھی کا زور!
کبر کی محفل میں جیسے وقت کے ماروں کا شور

سر برہنہ پاؤں ننگے، دھیان میں کھویا ہوا
ہل چلانے جا رہا ہے عافیت کا "دیوتا"

آنکھ میں غصہ کی سرخی دل میں درد و اضطراب
اور ماتھے پر پسینہ کھا رہا ہے پیچ و تاب

یہ جوانی یہ تنِ نازک یہ کھدر کا لباس
کیوں نہ مرجائے مرے حساس دل کی بھوک پیاس

بانیٔ جبر و تشدد یعنی اے سرمایہ دار
دیکھ کس محنت سے کھیتی کر رہا ہے کاشتکار

دیکھ تیری ہستیٔ ناپاک مٹ جانے کو ہے
ہاں تری دنیا میں ظالم انقلاب آنے کو ہے

سراج الدین ظفر

لالہ و گل

ذرّے ذرّے میں محبت کا جو اعجاز نہ ہو
ابرِ آوارہ نہ ہو سبزہ سرافراز نہ ہو

میری ہر سانس کوئی سلسلۂ راز نہ ہو
پردۂ جاں میں کہیں خود تری آواز نہ ہو

پردۂ راز ہیں سرگرمِ تگ و تاز نہ ہو
اس طرح آ کہ کوئی پردہ نہ ہو راز نہ ہو

لے کسی جرمِ سرِ انجمنِ ناز نہ ہو
ڈر رہا ہوں کہ شکایت کا یہ انداز نہ ہو

دور رہتا ہوں ترے در سے ہمیشہ کہ کہیں
عشق آلودۂ ذوقِ ہوس و آز نہ ہو

تو نہ آئے جو گلستاں میں تو اے جانِ بہار
پھر کبھی بادِ سحر زمزمہ پرداز نہ ہو

عشق مجھکو مہ و انجم سے بھی آگے لے جائے
زندگی میری اگر حائل پرواز نہ ہو

کہیں یہ بھی نہ ہو آدابِ محبت کے خلاف
سانس بھی لے کوئی اسطرح کہ آواز نہ ہو

اور بھی راہِ وفا میں ہیں مسائل درپیش
روح بیتاب ابھی بر سرِ پرواز نہ ہو

مسکراتے ہیں ستارے مجھے چھوڑو کہ کہیں
اس طرف سے یہ مجھے دعوتِ پرواز نہ ہو

پردۂ زیست اٹھائے ہوس روئے حبیب
یہ جو اٹھ جائے کوئی پردہ نہ ہو راز نہ ہو

درد پر ناز ہے مجھکو کہ عنایت ہے تری
کون ہے جس کو عنایت پہ تری ناز نہ ہو

دیکھ پائے کسی کا فر کا جو اندازِ خرام
بوئے گل پھر کبھی آوارۂ پرواز نہ ہو

روز سنتا ہوں ہواؤں کے ترانے کہ کہیں
ترا پیغام نہ ہو، یہ تری آواز نہ ہو

شاعرِ راز ہوں ساز اپنا اٹھاؤں جو ظفر
دوسری میرے مقابل کوئی آواز نہ ہو

پروفیسر عشرت رحمانی
(ایم اے)

(ریڈیائی ڈراما)

طوفانِ محبت

افرادِ تمثیل

(۱) ماشا . . . . ایک نوجوان ملاح
(۲) شامو . . . . . ایک ماہی گیر کی نوجوان لڑکی (ماشا کی منگیتر)
(۳) سمندر کا دیوتا . . . .
(۴) ہوا کا دیوتا . . . .
(۵) چند اور آوازیں . . . .

تمہید (محبت ایک معمہ ہے۔ جسکو دنیا کے بڑے بڑے فلاسفر، عالم، پنڈت اور سیانے حل نہیں کر سکے۔ کہتے ہیں محبت انسان کو دنیا سے کھو دیتی ہے اس بیماری کا کوئی علاج نہیں مگر جاننے والوں کے نزدیک محبت کا درد دل کی دوا بنتا ہے۔ اسکو علاج کی حاجت ہی نہیں، محبت اصل میں ایک سہانا خواب ہے جسکی تعبیر میں ایک نئی زندگی ملتی ہے۔ اور اس زندگی کے دلچسپ زمانے کی کبھی انتہا نہیں ہوتی۔ موت بھی محبت کی زندگی کا ایک پیارا کھیل ہے۔ آسمان کتنے ہی رنگ بدلے۔ کیسے ہی طوفان آئیں، گھٹائیں چھائیں، آندھیاں چلیں دنیا کی ہر چیز مٹ کر خاک میں مل جائے مگر محبت کے بوئے ہوئے پودوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ محبت میں فنا ہونا حیاتِ جاودانی ہے)

آبادی سے دور، بہت دور ایک مختصر سا جزیرہ تھا — اس جزیرے میں سوائے چند جھونپڑوں کے یا چند سخت جان جھاڑیوں کے اور کوئی چیز نہیں تھی، طوفان اور آندھیاں آتی تھیں، اور چند جانیں بھینٹ لیکر چلی جاتی تھیں — چاندنی راتوں میں جوار بھاٹا آتا۔ اور وہ بھی چند زندگیوں کا خراج وصول کر لیتا آبادی سے دور — بہت دور بسنے والے نوجوان ماہی گیر مچھلیاں پکڑنے جاتے تھے — اور بڈھے لوگ کنارہ پر بیٹھے ہوئے انکی سلامتی کی دعائیں مانگا کرتے تھے عورتیں گھروں میں انکے آنے کا انتظار کیا کرتی تھیں۔

اس جزیرے کی مختصر آبادی میں — دو نوجوان دل ایسے تھے۔ جنکے دلوں میں محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور اسکی لہریں دن بدن بڑھتی جاتی تھیں — ماشا ایک نوجوان ملاح تھا۔ اور شامو ایک غریب ماہی گیر کی لڑکی — دونوں فطرت کی گود میں پل کر جوان ہوئے تھے۔

چلئے! آبادی سے دور، بہت دور۔ اس بستی میں جہاں ماشا اور شامو کی محبت اپنا نکھرا ہوا روپ دکھا رہی ہے۔ انکی شادی کی تاریخ ٹھیر چکی ہے)

پہلا سین

[ایک ماہی گیر کی جھونپڑی۔ رات کا وقت ہے۔ شامو بے خبر سو رہی ہے۔ کل اس کے بیاہ کی تاریخ ہے۔ اس کے ماں باپ رشتہ کنبے کے لوگوں کو بلانے گئے ہیں۔ شامو کو سوتے میں ایسا معلوم ہو رہا ہے۔ جیسے محبت کے فرشتے دور سے اسے میٹھے میٹھے سروں میں گیت سنا کر جگا رہے ہیں۔]

(یہاں بہت دور سے گانے کی سی آواز آتی ہے۔ گویا شامو خواب سن رہی ہے)

(گانا) جاگ اے حسین جاگ . . . . جاگ . . . .
تو جو محوِ خواب ہے
عشق بھی خراب ہے
سو رہی ہے زندگی
سو رہے شباب بھی
جاگ اے حسین جاگ

(شامو ایک بھیانک خواب دیکھ کر جاگتی ہے)

شامو: (ایکدم سوتے سے جاگ کر ڈری اور سہمی آواز میں) ہا — ہا! ہائیں! دیوتا بھگوان! ..... یہ ..... یہ ..... کیا تھا۔ میں نے کیا دیکھا۔ ایسا بھیانک سپنا۔ — اوہ... کیسا ڈراونا خواب — کیا تھا یہ۔

(ماشا آتا ہے)

شامو — (آہٹ سے گھبرا کر) کون ہے یہ؟ کیا — ؟

ماشا :- کیا ہو رہا ہے؟

شامو :- کون ماشا تم؟

ماشا :- ہاں میں۔ کیوں! میں اسوقت نہ آؤں کیا؟

شامو :- نہیں تو — کیوں نہ آؤ — میں ابھی .....

ماشا :- ابھی سو کے اٹھی ہو — اوں۔ میرے آنے سے بے چین ہوئیں؟

شامو :- نہیں ماشا! تمہارے آنے سے بے چین —؟

ماشا :- کیوں نہیں کیا؟

شامو :- تمہیں دیکھنا سب سے بڑا چین ہے۔ تمہارے نہ آنے سے بے چین —

ماشا :- یہ میرے دل کی بات تمہاری زبان سے

شامو :- کیوں نہیں — جو تمہارے دل میں ہے وہ میری زبان پر

ماشا :- شامو! ہمارے کیسے اچھے نصیب ہیں — ہماری محبت کے خواب کی —

شامو :- خواب — اوہ — ماشا — ابھی میں نے ایک خواب دیکھا۔

(آواز کانپتی ہے)

ماشا :- ہیں شامو۔ تم کانپ رہی ہو — کیسا خواب؟

شامو :- اُف — بہت ڈراونا — خواب —

ماشا :- تم خواب سے ڈر گئیں شامو۔ (ہنسنا)

شامو :- ہاں ماشا — بہت ڈراونی باتیں دیکھ رہی تھی۔

ماشا :- (ہنسنا) ارے چھوڑو بھی — خواب کی باتوں کا کیا کہنا۔

شامو :- تم ہنس رہے ہو ماشا۔ سنو تو، میں نے کیا کیا دیکھا۔

ماشا :- اونہہ۔ بھول جاؤ — سب خیال کی باتیں ہوتی ہیں — خواب کوئی چیز نہیں — ہم محبت کے پیارے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ڈراونی باتیں ہمارا کیا بگاڑ سکتی ہیں! (ہنسنا) یہ ہماری خوش نصیبی کے دن ہیں — ہنسو شامو خوش رہو۔

شامو :- (مسکرا کر) دیوتا ہمیں سدا ہنسی خوشی رکھیں۔

ماشا :- سدا خوش رہیں گے شامو — خوشی کا زمانہ آ گیا ہے — جانتی ہو کل کیا دن ہے —

شامو :- کل — (شرما کر ہنسنا) میں جانوں۔ برسپت ہے۔

ماشا :- (ہنستا ہے) ہاں برہسپت تو ہے۔ مگر یہ ہماری زندگی میں پہلا برسپت ہے۔ تم بن رہی ہو — یہ کاہے کیلئے شرا رہے شامو ذرا بتانا۔

شامو :- میں کیا جانوں — سنا ہے۔ کہیں کسی کا بیاہ ہے۔ اوں!

ماشا :- کہیں! کسی کا! بیاہ!! (ہنسنا) واہ ری میری بھولی دلہن۔ اچھا تمہارے پتا اور ماتا جی کہاں گئے ہیں۔

شامو :- برادری میں لوگوں کو بلاوے دینے گئے ہیں۔

ماشا :- کیوں؟ کسی کے بیاہ کے بلاوے وہ کیوں دینے لگے۔

شامو :- میں کیا جانوں — تم ہی ان سے پوچھنا!۔

ماشا :- ان سے کیوں پوچھوں — میں آپ ہی نہ بتا دوں۔

شامو :- کیا ہے

ماشا :- تمہارا بیاہ ہے (ہنسنا)

شامو :- (شرما کر) ہوں — ایسی باتیں کرو گے، تو ہم نہ بولیں گے۔

ماشا :- واہ — یہ کوئی بری بات تھی!

شامو :- پھر ہم بھی کہدیں گے —!

ماشا :- بھلا تم کہو گی کیا —؟

شامو :- یہی کہ تمہارا بیاہ! (ہنسنا)

ماشا :- اچھا — یہ تو سب سے اچھی بات ہے۔ کہے جاؤ۔ میرے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی ہے۔

شامو :- ماشا —

ماشا :- شامو۔

شامو :- کیا کل سچ مچ تمہارے بیاہ کا دن ہے؟

ماشا :- ہاں ہاں! — اور تمہارے بیاہ کا دن — کیوں! ہمارے بیاہ کا — مدتوں بعد ہمارے نصیب کے پھول کھلے۔ بس تو مرادوں کے دن ہیں مرادوں کی راتیں۔

شامو :- آج کی رات کیسی پیاری ہے؟

ماشا :- کل کا دن اس سے بھی پیارا ہوگا۔

شامو :- ماشا۔ پھولوں کی خوشبو کتنی۔

ماشا :- [illegible]

مست ہے۔ پھول ہماری خوشی پر ہنس رہے ہیں۔ چاند کو دیکھو! کھلا جاتا ہے۔ پیاری شامو کو دیکھتا ہے۔ اور مسکراتا ہے۔

شامو :- آہا — آج چاندنی رات ہے۔ سچ مچ چاند کی رات بھی کیسی سندر ہوتی ہے

ماشا :- مگر آج چاندنی کی بہار ہی اور ہے شامو۔ آکاش سے نور برس رہا ہے۔ میرے چاند کو دیکھ کر تارے بھی مسکرا رہے ہیں۔ یہ سب ہمارے نصیب کے باغ کے پھول ہیں، شامو۔

شامو :- نہیں۔ رات کی پری ہماری خوشی پر ناچ رہی ہے۔ اور یہ تارے اس کے گلے میں موتیوں کی مالا ہے کیوں، یہ سجاوٹ سدا نہ رہے ماشا۔

ماشا :- کیسی پیاری بات۔ ہماری محبت کے باغ کی بہار یونہی کھلی رہے (کسی کی ہنسنے کی آواز دور سے: ہا ہا ہا ہا)

شامو :- ارے یہ کون — ہنسا —

ماشا :- کوئی بھی نہیں نہیں تو کچھ وہم ہوگیا ہے۔

(پھر ہنسی کی آواز)

شامو :- نہیں ماشا۔ کوئی پھر ہنسا — وہ سنو . . .

ماشا :- چھوڑو ان باتوں کو شامو۔ دیکھو ہماری محبت کی دنیا کیسی سندر ہے۔ ہم اب اس بہاروں کی دنیا میں چین کی بنسی بجائیں گے۔

شامو :- سچ ہے ماشا۔ دیکھو تو یہ پھول۔

(دور سے شور کی آواز)

ماشا :- ہیں یہ شور کیسا —

شامو :- اونہہ — ہوگا کچھ — پھولوں کو تو دیکھو — آج ہماری چبوتری کے چاروں طرف سارے کھل رہے ہیں۔

ماشا :- اور جو رہ گئے ہیں وہ صبح تک کھل کر بہار دکھائیں گے — مگر کیسے جانتی ہو —

شامو :- ہاں تمہارے، ماشا دو لہا کے سر پر چڑھیں گے۔

ماشا :- نہیں — شامو دلہن کے گلے میں کھلیں گے (دونوں کا ہنسنا)

(شور کی آوازیں بڑھتی ہیں اور ہوا کی سائیں سائیں)

ماشا :- یہ شور تو سمندر کا ہے — کیا ہوا۔

شامو :- کچھ بھی نہیں — تمہارے کانوں میں ہر وقت سمندر کا شور رہتا ہے۔ وہی گونجتا ہے۔ اب یہاں بیٹھے بیٹھے جی گھبرا گیا تو سمندر کا دھیان آگیا۔

ماشا :- [illegible]

تمہاری رسیلی آواز گونجتی ہے — سمندر کے شور میں بھی مجھے تمہارے پیار کی میٹھی باتوں کا مزا آتا ہے۔

شامو :- یہ سب میرے بہلانے کی باتیں ہیں۔

(شور کی آوازیں بڑھتی ہیں)

ماشا :- نہیں نہیں شامو — سنو تو — ہوا کیسی تیز ہے — اور سمندر کے شور کی آوازیں بھی بڑھ رہی ہیں۔ نجانے کیا ہے۔

شامو :- ہوگا کچھ — تمہیں کیا سوچ ہے۔ تمہارے کام کا وقت نہیں رات ہے۔

ماشا :- اوہو — دیکھو نا بادل چھا گئے — چاند بھی چھپ گیا اندھیرا ہو رہا ہے

شامو :- تمہیں کیا ڈر ہے —

ماشا :- مجھے — میں اس شور کو دیکھنے ذرا —

شامو :- نہیں شور کو دیکھنے میں نہ جانے دونگی۔ تم رات کو تو کشتی نہیں چلاتے — تمہاری بلا سے کچھ ہوگا۔

ماشا :- تمہاری خوشی مگر —

شامو :- مگر کیا؟ — ماشا — اب میں تمہیں ہر وقت کشتی نہیں چلانے نہیں جانے دونگی —

ماشا :- اچھا (ہنس کر)

شامو :- اور کیا تم مجھے اکیلا چھوڑ کر دن رات کشتی کھیتے پھرو گے؟ میں بے آس بیٹھی جھکولے کھاتی رہوں گی۔

ماشا :- نہیں۔ شامو جو تم کہو گی وہی ہوگا۔

شامو :- کیا تم کل سمندر میں کشتی . . . . —

ماشا :- نہیں — کل میں پریم ساگر میں مگن —

(ایکدم شور تیز ہوجاتا ہے — ہوا بے حد زور پر ہے۔ چیخوں کی آوازیں قریب ہوجاتی ہیں۔ ماشا گھبرا کر اٹھتا ہے۔ اور جانے کا ارادہ کرتا ہے)

شامو :- نہیں نہیں۔ ماشا! تم اسوقت نہیں جاسکتے۔

ماشا :- میں جلدی آجاؤں گا۔

شامو :- ہرگز نہیں — میں تمہیں کبھی نہ جانے دونگی — میں نے ایسا ہی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ ٹھیک یہی — بالکل یہی — آندھی شور — طوفان — (شور)

ماشا :- شامو میرا فرض ہے۔ مجھے سمندر پر جانا چاہیئے۔

شامو :- ماشا [illegible] ہمارا ساوے [illegible]

کہنا نہیں مانو گے۔
ماشا:- کیوں نہ مانوں گا۔ شامو۔ مگر — اُف دیکھو تو طوفان کا کیا حال ہے۔ نجانے —

(طوفانی شور جاری ہے شامو گھبراتی ہے)

شامو:- اسی لئے۔ اسی لئے میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ میں نے ابھی خواب میں دیکھا تھا۔ اُف — میں تھی اور تم۔ ہم دونوں سمندر کے کنارے سیپوں سے کھیل رہے تھے۔ تم مجھے تھپک تھپک کر سلا رہے تھے۔ اور سریلی آوازیں کچھ گا رہے تھے
ماشا:- یہ سب خیال ہے شامو۔ ہم سدا ہنسی خوشی کھیلتے رہیں گے
شامو: (جلدی جلدی گھبرائی ہوئی آواز میں) نہیں — سنو۔ وہی سب کچھ اتنے میں ایکدم پانی کا شور اور ہوا کا زور بند ہو گیا۔ طوفان آیا۔ اور چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ سمندر کے طوفان میں تم جا کر پھنس گئے — اور (آواز بھرا جاتی ہے) نہیں نکل سکے — آہ! میں نے بہت ڈھونڈا بہت دیکھا۔ سمندر کی تہ میں کھوج لگایا۔ پھر نجانے کیا ہوا۔ ہم دونوں کہاں گئے۔
ماشا:- شامو یہ سب خیال کی باتیں ہیں۔ مجھے جانا چاہئیے۔ میرا فرض۔
شامو: کل ہمارا بیاہ ہے۔ اور تم طوفان میں جا رہے ہو۔ ماشا ٹھہرو۔
ماشا:- میں ابھی آ جاؤں گا — تم نہ گھبراؤ۔ جہاز ڈوب نہ جائے۔
شامو:- نہیں۔
باہر سے آواز:- ماشا۔ طوفان بہت بڑھ گیا ہے۔ جلدی چلو۔
ماشا:- دیوتا ہماری مدد کریں — شامو! میں جاتا ہوں۔

(ماشا جاتا ہے۔ شامو اس کو پکڑتی ہے چیختی ہے۔ ہوا کی سائیں سائیں انسانی چیخوں کی طرح ... سنائی دیتی ہیں)

آواز:- شامو۔ نہیں۔ ماشا نہیں۔ مت جاؤ۔ آہ۔ تم کہاں جاتے ہو ٹھہرو۔ نہ جاؤ
ماشا: چھوڑ دو شامو — مجھے جانا ہے۔ (چلا جاتا ہے)
شامو:- آہ! ماشا کہاں جاتے ہو۔ چلا گیا — وہ کہاں گیا (شور و غل اور طوفان) مدد (ہوا ایکدم تیز) اُف! مدد۔ میرے ماشا کو بچانا دیوتا بھگوان!! —

(طوفانی شور اور ہواؤں کا زور۔ طوفان کی تباہیوں کی آوازیں گونج رہی ہیں۔ اس میں دیوتاؤں کی آوازیں مل جل رہی ہیں۔ (جیسے شامو کے کانوں میں گونج رہی ہیں)

ہوا کا دیوتا:- (سائیں سائیں سائیں) سمندر کے دیوتا اب بس کرو۔

(خوفناک آواز)

سمندر کا دیوتا:- (شائیں شائیں) ہوا کے دیوتا — ہا! ابھی اور ابھی اور
ہوا کا دیوتا:- سمندر کے دیوتا یہ زور۔ (خوفناک آوازیں)
سمندر کا دیوتا:- ابھی اور — ابھی اور — ابھی اور اور اور ...
شامو:- آہ! کیسا شور — کیسا زور کا طوفان — دیوتاؤ — یہ کیسی آوازیں — ماشا کو کہاں ڈھونڈوں۔ کیسے جاؤں — ماشا تم کہاں ہو۔ کہاں ہو —
ہوا کا دیوتا:- سمندر کے دیوتا — اب دکھا چکو زور۔
شامو:- آہ دیوتاؤ! مدد۔ مدد۔ ہمارا بیاہ۔

(شور میں آوازیں دب کر رہ جاتی ہیں)

میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ ماشا کہاں ہو —
سمندر کا دیوتا:- ابھی کچھ نہیں ہوا۔ ابھی اور — ابھی اور — ابھی اور اور۔ اور۔ اور (ہنستا ہے)

(خوفناک قہقہوں کی گونج)

(طوفانی زور، ہوا بادل کی گرج۔ آوازیں، چیخ پکار)

دُوسرا حِصّہ

(سمندری سین)

طوفان کی رات کے بعد۔ صبح کے وقت

سمندر کا کنارہ:- (رات بھر طوفان کا زور شور رہا ہے اب آہستہ آہستہ ہلکا ہوتا جاتا ہے مگر ابھی باقی ہے۔ شامو نے رات مشکل سے اس آفت میں گزاری ہے۔ صبح ہوتی ہے۔ سمندر کے کنارے بھاگ کے پہنچی ہے۔ جہاز تباہ ہو چکا ہے۔ ڈوبے ہوئے لوگوں کی چیخ پکار ابھی تک جاری ہے۔ ہلکا ہلکا ہوا کا زور۔ اس کے ساتھ یہاں کی ہلکی نغمہ کی لہروں کا مل جل کر ایک دلدوز سماں پیدا کرنا)
شامو:- (گھبرائی ہوئی آواز میں) دیوتاؤ! مدد!! طوفان تو کم ہو گیا۔ میرا ماشا کہاں ہے — (کسی سے) بھائی تم نے ماشا کو دیکھا ہے؟
جواب:- کیا دیوانی لڑکی ہے۔ یہاں کسی کو اپنی خبر نہیں۔ ماشا کی کسے پڑی ہے (کئی آوازیں) لڑکی راستے سے ہٹ جا۔ ہمیں لاشیں لانی ہیں۔
شامو:- اوہ! لاشوں کا ڈھیر — نجانے یہ کون کون ہونگے بیچارے!
آواز:- لڑکی تو کون ہے! یہاں سے ہٹ جا۔
شامو:- میں کہاں جاؤں۔ تمہیں بتا دو ماشا — میرا ماشا کہاں ہے!

(لوگ اس پر ہنستے چلے جاتے ہیں)

دیوانی۔ جیسے ماشا جہاز کا کپتان ہو۔ سب اسی کو تو دیکھ رہے ہیں۔ ہونہہ ہٹ جا یہاں سے۔ جہاز ٹوٹ چکا۔ ہزاروں آدمی ڈوب گئے۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں۔

شامو:۔ دیوانہ! میرا ماشا کہاں ہے! جہاز ڈوب گیا (لوگوں کی مختلف بولیاں آنے جانے اور بچانے ڈوبنے کی آوازیں) ماشا۔ ماشا تم کہاں ہو وہاں۔ دیکھوں وہ ملاح اس کنارے پر آ رہے ہیں۔ انہیں میں ــــ میرا ماشا ہوگا۔ طوفان کم ہو گیا۔ اب میں اسکو ساتھ لیکے گھر چلی جاؤں گی۔ ماشا ہیں نکال رہا ہوگا۔ گندے مردے نہیں چھونے دونگی آج ہمارا......

آوازیں:۔ ارے دوڑو۔ وہ کشتی میں جہاز کے بچے ہوئے آدمی۔ کشتی بھنور میں آگئی ــــ دوڑو ــــ ملاح گھبرا گیا ہے ــــ چپو نہیں چلتا چلو چلو ــــ مدد مدد ــــ وہ ڈوبے۔

شامو:۔ ارے کیا کون ــــ ماشا ــــ ماشا تم کہاں ہو ــــ میں یہاں ہوں کشتی چھوڑ دو میرے ماشا چلو۔ ماشا۔ نہیں سنتے۔ میری بات سنو ــــ ماشا۔ ماشا تم کہاں جاتے ہو۔ ارے۔ کشتی۔ تمہاری کشتی ڈوبی ــــ ڈوبی ماشا۔ بچو ــــ آہ ــــ پانی کا چکر ــــ آہ ــــ او دیوتاؤ ــــ وہ سب ڈوب گئے۔ ماشا کہاں گئے ــــ کیا ہوئے اوہ ــــ آہ۔ ماشا ــــ

آواز:۔ دیوانی لڑکی کشتی ڈوب چکی۔ وہ سب ڈوب گئے۔ اب کہاں ہیں۔

شامو:۔ وہ بھی ڈوب گیا ــــ ماشا ڈوب گیا ــــ میرا ماشا (دیوانی ہو جاتی ہے) میرا ماشا۔ نہیں وہ نہیں ڈوب سکتا ــــ آج ہمارا بیاہ ہے ماشا پھول ہنس رہے ہیں۔ ماشا تم کہاں ہو ــــ کہو: تم کہاں ہو (ہنستی ہے) ہا ہا ہا۔ ماشا تم بھی ہنسو۔ سمندر بھی ہنس رہا ہے۔ آہ میرا سپنا...... (روتی ہے) میں تمہارے پاس آ رہی ہوں ماشا

(شامو کودنا چاہتی ہے ــــ کوئی دیکھ کر پکڑ لیتا ہے)

آواز:۔ لڑکی کیا کرتی ہے۔ جان دیتی ہے۔ ٹھیرو۔

شامو:۔ تم کون ہو۔ چھوڑ دو مجھے ــــ ہمارا آج بیاہ ہے ــــ مجھے چھوڑ دو ہا ہا ہا (ہنسی) آج ہمارا بیاہ ہے۔ تم جانتے ہو..... ہم نے پریم کی نیا بنائی تھی۔

شامو:۔ (گاتا)

اب ڈوب چلی موری پریم کی نیا۔ ٹوٹ گئے پتوار
ٹوٹت ہے مورا نیا کھویا۔ ڈوب گیا سنسار

پریم طن کی آس بندھا کے
چھوڑ کے موہے گرو ا لگا کے
آن ملے تھے پریم کے دوارے
بچھڑت ہو اب پریتم پیارے
جیون ساتھی انگ کے تارے

کہاں گئے ہو پریم کھویا ٭ ڈوب چلی موری پریم کی نیا

وہ دیکھو ماشا ــــ میرا ماشا مجھے بلا رہا ہے۔ ماشا تم کہاں ـــ میں آتی ہوں

(یکدم کود پڑتی ہے ــــ پانی میں کودنے کی آواز)

لوگوں کی آواز:۔ یہ کیا ہوا ــــ دیوانی لڑکی ــــ سمندر میں ڈوب گئی اتنی دیر سے پکڑے رہے ــــ ذرا ہاتھ ڈھیلا ہو گیا ــــ وہ دیکھو چھوٹ کے کود پڑی ــــ کسی کی محبت میں دیوانی تھی۔

دوسرا:۔ محبت کی طاقت نے ہی اسے کھینچ لیا ــــ محبت کا طوفان بھی عجیب ہے۔

(خوفناک شور کی آوازیں)

ہوا کا دیوتا:۔ سمندر کے دیوتا ــــ یہ کیا ہوا ــــ

:۔ ہوا کے دیوتا ــــ اچھا ہوا ــــ

:۔ سمندر کے دیوتا ــــ ان دو دکھیوں کو ڈبو دیا ــــ آج ان کے بیاہ کا دن تھا

:۔ ہاں آج انکے بیاہ کا دن ہے۔

:۔ خوشی میں غم ملا دیا ــــ غریبوں کو مٹا دیا ــــ اب بیاہ کہاں ہوگا ــــ؟

:۔ ہوا کے دیوتا ــــ تم کیا جانو ــــ بیاہ کہاں ہوگا ــــ جانتے ہو ــــ وہ کبھی نہیں مٹ سکتے

:۔ پھر وہ کہاں گئے؟

:۔ وہ دونوں محبت کے دھنی تھے ــــ انہیں ایک دوسرے سے سچی محبت تھی ــــ پاک اور معصوم محبت نے انہیں جوڑ دیا ہے۔ وہ کبھی الگ نہیں ہو سکتے۔ وہ محبت کی کشتی میں سوار ہیں دیکھو وہ محبت کی جنت میں ہیں . . . .

ہیں ــــ یہ کیا ــــ سمندر کے کنارے کھوہ میں۔ شامو اور ماشا دونوں بیٹھے ہنس رہے ہیں۔ یہ کہاں ــــ

وہاں ہیں ــــ جہاں محبت کی بستی ہے۔ خبت ولوت ہے۔ مسرت ہے۔ راحت ہے۔ کوئی طوفان محبت کو نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ دونوں پریم کی نیا میں چین کی بنسی بجا رہے ہیں۔ وہ دونوں وہاں ہیں ــــ جہاں

سے پرندوں کے نغموں کو ——— پھولوں کی خوشبو کو ——— بچوں کی ہنسی کو ——— سورج کی روشنی کو ——— چاند کی کرنوں کو ——— ہوا کی آہوں کو ——— ستاروں کی شعاعوں اور ساری دنیا کو حکم دیتے ہیں ——— آج ان دونوں کا بیاہ ہے۔ یہی محبت کا آخری نباہ ہے۔

(قہقہہ کی گونج)

دیکھا وہ کہاں ہیں "

(گانے کی آواز اونچی ہو جاتی ہے)

(دونوں دیوتاؤں کا گانا)

اس پار چلو، اس پار چلو
جہاں بہتی پریم کی دھارا ہے
جہاں پریم کے سندر پھول کھلے
وہی پیارا دیس ہمارا ہے
اس پار چلو

(پردہ گرتا ہے)

مجید لاہوری

کاروبارِ شوق

ترے خیال کو تجھ سے حسین بناؤں گا — ترے جمال کو کیف آفریں بناؤں گا!
خزاں کو دلکشیٔ رنگِ آرزو دے کر — چمن کو جانِ بہشتِ بریں بناؤں گا
کلی کلی کو جوانی کی مستیاں دوں گا — روش روش کو شباب آفریں بناؤں گا
سکوتِ مرگ میں ہنگامۂ بقا بن کر — نوائے شوق کو میں آتشیں بناؤں گا
جس اضطراب سے پُر اضطراب ہے عالم — اس اضطراب کا دل کو امیں بناؤں گا
تو مسکرائے گی ارماں بھری نگاہوں سے — بصد نیاز تجھے نازنیں بناؤں گا
سُنا سُنا کے ترے حُسن کی حدیثِ جمیل — بلند و پستِ جہاں کو حسیں بناؤں گا

شراب برسے گی فطرت کے میکدے سے مجید
سرودِ عشق کو یوں دِل نشیں بناؤں گا

نوٹ:- جن خریدار حضرات کی میعاد خریداری ختم ہو جائے، اور انہیں ختمِ میعاد کی اطلاع دیجائے تو بہتر ہے کہ وہ حضرات دفتر کو چٹھی کا جواب جلد دیں، بصورت دیگر پرچہ وی۔ پی آنے پر وی۔ پی وصول کر لینا ان کا اخلاقی فرض ہے۔ (مینجر)

راجندر سنگھ بیدی

دس منٹ بارش میں

ابو بکر روڈ شام کے اندھیرے میں گم ہو رہی ہے۔ یوں دکھائی دیتا ہے۔ جیسے کوئی کشادہ سا راستہ کسی گونگے کی کان میں جا رہا ہے۔ ورونیکا کی باڑ، ووگن ویلیا کی بیل، سفر مینا کا گلاب، قطب سید حسین مکی کے مزار شریف کے کھنڈرات پر حافظ کی غزل، اور زمرد میں آیات پڑھ رہے ہیں، ایک کھلتے ہوئے مشکی رنگ کی گھوڑی جس کی پشت نم آلود ہو کر سیاہ ساٹن کی طرح دکھائی دے رہی ہے۔ سب بھیگ رہے ہیں۔ . . اور راتا بھی بھیگ رہی ہے۔

راتا کون ہے؟ اسے کلپ برکش کہہ لو۔ یا کام دھین گائے۔ یا اس سے بہتر راتا . . . راتا ہے۔ ہیرا لال کی بیوی، ایک دس سال کے نااہل جاہل، کاہل چھوکرے کی ماں، چند ماہ ہوئے تخفیف کے موقع پر حیوم پائپ کمپنی کے مالکوں نے ہیرا لال کو کام سے برطرف کر دیا۔ اس کے بعد ہیرا لال کی پرسکون زندگی میں قسمت کے طوفان گرد باد پیدا ہوتے رہے۔ وہ تلاش روزگار میں نہ جانے کہاں چلا گیا۔ لوگ کہتے ہیں، کہ وہ عفت مآب راتا کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ گیا ہے۔ شاید اس لئے کہ راتا اس سے محبت کرتی ہے گویا جو کوئی محبت کرے، وہ پائے استحقار سے ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ مرچو تیزابی کا بیان ہے، کہ ہیرا لال اپنی ہی برادری کی ایک اور عورت کے ساتھ چلا گیا ہے۔ وہی عورت ——— گوری جو ابو بکر روڈ کے مکانوں میں سے گملے اٹھایا کرتی تھی۔ ان دنوں ہیرا لال بیکار تھا۔ بیکار آدمی کی عقل و فکر میں خون جگر پینے یا کثرت سے محبت کرنے کے سوا اور کچھ نہیں سما سکتا۔ لوگوں نے ہیرا لال کو ایٹورہ بزرگ گاؤں میں دیکھا ہے۔ مگر مرچو تیزابی کا بیان ہے کہ اس نے اسے کوٹ تپلی میں صفیں بناتے اور گڑگڑی کے کش لگاتے ہوئے دیکھا ہے۔ قریب ہی گوری کسی دوسرے مرد کے ساتھ مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی تھی۔ . . . . . . مگر راتا پھر بھی ہیرا لال کو دل سے چاہتی ہے۔ یہ محبت اور جنون کے انداز بھی کبھی چھپتے ہیں؟ ——— اور راتا بھیگ رہی ہے!

راتا کی مشکی رنگ کی گھوڑی ابو بکر روڈ پر ہماری کوٹھی کے سامنے گھوم رہی ہے۔ وہ اس کا شب تاریک کا سا رنگ صرف اس کے ہنہنانے اور یا کبھی کبھی ایکا ایکی چمکنے سے [illegible] کے [illegible] دکھائی دیتا ہے۔ جسم سے [illegible] کو دانہ نہیں دیا گیا۔ نہ ہی اس کی صبح والی ٹانگ پر ہلدی ہی لگائی گئی ہے۔ بھوک کی شدت سے بے بس اور بجز کردہ آوارہ ہو رہی ہے۔ شاید ہیرا لال کو ڈھونڈتی ہوگی۔ ہیرا لال ——— جو اسے بھی چھوڑ کر گوری کے ساتھ چلا گیا ہے۔ گوری جو کوٹ تپلی میں کسی دوسرے مرد کے ساتھ مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی تھی، اور ایک وقت میں ایک دل کے اندر یا مشکی گھوڑی رہ سکتی۔ یا گوری۔ یا گوری یا راتا . . . . . . بھوکی مشکی گھوڑی ہنہنا رہی ہے۔ اس انداز سے جس سے سکندر سے جدا ہونے پر بوسی فلس ہنہناتا تھا!

راتا اپنے سر سے بوریے کی اوڑھنی اٹھا کر پوچھتی ہے۔

"بابو جی ——— آپ نے یہاں رامی نہیں دیکھی . . . ؟ رامی ——— میری مشکی رنگ کی گھوڑی؟"

میں نے کہا: "رامی؟ کون رامی؟ . . . . گویا [illegible]

. . . . اچھا! رامی تمہاری مشکی رنگ کی گھوڑی۔ اری وہ ورونیکا کی باڑ کے نیچے تو کھڑی ہے، تمہیں دکھائی نہیں دیتی کیا؟"

راتا آنکھوں کو سکیڑ کر باڑ کی طرف دیکھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ جب کھلتے ہوئے مشکی رنگ کی گھوڑی شام کے وقت بارش میں بھیگ جاتی ہے۔ تو وہ بھی شب تاریک کا ایک جزو بن جاتی ہے، اور بے نور رو رو کر جوت گنوائی آنکھوں کو اسے شام تاریکی یا تاریکی شام سے جدا کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے . . . . . . بارش کے رم جھم، سرس کی لمبی لمبی پھلیوں کی کھڑکھڑ، گرتے ہوئے پتوں کی ٹوٹ، رعد کی گرج، بطخوں کی بدبط، مینڈکوں کی ٹراہٹ، پرنالوں کے شور، اس کتیا کی اونہہ ——— اونہہ، جس نے ابھی ابھی سات بچوں کا جھول جنا ہے۔ اور ایک بچے کو منہ میں پکڑے کسی بجھے ہوئے تنور کی متلاشی ہے۔ ان سب کے شور و غوغا میں بھوکی گھوڑی کی جگر دوز ہنہناہٹ علیحدہ سنی جا سکتی ہے۔

پرماشر کہتا ہے "میں بھیگ رہا ہوں . . . . اور وہ بھی بھیگ رہی ہے"

ماں خفا ہوتے ہوئے کہتی ہے: "گیلا . . گیلا . . گیلا! تنور بالکل گیلا ہو گیا ہے۔ اس؟ یہ موٹی کتیا تنور میں چھپی بیٹھی ہے۔ میرا تنور گر جائے گا . . . بے موقت کی بارش، رام رے . . . !"

ننھے لشن کا فراک گرکر صحن میں یوں پڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جیسے کوئی مری ہوئی فاختہ ہو۔ ماں ناراض ہے۔ کہ میں نے لشن کا فراک کیوں نہیں اٹھایا؟ حالانکہ رتنا کی گھوڑی پکڑنے میں میں سر سے پاؤں تک بھیگ گیا۔ ماں اس لئے بھی خفا ہے۔ کہ میں پراشر سے آوارہ مزاج نوجوان کے ساتھ بارش میں لنگوٹا باندھ کر نہانے کے لئے چلا ہوں۔ ماں کا خیال ہے کہ میں بھی اس کے ساتھ رہ کر آوارہ ہو جاؤں گا۔ حقیقت میں ماں کے ماتھے پر تیوری اس لئے ہیں۔ کہ میں نے رتنا کو مشکی گھوڑی پکڑنے میں مدد دی ہے۔ گھوڑی کو شام کی تاریکی سے علیحدہ کرتے ہوئے اسکی ایال رتنا کے ہاتھ میں دیدی ہے اور اس فعل کے ارتکاب میں اس سے چھو گیا ہوں۔

میں نے کہا: اسی پراشچت میں تو میں نہا رہا ہوں، ماں!

حقیقت یہ ہے۔ کہ اس قسم کی آلودگی کو میں پسند کرتا ہوں۔ پراشر کیا وہ تو ہر قسم کی آلودگی کو پسند کرتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کاش! پھر یا لال کبھی نہ آئے اور رتنا کو ہر ایک کام کے لئے ہمارا مرہون منت ہونا پڑے۔ کیا وہ گھوڑی ہی پکڑوائے گی۔ اور کوئی کام نہیں کہے گی؟

ماں کہتی ہے۔ لوہار، بڑھئی، چمڑہ رنگنے والے ایک برہمن کو چھتیس قدم، تاڑی بیچنے والے تیس قدم، جاروب بوسنے والے اڑتالیس قدم، موٹا ماس کھانے والے چوسٹھ قدم پرے سے بھرشٹ کرسکتے ہیں، مگر میں ماں کو کہتا ہوں، ماں! ان لوگوں کیوجہ سے تو ہم زندہ ہیں۔ براہمن کھیتی کی یہ لوگ باڑ ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر تھوڑی بہت پرانی سچائی کو بچانے کے لئے روز ازل سے زندہ ہے۔ ماں کہتی ہے۔ کل جگ ہے۔ گھور کل جگ!

بظاہر ماں لشن سے باتیں کر رہی ہے۔ مگر دراصل وہ سب کچھ مجھے سنا رہی ہے۔ مہا یگہ برہما کا ایک دن ہوتا ہے۔ کرت، کریتا، دواپر اتنے لاکھ برسوں کے ہیں۔ کل جگ چار لاکھ بتیس ہزار برسوں کا ہے۔ پچھلے برس چیت کے مہینے میں کل جگ کو صرف پانچہزار چھتیس برس گذرے ہیں۔ رام جانے ابھی کتنے باقی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور یہ بے وقت کی بارشیں!

"بارش نے کافی سردی پیدا کر دی ہے؟" میں نے کہا

"ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے تو دانت بجنے لگے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ چلو برآمدے میں چلیں"

"چلو ۔ ۔ ۔ ابھی بہت وقت تو نہیں ہوا"

"چائے بنوا دو نا — سردی ہو رہی ہے"

"چائے بن جائے گی۔ سگرٹ نہیں ملیں گے"

"کوئی بات نہیں! بڑھ ماں جو ہیں میرے کوٹ کی جیب میں"

"ہمارے ٹی سنڈیکیٹ کو تو اس بارش سے بہت فائدہ ہے"

"ہاں — چائے کے پودوں کی ڈھلوان جنوب کی طرف ہے اور بکر روڈ کا تمام پانی ادھر نہیں جاتا۔ مگر زیادہ بوچھاڑ چائے کے پودوں کے لئے نقصان دہ ہے۔ جڑیں گل جانے کا اندیشہ ہے۔ ہلکی ہلکی پھوار کا تو کہنا ہی کیا ۔ ۔ ۔ کچھ بھی ہو۔ یہ بارش ایسوسی ایٹڈ ٹی سنڈیکیٹ کے لئے فائدہ مند ثابت ہوگی۔ ہماری آمدنی بڑھ جائے گی۔ کیوں؟ ہے نا!"

"ہاں!"

"ایشور اپنی دیا بارش کے ذریعہ بھیجتا ہے!"

"ہاں — دیا ۔ ۔ ۔ ۔ آمدنی — ارے! رتنا کی جھونپڑی کی کھپریل اڑ رہی ہے!"

"یہ بھی ایشور کی دیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

اب بارش بہت زیادہ ہونے لگی ہے۔ گویا سب کی سب ابو بکر روڈ پر ہی برس پڑے گی۔ نکیٹر کے پتے بلنج کے پردوں کی طرح بھیگتے نہیں پانی کے قطرے ان پر پارے کی طرح لڑھکتے ہیں۔ کہیں کہیں اٹک کر ایک مدور ہیرے کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد ایک اور قطرہ وہیں ٹپکتا ہے۔ تو ہیرا زیادہ مدور اور بڑا ہو جاتا ہے۔ مگر نازک نازک رات کی رانی کے پھول اس بوچھاڑ کی تاب کہاں لا سکتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابو بکر روڈ کے دو رویہ کوٹھیوں میں بجنے والے نکیٹر کے پتوں کی طرح ہیں۔ بارش انکی سلیٹ کی چھتوں پر سے بہتی لڑھکتی ہوئی ابو بکر روڈ پر آ رہی ہے۔ بارش کے قطرے ان کے لئے مدور ہیرے ہیں ۔ ۔ ۔ مگر رات کی رانی — رتنا سر پھینکدیتی ہے۔ لگا ہے گا ہے سر اٹھا کر کھپریل کو باندھنا شروع کر دیتی ہے۔ اور اپنے بھیگے ہوئے بالوں کیوجہ سے وہ گن ویلیا کی حسین بیل دکھائی دیتی ہے۔

پہلے بیچاری مشکی گھوڑی کو ڈھونڈتی پھرتی تھی۔ اب یہ اس کیلئے ایک نئی مصیبت ہے۔ جھونپڑی کی تمام چھت سے پانی بہنے لگا ہے۔ بوسیدہ کی اوڑھنی تو محض رسمی پناہ ہے۔ اس کے تمام کپڑے بھیگ کر جسم کے ساتھ چپک گئے ہیں۔ شام کے اندھیرے میں جب بجلی چمکتی ہے، تو وہ عریاں سی دکھائی دیتی ہے۔

بارش میں ایشور کی دیا سے کوئی نرم گرم جامے زیب تن کرتا ہے کوئی عریاں ہو جاتا ہے۔ کسی کی آمدنی دوگنی ہو جاتی ہے، تو کسی کی کھپریل ٹوٹ جاتی ہے ۔ ۔ ۔ کوئی شب سرور گذارتا ہے، کوئی بےکس شب تور

وگن ویلیا کی بیل کو جب تند ہوا ہلاتی ہے، تو یوں دکھائی دیتا ہے گویا کوئی حسینہ سرو ہونے کے بعد لب بام اپنے چمکیلے سیاہ بالوں کو زور سے نچوڑ کر دونوں ہاتھوں سے جھاڑ رہی ہے۔ رتنا کا ۔ ۔ ۔ [illegible]

لڑکا جھونپڑی میں سویا پڑا ہے۔ بجھے ہوئے چولہے کے پاس گرم ہو کر ..... اگر وہ جاگتا ہوتا، تو مشکی گھوڑی پکڑنے کے لئے اسکی ماں کو میرا مرہونِ منت نہ ہونا پڑتا۔ پھر ایا لال تو چلا ہی گیا ہے کاش! وہ کاہل لڑکا ہمیشہ کی نیند سو جائے!

شاید راٹا کھپریل بند حوانے کے لیے ہمیں بلائے۔ اس کے بارش کی وجہ سے بدن کے ساتھ چپکے ہوئے کپڑے! بجلی کی چمک میں اس کا بدن کتنا خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔ اور ماں .... ماں کچی ہے کس جگ ہے۔

—— اور راٹا بالکل بھیگ چکی ہے۔

کلکتہ کی مارکیٹ میں چائے کتنی بکے گی؟ کتنی دساور کو جائے گی میری آمدنی بڑھ جائے گی پراشر کی بھی۔ ... مگر وہ کمبخت اور بڑیا پی جگا جائے کے پیالوں کے پیالے اور شراب اور ...... مگر راٹا کی کھپریل اڑ رہی ہے۔

" تجھے نکلے گلٹی، ہیضے کے تو مرے ..... سوئے کا سو یارہ جائے تو .... " راٹا اپنے چھوکرے کو گالیاں دے رہی ہے۔

راٹا کو چائے کی ضرورت نہیں، گالیاں دیتے ہوئے اس کے جسم میں کافی گرمی آ رہی ہے۔ وہ نکما سست لڑکا، اس کے ساتھ کھپریل بھی تو نہیں بند حواتا۔ آرام سے بجھتے ہوئے چولہے کے پاس پڑا رہتا ہے پانی کی چھینٹیں پڑتی ہیں، تو ٹانگیں سکیڑ لیتا ہے۔ جب اندر پانی ہی پانی ہو جائے گا، تو وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھے گا۔ صرف یہ کہے گا۔ ماں کیا بات ہے جو اتنا شور مچا رکھا ہے؟ چین سے سونے بھی نہیں دیتی۔ .... بھلا کوئی بات ہی نہیں، وہ تو شاید یہ بھی کہے میں ایسی عورت کے گھر کیوں پیدا ہوا، جو ایسی ایسی گالیاں دیتی ہے۔ جیسے میری کوئی بھی ضرورت نہیں، کہتی ہے۔ سوئے کا سو یا رہ جائے تو .... وہ بے وقوف کیا جانے کہ جب ماں یہ کہتی ہے، کہ تو سوئے کا سو یا رہ جائے۔ تو اس وقت وہ اسے ہمیشہ کی نیند سے بچانے کے لئے طوفانِ باد و باراں میں تن تنہا بے یار و مددگار اپنی جان تک لڑا رہی ہے۔

ابھی انتہائی گرسنگی کی وجہ سے اسکی مشکی گھوڑی یوں ہنہنا رہی تھی جیسے سکندر سے جدا ہونے پر بوس فیلس ہنہناتا تھا۔ مگر اب وہ خاموش ہے۔ شاید اس نے راٹا کی بے بسی کو دیکھ لیا ہے۔ اور پھر ایا کے پیار کو —— اب وہ کبھی نہیں ہنہنائے گی!

پراشر کہتا ہے " وہ ایک مرتبہ مدد کے لئے اشارہ تو کرے "

" تم پاگل ہو —— اور ہم دونوں ...... " میں نے جواب دیا۔

" میں کہتا ہوں۔ کیوں نہ ہم خود ہی چلے جائیں "

" مگر ماں کہتی ہے۔ کل جگ کو صرف پانچ ہزار برس گذرے ہیں رام جانے ابھی کتنے باقی ہیں "

پھر وہی گالیاں ......

" تجھے آوے ڈھائی گھڑی کی ..... نکلے تیرا جنازہ لیجا کے ..... گور میں پڑے ..... خون تھوکے تو ...... "

شاید وہ چھوکرا سوچتا ہوگا، میں کیوں اس عورت کے گھر پیدا ہوا جو مجھے گور میں بھیجنا چاہتی ہے۔ وہ بے وقوف کیا جانے، کہ حقیقت میں وہ اسے آبی گور سے بچانے کے لئے اپنی جان تک لڑا رہی ہے وہ دس سالہ بے عمل، غافل، کاہل چھوکرا اب تک اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ صرف اس لئے کہ راٹا کو اس سے محبت ہے۔ جس کا اس کو اچھی طرح سے احساس ہے۔ وہی راٹا کی زندگی کا سہارا ہے، وہی راٹا کی آنکھوں کا نور ہے۔ اسی لئے وہ بیکس اور اندھی ہے! ..... اگر راٹا پھر ایا لال کو محبت نہ کرتی، اگر وہ اس چھوکرے پر اپنی تمام امیدیں نہ لگا دیتی تو سکھی ہو جاتی

ابو بکر روڈ متحرک ہو کر کوئلے کی کان میں جاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے بہاؤ کے خلاف ایک دہقان جھکتا ہوا آہستہ آہستہ اسی جانب آ رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک بیل کی رسّی ہے۔ شاید وہ بیل کو کہیں سے چرا لایا ہے۔ غالباً اسکی خواہش ہے۔ کہ ہم اسے برآمدے میں کچھ دیر ٹھہرنے کے لئے جگہ دیں۔ اور یہ ممکن نہیں، کون جانے بیل گوبر سے برآمدے کا فرش خراب کر دے۔ اور ہاں ..... پھر چوری کے مال کو اپنے پاس رکھنا ..... !

" بابو جی سلام " دہقان کہتا ہے۔

" سلام " پراشر نے زیرِ لب کہا۔

پھر وہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں سے ایک گیلا کاغذ پراشر کے ہاتھ میں دے دیتا ہے —— پروانۂ راہداری ..... یہ اس بات کا ثبوت ہے، کہ بیل چوری کا مال نہیں، اپنا ہے۔ جسے وہ سال ہل کی منڈی میں بیچنے کے لئے لے جا رہا ہے۔

باعثِ تحریر آنکہ

ایک راس گاؤ نر جس کے سینگ اندر کو مڑے ہوئے ہیں، دُم سیاہ بالوں میں سفید ....

—— اور باقی کا بارش نے دھو دیا ہے۔ کتنے بے ربط ہوتے ہیں یہ دہقان لوگ، پہلے سینگ اور پھر دُم، بعد المشرقین، ان کے لئے گویا دُم اور سینگوں کے درمیان کوئی جگہ ہی نہیں۔ جسم کا رنگ پہلے آنا چاہئے تھا

مخملیں جسم ! اور وہ بارش میں گیلا ہو کر سفید ساٹن کی طرح دکھائی دینے لگا ہے اندھیرے میں اس کا سفید رنگ نظر آتا ہے۔ مگر جب بجلی چمکتی ہے تو بیل بجلی کا ایک جزو بن جاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بیل تمام زور لگا کر ہانکتا ہے۔ جس طرح شو جی مہاراج کو دیکھ کر پیارے ان کا نندی گن ہانک رہا ہو۔ شاید بیل بہت بھوکا ہے۔ مگر اپنے بوڑھے، مکروہ شکل مالک کو پیار کئے جاتا ہے اگرچہ جانتا ہے کہ بوڑھا کل اسے تال محل کی منڈی میں بیچ ڈالے گا ہائے ! محبت اور جنون کے انداز بھی کیسے عجیب ہیں !

"کیوں بیچتے ہو اتنے خوبصورت بیل لو ؟"

"بابو جی ۔ ۔ ۔ ۔ فصلیں تباہ ہو گئی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مالیہ دینا ہے ۔ ۔ ہائے ! یہ بے وقت کی بارشیں۔ کیا میں اندر آ جاؤں اس چھت کے نیچے ؟"

"اوں ہوں — تمہارا یہ بیل گوبر سے برآمدے کو خراب کر دیگا"

"میں صاف کر دوں گا بابو جی ! — شیشے کی طرح ۔ ۔ ۔ بیل صبح سے بھوکا ہے۔ اتنی سردی کہاں برداشت کرے گا اور پھر دوسری بات نہیں فقط یہ پروانہ راہداری دھل گیا، تو یہ بیل چوری کا مال سمجھا جائے گا۔ تال محل کا تھانے دار جہاں خاں بڑا کڑوا آدمی ہے مار مار کر آدھ موا کر دیگا میں جاتا رہے گا۔ تال محل میں اس بیل کی قیمت پر ہی تمام امیدیں لگا رکھی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہائے ! یہ بے وقت کی بارشیں"

"جاؤ" پراشر نے کہا ۔ ۔ ۔ ۔ "ہم تمہیں یہاں جگہ نہیں دے سکتے جاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

دہقان سہم کر چلا گیا۔ کبھی کبھی پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا ہے۔ گویا رات کو ہمارے ہاں ہی سیندھ لگائے گا۔ "اگر وہ سیندھ لگائے بھی تو حق بجانب ہے" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

بیل ابو بکر روڈ کے چوک پر گر پڑا ہے، وہ دہقان کے اٹھائے ۔ ۔ ۔ کسی کے اٹھائے نہ اٹھے گا۔ وہ نندی گن کی طرح دہقان کو دیکھ کر کبھی نہیں ہانک لگائے گا۔

"اور وہ سنگل چائے نہ پی تھی ! ۔ ۔ ۔ نہیں ! ۔ ۔ ۔ کتنے کاہل ہو تم ! راتا کے جھونپڑے کی طرح۔ مگر ہم تم سے محبت نہیں کرتے۔ مار مار کر جان نکال دیں گے — یہ جو کایستھ کے گھر نوکر لوگ حرام کی کھاتے ہیں۔ برتن ہماری عورتیں انہیں مانجھنے نہیں دیتیں۔ چونکا انہیں نہیں لگتا ہوتا۔ اور ماں کو تو اس کی صفائی بھی پسند نہیں۔ بجانے وہ کرتا کیا ہے ! میں نے کہا۔

پھر میں نے پراشر سے پوچھا :-

"کتنی پیالیاں پیو گے تم ؟"

"دو چھ"

"پارہ شر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور وہ ریں بیسٹریاں ؟ کر دو ہاں"

"زیادہ ۔ ۔ ۔ ۔"

"چھی"

— بارش اور بھی تیز ہو رہی ہے۔ ۔ ۔ ۔ اور راتا کی گالیوں کی بارش بھی !

کھپریل گرا ہی چاہتی ہے۔ دیواروں میں شگاف ہو رہے ہیں۔ قریب ہی ایک سیٹھ کے سہ منزلہ مکان کا پرنالہ راتا کی جھونپڑی پر گرنے لگا ہے۔ جھونپڑی کے ارد گرد ابو بکر روڈ پر چلتے ہوئے پانی کو دیکھ کر طوفان نوح کا خیال آتا ہے۔ کیا ہم راتا کی مدد کر سکتے ہیں ! باوجود کل جگ کے ۔ ۔ ۔ ۔ ہمارے برآمدے کے سوا اور کوئی نزدیک پناہ بھی تو نہیں ہے۔ پراشر خوش ہے۔ اس کے پاس چائے ہے۔ بیڑیاں ہیں — اور بے پناہ راتا ادھر آ ہی جائے گی ۔ ۔ ۔ !

راتا چاروں طرف دیکھ رہی ہے پراشر بولا :-

"ابھی وہ کہے گی۔ مجھے اپنے دامن میں چھپا لو بابو جی"

"اوں ہوں" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"تو اس کے سوا اسے چارہ ہی کیا ہے !"

"یہ بارش کا دامن کیا اس کے لئے کم ہے ! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ راتا کی سی عورت کو میں جانتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب کسی ایسی مصیبت زدہ پر عزت کے دامن تنگ ہو جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو خود بخود ایک بہت بڑا دامن اس کے لئے کھل جاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

— راتا کی تو مٹھیاں بند ہیں۔ کبھی کبھی وہ دانت پیستے ہوئے چیخ لیتی ہے —

"جوان مرے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کلموئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے تو رولیا تجھے بے چین"

نوشتہ: جیمس فلیکر
مترجمہ: اثر چکوالی

عربوں کا جنگی ترانہ

ہم تقدیر سے بھی زیادہ
تیز رفتار ہیں۔
ہم ہر وقت گھوڑوں پر سوار
جنگ کے لئے تیار رہتے ہیں
ہم مغربی حکمرانوں کی
تہذیب و تمدن کو
کچل دیتے ہیں۔
او مغرب کے
سفید فام بادشاہو!
خبردار ہو جاؤ
ہشیار ہو جاؤ
عیش و آرام ہم سے
بہت دور رہتے ہیں
اور نہ ہم بزدلوں کی موت
مرتے ہیں۔
عورتوں کی طرح
ہم آہ و بکا نہیں کرتے۔
اور نہ ہی بچوں کی طرح
بڑبڑاتے ہیں۔
بلکہ
ہم خیموں کے رستوں پر
سوتے ہیں
ہم نئے جذبوں اور نئے دلوں کے ساتھ
بیدار ہوتے ہیں۔
اور میدان جنگ کی سمت
فتح مندانہ انداز سے
روانہ ہوتے ہر ،۔

سورج اور چاند
ہماری رہنمائی کرتے ہیں
اور نسیم بہار
ہمارے بالوں کو
چھوتی ہوئی —— گذر جاتی ہے۔
ہم — شمال سے جنوب
اور مشرق سے مغرب — کی جانب
فتح مندانہ انداز سے
بڑھتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔
تلوار ہماری پیش قدمی کرتی ہے۔
اور ہمارا قومی پرچم
ہلالی نشان کے ساتھ
ہر جگہ لہراتا ہوا دکھائی دیتا ہے
ہم میدان جنگ میں
موت کے دانت کھٹے کر دیتے ہیں
ہماری تلواریں اور نیزے
دشمنوں کے دلوں میں
ایک غیر فانی ہراس
پیدا کر دیتے ہیں۔
ہماری ڈھالیں
ایک پرسکون چشمے کے
پانی کی مانند چمکتی ہیں۔
دشمن کے بزدل اور جواں مرد سپاہی
ہماری تلوار کی محض جنبش ہی سے
بے موت مر جاتے ہیں۔
خدا کے فضل سے
ہم —— فتح مند و کامراں ہیں۔

احمد ندیم قاسمی

پہلا تجربہ

پھوار پڑ رہی تھی۔ بوڑھا اپنے دھوئے ہوئے چیتھڑے لپیٹتا ہوا باہر نکلا۔ نیت آنکھوں پر ابرو لٹک رہے تھے، اور ہونٹ چہرے کی بے شمار جھریوں میں خلط ملط ہو گئے تھے۔

وہ اپنی گذشتہ زندگی نہایت باعزت طریق پر گزار چکا تھا۔ آخری دنوں میں نوجوان بیٹا اینٹوں کے بھٹے میں کام کرتا ہوا جل کر مر گیا اور بوڑھے کے دل کو سخت دھکا لگا۔ گاؤں میں ایک چھوٹی سی نون مرچ کی دوکان تھی، چند مہینوں کے بعد اسے بھی بند کرنا پڑا۔ گاؤں میں جو تھوڑی بہت ساکھ قائم تھی، وہ بھی مٹنے لگی، خوددار طبیعت پائی تھی، گاؤں سے اٹھ کر لاہور شہر آ گیا تھا۔ یہاں بھی کوئی باعزت جگہ نہ مل سکی۔ ایک ہفت سالہ بچہ ناقص غذا ملنے کی وجہ سے بیمار پڑ گیا۔ چادر کے پلو میں جو دو چار ٹھیکریاں بندھا رہا تھا وہ ختم ہو گئی تھیں۔ حکیم نے چونی کا ایک نسخہ تجویز کیا تھا، پاس کوئی ایسی چیز نہ تھی کہ بیچ کر دوا خرید دے۔ بھیک مانگتے شرم آتی تھی، کوئی ایسا جاننا نہیں کہ اس سے قرضہ لے لیتا۔ راضی برضا ہو کر بیٹھ رہا لیکن بچے کی دکھی دکھی التجاؤں نے کلیجہ جھلس دیا۔ دانتوں میں انگلی داب کر اٹھ بیٹھا۔ سوچا۔ کوئی مجھے جانتا تو ہے نہیں، دو چار جگہ ہاتھ پھیلاؤں گا، کچھ مل گیا تو خیر، نہیں تو اپنا اور بچے کا گلا گھونٹ کر مر جاؤں گا۔

آج وہ مجبور ہو کر بھیک مانگنے کے لئے جھونپڑے سے باہر نکلا تھا۔ جھونپڑی کے دروازہ پر ایک بڑھیا کھڑی تھی۔ بولی۔ "کہاں چلے بڑے میاں؟"

بڑھے کے پوپلے منہ سے یہ لفظ جیسے پھسل کر نیچے گر گیا۔ "شہر۔"

"ننھے کا بخار اتر گیا؟"

"نہیں، اور تیز ہو گیا۔"

"کوئی دوا پلائی؟"

"خریدنے جا رہا ہوں۔"

بڑھیا سر جھکا کر اندر چلی گئی اور بوڑھا سوچنے لگا۔ کہ کیا بھیک مانگنے کا پہلا اصول جھوٹ بولنا ہے!

وہ کیچڑ میں پھسلتا گرتا پڑتا چلا جا رہا تھا۔ دور سڑک پر لوگ چھاتے لئے، چمڑے کے بھاری بھاری بوٹ پہنے شپ شڑپ کرتے گزر رہے تھے۔

اب وہ بڑی سڑک پر آ گیا۔ ایک موٹر آئی اور دور تک چھینٹے اڑاتی ہوئی اس کے قریب سے گزر گئی۔ اس نے اپنی جھریوں اور دھوئے ہوئے چیتھڑوں سے کیچڑ پونچھتے ہوئے ایک لمبی آہ بھری کہ اس کے ماتھے کی لکیریں ابھر آئیں۔ ادھر ادھر دیکھا۔ سامنے ہسپتال نظر آیا۔ سوچا۔ اگر یہیں سے بخار کی دوا مل جائے تو شہر جانے کی کیا ضرورت! ننھے کا بخار بھی تیز تھا کہیں وہ بے ہوش ہو کر کھاٹ سے نیچے نہ آ رہے!

ڈاکٹر صاحب ایک بڑی میز کے سامنے کرسی پر بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ آس پاس سفید پوش مریضوں کا ہجوم تھا۔ بوڑھے نے چیتھڑوں سے تھرتھراتے ہوئے ہاتھ باہر نکال کر تھوڑی کے نیچے جوڑ لئے اور بولا۔

"سلام حضور!"

وہ سلام کے جواب میں ڈاکٹر صاحب کے سر کی ایک خفیف سی حرکت کا منتظر تھا۔ لیکن مایوس ہوا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ کہ ان مریضوں ہی میں سے شاید کوئی بھلے مانس ہمدردی کرے اور سفارش کر دے۔ لیکن سب ڈاکٹر صاحب کے قلم پر نگاہیں گاڑے نجوں پر پتھر کے بے جان بتوں کی طرح بیٹھے تھے۔

اتفاقاً ڈاکٹر صاحب کو چھینک آ گئی۔ چہرے پر رومال مل کر سامنے دیکھا۔ بوڑھا موقع غنیمت جان کر پاس ادب سے فرش پر جھک گیا۔ اور پکارا۔ "سلام حضور!" —— اور جب سر اٹھایا، تو ڈاکٹر صاحب کا قلم اسی طرح فرفر چل رہا تھا۔

اس نے سوچا۔ اس طرح تو شاید ہی کام بنے۔ جو مدعا ہے صاف صاف بے دھڑک کہہ ڈالنا چاہیئے۔

"حضور! میرا ننھا بچہ پرسوں اترسوں سے سخت بخار۔ ۔ ۔ ۔!"

ڈاکٹر صاحب کے گھورنے نے میز کی چولیں ڈھیلی کر دیں۔ کاغذ، دواتیں، اور سرخ و سبز کی نلیاں لرز اٹھیں۔ بوڑھے کا دل بے اختیار پسلیوں سے ٹکرا کر رہ گیا، اس کے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھ آپ سے آپ چیتھڑوں کے پیچھے چلے گئے۔ اس کی ناک، کان اور ہونٹ ہلدی کی طرح زرد پڑ گئے۔ پھر واپس سڑک پر آ گیا۔ ایک اور موٹر جھپاک سے اس کے قریب سے گذر گئی۔ موٹر کے عقبی پردے کے قریب اندر کی طرف رنگ برنگ کی ایک گڑیا ناچتی اچھلتی موٹر کے ساتھ غائب ہو گئی۔ بوڑھے نے

دل میں کہا "میں چار آنے کی ہو گی یہ گڑیا! اور مجھے چونی کی دوا خریدنی ہے"۔

اس نے پلٹ کر ہسپتال کی طرف دیکھا۔ دروازے پر سفید روغن سے "خیراتی ہسپتال" لکھا ہوا تھا۔ بوڑھے کو یوں معلوم ہوا، جیسے یہ الفاظ اس پر ہنس رہے ہیں، وہ کچھ سوچ کر تیز تیز قدم اٹھاتا شہر میں گھس گیا۔ پھوار کے ننھے ننھے قطرے اس کی الجھی ہوئی میلی داڑھی میں اٹک رہے تھے، اور اس کا سارا جسم سردی کی شدت کی وجہ سے اس کے دل کی طرح کانپ رہا تھا۔

ایک بہت بڑی عمارت کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ رک گیا۔ یہ کسی اخبار کا دفتر تھا۔ سامنے ایڈیٹر صاحب کا کمرہ تھا۔ اس نے چق اٹھانے کا ارادہ کیا مگر ہاتھ کو جیسے کسی نے کہنی سے پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا، بان میں جیسے گانٹھ پڑ گئی۔ اوروں کو بھیک دینے والا خود بھیک مانگ رہا تھا۔ اس کا سر جھک گیا۔ بھیگی ہوئی داڑھی کے بال فرطِ غم سے اکڑ گئے مگر ہمت کر کے ہاتھ آگے بڑھا ہی دیا۔ "حضور! ایک پیسہ اللہ ......؟"

ایڈیٹر نے نتھنوں سے سگرٹ کا دھواں نکالتے ہوئے کہا "بھاگ جاؤ"۔ بوڑھے کا ہاتھ بڑی تیزی سے واپس چیتھڑوں میں گھس گیا۔

باہر نکلا تو ایک شکرم سے ایک عورت نرم و گرم سموروں میں ملفوف اتری اور ہاتھ میں چمڑے کا ایک بیگ لٹکا کر اندر جانے لگی۔ بوڑھا قدرے جھجکا مگر بے اختیار پکار اٹھا "بی بی جی۔ میرا بچہ ......؟"

بی بی جی نے جیب سے رومال نکالا، اور ناک پر رکھ کر گبھراتی ہوئی ایڈیٹر کے کمرے میں گھس گئیں۔

اس نے سوچا "کیا آج میرے جسم سے بو آ رہی ہے! اس چار لاکھ کی آبادی میں کسی سینے کے اندر دل نہیں کیا! پیسے لوگوں کو اتنے محبوب کیوں ہوتے ہیں کہ انہیں دم بھر کے لئے بھی اپنے بٹوے سے جدا نہیں کرتے۔ اور پھر مجلسوں میں اکڑی گردنوں کے ساتھ کس شان سے کہتے ہیں پیسہ! پیسہ! پیسہ تو ہمارے ہاتھوں کا میل ہے! جھوٹے۔ ریاکار!

وہ اب نئی نئی باتیں سوچنے لگا۔ فقیروں کی امیدیں مر مر کر زندہ رہنے کی خوگر کیوں ہوتی ہیں! میں کتنا ڈھیٹ ہوں لیکن یہ میری ڈھٹائی نہیں قوتِ برداشت ہے۔ بڑے بڑے جرنیل بھی فقیروں کی سی قوتِ حوصلہ کے مالک نہیں ہوتے۔ اُف! جب میں نے اپنے جیسے انسانوں کے آگے باچھیں لٹکا کر ہاتھ پھیلائے تھے، تو خدا جانے کائنات ریزہ ریزہ کیوں نہ ہو گئی۔ آسمان کیوں نہ ٹوٹ پڑا۔ زمین کیوں نہ پھٹ پڑی۔ ان امیر لوگوں کے پاس تو غریبوں کے لئے چند نرم الفاظ بھی موجود نہیں

وہ چیتھڑوں میں ہاتھ چھپائے تیز تیز قدم اٹھاتے بڑھا جا رہا تھا اس کے سر کی ٹوپی تیز پھوار کو نہ روک سکی۔ اس کے گنجے سر پر ٹھنڈا پانی موٹی موٹی بوندیں بن کر گر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کہرے یا دھوئیں کی وجہ سے آنسو تھے۔ جھریوں میں پھوار اٹک رہی تھی، آدھی داڑھی چیتھڑوں میں چھپ گئی تھی، جسم جھکا ہوا تھا۔ ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے۔

ناگاہ اسے کچھ دور ایک بورڈنگ ہاؤس نظر آیا۔ وہ سوچنے لگا یہ کم عمر لڑکے اتنے پتھر دل نہیں ہوتے، اور پھر انہیں پیسے کی اتنی پروا بھی تو نہیں ہوتی، باپ کا مال، پوت نہال۔ سینما یا مٹھائی کے خرچ سے دو چار آنے مجھے دے دیں گے۔ انہیں ثواب ملے گا، اور میرا بچہ اچھا ہو جائے گا۔

وہ دروازے کی سیڑھیاں چڑھ کر اندر داخل ہوا چار لڑکے اکٹھے کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ اب اس نے اپنے سینے میں سے خودداری عزت نفس اور غیرت کی لاش کھینچ کر باہر فرش پر پٹخ دی اور پیشہ ور گداگروں کی طرح بولا "بابو جی ......!"

ایک لڑکا بولا "بابا! یہ بڑا امیر ہے۔ اس کا باپ ڈپٹی ہے۔

دوسرا لڑکا بولا "بابا! اس کا باپ بڑا زمیندار ہے۔ پانچ مربع ہیں ان کی۔ پانچ!

تیسرا لڑکا بولا "اس سے مانگ اس سے۔ اس کا باپ پٹواری ہے۔ زمینداروں کی کھالیں ادھیڑنے والا"

بوڑھے نے محسوس کیا، کہ وہ ایک کھلونا ہے، جس سے یہ شریر لڑکے کھیل رہے ہیں۔ لیکن اسے چونی کی فوری ضرورت تھی اور ضرورت بادشاہوں کو فقیروں کے قدموں پر جھکا دیتی ہے۔ وہ تو زمانے کا ٹھکرایا ہوا ایک بدنصیب بوڑھا کھوسٹ ہے۔ جس کے ننھے کو چونی کی دوا کی ضرورت ہے!

اس نے چوتھے لڑکے کی طرف انگلی اٹھا دی "تم ہی مہربانی کرو بابو جی"

وہ تو بپھرا بیٹھا تھا۔ کہنے لگا "میرے والد صاحب گداگروں کے سخت خلاف ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہندوستان کی غلامی کی وجہ یہ ذلیل بھکاری ہیں۔ جو چھوٹے بڑے کے آگے ہاتھ پھیلا پھیلا کر انسانی غیرت بیچتے رہتے ہیں۔ چل ہٹ دور ہو، مجھے تیری غلیظ داڑھی سے بو آ رہی ہے"

چاروں لڑکے زور زور سے ہنسنے لگے اور اس نے محسوس کیا کہ بورڈنگ ہاؤس کا برآمدہ سمٹا آ رہا ہے۔ اور عنقریب اسے یہ دیواریں جکڑیں گی۔ اور وہ چیختا چلاتا مر جائے گا۔ مر جائے گا؟ —— اسے اپنے

ننھے کا خیال آگیا۔ چھاتی کی ذرا بائیں جانب چوتھی اور پانچویں پسلی کے درمیان کوئی شے اس زور سے اچھلی کہ وہ گرتے گرتے بچا۔ واپس لوٹنا چاہا تو ایک لڑکے نے بڑھ کر ایک پیسہ اس کی کمزور اور مایوس انگلیوں میں تھما دیا اور بولا "بابا! حاتم یہ تو نہ کہے گا۔ کہ اس کے بعد اس دنیا میں اس کا نام نہیں۔ آج ہم نے اس کی قبر پر لات مار ہی دی!"

چاروں لڑکے پھر قہقہوں میں غرق ہو گئے۔ وہ سیڑھیاں اتر کر سڑک پر آگیا۔ ایک لڑکے کی آواز آئی "بابا! پیسے کو مضبوطی سے تھامے رکھنا۔ سیڑھیاں بڑی تیز ہیں!" —— جیسے فقیر کا کوئی گلا گھونٹ رہا تھا۔

"مجھے واپس ہو جانا چاہیئے۔ ۔ ۔ ۔ مجھے واپس ہو جانا چاہیئے کہیں میرا ننھا اکیلے ہی نہ دم توڑ دے۔" اس کا جسم پھنک رہا تھا اس کی آنکھیں سرخ تھیں، اور اس کی سانسیں بہت تیز چل رہی تھیں "مجھے واپس ہو جانا چاہیئے!"

پیسہ مٹھی میں دبائے وہ ایک اور راستے سے واپس آنے لگا۔ ایک بہت بڑے میدان میں ایک بہت بڑا اژدہام نظر آیا۔ ایک بہت بڑے شامیانے کے نیچے لوگ ایک دوسرے سے چپکے بیٹھے تھے ایک بہت بڑے قومی رہنما۔ ایک بہت بڑے اسٹیج پر اچھل رہے تھے۔ کود رہے تھے۔ جھکتے تھے۔ تنتے تھے۔ گھونسے تانتے تھے۔ باہیں پھیلاتے تھے۔ منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ آنکھوں سے شرارے برس رہے تھے۔ اسٹیج کانپ رہا تھا۔ خود کانپ رہے تھے۔ بوڑھا سوچنے لگا۔ ان لوگوں کے دل اتنے بڑے لیڈر کی باتیں سن سن کر پسیج رہے ہوں گے۔ ان میں سے کوئی خدا ترس مجھے ضرور سہارا دے گا۔ اور شاید کوئی چونی کے بجائے اٹھنی دے دے۔ شاید میں ننھے کے لئے کچھ پھل بھی خرید سکوں گا۔ بےچارا بے ہوشی میں سیب مانگ رہا تھا۔

وہ آگے بڑھا۔ اس وقت رہنما صاحب فرما رہے تھے "ہم ہندستانی ہیں۔ ہم نہ ہندو ہیں نہ مسلمان، نہ سکھ نہ عیسائی نہ پارسی نہ یہودی۔ نہ ۔ ۔ نہ چینی۔ ہم ہندوستانی ہیں۔ ہم سب ہندوستانی ہیں۔ ہندوستان ہمارا جنم بھومی ہے۔ ہندوستان ہماری دنیا ہے۔ ہندوستان ہمارا سب کچھ ہے۔ بولو ہندوستان کی جے۔ بھارت ماتا کی جے۔ انقلاب زندہ باد"

حاضرین فرط جوش میں فرش پر سے کود کود جاتے تھے ہر آنکھ میں خون تھا اور ہر لب پر نعرہ۔ بوڑھے نے مجمع میں ایک شخص کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا "بے مولوی جی۔ مجھ غریب کا ننھا۔ ۔ ۔" بوڑھے کی چھاتی کہنی کے سیدھے نشانے سے پھٹ گئی، وہ لڑکھڑا کر ایک اور شخص پر جا گرا، جس کا طرہ مور کی دم کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ وہ بولا "دفع ہو غلیظ کتے۔ مانگنے کی یہی جگہ ہے کیا!"

بوڑھا چھاتی ملتا ہوا جلسہ گاہ سے نکل آیا ایک مریل سی کتیا جو دم کو ٹانگوں میں دبائے ایک پودے کی اوٹ میں بیٹھی تھی۔ حسرت بھری نگاہوں سے گھورنے لگی بوڑھے کے آنسو آنکھوں سے نکل کر جھریوں میں اٹکی ہوئی پھوار میں مل گئے۔ اس نے اپنے جی میں کتیا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "ادھر آ۔ ادھر آ جا کتیا۔ تو بھی دنیا کی ٹھکرائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ تو بھی میری طرح ٹھٹھر رہی ہے۔ تیری پسلیاں بھی میری طرح ابھری ہوئی ہیں"

کتیا فقیر کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر جلسہ گاہ کی طرف چل دی۔ اس کی لٹکی ہوئی دم اور جھکے ہوئے لمبے کانوں کے کناروں پر سے پھوار موٹے موٹے قطرے بن کر نیچے گر رہی تھی۔ فقیر نے اپنی خاموش تقریر جاری رکھی، "اری ادھر نہ جا۔ وہاں بھارت ماتا کے سپوت تیری پسلیوں میں ایسی کہنی لگائیں گے۔ کہ تیرا بھیجا نکل جائے گا۔ وہاں غلامی کا جوا اتارنے کے مشورے ہو رہے ہیں۔ ادھر غریبوں کا گزر نہیں!"

دماغ یوں بے تحاشا کام کرنے لگا تو بوڑھے کے کان بجنے لگے اس نے سمجھا میں پاگل ہو رہا ہوں۔ کتوں سے باتیں کرنا داناؤں کا کام نہیں۔ وہ پیسہ اس کی مٹھی میں انگارے کی طرح دہکنے لگا۔ وہ اسے پھینک دینا چاہتا تھا۔ مسل دینا چاہتا تھا۔ لیکن شاید اس سے ایک سیب خریدا جا سکے! اب اس نے مٹھیاں بھینچ کر دوڑنے کی کوشش کی ننھا اسے فضا میں سوجی سوجی آنکھوں سے آنسو گراتا، منہ بسورتے سسکتا نظر آیا۔ اب وہ نوجوانوں کی طرح دوڑنے لگا!

اچانک اس کے قدم رک گئے۔ سامنے کارخانے کی لمبی لمبی چمنیاں دھواں اگل رہی تھیں۔ دھک۔ دھپ۔ دھک۔ دھپ۔ اس کا دل مشین کی آواز سے ہم آہنگ ہو کر تڑپنے لگا۔

وہ جی میں کہنے لگا کیا یہاں سے بھی نا امید لوٹنا پڑے گا! اس جگہ سے تو ابھی مجھے کچھ لوا دے۔ ننھے کے پاس خالی ہاتھ کیسے جاؤں خالی ہاتھ جانے سے تو کہنا بہتر رہے گا۔ کہ ننھے مر جا۔ بے شک مر جا۔ مجھ سے تیرے لئے چونی کی دوا نہیں خریدی جا سکتی۔ بے شک مر جا —— الہی —— الہی!

وہ کارخانے میں داخل ہوا، کالے کالے چہرے۔ کالے کالے لباس! کالی کالی مشین! گرما گرما خیر!

"سلام حضور!"

"ارے! تو یہاں کیسے گھس آیا! بھاگ جا!"

"حضور، میرا ننھا سا بچہ ہے۔ تین دن سے بیمار پڑا ہے۔ اگر ایک چونی......"

"معاف کر بابا!"

بوڑھے نے سوچا، اب لے کے ہی ٹلوں گا۔ یوں تو یہ لوگ غریبوں کی باتیں ایک کان سے سنتے نہیں، اور دوسرے نکال باہر پھینکتے ہیں بولا "بابو جی۔ اگر میں......"

"ارے بہرہ ہے کیا؟ - بھاگ جا"

"میں حضور...."

"چپراسی اسے دھکیل کر باہر کردے۔ یوں مانگتا ہے۔ جیسے مجھے اس کے باپ کا قرضہ دینا ہے۔ لچا۔ بدمعاش۔ کنگلا!"

بوڑھا پکار اٹھا "بھائی چپراسی! مجھے دھکا نہ دینا۔ میں غریب مر جاؤں گا!"

بوڑھا اب بڑے اطمینان و سکون سے واپس مڑا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی، اس کے انداز میں وقار تھا۔ وہ دس سال پہلے کا پرانا باعزت چودھری نظر آنے لگا۔

. . . .

اچانک کارخانے میں بھگدڑ مچ گئی "ارے لیسنا۔ پکڑنا... وہ گیا۔ وہ - وہ - وہ گیا!"

خون سے لتھڑا ہوا ایک انسانی ہاتھ جس نے اپنی زرد ہتھیلی میں ایک پیسہ تھام رکھا تھا۔ دھن سے منیجر کی میز پر آگرا!

منیجر نے حیران ہوکر پوچھا "کیا ہوا؟"

ایک مزدور ہراساں لہجے میں بولا "حضور، وہ فقیر مشین کی جھپٹ میں آکر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا!"

"تو پولیس میں اطلاع کردو"

باہر کارخانے کی لمبی لمبی چمنیاں دھواں اگل رہی تھیں دھک۔ دھپ۔ دھک۔ دھپ۔ مشینوں کی آواز آرہی تھی

صمد ساز رضوی

اے دوست!

(۱)

میں اپنی ساری راحتیں نثار تم پہ کر چکا!
بجوں طلب، وفا کی منزلوں سے بھی گذر چکا
جب اپنی روح و قلب کو میں درد و غم سے بھر چکا
ہزار بار کہہ چکا کہ . . ہاں میں تم پہ مر چکا
تو پھر یہ کیا کہا "مری وفا کو بھول جاؤ گے"!!

(۲)

نشاطِ مرگ کی طرح وجود میں سما گئے،
سرورِ زیست بن کے تم فضائے دل پہ چھا گئے
مرے زمین و آسماں کچھ اور ہی بنا گئے
تمہیں تو ہو جو مجھ کو اپنا بھولنا سکھا گئے
تو پھر یہ کیا کہا "مری وفا کو بھول جاؤ گے"!!

(۳)

سما کے مجھ میں تم نے زیست کا نیا مزہ دیا
نشاطِ جاوداں کا درس روح کو پڑھا دیا
فضا کو اپنی مسکراہٹوں سے جگمگا دیا
تمام کائنات کو حسین تر بنا دیا
تو پھر یہ کیا کہا "مری وفا کو بھول جاؤ گے"!!

(۴)

وہ مسکراہٹیں جو میرے دل میں جذب ہو چکیں
وہ آنکھیں۔ جو مرے لئے ہزار بار رو چکیں
جو کیفِ روح میں نظامِ قلب کو ڈبو چکیں
میں ان کو بھول جاؤں گا۔ جو مجھ کو مجھ سے کھو چکیں
تو پھر یہ کیا کہا "مری وفا کو بھول جاؤ گے"!!

احمد ندیم قاسمی

مژدۂ انقلاب

مضطرب ہیں میری فریادوں سے یارانِ چمن
چونکتا ہوں ان کے کانوں میں سرودِ زندگی
ذرّے ذرّے سے اٹھے گی جب صدائے انقلاب
نالہ ہائے درد سے گونجیں گے اس کے مرغزار
پی سکیں گے اس سے درویش و امیر و بادشاہ
میری وحشت ہوشیاروں سے کبھی لے گی خراج
زندگی اور موت اک تصویر کے دو عکس ہیں
طعنے دیتے ہو مجھے لیکن جوانانِ "غیور"
تم نہیں سمجھے غلامی اور آزادی کا فرق
تم نہیں سمجھے کہ جب شیشے پہ جم جاتا ہے میل
تم نہیں سمجھے کہ جب دلِ غیر کے محکوم ہوں
میں نہیں کہتا کہ ہے تنہا تمہارا ہی قصور
میرے سینے میں مگر شمعِ عمل ہے شعلہ ریز
لیڈروں کے دل میں رقصاں خواہشِ نام و نمود
اس طرف اغیار کا ہر فرد ہے مصروفِ کار
اس طرف بارود کی بو اور توپوں کی گرج
تم ابھی تک ہند کو فردوس ہو سمجھے ہوئے،
جانتا ہوں اس حقیقت کو یہاں دیوانگی،
لیکن اس اجڑی ہوئی محفل کی حالت دیکھ کر
اب سراپا آگ ہے میرا وجودِ غم نصیب
انقلاب آ جائیگا اب انقلاب آ جائے گا!!
برق کے مانند کوندیں گے یہاں کے بدنصیب
آگ کی مانند لپکیں گے یہاں کے مولوی
ڈالیوں پر جھوم کر ہر تتق مل کر گائیں گے!!

توڑ کر چھوڑوں گا لیکن میں قوانینِ کہن!
ایک دن کروٹ بدل لے گا مرا پیارا وطن
منتظر ہیں اس گھڑی کے جانفروشانِ چمن
خون کے دھاروں سے دھل جائیگا رنگِ انجمن
اک نئے سانچے میں ڈھل جائیگی صہبائے کہن
اک صداقت بن کے چمکے گا مرا دیوانہ پن
کھیل ہے میرے جنوں کے سامنے دار و رسن
تم کو زیبا ہے کہ پہنو جیتے جی کالے کفن
تم نہیں سمجھے کہ جنگل میں ہے غیروں کے وطن
اس سے چھن سکتی نہیں زنہار سورج کی کرن
کچھ اثر کرتا نہیں روحوں پہ نورِ علم و فن
خوابِ غفلت میں پڑی ہے انجمن کی انجمن
جس کی ضو میں دیکھتا ہوں ہند کے کوہ و دمن
اور اہلِ دیں کے ڈھیلے فرغلوں میں مکر و فن
اس طرف بیکار ہیں مصروف شیخ و برہمن!
اس طرف مردوں کے رخ پر عورتوں کا بانکپن!
میری نظروں میں مگر یہ ملک ہے بیت الحزن
میری فریادوں سے جھنجھلاتے ہیں یارانِ وطن!
اب بہت رس رس کے دکھتا ہے مرا داغِ کہن
میری آہیں برق ساماں میرے نالے شعلہ زن
ذرّہ خاکِ ہند کا بن جائے گی لعلِ یمن
شیر کی مانند گونجیں گے یہاں کے خستہ تن
آندھیوں کی طرح ابھریں گے یہاں کے برہمن
اپنی آزادی کے نغمے خوش نوایانِ چمن

میرا سرمایہ مرا احساس ہے ورنہ ندیم
میں نہ عالم ہوں نہ فاضل ہوں نہ استادِ سخن

ادارہ

نقد و نظر

مدراس میں اُردُو:۔ مصنفہ نصیر الدین صاحب ہاشمی طباعت وکتابت اعلیٰ۔ صفحات دو سو کے قریب قیمت عہ ملنے کا پتہ۔ ادارۂ ادبیات اردو، رفعت منزل خیریت آباد۔

موجودہ صورت حالات میں، جبکہ اردو دشمنی کے مظاہرے ہندوستان کے گوشے گوشے میں بروئے کار آرہے ہیں وہ بڑے بڑے قوم پرست، جن کی قوم پرستی مسلم اور جن کی وسیع الخیالی مشہور و معروف ہے موجودہ اردو ہندی نزاع کے سلسلے میں ایسی ایسی حرکتیں کر رہے ہیں۔ جن کا تصور بھی انکے معتقدمند نہیں کر سکتے اردو کی خوش قسمتی سے ہم میں ایسے اولوالعزم اشخاص بھی موجود ہیں جن کا . . . . اوڑھنا بچھونا اردو ہے: جو ہر وقت اردو کو ترقی و فروغ دینے کے لئے تدابیر سوچتے رہتے ہیں۔ اور جو ہر وقت اُردو کی نشر و اشاعت کیلئے کوشش کرتے رہتے ہیں!

جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی ان ہی اشخاص میں شامل ہیں۔ اس کتاب سے پیشتر بھی آپ کئی محققانہ مقالات تحریر فرما چکے ہیں "مدراس میں اردو" اپنے موضوع کے لحاظ سے نہایت کامیاب کوشش ہے ہاشمی صاحب نے مدراس میں اردو کی رفتار ترقی پر روشنی ڈالتے ہوئے مدراس کے ادباء کی ذہنی کاوشوں پر تبصرہ کیا ہے! جو ہر لحاظ سے قابل تحسین ہے!

کتاب کے شروع میں اردو کے مشہور ادیب جناب سید محی الدین صاحب زور نے ایک مختصر مگر پر مغز دیباچہ لکھا ہے۔

امید ہے ہماری پبلک اس کتاب کی کما حقہٗ قدر کرے گی۔ (م، ا)

مَن کی بِتیا:۔ مصنفہ محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ طباعت وکتابت اعلیٰ۔ صفحات ۸۰۔ قیمت ۸ر ملنے کا پتہ۔ ادارہ ادبیات اردو خیریت آباد۔ حیدر آباد دکن۔

محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ اردو کی مشہور انشا پرداز ہیں، اور آپ کے متعدد مفید مقالات اکثر رسائل میں شائع ہو چکے ہیں یہ مجموعہ آپ کی ان تقریروں پر مشتمل ہے۔ جو آپ نے گاہے گاہے، مختلف جلسوں میں کیں۔ کل مضامین اٹھارہ ہیں۔ اور ہر مضمون اپنی افادیت کے لحاظ سے اتنا کامیاب ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کتاب کے آغاز میں لکھا ہے،

"اس کتاب میں متوسط طبقہ کی خواتین کی معاشرتی اور اخلاقی کمزوریوں کو بے نقاب کر کے زندگی کی تلخیوں سے کامیاب مقابلہ کرنے کے طریقے پیش کئے گئے ہیں"

اور کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ سطور مبالغے پر مبنی نہیں۔ واقعی محترمہ نے کھاتے پیتے طبقے کی کمزوریوں کو نہایت کامیابی کے ساتھ بے نقاب کیا ہے!

محترمہ کا طرز نگارش بہت شگفتہ ہے! معلوم ہوتا ہے کہ لطیف النساء صاحبہ ایک پیدائشی ادیبہ ہیں! (م، ا)

من کی دُنیا:۔ مصنفہ جناب رشید قریشی۔ کتابت وطباعت اعلیٰ صفحات ۱۴۰۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ۔ ادارہ ادبیات اردو خیریت آباد حیدر آباد دکن۔

من کی دنیا مجموعہ ہے۔ جناب رشید قریشی صاحب کے افسانوں کا۔ رشید صاحب ابھی نومشق ہیں، اور ان کے افسانے بھی زیادہ کامیاب نہیں۔ مگر امید کی جاتی ہے کہ ہمارا یہ نووارد صاحب قلم مستقبل میں ضرور اردو کے مشاہیر کی صف میں شامل ہوگا۔ اندازِ نگارش کے تیور صاحب قلم کی صلاحیتوں کا پتہ دے رہے ہیں — !

آغاز کتاب میں ایک مختصر سا دیباچہ ہے۔ جناب محی الدین صاحب زور کے قلم سے پھر جناب پروفیسر مولوی عبدالقادر صاحب سروری ایم، اے ایل، ایل بی کا مقدمہ ہے۔ جس میں انہوں نے افسانے کے عناصر ترکیبی پر روشنی ڈالتے ہوئے قریشی صاحب کی خصوصیات کا بھی ذکر کیا ہے! عرضِ حال کے ماتحت افسانہ نگار نے اپنا اور اپنے افسانوں کا تعارف کرایا ہے۔ اور افسانوں کے مطالعے سے پیشتر ان سطور کا پڑھنا بہت ضروری ہے۔

بہر حال اس مجموعے کی قدر کرنی چاہیئے۔ (م، ا)

غلاموں کی بغاوت:۔ مصنفہ چودھری عبدالرشید صاحب

تبسم بی اے۔ کتابت وطباعت نہایت اعلیٰ صفحات ۶۴ قیمت ۴ ر، ملنے کا پتہ۔ اردو اکیڈمی لاہور۔ مکتبۂ اردو لاہور۔

غلاموں کی بغاوت ایک ولولہ انگیز نظم ہے۔ جناب عبدالرشید صاحب تبسم کے قلم سے، تبسم صاحب پنجاب کے جواں سال، جواں دماغ اور جوان فنکار ادیب ہیں اور آپ جو کچھ لکھتے ہیں سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں۔ زیرِ نظر نظم موجودہ فضا کے لئے بہت مفید نظم ہے۔

شروع میں مورخ اسلام مولانا علم الدین صاحب سالک ایم، اے، علیگ، کا محققانہ مقالہ ہے۔ جس میں انہوں نے تنزل کے غار میں گری ہوئی قوم کی ذہنی پستی کی نفسیاتی تحلیل کر کے تبسم صاحب کے اشعار کی خوبیاں واضح کی ہیں۔ (م ۱۰)

مظاہرِ ذہنیات:۔ مصنفہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب ایل، ایم، پی، آئی، ایم، ڈی۔ کتابت وطباعت خوشگوار صفحات ۱۸۴ قیمت دو روپے ملنے کا پتہ۔ کوثر چاند پوری رائسین بھوپال۔

مظاہرِ ذہنیات میں فاضل مصنف نے انسانی زندگی کے تمام عناصر کی نفسیاتی تحقیق کر کے کامیابی کے ذرائع بتائے ہیں۔ سب سے پہلے حقیقت نفس پر روشنی ڈالی ہے۔ نفس کیا چیز ہے؟ اسکی کون کونسی مختلف کیفیتیں ہیں۔ شعوری، تحت شعوری، التباسات حسیہ، خارجی موثرات یا حیات کی نہایت کامیابی کے ساتھ توضیح وتشریح کی ہے پھر قوت حافظہ، اس کی گوناگوں کیفیات، اسے تیز اور کارآمد بنانے کے ذرائع پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کے بعد دوسرے اہم لوازم حیات کو معرض بحث میں لایا گیا ہے۔ مصنف کا اندازِ بیان نہایت شگفتہ اور دلآویز ہے۔ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی انسانی زندگی کی گہرائیوں سے واقف ہو سکتا ہے۔ ہمیں فاضل مصنف کا شکرگزار ہونا چاہیئے کہ انہوں نے اتنی کامیاب، مفید اور کارآمد کتاب لکھ کر ہماری معلومات میں اضافہ کیا۔ لاریب مظاہرِ ذہنیات ایک مشعلِ کامیابی ہے۔ جس کی ضرورت ہر شخص کو ہے۔ امید ہے قارئین اس کتاب کی قدر کریں گے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ (م۔ ا)

مکتبہ اردو کی ہر دلعزیز مطبوعات

حاجی لق لق ملک کے مشہور مزاح نگار حاجی لق لق کے بہترین مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے اور افسانے ان کے پڑھنے سے آپ کا دل کشت زعفران بن جائیگا۔

حاجی لق لق — ایک روپیہ

لینن بیسویں صدی کا سب سے بڑا انسان تھا جسے بچے بچے دیکھتے روس کی کایا پلٹ دی۔ کون ہے جو اس قوت کے انسان [illegible] ریاستی کے سوانح حیات دلچسپی سے پڑھنا گوارا نہیں کرے گا۔ مصنفہ ڈی ایس مرسکی مترجمہ [illegible] محمد اشرف مجلد عہ

طلسم خیال کرشن چندر کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ کرشن کے افسانے ہماری زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان میں حیات انسانی کا گہرا مطالعہ ہے، موجودہ معاشرت پر طنز کے تیز نشتر بھی ہیں اور حقیقت پسندانہ محبت رومانیت کی خوشبو بھی!

کرشن چندر ایم اے — مجلد ایک روپیہ چار آنے

پیغمبر صحرا مشہور مسلم بیرسٹر علامہ شیخ عبداللطیف نے پیغمبر کائنات کے حالات منقبت اور سلجھے ہوئے پیرایہ میں لکھے ہیں۔ ہر لفظ سے عشق رسالت کی خوشبو آتی ہے۔ اردو ترجمہ پرافٹ آف دی ڈیزرٹ

علامہ عبداللطیف گابا — مجلد و مطلا دو روپے

کمپنی کی حکومت کتاب ہے اس صد سالہ دور حکومت کی جب ہندوستان کو سیاسی طور پر محکوم اور اقتصادی لحاظ سے غلام بنایا جا رہا تھا۔

[illegible] ادیب باری — مجلد ڈیڑھ روپیہ

چاند کا گناہ اور دیگر افسانے اس مجموعہ میں دنیا بھر کے نقادان ادب کے بہترین تسلیم شدہ افسانے شامل ہیں۔ جو اب تک اردو میں منتقل نہیں ہوئے تھے۔

راجہ مہدی علی خان — مجلد مطلا دو روپے

تین پیسے کی چھوکری (اور دیگر افسانے) افسانہ نگاری کے سابق اور افسانوں میں [illegible] ذوق رکھنے والوں کے لئے ان افسانوں کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔

قاضی عبدالغفار خان (مصنف لیلے کے خطوط) — مجلد ڈیڑھ روپیہ

آہنگ رزم ہندوستانی زبان میں جنگی ترانوں کا پہلا مجموعہ۔ شجاعت اور غیرت کے جذبات ابھارنے والی کتاب۔ دوسرا ایڈیشن۔ دو نئی نظمیں بھی شامل ہیں۔

وقار انبالوی — مجلد آٹھ آنے

دنیا کی حور اور دیگر افسانے یہ کتاب خاص طور پر لڑکیوں اور عورتوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس کا پلاٹ بالکل ہماری معاشرت و تمدن کے مطابق ہے۔ طبیعت خود بخود الفاظ کا اثر قبول کرتی ہے۔

کوثر چاندپوری — مجلد ایک روپیہ

ترکی جمہوریہ میں ترکی کی مختلف ترقیات کا حال نہایت دلپذیر پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ پہلے کیا تھا، انقلاب کے بعد کیا ہوا، نیا انقلاب پیدا ہوا، ترکی کے متعلق معلومات حاصل کرنے کیلئے یہ کتاب بے نظیر ہے۔

سید ضمیر حسن ہاشمی — مجلد [illegible]

باسی پھول — یہ سید علی عباس حسینی کے پندرہ افسانوں کا مجموعہ ہے جن کا فن سب نے تسلیم کیا ہے۔ اس مجموعہ میں ایسے افسانے بھی شامل ہیں اور طربیہ بھی، ان میں [illegible] اور سوشل بھی، اور ہر ایک میں مصنف کا طنز اور مہذب ظرافت چھپی ہوئی موجود ہے۔

پریم کا جادو — ہندوستان کی اصنامی دنیا ایک ایسی دنیا ہے جس کے سامنے [illegible] مصریوں کی بہت آفرینیاں اور یونانیوں کی دیومالا کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ ہندوستان کی دنیائے طلسم و رومان کے حیرت زا رومان اس مجموعہ میں پیش کئے گئے ہیں۔

مصنف [illegible] ترجمہ [illegible] سید احمد نظامی — مجلد ایک روپیہ

شعلے — فطرت انسانی کے اسرار و رموز آشکار کرنے والے، ریاکاری کے خس و خاشاک جلانے والے افسانے۔ وہ کتاب جسے ادیب و شاعر چھپ چھپ کر پڑھتے ہیں، زبانی کوستے ہیں اور دل سے اعتراف کرتے ہیں۔

احمد علی ایم اے (مصنف ضبط شدہ کتاب [illegible]) — مجلد ایک روپیہ

نقش دوام جدید نظم گوئی کے ارتقا اور فلسفیانہ جذباتی رنگ سخن سے لطف اندوز ہونے کے لئے "نقش دوام" کا مطالعہ کریں۔

سید عبدالحمید عدم — مجلد و مطلا دو روپے

صحرا نورد کے خطوط رومان انگیز دنیا میں بھٹکنے والے صحرا نورد کی کتاب زندگی — ہیجان خیز ورق جس کا ایک ایک لفظ آپ کو قعر حیرت میں گم کر دے گا۔

میرزا ادیب بی اے — ڈیڑھ روپیہ

شہنشاہ حبشہ دنیا کی سٹیج پر ابھی ابھی ایک نہایت دلدوز، لرزہ خیز اور دردناک تمثیل ہوا ہے جس کا ہولناک نتیجہ دنیا کبھی نہیں بھول سکتی۔

اختر اورینوی ایم اے — آٹھ آنے

عورتوں کے افسانے ہندوستان کی عورتوں کے دکھ درد کو سمجھنے اور ان کے دکھے ہوئے دلوں کی آوازیں سننے کیلئے اس کتاب کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔

کوثر چاندپوری — ڈیڑھ روپیہ

پھول اور کانٹے ان افسانوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ [illegible] عالم شبابیات سے [illegible] ہیں اور اس قدر پاکیزہ ہیں کہ ایک بھائی اپنی بہن کو پیش کر سکتا ہے۔

گوپال متل بی اے — بارہ آنے

مکمل فہرست کتب طلب فرمائیں

R. L. NO. 3521

علمی - ادبی و تنقیدی ماہوار مرقع

مصور ادب لطیف لاہور

ایڈیٹر

چودھری برکت علی بی اے

سالانہ چندہ 3/8/-

فی پرچہ -/4/-

دار الاشاعت

مکتبہ اردو ۱۴ سرکلر روڈ لاہور

منظور کردہ محکمۂ تعلیم پنجاب صوبہ سرحد ریاست حیدرآباد دکن
مکتبۂ اردو لاہور کا

کثیر الاشاعت و ارزاں ترین ماہنامہ

رسالہ ادبِ لطیف لاہور

اگست سنہ ۱۹۳۹ء

خریداران ادبِ لطیف کیلئے انتہائی رعایت!

صحرانورد کے خطوط جیسی عدیم النظیر کتاب

صرف ایک روپیہ آٹھ آنے میں!

جیسا کہ قارئین جانتے ہیں صحرانورد کے خطوط شائع ہو چکی ہے اسکی قیمت ڈھائی روپے علاوہ محصولڈاک اور محصولڈاک کیساتھ تین روپے ہے
لیکن ہم خریداران ادب لطیف کیساتھ ایک روپے کی رعایت کرتے ہوئے اعلان کرتے ہیں۔ کہ خریدار صاحبان ——————
یا تو (۱) ایک روپیہ آٹھ آنے کتاب کی قیمت اور پانچ آنے ڈاک خرچ کل ایک روپیہ تیرہ آنے بذریعہ منی آرڈر بھیج دیں۔ کتاب فوراً ان کی خدمت میں بھیج دیجائیگی۔ مزید تین آنے بھیجنے والے حضرات کو کتاب بصورت رجسٹری بھیجی جاویگی —————— یا
(۲) ہمیں اجازت دیں۔ کہ کتاب وی پی برائے مبلغ دو روپے انکی خدمت میں بھیجدیں۔ کتاب وی پی بھیجنے کی صورت میں محصولڈاک ساڑھے آٹھ آنے صرف ہوتے ہیں۔

جو حضرات چند ماہ پیشتر کتاب کا آرڈر بھیج چکے ہیں۔ ان کی خدمت میں گزارش ہے۔ کہ وہ دوبارہ آرڈر عنایت فرمائیں تاکہ فوراً تعمیل کی جائے۔
یہ اعلان نئے خریداروں کے لئے بھی ہے۔ نئے خریدار حضرات پانچ روپے پانچ آنے بذریعہ منی آرڈر بھیج دیں۔ اس رقم میں کتاب کی قیمت اور ہمارے کا ایک سال کا زر سالانہ دونوں شامل ہیں۔
کتاب ہاتھوں ہاتھ بک رہی ہے۔ قارئین بہت جلد توجہ کریں۔ ورنہ ممکن ہے۔ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے!

(نوٹ) آرڈر دیتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں

مینیجر مکتبۂ اردو لاہور

جنگ آزادی کی ختم ہونے کے واقعات کی بھی تصویر کھینچ دی ہے!

موت کا راگ - مصنفہ میرزا ادیب!

یہ مجموعہ ہے میرزا ادیب کے سولہ افسانوں کا جس میں کئی افسانے غیر مطبوعہ ہیں۔

پروفیسر فضل حق کی وفات۔ ہمیں یہ پڑھ کر نہایت افسوس ہوا ہے۔ کہ بروز اتوار ۳۰ - جولائی کو پروفیسر قاضی فضل حق دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ پروفیسر مرحوم السنۂ شرقیہ کے بہت بڑے عالم تھے۔ دعا ہے۔ خدا مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے۔

ادب لطیف کی موجودہ مسطر:- ادب لطیف کی موجودہ مسطر تینتیس ۳۳ سطروں پر مشتمل ہے جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ رسالے میں ایک کالم کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اب ہم نے درمیانی لکیر (جو صفحے کو دو کالموں میں تقسیم کرتی تھی) اڑا دی ہے۔ صفحے کی پیشانی کی لکیروں کا انداز بھی بدل ڈالا ہے قارئین ملاحظہ فرمائیں گے۔ کہ "ادب لطیف" کا ہر پرچہ نہ صرف معنوی خصوصیات کے لحاظ سے پہلے پرچے پر فوقیت رکھتا ہے۔ بلکہ اس کے صوری محاسن میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

مینجر صاحب کی علالت:- مکتبہ اردو اور ادب لطیف کے مینجر جناب چوہدری بشیر احمد صاحب کئی دن سے علیل ہیں۔ قارئین دعا کریں۔ کہ خداوند تعالے ان کو صحت کاملہ و عاجلہ عطا کرے۔

علامہ راشد الخیری کے خطوط:- مسٹر صادق الخیری قارئین ادب لطیف سے درخواست کرتے ہیں۔ کہ اگر ان کے یا ان کے کسی دوست کے پاس علامہ راشد الخیری کا کوئی نجی یا مخزن و تمدن وغیرہ کے سلسلے میں صحافتی خط موجود ہو تو از راہ کرم ان کے پاس فوراً بھیج دیں۔

اگر مکتوب الیہ کی خواہش ہو۔ تو موصوف اسکی نقل رکھ کر اصل بحفاظت و بصد شکریہ واپس بھیج دیں گے۔ خطوط کے علاوہ اگر کسی صاحب کے پاس "کہکشاں" (جو دارالاشاعت پنجاب سے شائع ہوتا تھا) کا مکمل فائل یا اس کے کچھ پرچے موجود ہوں۔ تو وہ ازراہ مہربانی یا قیمتاً مسٹر صادق کے پتے پر بھیج دیں۔ جناب صادق الخیری کا پتہ یہ ہے:-

صادق الخیری ایم۔ اے۔ کوچہ چیلان۔ دہلی۔

ادب لطیف کے گزشتہ سالنامے اور افسانہ نمبر۔

ادب لطیف کے گزشتہ سالناموں اور افسانہ نمبروں کی بہت کم کاپیاں دفتر میں محفوظ ہیں۔ جیسا کہ ہر پرچے میں اعلان کیا جاتا ہے۔ یہ ضخیم نمبر رعایتی قیمت پر دیئے جاتے ہیں۔ قارئین کرام ان نمبروں اور ان کی رعایتی قیمتوں کی فہرست اس نمبر میں کہیں ملاحظہ فرمائیں گے۔

ادب لطیف کا

معرکہ آرا افسانہ نمبر

اس شمارے کے بعد جو نمبر شائع ہوگا۔ وہ افسانہ نمبر ہوگا۔ یہ افسانہ نمبر یقینی واثق ہے ادب لطیف کے تمام گزشتہ افسانہ نمبروں سے زیادہ وقیع اور دلچسپ ہوگا۔ افسانہ نمبر کی تعمیر میں ملک کے چوٹی کے افسانہ نگار حصہ لے رہے ہیں۔

ان حضرات کے مضامین اور افسانے دفتر میں پہنچ چکے ہیں:

محترمہ حجاب امتیاز علی کا ایک نہایت دلآویز اور دلپذیر رومان۔

کرشن چندر ایم۔ اے کا ایک لاجواب افسانہ

اوپندر ناتھ اشک کی ایک حسرت انگیز کہانی۔

چودھری منظور احمد مخمور جالندھری اور مجید لاہوری کے مہدآمدہ منظوم افسانے

پروفیسر کنہیا لال، جمیل احمد کند ھاپوری، سراج الدین احمد نظامی کے بلند پایہ افسانے

احمد ندیم قاسمی کا ایک نفسیاتی شاہکار۔

ناکارہ حیدر آبادی کا ایک بھرپور لطف مزاحیہ افسانہ

محترمہ مسز عبد القادر کا ایک دلچسپ رومان

راجندر سنگھ بیدی کا ایک معاشرتی شاہپارہ

ماہر القادری، سید بادشاہ حسین، اختر اورینوی، اور سید راحت مولائی کے بلند پایہ مقالات۔

ان کے علاوہ دنیا کے مشہور افسانہ نگاروں، مثلاً ماپاساں، ایڈگر ایلن پو اور چیخوف کے شاہکار افسانے اردو میں پہلی مرتبہ شائع ہو رہے ہیں۔

گزشتہ اشاعت میں "محسوسات مجرم" کا ابتدائیہ شائع کیا گیا تھا یہ ابتدائیہ اسقدر مقبول ہوا ہے۔ کہ کئی حضرات نے یہ دو صفحے پڑھ کر ہی کتاب کا آرڈر بھیج دیا ہے۔

افسانہ نمبر میں اس کتاب کا ایک مکمل باب جو ایک طویل افسانہ ہے۔ "دیوی" کے عنوان سے شائع ہو رہا ہے۔ امید ہے۔ یہ افسانہ صحرانورد کے تمام خطوط کے مقابلے میں زیادہ دلچسپ ہوگا۔

ضروری:- جیسا کہ قارئین کو معلوم ہے جتنا بڑا یہ افسانہ نمبر ہے خاص نمبر ہمیشہ ڈاک میں گم ہو جاتے ہیں۔ اسلئے اطلاعاً لکھا جاتا ہے۔ کہ جو حضرات اپنا پرچہ بحفاظت وصول کرنا چاہتے ہیں۔ وہ معمولی مہر کے ٹکٹ رجسٹری کیلئے بھیج دیں۔ (مینجر)

ہماری زبان

"اردو ہندی کے سلسلے میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ وُہ ہمارے سامنے ہے۔ حقائق کو لاکھ چھپایا جائے مگر وُہ کبھی نہ کبھی دنیا کی نگاہوں کے سامنے آ ہی جاتے ہیں۔ چھپے ہوئے واقعات کو تو ایک طرف رکھیئے، ہمارے مشاہدات ہی اس امر پر شاہد ہیں۔ کہ موجودہ صورتِ حال جو سلوک اُردو کے ساتھ کیا جا رہا ہے وُہ ایک نہ ایک دن اس کو ختم کر کے چھوڑیگا۔ دُور کیوں جائیے۔ جو کچھ ہمارے اپنے صوبے میں ہو رہا ہے۔ وُہ کم افسوسناک نہیں۔ مندرجہ ذیل نوٹ ہم قارئین کی آگاہی کے لئے انجمن ترقی اُردو کے نیم ماہی آرگن "ہماری زبان" سے نقل کرتے ہیں :-

کچھ سال پہلے یہ بحث جاری تھی۔ کہ اُردو کی ابتدا پنجاب سے ہوئی یا دکن سے۔ اُردو کی ابتدا خواہ کہیں سے بھی ہوئی ہو۔ مگر یہ بات بالکل بحث طلب نہ تھی۔ کہ پنجاب کے لوگ اردو بولتے اور لکھتے ہیں۔ بے شک پنجاب نے اُردو کی بڑی خدمت کی ہے اور اس خدمت میں ہندو مسلمانوں کی کوئی تخصیص نہیں۔ اُردو کو پروان چڑھانے میں اپنی اپنی جگہ دونوں کا حصّہ ہے۔ ہندو اور مسلمانوں کے اردو میں روزانہ اور ہفتہ وار اخبارات اور ماہوار رسالے نکلتے ہیں اور کتابیں چھپتی ہیں۔ مگر آج جس طرح پنجاب میں ہندی کو آگے بڑھانے اور مشترکہ زبان کو کم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے۔ کہ اگر ابھی سے پیش بندی نہ کی گئی۔ تو اُردو کے لئے آنے والا زمانہ کافی نازک ہوگا۔ یہ کوشش زیادہ تر اسکولوں اور کالجوں میں ہوتی ہے۔ وہاں عام فہم زبان کو نکال کر ایک انمل بے جوڑ طرح کی زبان داخل کی جا رہی ہے۔ ہمارے سامنے اس وقت ایک کتاب ہے۔ جو پنجاب کے اسکولوں میں لڑکوں کو ہندی سے انگریزی میں ترجمہ سکھانے کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ "آرٹ آف انگلش ٹرانسلیشن" یہ کتاب پنڈت وشوا ناتھ اور لالہ دولت رام کی تصنیف ہے۔ ہائی سکولوں کے طلباء کے لئے لکھی گئی ہے۔ اسمیں ہندی کے جو جملے ترجمہ کے لئے دیئے گئے ہیں۔ ان کے چند نمونے ہم آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

"ڈاکٹر صاحب کئی دِن سے میرے بیٹے کا چکتسا (علاج) کر رہے ہیں۔" صفحہ ۳۰

"کیا میرے اسا شیہ (مدعے) کے انوکل نہیں۔" صفحہ ۳۰

"اپنی آئے (آمدنی) کو بڑھاؤ اور ویئے (خرچ) کو کم کرو۔" صفحہ ۳۴

"آؤ آج اتسو (میلہ) دیکھنے کے لئے چلیں۔" صفحہ ۳۷

"جب میں اسکول پہنچا۔ تو ادھیاپک اپستھتی (حاضری) پکار رہا تھا۔"

"کیا اس کا بھائی پرچیوت (مدفون) کیا جا چکا ہے۔" صفحہ ۶۸

"جب اس کا مکان گرایا گیا۔ تو اس نے میونسپلٹی پر ابھی یوگ (مقدمہ) چلایا۔" صفحہ ۷۳

"کرشک لوگ ورشا کے آرمبھ ہونے سے پہلے ہی اپنی اوپج کاٹ لیں گے۔" صفحہ ۹۰

"جب ابھی تک یوتک (ملزم) نے دیکھا۔ کہ اس کے سمبندھیوں نے اسے چھڑانے کے لئے وکیل کر لیا ہے۔ تو اس نے دوش ہونا اسویکار کر دیا۔" صفحہ ۱۰۰

"جب ساہوکار نے دیکھا۔ کہ اشنٹرین (قرضدار) ٹال مٹول کر رہا ہے۔ تو اس نے نالش کر دی۔" صفحہ ۱۰۸

"کیا تم اس کے انوگرہت ہو؟" صفحہ ۱۴۱

"وشواس نئے (قابلِ اعتبار) ———— ہوتی ہیں۔" صفحہ ۱۴۴

ان فقروں کو ملاحظہ کیجئے۔ ایسی مثالیں بہت پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان میں جو خاص بات نظر آتی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ سخت ہندی الفاظ کے عام فہم الفاظ بریکٹ میں لکھے ہوئے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ اسلئے کہ جو لڑکے پنجاب میں ہندی پڑھتے ہیں۔ وُہ ہندی اور سنسکرت کے ثقیل الفاظ نہیں سمجھتے۔ اس لئے ان کی آسانی کے لئے اُردو کا عام فہم لفظ بریکٹ میں لکھ دیا جاتا ہے اور یہ صورت اس وقت تک جاری رہے گی۔ جب تک کہ ہندی کے طلباء سخت الفاظ عام طور پر نہ سمجھ سکیں۔ اب ذرا الفاظ پر غور کیجئے۔ علاج کی جگہ چکتسا، آمدنی کی جگہ آئے، مقدمہ کی جگہ ابھی یوگ، ملزم کی جگہ ابھی یوتک وغیرہ سخت الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ حالانکہ اردو کے الفاظ عام طور پر سب سمجھ سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ کہ ان الفاظ کی اصل عربی یا فارسی ہو۔ اور چونکہ آجکل عربی اور فارسی کے الفاظ سے نفرت کرنا قوم پرستی کی سب سے بڑی علامت ہے۔ اس لئے یہ الفاظ بدل دیئے گئے۔ اور ان کی جگہ موٹے موٹے سنسکرت کے لفظ رکھ دیئے گئے۔ مگر ایک بات اور بھی ہے۔ ان الفاظ کے متعلق کیا کہا جائے جنکی اصل نہ عربی ہے نہ فارسی بلکہ سنسکرت ہے۔ مگر کثرتِ استعمال سے وُہ اپنی صورت بدل چکے ہیں۔ آج ان الفاظ کو پھر اپنی شکل میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔

مثلاً برسات کی جگہ ورشا، کسان کی جگہ کرشک وغیرہ کیا اس سے

پتہ نہیں چلتا ہے۔ کہ زبان پر چھپر پانچ ہزار برس پہلے کا تہذیبی رنگ چڑھایا جا رہا ہے؟ بعض الفاظ کے سامنے کوئی بریکٹ نہیں ہے۔ حالانکہ وہ بھی ثقیل اور نامانوس ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے۔ کہ اب ان کو بریکٹوں کی مدد کی ضرورت نہیں۔ اب وہ زندہ دلانوں میں سمجھے جا سکتے ہیں۔ یہ ہے وہ طریقہ جس سے آہستہ آہستہ پنجاب میں اردو کی موجودہ حیثیت پر چھری چلائی جا رہی ہے۔ مگر جس سے زندہ دلانِ پنجاب اب تک بے خبر ہیں۔ کیا وہ اسی بے خبری میں زندگی گزار دیں گے۔ یا اُٹھ کر کچھ کام بھی کریں گے؟"

ملاحظہ فرمایا آپ نے کس طرح پنجاب میں اردو دشمنی کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے۔

جو حضرات اس سلسلے میں مزید معلومات بہم پہنچائیں گے۔ ہم اُن کے شکرگزار ہوتے ہی ان کے مضامین کو "ادب لطیف" میں جگہ دیں گے

تراجم

کمسن بچے کی موت پر

انسان تجویزیں سوچتا ہے۔ اور قادرِ مطلق موزوں وقت پر فیصلہ کر
دیتا ہے ان تدبیروں کا۔
میں پڑھا . . . جہاں تم لیٹے ہوئے تھے۔
حسین گلاب کا ننھا نازک پھول
گلاب کے پھولوں کی آغوش میں
میں نے جانا . . . تم یہاں نہیں تھے۔
معلوم ہوتا تھا
تمہارے ننھے مُنّے . . . نازک پاؤں تھک گئے ہیں۔
اور تم آرام کر رہے ہو . . . گلوں کے نازک انبار میں
میں آیا!
تم نے مسکرائے اپنے "گل پوش" بستر پر
میں سمجھا . . تم کھوئے ہوئے تھے اپنی رنگین خیالوں میں۔
مگر آہ! تمہاری روح پرواز کر چکی تھی قفسِ خاکی سے۔
حقیقتاً تم سو رہے تھے ابدی خواب کی شیریں آغوش میں۔
لیکن پھر بھی:
تمہاری حسین پلکیں کتنی خاموشی سے اٹھی ہوئی تھیں آسمان
کی طرف۔
تمہارے پیارے بال کتنے پُرسکون تھے۔
یقیناً میں جانتا ہوں۔
تم جھانک رہے تھے — اپنی ننھی ننھی پیاری پیاری آنکھوں سے۔
اس نے — میرے نالے دبے رہنے پردۂ دل میں۔
میں جانتا ہوں:
خالق بصیر و ناظر ہے۔ وہ فیصلہ کر دیتا ہے موزوں وقت
پر انسانی تدبیروں کا۔
تبسم میرے لبوں پر لہرایا — میں نے تمہارا نام پکارا۔
اور اپنے گلاب کے حسین پھول کو، شیریں، نازک گلوں کے
لطیف انبار میں شامل کر دیا۔
اور تمہیں تمہاری رنگین کھیلوں میں مستغرق چھوڑ دیا۔

(چرڈ مڈلٹن)

مترجمہ سید اشرف کاظمی قصور

رازِ محبت

محبت لفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتی — دوست!
یہ دلوں میں۔ چپکے چپکے۔ پوشیدہ۔ غائبانہ بہراتی ہے۔
جیسے بادِ رواں کے نرم و نازک جھونکے۔
میں نے اپنا صحیفۂ دل کھول کر رکھ دیا محبوبہ کے سامنے دوست!
اور اپنے سینے میں پنہاں محبت کی تمام باتیں۔
مگر — آہ! وہ پھر بھی مجھے داغِ فرقت دے گئی!
ایک مسافر آیا۔
خاموش نظروں سے پوشیدہ اور اسے لے گیا۔
سردآہ کے ساتھ! (ولیم بلیک)

خاموش محبت!

اے دوست! تو اگر محبت کی پوشیدہ باکیف ذاتیوں میں کھو گیا ہے۔
تو لوں کو وا نہ کر۔
اپنے سینے کی گہرائیوں میں محبت کی آگ جوڑ کا مگر مہر بلب!
کیونکہ قلمروِ محبت کی وسعتوں پر سکوت مسلط ہے:
اگر تیرے لب آہوں اور نالوں سے واقف ہو گئے۔
تو درد و غم تیرے آبگینۂ دل کو پارہ پارہ کر دیگا۔

(لونگ فیلو)

مرگِ شباب!

وہ چل بسی ایسے
جیسے صبح کے وقت شبنم کے قطرے مٹ جائیں آفتاب کے بلندی پر پہنچنے
سے پیشتر۔
آہ کتنی مختصر زندگی!
وہ سمجھ بھی نہ سکی — محبت کی آہوں کا مفہوم
محبت کی شیرینیاں اس کے گرد یوں لہراتی تھیں
جیسے گلاب کے گرد اس کی نازک نکہتیں!
وہ بڑھی۔ اپنے محبوب کی الفت بھری نگاہوں کے راحت پرور سایہ میں
مگر یہ تم خوف و ہراس سے بے نیاز، ظالم موت نے اسے چرا لیا چپکے چپکے!
اس دنیا میں "فرشتۂ الفت" اس کا نگہبان تھا۔
اس نے اسے موت کے ہاتھوں سونپ دیا۔
وہ فرشتہ اس پر مہربان تھا — تو پھر ہم کیوں خوف کھائیں موت سے
ممکن ہے مقدس موت اس سے بھی زیادہ مہربان ہو

غزل

طالب انصاری

ستم کی خو ہو گئی ہے تیری، ستم کا سہنا ہے کام میرا! پھری ہیں جب سے تری نگاہیں، بدل گیا ہے نظام میرا

جو عشق میں جاں مٹا چکے ہیں حیاتِ جاوید پا چکے ہیں جریدۂ دہر پر لکھا ہے، جلی قلم سے دوام میرا

ہر اک فضا لالہ زار میری، ہے آسماں کی بہار میری ستارے ہیں میری مے کے چھینٹے، مہِ درخشاں ہے جام میرا

نہ رک سکا آنسوؤں کا طوفاں نہ لا سکا تابِ دردِ ہجراں ہوئی جو لبریز چشمِ پرخوں چھلک پڑا خود ہی جام میرا

جو میرے ملنے کو عار سمجھے، میری وفاؤں کو خوار سمجھے تو اس ستمگر کے آستاں کو ہے دور ہی سے سلام میرا

رہے گی کب تک یہ بے نیازی کرو گے کب تک نہ دلنوازی یہ وقت ہے وقتِ چارہ سازی کہ غم سے ہوتا ہے کام میرا

جفا سے اس شوخ کو ہے رغبت ستم کی خو ہے ستم کی عادت ہوئی ہے کس سنگدل سے الفت پڑا ہے کس مرتب سے کام میرا

نہ کرو وفاؤں کو میری رسوا، ہر اک زباں پہ ہے اسکا چرچا اچھالتا ہوں میں نام تیرا، ڈبو رہا ہے تو نام میرا

نہ بندگی سے ہے دل کو رغبت نہ کیفِ سجدہ نہ ذوقِ طاعت! فقط دکھاوے کی ہے عبادت نماز میری سلام میرا

خدائی اس محتسب کو سمجھے، اڑا دیئے اس نے ہوش میرے بکھر گئی سب شراب میری الٹ گیا مجھ سے جام میرا

عطاء اللہ
(پالوی)

اُردو میں فن ڈراما پر تنقیدی تصانیف

"ناٹک" کہئے یا "ڈراما" دونوں ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ "ناٹک" ہندی اور "ڈراما" یونانی ہوتی شکل ہے۔ ہندوستان کی سب سے بڑی قدیم زبان پراکرت کے لفظ "نارٹ" (بمعنی رقص)، "نٹ" (بمعنی بازیگر) اور "نارتکا" (بمعنی نچیا) کی۔ اسی طرح "ڈراما" مشتق ہے یونانی لفظ "ڈراؤ" سے جس کے معنی کام کرنے اور ایکٹنگ کے ہیں۔ چونکہ ناٹک یا ڈراما انسانی زندگی کا جزو لاینفک ہے۔ لہٰذا اس کی صحیح تعریف میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک طرف تو انسانی زندگی کو دیکھنے اور سمجھنے میں ایک صحیح تصویر کا کام دیتا ہے، اور دوسری جانب زندگی کو سمجھانے کی ایک اچھی ترکیب اور سدھارنے کی ایک عمدہ تدبیر ہے۔ کیونکہ اس میں اقوال و افعال کے ذریعے انسان کی اچھی یا بری، معاشرت، تمدن، تہذیب یا طریق کی متحرک تصویر دکھائی اور اتاری جاتی ہے۔ بقول محمد عمر و نور الٰہی صاحبان ڈراما ایک روداد ہے، جو عملاً کر کے دکھائی جاتی ہے ڈراما ایک مکالمہ ہے، جس سے ایک ایسا نتیجہ برآمد ہوتا ہے جو بلاواسطہ افعال انسانی سے مترتب ہوتا ہو۔ ڈراما ان لوگوں کا لکچر ہے جو مکالمہ کی زحمت گوارا نہیں کر سکتے اور ڈراما

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

کی متحرک تشریح ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے

نشر کرتے ہیں جو کچھ نیک و بد کام
دکھا دیتے ہیں ہم ہر اک کا انجام

حقیقت یہ ہے کہ ناٹک یا ڈراما ایک ایسا فن ہے جو بالتفریح تعلیم، بلا جبر تربیت، بلا زحمت تعلیم اور بلا نصیحت رجحت مواعظت کا کام دیتا ہے۔ اس سلسلے میں اس کا مقابلہ دنیا کا کوئی طرز تعلیم، کوئی طرز تربیت اور کوئی صنف ادب نہیں کر سکتی۔ محمد عمر و نور الٰہی صاحبان نے بالکل درست اور قطعی بجا فرمایا ہے۔ کہ:

"جب تہذیب عالم کے صم و بکم، مظاہر مثلاً تاریخ، تذکرہ، سیر و روایات، انسان کو نکتہ کار بنانے کی اہلیت رکھتے ہیں، تو ان کا چلتا پھرتا، منہ بولتا نمونہ (ڈراما یا ناٹک) جو اثر انسان کے دل و دماغ پر کرے گا وہ کتنا اہم بالشان ہوگا؟ اگر یہ سچ ہے کہ "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" تو اسے بھی سچ مانئے کہ تاثیر کے اعتبار سے کسی کتاب کا مطالعہ ڈراما سے لگا نہیں کھا سکتا۔ حضرت انسان کے دیگر سوانح نگار واقعات سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ جو کچھ از منۂ ماضیہ میں ہو چکا اسے بیان کر کے اپنا دفتر لپیٹ لیتے ہیں۔ لیکن ڈراما جو فطرت انسانی کا ماہر کامل ہے ان سے بہت آگے نکل جاتا ہے۔ اور ممکنات کو معرض بحث میں لا کر یہ بھی دکھا دیتا ہے، کہ فلاں کا مآل ایک ایسی صورت میں بھی ممکن ہے۔ جو آج تک رونما نہیں ہوا تاریخ آپ کو "محو غم دوش" تو کر دے گی، مگر فکر فردا پر آمادہ کرنا ڈراما ہی کا کام ہے۔ وہ تاریخ، آپ کو بتائے گی کہ دنیا نے کیا کیا، اور ڈراما آپ کو دکھائے گا، کہ دنیا کو کیا کرنا چاہیئے"

ظاہر ہے کہ جب ڈراما میں یہ اہلیت ہے، اور یہ ہمارے ادب و زندگی کا ایسا زبردست مآل اور اس میں اس درجہ درخور رکھتا ہے، تو وہ ضرور اور بالیقین ایک مستقل اور باضابطہ "فن" کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور فن ایسی چیز ہے جس کے کچھ اصول و قیود مقرر اور کچھ ضوابط و حدود متعین ہوں۔ انکے کچھ خاص اصطلاحات، انکی کچھ علیحدہ خصوصیتیں اور ان کے کچھ منفردانہ اصول منضبط ہوں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے، کہ دنیا کی ساری زبانوں میں کل علوم اور سارے فنون کے ساتھ ساتھ فن ڈراما سے متعلق بھی ایسی ایسی ضخیم کتابیں تصنیف و تالیف ہوئی ہیں جن میں اس فن یا اس علم کے اصول و قیود اور قواعد و ضوابط سے بحث کی گئی ہے، اور اس فن یا علم کو جانچنے اور پرکھنے کی کسوٹی کتابی صورت میں تشکیل ہوتی ہے۔ خود قدیم ہندوستان کی سب سے بڑی زبان سنسکرت میں بھی "بھارتی ناٹیہ شاستر" کے علاوہ متعدد تصانیف ایسی دستیاب ہوتی ہیں، جن میں فن ڈراما کے قواعد و ضوابط متعین کئے گئے ہیں۔ اور اصول فن سے بحث کرتے ہوئے ان پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ مگر اردو زبان نے جب اس فن [illegible]

اہم صنف ادب ہی کو پس پشت ڈال دیا ہو۔ تو پھر اس زبان میں ایسی تصانیف کے وجود میں آنے کی کونسی صورت تھی!

اردو زبان آج سے نہیں صدیوں سے ہندوستان میں رائج ہے "اردو میں ناٹکوں یا ڈراموں کا وجود آج سے نہیں، عرصے سے پایا جاتا ہے۔ لیکن ۱۹۲۲ء تک اردو میں اس فن پر یا اس سے متعلق کوئی تصنیف و تالیف موجود نہ تھی۔ یہ صحیح ہے کہ اس درمیان میں اس فن پر اردو میں اکثر بلند پایہ مقالے لکھے گئے۔ مگر وہ صرف رسائل کے اوراق ہی تک محدود رہے۔ نہ انہیں کتابی شکل میں منضبط کیا گیا تو نہ ان سے علیحدہ ہو کر اس فن کے متعلق کتابیں لکھی گئیں۔ البتہ ۱۹۲۴ء میں محمد عمر و نور الٰہی صاحبان نے ناٹک ساگر تالیف کی، جو ۱۹۳۴ء تک بقدر مدت دس سال وحدہ لاشریک لہٗ کا نعرہ لگاتی رہی۔ ۱۹۳۵ء میں دوسری تالیف "اردو میں ڈراما نگاری" عالم وجود میں آئی۔ جس کے مولف اردو زبان کے مشہور پرستار جناب سید بادشاہ حسین حیدر آبادی ہیں۔ یہ دونوں کتابیں اسوقت میرے پیش نظر ہیں۔ اور میں چاہتا ہوں کہ علی الترتیب ان دونوں ادبی کاوشوں کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کی کوشش کروں

"ناٹک ساگر"

"ناٹک" جیسا کہ ابتدائی صفحات میں ظاہر کیا گیا ہے۔ اس تماشہ کا نام رکھا گیا ہے جس میں بول چال اور حرکات و سکنات کے ذریعے انسانی زندگی کے کسی روشن یا تاریک رخ کو پیش کیا گیا ہو۔ اور "ساگر" کے معنی سمندر کے ہیں۔ لہٰذا "ناٹک ساگر" کے معنی ہوئے "وہ کتاب جس میں ڈراما کا ایک بحر بیکراں موجیں مار رہا ہو" حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب اسم بامسمیٰ ہے۔

ناٹک ساگر کے فاضل مولفین نے اپنی اس مشترکہ تالیف کے تقریباً ساڑھے چار سو صفحوں میں تمام دنیا کے ڈراموں کا ایک ایسا سمندر بند کر رکھا ہے۔ جس کی وسعت اس سرے سے اس سرے تک تمام کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اور جس کا آغوش ادب آٹھویں صدی قبل مسیح سے بیسویں صدی بعد مسیح یعنی ڈھائی ہزار سال سے زیادہ کے ڈرامائی تذکرے کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

اس کا "دیباچہ" خود مولفین نے اور "مقدمہ" ملک کے مشہور انشاپرداز خصوصاً فن ڈراما کے مشہور عالم جناب کیفی دہلوی نے لکھا ہے۔ خوش قسمت ہے زبان اردو کہ اس میں اب ایسی جامع تالیف موجود ہے۔ جس کی مثال دنیا کی دیگر زبانوں میں نہیں دکھائی دیتی۔ اور واقعی مستائش ہیں خوش مذاق مولفین جنکی عرق ریزی، صبر آزما جانچ اور قسمت نگاری نے بقول کیفی اردو ادب میں ایک ایسی گرانبہا تالیف کا اضافہ کیا ہے جس کے احسان کی گرانباری سے اردو زبان کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔

ناٹک ساگر کے پندرہ ابواب ہیں۔ جن میں سے چودہ ابواب میں تمام دنیا بجز ہندوستان کو چھوڑ کر ہر ملک کے ڈراموں، ڈراما نگاروں، سٹیجوں، ایکٹروں، ڈراما کی بنیادوں، فنی خصوصیتوں، بتدریج ترقیوں اور ان کے عروج و زوال... سے بحث کی گئی ہے۔ اور جو لکھا گیا ہے۔ وہ نہایت محققانہ اور مدلل و مفصل ہے جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ اس میں انگریزی تصانیف سے مدد لی گئی ہے۔ اور انگریزی میں تمام ممالک کے ڈراموں سے متعلق بے شمار و بیش بہا کتابیں تصنیف، تالیف اور ترجمہ کی گئی ہیں، اور کافی سے زیادہ چھان بین، جانچ پڑتال اور تحقیق و تدقیق کر کے مواد بہم کئے گئے ہیں۔ ورنہ مشکل تھا۔ کہ ایسی بسیط اور جامع کتاب تالیف ہو سکے۔ پانچواں "ناٹک ساگر" کا بارھواں باب ہندوستان سے متعلق ہے۔ جس میں قدیم و جدید ہندوستانی سٹیجوں، ہندی، اردو اور بنگالی ڈراموں، ڈراما نگاروں اور ڈرامائی خصوصیات سے بحث کی گئی ہے ان چیزوں میں بھی جہاں تحقیق و تدقیق کا موقع آ گیا ہے۔ وہاں مغربی مصنفین، مولفین اور محققین کی تصانیف و آراء سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ہر چند کہ اردو، ہندی یا بنگلہ میں ایسی کتابوں کے فقدان کی وجہ سے انگریزی تصانیف سے استفادہ ناگزیر تھا۔ اور یہ واقعہ ہے۔ کہ اس وقت ہندوستانی ڈرامائی ادب سے متعلق جو کچھ قابل قدر سرمایہ ملتا ہے وہ انگریزوں اور جرمنوں ہی کے شوق تلاش و جستجو اور ذوق تحقیق کا نتیجہ ہے۔ مگر پھر بھی فاضل مولفین بذات خاص نہ سہی دیگر ارباب نظر کے تحقیقی نتائج سے مشورہ یا استفادہ فرما لیتے۔ تو کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو جاتا۔ نیز وہ مقامات غیر محققانہ یا تشنہ نہ رہ جاتے جو اس وقت زیر بحث اور محل نظر ہو رہے ہیں۔ یا پہلے ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ڈراما کی ابتدا کہاں سے ہوئی، یا یہ کہ اردو زبان میں ڈراما خصوصاً اندر سبھا کی بنیاد کیسے پڑی۔ یہ دو چیزیں ایسی ہیں۔ جو حد درجہ بحث طلب تھیں۔ اور ان پر تفصیلی محققانہ مقالے کی ضرورت تھی۔ مگر فاضل مولفین نے انہیں صرف مغربی محققین کا سہارا لیکر قطعی مجمل اور کسی حد تک اپنی بات کی پچ رکھ کر متنازعہ فیہ بنا دیا ہے۔ میں اس کتاب سے

متعلق اس جگہ ان ہی دونوں عنوانات کے ماتحت کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں

(۱) "ڈراما کی ابتدا کہاں سے ہوئی؟"

یہ چیز کہ ڈراما کی ابتدا کہاں سے ہوئی؟ یا یہ کہ ڈراما کی بنیاد سب سے پہلے ہندوستان میں پڑی یا یونان میں! بڑی متنازعہ فیہ ہے جیسا کہ "ناٹک ساگر" کے مقدمہ میں حضرت کیفی دہلوی نے فرمایا ہے۔ سب سے پہلے جرمنی کے ایک محقق ویبر نے یہ سوال اٹھایا کہ سنسکرت ناٹک یونان سے آیا۔ یا یہ کہ ...... یونانی ناٹک سے متاثر ہوا، جب یہ خیال عام ہوا، تو اسی سلسلے میں دو جماعتیں متعین ہوگئیں، اور ہر جماعت کے افراد مختلف دلائل پیش کرنے لگے۔ مگر بقول پنڈت رام سروپ باسشٹ چند تمام افراد نے بالآخر اپنی اپنی حماقتیں قبول کر لیں اور اپنے آرا کی غیر قطعیت تسلیم کر لی۔۔ فاضل مولفین نے اس سلسلے میں صفحہ ۳۱۲ میں علمائے ہند کے ڈرامے کی ایجاد کو دیوتاؤں سے منسوب کرنے کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ کہانی درج فرمائی ہے جو زبان زد خاص و عام ہے۔ اور صفحہ ۳۱۴ میں فرمایا ہے کہ

"یہ روایت کوئی باور کرے یا نہ کرے، مگر اس میں کلام نہیں کہ چوتھی صدی قبل مسیح میں فن ڈراما ہندوستان میں ایجاد ہو چکا تھا"

پھر صفحہ ۳۲۰ میں "ہندی اور یونانی ڈراما" کے عنوان سے فرمایا ہے کہ:

"ہندوستان میں ڈراما کس طرح پیدا ہوا، ایک ایسا سوال ہے کہ قطع نظر روایات مذہبی اسکا جواب دینا مشکل ہے۔ لیکن اس سے مجالِ انکار نہیں کہ سنسکرت کی صرف و نحو کے موجد پانَنی سے قبل ڈراما ہندوستان میں رائج تھا۔ سنسکرت صرف و نحو کا نامور شارح گیتا نجلی بھی اپنی تصنیف میں ڈراما کا حوالہ دیتا ہے"

لیکن اس کے باوجود آگے چل کر فاضل مولفین نے مغربی محققین کے خیالات کی ترجمانی فرماتے ہوئے ان وجوہ کا ذکر کیا ہے۔ جن کی بنا پر ہندوستانی سنسکرت ڈراموں پر یونانی اثر ثابت کیا جاتا ہے، پھر آگے بڑھ کر مولف انسائیکلوپیڈیا اور شگل کے حوالے سے یہ تذکرہ کرتے ہوئے کہ ڈراما قطعی ہندوستانی چیز ہے، فرمایا ہے کہ:

"ایسی صورت میں یہ تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے کہ ڈراما خالص ہندی چیز ہے"

گویا فاضل مولفین باطمینان تمام اس کے قائل نہیں کہ ڈراما خالص ہندوستانی چیز ہے۔ بلکہ انہوں نے مولف انسائیکلوپیڈیا اور شگل کے اقوال و تحقیق سے متاثر ہو کر چار و ناچار یہ تسلیم کر لیا ہے۔ کہ ڈراما در اصل ہندوستان کی چیز ہے۔ کیونکہ پھر انہوں نے آخر میں یہ لکھ دیا ہے کہ:

"ہندوستان کے ماہرین فن ڈراما کی تو یہ رائے ہے کہ خود یونان نے ڈراما ہندوستان سے لیا۔ لیکن چونکہ ابھی یہ دعویٰ شائع ہو کر تنقید کے خراد پر نہیں چڑھا، اس لئے اس پر کچھ کہنا قبل از وقت ہے" (صفحہ ۳۲۲)

شاید یہ اشارہ حضرت کیفی کی علمی اس محنت شاقہ کی طرف ہے۔ جس کے ذریعے وہ ثابت کرنا چاہتے تھے، یا ہیں۔ کہ "یونان کے ناٹک پر ہندوستان کے ادب کا بیّن اثر پڑا ہے" بہرکیف فاضل مولفین اگر چاہتے تو تفصیلاً نہ سہی مجملاً ہی اس پر روشنی ڈال سکتے تھے۔ کہ ڈراما قطعاً ہندوستانی چیز ہے اور اس کی بنیاد یہیں پڑی۔

جیسا کہ خود فاضل مولفین نے تحریر فرمایا ہے۔ سنسکرت صرف و نحو کے نامور شارح گیتا نجلی نے اپنی تصنیف میں ڈراما کا حوالہ دیا ہے یہ شارح دو ڈھائی سو سال قبل مسیح گزرا ہے۔ اور اس نے اپنی شرح "مہابھاشیہ" میں "کنس بندھ اور بلی بندھ" وغیرہ مکمل ڈراموں کا پتہ دیا ہے، اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ مسیح سے دو ڈھائی سو سال قبل ڈراما باضابطہ ایک فن قرار پاکر معراج کمال حاصل کر چکا تھا۔ نیز حسب اعتراف مولفین "مرچھ کٹک" تحقیقی طور پر دو ڈھائی سو سال قبل مسیح کا ڈراما ہے۔ جو مکمل صورت میں موجود ہے۔

اب آیئے تیسری صدی قبل مسیح میں۔ اسوقت بھی ڈراما مکمل صورت ہی میں موجود تھا۔ کیونکہ اشوک اعظم تیسری صدی قبل مسیح گزرا ہے۔ اور اسوقت تک اس کے جتنے کتبے دستیاب ہوئے ہیں ان میں سے اکثروں پر ایسے احکام درج پائے جاتے ہیں۔ جو ڈراما کی ممانعت میں ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ تیسری صدی قبل مسیح میں ڈرامے بکثرت ہوا کرتے تھے۔ اور ان کا بڑا زور تھا۔

فاضل مولفین اس سے بھی مجالِ انکار نہیں پاتے کہ "سنسکرت صرف و نحو کے موجد پانَنی سے قبل ڈراما ہندوستان میں رائج تھا" اس کو نہ ماننے کی کوئی وجہ بھی نہ تھی۔ کیونکہ مہرشی پانینی (Panini) نے سنسکرت کی یہ گرامر جس کا نام "اشٹادھیائی" ہے اور جو مہابھاشیہ (شرح) کی تصنیف سے ایک سو برس اور مسیح سے تین سو برس قبل تصنیف ہوئی ہے۔ اس میں نہ صرف یہ کہ ڈراموں کا ذکر موجود ہے بلکہ یہ بھی تحریر ہوا ہے کہ شلالی اور کرشاشو نے دو "نٹ سوتر" (یعنی ناٹک

کے متعلق دو کتابیں تصنیف و تالیف کی تھیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ تین سو برس قبل مسیح میں ڈراما سے متعلق ایسی کتابیں مسطور ہوچکی تھیں جن میں ڈرامائی ادب پر تنقیدی نظر کی گئی ہو۔ اور چونکہ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ادب میں فن تنقید اسی وقت عالمِ وجود میں آتا ہے اور اس کے اصول و قواعد اسی وقت مرتب ہوتے ہیں، جب اس ادب کی بہتات ہو جاتی ہے۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ چوتھی ہی نہیں بلکہ پانچویں صدی قبل از مسیح میں بھی ڈراموں کی بہتات تھی۔ کہ کھرے اور کھوٹے کو پرکھنے کے لئے اس فن پر کتابیں تصنیف کی گئی تھیں۔ اس خیال یا حقیقت کی تصدیق اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ ویدویا رشی، اور والمیک رشی کی مایۂ ناز ادبی کتابیں مہابھارت اور رامائن میں بھی جو علی الترتیب چوتھی اور پانچویں صدی قبل از مسیح کی تصنیف ہیں۔ "نٹ اور نرتکہ" یعنی ایکٹر اور ناچنے والے، وغیرہ قسم کے بے شمار الفاظ ملتے ہیں۔ نیز بھارت ناٹیہ شاستر چاہے جس طرح بھی عالمِ وجود میں آئی ہو۔ لیکن آئی۔ اور یہ مسلم ہے کہ وہ مکمل طریقہ پر فن ڈراما سے متعلق ہے۔ اور اس میں تفصیلات و تعینات اصول و ضوابط اس طرح درج ہیں۔ جن کو دیکھتے ہوئے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس وقت ڈراما غیر معمولی طور پر مکمل اور ہمہ گیر تھا۔ اور چونکہ ایسی جامع اور بسیط کتاب کے وجود میں آنے کی صورت جب ہی ممکن ہے، جب فنِ ڈراما بے حد ترقی کرچکا ہو۔ لہٰذا یہ یقینی ہے کہ حضرت مسیح سے چار پانچ سو سال قبل ڈراما موجود تھا۔ اور روز بروز ترقی کر رہا تھا۔

فاضل مولفین نے مغربی محققین کی تحقیقوں کے مطابق باب اول میں یونانی ڈراموں کی ابتدا سے متعلق فرمایا ہے کہ:۔

"اہلِ یونان کی طبائع میں ڈراما کا عنصر موجود تھا، اور اس کی شہادت ان مذہبی رسوم سے ملتی ہے جنہیں اسرار برزخ کہتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی پوجا تھی جس میں پوجاری ڈائیٹر اور سیرس نامی دیوتاؤں کے معجزات اور سوانح حیات ان کا بہروپ بھر کر بیان کرتے اور اعتراف دوزخ اور بہشت کے نظارے دکھا کر حیات بعد الموت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچتے تھے۔ اور اس سے تلقین و تبلیغ کا کام لیتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی باکس پوجا رائج تھی لیکن اس ادائے فرض مذہبی کے علاوہ قومی اور اقتصادی بہبودی کی دعائیں بھی شامل ہوتی تھیں۔ باقاعدہ ڈراما کا سرچشمہ یہی باکس پوجا ہے۔"

اگر حقیقتاً صرف اس طرح کے مذہبی رسوم کی ادائی بہت ثبوت ہے۔ ڈراما کے یونانی نژاد ہونے کا۔ اور اس کی قدامت چھٹی صدی قبل مسیح قرار دی جاتی ہے۔ تو پھر ڈراما کو ہندی نژاد کیوں نہ مانا جائے۔ جبکہ بودھ مذہب کی بنیاد چھٹی صدی قبل از مسیح میں پڑی، اور بودھ مذہب کی اکثر کتابوں میں ڈرامائی تذکرے پائے جاتے ہیں۔ جن کے معنی یہ ہیں کہ بودھ مذہب سے کہیں قبل ہندوستان میں ڈراما رائج تھا۔

آگے چل کر نیز فاضل مولفین نے یونانی ڈراما نگار ایس کائیلس Aeschylus کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ:

"جس طرح تھسپس فنِ ڈراما کا موجد ہے اسی طرح باقاعدہ ٹریجیڈی کی داغ بیل ڈالنے کا سہرا ایس کائی لس کے سر ہے اس نے کورس کو بہت حد تک عضو معطل کر کے مکالمہ کو جزوِ اعظم بنایا۔۔"

اگر واقعی ڈراما کو ڈراما بنانے کا فخر ایس کائیلس کو محض اسی وجہ سے حاصل ہے کہ اس نے "کورس کو بہت حد تک عضو معطل کر کے مکالمہ کو جزوِ اعظم بنایا" اور اگر واقعی صرف مکالمہ کی موجودگی ہی ڈرامے کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے تو پھر تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔ کہ ڈراما ہندی چیز ہے۔ کیونکہ یہ امر مسلم ہے کہ وید مقدس دنیا کی سب سے پرانی مذہبی کتاب ہے۔ اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ وید کے چند سوکت ایسے ہیں جو کلیتاً ایک ڈرامائی مکالمے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان کے مسلم الثبوت شہرہ آفاق ... کا تو یہی خیال ہے کہ "سنگیت میں تین چیزیں شامل تھیں۔ گانا بجانا اور رقص" اسی سنگیت کے ذریعہ رشی لوگ وید کے ان مکالموں کے منتروں کو گاتے تھے اور کچھ ایکٹ بھی کرتے تھے۔

ویدوں میں "رگ وید" سب سے پرانی کتاب ہے۔ اسی سے ہم کو پتہ چلتا ہے۔ کہ سوم رس بوٹی جس کا رس نکال کر پیا جاتا تھا کی فروخت کے وقت ایک قسم کی ایکٹنگ ہوا کرتی تھی۔ جس سے مقصود یہ تھا کہ بیچنے والے اور خریدنے والے دونوں محظوظ ہوں۔

"یجر وید" میں لفظ شیلوس متعدد مقامات پر موجود ہے۔ جس کے معنی ایکٹر کے ہیں۔ نیز "یجر وید" میں رقص و سرود کا ذکر بھی اکثر جگہوں پر ہے۔ بقول جناب رام سروپ شاستری مہاورات ستوم کے موقع پر کنواری لڑکیاں پوجا کے لئے اگنی کے ارد گرد طواف کے وقت ناچا اور گایا کرتی تھیں۔ اور شریمد بھاگوت وغیرہ کئی پرانوں میں اپسراؤں اور رنڈیوں کے ناچنے گانے کا بھی ذکر موجود ہے۔ پھر کیوں نہ کہا جائے کہ ڈراما ہندوستانی

چیز ہے؟ بہر کیف اسی سلسلے میں حضرت کیفی دہلوی نے بھی مقدمۂ ناٹک ساگر میں کافی کچھ لکھا ہے۔ اور ضرورت نہیں ہے کہ اسے یہاں نقل کر کے مضمون کو طول دیا جائے۔

ناٹک ساگر میں دوسری چیز جو متنازعہ فیہ ہے وہ یہ کہ :-

(۲) اندر سبھا کی بنیاد کیسے پڑی؟

اس کے متعلق "ناٹک ساگر" کے وجود میں آنے سے پہلے فاضل مولفین نے جو مقالہ رسالہ "اردو" میں شائع کرایا تھا۔ اس میں واجد علی شاہ اودھ کی رنگین زندگی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ کہ جس وقت لوگ شاہ اودھ کو نئے ڈھنگ سے مسرور و محظوظ کرنے کی فکر میں سرگرداں تھے۔ اس وقت :-

"۱- ایک فرانسیسی مقرب بارگاہ نے مغربی تھیٹروں کا نقشہ پیش کیا۔ ہندوستانیوں کو بھی کچھ خیال آیا۔ اور انہوں نے مروجہ ناٹک سے مغربی ڈراموں کی تطبیق کی۔ یہ وہ وقت تھا۔ کہ بمصداق کل جدید لذیذ، فرانس بلکہ عام یورپ اپیرا (وہ ڈراما جو سر بسر رقص و سرود کے ذریعے ادا کیا جاتا ہو) کا گرویدہ ہو رہا تھا۔ اس لئے واجد علی شاہ کے حضور میں جب فرانسیسی ڈراما کا ذکر آیا۔ وہ اوپیرا تھا۔ ناچ گانا پہلے ہی ایک پسند خاطر چیز تھی۔ اس لئے ایسا ہوا، کہ ہندوستانی مذاق کا اوپیرا تیار ہو۔ قرعۂ فال امانت کے نام پڑا۔ جنہوں نے ۱۲۶۹ھ میں اس فرض کو بوجہ احسن ادا کیا۔"

مطبوعہ مضمون میں صاحب مضمون نے ان کے علاوہ بھی دعوے کئے تھے۔ کہ جب اندر سبھا تیار ہوئی۔ تو ڈراما کی صورت میں قیصر باغ میں کھیلی گئی۔ واجد علی شاہ نے اس میں اندر کا پارٹ کیا۔ باقی پارٹ اہلِ دربار کو ملے۔ وغیرہ وغیرہ۔

جب یہ مضمون شائع ہوا، تو مولانا عبدالحلیم شرر نے اپنے رسالہ "دلگداز" میں صاحب مضمون کے ان دعووں کی تردید کی اور لکھا کہ :-

"واجد علی شاہ کا مقرب بارگاہ کوئی فرانسیسی نہ تھا۔ جان عالم کے ۔۔۔ زمانے میں فرنچ لوگوں کا دور ختم ہو چکا تھا۔ ...... یہ بھی غلطی معلوم ہوتی ہے کہ امانت نے اندر سبھا واجد علی شاہ کے اشارے یا حکم سے لکھی۔ یا قیصر باغ کے سٹیج پر دکھائی گئی۔ ..... جہاں تک میں نے دریافت کیا ہے۔ اندر سبھا کبھی شاہی ڈراما نہیں بنی اور نہ بادشاہ نے کبھی راجہ اندر کا روپ بھرا۔ ..... یہ بھی غلط ہے کہ ... کسی معزز دربار والے نے اس کا کوئی پارٹ لیا ہو"

منجملہ ان کے اور بھی اعتراضات کئے گئے تھے۔ اور فاضل مولفین کے بیان کی عدم صحت میں چند ثبوت بہم پہنچائے گئے تھے۔ فاضل مولفین نے انہیں نہ مانا اور اس کے جواب میں ایک مضمون رسالہ "ہزار داستان" میں شائع کرایا تھا۔ اور اس میں اپنی تحریر کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔

"ناٹک ساگر" میں بھی فاضل مولفین نے اپنا پہلا بیان اور شرر کا اعتراض نقل کرتے ہوئے اپنے جواب مطبوعۂ "ہزار داستان" کا ملخص درج فرمایا ہے۔ جس کا لب و لہجہ کس حد تک تلخ ہے۔ اور جس میں فرمایا گیا ہے کہ :-

"..... رہس تو خیر عام ہے۔ قیصر باغ میں پہنچ گئی لیکن پردے جو بالکل مغربی چیز ہیں، اور رہس کی نمایش انکی دست نگر نہیں۔ ان کا دخل قیصر باغ میں کیسے ہوا؟ ..... ایک ہی جواب ہے۔ کہ قیصر باغ کے سٹیج کو کسی یوروپین کی وساطت سے پردے ملے۔ ورنہ واجد علی شاہ کی رنگ رلیوں کا کوئی مورخ بتائے۔ کہ یہ وساور کی چیز قیصر باغ کی فصیل کس طرح پھاند گئی ..... یہ درست ہے کہ واجد علی شاہ کے زمانے میں فرانسیسی حکومت کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا۔ کہ کوئی فرانسیسی تجارت یا سیاحت کے لئے لکھنؤ میں نہیں آ سکتا تھا۔ اور اسے دربار میں اتنی بھی رسائی نہ ہو سکتی تھی کہ وہ ڈراما مغربی تھیٹر کے ساز و سامان کا ذکر کر سکے ......

پردوں کی موجودگی کسی ایسے ڈراما کی مقتضی ہے جس کی نمایش میں انہیں استعمال کیا جائے، اور جو فن کے لحاظ سے رہس سے بلند ہو۔ اگر اندر سبھا ڈراما نہیں تو مولانا بتائیں کہ کس ڈراما کے لئے اتنا اہتمام کیا گیا تھا؟ ..... مولانا فرماتے ہیں۔ کہ بادشاہ کے رہس منڈل کو دیکھ کر عوام کو بھی شوق چرایا، اور ان کے لئے امانت نے اندر سبھا لکھی۔ ..... اندر سبھا اوپیرا یعنی میوزیکل کومیڈی ہے۔ اس صنف سے ہندوستان کا قدیم ڈراما ناآشنا

ہے۔ اور ہندوستان میں ڈراما کا آغاز اوپیرا سے ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ اس کا طرح انداز کوئی فرنگی ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ فرانسیسی ہے۔ اگر کوئی ہندوستانی رہنما ہوتا تو بھولبھولی ...... کا نمونہ پیش کرتا اگر انگریز ہوتا، تو شیکسپیر کے طرز کی چاٹ لگاتا۔ یہ کوئی فرانسیسی ہی تھا جو اوپیرا کو رائج کر گیا۔ کیونکہ اس وقت اوپیرا کے سب سے بڑے علمبردار فرانسیسی ہی تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اندر سبھا کی ترتیب فرانسیسی ڈراموں کی ترتیب سے ملتی جلتی ہے...... آخر میں ہم مولانا کی توجہ سرسوتی اپریل سنہ ۱۹۲۸ء کی طرف منعطف کراتے ہیں جس میں ہندوستان کے مایۂ ناز ادیب تاریخ اور فن ڈراما کے ماہر لالہ کنور سین .... اندر سبھا کے متعلق رقمطراز ہیں کہ،

"یہ اندر سبھا اودھ کے رنگیلے فرمانروا اور اس کے اہل دربار کیلئے تحریر ہوئی جسے انہوں نے تمثیل کیا۔ واجد علی شاہ اس میں اندر کا پارٹ کیا کرتے تھے"۔

مزید تشفی کے لئے ہم نے ڈراما کے مایۂ ناز عالم جناب کیفی سے استشہاد کیا۔ اور صاحب موصوف نے بھی اس قول کی تصدیق اور توثیق کی ....

غرض اسی طرح سارے اعتراضات ادا کئے گئے تھے۔ مگر یہ سب مرحلہ "ناٹک ساگر" کے وجود میں آنے سے پہلے پیش آیا تھا۔ جب "ناٹک ساگر" مطبوع ہوئی تو دعووں، اعتراضوں اور جواب کے اکثر حصے حذف کرکے ان کے صرف چند اقتباسات پیش کئے گئے جس کے مطالعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مولفین اپنے ان دعووں کی صحت پر اڑے رہے کہ:۔

(۱) واجد علی شاہ کے دربار میں ایک فرانسیسی کی رسائی تھی
(۲) اس فرانسیسی درباری نے فرانسیسی اوپیرا کا نقشہ پیش کیا۔ کیونکہ اس زمانے میں فرانس بلکہ عام یورپ اوپیرا کا گرویدہ ہو رہا تھا۔ اس لئے واجد علی شاہ کے دربار میں جس فرانسیسی ڈرامے کا ذکر آیا، وہ اوپیرا تھا۔
(۳) پردے بالکل مغربی چیز ہیں۔ اور رہس کی نمائش ان کی دست نگر نہیں۔
(۴) اندر سبھا اوپیرا ڈرامے کے طور پر قیصر باغ میں تصنیف کھیلی گئی۔
(۵) امانت نے واجد علی شاہ کی فرمائش سے اندر سبھا لکھی جس میں واجد علی شاہ نے اندر کا اور دیگر درباریوں نے دوسروں کا پارٹ لیا۔
(۶) یہ دعوے سب اس لئے اٹل ہیں کہ مسٹر بالی والا خورشید جی بہت بڑے ایکٹر، جناب لالہ کنور سین مایۂ ناز ادیب و تاریخ و فن ڈراما کے ماہر اور حضرت کیفی ڈراما کے وحید العصر عالم نے میرے بیان کی تصدیق کی ہے

"ناٹک ساگر" کی اشاعت کے بعد پروفیسر مسعود رضوی نے "اردو" میں ایک مضمون لکھا جس میں فاضل مولفین کے ان چند نیز دیگر غیر حقیقی امور کی تردید کی۔ جو یہ ہیں:۔

(۱) اندر سبھا میں نثر کی متعدد سطریں موجود ہیں۔
(۲) امانت کی رسائی واجد علی شاہ کے دربار میں کبھی نہیں ہوئی، جس کے چشم دید گواہ امانت کے چھوٹے بیٹے سید عباس حسن فصاحت موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان سے زیادہ باوقعت اور کسی کی بات نہیں ہو سکتی۔
(۳) قیصر باغ میں اندر سبھا امانت، جس کی تصنیف کا سال مولفین نے سنہ ۱۲۶۲ھ ظاہر کیا ہے۔ کبھی نہیں کھیلی گئی۔ نہ درباریوں خواہ واجد علی شاہ نے اس میں کوئی پارٹ کیا نیز امانت نے "اندر سبھا" نہیں، بلکہ شرح اندر سبھا سنہ ۱۲۷۰ھ میں لکھی۔ اندر سبھا کا سال تصنیف سنہ ۱۲۶۸ھ ہے
(۴) اندر سبھا واجد علی شاہ کے حکم سے نہیں لکھی گئی بلکہ امانت کے شاگرد مرزا عابد علی عبادت کی فرمائش سے تصنیف ہوئی۔ نیز ——— یہ قیصر باغ میں نہیں کھیلی گئی۔ نہ اس کے سٹیج کی تیاری میں فرانسیسی ہدایت کو دخل تھا۔
(۵) امانت اندر سبھا کو اپنے نام سے منسوب کرنا معیوب سمجھتے تھے۔ اور اسی لئے انہوں نے اندر سبھا کی مخصوص نظموں میں استاد تخلص کیا۔

پروفیسر صاحب نے اپنے متذکرہ بالا دعووں کی صحت میں جو ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ وہ اٹل ہے۔ یعنی انہوں نے "شرح اندر سبھا" تمام و کمال نقل کر دی ہے جس میں متذکرہ بالا حقیقتیں خود مصنف اندر سبھا کے قلم اعجاز رقم کی لکھی ہوئی موجود ہیں۔ ایسی صورت میں بقول پروفیسر صاحب:۔

ان دعووں کے لئے کسی دلیل اور قیاس کی ضرورت

نہیں، صرف اندر سبھا اور شرح اندر سبھا کو ایک بار خود سے پڑھ لینا کافی ہے۔"

اس میں شبہ نہیں کہ پروفیسر صاحب کے اس جواب سے فاضل مولفین کے غلط دعووں کی قرار واقعی تردید ہو گئی ہے۔ لیکن پھر بھی اگر تمام چیزوں کو تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو بھی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ فاضل مولفین "ناٹک ساگر" اس بارے میں زبردست ٹھوکر کھا گئے ہیں۔ ابھی حال ہی میں پروفیسر آزر عطیلی نے "اندر سبھا" اور فاضل مولفین کی تصنیف "ناٹک ساگر" کے اس حصے سے بحث کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ

(۱) جنوری ۱۸۴۷ء اور پھر نومبر ۱۸۴۷ء میں جو معاہدہ واجد علی شاہ اور انگریزوں سے ہوا، اس کی دفعہ دو خاص اس امر سے متعلق ہے کہ نواب اپنی ملازمت خواہ ریاست میں بجز کمپنی کے ملازموں (انگریزوں) کے کسی فرنگی کو رہنے کی اجازت نہ دیگا۔

(۲) اوپیرا انیسویں صدی میں کل جدید لذیذ کی حیثیت رکھتا تھا کیونکہ اوپیرا کی بنیاد سولہویں صدی عیسوی میں اٹلی میں پڑ چکی تھی۔ اسکا بانی ونسترو گالیلی ہے۔ جو اٹلی کے مشہور ماہر طبیعات کا باپ تھا، اور جو سولہویں صدی عیسوی میں گزرا ہے۔

(۳) ہندوستانی ناٹکوں میں پردے کا استعمال آج سے نہیں زمانے سے تھا۔ سنسکرت کے ڈراموں میں سنسکرت کا مشہور لفظ "اپاکشے پے نا" پایا جاتا ہے۔ جس کے معنی ہیں پردہ اٹھا کر یا پردہ کھینچ کر۔ "مدرا راکشس" سنسکرت زبان کا مشہور ڈراما ہے۔ جس کا مصنف وشاکھ دت ہے۔ یہ ڈراما آٹھویں صدی عیسوی میں لکھا گیا تھا اس میں یہ عبارت موجود ہے "پردہ ہٹا کر آگے بڑھتا ہے"۔ "ادراکشس میں شنو گپتا تجھے سلام کرتا ہوں"۔

مسٹر ہوریس ہیمن ولسن نے اپنی تصنیف "تھیٹر آف دی ہندوز" میں سنسکرت کے بعد قدیم ڈراموں کا ذکر کیا ہے۔ جن میں پردے کے متعلق ہدایات درج ہیں ڈراما "وسنگیت رتناکر" میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ "رقاصہ پردے کے پیچھے سے آگے بڑھے" وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستانی ڈراموں میں پردہ کا رواج سولہویں صدی عیسوی سے بھی قبل تھا۔

(۴) امانت نے اندر سبھا واجد علی شاہ کے حکم سے نہیں لکھی۔ اس کے متعلق خود امانت کا بیان پیش کردہ پروفیسر مسعود حسن کافی ہے۔ البتہ یہ جاننے کے لئے کہ وہ کون دو شخص اس جلسے کی تیاری پر آمادہ ہوئے۔ یہ بتا دینا کافی ہے۔ کہ تذکرہ "خوش معرکۂ زیبا" مصنفہ ناصر لکھنوی میں امانت اور اندر سبھا کے متعلق خود مولف یا مصنف کے چشم دید حالات درج ہیں۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ عبادت کے اصرار سے امانت نے اندر سبھا لکھی اور شنکر پنڈت کشمیری اور میر حافظ نے اس کو سٹیج کیا۔"

پروفیسر آزر عطیلی نے اس بارے میں کافی... لکھا ہے مگر چونکہ یہ پیرا بھی خاصی دلچسپ ہے۔ لہٰذا میں اس جگہ خود میر ناصر لکھنوی کے بیان کا کچھ حصہ نقل کئے دیتا ہوں۔ اب اس سے بڑھ کے اور ثبوت کیا ہوگا:۔

"...... میر امانت صاحب کی زبان میں لکنت بھی تھی اور یہ مرض ان کا آبائی ہے۔ بلکہ انکی اولاد تک کی زبان میں لکنت موجود ہے۔ لہٰذا مرثیہ تصنیف ان کا ان کے شاگرد پڑھا کرتے تھے۔ اور ان کے شاگردوں میں جو ہے اس کے تخلص کے اخیر میں تے (ت) ہوتی ہے۔ مثل جنت و عبادت اور میاں فرحت وغیرہ کے میاں امانت نے ایک میر انیس کی طرح مثنوی اندر سبھا تصنیف کی تھی۔ اس میں بجائے امانت تخلص استاد اپنا قرار دیا تھا۔ اور اس مثنوی میں غزل اور ہولی، ٹھمری اور چند دیاں بھاشا میں کہی تھی چنانچہ جس کو شنکر پنڈت کشمیری اور میر حافظ نے چند طفلان حسین اور امردان ماہ جبیں خوبصورت جمع کر کے، اور لڑکوں کو مثنوی یاد کرا کے اور تعلیم راگ اور ناچ دیکر ایک رہس کھڑا کیا تھا۔ چنانچہ خلائق نے یہ جلسہ جدید دیکھ کر بہت پسند کیا۔ اور ہزار ہا لوگ بازاری جمع ہونے لگے۔ ایک روز مولف بھی اس جلسہ رہس اندر سبھا میں گیا۔ دیکھا میں نے کہ ہزار ہا لوگ ان امردان حسین پر مفتوں و شیفتہ ہیں۔ بقول اثر جلالہ سے ہجوم ماہ رویاں استقدر تھا۔ کہ مجھکو دیکھنے میں چھپا یا ڈر تھا

اور میاں امانت مسند پر بیٹھے تھے۔ اور ایک لمبا
سہرا پایا آگے گاتا ہے ہیں یہ دیکھ کر جلدے توقف کے
بعد اپنے مکان پر چلا آیا۔ غرض کہ یہ اندر سبھا خوب
چمکی اور مشہور خلائق ہوئی۔ . . . ۔ ۔

بہرکیف اس بارے میں حقیقت یہ ہے کہ چاہے کچھ ہی ہو لیکن نہ تو لالہ کنور سین صحیح راستے پر ہیں نہ حضرت کیفی کا بیان مستند ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اس مقام پر فاضل مولفین نے زبردست ٹھوکر کھائی ہے۔ جس کی وجہ انکی محض قیاس آرائی اور فقدان ذوقِ تحقیق ہے۔

صفحہ ۲۰۰ میں فاضل مولفین نے آغا حشر کے بیان میں بڑے ہی بخل سے کام لیا ہے۔ درانحالیکہ، اس وقت اردو میں حشر کا پایہ مسلم تسلیم کیا جا چکا تھا۔ انکی ڈراماتی تصانیف کی تعداد بھی قطعاً غیر مکمل ہے۔ اسی طرح چند اور ڈرامانگاروں کے تذکرہ سے یہ تالیف خالی نظر آتی ہے۔ نیز سب سے بڑی کمی جو اس کتاب میں ہے۔ وہ فن ڈراما کی اصطلاحات کا تفصیلی عدم بیان ہے۔ ڈراموں کی اصطلاحیں اتنی اور ایسی ایسی باریک و نازک ہیں۔ جن پر عوام کو قطعی دسترس نہیں۔ اگر اس سلسلے میں فاضل مولفین اس امر کو بھی ملحوظ خاطر رکھتے تو کتاب کچھ اور چمک جاتی۔

پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ جتنا کچھ اس تالیف میں جمع کر دیا گیا ہے، وہ نہ صرف یہ کہ اپنی جگہ بے مثل و نایاب ہے۔ بلکہ یہ وہ مشعلِ علم ہے۔ جس نے اس کی تالیف کے بعد کتنوں کے گھر روشن کئے ہیں

اُردو میں ڈرامانگاری

یہ دوسری تالیف ہے۔ جو حیدرآباد کے مشہور ادیب جناب سید بادشاہ حسین صاحب کے قلم کی مرہون منت ہے۔ اس کتاب کے پندرہ عنوان قائم کئے گئے ہیں۔ جن میں سے آخری ماخذ ہے۔ بقیہ چودہ عنوانوں کے ڈراما کی ابتدا۔ ڈراما کی قسمیں۔ ڈراما اور تھیٹر۔ اردو ڈراما اور تھیٹر۔ اردو ڈراما کی پیدائش۔ اندر سبھا۔ قدیم اردو ڈراموں کی بعض اہم خصوصیات۔ طرزِ قدیم کے علمبردار شیکسپیر کے ترجمے، دوسرے قدیم ترجمے۔ قدیم ناٹک کمپنیاں۔ طرزِ جدید کے پیش رو۔ طرزِ جدید کے پیرو۔ فلم اور اردو ڈراما۔ اردو ڈراما کا مستقبل۔ پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ شروع میں آٹھ صفحوں کا "دیباچہ" بھی شامل ہے۔ جو خود مولف کا لکھا ہوا ہے۔

دیباچہ میں قابل مولف نے تنقید کی تعریف۔ نقد کے اصول اور نقاد کے فرائض کی حد بندی (جہاں تک ڈراما سے تعلق رکھتا ہے) اپنے نقطہ نگاہ سے کی ہے اور ہر شخص کی پسند کو مختلف بتاتے ہوئے اپنی ذاتی رائے کو ڈراموں پر تنقید کرتے وقت سب سے زیادہ اہمیت دی ہے نیز بطور پیش بندی ان تمام اختلافی مقامات، مباحث اور مسائل پر ایک ایسی تحریر سپردِ قلم فرما دی ہے۔ کہ بظاہر گنجائش گفتگو نہیں رہی ہے۔ مگر اس کا کیا جواب۔ کہ فاضل مولف کی اس تحریر کے آگے ہر شخص اپنے کو تسلیم خم کرنے پر آمادہ نہیں پاتا۔ صاحب موصوف ایک جگہ فرماتے ہیں :-

"ہم نے اس کتاب میں کوشش کی ہے کہ اپنی رائے کا اظہار کریں۔ یہ تو قریب قریب ناممکن ہے۔ کہ ہر چھوٹی بڑی بات کے لئے ہم اپنی ذاتی رائے پیش کرتے کیونکہ بعض دفعہ ایک کے خیالات دوسرے سے کسی نامعلوم اثر کے ماتحت جا ملتے ہیں۔ اور بعض دفعہ دوسرے کی رائے اسقدر جاذب نظر اور اسقدر جاذبِ کشش رکھتی ہے۔ کہ وہ دوسروں کی رائے کا خود بخود جزو بن جاتی ہے ہمیں اعتراف ہے۔ کہ ہم نے بعض جگہ دوسروں کی رایوں کو اپنا لیا ہے۔ جسکا تفصیلی ذکر ماخذ میں کیا جائے گا۔ اور جہاں ہم اپنا کرنے سے قاصر تھے۔ یا جہاں ہمیں دوسروں سے اختلاف تھا اپنی رائے کا اظہار کیا"

اس سے تو قطعاً انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ وقتاً فوقتاً دوسروں کے خیالات اپنائے جاتے ہیں۔ اور اس سے دنیا کا کوئی بھی بڑے سے بڑا شاعر و ادیب انکار نہیں کر سکتا۔ مگر اس کے لئے مقام و محل کا خیال بھی ضروری ہے۔ نیز یہ بھی درست ہے کہ بعض اوقات دو شخصوں کے خیالات لڑ جاتے ہیں۔ مگر ساری کی ساری تصنیف میں ایسا نہیں ہوتا۔

"اُردو میں ڈرامانگاری" ایک ایسی کتاب ہے۔ جس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہ ناٹک ساگر کا نچوڑا ہوا عطر یا یہ کہ یہ کلیتاً ناٹک ساگر کے باب دوازدہم کے اجمال کی (کسی قدر ترقی یافتہ) تفصیل ہے۔ جس کے متعلق میں آگے چل کر اصل کتاب کو پڑھنے کے سلسلے میں بھی کچھ عرض کروں گا۔

دوسری چیز جو "دیباچہ" میں کھٹکتی ہے، وہ فاضل مولف کا یہ فرمانا ہے کہ :۔

"اس سلسلے میں یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ ہم

تمام ڈراما نگاروں کے تمام ڈراموں کا ذکر نہیں کیا اس کے کئی اسباب ہیں۔

ایک وجہ تو یہ ہے۔ کہ اس چھوٹی سی کتاب میں ان تمام کے تفصیلی تذکرہ کی گنجائش نہ تھی۔ دوسری وجہ ان لوگوں پر زیادہ واضح ہو گی جنہوں نے اردو ڈراموں کا مطالعہ کیا ہے۔ ڈرامے ناٹک کمپنیوں کیلئے لکھے جاتے تھے۔ اور ناٹک کمپنیاں لاتعداد قائم ہوئیں۔ کچھ دنوں چلیں اور ٹوٹ گئیں۔ ایک ہی نام کے متعدد ڈراما نگار گزرے۔ اور ایک ہی نام کے متعدد ڈرامے لکھے گئے کمپنیوں نے ڈراما نگاروں کو مشتہر نہیں کیا۔ بلکہ بعض دفعہ ان کے نام تک کا اشتہار نہ ہوتا تھا۔ اکثر ڈرامے شائع نہیں ہوئے۔ اور اداکاروں کے سینوں میں مدفون ہو گئے ڈراما عوام کے ہاتھوں میں ہونے کی وجہ سے تاریخ اور تنقید کی نظروں سے بچ رہا۔ اور اسکی حیثیت محض کھیل تماشہ کی رہی۔ ان ہی مختلف اسباب کی بنا پر اردو کے پورے ڈراما نگاروں اور ان کی تصنیفات و تالیفات کا صحیح پتہ چلانا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن بھی ہے تیسری وجہ یہ ہوئی۔ کہ ایسے ڈرامے اور ڈراما نگار جن میں کوئی خصوصیت نہ تھی اور جو صاحب طرز نہ تھے عمداً طوالت کے خوف سے نظر انداز کر دیئے گئے"

پہلی وجہ قطعاً ناکافی ہے۔ کیونکہ سمندر کو کوزہ میں بند کرنا ہی تو ایک ادیب و شاعر کا کمال ہے۔ پھر کیا اس دو ڈھائی سو صفحہ کی کتاب میں اتنی گنجائش نہ تھی۔ کہ اس میں اردو کے تمام ڈراما نگاروں کا جن کا نام پبلک میں آ چکا تھا، نام یا ان کا مجملاً ذکر سما سکے؟ دوسری وجہ کسی حد تک درست ہے۔ لیکن سوال یہ ہے۔ کہ کیا ایسے افراد کا نام نہیں درج فرمایا گیا ہے۔ جو پبلک میں آ چکے ہیں۔ اور جن کے ڈرامے کسی نہ کسی نوع ایسی خصوصیت ضرور رکھتے ہیں۔ جن کا ذکر کیا جانا مقتضائے انصاف تھا؟ تیسری وجہ اور بھی مہمل ہے۔ کیونکہ محض طوالت کے خوف سے ایسے ڈراما نگاروں کو نظر انداز کر دینا جن کے تصنیف کردہ ڈرامے موجود ہیں۔ مگر اس میں فاضل مولف کو کوئی خصوصیت نظر نہ آئی، اور انکے بجائے ان اصحاب کا ذکر فرمانا جنہوں نے ڈرامے خود نہیں لکھے۔ بلکہ انہوں نے صرف دو ایک ڈراموں کے ترجمے کئے ہیں۔ مگر وہ مولف کو پسند ہیں۔ ہرگز قرین انصاف نہیں۔ نیز جیسا کہ خود مولف نے دیباچہ میں فرمایا ہے کہ:-

"جو چیز ایک کو بہترین معلوم ہوتی ہے، خواہ وہ کتنی ہی معیاری اور فنی خوبیوں سے مالا مال کیوں نہ ہو ضروری نہیں کہ وہ دوسروں کو بھی بہترین معلوم ہو"

انہوں نے یہ کیسے سمجھا، کہ جو ڈرامے انہوں نے ناپسند فرما کر نظر انداز کر دیئے ہیں وہ دوسروں کو بھی یقینی ناپسند ہونگے۔ اور اسلئے ان کا نام بھی کتاب میں لکھنا ضروری نہیں؟ بہرکیف ان تینوں وجوہ کا تذکرہ کرتے ہوئے قابل مولف نے آگے بڑھ کر فرمایا ہے کہ:-

"اگر کسی ڈراما نگار کو اپنا نام اس کتاب میں نظر نہ آئے تو وہ مایوس نہ ہوں۔ کیونکہ اگر ہم نے انفرادی طور پر ان کا ذکر نہیں کیا، تو مجموعی حیثیت سے انکی طرز کا تو ذکر ضرور کیا ہے۔ کیونکہ انکی طرز متذکرہ بالا تین طرزوں میں سے کوئی نہ کوئی ہوگی، جن کا ہم نے تفصیلی ذکر کیا ہے"

ہرچند کہ اس دلچسپ عبارت سے ایک طرف تو قابل مولف کی غلطیوں اور فروگزاشتوں پر ایک حسین اور زرنگار پردہ پڑ جاتا ہے تو دوسری جانب ان لوگوں کی واقعی اشک شوئی بھی ہو جاتی ہے۔ جن کے ڈراموں کا اس کتاب میں ذکر موجود نہیں۔ مگر اس کا کیا جواب کہ بعض مشہور اور اچھے خاصے ڈراموں کے تذکرہ کی غیر موجودگی سے کتاب کی مکملیت ہی میں فرق آ گیا۔ یا نقص پیدا ہو گیا ہے؟

خورشید جی بالی والا کے ڈراموں "وکرم ولاس، دلیر دل شیر، نگاہ غفلت، تارزن، گوپی چند اور ہریش چندر"، اور حسن نظامی کا ڈراما "چراغ راہ" وغیرہ ڈرامے ایسے ہیں۔ جن کا ذکر "ناٹک ساگر" میں موجود ہے۔ مگر فاضل مولف نے ناٹک ساگر سے غیر معمولی طور پر استفادہ کرنے کے باوجود اپنی تالیف میں ان ڈراموں کا ذکر نہیں فرمایا۔ نیز شوق لکھنوی کا ڈراما "رشید اور رعنا"، مولوی الٰہی بخش کا ڈراما "ہمت عالی" منشی غلام قادر فصیح کا ڈراما "شیر میسور"، مولوی انیس احمد کا ڈراما "جہل مرکب"، محمد حبیب صاحب کا ڈراما "انجام"، منشی جوالا پرشاد برق کے ڈرامے "مرتالبی۔ مار آستین۔ بنگالی دلہن۔ پرتاب اور بروگ"، اور منشی ظہور احمد وحشی کے ڈرامے "محبوبہ کربلا، حجاج بن یوسف، عروس مصر، عبدالرحمن ناصر" وغیرہ ایسے ڈرامے ہیں۔ جن کا ذکر نہ کرنے سے مصنفین یا انکی روح کو گزند پہنچے یا نہ پہنچے لیکن کتاب کی قدر و قیمت میں کسیقدر کمی ضرور آ گئی ہے۔

نیز ان کے متعلق صرف یہ کہدینا کافی نہیں ہو سکتا کہ "

"اس کتاب کا مقصد مجموعی طور پر اردو میں ڈرامانگاری
کی حالت کو پیش کرنا ہے۔ نہ کہ انفرادی حیثیت سے
ایک ایک ڈرامے کو روشناس کرانا"

بہرکیف دیباچہ کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ جس کا پہلا عنوان ہے "ڈرامے کی ابتدا" اس میں بھی ڈرامے کی ابتدا یونان سے دکھائی گئی ہے۔ اور یہاں بھی ڈرامے کا موجد الیس کائی لس (Aeschylus) ہی کو قرار دیکر ڈرامے کو یونانی نژاد ظاہر کیا گیا ہے۔ چونکہ اس تالیف کا بہت بڑا حصہ "ناٹک ساگر" اور مولف کی تمام تر تحقیق مغربی محققین کے افکار سے ماخوذ ہے لہٰذا ایسا ہونا ہی چاہیئے تھا۔ بہرکیف چونکہ "ناٹک ساگر" کے سلسلے میں اس عنوان پر میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ لہٰذا اسکی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ کہ ان کا بیان بھی اعادہ کیا جائے۔

دوسرا عنوان "ڈرامے کی قسمیں" ہے۔ جس میں ڈراموں کے اقسام گنائے گئے ہیں۔ اور انکی خصوصیات سے بحث کی گئی ہے۔ ہرچند کہ اس جگہ ہندی یا قدیم ہند کے ڈرامائی اقسام کا ذرا بھی تذکرہ نہیں کیا گیا ہے۔ پھر بھی کتاب کا یہ حصہ قابل قدر ہے۔ اور "ناٹک ساگر" کی اس بڑی کمی کو جس کو فاضل مولفین نے "دیباچہ" میں کسی حد تک پورا کیا تھا۔ جناب بادشاہ حسین صاحب نے بہت بڑی حد تک پورا کیا ہے جس وجہ سے وہ قابل مبارکباد ہیں۔ اس حصہ کا اردو داں اصحاب کو ضرور مطالعہ کرنا چاہیئے۔

تیسرے عنوان "ڈراما اور تھیٹر" کے تحت بھی جو کچھ لکھا گیا ہے ہرچند کہ اس میں صرف مغربی مصنفین اور انگریزی تصنیفات سے ہی کام لیا گیا ہے۔ مگر وہ با وقعت ہے۔ اور یہ حصہ فن ڈراما اور اسٹیج کے محاسن و معائب کو ظاہر کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔

چوتھا عنوان "اردو ڈرامے کی پیدائش" ہے۔ جس میں مولف نے ہندی راگ چھیڑا ہے۔ یہ کیسی مہمل بات ہے۔ کہ ہمارے علمائے ادب جب کچھ کہتے ہیں تو دوسروں کا سہارا لیکر اور جب کسی منزل کی طرف چلتے ہیں تو ایک راہ سے نہیں بادشاہ صاحب نے بھی ڈراموں کی تخلیق کے سلسلے میں تو ہندوستان اور ہندی قدیم ڈرامانگاروں کو قطعی نظرانداز کر دیا۔ درانحالیکہ اسوقت اس کی سخت ضرورت تھی لیکن جب اردو ڈراموں کا سوال آیا تو اس کی تاریخی حیثیت کو ظاہر کرنے کے لئے قدیم ہندی ڈراموں سے مرے اکھیڑنے لگے۔ درانحالیکہ یہاں اسکی کوئی ضرورت نہ تھی۔ بہرحال آگے چل کر فاضل مولف نے نواز کبیشور کے

اس ڈرامے کا تذکرہ کیا ہے۔ جو شاہ فرخ سیر کے عہد میں تیار ہوا تھا اس کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"رفتہ رفتہ فارسی کے زیر اثر چند تماشے مخلوط فارسی اور پراکرت میں تیار ہوئے۔ جو خاص محلوں اور درباروں میں دکھائے جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی قسم کا ایک تماشا نواز نامی ایک شخص نے فرخ سیر کے حکم سے تیار کیا تھا۔ اس کا سلیس اردو میں ترجمہ ۱۸۰۱ء میں مرزا کاظم علی جوان نے کیا۔ جو فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے مشہور مترجم تھے"

ہرچند کہ یہاں اسکی ضرورت نہ تھی۔ کہ اس کتاب کے دوسرے ابواب کا تذکرہ کیا جائے۔ لیکن چند مصلحتیں ہیں۔ جن کی وجہ سے اس کتاب کے نویں عنوان "دوسرے قدیم ترجمے" کا ایک اقتباس شکنتلا کے ترجموں کے ذکر سے پیش کیا جاتا ہے۔ صفحہ ۵۰ میں فرماتے ہیں:۔

"سب سے پہلا ترجمہ اگر اس کو ترجمہ کہا جا سکے۔ تو نواز کا ہے فرخ سیر (۱۷۱۳ء سے ۱۷۱۹ء) کے زمانے میں اس نے شکنتلا سے ترجمہ یا اس سے اخذ کر کے ڈراما ترتیب دیا کہا جاتا ہے کہ فرخ سیر کے ایک فوجی سردار مولیٰ خاں ولد فدائی خاں کے حکم سے یہ ترجمہ ہوا تھا۔ اور مولیٰ خاں نے جس کو جنگی کارگزاری اور ایک لڑائی جیتنے کے صلے میں معظم خاں کا خطاب ملا تھا۔ اپنے خطاب پانے کی یادگار میں یہ ترجمہ کرایا۔

نواز نے شکنتلا کو سنسکرت سے ہندی میں منتقل کیا اور ۱۸۰۱ء میں مرزا کاظم علی جوان فورٹ ولیم کالج کے مشہور مترجم نے نواز کے ہندی ایڈیشن کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا"

غالباً یہ حوالے رسالہ "اردو" کے جنوری نمبر ۱۹۲۸ء کے باب تنقید سے لئے گئے ہیں۔ لیکن "ماخذ" میں "اردو" کے اس نمبر کا ذکر موجود نہیں بہرکیف یہ کہیں سے بھی لیا گیا ہو۔ لیکن درست ہے۔ البتہ یہ سمجھ میں نہ آیا کہ جب فاضل مولف کو اس کتاب کا قرار واقعی علم تھا۔ تو پہلے اقتباس میں اسے بطور تصنیف کیوں پیش کیا گیا۔ اور پھر دوسرے اقتباس میں اس کا سبیل ترجمہ کیوں ذکر فرمایا گیا۔ جب کہ حقیقتاً وہ ترجمہ ہے شکنتلا کا!

کتاب کا پانچواں عنوان "اندر سبھا" ہے۔ جس میں اندر سبھا

سے متعلق تمام اشعار کا بغیر کسی دلیل اور مزید ثبوت کا تذکرہ کئے ہوئے، علامضیع کر رکھ دیا گیا ہے نیز پروفیسر مسعود حسن رضوی کے مضمون "امانت اور شرح اندرسبھا" مطبوعہ اردو کے اس خیال کو کہ

"میر حسن کے اشعار نقل کرنے سے گمان ہوتا ہے کہ امانت نے اندرسبھا کا پلاٹ، یا کم سے کم اسکا کچھ حصہ میر حسن کی مشہور زمانہ مثنوی سحرالبیان سے لیا ہو"

کسی قدر پھیلا کر اور اپنا کر پیش کیا گیا ہے۔ مگر چونکہ فاضل مولف نے جو کچھ فرمایا ہے، وہ قطعی درست ہے۔ لہذا گنجایش اعتراض یا اس سے مجال انکار نہیں۔ البتہ اس کا تذکرہ نہ فرمایا گیا۔ کہ امانت کی اندرسبھا کی اشاعت کے بعد اور بھی اندرسبھائیں لکھی گئیں۔ جن میں سے یہ چار اس وقت موجود ہیں۔ اندرسبھا امانت۔ اندرسبھا مداری لال، بزم سلیمان اور جشن پرستان۔

چھٹا عنوان "قدیم اردو ڈراموں کی بعض اہم خصوصیات" ہے اور جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے۔ یہ حصہ کتاب اچھا خاصا ہے۔ جسے مولف نے واقعی بڑی محنت و جانفشانی سے مرتب کیا ہے۔

ساتواں عنوان "طرز قدیم کے علمبردار" ہے۔ جس میں رونق، ظریف، حافظ عبداللہ۔ مرزا نظیر بیگ نظیر۔ طالب۔ احسن۔ بیتاب۔ دیوانہ۔ حشر، محشر، صحت۔ نیر۔ نازاں۔ عباس۔ فائز۔ افق۔ آغا شاعر، مائل۔ شاد۔ اسمٰعیل۔ شیر محمد خاں۔ آرزو۔ رادھے شیام۔ دلاور شاہ۔ افسوں۔ مخلص اعظم۔ عباس علی اور ریاض۔ یعنی تیس ڈراما نگاروں کے ڈراموں سے بحث یا اس کا سرسری ذکر کیا گیا ہے۔

ان میں سے گیارہ ڈراما نگار ایسے ہیں جن کا ذکر "ناٹک ساگر" میں موجود ہے۔ اور افسوس ہے کہ ان لوگوں کے متعلق جو کچھ اور جتنا کچھ "ناٹک ساگر" میں تھا۔ وہی اس میں بھی ہے۔ حد یہ ہے۔ کہ حشر کے اردو ہندی ڈراموں کا جہاں پر ذکر کیا گیا ہے۔ وہاں بھی صرف دو ڈراموں کا اضافہ کر کے وہی سب ڈرامے اسی ترتیب سے پیش کئے اور بتائے گئے ہیں۔ جو جس طرح "ناٹک ساگر" میں موجود ہیں۔ اور حشر کے مشہور و معروف ڈراموں مثلاً مار آستین۔ جرم وفا یا نیک پروین۔ یہودی کی لڑکی، شیر کی گرج۔ ہندوستان اور رستم و سہراب (اردو میں) اور بلوا منگل، میشم، بھگیرت گنگا۔ بھارتی بالک۔ دھرمی بالک۔ پہلا پیار اور دل کی پیاس (ہندی میں)، کا کوئی تذکرہ نہ فرمایا گیا۔ نیز فاضل مولف نے آغا حشر کو "شیکسپیر ہند" کہے جانے کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے۔ کہ انہوں نے شیکسپیر کے متعدد ترجمے کئے تھے: لہذا انہیں لوگ "شیکسپیر ہند"

کہنے لگے۔ مجھے اس میں کلام ہے۔ حشر کے ادبی ڈراموں (وہ نہیں جنہیں کمپنیوں نے غتر بود کر کے انکی شکل ہی بگاڑ دی تھی۔ بلکہ وہ جو ہنوز اصلی حالت میں بصورت مسودہ موجود ہیں) میں وہ کمالات پائے جاتے ہیں۔ جو شیکسپیر کے ڈراموں کا طرۂ امتیاز ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ عوام نے نہیں، بلکہ خواص نے انہیں شیکسپیر ہند کہنا شروع کر دیا تھا۔

آٹھواں عنوان ہے "شیکسپیر کے ترجمے" جس میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ شیکسپیر کے ترجموں کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ لاریب اس جگہ قابل مولف نے بڑی ہی تلاش و جستجو سے کام لیا ہے۔ اور تمام تراجم کی تفصیلی فہرست پیش کرنے کی کوشش فرمائی ہے، جو مشکور ہے۔ لیکن اگر بے موقع نہ ہو تو میں عرض کروں، کہ دو ایک ترجمے ایسے ہیں۔ جن کی عدم موجودگی کھٹکتی ہے۔ مثلاً میکبتھ (Macbeth) کا ترجمہ "تلاطم یزداں" مترجمہ سہراب جی پستن جی کانگا، مطبوعہ انوار الاسلام پریس حیدرآباد کا کہیں ذکر موجود نہیں۔ اسی طرح دی ونٹرز ٹیل (The winter's tale) کے ترجموں کا جہاں ذکر فرمایا گیا ہے، وہاں اس کے ترجمہ "وہم و گمان" مترجمہ مرزا تقی حسین تقی مطبوعہ اختر دکن پریس حیدرآباد کا ذکر موجود نہیں۔ رومیو جولیٹ (Romeo and Juliet) کے ترجموں کے ذکر میں بھی منشی جوالا پرشاد برق کے ترجمہ "معشوقۂ فرنگ" کا تذکرہ موجود نہیں، حالانکہ حضرت کیفی دہلوی نے "ناٹک ساگر" کے مقدمہ میں اس کا خاص طور سے ذکر فرمایا ہے۔

نواں عنوان "دوسرے قدیم ترجمے" ہے۔ جس میں قدیم ہندی ڈراموں کے ترجموں کا ذکر ہے۔ یہ حصہ بھی بہت محنت سے مرتب کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے کالیداس کے شہرۂ آفاق ڈراما "شکنتلا" کے ترجموں کا ذکر ہے۔ اور اس کے بعد کالیداس کے دوسرے ڈراموں، نیز دیگر تراجم کا۔ بظاہر اس میں کوئی لچک نہیں معلوم ہوتی، اس حصہ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کس طرح اردو میں دیگر زبانوں کے سمندر کھنگالے گئے ہیں۔

دسواں عنوان "قدیم ناٹک کمپنیاں" ہے۔ جس میں انگریز محققین "ناٹک ساگر" کی مدد سے تمام پرانی اور کسی قدر اپنی تحقیق سے چند نئی کمپنیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ خاص چیز خاص طور سے مطالعہ کے لائق ہے۔

"طرز جدید کے پیش رو" اس کتاب کا گیارھواں عنوان ہے جس میں گیارہ ڈراما نگاروں کا ذکر ہے۔ یہ سب وہی ڈراما نگار ہیں جن کا ذکر "ناٹک ساگر" میں موجود ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس کتاب میں تمام کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا تھا۔ اور اس کتاب میں بعد وعنوانین

کے تحت پیش کئے گئے ہیں۔ بظاہر ان میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ ورنہ یوں تو ہر ڈراما نگار ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہے۔ لہٰذا مجھے ان کو دو جگہ تقسیم کر دینے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔

"طرز جدید کے پیرو" ہیں جو اس کتاب کا بارھواں عنوان ہے اکیں ڈراما نگاروں کا ذکر ہے۔ جن میں سے اکثر صرف مترجم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اکثر وہ ہیں، جنکا ذکر "ناٹک ساگر" میں ہوچکا ہے جناب تاج کے ڈراما انار کلی پر جو کچھ اظہار خیال فرمایا گیا ہے۔ وہ حوصلہ افزا نہیں۔ شاید اس کی وجہ ان کے نقائص کا علم ہو۔ جو ساقی کے ذریعے کسی زمانہ میں کس تنقید سختی کے ساتھ ظاہر کئے گئے تھے۔ مگر یہ امر حیرت انگیز ہے۔ کہ ان نقائص کے باوجود اس ڈراما نے وہ مرتبہ حاصل کر لیا ہے، جو اردو زبان کے کسی ڈراما کو بھی حاصل نہیں۔ اور جس کے معترف خود فاضل مولف ہیں

تیرھواں عنوان "فلم اور اردو ڈراما" ہے۔ اسکے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے ان میں زیادہ تر حقیقت ہے۔ کاش اس پر دھیان دیا جائے۔

چودھواں عنوان "اردو ڈراما کا مستقبل" ہے، اور اس کے تحت بھی جو کچھ اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اور جو کچھ مشورے دیئے گئے وہ درست ہیں۔ کاش ان پر عمل ہو۔

سب سے آخری یعنی پندرھواں عنوان "ماخذ" ہے۔ جس کے متعلق دیباچہ میں فرمایا گیا تھا۔ کہ اس کا تفصیلی ذکر ماخذ میں کیا جائے گا مگر حقیقتاً اس میں کوئی تفصیلی ذکر موجود نہیں۔ بلکہ صرف ان کتب و رسائل کے نام اور پتے درج کئے گئے ہیں۔ جن میں ڈرامائی ادب سے متعلق کم و بیش مواد ملتے اور موجود ہیں بہرکیف جہاں تک فاضل مولف کی محنتوں کا سوال ہے۔ کتاب قابل قدر ہے۔ اب اگر اس میں چند فروگزاشتیں ہیں تو اس سے کون کتاب منزا اور مبرا ہے! پھ جب اس چیز پر نظر ڈالی جائے۔ کہ میں لے دے کر یہی دو کتابیں ہیں جو فن ڈراما پر یا فن ڈراما سے متعلق ہیں، تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ دونوں تصانیف صد درجہ قابل قدر اور لائق احترام ہیں

امینِ حزیں
(سیالکوٹ)

"تجلّیات"

بیتاب نگاہوں کا "مقصود" ہے پردے میں   الجھن سی یہ الجھن ہے "مشہود" ہے پردے میں
آنکھوں کے پسِ پردہ ہے عکس فگن لیکن،   ظاہر کی یہ صورت ہے "موجود" ہے پردے میں

(۲)

"ایمان" کی دُنیا ہے۔ "ایقان" کی دُنیا ہے،   "مہجور" کی دنیا بھی کس شان کی دُنیا ہے
معمول یہیں کا ہے بے تابی و بے خوابی   یہ جان کی دُنیا ہے "پہچان کی دُنیا" ہے

(۳)

بے شوقِ جنوں ساماں رفتار نہیں ممکن   بے جوہرِ بے تابی کردار نہیں ممکن
قندیل کی "خودسوزی" کیا کہتی ہے سنتے ہو؟   دِل خود نہ جلے جب تک دیدار نہیں ممکن

(۴)

ہے باعثِ بیتابی پردے کا نہ ہٹنا ہی!   بجلی کی تڑپ کیا ہے؟ بادل کا نہ پھٹنا ہی
سچ کہتی ہے محفل سے قندیل سرِ محفل   اس سوزِ رگِ جاں کا بہتر ہے نہ گھٹنا ہی

میرزا ادیب

سوکھی ہوئی ندی

آندھی تھم چکی تھی، مگر ابھی کہیں کہیں گرد و غبار کے بادل سورج کی الوداعی زرد زرد روشنی میں منڈلا رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی، اور وہ دونوں سوکھی ہوئی ندی کے کنارے ایک دوسرے کے بالکل قریب چپ چاپ بیٹھے تھے۔ گویا کسی گہری فکر میں غرق ہیں۔ اچانک ان کے سروں کے اوپر ایک چیل کی دردناک آواز گونجی، اس پر ایک نے سر اٹھایا، اور تاریکی میں غائب ہوتے ہوئے پروں کو دیکھنے لگا۔ دو تین لمحوں کے بعد چیل افق کی تاریکی میں غائب ہو گئی اس پر اس نے اپنی سیاہ ٹوپی زانو سے اٹھا کر پگڑی کے قریب رکھ دی اور اپنے ساتھی سے کہنے لگا: "پار سال یہ نہر پانی سے لبالب بھری ہوئی تھی مگر اب تو کہیں ایک قطرۂ آب بھی نظر نہیں آتا۔"

دوسرے نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی نگاہیں ایک بڑ کے درخت کے نیچے چند خانہ بدوشوں کے درمیان آگ کے مدھم سے شعلوں پر جمی تھیں۔ پہلا چند لمحے اپنے ساتھی کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر بولا "تم کئی بار میرے ساتھ یہاں آئے تھے سلطان!"

سلطان نے سرد آہ بھر کر کہا: "پار سال بہت بارش ہوئی اور اس میں اتنا پانی جمع ہو گیا، کہ لوگ نہایا کرتے لیکن آج یہاں خاک اڑتی ہوئی نظر آتی ہے! معلوم ہوتا ہے۔ یہاں کبھی پانی تھا ہی نہیں —— زندگی میں بھی" —— سلطان کہتے کہتے رک گیا۔

"زندگی میں بھی —— کیا؟"

"کچھ نہیں ذہن میں ایک خیال آیا تھا۔"

"کونسا خیال —— بتاتے کیوں نہیں؟"

"کوئی خاص خیال نہیں" یہ کہہ کر سلطان اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی چھنگلی پر پھیرنے لگا۔

"بھئی اگر کوئی خاص خیال نہیں۔ تو پھر بتانے میں کیا ہرج ہے؟"

"اس سوکھی ہوئی ندی کو دیکھ کر مجھے اپنی زندگی کا ایک واقعہ یاد آگیا ایک ایسا واقعہ جس نے میری رگ رگ میں طوفان کیف و نشاط برپا کر دیا تھا۔ ایک ایسا واقعہ جس نے مجھے زندگی کی حقیقی مسرت سے روشناس کرایا تھا۔"

"اور آج —؟"

"وہ آج میں پھر پہلا سا افسردہ روح، اور پژمردہ دل انسان ہوں"

"تم پہیلیوں میں باتیں کر رہے ہو سلطان!"

"اگر تم مصر ہی ہو تو میں سب کچھ بتائے دیتا ہوں بچپن ہی سے میرے دل و دماغ پر قنوطیت چھائی ہوئی تھی، اور میں زندگی کے اس زرین دور میں بھی افسردہ رہتا تھا۔ کتابوں کے علاوہ مجھے کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھی۔ دن کے وقت ...... گھر کے آخری کمرے میں کھڑکی کے پاس بیٹھ کر کتابیں پڑھتا رہتا۔ اور رات کو اپنی دادی اماں سے بادشاہوں اور راجاؤں کے قصے سنتا سنتا سو جاتا۔ ٹریجیڈی مجھے بے حد پسند تھی۔ اور جب کبھی میں کسی کتاب میں کوئی حسرت ناک قصہ پڑھتا، تو میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتیں۔ اور میں بعض اوقات اتنا روتا۔ کہ کتاب کے ورق گیلے ہو جاتے۔ اپنی اس عادت کی وجہ سے مجھے کئی بار شرمندگی اٹھانا پڑی۔ لیکن جب سیل اشک آنکھوں میں امنڈ آتا تھا، تو سوائے رونے کے اور کچھ بھی نہ سوجھتا تھا۔ میری عزلت نشینی محلہ بھر میں مشہور تھی۔ اور جب میں گھر سے باہر نکلتا تو لوگ مجھے اس طرح دیکھتے گویا کوئی عجیب چیز دیکھ رہے ہیں۔ میں لوگوں کے طنزیہ فقرے سنتا، اور خاموش رہتا —— اس کے سوا اور میں کر ہی کیا سکتا تھا۔

میرے والد صاحب بڑی غضبناک طبیعت کے مالک تھے آخر عمر میں وہ نور بصارت سے بھی محروم ہو گئے تھے۔ اور اس چیز نے بھی فطری زود رنجی میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ میری والدہ بڑی سنجیدہ طبیعت کی عورت تھیں۔ اور کسی سے بولنا چالنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ بھائی بھی عموماً خاموش طبع تھے۔ اسی ماحول میں میری افسردہ زندگی گزر رہی تھی۔

اس وقت میری عمر شاید اکیس سال کی تھی۔ جب ہم نے مکان تبدیل کیا۔ ہمارے مکان کے سامنے ایک ٹھیکیدار صاحب رہتے تھے جو بہت زندہ دل انسان تھے۔ چنانچہ جلد ہی ان کے ساتھ ہمارے تعلقات استوار ہو گئے۔ ایک دن میں اپنے کمرے میں کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا

اختر انصاری

قطعات

گریۂ شب

اب نہ اگلی سی وہ طبیعت ہے   نہ وہ دل میں کسی کی حسرت ہے
شب کو روتا ہوں کیوں بتاؤں کیا؟   یوں سمجھ لو کہ ایک عادت ہے

محبت

آس کو یاس نے کیا مغلوب   لی جگہ آرزو کی حسرت نے
لٹ گئی سب متاعِ دل لیکن   ساتھ چھوڑا نہیں محبت نے

احساسِ غم

تیرے قربان! اے نشاطِ شباب   اے سرورِ حیات صدقے جاؤں
کیا کروں اپنے دل کی ٹیسوں کو   غم کے احساس کو کہاں لے جاؤں

آواز

اب نہیں آرزوئے بزمِ طرب   اب نہیں جستجوئے نغمہ و ساز
ہو گیا ختم ذوقِ موسیقی   جب سے میں نے سنی تری آواز

مظلوم کیتھلوی

بھکارن

دُور افق پر بجلی کسی تاریک قسمت میں شعاعِ امید کی طرح چمک رہی تھی۔ اور بارش کی ہلکی ہلکی بوچھاڑ ہوا کی خنکی میں اضافہ کر رہی تھی۔

ریکھا نے پیالہ میں سے چائے کا آخری گھونٹ اپنے حلق میں انڈیلا و بل ادا کر کے ریستوران سے باہر نکل آئی ـــــ اس وقت رات کے نو بج چکے تھے۔

ریکھا نے اپنی ساری درست کرتے ہوئے جونہی ریستوران کی آخری سیڑھی سے نیچے قدم رکھا اس کے کانوں میں ایک نحیف آواز آئی "بی بی جی! پیسہ"۔

ریکھا نے بجلی کی روشنی میں دیکھا کہ سولہ سترہ سالہ بھکارن اپنا ہاتھ بڑھا کر اسکی طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ بھکارن کے تمام کپڑے گیلے ہو چکے تھے۔ اور نومبر کی گلابی سردی نے اسے کانپنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ریکھا کو وہ بھکارن بہت خوبصورت معلوم ہوئی۔ اور معاً اسے اپنی چھوٹی بہن منورما کا خیال آ گیا ـــــ منورما، جس کی وفات کو ایک سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس نے اپنا منی بیگ کھولتے ہوئے پوچھا "پیسہ لیکر کیا کرو گی؟"

"چائے پیونگی" بھکارن نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

ریکھا نے یہ سن کر اپنا منی بیگ بند کر لیا اور بولی "کیا تم میرے ساتھ چلو گی؟"

"کہاں ـــ؟"

"میرے بنگلہ پر ـــــ وہاں تمہیں گرم گرم چائے کے علاوہ کھانا بھی کھلاؤں گی"

بھکارن نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ریکھا کی طرف دیکھا گویا وہ اپنا خواب بھلانا چاہتی تھی۔ ایک لمحہ کے بعد اس نے جواب دیا۔

"نہیں بی بی جی"

"کیوں" ریکھا نے حیران ہو کر پوچھا۔

بھکارن نے یہ سنکر ایک مرتبہ ریکھا کو سر سے پاؤں تک دیکھا پھر اپنے کپڑوں پر نگاہ ڈالی۔ اور اس کے بعد اپنی آنکھیں ریکھا کی آنکھوں میں گاڑ دیں گویا وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دے رہی تھی۔ کہ میری اور آپ کی ہستی میں زمین و آسمان کا فرق ہے

ہوا کے ایک تیز جھونکے کی آمد پر بھکارن پھل سے لدی ہوئی نازک ٹہنی کی طرح کانپ اٹھی۔

ریکھا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا "میرے ساتھ چلو تمہیں کپڑے بھی دوں گی۔ اور ان گیلے کپڑوں میں تم کانپ رہی ہو"

بھکارن نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی کیونکہ وہ ریکھا کے ساتھ جانا نہ چاہتی تھی۔ مگر ریکھا کے نرم و نازک ہاتھ اس کے لئے ہتھکڑیاں بن چکے تھے۔

نزدیک ہی سڑک کے کنارے ریکھا کی کار کھڑی تھی۔ اس نے کار کا دروازہ کھول کر بھکارن کو اندر دھکیل دیا۔ اور خود کار چلانے لگی۔ بھکارن سہمی ہوئی حالت میں کار کے گدیلے پر بیٹھ گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا گویا دھنس گئی ہو۔

تمام راستہ بھکارن چین کے ساتھ سیٹ پر نہ بیٹھ سکی۔

کار ایک شاندار بنگلے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ ریکھا بھکارن کو اتار کر اندر لے گئی۔

بنگلہ میں جا کر ریکھا نے بجلی کی انگیٹھی سے پانی گرم کرایا۔ اور بھکارن کو تیل صابن سے خوب نہلوایا۔ اس کے بعد اسے پہننے کے لئے سفید کپڑے دیئے۔

اب بھکارن ہتھیلی کے پھول کی طرح دلکش اور راس گلاب کی طرح شگفتہ ہو گئی تھی۔ جس کا منہ نسیم سحر نے شبنم سے دھو ڈالا ہو بال درست کر کے بھکارن کمرہ طعام میں گئی۔ اور وہاں چائے کے چھ پیالے اپنے حلق میں انڈیل لئے۔

ریکھا اب محسوس کر رہی تھی کہ بھکارن کا خوف لمحہ بہ لمحہ دور ہوتا جا رہا تھا۔

بھکارن کے لئے یہ بنگلہ عجوبہ سے کم نہ تھا۔ چائے پینے کے بعد

وہ ریکھا کے ساتھ تمام کمروں میں گھومتی اور ہر چیز کو غور اور تعجب سے دیکھتی رہی۔

دن بھر کے تھکے ماندے آدمی کو اگر کچھ سکون میسر ہو جائے، تو اس پر نیند غالب آ جاتی ہے۔ بھکارن کی بھی یہی حالت ہوئی، ریکھا نے اسے اپنے خاص کمرے میں لٹا دیا، اور نرم و گرم بستر پر لیٹتے ہی اسے نیند آ گئی۔

. . . .

رات کو گیارہ بجے کے قریب پرمودہ بابو کلب سے واپس آئے، کھانا کھانے بغیر سیدھے ریکھا کے خاص کمرے میں چلے گئے آہستے سے دروازہ کھول کر دیکھا، کہ ریکھا کے بستر پر ایک نازک اندام حسینہ خواب راحت کے مزے لے رہی تھی، سوتے میں اس کا حُسن اور بھی نکھر گیا تھا۔ اور بل کھاتے ہوئے گیسو اس کی چھاتی پر اس طرح لہرا رہے تھے، جس طرح سانپ بین کی آواز پر لہراتا ہے پرمودہ بابو نے ایک لمحہ تک اسے دیکھا، اور پھر اپنے کمرہ میں چلے گئے۔ وہاں ریکھا ایک انگریزی ناول پڑھ رہی تھی۔ پرمودہ نے ہنس کر پوچھا: "آج تمہارے کمرے میں کون سو رہی ہے ریکھا؟"

ریکھا نے ناول میز پر رکھ کر ایک انگڑائی لی۔ اور جمائی لیتے ہوئے بولی: "میری ایک سہیلی ہے!"

"کہاں سے آئی ہیں؟"

"یہیں سے"

"اوہ! میں نے تو آج انہیں پہلی ہی بار دیکھا ہے" پرمودہ نے یہ کہتے ہوئے اپنا ہیٹ دور کرسی پر پھینک دیا۔ اور خود آرام کرسی میں گر پڑا۔

ریکھا نے کنکھیوں سے پرمودہ کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا "لیکن اب آپ اسے ہر روز دیکھ سکیں گے!"

"یعنی؟"

"یہ میرے ساتھ رہیں گی" ریکھا نے جواب دیا۔

"اوہ! بہت خوب!" پرمودہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور اس کے بعد کمرے میں خاموشی طاری ہو گئی۔ چند لمحے بعد ریکھا نے شرارتاً پوچھا:

"کیا آپ کو میری سہیلی پسند ہے؟"

"بہت!" پرمودہ نے خشک ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"مجھ سے بھی زیادہ؟"

"تم سے؟" پرمودہ نے یہ کہتے ہوئے ریکھا کو خوب غور سے دیکھا۔ اور پھر مسکرا کر بولا "شاید"

ریکھا سر سے پاؤں تک جل اٹھی۔ مگر اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہوئے بولی: "میں نوکر کو بھیج رہی ہوں، آپ چائے وغیرہ تیار کرا لیجئے۔"

نوکر پرمودہ کے کمرے میں چلا گیا۔ اور ریکھا اپنے کمرے میں، بھکارن اس وقت خواب میں پریوں کا ناچ دیکھ رہی تھی، ریکھا نے اسے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔ بھکارن گھبراہٹ کی حالت میں آنکھیں کھول کر بولی: "کیا بات ہے بہن؟"

"کچھ نہیں" ریکھا نے جواب دیا "اب تم کافی سو چکی ہو، اٹھو!"

بھکارن اٹھ بیٹھی، مگر وہ چاہتی تھی، کہ پھر لیٹ جائے۔

ریکھا اس کا بازو پکڑ کر غسل خانہ میں لے گئی اور اس کے چیتھڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی: "انہیں اٹھا لو!"

بھکارن نے سہمی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کپڑے اٹھا لئے، اس کے بعد ریکھا اسے بنگلے کے دروازہ پر لے آئی اور ایک روپیہ اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولی: "دیکھو! یہ سامنے والی سڑک سیدھی ریسٹوران کو جاتی ہے"

بھکارن نے دبی آواز میں کہا "لیکن اس وقت سردی ہے بہن!" مگر ریکھا نے جواب دیا:

"پروا نہ کرو" اور ان الفاظ کے ساتھ ہی اپنے کندھوں پر سے اونی شال اتار کر بھکارن کے کندھوں پر ڈالتے ہوئے بنگلہ کا دروازہ بند کر لیا۔

اور ——

کچھ دیر بعد جب شہر کے گرجا گھر میں بارہ بجے۔ اس وقت بھکارن اسی ریسٹوران کی سیڑھیوں پر تھی، جہاں کھڑی ہو کر وہ کئی سال سے بھیک مانگ مانگ کر اپنا پیٹ پال رہی تھی۔

سراج الدین ظفر

میری خودداری

نہ مسکرا مری حالت پہ اے اسیرِ ہوس
بجا نہیں مرے آگے غرورِ نام و نمود

کبھی نہ خاک نشینوں کی گرد کو پہنچی
نہ پادشاہتِ فرعون نہ سطوتِ نمرود

مجھے دیا ہے زمانے نے ذوقِ بت شکنی
یہ کائنات ہے بت خانہ اور میں محمود

تری نظر ہے اسیرِ فریبِ سطوت و جاہ
مری نظر کا ہے آگے مہ و زحل سے ورود

تری ہوس کو ہے دو روزہ زندگی کا خیال
مری خودی کو ہے ذوقِ زمانِ لامحدود

مرے خیال سے جلتا ہے لامکاں کا چراغ
ترا خیال خود اپنے لئے ہے نامسعود

مرے لہو میں شرارے ہیں برقِ ایمن کے
ترے لہو میں غلامانہ زندگی کا جمود

مری جبیں ہے مہِ نیم شب کا آئینہ
تری جبیں ہے سجودِ ریا سے گرد آلود

تری اداؤں سے آتی ہے بو غلامی کی
مری نواؤں سے ہے خودسری کا درس و درود

مری جوانی سے قائم بنائے کون و مکاں
ترے بڑھاپے سے قائم گداگری کا وجود

مرے خلوص کی وسعت ازل سے تا بہ ابد
ترے غرور کا حلقہ بقدرِ چشمِ حسود

مرا وقار مرے بعد زندۂ جاوید
ترا وقار ترے بعد نیست اور نابود

ترا وجود نسب در نسب ہے رسوائی
مرا وجود نسب در نسب سخاوت و جود

مری نظر میں ہے جو چیز ہیچ اندر ہیچ
بنایا تو نے اسی ہیچ و زشت کو مسجود

نہیں ہے مجھ کو رئیسانہ زندگی منظور
ملے جو خوشۂ خوشامد سے گوہرِ مقصود

مرے لئے ہے وہ اعزاز بدتر از دشنام
کہ جس کی تہ میں فرنگی کا ہاتھ ہو موجود

جھکا جو دولت و ثروت کے آستانے پر
مری نظر میں ہے وہ شخص ارذل و مردود

مسعود جاوید

"نکہت کے خطوط"

رات کہیں دور کوئی گا رہا تھا،
کون سنے گا اس کا درد شورشِ کائنات میں
تم نے جسے مٹا دیا پردۂ التفات میں

میں سنتی رہی چپ چاپ —— اور متعدد بار دل نے کہا تو بھی گا، اور یونہی گاتی ہوئی رات کی خاموش فضاؤں میں اپنی آواز کے ساتھ تحلیل ہو جا —— مگر میں سنتی رہی خاموش، جیسے کوئی اپنی روح کی کراہ سن رہا ہو۔ جگر میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ لب تھرتھرائے میں نے محسوس کیا الفاظ خاموشی بن کر ٹپک رہے ہیں۔

—— "درد" —— "شورشِ کائنات" —— "پردۂ التفات" ——

اچانک مجھے احساس ہوا کہ ایک چیخ اپنے ساتھ میری ساری زندگی لئے ہوئے سینے کی گہرائیوں سے آندھی کی طرح اٹھی۔ ضبط کی مضمحل کوششیں آنسو بن کر آنکھوں میں آگئیں۔ جسم کے سارے اعصاب فولادی سختی کے ساتھ شل سے ہو گئے تھے —— میں نے چاہا چیخ پڑوں مگر ایک داستاں کپکپی کے ساتھ تھا۔ یہ معلوم ہوا، جیسے کسی آہنی بازو نے پوری بے دردی سے میرا گلا دبا دیا ہے۔ میرا سانس گھٹنے لگا —— ایک سناٹے کے واسطے اس گھٹے ہوئے سانس نے نگاہ بن کر آنکھوں سے نکلنے کی کوشش کی، مگر دوسرے لمحے ہی میں میرے ہوش و حواس سلب ہو چکے تھے۔

آخر شب کے ستارے ڈوبنے لگے تھے، کہ مجھے ہوش آیا۔ جسم کی رگ رگ زخم کی طرح دکھ رہی تھی۔ ضعف و نقاہت کی شدت میں یہ احساس ہوتا تھا کہ سکرات کے عالم میں زندگی کا دھندلا سا خواب دیکھ رہی ہوں۔ تکیہ سر کے نیچے سے پھسل کر زمین پر آرہا تھا۔ اور چوڑیوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے دونوں کلائیوں کو مجروح کر چکے تھے ——

مگر —— قریب ہی اپنی سنہری پرتوں "وہ" اسی طرح مدہوش سو رہے تھے!!

یہ "وہ" تھے جن کو مذہب کے پس پردہ سماج نے میرا "خدائے مجازی" بنا دیا تھا۔ اور جن کی ہر ایک جنبشِ نظر پر مجھے صرف سجدے ہی شانہ کرنے کا حق دیا گیا تھا۔ یہ وہی تھا "خدائے ننگ و ناموس" تھا جس کے بغیر عورت صرف "عورت" رہتی ہے —— "خاتون" نہیں! —— یہ

"بی آقا" تھا، جو اپنی ہر ایک کنیز کو قبر میں سلا کر تہذیب و سماج کے تاجران سے ایک اور کنیز "خرید لینے" کا کلی اختیار رکھتا ہے —— مگر نہیں —— وہ تو ایک "لاش" تھی، جس کے کفن میں مجھے اس لئے ساتھ ... ملفوف کر دیا گیا تھا، کہ اس کے توسل سے میں بھی کسی طرح فردوس میں پہنچ سکوں، ورنہ بدبخت عورت تو مرد کو "مردودِ بہشت" کرا ہی چکی ہے، اور اس کے لئے وہاں تک پہنچنے کا بذاتِ خود کوئی استحقاق نہیں رہا! —— میں نے ایک نظر ادھر ڈالی اور بے اختیار جی چاہا، کہ اٹھ کر اپنے ناتواں ہاتھوں کی ساری قوت ان کی موٹی گردن پر صرف کر دوں خواہ اس کے بدلے مجھے ابد تک جہنم کے شعلوں میں ہی کیوں نہ پھینک دیا جائے!

تم شاید متعجب ہو گی کہ ایک عورت ہوتے ہوئے بھی میں کیونکر ایسا لکھنے کی جرأت کر رہی ہوں۔ لیکن برا نہ مانو، تو کہوں، کہ تمہارا یہ استعجاب غلامانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ تم اس غلامی کا احساس اس لئے نہیں کر سکتیں، کہ تمہیں اس کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ تمہاری ازدواجی زندگی ان تمام مسرتوں کی حامل ہے، جن کی تمہیں یا کسی اور عورت کو توقع ہو سکتی ہے۔ اور اس طرح اس حسین و جمیل قید میں آزادی کا تصور بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ مگر مجھے دیکھو، کہ دلہن بننے کے بعد آہوں اور آنسوؤں کے درمیان ہی زندگی گذری ہے۔ اور سماج کی ستم پسند مصلحتوں نے مجھے ان مسرتوں سے فریب کھانے کا بھی موقع نہیں دیا۔ جو مجھے اپنی جنسی غلامی کے شعور سے دور رکھ سکتی تھیں اگر ایسا نہ ہوتا، تو بہت ممکن تھا، کہ کسی اور عورت کی زبان سے یہی الفاظ سن کر میں خود بھی تمہاری طرح متحیر ہوتی۔

اس غلامی و آزادی سے میرا مفہوم کیا ہے۔ یہ شاید تم پوری طرح نہ سمجھ سکو۔ تہذیب و سماج نے عورت کو کچھ ایسے خوبصورت انداز میں دھوکے دیئے ہیں، کہ ایک مبہم سے احساس کے علاوہ کوئی تجزیہ و تحلیل ممکن معلوم نہیں ہوتی۔ عورت کے ارتقائے حیات کی داستان کا اولین باب وہ ہے، جب وہ شادی کے بعد بھی اپنے خاندان یا قبیلے کے ہمراہ غاروں یا خیموں میں زندگی گزارتی تھی۔ دنیا کے اس

قدیم دور میں شادی کا مفہوم یقیناً موجودہ مفہوم سے کہیں زیادہ مختلف تھا ابھی تہذیب و مذہب کی پیدائش نہ ہوئی تھی۔ اور اگر ان کا کوئی وجود تھا تو وہ بھی یقیناً آجکل سے بالکل جداگانہ نوعیت رکھتا تھا۔ اس لئے موجودہ صدی کا مہذب انسان اس قدیم دور کو وحشت و بربریت کا زمانہ سمجھتا ہے۔ مگر حیرت ہے کہ اس قدیم "وحشی زمانے" میں عورت کو جو مرتبہ اپنے اقتدار و اہمیت کے لحاظ سے حاصل تھا، وہ آج — "یوٹوپیا" کا ایک حسین خواب معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں پہلی قابل غور چیز یہ ہے۔ کہ عورت کو اپنے خاندان کا "سردار" تسلیم کیا جاتا تھا۔ وہ شادی کے بعد بھی اپنے اعزا کے درمیان زندگی بسر کرتی تھی۔ اس کا شوہر بھی اسکی طرح اپنے قبیلے میں ہی رہتا تھا۔ اگر کبھی کبھی وہ اپنی شریک حیات سے ملنا چاہتا تھا۔ تو اسکی حیثیت عورت کے خاندان میں ایک معزز مہمان کی ہوتی تھی۔ ایک طویل مدت تک یہی قانون جاری وساری رہا۔ اور شادی کے مفہوم کے زبردست تغیرات کے بعد بھی عورت کی حیثیت اپنے خاندان کی "فطری ملکہ" کی سی رہی۔ اس عہد میں عورت کی اہمیت و رفعت کی شاہد ایک دوسری تاریخی حقیقت یہ ہے۔ کہ حسب و نسب کا سلسلہ ماں کی طرف سے شمار ہوتا تھا۔ اور تمام رشتے مادری شجرے کی بنا پر متعین ہوتے تھے۔ ماں، خاندانی املاک کی مالک تھی۔ اگر عورت کسی سبب سے اپنے شوہر سے بیزار ہو جاتی تھی۔ تو اس کو اپنے گھر سے نکال دیتی تھی۔ اور مرد اپنے قبیلے میں چلے جانے پر مجبور ہوتا تھا۔ اس قسم کی مفارقت و علیحدگی کی حالت میں بچے اپنی ماں کے پاس ہی رہتے تھے۔ اور اسی کے خاندان کے ارکان شمار ہوتے تھے۔ سماجی ارتقا کے اس دور کے متعلق کارپنٹر بیان کرتا ہے کہ

"ان قدیم سماجی حالات میں عورت بہ نسبت موجودہ زمانے کے کہیں زیادہ آزاد و خوش حال تھی۔ وہ اپنے ہی فرقے یا قبیلے اور اپنے اعزا و اقارب کے ساتھ رہتی تھی۔ اور اس کا شوہر ایک خارجی مہمان کی حیثیت رکھتا تھا۔ ان امور کے مد نظر عورت کسی صورت میں بھی شوہر کی محکوم نہ تھی۔ اور اگر شوہر اس تک رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ تو اس کے لئے یہ ضروری تھا۔ کہ صرف عورت ہی کے لئے پسندیدہ رویہ اختیار نہ کرے۔ بلکہ عورت کے خاندان کے لئے بھی خوشگوار ثابت ہو۔ وہ اپنے بچوں کی کلی طور پر مالک تھی۔ اور اس کو یہ حق حاصل تھا کہ اپنی ملکیت اپنے بچوں کے واسطے ورثہ میں چھوڑ جائے۔ مختصراً یہ کہ خاندان اور نسب کا پورا اعزاز اسی کو حاصل تھا۔ اس کے برعکس اگر شوہر کو یہ بھی معلوم ہو جاتا تھا۔ کہ اس کے بچے کون سے ہیں۔ تو اس صورت میں بھی وہ انکی کچھ دیکھ بھال نہ کر سکتا تھا۔ اور نہ اپنے قبیلے کی اجازت کے بغیر اپنی ملکیت بچوں کو دے دینے کا حق رکھتا تھا۔ اس طرح خاندانی زندگی میں مرد محض ایک ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔"

یہ داستان ہے اس زمانے کی جسے آج ہم "وحشت و بربریت کی یادگار" سمجھ کر حقارت سے دیکھنے کے خوگر ہو چکے ہیں۔ مگر تاریخ شاہد ہے کہ جیسے جیسے مرد زندہ مخلوق کی دنیا میں اقتدار حاصل کرتا گیا۔ اور وحشی جانوروں پر اپنے آلات حرب کی ایجاد کے ذریعے تسلط و قدرت پاتا گیا اس کے ذہن میں ذاتی تصرف کا شعور بڑھتا چلا گیا۔ اور کچھ مدت کے بعد وہ اپنی ازدواجی زندگی کی پابندیوں کو قہر و غضب کی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مرد میں اپنی طاقت کا احساس پیدا ہوا۔ اس نے یہ طے کر لیا۔ کہ جسطرح وہ اپنی قوت کے ذریعے جنگل کے درندوں کو ہلاک کر سکتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنی ازدواجی زندگی کے قید و بندوں کو درہم برہم کر کے عورت کو اپنا محکوم بنا کر چھوڑے گا —— یہ پہلا پہلا اقدام تھا موجودہ تمدن کی طرف!! —— چنانچہ اس نے اپنے اسلاف کی تمام روایتوں سے بغاوت کی۔ اور عورت کو ایک جانور کی طرح پکڑ ([illegible]) کر کے اپنے قبیلہ کے خیموں میں لے آیا۔ عورت نے اس تباہ کن تبدیلی کو کس طرح قبول کیا؟ یہ چیز وثوق کے ساتھ نہیں بتائی جا سکتی۔ اگرچہ یہ امر انسانی فطرت کے منافی ہے۔ مگر ممکن ہے کہ عورت محض معذوری و مجبوری کے تحت خاموش ہو کر رہ گئی ہو۔ کچھ محققین کا خیال ہے۔ کہ عورت نے جدید طرز زندگی کے نقصانات کو اس لئے برداشت کر لیا۔ کہ اس صورت میں مرد پر اس کا تصرف زیادہ مکمل اور براہ راست ہونے کا امکان رکھتا تھا۔ بہرحال خواہ عورت نے اس تغیر کو پسند کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ مگر یہ حقیقت ہے۔ کہ مرد نے اسی پر زور دیا۔ اور کامیابی کے واسطے اکثر قوت و تشدد کا استعمال کیا اس ذہنیت کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اس قسم کی جبری یا گرفتاری کی شادیاں ہو گئیں۔ جس مرد میں جتنی زیادہ جرأت "رندانہ" ہوتی وہ اتنی ہی عورتیں دیگر قبائل سے پکڑ لایا۔ قبیلوں کے طاقتور سردار اور وحشی جنگجو اپنی بیویوں کی تعداد میں اضافہ کرتے چلے گئے۔ اور قبائل کے درمیان ایک مستقل خصومت و جنگ کا عنوان قائم ہو گیا۔ اس حالت میں مرد نے عورت کی اقتصادی قیمت کو سمجھا اور اسے مختلف کام سپرد کئے گئے۔ اس کے بچے مرد کی ملکیت ہو گئے۔ اولاد نرینہ کی وقعت بڑھ گئی۔ کیونکہ لڑکے مرد بن جانے کے بعد قبیلہ کی باہمی لڑائیوں میں صف آرا ہو سکتے تھے۔ لڑکیوں کے فرائض یہ رہ گئے کہ زراعت کریں۔ اناج پیس کر تیار کریں۔

کے کپڑے بنائیں، اور بچے پیدا کریں۔ کچھ عرصہ کے بعد ہی مرد کے اس احساس
نے کہ عورت اسکی ذاتی ملکیت ہے۔ ایک قدم اور بڑھا دیا۔ یعنی دوسری
ملکیت کی طرح عورت کی بھی خرید و فروخت جاری ہو گئی۔ اولاد کے متعلق
اس کے تمام حقوق سلب کر لئے گئے۔ حسب و نسب کا سلسلہ مرد کی
ذات سے شمار ہونے لگا۔ اور خاندان کی تمام ملکیت جو زیادہ تر خود عورت
کی محنت و مشقت کا نتیجہ ہوتی تھی، مرد کے تصرف میں دیدی گئی۔ اسی
طرح عورت بہت سرعت کے ساتھ "ایک سردار اور ملکہ" کی حیثیت سے
گر کر صرف ایک غلام یا پالتو جانور بن کر رہ گئی۔ مادری اعزاز فنا ہو گیا
پدری اقتدار کا عروج ہوتا گیا ——— مرد ایک آقائے مطلق —— عورت
اس کی کنیز!!

عورت کے سماجی مرتبہ کے اس انقلاب پر غور و فکر کرتے ہوئے
بہت کم لوگ ایسے ہونگے۔ جو عورت کی اقتصادی اہمیت کو نظر انداز
کر سکیں۔ زوجہ اپنے شوہر کی محض "ایک جنسی شریک" یا اس کی اولاد
کی خادمہ ہی نہ تھی۔ بلکہ وہ خاندان کی محنت و مشقت کا زیادہ حصہ سرانجام
دیتی تھی۔ اور مرد کا کام صرف شکار کرنا یا دشمنوں سے جنگ جوئی کرنا تھا۔ شکار
کے جانوروں کی کھالیں بنانا، اناج پیسنا کوٹنا۔ کھیتوں میں ہل چلانا۔ یہ سب
امور عورت ہی کی ذمہ داری پر تھے۔ اور اس لئے مرد، عورت کو اپنی ملکیت
میں سب سے زیادہ قیمتی چیز سمجھنے لگا اور اسکی قیمت بھیڑ بکریوں کی صورت
میں متعین ہونے لگی۔ اگر عورت ایک کار آمد مزدور نہ ہوتی، ——— اگر
وہ صرف ایک عیش و عشرت اور مصارف کی چیز ہوتی ——— تو یقیناً
نسل انسانی کے اس کٹھن اور مشقت انگیز دور میں اس کی قیمت اس قدر
زیادہ کبھی تصور نہ کی جا سکتی۔ اسطرح رسمی شادی کے اس دور نے جہاں
عورت کو ایک جدید رتبہ اور اختیار دیدیا۔ وہاں ساتھ ہی ساتھ عورت
کی مساوات اور آزادی کو بھی لوٹ لیا۔ اور اسے ایک کنیز میں تبدیل
کر دیا۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ جب کوئی انسان دوسروں کو غلام بناتا ہے،
تو وہ اپنی گردن کو بھی ان زنجیروں سے محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ چنانچہ
کچھ عرصہ کے بعد دنیا نے دیکھا، کہ مرد عورت کو محبوس کر کے خود بھی آزاد
نہیں رہا۔ اس نے خود کو چند جدید اور اہم ذمہ داریوں میں گرفتار کر
لیا۔ اس کو مجبوراً چند حقوق اور فرائض کی تکمیل اپنے سر لینی پڑی۔ علاوہ
ازیں مرد نے اعصابی طاقت سے حکومت کی۔ اور اس کی اولاد نرینہ
"نظری انتخاب" کے قوانین کے تحت اسی ذہنیت کو لیکر پیدا ہوئی، عورت
کمزور تھی، اس لئے مجبوراً اسے چالاک ہونا پڑا، اور اس نے اپنی لڑکیوں
کی فطرت میں تعلیم و عمل سے یہی چیز پیدا کر دی۔ پھر جو کم ذہانت وحشیانہ
طاقت کے مقابلے میں بشرطیکہ جہالت ہمیشہ کامیاب رہی ہے۔ اس لئے
عورت نے رفتہ رفتہ خود کو "حقوق" روایات و رسوم میں محصور کر لیا، جن
کی پابندی اکثر مذاہب نے بھی مرد کے واسطے لازمی قرار دیدی۔ نسل
انسانی کی تاریخ میں سب سے زیادہ اہم رسم و قاعدہ جو عورت نے
اپنی آزادی کے واسطے قائم کیا۔ یہ تھا۔ کہ شوہر اپنی بیوی اور بچوں کی کفالت
و پرورش کا ذمہ وار ہے۔ اس رسم نے رفتہ رفتہ قوت مجتمع کر کے مذہب
کی پشت پناہی بھی حاصل کر لی۔ اور ایک قانون کی صورت میں تبدیل
ہو گئی۔ اس طرح بہت سے محققین کا فیصلہ ہے۔ کہ قدیم انسان اور موجودہ
مہذب اقوام کے بیشتر طریق و رسوم عورت کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔ تہذیب
و تمدن کے عروج کے ساتھ ساتھ یہ طریق اصول میں تبدیل ہو گئے اور
مذہب و حکومت کی حمایت نے انکو قوانین کی صورت دیدی۔ جو کسی
حد تک عورت کی آزادی کے ضامن ہو گئے لیکن اس کے ساتھ ساتھ
ایک اور اہم چیز بھی قابل غور ہے۔ انسان کے جسمانی ارتقا کی تاریخ
بتاتی ہے۔ کہ اس کے بعض کار آمد اعضاء ایسے بھی تھے۔ جنکا استعمال
کسی وجہ سے ترک کر دیا گیا۔ اور اس لئے وہ معدوم ہو گئے۔ مگر ان
متروک اعضاء کے "باقیات" ———
(Vestigial Remnants) نظام جسمانی میں اب
بھی موجود ہیں۔ جو بعض اوقات عمل میں آ کر غیر متوقع پریشانی کا سبب
ہو جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح قدیم زمانے کے نفسیاتی اور سماجی
"باقیات" بھی مرد کی فطرت میں خوابیدہ رہ گئے ہیں۔ جو اکثر متحرک
ہو کر اسے مجبور کر دیتے ہیں۔ کہ اپنی تہذیب کے تمام لبادوں کو اتار کر پھر
وہی وحشی "آقا" بن جائے۔ جو عورت کو ایک پالتو جانور سمجھ کر اپنی
اعصابی قوت سے ہانکتا تھا۔ عورت نے چند بلند فطرت اور وسیع نظر
مشاہیر کی امداد سے صدیوں کی جد و جہد کے بعد رفتہ رفتہ اپنی کھوئی
ہوئی آزادی کو واپس لیتے ہیں۔ ایک نمایاں کامیابی حاصل کی ہے
مگر جب مرد کی بہیمانہ خوابیدہ فطرت جاگ پڑتی ہے۔ تو مذہب، تہذیب
اور قانون کوئی بھی عورت کی سپر نہیں بن سکتا۔ بلکہ یہی چیزیں مرد کی
چیرہ دستیوں کے خوبصورت حجابات ثابت ہوتی ہیں۔ کارپنٹر کہتا
ہے کہ:

"ایک نیم ارتقا یافتہ مرد یقیناً ایک خونخوار جانور ہے۔ اور
یہی وجہ ہے کہ دنیا میں مرد کی حکومت کا مفہوم صدیوں تک عورت
کی غلامی رہا ہے"

اور یہ ایک حقیقت ہے کہ تہذیب و اخلاق کے موجودہ [illegible]

انقلاب و عروج کے زمانے میں بھی اس قسم کے "نیم ارتقاء یافتہ" مردوں کی کمی نہیں. ہمارا موجودہ سماج اسی نوعیت کے خونخوار انسانوں کا ایک غول ہے. ذرا خود سوچو، کہ جب والدین اپنی بے زبان لڑکی کو ایک "عفریت" کے حوالے کر دیتے ہیں. جو اس دوشیزہ کی زندگی کو اپنے ظالم دبے ور جھگڑوں میں مسل کر پھینک دیتا ہے. تو کیا یہ منظر بالکل وہی نہیں ہوتا جب مرد ایک صیاد و تما قہرمان ——— اور عورت ایک صید تھی مجبور و کمزور ——— مذہب و تہذیب کے وہی علمدار جو عورت کو اطاعت و محبوبیت کا درس دینے میں تقریر کی ساری قوتیں صرف کر ڈالتے ہیں. اسوقت کیوں زبان نہیں ہلا سکتے. جب عورت کو اسی اطاعت و محکومیت کے بدلے صرف ٹھوکریں عطا کی جاتی ہیں؟ ———

تم نہیں جانتیں؟ تو سنو ———: یہ ساری تہذیب کم از کم عورت کے واسطے ایک "منافقت" کے علاوہ کچھ نہیں. مرد ان قوانین و اصول سے تو انکار نہیں کر سکتا. جو غلام عورت نے جدو جہد کر کے اپنی نجات کیواسطے پیدا کئے. کیونکہ اس طرح خود "تہذیب" کے دعاوے باطل ہوتے ہیں. اب صرف یہی صورت عمل باقی رہ جاتی ہے کہ مرد کہے کچھ اور کرے کچھ! عورت کی مساوات و آزادی کے ترانے بھی گائے. اور گھر کی قید میں اسے آنسو بہانے پر بھی مجبور کرے ——— اس کی بہبودی کی خاطر اپنی ذمہ داریوں کا احساس بھی ظاہر کرے. اور اسکی بربادیوں پر ذراسی توجہ بھی گوارا نہ کرے ——— آہ! تو میں اسی طرح تباہ ہوتی ہیں!!

خط بہت طویل ہوگیا. تم میری بکواس سے یقیناً اکتا گئی ہو گی. مگر میں کیا کروں، پردیس دکھا ہوا دل ہے. اور تم جیسی بے لوث پرستش کرنے والی ہستی ——— ! کہنے جیتی ہوں. تو جی چاہتا ہے کہ بے تکلف کہتی چلی جاؤں، تم چاہے سنو یا نہ سنو! ——— میرے ہذیانات سے یقیناً تم متحیر و متوحش ہوتی ہوگی. مگر پیری مجھے اپنی نامرادیوں کی قسم یہ سب حقایق ہیں. شاید میری زندگی میں وہ دن نہ آئے. مگر یہ چیز اٹل ہے کہ ایک روز یہ حقایق پرستاری کی نگاہوں سے دیکھے جائیں گے. اور میری روح ہندوستانی عورتوں کے خواب میں آکر انہیں مبارکباد دے گی!! ———

میری صحت کو کیا پوچھتی ہو! راکھ کے ڈھیر میں دبی ہوئی ایک چنگاری ہے. کچھ راکھ بن چکی ہے اور کچھ بنتی جا رہی ہے. غشی اور تشنج کے دورے پڑتے ہی تھے. اب کبھی کبھی دیوانگی کا سا جوش بھی طاری ہو جاتا ہے. تنہا مکان ہوتا ہے. اور میں اسی حالت میں دیواروں سے سر ٹکراتی پھرتی ہوں. کیا کروں، زمین سخت ہے اور آسمان دور ———

بس چلتا تو کبھی کی مر چکی ہوتی. زندگی کے ساتھ ساتھ موت بھی تمسخر کر رہی ہے. خدا جانے کب تک یونہی نزع کی اذیت سہتی رہوں گی!

تمہاری نجمت.

میری نکہی؟

آؤ آج تمہیں ایک دلچسپ کہانی سناؤں. مجھے معلوم نہیں دوسروں کی زندگی میں بھی ایسا ہوتا ہے یا نہیں. کم از کم میری حیات میں تو یہ چیز آپ بیتی ہے.

کالج کا انبساط پرور زمانہ تو تمہیں بھی یاد ہوگا. مجھے تو بھلائے نہیں بھولتا. تعلیمی مشاغل میں مستقل انہماک اور اس کی معصوم لذتیں ——— بس یہ محسوس ہوتا تھا. کہ زندگی اس کے علاوہ کچھ نہیں. ہمارے ذہن میں مستقبل کے متعلق کیسے کیسے سہانے "خواب" محفوظ تھے ——— یہ ہوگا وہ ہوگا ——— دن اس طرح بسر ہوں گے ——— راتیں یوں گزریں گی. مگر میرے تو وہ سارے خواب تقدیر کی چٹانوں سے ٹکرا کر چور چور ہو گئے. کبھی کبھی ان کے ٹکڑے مجتمع کر کے ایک شکستہ سا خاکہ بنانیکی کوشش کرتی ہوں اور پھر خود ہی منتشر کر دیتی ہوں ——— کتنا لاحاصل ہے یہ کھیل ——— مگر کسقدر دلچسپ!!

آہ انسانی فطرت! ——— زندگی بھر ہم سب یونہی خوابوں سے کھیلتے رہتے ہیں ——— کچھ خواب زندگی بن کر ایک ہنگامی فریب بن جاتے ہیں، اور کچھ اشکوں. کراہوں اور سسکیوں میں تبدیل ہو کر اب بھی حقیقت بن جاتے ہیں ——— مگر ان کی یاد؟ ——— آہ! وہ تو بار بار آتی ہے ——— خاموش رات میں سونے سے کچھ پہلے ——— سنسان دوپہر کی تنہائی میں ——— سوگوار شام میں ——— آتی ہے اور دبے پاؤں چلی جاتی ہے ——— جیسے زندگی ——— آہ! فانی انسان اتنی مختصر ہے تیری ہستی. مگر کسقدر لامتناہی ہیں تیرے خواب!!

پھر اب اس کے علاوہ چارہ ہی کیا ہے کہ تو اپنی محرومیوں سے کھیلتا رہ، کہ اس میں کامرانی نہیں تو فریب کامرانی تو ضرور موجود ہے.

ہاں تو یہ اسی عہد بہاریں کا واقعہ ہے. کالج کا عظیم الشان فنکشن "اندھی دیوانی" ہونے کو تھا. جب مجھے تمثیل کے مرکزی کردار "دیوانی" کا پارٹ دیا گیا. تو میں نے سوچا "خوب، یہ ایک ہی رہی!" ——— قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند" بھلا یہ کیسے ممکن تھا. کہ مجھ جیسی بھولی بھالی لڑکی سینکڑوں حاضرین کے سامنے ایک پاگل عورت بن کر ساری رات بکواس کرتی. ہے ہ میں نے اپنا پارٹ زبانی یاد کر لیا.

آخری ڈریس ریہرسل کا وقت آیا۔ کالج کا تمام عملہ موجود تھا۔
ریہرسل شروع ہوا۔ میں دیوانی بن کر بال بکھرائے دریدہ کپڑے پہنے
آگے بڑھی۔ کس قدر سنجیدگی سے میں اداکاری میں جذب تھی کہ ناممکن
میری نظر اپنی شریر سہیلی عصمت پر پڑی۔ میری اداکاری نے اس کے
چہرے پر حیرت و خوف کے کچھ ایسے مضحکہ خیز اثرات پیدا کر دیئے تھے
میں دیکھ نہ سکی۔ اور بے اختیار قہقہہ لگاتی ہوئی سٹیج سے بھاگ
گئی۔ ایک لمحہ میں سارا کھیل ختم ——— پھر کیا کچھ مرچیں وغیرہ . . .
کا بدنت مجھے تنہا پایا۔ کتنی کچھ ہدایات کی گئیں۔ مگر سچ مانو مجھے پھر
بھی یہ خوف رہا کہ ڈرامہ کے دوران میں کہیں پھر ایسا ہی نہ ہو جائے
مگر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب اگلے روز پورے ڈرامے
میں مجھے ایک ساعت کے لئے بھی ہنسی نہ آئی۔ حاضرین نے میرے
کمال کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ اور اختتام پر
مجھے بہت سے تحفے عطا کئے گئے۔ لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ میں کھیل میں
کیسے مکمل طور پر دیوانہ بن جانے میں کیسے کامیاب ہو گئی تھی۔ میری
ترکیب بہت سادہ تھی۔ مگر قدرے دشوار بھی ——— یعنی صرف یہ
کہ تمثیل کو حقیقت سمجھ لوں۔ میں نے تھوڑی دیر کے لئے یہ تصور کر لیا
تھا کہ میں واقعی ازدواجی زندگی میں داخل ہو گئی ہوں، اور میرے شوہر
کی بے اعتنائیوں نے مجھے پاگل بنا دیا ہے۔

لیکن پرویں مجھے اسوقت کیا خبر تھی۔ کہ یہ ڈرامہ نہیں۔ بلکہ تمثیل
کے پردوں میں اپنی حقیقی زندگی کا کھیل کھیل رہی ہوں، اسوقت میں
نے جن جذبات کو زبردستی اپنے اوپر طاری کر کے حاضرین سے
خراج تحسین وصول کیا تھا، آج وہی جذبات میری رگ رگ کو مجروح
کر چکے ہیں۔ مگر زندگی کے سٹیج کے تماشائی کس قدر بے حس ہیں کہ
چپ چاپ بیٹھے دیکھ رہے ہیں۔ کاش یہ ڈرامہ بھی جلد ختم ہو جائے
اور موت کا آخری پردہ مجھے ان سنگدل تماشائیوں کی نظر سے مخفی
کر دے!! ———

ہاں تم تعجب نہ کرو ——— میں واقعی روز بروز پاگل ہوتی جا رہی
ہوں۔ دیوانگی کے دورے میں کیا کیا کچھ بکتی ہوں۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں
لیکن یہ جانتی ہوں۔ کہ اس حالت میں اپنے لاڈلے بچے نوری کو کئی بار
زدوکوب کر چکی ہوں۔ وہ کیا جانے کہ ماں اسوقت دیوانی ہے۔ سمجھتا
ہوگا کیسی ظالم عورت ہے۔ مجھ سے دہشت محسوس کرنے لگے تو تعجب کیا
ہے۔ ہوش آتا ہے۔ تو اسے کلیجے سے لگاتی ہوں ——— پیار کرتی ہوں
روتی ہوں ——— ہنستی ہوں۔ وہ مجھے متحیر نظروں سے گھورتا ہے۔ کبھی کبھی
روٹھ جاتا ہے ——— "امی ہم نہیں بولتے تم سے" ——— آہ! میرا مظلوم
بچہ!! اسکی پیاری پیاری انکھڑیوں میں کیسے ننھے ننھے آنسو چھلک آتے
ہیں! وہ کیسی لرزہ خیز سسکیاں لیکر خاموش رہنے کی کوشش کرتا
ہے!! ——— میرا ننھا سا چاند!!! شاید وہ اس عقوبت میں صرف اس
واسطے مبتلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ کہ وہ ایک عورت کی لڑکھڑاتی ہوئی زندگی
کا واحد سہارا ہے؟ ——— خیر!!

خوگر جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی
اس قدر ظلم پہ موقوف ہے کیا اور سہی

تمہاری بدبخت دیوانہ

جمیل احمد
(کندھاپوری)

ناول نویسی

اکثر نقاد کہتے ہیں کہ ڈرامہ لکھنا جسقدر دشوار ہے ناول قلم بند کرنا اسیقدر آسان ہے۔ کیونکہ ایک ڈرامہ نگار کو کچھ لکھنے سے پہلے سٹیج کی بنیادی ضروریات اور ڈرامہ کے فنی اصول وضوابط سے اچھی طرح واقفیت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ مگر ایک ناول نویس کے لئے نہ کوئی ایسی پابندی ہے اور نہ کوئی ایسی دشوار شرط۔ ہر وہ شخص ناول لکھ سکتا ہے جس کے پاس فرصت کے ساتھ ساتھ قلم، سیاہی کاغذ ہوں!! . . . ظاہر ہے کہ جب نقادوں کی نظر میں ناول نویسی بحیثیت فن اسقدر آسان ہے۔ تو اس کے ادبی معیار کو جانچنے کے لئے اگر اس کے فنی اصول قائم کئے جائیں۔ تو یہ کوئی سہل کام نہ ہوگا۔

بہرحال ناول نویسی کے اصول وضوابط پر کچھ لکھنے سے پیشتر ہم اسکے خاص اجزائے ترکیبی پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال لینا ضروری سمجھتے ہیں۔

(۱) پلاٹ (۲) کردار (۳) مکالمہ (۴) منظر (۵) طرز تحریر (۶) اور نظریہ حیات۔ یہ وہ چھ ضروری عناصر ترکیبی ہیں۔ جن کے بغیر کوئی ناول خواہ وہ اچھا ہو یا برا، حزنیہ ہو یا طربیہ، طویل ہو یا مختصر عالم وجود میں نہیں آسکتا۔ ناول واقعات اور حرکات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اور ان ہی دونوں کے امتزاج کو لوگ عام طور پر پلاٹ سے تعبیر کرتے ہیں۔ جو اشخاص پلاٹ میں حصہ لیتے ہیں۔ انہیں کردار کا لقب دیا جاتا ہے۔ اور ان کرداروں کے درمیان جو گفتگو ہوتی ہے، اس کو مکالمہ کہتے ہیں۔ جس کا کردار نگاری سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ حرکت جس جگہ عمل میں آتی ہے، اور کردار جہاں تعمیر پلاٹ میں حصہ لیتے ہیں۔ اسے منظر کہا جاتا ہے۔ طرز تحریر کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ کیونکہ یہ وہ چیز ہے۔ جو ہر ناول نویس کا خاص طرۂ امتیاز ہوتا ہے۔ اب صرف ایک عنصر باقی رہ گیا ہے نظریہ حیات! جس کے معنی یہ ہیں۔ کہ ہر ناول نویس زندگی کے اہم مسائل پر اپنا زاویۂ نظر بیان کرتا ہے۔ یہ ایک کامیاب ناول کی سب سے لازمی شرط ہے مگر اس کے لئے ایک کامل فن ناول نویس کو چاہئے کہ وہ واقعات اور کردار کی ترتیب کچھ اس طرح کرے۔ اور تحریکات کو کچھ ایسے پیرائے میں بیان کرے، کہ اس کا نظریہ حیات خود بخود قارئین پر واضح ہو جائے پلاٹ کے متعلق کچھ عرض کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے ۲

کہ پہلے اس مواد کا ذکر کر دیا جائے جس سے پلاٹ کی تعمیر وتشکیل ہوتی ہے۔ اگر آپ مثال کے لئے اُردو کے تین شہرۂ آفاق ناول نویس یعنی سرشار، پریم چند اور راشد الخیری کے کارناموں پر ایک سرسری نگاہ ڈالیں تو یہ حقیقت آپ پر اچھی طرح آشکار ہو جائے گی، کہ ان تینوں نے مختلف طبقۂ انسانی سے اپنے ناولوں کے لئے مواد فراہم کئے ہیں۔ سرشار کے کردار عموماً طبقۂ اعلیٰ سے متعلق ہوتے ہیں۔ پریم چند نے سماج کی بیہودگیوں سے تنگ آکر اس پر زہر میں بجھے ہوئے تیر پھینکے ہیں۔ اور اس کے کردار ہمارے جیسے مجبور اور لاچار انسان ہیں۔ راشد الخیری نے اپنے ناولوں میں متوسط طبقہ . . . کے حالات زندگی پیش کئے ہیں۔ اسی طرح اگر آپ انیسویں صدی کے چار مشہور ترین انگریزی ناول نویس مثلاً ڈکنس، تھیکرے، جارج ایلیٹ، اور ہاتھورن کے ناولوں کو مدنظر رکھیں۔ تو آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ جو چیز ڈکنس کے ڈیوڈ کاپر فیلڈ (David Copperfield) میں ہے۔ وہ تھیکرے کے وینٹی فیئر (Vanity Fair) میں نہیں۔ اور جو شے ایلیٹ کے آدم بیڈ (Adam Bede) میں کارفرما ہے۔ وہ ہاتھورن کے سکارلٹ لیٹر (The scarlet letter) میں روپوش ہے۔

ان چاروں کی دنیا ہی بالکل جدا نظر آتی ہے۔ مگر اس تضاد کے باوجود بھی انہوں نے فطرت انسانی کی نقاب کشائی کی ہے۔ یہ اور بات ہے۔ کہ ڈکنس نے جس طبقہ کے انسانوں کے واقعات اپنے مختلف ناولوں میں قلم بند کئے ہیں۔ وہ اوسط اور نچلے درجے سے تعلق رکھتے ہیں اور تھیکرے کے بیشتر کردار طبقۂ اعلیٰ سے متعلق ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت اب واضح ہو گئی کہ پلاٹ میں حیات انسانی کے کسی نہ کسی پہلو کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ خواہ وہ طبقۂ اعلیٰ سے متعلق ہو یا طبقۂ ادنیٰ سے! اب دیکھنا یہ ہے کہ کس قسم کا پلاٹ فنی اعتبار سے بلند اور کامیاب کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ پلاٹ خواہ کسی شے سے بھی متعلق ہو، مگر اس کو فنی بلندی دینے کے لئے یہ امر لازمی ہے۔ کہ وہ سب کے لئے یکساں طور پر دلچسپی کا باعث بن سکے۔ بعض حضرات اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہی پلاٹ درحقیقت قابل ستائش ہے، جو امراء اور دولتمند لوگوں کی زندگی،

متعلق ہو۔ مگر یہ خیال صرف سطح بین نادانوں کا ہے۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ سڑک پر پڑے ہوئے فقیر اور گداگر کی زندگی کو بھی اگر پلاٹ کا مرکز بنا لیا جائے۔ تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اور اب تو آئے دن ایسے ترقی پسندانہ ناول لکھے جانے لگے ہیں۔ جن میں نچلے طبقے کے لوگوں کی غمناک زندگی سے پلاٹ کا مواد فراہم کیا جاتا ہے۔ ہاں! اسی طرح اس لغو خیال کو بھی حرف غلط کی طرح دل سے نکال دینا چاہیئے۔ کہ وہی ناول درحقیقت بلندپایہ اور کامیاب کہلانے جانے کا مستحق ہے۔ جس کا انجام حزنیہ ہو۔ طربیہ انجام بھی ہماری دلچسپی کا اسی طرح موجب بن سکتا ہے۔ جس طرح ?یہ انجام! اصل چیز یہ ہے۔ کہ پلاٹ کے اندر دلچسپی ہونی چاہیئے یعنی یہ کہ وہ ہر قسم کے قاری کے لئے ذہنی انبساط کا سامان مہیا کر سکے۔

ناول جسقدر دلچسپ ہوگا۔ اسی قدر اسے کامیاب تصور کیا جائے گا۔ اگر وہ اس قابل ہوا کہ قاری اپنے اوقات فرصت میں اس کے مطالعے سے تھوڑی دیر کے لئے اپنے تمام تفکرات و تردوات سے بے نیاز ہو گیا۔ تو بلاشبہ وہ ناول قابل تعریف ہے۔ اور اس کا مصنف قابل تعظیم۔ اگر دلچسپی کے علاوہ فنی پابندیوں کا بھی اس کے اندر بدرجہ اتم خیال کیا جائے۔ یا اس کے اندر کردار نگاری کا جوہر نہایت خوبی کے ساتھ نمایاں ہو۔ یا اس میں ڈرامائی قوت بھی کافی طور پر پیدا کی جائے۔ تو لٹریچر میں ضرور اس ناول کا پایہ بہت بلند ہوگا۔

ناول کو کامل طور پر فنی بلندی بخشنے کے لئے صرف دلچسپی کا خیال رکھنا کافی نہیں۔ سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ اس کے اندر فنی پابندیوں کا کافی خیال کیا جائے۔ اور واقعات کو نہایت خوبصورتی سے ترتیب دیا جائے۔

صداقت کی اہمیت :- ایک کامیاب ناول کیلئے

یہ از بس ضروری ہے کہ اس کے اندر صداقت کا عنصر بخوبی کارفرما ہو ناول نویس صرف ان ہی باتوں کو اپنے ناول میں بیان کرے۔ جس کا اسے تجربہ ہو۔ . . . . یا جس سے وہ اچھی طرح باخبر ہو! ورنہ صرف ہوائی باتوں کو الٹ پلٹ کر رکھ دینے سے ناول بے لطف اور بے قدر ہو کر رہ جائے گا۔ یہ خیال کرنا غلط اور مہمل ہے۔ کہ ناول کچھ بھی ہو۔ آخر ناول ہی تو ہے۔ حقیقت سے اس کو کیا واسطہ!

اس قسم کے خیالات دماغ سے نکال کر یہ ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ کوئی ناول، خواہ وہ دیگر حیثیتوں سے کتنا ہی بلندپایہ کیوں نہ ہو۔ اس وقت تک فنی لحاظ سے قابل قدر نہیں سمجھا جا سکتا۔ جب تک کہ اس کے اندر صداقت غالب نہ ہو! ظاہر ہے۔ کہ ایک کامیاب ناول کی بنیادی شرط اس کے پلاٹ کی صداقت ہے۔ ناول نویس پر لازم ہے۔ کہ اسے زندگی کے جس پہلو کی تصویر اتارنی ہو۔ اسے اس طرح منعکس کرے۔ جیسے وہ ان تمام باتوں سے بخوبی واقف ہے۔ اس چیز کو اسے ہاتھ ہرگز نہیں لگانا چاہیئے۔ جس کا اسے تجربہ نہ ہو۔ یا جس سے وہ کامل طور پر واقف اور متعارف نہ ہو!

ہر ناول نویس کی ایک محدود دنیا ہوتی ہے۔ جس کے ہر ہر ذرے سے وہ واقف ہوتا ہے۔ اب اس کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ اپنے ناولوں کے لئے ہر قسم کا مواد اپنی اسی محدود دنیا سے فراہم کرے اگر اس نے اس کے باہر پاؤں پھیلائے تو یقیناً ٹھوکر کھا کر گر جائے گا

جارج ایلیٹ نے ہم عصر ناول نویس خواتین کے خلاف ایک مرتبہ یہ شکایت کی تھی، کہ ان کا نقطہ نظر مردوں جیسا ہوتا ہے۔ حالانکہ انہیں اپنی صنف کا خیال کرتے ہوئے زندگی کی تصویر اپنے ناولوں میں اسی طرح اتارنی چاہیئے، جس طرح کہ خواتین اتارتی ہیں اور اتارنے کی عادی ہیں!" ظاہر ہے کہ جارج ایلیٹ کی شکایت بجا تھی۔ کیونکہ مرد صرف مرد ہی کے جذبات اور احساسات سے اچھی طرح واقف ہو سکتا ہے۔ اور خاتون صرف خاتون کے جذبات ہی سے! اگر کوئی مرد کسی خاتون کی دلی کیفیات کا حال قلمبند کرے گا، تو ظاہر ہے۔ اس میں وہ صداقت نہیں آ سکتی۔ جو ایک خاتون اور صرف ایک خاتون کے قلم ہی سے ممکن ہے۔ ناول نویس خواتین میں جین آسٹن (Jane Austen) صداقت کو بہت زیادہ مدنظر رکھا کرتی تھی۔ اس نے اپنے متعدد ناولوں میں صرف ان ہی مقامات کا ذکر کیا ہے۔ جن کا اسے ذاتی تجربہ تھا...... اس نے زندگی کے صرف ان ہی پہلوؤں کے جلوے دکھائے ہیں۔ جن سے وہ اچھی طرح متعارف تھی۔ جو چیز اس کی دسترس سے باہر تھی اور جس پرا سے عبور نہ تھا۔ اسے اس نے کبھی ہاتھ نہ لگایا۔ اس کے ناولوں میں خواتین نہ صرف خواتین ہی سے مصروف تکلم نظر آتی ہیں بلکہ مردوں سے بھی! مگر ایک مرد کو مرد کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے اس نے اپنے ناول میں ایک جگہ بھی پیش نہیں کیا کیونکہ وہ مردوں کے جذبات اور احساسات سے بیگانہ تھی۔ اور اسے اس کا علم نہ تھا کہ مرد آپس میں کس قسم کی گفتگو کیا کرتے ہیں۔

لیکن یہ امر قابل افسوس ہے۔ کہ نئے اور مبتدی ناول نویس اس اہم پہلو کو بالکل نظرانداز کر ڈالتے ہیں۔ اور وہ بے سروپا باتیں لکھ مارتے ہیں۔ جن کا نام و نشان تک بھی وہ نہیں جانتے۔ اپنے پلاٹ کے لئے مواد وہ ان چیزوں سے فراہم کرتے ہیں۔ جن سے وہ کبھی دوچار نہیں

ہوتے۔ وہ تخیلی زندگی کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ مگر یہ خود نہیں جانتے۔ کہ سٹیج کے اندر رول کرنے کیسے ہوتے ہیں۔ وہ سمندر وں... ذکر کرتے ہیں۔ مگر انہیں اسکا ذاتی تجربہ نہیں ہوتا۔ کہ سمندر کا پانی تلخ ہوتا ہے یا شیریں، سرمایہ دارانہ ذہنیت کے خلاف آواز اٹھانا اور مزدورانہ جذبات کو دنیا کے سامنے پیش کرنا واقعی بہت بڑا کام ہے۔ مگر اب ہر شخص جس نے غربت کی معمولی سی مصیبت بھی نہیں اٹھائی۔ محض مقبولیت کیلئے با بار چبائے ہوئے نوالے چبانا شروع کر دیتا ہے ظاہر ہے۔ کہ جہاں یہ کیفیت ہوگی۔ وہاں کوئی ناول فنی بلندی کیونکر حاصل کر سکتا ہے!

اکثر نقادوں کا خیال ہے۔ کہ ہر شخص اپنی زندگی میں کم سے کم ایک کامیاب اور دلچسپ ناول ضرور لکھ سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنے ذاتی تجارب وخیالات، احساسات وجذبات کی تصویر صداقت کے ساتھ پیش کرے۔ مگر افسوس کہ ہمارے بیشتر ناول نویس اسکی مطلق پروا نہیں کرتے۔ اور بے جا مقبولیت کا حوصلہ رکھنے کے لئے وہ دوسروں کی نقل اتارنے کی سعیٔ نامشکور میں منہمک ہو جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بھونڈی نقل کسی کام کی بھی نہیں ہوتی۔

کاش۔ جتنا وقت وہ اس قسم کی ناکام کوششوں میں صرف کرتے ہیں۔ اگر اس کا نصف بھی ذاتی تجارب کی بنا پر کچھ لکھنے میں صرف کریں تو وہ ذہنی کاوش کہیں زیادہ مستحسن سمجھی جائے۔

زندگی کے مختلف شعبوں کی واقفیت حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہم براہ راست ہر چیز کا ذاتی تجربہ کریں۔ یہ کسی قدر مشکل امر ہے۔ کتابوں سے بھی ہم بہت کچھ استفادہ ..... کر سکتے ہیں۔ علاوہ ان اشخاص سے گفتگو کرنا بھی کچھ کم منفعت بخش نہیں۔ جو ان حالات سے متعارف ہو چکے ہیں۔ جن کی کبھی ہم نے آج تک شکل بھی نہیں دیکھی۔ انگریزی ادبیات میں ڈیفو Defoe کا رابنسن کروسو ایک شاہکار ناول ہے۔ اس کے اندر جو مناظر بیان کئے گئے ہیں۔ وہ اسقدر صحیح جاگتے معلوم ہوتے ہیں کہ ان کے غلط ہونے کا شائبہ بھی ہمارے ذہن میں نہیں گزرتا۔ مگر کیا آپ کو یہ سنکر تعجب نہ ہوگا کہ اس کا مصنف نہ تو کبھی کسی جزیرے میں رہا۔ اور نہ اپنی تمام زندگی میں اس نے کبھی سمندر کی شکل ہی دیکھی۔ ورنہ لگا اس قسم کے مناظر سے یہ تصنیف پر ہے۔ وجہ اسکی یہ ہے۔ کہ ڈیفو نے دوسرے ذرائع سے مواد فراہم کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اور اپنے زور دار تخیل کی مدد سے ایسی دلچسپ دلپذیر کہانی قلمبند کی۔ جسے اب تک بچے اور بوڑھے مرد اور عورت سب یکساں طور پر ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔

—— تاریخی ناول نویسوں کو بھی موخر الذکر قسم کے تجارب حاصل کرنے پڑتے ہیں۔ مثلاً اگر انہیں تین صدی پیشتر کی حالت قلمبند کرنی ہے۔ تو وہ اس عہد کے صحیح حالات کتابوں کی مدد ہی سے معلوم کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ذاتی تجارب کا اس سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

محترمہ حجاب امتیاز علی

ایک رات

مجھے ایک مدت سے ثمرو کے کھنڈر دیکھنے کا اشتیاق تھا۔

اتفاق سے ایک دن باتوں باتوں میں نے اپنے شوق کا ذکر بوڑھے ڈاکٹر گار سے کیا۔ وہ سنتے ہی بولے "اتنا اشتیاق ہے تو بیٹی ادہاں کی سیر کو جاتی کیوں نہیں، تمہارے قیام کا انتظام میں کئے دیتا ہوں۔ مادام حمرہ دلی خوشی سے تمہیں اپنا مہمان بنائیں گی۔ کہو تو آج ہی انہیں خط لکھدوں؟"

میں نے سوال کیا "مادام حمرہ کون ہیں؟"

بوڑھے ڈاکٹر گار نے نسوار کی ڈبیہ جیب سے نکالی اور اس کی انگلی مارتے ہوئے بولا "تم مادام حمرہ کو نہیں جانتیں روحی! دو سال ہوئے یہ خاتون ثمرو سے کوئی چالیس میل کے فاصلے پر کار کے حادثہ میں بری طرح زخمی ہو گئی تھیں۔ اتفاق کی بات، ان زمانے میں ہماری پارٹی شکار کی غرض سے نکلی ہوئی تھی خیمے قریب ہی لگے تھے۔ رات کا وقت تھا، شہر دور تھا۔ ایک میں ہی وہاں ڈاکٹر تھا۔ اللہ نے وقت پر مجھے توفیق دی، اور میں اس بے چاری خاتون کو اپنے خیمے میں لے آیا۔ چوٹیں سخت تھیں، مگر چار دن کی تیمارداری اور علاج نے خطرہ سے باہر کر دیا۔ اور میں نے انہیں اپنی کار میں بٹھا کر ان کے گھر پہنچا دیا۔ وہ دن اور آج کا دن ——— ہمیشہ ان کا اصرار رہا کہ میں چند دن کے لئے انکے ہاں جاؤں، اور ان کا مہمان رہوں۔ مگر اس بے چاری کے اس شدید اصرار کے باوجود میں اب تک نہ جا سکا۔ کھنڈروں کی سیر کے لئے وقت نکال سکا۔ بیماروں کی خدمت سے جو وقت بچتا ہے۔ وہ مطالعہ کی نذر ہو جاتا ہے۔ اب یہ موقع اچھا پیدا ہو گیا۔ اپنی بجائے میں تمہیں بھیجدوں گا۔ انہیں خوشی ہوگی تمہاری خواہش پوری ہو جائے گی۔"

یہ سنکر میں بولی "واقعی موقع تو اچھا ہے۔ مگر ڈاکٹر میں اکیلی نہیں جاتی، بخدا مجھے لطف نہ آئے گا، تم بھی ساتھ چلو؟"

ڈاکٹر نے اپنے قدیم انداز میں صاف انکار کر دیا "بیٹی! میرا جی نہیں چاہتا۔ کون سوٹ کیس بھرے، اور سفر کی زحمت اٹھائے۔"

جسوتی برآمدے کے سرے پر بیٹھی میوہ کھا رہی تھی، یہ سنکر وہیں سے بولی "سوٹ کیس میں بھر دونگی، پیارے گار، آپ ضرور چلیں۔"

جسوتی بچپن سے بوڑھے ڈاکٹر گار کو گاری گار کہنے کی عادی ہے ڈاکٹر گار نے تھوڑی دیر کے غور کے بعد اپنی عادت کے مطابق ارادہ بدل ڈالا۔ بولا "تم لوگوں کی فرمائش ٹالتے ہوئے بھی طبیعت آزردہ ہوتی ہے۔ تو پھر جسوتی! میرے سوٹ کیس تم کو بھرنے ہونگے، اور میری نسوار کی پڑیوں کی دیکھ بھال روحی! تم کرو۔"

بوڑھے ڈاکٹر کی اسی ایک گندی عادت سے مجھے نفرت ہے۔ مجھے نسوار کو چھونے سے بھی گھن آتی ہے۔ مگر کیا کرتی، اسوقت اپنا مطلب تھا۔ ناچار وعدہ کر لیا۔ کہ نسوار کی پڑیوں کا اہتمام میں کروں گی

ڈاکٹر گار نے اسی وقت مادام حمرہ کو خط لکھدیا۔ کہ ہفتہ عشرہ میں ہم لوگوں سمیت وہ وہاں پہنچ رہے ہیں۔

لیکن ڈاکٹر کے پاس بعض کیس ایسے اہم آتے رہے۔ کہ خط لکھنے کے پندرہ دن بعد ہم اپنا سفر شروع کر سکے۔ اس روز میں، میری محبوب اکلوتی سہیلی جسوتی اور ڈاکٹر گار ہم تینوں ڈاکٹر کی چھوٹی سی سفری کار میں چل پڑے۔ دن کی گرمی سے بچنے کے لئے رات کا کھانا کھا کر سفر شروع کیا۔ پروگرام یہ بنا۔ کہ ثمرو کے راستے میں رات مادام حمرہ کے ہاں بسر کر کے انکی خواہش پوری کریں۔ اور دوسری صبح ثمرو کے کھنڈروں میں پہنچ جائیں۔ یہ خبر نہ تھی، کہ یہ رات زندگی کی نہایت خوفناک راتوں میں سے ایک ہوگی ——— مالک کی پناہ!

مئی کی تپتی ہوئی چاندنی رات تھی۔ ہماری ننھی سی "بینٹلے" ویران سڑک پر کسی تیز رفتار کیڑے کی طرح چلی جا رہی تھی۔ نو بج چکے تھے ——— خیال تھا کہ ساڑھے بارہ بجے تک ہم مادام حمرہ کے یہاں پہنچ جائیں گے سڑک پر کوئی راہگیر نہ تھا۔ زرد چاند موسم گرما کے شفاف آسمان پر دم بخود تھا۔ تاڑ کے فلک بوس چھتری نما درخت رات کی فسوں کاری سے مبہوت کھڑے تھے۔

جسوتی کار چلا رہی تھی۔ میں اس کے پہلو میں بیٹھی ٹانی کھا رہی تھی بوڑھا ڈاکٹر بیٹھا ہوا سگار منہ میں دبائے غنودگی کے عالم میں پچھلی سیٹ پر پڑا تھا۔ غنودگی سے چونکتا، تو مزے میں آکر عمر خیام کی کوئی شوخ رباعی

اپنی موٹی غیر شاعرانہ آواز میں گادیتا۔ یہ اس کی مخصوص عادتوں میں سے ایک عادت تھی۔

دلفریب چاندنی تھی۔ اور خوابناک سماں، دفعتاً جسوتی نے کار کھڑی کردی۔

میں نے چاکولیٹ کا ایک ٹکڑا نگلتے ہوئے پوچھا "کیوں کیا ہوا؟" وہ بولی "کوئی خرابی ہو گی" اور پھر سیٹ سے اتر کر انجن کھول کر دیکھنے لگی۔

میں نے کہا "ناممکن! اچھا ٹھہرو، میں دیکھتی ہوں"

یہ کہکر میں نے اپنا دستی بٹوا ڈاکٹر گار کی گود میں پھینک دیا، اور خود انجن کو دیکھنے لگی۔ آدھے گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد ہم نے مایوس ہوکر ایک دوسرے کو تکا۔

جسوتی نے کھسیانے لہجے میں پوچھا "اب کیا ہوگا روحی؟"

اسی وقت تاڑ کے دیو قد درخت پر تہذیب و تمدن سے ناآشنا صحرائی الو نے ایک وحشیانہ چیخ ماری۔ بھلا جسوتی کے کان جو ستار کی موسیقی اور محبت کی سرگوشیوں کے عادی تھے الو کی اس زیادتی کی تاب کب لاسکتے تھے۔ وہ مارے خوف کے مجھ سے چمٹ گئی لیکن میں تو غیر آباد زمینوں اور مہاذری جیسے دشوار گزار پہاڑوں کی سیاحت کی عادی ہوں۔ اسکی بزدلی پر اسکو ہمت دلائی۔

اتنے میں بوڑھا ڈاکٹر گار حافظ کا ایک عشقیہ شعر پڑھتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اور پوچھنے لگا "کیا ہم پہنچ گئے؟"

کچھ دیر بعد پریشانی کے عالم میں ہم تینوں کار سے نیچے اترے، اور سراسیمگی سے ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

رات زیادہ گہری ہوتی چلی جاتی تھی، چاند کی زرد روشنی میں رات کا کوئی پرندہ اپنے بڑے بڑے بازو پھیلائے کسی سمت اڑتا، تو ہم کسی راہ گیر یا گاڑی بان کے دھوکے میں اسی سمت تکنے لگتے۔

تھوڑی دیر بعد دور سے بغیر چھت کے دیہاتی وضع کی ایک مضحکہ انگیز گاڑی آتی ہوئی نظر آئی۔

جسوتی نے اسے دیکھ کر غمگین لہجے میں کہا "اگر ہم دیر میں پہنچے، تو وہ سوچکی ہونگی۔ اس لئے اسی گاڑی میں چلے چلو"

گاڑی سڑک کے کنارے بے فکری سے جیسے چہل قدمی کرتی ہوئی چلی جارہی تھی۔

ڈاکٹر گار نے دور سے آواز دی "بڑے میاں! ایوب محلہ میں عشرت خانہ نامی کوٹھی تک ہمیں پہنچادوگے؟"

گاڑی بان نے ہماری طرف دیکھے بغیر دیہاتیوں کے سے اکھڑ لہجے میں جواب دیا۔

"نہیں بارہ بج گئے ہیں۔ دیر ہوگئی ہے"

یہ غیر مہذب اور گنوارانہ جواب سن کر بہت ہی غصہ آیا مگر کیا کرتے۔ میں اور جسوتی اس کے پاس گئیں۔ وہ ہمارے بیش قیمت زریں لباس اور باوقار چہرے دیکھ کر گاڑی سے نیچے اتر آیا۔

"یہ لو" میں نے جاتے ہی چاندی کا ایک چمکدار سکہ اس کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ اور بولی "اب ہمیں جلدی سے عشرت خانے تک پہنچادو"

وہ مرعوب ہوگیا۔ اور مودب لہجے میں بولا "سوار ہو جائیے حضور، دو گھنٹوں میں پہنچادوں گا"

گاڑی کے پائیدان پر قدم رکھا، تو ایسا معلوم ہوا، کہ گاڑی سر پر آرہے گی۔ اس لئے فوراً میں نے اس کی چھت تھام لی۔ جسوتی نے اس کے پہیئے کو مضبوطی سے پکڑ کر گاڑی پر قدم رکھا۔ غرض ہم تینوں چڑھ کر بیٹھ گئے۔

اب گاڑی چلی جارہی تھی، آہستہ آہستہ جیسے کسی جاں بلب نیم کا سانس چل رہا ہو۔ چاند زرد پڑ گیا تھا۔ ہواؤں میں خوفناک سرسراہٹ پیدا ہوگئی تھی۔

بوڑھا ڈاکٹر گار گاڑی کے ہچکولوں سے ناخوش اور چڑچڑا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ہم دونوں گرمی سے نڈھال، ہاتھوں میں خس کی زریں پنکھیاں لئے، جن کی ڈنڈیاں خوشبودار صندل کی لکڑی کی تھیں۔ بار بار بے کلی سے پہلو بدل رہی تھیں۔ آہ! اللہ وہ گرم اور ویران چاندنی رات۔ سانس آگ کے شعلوں کی طرح ناک سے نکلتا تھا۔ زبان سوکھے پتے کی طرح خشک تھی۔ جسوتی رہ رہ کر اپنی پری کی وضع کی چھوٹی سی نقرئی صراحی سے پانی انڈیل انڈیل کر پی رہی تھی۔ مشرقی ممالک کی یہ وہی گرم رات تھی۔ جس کے متعلق ہمارے ان ایشیائی ممالک میں مشہور ہے۔ کہ سبز چشم پریاں بھی اپنی آبی دنیا سے باہر نکل آتی ہیں۔

دور سے ایک سفید شاندار عمارت نظر آنے لگی۔ پھر یک لخت بوڑھا ڈاکٹر گار گاڑی بان پر، اور میں جسوتی پر جا پڑی۔ اور اس طرح ہماری مضحکہ انگیز گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ عشرت خانے کے شاندار پھاٹک میں مڑ گئی۔

میں نے کھسیانے انداز میں کہا "ایسی بھدی گاڑی میں اپنے میزبان کے سامنے جاتے ہوئے میں تو زمین میں گڑ جاؤں گی"

سا پر بوڑھے ڈاکٹر گار نے کہا "مگر رومی! اس میں شرم کی کیا بات ہے، وہ کیا سمجھ نہ جائیں گی۔ کہ مجبوری کو اس گاڑی پر سوار ہونا پڑا ہوگا؟"

جسونتی نے کہا "نہ نہ جتنی جلدی ہو سکے اس کو واپس کر دو۔"

چاندنی کی سفید دھاریاں خوش قطع اور تنگ روشوں پر پڑی ہوئی تھیں۔ ہماری گاڑی صدر دروازے پر جا کر رک گئی۔ ہم نے فوراً اسے واپس کر دیا۔

میں نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا "یہاں کی دنیا تو خواب میں ملفوف نظر آتی ہے۔ چوکیدار کا بھی پتہ نہیں!"

جسونتی نے کہا "کون جانتے مادام حمرہ یہاں ہیں بھی یا نہیں۔"

ڈاکٹر کہنے لگا "ہونگی کیوں نہیں؟ انہوں نے میرے خط کا جواب دیا تھا۔ اور لکھا تھا کہ میں دلی اشتیاق سے آپ سب کی آمد کی منتظر ہونگی۔"

ہم نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ پہلے احتیاط سے آہستہ آہستہ، پھر کچھ دیر بعد زور سے۔ مکان کا طواف کیا۔ نوکروں کو پکارا، چوکیدار کو آوازیں دیں۔ غرض جتنی کوششیں ہو سکتی تھیں۔ کر لیں۔ مگر زرد چاندنی میں سفید مرمریں محرابوں والا عالی شان محل ساکت کھڑا رہا۔ وسیع برآمدوں میں لمبے ستونوں کا عکس چاندنی میں ترچھا پڑ رہا تھا۔ چنبیلی کی بیل میں جھینگر اپنا نغمۂ تنہائی الاپ رہا تھا۔

جب مایوس ہو کر ہم زینے سے اترنے لگے۔ تو اچانک اندر کسی کمرے سے ایک ایسی آواز آئی۔ جیسے کسی نے دیا سلائی جلائی ہو۔

ڈاکٹر گار نے چونک کر کہا "مجھ کو میرا خیال ہے کہ کوئی جاگ رہا ہے!"

ہم تینوں پھر زینے طے کر کے دروازے کے پاس اس امید میں جا کھڑے ہوئے کہ اب کھلتا ہے، اور اب کھلتا ہے۔ اندر سے کبھی کبھی کوئی خفیف سی آواز آ جاتی تھی، پانچ منٹ اسی حالت میں گزر گئے۔ ہم بند دروازے پر نظریں گاڑے کھڑے رہے۔

آخر ڈاکٹر نے حیران ہو کر کہا "یہ کیا بات ہے؟"

میں نے شیشوں میں سے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ وہاں تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا۔

ڈاکٹر بیزار ہو کر چلایا "ارے بھئی! یہاں کوئی ہے یا نہیں؟"

اس کے چلانے کا اثر یہ ہوا کہ اندر پھر کچھ گڑبڑ ہونے لگی۔ دو لمحے بعد یکایک دروازہ اس زور سے کھلا کہ ہماری آنکھیں بند ہو گئیں۔ اس کا کھلنا تھا کہ تیز ہوا کا ایک سرد جھونکا اچانک ہمارے گرم چہروں سے یوں آ کر لگا۔ جیسے کسی نے تھپڑ مارا ہو۔ میری تو آنکھیں بند ہو گئیں، اور ساتھ ہی ہم تینوں کھڑے کھڑے کانپ سے گئے۔ لیکن دروازے کے سامنے موجود کوئی نہ تھا!

ڈاکٹر گار حیران و پریشان ہو کر بولا "یہ دروازہ کھولا کس نے؟"

اندر کی ویران تاریکی میں داخل ہونے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ڈاکٹر نے ایک قدم اندر رکھا تھا کہ جسونتی نے اسے روک دیا۔

بیزار ہو کر ہم نے پھر باغ کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔ یک لخت پھر اندر کے کسی دروازے کے پٹ سے کھلنے کی آواز آئی۔ اور ساتھ ہی سرد اور تند ہوا کا جھونکا ایک بار پھر ہم تک پہنچا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تاریکی میں ایک ہلکی سی روشنی نظر آنے لگی، جو بتدریج موم بتی میں تبدیل ہو گئی، ہم نے نگاہ موم بتی سے ذرا اوپر اٹھائی، تو انھیں اٹھائیس سال کی ایک حسین و دلفریب خاتون نظر آئی جس نے نہایت سادہ اور سفید لمبے لمبے لرزاں دامنوں کا لباس پہن رکھا تھا۔ موم بتی اس کے ہاتھ میں تھی۔

ڈاکٹر گار کو دیکھ کر وہ مسکرائی۔ اور سر جھکا لیا۔

"مزاج شریف مادام حمرہ ——— یہ دونوں لڑکیاں میری بیٹیاں ہیں۔ انہیں کا ذکر میں نے خط میں کیا تھا۔"

حمرہ نے نہایت دلکش انداز میں ہماری طرف دیکھ کر خیر مقدم کے طور پر سر جھکا دیا۔

پھر ایک لمحہ بعد کوئی بات کہے بغیر انہوں نے اشارہ سے ہمیں اپنے پیچھے بلایا۔ اور روشنی دکھاتے ہوئے خود سامنے چلنے لگیں۔ ایک بل کھائے ہوئے ناگ کے پھن پر موم بتی جل رہی تھی، ہوا سے ان کے سفید لمبے لمبے دامن ان کے پیچھے دور دور تک لہرا رہے تھے۔ چال ایسی تھی، جیسے کوئی پری ہوا میں تیر رہی ہو۔ سیاہ بال سفید ریشمی چادر کے نیچے ہوا کی شوخیوں سے لہرا رہے تھے۔ چہرے پر حوروں کی مسکراہٹ تھی۔

اسی وقت جسونتی نے سرگوشی کی "رومی! یہاں کیسی خنک ہوا چل رہی ہے۔ باہر تو سڑکوں پر لو کی تکلیف دہ لپٹوں سے ہمارے چہرے گرم ہو رہے تھے!"

جسونتی کا فقرہ ختم ہی ہوا تھا کہ ہم ایک عالیشان ہال میں پہنچے، جہاں پالش کی ہوئی چمکدار سیاہ لمبی میز پر انواع و اقسام کے پھل برگ نما نقرئی طشتوں میں سجے ہوئے تھے۔ دل کی شکل کی ننھی ننھی کٹوریوں میں شربت رکھا ہوا تھا۔ میز کے اوپر چھت میں کنول کے پھولوں کی وضع کے فانوس آویزاں تھے۔ دروازوں پر ارغوانی رنگ کے زریں پردے لگے ہوئے تھے۔ دیواروں پر چین کی کسی قدیم جنگ کے مناظر لٹک رہے تھے۔

مادام حمرہ نے سانپ کی شکل کا شمع دان میز پر رکھ دیا۔ اور خود سرے والی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

ڈاکٹر گار نے کہا۔ لیکن! میری پیاری مادام —— رات کے دو بجے ایسے لذیذ کھانوں سے کوئی کس طرح لطف اندوز ہوسکتا ہے؟ اسوقت تو ایک نرم اور آرام دہ بستر عنایت ہوجائے۔ تو بڑی مہربانی ہو۔

یہ سنتے ہی مادام حمرہ کسی قسم کا کوئی لفظ منہ سے نکالے بغیر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ کھانے کے لئے مطلق اصرار نہ کیا۔ اپنا ہی ناگ کی وضع کا شمعدان اٹھالیا۔ اور مسکرا کر گردن کے اشارے سے ہمیں اپنے پیچھے پیچھے آنے کو کہا۔

ایک پرتکلف خوابگاہ میں لے گئیں۔ جہاں مدھم روشنیوں کے نیچے نفیس اور رنگین ریشمی بستر بچھے ہوئے تھے۔ یہاں پہنچکر سر کے اشارے سے شب بخیر کہا۔ اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی اس طرح چپ چاپ باہر چلی گئیں

میں ایک کمزور دل کی وہمی عورت ہوں، اپنی میزبان کی ان حرکات نے میرا خون خشک کردیا تھا۔ چنانچہ ان کے کمرے سے باہر جاتے ہی میں نے ڈاکٹر گار کا ہاتھ تھام لیا۔ اور بولی۔۔

"یہ بات کیوں نہیں کرتیں؟"

گار بولا: "میں خود حیران ہوں، نہ جانے کیا معاملہ ہے؟"

میں نے بیزار لہجے میں کہا: "یہاں سے بھاگ چلو ڈاکٹر!"

جسوتی بولی: "انکی شکل کیسی میٹھی ہے۔ پر کہیں گونگی تو نہیں؟"

ڈاکٹر گار نے کہا: "نہیں بیٹی! نہیں! وہ بے حد باتونی ہیں"

میں سوچتے ہوئے بولی: "اس حسن کے باوجود انہیں دیکھ کر مجھے وحشت سی محسوس ہوتی ہے"

ڈاکٹر گار اپنے کمرے میں چلا گیا۔ جسوتی اور میں اس راز کو سلجھانے کی کوشش کرتی ہوئی تین بجے کے قریب اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹ گئیں صبح کی نماز کے وقت عادتاً میری آنکھ کھل گئی۔ پروگرام کے مطابق آٹھ بجے ہمیں سرد کے کھنڈروں کی طرف روانہ ہوجانا تھا۔ اس لئے میں نے جسوتی کو بھی جگادیا۔ ہم دونوں نے نماز پڑھی۔ صبح گرم اور خوشگوار تھی۔ نماز کے بعد سامنے چنبیلی کی بیلوں میں بیٹھ کر بہت دیر چائے کا انتظار کیا۔

مگر جب مایوسی ہوئی تو میں ڈاکٹر گار کے کمرے میں گئی۔ اور بولی:

"ڈاکٹر! ابھی تک سورہے ہو؟"

وہ بولے: "چائے کے انتظار میں پڑا ہوں۔ روحی! چائے آجائے تو اٹھوں۔ ذری وہ نسوار کی ڈبیہ پکڑا دینا۔ شکریہ!"

نو بج گئے۔ اور کسی نے خبر نہ لی۔ تو میں نے کہا: "چلئے ڈاکٹر! ذرا باہر نکل کر دیکھیں۔ چائے یا کوئی خادمہ کیوں نہیں آتی؟"

ڈاکٹر گار نے جلدی جلدی کپڑے پہن لئے۔ ہم تینوں وسیع برآمدے سے گزر کر بڑے ہال میں آئے۔ تمام دروازے بند تھے۔ ہر طرف سناٹا اور ویرانی تھی۔ بیش قیمت فرنیچر پر گرد جمی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کوٹھی کئی روز سے بند پڑی ہے۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے کھٹکھا کر آہٹ کر کے ایک ایک کمرے کو کھولا۔ لیکن ہر کمرہ خالی تھا ہر کمرے کی یہ حالت تھی۔ جیسے برتا ہی نہیں جاتا۔

ساری کوٹھی دیکھ ڈالی۔ اس میں کہیں کوئی متنفس نہ تھا ہمارے دلوں پر دہشت ایک بوجھ کی طرح بیٹھنے لگی۔ پریشان ہوکر باغ میں نکل آئے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ یہ ماتو رات کیا ہوگیا ——؟ نوکر کدھر ہیں؟ مادام حمرہ کہاں غائب ہوگئیں۔

دس بج گئے۔ ہم پریشانی کے عالم میں اس ویران گھر کے زینے پر کھڑے سوچ رہے تھے۔ کہ کیا کریں؟ اتنے میں دیکھا۔ کہ بوڑھا ملازم باغ سے ہوکر اندر آیا۔ اور چپ چاپ ایک کمرے میں داخل ہوگیا پھر اس نے فرنیچر نکال نکال کر باہر رکھنا شروع کردیا۔ ساتھ ہی ساتھ زور زور سے روتا بھی جارہا تھا۔

ہم لوگ تیزی سے اسکی طرف گئے۔ وہ ہمیں دیکھ کر ٹھٹک سا گیا۔ پھر حیران ہوکر ہمارا منہ تکنے لگا۔

ڈاکٹر نے پوچھا: "مادام حمرہ کہاں ہیں؟"

بوڑھا متعجب ہوکر دیوانوں کی طرح ڈاکٹر کا منہ تکنے لگا۔

ڈاکٹر گار نے پھر کہا: "ہم ان کے مہمان ہیں۔ مادام حمرہ کہاں گئیں؟"

بوڑھے نے حیران ہوکر کہا: "مادام حمرہ؟ —— —— آہ حضور! بیگم صاحب کو تو سانپ نے ڈس لیا تھا۔ ان کے انتقال کو آج پورے دس دن ہوگئے۔ آج گھر کا سامان نیلام ہونے والا ہے!"

یہ سنتے ہی میں نے جسم میں ایک پھریری سی محسوس کی —— رات کا وہ پراسرار سرد ہوا کا جھونکا پھر ایک دفعہ مجھے اپنے قریب محسوس ہونے لگا۔ اور میں بید مجنوں کی طرح کانپنے لگی۔

اس کے بعد مجھے مطلق یاد نہیں کہ کیا ہوا تھا۔

گنگا دھر ناتھ فرحت
(کانپوری)

تیرے بغیر!

خانۂ ہستی ہے بے بہارِ بوستاں تیرے بغیر
آ کہ باغِ زندگی میں ہے خزاں تیرے بغیر

بے مزہ ہے محفلِ کون و مکاں تیرے بغیر
سونی سونی ہے فضائے دو جہاں تیرے بغیر

مضطرب ہے مضطرب عمرِ رواں تیرے بغیر
غیر ممکن ہے سکونِ جاوداں تیرے بغیر

چین دل میں، نیند آنکھوں میں کہاں تیرے بغیر
خوابِ شیریں بھی ہے اک خوابِ گراں تیرے بغیر

پھر سسک کر رہ گئی عمرِ رواں تیرے بغیر
پھر تڑپ اٹھی حیاتِ جاوداں تیرے بغیر

ہر نفس کی آمد و شد، کد و کاوش کی دلیل
موجِ بوئے گل ہے زنجیرِ گراں تیرے بغیر

تو نہیں تو دل کی بستی میں اجالا ہی نہیں
تیرہ و تاریک ہے کون و مکاں تیرے بغیر

ہمرکابی میں تری صحرا بھی ہے اک گل کدہ
کاٹنے کو دوڑتا ہے بوستاں تیرے بغیر

چاندنی راتوں کی یہ سرمستیاں بےکیف ہیں
بے مزہ ہے ماہتابِ ضوفشاں تیرے بغیر

آتشِ سیال رقصاں ہے مرے دل میں کہ آج
ہر رگ و پے میں ہے اک برقِ تپاں تیرے بغیر

ماہ و انجم درپئے تحریکِ آہ و گریہ ہیں!
سلکِ رشکِ یاس میں ہے کہکشاں تیرے بغیر

سیکڑوں سجدے تڑپتے ہیں جبینِ شوق میں.
ننگِ سجدہ ہے زمین و آسماں تیرے بغیر

نغمۂ ہستی، فروغِ زندگی، بزمِ حیات
بے حقیقت سی ہے ساری داستاں تیرے بغیر

خود فراموشی گئی، رندی و بدمستی گئی،
بڑھ گیا اندیشۂ سود و زیاں تیرے بغیر

ظلمتیں بڑھنے لگیں، گھٹنے لگا نورِ حیات
ہو چلا بت پر خدائی کا گماں تیرے بغیر

فرحتِ مہجور اپنے کلبۂ احزاں میں ہے
کس کو ہے توفیق سیرِ بوستاں تیرے بغیر

نوشتہ:- ہیرلڈ برگ ہاؤس

مترجمہ:- سید فیضی جالندھری

سوگوار محبّت

ایک ایکٹ کا ڈراما

افرادِ تمثیل

لوسنڈہ بینز ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک پچاس سالہ کنواری بڑھیا
ہیلن ماسٹرز ۔ ۔ ۔ ۔ لوسنڈہ کی شاگردہ
سوسن کرانمر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لوسنڈہ کی جوان خادمہ
کرنل رُوفرن لوسنڈہ بینز کا دیرینہ محب

زمانہ ــــ جون ۱۸۸۹ء

منظرِ اوّل

کرنفورڈ میں مس لوسنڈہ بینز کا ڈرائنگ روم جس کا سازو سامان (کرسیاں، پردے، صوفے اور دیواروں پر لٹکی ہوئی تصاویر) اپنی مالکہ کی کہن سالی کی طرح مرورِ ایام کی تباہی کا آئینہ دار ہے۔ موسم گرما کی ایک سہانی اور چمکیلی صبح درو دیوار پر رنگ نور برسا رہی ہے۔ کھڑکی کے باہر سرسبز جھاڑیوں اور حوروں جیسے سبزے کی کیف آگینی سے دل و دماغ پر ایک کیفیت سی طاری ہوئی جاتی ہے۔ لطافت پرور نسیم کے ہلکے ہلکے تھپیڑے نرم و نازک گلوں کو تھپک رہے ہیں۔ نشست گاہ کا دروازہ "ب" اندر کی جانب کھلتا ہے۔ سوسن کرانمر ایک بائیس سالہ شوخ و جمیل دیہاتی لڑکی اپنی ایک ہم عمر خاتون ہیلن ماسٹرز کو جو موسم کے مطابق کپڑوں میں ملبوس ہے۔ کمرے میں داخل ہونے کا اشارہ کرتی ہے۔

سوسن:- مس ماسٹرز!! بی صاحبہ (لوسنڈہ بینز) فرماتی ہیں کہ آپ تشریف رکھئے۔ میں ابھی حاضر ہوئی۔

ہیلن:- (دکھڑے کھڑے) سوسن! میری جانب سے انہیں کہہ دو کہ اگر میری وجہ سے انہیں ملاقاتی ٹوپی پہننے کی زحمت ہوئی ہے تو مجھے سخت رنج ہے۔

سوسن:- (منہ بسورتے ہوئے) نہیں بی بی! ملاقاتی ٹوپی پہنکر مہمان سے ملنا انکا معمول ہے۔ اس میں انہیں ذرہ بھر زحمت نہیں ہوتی بلکہ خوشی ہوتی ہے۔

ہیلن:- مگر میں تو مہمان نہیں ہوں۔ اگر بالفرض ایسا ہو بھی تو اس صبح سویرے خلافِ توقع ملاقات کا کچھ خیال کیا ہوتا!ــــ

سوسن:- (قطع کلامی کرتے ہوئے) وہ اپنی ٹوپی بدل رہی ہیں۔ اور اب تک تو تبدیل بھی کر چکی ہونگی بس آیا ہی چاہتی ہیں۔

ہیلن:- (ذرا محجوب ہو کر) افسوس کہ شرفِ زیارت کا یہی موقعہ میسر آیا۔ کیونکہ آج ہی لندن کو واپس لوٹ رہی ہوں۔

سوسن:- ایں!! تو کیا ریل گاڑی سے جانے کا خیال ہے؟

ہیلن:- (مسکراتے ہوئے) ہاں! ارادہ تو یہی ہے۔

سوسن:- آپ کی ہمت قابلِ رشک ہے۔

ہیلن:- (گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے) سوسن! بی صاحبہ اچھی تو ہیں نا!

سوسن :- ہاں بخیریت ہیں۔ لیکن نامراد سلمن نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔

ہیلن :- (چونک کر) سلمن، کون سلمن ؟

سوسن :- (جی بی بی !! بچے تو اس کمبخت نے دیئے ہیں، مگر مصیبت ہماری بی صاحبہ پر ٹوٹ پڑی ہے

ہیلن :- بہت خوب !!

سوسن :- ہم ابھی تک اسے سلمن ہی کہتے ہیں۔ یہی اس ناہنجار کا نام ہے۔ سچ ہے زمانہ کبھی ایک حال پر نہیں رہتا۔ مس ہیز کا خیال ہے سلمن نے انکا ساتھ نہیں دیا۔

ہیلن :- (شوخی سے) اللہ تم نے سوسن !

سوسن :- بی بی میرا کیا ہے، میں ٹھہری انکی خادمہ (لجاتے ہوئے اور ذرا توقف کے بعد) مس ماسٹرز !!

ہیلن :- (استعجاب کے انداز میں) کیا ہے سوسن، تمہارے گالوں پر یکایک زردی کیوں چھا گئی۔

سوسن :- کچھ نہیں (ذرا سوچکر) مس ماسٹرز !! تمہاری تو بی صاحبہ سے بڑی بے تکلفی ہے نا —— انکی ایک بات میری آنکھوں میں بہت کھٹکتی ہے، اگر میری خاطر اس کا تدارک فرماؤ تو مجھے یقین ہے کہ ——

ہیلن :- ہاں ہاں !! کہو رک کیوں گئیں ؟

سوسن :- بات یہ ہے کہ دس سال قبل جب میں یتیم خانہ سے یہاں آئی تو مس صاحبہ نے مجھے اپنی خدمت میں لیتے ہوئے کہا تھا۔ اب عشق و محبت کی داستان کو ہمیشہ کے لئے فراموش کر دو۔ میں نے جواب میں کہا تھا۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ لیکن یہ سن شعور سے پہلے کا واقعہ ہے۔ جب میں محبت کی ہی دلآویزی سے بالکل نا آشنا تھی۔ اب جبکہ میں سرحدِ شباب میں قدم رکھ چکی ہوں۔ مجھے خوف ہے کہ اپنے عہد پر قایم نہ رہ سکوں گی تاہم۔

ہیلن :- تو کیا "نیاز مندوں" کی ضرورت محسوس کرتی ہو ؟

سوسن :- نہیں بی بی، یک وقت میں ایک ہی "نیاز مند" سے نبھ جانے کی زحمت ہے۔

ہیلن :- کیا کسی کی خلشِ عشق پہلو کو گدگدا رہی ہے ؟

سوسن :- جیمس براؤن میرا منظورِ نظر ہے۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ وہ میرے لئے کسقدر مضطرب ہے

ہیلن :- یہ بات ہے !

سوسن :- میں اس سے وعدہ بھی کر چکی ہوں۔ میرے اقرار پر وہ کسقدر مسرور ہوا تھا، کچھ نہ پوچھئے۔ اب فوری انکار سے اسکی روحانی تکلیف کا خیال کرتے ہوئے کانپ اٹھتی ہوں، مجھے اس کا اداس چہرہ نہ دیکھا جائے گا۔ حیران ہوں کہ کروں تو کیا کروں۔ عجب مخمصے میں گرفتار ہوں۔ بی بی سے اس کے متعلق استفسار کرتی ہوں۔ تو راز کے فاش ہو جانے کا خطرہ ہے۔ ایمان کی پوچھو تو بی بی بھی اپنے دل پر ہی چوٹ کھائے ہوئے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ ان معاملات میں تنگ نظری کا ثبوت دیں۔

ہیلن :- (رکتے ہوئے) سوسن !!

سوسن :- (فاتحانہ انداز سے) کہ الفرڈ کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ مس ہیز اور

ہیلن :- (دخل اندازی کرتے ہوئے) خبردار سوسن !!

سوسن :- بی بی اس میں جھوٹ ہی کیا ہے۔ مزید برآں وہ ہندوستان سے واپس بھی آچکے ہیں۔ اور اپنی آنکھوں سے میں نے انہیں دیکھا ہے۔

ہیلن :- مسٹر ڈفرن واپس آگئے ہیں ؟

سوسن :- دیکھئے آپ نے ہی انکا نام لیا ہے۔ مجھے معذور رکھیئے گا، ہاں واپس آچکے ہیں

ہیلن :- کب ؟

سوسن :- میں تو اتنا جانتی ہوں، بی بی کے ہمراہ کل ترکاریاں خریدنے جا رہی تھی۔ کچھ شیشے کے برتن بھی لانے تھے۔ کہ مسٹر ولسن کی دکان میں ہم نے ایک شخص کو دیکھا۔ جو سگرٹ سلگانے کے لئے دیا سلائی کی ڈبیہ خرید رہا تھا۔

ہیلن :- کیا کہا ؟ کہ الفرڈ میں اور سگرٹ نوشی !!

سوسن :- جی ہاں ! اور اس نے بی بی کو سلام کرنے کیلئے ٹوپی سر سے اتاری۔ مس صاحبہ متحیر رہ گئیں۔ جھٹ میرا بازو تھام کر کچھ سہارا لیا۔ حیرت کے عالم میں بولیں "اخاہ ... مسٹر ... ... ڈفرن" اور دوکاندار سے چیزیں خریدنے میں بھی منہمک رہیں۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ میں کچی گولیاں نہیں کھیلی ہوں۔ نظریں پہچانتی ہوں۔ "تاڑ گئی" کہ دال میں کچھ کالا کالا ہے تاہم بی بی کی ہمت پر آفریں ہے۔ جب وہ اس خارزار سے دامن نہ بچا سکیں، تو پھر مجھ پر ... جیمس براؤن کے قصرِ محبت کے دروازے کیوں بند ہوں۔

ہیلن:۔ خیر دیکھا جائے گا۔

(لوسنڈہ جنیز آتی ہے۔ وہ ایک پچاس سالہ بڑھیا ہے نرم و نازک لباس میں ملبوس ہے چہرے پر شگفتگی کے آثار ہیں، گزری ہوئی جوانی کی مدہم تابش اس کے گزشتہ حسن و جمال کی غمازی کر رہی ہے)

لوسنڈہ:۔ خالہ ہیلن اور یہاں۔۔۔

ہیلن:۔ پیاری سی آنٹی!!

(دونوں ایک دوسری کو اظہار محبت کیلئے چومتی ہیں)

(سوسن چلی جاتی ہے)

لوسنڈہ:۔ ہیلن!! یہ صبح سویرے کی تکلیف فرمائی کا سبب؟

(دونوں بیٹھ جاتی ہیں)

ہیلن:۔ محض آرزوئے دید! کل ہی آئی تھی۔ اور آج ہی جا رہی ہوں۔۔۔

لوسنڈہ:۔ کیا کہا؟ اتنے عرصہ کے بعد آئی ہو اور اس قدر جلد جا رہی ہو؟ کچھ دیر اور نہ ٹھہرو گی؟

ہیلن:۔ یہی تھوڑا سا وقت غنیمت ہے۔

لوسنڈہ:۔ سنا ہے تمہاری منگنی بھی ہو چکی

ہیلن:۔ سنا تو ٹھیک ہے۔ آپ میری خوشی میں شریک ہیں نا!۔۔؟

لوسنڈہ:۔ پیاری بچی!! میں تو ہر لحظہ تیری مسرتوں کیلئے دست بدعا ہوں۔۔۔!

ہیلن:۔ مس جنیز!! میری زبردست خواہش ہے کہ میں تمہیں اپنے ہونے والے شوہر سے تعارف کراؤں، وہ بھی یہیں ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے تو اس مکان میں مرد کا گذر مشکل ہے پھر بھی متوقع ہوں کہ آپ میرے معاملے میں درگذر فرمائیں گی۔

لوسنڈہ:۔ کیا اپنے منگیتر کی طرف اشارہ ہے؟

ہیلن:۔ معاف کرنا، یہ میری دلی آرزو ہے کہ میرا بھی اس کمرے کو دیکھ لے جہاں آپ مجھے سینا پرونا سکھایا کرتی تھیں

لوسنڈہ:۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہم مکان کے باہر ملیں۔ یہاں جیسا کہ تم جانتی ہو اول تو مردوں سے ملنے کے لئے کوئی اچھی جگہ نہیں ہے نیز دوسرے یہاں ملنے میں مجھے شرم آتی ہے۔ ہر چند کہ سلسن نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ لیکن اتنا یقین ہے کہ مردوں کی خصلتیں اس سے بھی گئی گذری ہوتی ہیں

ہیلن:۔ میری تو بہت سادہ مزاج ہے

لوسنڈہ:۔ ضرور ہوگا، لیکن میرے لئے تو مرد کا تصور ہی اندوہناک

کہاں یہ بات کہ میں اسے خوش آمدید کہوں۔

ہیلن:۔ پھر وہ اصطبل ہی میں رہیں تو اچھا ہے

لوسنڈہ:۔ مجھے دوسروں سے کیا غرض، جہاں تک میری اپنی ذات کا سوال ہے میں اپنا اصول نہیں توڑ سکتی

ہیلن:۔ کیا سوسن بھی آپ کا ساتھ دیگی؟

لوسنڈہ:۔ یقیناً۔

ہیلن:۔ ہر چند اس کے دل میں عشق کا شعلہ برق فگن ہے۔ مگر وہ ایفائے عہد کا ضرور خیال رکھے گی۔

لوسنڈہ:۔ (چونک کر) میں نے تو اسے عشق نہ کرنے کی ہدایت کی تھی اگر واقعی وہ اب کسی کو چاہنے لگی ہے تو اسے اس کام کیلئے مہینہ کے دو دن کافی سے زیادہ ہیں۔ میں اس معاملہ میں بہت فراخدلی سے کام لے رہی ہوں۔ میری طرف سے وہ جس کے ساتھ جی چاہے گھر بسا کر جائے میں اسے نہیں روکتی لیکن اس کے کسی آشنا کو اپنے گھر میں نہیں دیکھ سکتی۔ مردوں کی بیہودگی دردسر کا باعث ہے۔ چاہے وہ سوسن کا چاہنے والا ہی کیوں نہ ہو

ہیلن:۔ (سوسن کا پاس کرتے ہوئے) آخر عورت ہے اور نوجوان!! تنہائی سے گھبرائی ہوگی

لوسنڈہ:۔ گھبرانے کیوں لگی۔ کئی ایک کام ہیں، جن سے دل بہل سکتی ہے۔

ہیلن:۔ لیکن تم ہی کہو۔ کیا سردیوں کی تاریک اور خنک رات کو مطمئن رہ سکتی ہو بستر کی گرمی ہی تو کافی نہیں ہوتی

لوسنڈہ:۔ مطمئن، یہی تنہائی میرے لئے کسی زمانے میں عذاب تھی اور ایک دفعہ جب کہ اخبار میں چوری کی چند ایک وارداتیں ہوئیں، تو میں سوچا کرتی تھی۔ کہ پہلو میں خاوند کی موجودگی کس قدر حوصلہ افزا اور کیف آگیں ہوتی ہوگی۔۔۔۔۔۔ تمہیں یہ باتیں ناپسند تو نہیں!

ہیلن:۔ قطعی نہیں!! اگرچہ شادی سے قبل ان باتوں سے احتراز لازم ہے۔

لوسنڈہ:۔ ہاں وہ رنگین زمانہ ابھی تک میری نگاہوں پر رعنائی بن کر چھا رہا ہے۔ جب میں بھی جذبات سے مغلوب ہوکر ہر نوجوان لڑکی کیطرح اپنے آپ کو کسی کی آغوش میں گرا دینے کی خواہشمند تھی لیکن جس شخص پر میری نگہ انتخاب پڑی، یعنی جس کے ساتھ میری شادی ہو سکتی تھی، وہ مجھ سے اپنے سوال کا نفی میں جواب

پر خزیت طاری ہوگیا۔ یہ حقیقت ہے کہ "نہیں" سے میرا منشا قطعی انکار نہ تھا۔ بلکہ میرا عارضی انکار، اقرار کا پہلو لئے ہوئے تھا۔ میں آجتک اپنی اس غلطی پر متاسف ہوں۔ خدا معلوم اسوقت میرے ہونٹوں سے "نہیں" کا لفظ کیوں نکل گیا۔ حالانکہ میرے جسم کی رگ رگ سے "ہاں" کی صدا پیدا تھی۔ میں اس کی محبت کا دم بھرتی تھی۔ لیکن اس نے میری "نہیں" پر اعتبار کر لیا۔ اور مجھے تمام عمر آلام و مصیبت کے طوفان میں غوطے لگانے کیلئے تنہا چھوڑ گیا ہیلن!! تم کس قدر خوش نصیب ہو جاؤ ہیلن خدا کا شکر بجا لاؤ کہ تمہاری خوش نصیبیاں "نہیں" کی مہوم جانگزا سے محفوظ و مصئون ہیں۔

ہیلن :۔ مس بینز تمہاری طرح شرمیلی تو میں بھی ہوں۔ میرے منہ سے بھی دو بار "نہیں" نکل گیا تھا۔ لیکن تیسری دفعہ جب میری نے سوال کیا، تو مجھ سے انکار نہ ہو سکا۔ اور مجھے اپنی شکست تسلیم کرنی پڑی۔

نوسندہ : مسٹر ڈوفرن نے مجھ سے ایک ہی دفعہ استفسار کیا مگر حسب خاطر جواب نہ پاکر مجھ سے منہ موڑ لیا۔

ہیلن :۔ مسٹر ڈوفرن!!

نوسندہ :۔ ہاں یہی۔ ان کا نام تھا۔ میں اس تذکرہ کا اعادہ نہیں چاہتی۔ ہیلن!! خدا کے لئے میری اس دیدہ و دانستہ غلطی کو بھول جاؤ وہ جوانی کی نوگذاشت تھی۔ اس منزل میں بہت سے رہرو شکستہ پائی سے عاجز آجاتے ہیں اس لئے گذشتہ واقعات کو بھلا دینا ہی قرین مصلحت ہے۔

ہیلن :۔ مسٹر ڈوفرن . . !! لیکن مس بینز ـــــ مستقبل تو امید افزا ہو سکتا ہے۔

نوسندہ نہیں!! ایام رفتہ کی یاد ہی قدم قدم پر کیا کچھ کم جان لیوا ثابت ہو رہی ہے، جو میں اپنے مستقبل کو بھی تاریک کر لوں۔ میرے لئے تو جو کچھ بھی ہے یہی ہے۔ انہی حسین سایوں تلے زندگی بسر ہو رہی ہے۔ اور نا معلوم کب تک . . . . .

ہیلن :۔ حسین سائے ؟

نوسندہ :۔ ہاں تمہیں کیا خبر، تم رموزِ محبت کیا جانو۔ وہ دیکھو تمہارا خاوند اور تمہارے ننھے ننھے بچے انتظار کر رہے ہیں، اور تمہیں معصوم اشاروں سے اپنے پاس بلا رہے ہیں۔

ہیلن :۔ ان باتوں سے آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔

نوسندہ :۔ شرمندگی کیسی اور کس لئے ؟ تمہیں تو زندگی اور اس کی حلاوتوں پر ناز کرنا چاہئے

ہیلن :۔ واقعی مجھے ناز ہے اور ہوگا تنی شادمانی کے باوجود میری حرص روز افزوں ترقی پر ہے۔ لیکن تمہیں دیکھتی ہوں کہ قلیل سرمایہ رکھتے ہوئے بھی قناعت پسند ہو۔

نوسندہ :۔ درست ہے زندگی جوانوں کا حصہ ہے مسرتوں اور عشرتوں سے جذبات کے متلاطم ہونے کا نام ہی زندگی ہے اور میرے لئے تو اس عمر میں جو تھوڑا بہت سرمایۂ عیش و نشاط باقی رہ گیا ہے۔ وہ ان واقعات ماضی کے حسین سایوں کی بہترین یادگار ہے۔ مجھے بھی تنہائی کبھی بارگراں معلوم ہوتی تھی۔ میں نے بھی راتوں کو آنسوؤں سے تکیے بھگوئے ہیں تاروں سے ہجر بانی کی شب اور فراق کے دنوں کی شام اور انتظار کی رات کی سحر نہیں دیکھی۔

ہیلن : مگر اب ؟

نوسندہ :۔ اب عالمِ تخیل ہی میرے لئے سرمایۂ حیات ہے۔ یہی میری معنوی اولاد ہے۔ دوسرے لوگوں کے بچوں کی طرح میرے یہ بچے ہیلن!! پروان نہیں چڑھتے۔ بڑے ہو کر بے ڈول اور بدصورت نہیں ہوتے بلکہ ہمیشہ بچپن کی شراب کیف آور سے سرشار رہتے ہیں۔ اور خوبصورتی و خوش اخلاقی کے زیوروں سے آراستہ ہوتے ہیں۔ میری تنہائی بھی انکی معصوم اداؤں کی وجہ سے جلوت ہوتی ہے۔ لہٰذا تم جان سکتی ہو کہ میں ایک لمحہ کے لئے بھی تنہا نہیں رہتی۔ وہ میرے نزدیک آگ کے پاس آکر بیٹھتے ہیں تاکہ اس سے نکلتے ہوئے شراروں کو دیکھ سکیں۔ وہ دیکھو میری اور توان آپس میں کھیل رہے ہیں۔ کسقدر خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں بچوں کی سی ضد ہے!! نہ ہی گھر میں طوفان بے تمیزی برپا کرتے ہیں۔ رات کو یہ میرے ننھے گلے سے لپٹ کر سوتے ہیں۔ اسی طرح جسطرح حقیقی بچے اپنی ماؤں سے اظہارِ محبت کرتے ہیں۔

ہیلن :۔ بہت خوب!! اس سے اچھی بات اور ہو بھی کیا سکتی ہے۔

نوسندہ :۔ خیر ہیلن!! ان باتوں کو چھوڑو، پرانی کہانیوں کی یاد بہت تلخ ہوا کرتی ہے۔ میں نے خود فراموشی کے عالم میں تم سے وہ باتیں کہدی ہیں، جنکا افشا قرین مصلحت نہ تھا کیونکہ رازداری محبت کا جزو ضروری ہے۔ اپنی منگنی کا ذکر چھیڑو مراسم عروسی کب تک عمل میں آئیں گی ؟ "نوعروسِ حسن کی خاطر نازک نازک

پھولوں کی پنکھڑیاں اور مدہوش کن خوشبوئیں تمہیں میرے
باغ سے میسر آسکتی ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟

(سوسن آتی ہے)

سوسن :۔ (عدم توجہی کے انداز میں) بی صاحبہ!

لوسنڈہ :۔ کیا ہے سوسن؟ تمہاری سانس کیوں پھول رہی ہے؟

سوسن :۔ باہر دروازے پر کوئی صاحب جن کے بشرے سے اشتیاق
ٹپک رہا ہے۔ کھڑے ہوئے آپ کا پتہ پوچھ رہے ہیں۔

لوسنڈہ :۔ کون ہیں؟

سوسن :۔ (یاد کرتے ہوئے) بی صاحبہ اگر معاف فرمائیں تو کہوں۔
کل ہم نے انہیں مسٹر ولسن کی دکان میں دیکھا تھا۔ البتہ لباس
کل سے زیادہ پُرتکلف ہے۔ میں نے تو ان سے کہدیا تھا کہ بی
صاحبہ مشغول ہیں۔ لیکن انہوں نے ایک نہ مانی۔ اور ملاقات
پر مصر رہے

لوسنڈہ :۔ (کچھ محجوب سی ہو جاتی ہے اور اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش
کرتی ہے) اچھا سوسن!! انہیں اندر بلا لاؤ۔

سوسن :۔ (استعجاب آمیز لہجہ میں) کیا یہیں؟

لوسنڈہ :۔ (بے پروائی سے) ہاں!

سوسن :۔ میرے خدا عجیب معاملہ ہے۔ (سوسن چلی جاتی ہے)

لوسنڈہ :۔ ہیلن!! میرے پاس کھڑی ہو جاؤ۔ آزمائش کا وقت ہے
میری بچی مجھے تنہا نہ چھوڑ دینا۔

ہیلن :۔ ایسا کبھی نہ ہوگا میں سایہ کی طرح ساتھ رہونگی

لوسنڈہ :۔ میری ہمت جواب دے رہی ہے پھر بھی خدا کا لاکھ لاکھ شکر
ہے۔ ہیلن کہ تم یہیں ہو اتفاق کی بات ہے کہ میں نے تمہاری
خاطر ملاقاتی ٹوپی بھی پہن لی تھی

ہیلن :۔ آپ تو جاذب نظر معلوم ہو رہی ہیں۔ ماشاء اللہ چہرے کا
رنگ بھی نکھرا ہوا ہے۔ جبڑاں سمٹ کر سرخ ہو گئی ہیں۔

لوسنڈہ :۔ عجیب مصیبت کا سامنا ہے۔ دیکھ میری ٹوپی تو ٹھیک ہے نا؟

ہیلن :۔ ہاں ہاں بالکل درست ہے۔

لوسنڈہ :۔ ہیلن!! انکی تواضع کیونکر کی جائے؟ صبح کے وقت مرد چائے
پیتے ہیں یا شراب؟ واللہ مجھے تو کچھ علم نہیں میں تو اس معاملے
میں بالکل کوری ہوں۔

ہیلن :۔ نہیں تو آپ کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہ ہوگی۔ البتہ
شراب تلخ ضرور پئیں گے۔

(سوسن اور چارلس روڈفرن اندر آتے ہیں۔ سوسن تعارف کر
کے واپس چلی جاتی ہے۔ روڈفرن قد و قامت کے لحاظ سے
وہ سالہ بوڑھا سپاہی معلوم ہوتا ہے۔ چست لباس پہن
رکھا ہے۔ انداز سے شرم نمایاں ہے۔ گفتگو سے سپاہیانہ پن
مترشح ہے۔ لیکن جلد ہی اپنی غلطی کو محسوس کرتا ہے۔ کہ
فوجی دستے کو حکم دینے کی بجائے ایک عورت سے مخاطب ہے)

لوسنڈہ :۔ (سلام کو جھکتے ہوئے) آخاہ مسٹر روڈفرن ہیں!

روڈفرن :۔ مسٹر نہیں مادام! کرنل ایسٹ انڈیا کمپنی کا ریٹائرڈ کرنل

لوسنڈہ :۔ (تعارف کراتے ہوئے) آپ کرنل روڈفرن ہیں۔ اور یہ میری
عزیز شاگرد مس ماسٹرز!

روڈفرن :۔ آپکی خادمہ کہاں ہیں مادام؟

لوسنڈہ :۔ تشریف رکھئے۔ (روڈفرن مشکوک نظروں سے دیکھتا ہے،
وہ کرسی اپنی جسامت کے لحاظ سے مضبوط دکھائی پڑتی ہے)
ہاں! ہاں!! بے خطر بیٹھ جائیے۔

روڈفرن :۔ (بیٹھتے ہوئے) شکریہ!!
(کرسی کی نشست بہت نیچی ہے۔ لیکن اونچے اونچے پاؤں
نشست کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں)

لوسنڈہ :۔ کچھ پینے کے لئے حاضر کروں کرنل!! تھوڑی سی خوشذائقہ
شراب یا ۔ ۔ ۔ ۔

روڈفرن :۔ نہیں بس شکریہ۔ شراب کا تو میں خوگر نہیں ہوں۔
(کہتے کہتے رک جاتا ہے اور ہیلن کی طرف چبھتی ہوئی نظروں
سے دیکھتا ہے۔ گویا اسکی حاضری بے تکلفی میں مخل ہو)

لوسنڈہ :۔ (محجوب ہو کر) کرنل!! فوجی زندگی کے تجربہ کار افراد تو شراب
ایک دیرانہ نظر آتا ہوگا۔

روڈفرن :۔ میں تو اپنی واپسی پر بہت خوش ہوں۔

لوسنڈہ :۔ یقیناً۔ کیا ایشیائی لوگ بہت تندخو ہوتے ہیں؟

روڈفرن :۔ (ہیلن کی طرف دیکھتے ہوئے) مس صاحبہ میں یہاں کوئی
افسانہ کہنے نہیں آیا۔

لوسنڈہ :۔ مگر آپ کی زندگی تو صعوبتوں اور خطروں سے لبریز رہی گی
یقین ہے ۔۔۔

روڈفرن :۔ بیگم صاحبہ معاف کیجئے گا۔ جنگی حکایات عورتوں کے کانوں
پر ذرا گراں گزرتی ہیں۔ میری زندگی کے واقعات اضطراب
انگیز نہیں ہیں۔ جتنی آپکی رنگین داستان حیات میرے لئے

دلچسپ ہوگی۔

لوسنڈہ :۔ (سرد آہ بھر کر) میری داستان حیات!! لیکن میں ——

رڈفرن :۔ (اٹھتے ہوئے) ہاں اسی خاطر تو میں یہاں آیا ہوں۔ مس مارٹرز تو آپ کی شاگردی میں رہ کر کل افسانے سے باخبر ہو گئی ہوگی۔ شاید یہ اعادہ انہیں اچھا معلوم ہو۔

لوسنڈہ :۔ مجھے یقین ہے کہ ہیلن اسکا خیال نہ کریگی۔ اور مجھے کہنا ہی کیا ہے

ہیلن :۔ (اٹھتے ہوئے) کرنل رڈفرن تم ایسے دو دیرینہ دوستوں کے لئے خلوت زیادہ مناسب ہے۔

لوسنڈہ :۔ (اٹھتے ہوئے اور خوفزدہ ہو کر) مگر ہیلن!! . . . کرنل تم خواہ مخواہ دخل اندازی کر رہے ہو۔ بیچاری ہیلن مجھ سے اپنی منگنی کے متعلق گفتگو کر رہی تھی۔

رڈفرن :۔ (جھکتے ہوئے) مس مارٹرز!! مبارک ہو۔

ہیلن :۔ شکریہ کرنل صاحب!

لوسنڈہ :۔ ہاں تو پھر کیا ہوا ہیلن؟

ہیلن :۔ عرض تو کر چکی مس صاحبہ تمہاری قسم اب کوئی بات نہیں

رڈفرن :۔ چلو بات ٹلی۔

ہیلن :۔ جانے سے قبل سوسن سے ایک بات کرلوں۔ اجازت ہے؟

لوسنڈہ :۔ اتنی جلدی کیا ہے۔ چلی جانا۔

ہیلن :۔ نہیں اب اجازت ہی دیجئے۔

لوسنڈہ :۔ لیکن . . . .

ہیلن :۔ میں الوداع کہنے کیلئے پھر کسی وقت حاضر ہو جاؤں گی۔ اچھا کرنل رڈفرن آداب!

رڈفرن :۔ (دروازہ کھول کر جھکتے ہوئے) آداب مس مارٹرز!! (جب وہ اس کے پاس سے گزرتی ہے) خدا کرے تو نیک لڑکی ثابت ہو۔

(ہیلن چلی جاتی ہے۔ وہ دروازہ بند کر کے مڑتا ہے)

اچھا لوسی!!

لوسنڈہ :۔ (خوفزدہ ہو کر) کیسے کرنل رڈفرن!!

رڈفرن :۔ لوسی تمہیں یاد ہوگا کہ میرا اصلی نام چارلس ہے۔

لوسنڈہ :۔ ہاں اچھی طرح یاد ہے۔

رڈفرن :۔ اور وہ آخری وقت بھی۔ جب تم نے مجھے اس نام سے مخاطب کیا تھا۔ جب میرے دل میں مسرت کی ایک لہر نے چٹکی لی تھی۔ اسی کمرے میں۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟ میں اپنی زندگی کے وہ غم انگیز واقعات کیونکر بھول سکتا ہوں اسی بارگاہ میں جب سربسجدہ حاضر ہوا تھا۔ جب اپنے استفسار پر "نہیں" کا زہرآلود لفظ سنکر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ کچھ نہ پوچھئے کہ اسوقت مجھ پر کیا کیفیت طاری تھی۔ میں تو سمجھے تھا کہ تمہارا جواب شرمندۂ سوال نہ ہوگا۔ اپنی زندگی میں میں نے بہت سی صعوبتوں کا مقابلہ کیا ہے۔ لیکن اسدن کی چوٹ کا اثر آجتک میرے دل پر باقی ہی نہیں بلکہ ترقی پذیر ہے کتنا عرصہ ہوا؟ ۲۵ سال . . . .

لوسنڈہ :۔ ۲۵ سال تین مہینے اور دس دن شاید ماہ مارچ ۱۹۲۴ء کا دن تھا۔

رڈفرن :۔ اچھا تو تمہیں تاریخ بھی یاد ہے۔ یہ بھی یاد ہوگا کہ میں کس طرح ایک ٹوٹا ہوا دل لیکر گیا تھا۔ میں نے جاتے ہی سب سے پہلے جہاز سے ہندوستان کی راہ لی۔ لوسی شاید تمہیں علم نہیں کہ ہندوستان پہنچتے ہی میری یہی کوشش رہی کہ کسی طرح پھر تمہارے قدموں میں آجاؤں۔ پورے پچیس سال تک میں اسی کوشش میں مصروف رہا۔ اسی لئے تمہیں خط بھی نہ لکھ سکا۔ کیونکہ میرا ارادہ تھا کہ جتنی جلدی ممکن ہو خط سے پیشتر ہی میں خود پہنچ جاؤں۔ اول اول تو مجھے رخصت نہ مل سکی آخرکار جب رخصت ملی تو صاحب فراش ہو گیا اور جب صحتیاب ہوا تو جنگ سر پر آپڑی۔ میری ناکامرانی نے میرا ساتھ نہ چھوڑا خدا خدا کر کے جنگ کے زخم سے رہائی ملی تو . . . .

لوسنڈہ :۔ کیا زخمی ہو گئے تھے؟

رڈفرن :۔ ہاں یہی معمولی سا زخم جسکی وجہ سے کافی عرصہ تک زیر علاج رہا۔ چنانچہ اسی اثنا میں غدر ہو گیا۔ اس سے بھی بال بال بچا لہٰذا اس موقعہ کو غنیمت جانا۔ کہ گھر کی راہ لوں یہ میری رام کہانی ہے اب اپنی کہو لوسی تم کیسی رہیں؟

لوسنڈہ :۔ یہیں اس گھر میں اور کہاں؟

رڈفرن :۔ جانتی ہو میرے نزدیک گھر کا مفہوم کیا ہے؟ میں جب دوسرے لوگوں سے گھر کی بابت سنتا تو میرے سینے پر سانپ لوٹ جاتا۔ ہر شخص کو اپنے اپنے گھر کی یاد ستا رہی تھی۔ لیکن میری دنیا محض کرانفرڈ تک محدود تھی۔

لوسنڈہ :۔ کرانفرڈ تمہارا وطن تو نہیں ہے؟

رڈفرن :۔ کیا ہوا۔ تمہارا تو ہے نا۔ کرانفرڈ سے میرا مطلب تمہاری ذات

بھی علاوہ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں
لوسنڈہ :۔ کیا ریٹائرڈ ہونے کے تک تھک نہیں ہو گئے ؟
رڈوفرن :۔ ریٹائر ہونے کے ! میں تو آج تک اپنے آپ کو جوان خیال کرتا ہوں، اور محض اس سابقہ نہیں کو ہاں میں تبدیل کرنے کے لئے آیا ہوں۔ یہ وہی مسئلہ ہے جس نے مجھے تشکیک و ارتیاب کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان پہنچتے ہی سب سے زبردست جذبہ جو مجھے واپسی پر اکسا رہا تھا یہی تھا۔ فرض کرو میں نے تم سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اور جب کہ پھر ایکدفعہ پوچھ رہا ہوں تو کیا تمہارا جواب وہی نہیں رہیگا۔
لوسنڈہ :۔ جو کچھ میں زبان سے کہہ چکی ہوں، اس پہ سختی سے کاربند ہوں
رڈوفرن :۔ چھوڑو بھی لوسی ان باتوں کو۔ دیکھو کتنا عرصہ گزر گیا ہے۔
لوسنڈہ :۔ اب کافی مدت گزر چکی ہے۔
رڈوفرن : اس کا مطلب یہ ہوا، کہ گذشتہ را صلوات پر عامل ہوں۔
لوسنڈہ :۔ اس سے بہتر اور کیا بات ہو سکتی ہے
رڈوفرن :۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اچھا تمہارے کہنے سے "گذشتہ را صلوات" ہی سہی تاہم "آئندہ را احتیاط" تو ضروری ہے۔
لوسنڈہ :۔ کیا مستقبل میں یہیں رہائش کرنے کا ارادہ ہے ؟
رڈوفرن :۔ خیال تو ایسا ہی ہے۔ فی الحال "جارج ہوٹل" میں قیام کرونگا اس کے بعد حسب پسند کوئی خطۂ زمین لیکر یہیں رہائش اختیار کر لوں گا۔
لوسنڈہ :۔ اوہ پھر کوئی ہرج نہیں۔ دوسرے لوگوں کے گھروں میں ہم آزادی سے ایک دوسرے سے مل سکیں گے۔
رڈوفرن :۔ دوسرے کے مکانوں میں، کیسی باتیں کر رہی ہو لوسی ؟
لوسنڈہ :۔ کرنل !! تمہیں یاد ہوگا، جب تم آخری مرتبہ مجھ سے ملنے کیلئے آئے تھے، اس وقت میرے والدین دنیا میں نہ تھے۔ لیکن تمہارے چلے جانے کے بعد آج تک کوئی آدمی میرے مکان میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کر سکا۔ تم پہلے شخص ہو، جس نے میرے اصول کو شکست دی ہے۔
رڈوفرن :۔ یوں کہو کہ آج تمہیں کسی مرد کی صحبت نصیب ہو گئی
لوسنڈہ :۔ افسوس کہ یہ ایک بوڑھی اور بے حس عورت کا گھر ہے جہاں مردوں کو بار نہیں۔
رڈوفرن :۔ بوڑھی عورت جائے جہنم میں، معاف کرنا لوسی . . . وہ ایک سپاہیانہ بھول تھی، ہو گئی، مجھے تو آج بھی تم پہلے سے زیادہ حسین نظر آ رہی ہو۔ ذرا میرے دل کے آئینہ میں یہ تصویر تو دیکھو، وہی کنول کی طرح کھلا ہوا چہرہ، وہی پیپ . . پیاری نیلوفری آنکھیں۔ دل میں محبت کی تجلیاں خوابیدہ ہیں۔ نرم و نازک ہونٹوں پر وہی احمریں تبسم جلوہ افروز ہے مجھے بستر علالت پر دم مسیحا کا کام دے رہا تھا۔ خدا کی قسم آج بھی تمہارا کا بیدہ سا پیکر مرکز صد انوار ہے۔ ہندوستان میں تمہاری ہی یاد تو میرے لئے ذریعۂ سکون اور وجہ اضطراب کا باعث تھی۔
لوسنڈہ :۔ کرنل !! ذرا اپنی آنکھیں تو مل کر دیکھو۔
رڈوفرن :۔ وہ کیوں ؟
لوسنڈہ :۔ تاکہ تمہیں اصلیت نظر آئے۔
رڈوفرن :۔ لاحول ولا قوۃ !! مذاق نہیں کر رہا ہوں۔
لوسنڈہ :۔ خیر ایسا ہی سہی۔ مگر بہتر یہی ہوگا کہ آپ اپنی زندہ دلی کے لئے کوئی اور ہی مضمون شعر تلاش کریں۔ ایک عمر رسیدہ سے کیا حاصل ہوگا ؟
رڈوفرن :۔ لوسی !! تمہارے پاس آئینہ بھی ہے ؟
لوسنڈہ :۔ میں ہر روز اس میں اپنی جھریوں کو غور سے دیکھتی ہوں۔
رڈوفرن :۔ وہ آئینہ دھندلا ہوگا۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی۔
لوسنڈہ :۔ خیر ان تکلفات کو رہنے دیجئے۔ اور تشریف آوری کا اصل مقصد بیان فرمائیے۔
رڈوفرن :۔ مقصد ؟ کیوں بھولی بنتی ہو ؟ واللہ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو کچھ میں اب تک کہہ چکا ہوں، وہ محض بکواس تھی۔
لوسنڈہ :۔ یہ بات نہیں بلکہ آپ کی گفتگو مہمل سی ہے۔
رڈوفرن :۔ اچھا تو بامعنی لیجئے۔ تکلفات برطرف، میری انتہائے آرزو یہی ہے کہ آپ میری ہو جائیں، یہ دوسری دفعہ استفسار کر رہا ہوں۔ اور ایک مدت کے بعد۔ لوسی عورت کے مزاج میں تلون ہوتا ہے۔ مناسب تو یہی ہے کہ پھر غور کیا جائے
لوسنڈہ :۔ میں بہت غور کر چکی
رڈوفرن :۔ (خوشی سے اس کے قریب جا کر) لوسی !!!
لوسنڈہ :۔ شاید آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔
رڈوفرن :۔ میں سمجھ چکا ہوں کہ تمہارا ارادہ بدل چکا ہے
لوسنڈہ :۔ چارلس جب میں نے پہلی مرتبہ "نہیں" کہا تھا تو وہ میرے لبوں کی مدھم سی آواز تھی۔ حالانکہ میرا دل و دماغ اس کے

خلاف تھا۔ اس واقعہ کو ۲۵ سال گزر چکے ہیں۔ جوانی کی رعنائیاں مفقود ہو چکی ہیں۔ اب جبکہ میں "نہیں" کہہ رہی ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ میرے دل و دماغ میری گواہی دے رہے ہیں۔

رڈفرن :۔ نہیں نہیں!! آج میں اس "نہیں" کو قبول نہیں کروں گا یہاں تک کہ تمہیں مجبور نہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

لوسنڈہ :۔ تابکے؟ یہاں تک کہ پھر میں دوشیزہ بن جاؤں؟ یاد رہے کہ تمہاری بار بار کی فرمائشیں میری گذشتہ جوانی کو واپس لانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

رڈفرن :۔ مضائقہ نہیں محبت کا ثبات دل کی جوانی سے عبارت ہے۔

لوسنڈہ :۔ تمہارا دل جوان ہے؟

رڈفرن :۔ بالکل جوان یہ دل جذبات کا سمندر اور تمناؤں کا مخزن ہے۔ آج سے ۲۵ سال قبل بھی تھا اور اب بھی ہے۔ اس شفاف آئینے میں آج بھی کوئی لکیر نہیں۔ اسی طرح روشن اور چمکیلا ہے

لوسنڈہ :۔ ٹھیک ہے وہ اس لئے کہ ہندوستان کی صحت پرور فضا میں رہ آئے ہو۔ اور جنگ نے تمہیں اتنی فرصت ہی نہ دی کہ تمہارا خیال کسی اور طرف متوجہ ہوتا۔

رڈفرن :۔ بالکل غلط۔ سفید جھوٹ۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔

لوسنڈہ :۔ پھر تم نے میرے خیال کو اپنے گوشۂ ذہن میں محفوظ کر لیا ہوگا۔ جس طرح میں اپنے پھولوں کو خزاں کے غلبہ سے محفوظ کر کے حفاظت سے رکھ چھوڑتی ہوں۔ تم گاہے گاہے میری یاد کو رنگ کاری کی غرض سے دماغ سے باہر نکالتے ہوگے اور کچھ دیر تک اس پر یاد آوری کا عطر برسا کر دوبارہ ذہن میں منتقل کر دیتے ہوگے۔ یہاں تک کہ لڑائی جھگڑوں کے بعد آپس میں نیاز و ناز کی محافل آراستہ ہوتی ہوں گی۔ بایں ہمہ میری قسمت میں ایسی رعائتیں کہاں تھیں۔ اور نہ ہی مجھے ایسا کوئی گر یاد تھا جس سے نخل محبت کو سرسبز و شاداب رکھ سکتی۔ درد کی زیادتی سے زخم گہرا ہو چکا تھا۔ آخر کار وہ امتداد زمانہ سے وہ خود بخود مندمل ہو گیا۔ ہر چند وقت نے محبت کی خاموش چنگاری سے تمہارے سینہ کو گرم رکھا۔ لیکن میری آتش شوق نے مبارک کر محبت کو ہمیشہ کے لئے خاکستر کر دیا۔

رڈفرن :۔ لوسی!! اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ محبت سو جاتی ہے لیکن فنا نہیں ہوتی۔ البتہ جگانا شرط ہے۔

لوسنڈہ :۔ بہت دیر ہو گئی چارلس!! وقت گذر چکا ہے۔ بہار کی جگہ خزاں نے لے لی ہے۔ اب دل مسرت کے جذبہ سے متاثر نہیں ہوتا۔ میں تو قناعت کی آرزومند ہوں۔

رڈفرن :۔ لیکن میں؟

لوسنڈہ :۔ تم زندہ ہو، زندگی کا لطف صرف تمہارے لئے ہے۔۔۔: چارلس تکمیل زندگی کے اثاثہ تمہاری گود میں ہیں۔

رڈفرن :۔ میں نے امیدوں کے سبز محلوں میں زندگی بسر کی ہے۔ اب کیونکر اپنے ہاتھوں سے حسرت و یاس کا تیشہ لیکر ان کی بنیادوں کو منہدم کر دوں۔

لوسنڈہ :۔ ان تشنۂ تکمیل امیدوں کو یادگار میں تبدیل کر دو!

رڈفرن :۔ کیسی یادگار؟

لوسنڈہ :۔ کیسی یادگار؟ جس نے تمہارے لئے باعزت زندگی کے دروازے کھول دیئے۔ اور مجھے جیتے جی طوفان خیز امواج کے سپرد کر دیا۔

رڈفرن :۔ تو کیا میں بالکل نا امید ہو جاؤں لوسی؟

لوسنڈہ :۔ ہاں بالکل نا امید!!

رڈفرن :۔ (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) ہندوستان میں میں نے کبھی شکست کی صورت نہیں دیکھی تھی۔

لوسنڈہ :۔ اب تم انگلستان میں ہو۔ یہ انگلستان ہے کرنل!!

رڈفرن :۔ (حقارت سے) کرنل!!

لوسنڈہ :۔ (ہاتھ بڑھاتے ہوئے) الوداع چارلس!!

رڈفرن :۔ (شکستہ دلی سے ہاتھ ملاتے ہوئے) لوسی!! (لوسی اپنے سر کو جنبش دیتی ہے) الوداع!!

(رڈفرن چلا جاتا ہے۔ لوسی بیٹھی ہوئی اپنے گلے کے لاکٹ کو کھولتی ہے اور اسے بار بار چومتی ہے۔ ہیلن دبے پاؤں اندر داخل ہوتی ہے)

ہیلن :۔ کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟

لوسنڈہ :۔ (لاکٹ کو بند کرتے ہوئے) ہیلن!! کیا تم واقعی دل برداشتہ ہو گئی تھیں۔ جب میں نے کہا تھا۔ کہ تمہارا میری اندر نہیں آ سکتا!

ہیلن :۔ میرا خیال تو یہی تھا۔

لوسنڈہ :۔ لیکن اب ہیلن اسے میری طرف سے کہنا۔ وہ ایک شرط پر کہ اپنی جوتیوں کو گرد سے صاف کر کے اور کمرے میں کسی قسم کا شور و غل نہ کرے۔ اندر آ سکتا ہے

ہیلن :۔ مس ہینڈ! آپ کا بہت بہت شکریہ۔ جارج خوش ہو جائیگا۔

آپ تصور نہ کرسکیں گی۔

(ہیلن چلی جاتی ہے۔ مس بنیز موفوں کے غلاف درست کرتی ہے۔ اسی دوران میں سوسن دروازہ کھٹکھٹاتی ہے)

(سوسن داخل ہوتی ہے)

لوسنڈہ :- ہاں، اندر آؤ

سوسن :- (ہنستی ہوئی) بی صاحبہ!!

لوسنڈہ :- کیا بات ہے سوسن؟

سوسن :- اسی صاحب نے ——

لوسنڈہ :- آخر کچھ کہو گی بھی!

سوسن :- انہوں نے مجھے یہ دیا ہے (سورن دکھا کر) بیگم صاحبہ کیا میں اسے رکھ لوں؟

لوسنڈہ :- ضرور سوسن ضرور

سوسن :- انہوں نے کہا تھا کہ اسکی نئی گون خرید لوں۔ یا اپنے محبوب کے لئے کوئی تحفہ لے لوں۔ مس صاحبہ گون کی تو مجھے چنداں ضرورت نہیں۔ البتہ ایک ہم نفس کی متمنی ہوں۔ چاہے اس معاملے میں "بے شرم و بے حیا" ہی کیوں نہ کہلواؤں، کیا کروں کہ مجبور محض ہوں۔

لوسنڈہ :- سوسن تمہیں یاد ہے کہ میں نے ایک دفعہ کہا تھا، اب عشق و محبت کی داستان کو بالکل فراموش کردو۔

سوسن :- بی صاحبہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اور ہمیشہ۔۔ یاد رہیگا۔

لوسنڈہ :- سوسن!! ماشاء اللہ تم بھی نوجوان ہو۔

سوسن :- ابھی کہاں، اس نومبر کو ۲۴ سال کی ہو جاؤنگی۔

لوسنڈہ :- اسی لئے تو کہہ رہی ہوں کہ جوان ہوگئی ہو۔

سوسن :- (طنزیہ لہجے میں) جوان ہوگئی ہوں مگر کسی کی زینت آغوش ہونے کے لئے نہیں۔

لوسنڈہ :- نہیں سوسن!! میں نے تم سے یہ تو ضرور کہا تھا، کہ عشق و محبت کو خیر باد کہدو۔ لیکن اگر تمہاری نظر انتخاب کسی نوجوان پر پڑگئی ہے اور وہ تمہیں پسند آگیا ہے تو مجھے ضرور خبر کرنا۔ تاکہ میں اس کے حالات سے واقفیت کے بعد ایک ہفتہ میں ایکبار اسے اپنے گھر آنے کی اجازت دیدوں۔ بشرطیکہ اس کی ذات سے کسی قسم کی جھگڑا نی یا شور و غل نہ پیدا ہو۔

سوسن :- (لوسنڈہ کے پاؤں پر جھکتے ہوئے) بی صاحبہ خوشحال اور آباد رہو۔

لوسنڈہ :- خدا نہ کرے میں آئندہ جوان دلوں کیلئے سرمایۂ زحمت بنوں!!

مترجمہ رضیہ بیگم

فلسفہ محبت

کہا جاتا ہے، محبت جوانی کا ایک خواب ہے:

جوانی کے مٹتے ہی محبت غائب ہوجاتی ہے:

مگر اس قول کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں:

سچی محبت ایک بار پیدا ہو کر کبھی بھی مٹ نہیں سکتی:

اگرچہ اس مقدس جذبے کی شدت میں کمی ضرور واقع ہوجاتی ہے۔

سورج تمام دن چمکتا رہتا ہے اور شام کو غروب ہو جاتا ہے۔

مگر رات کو سورج کی روشنی چاند کی روشنی میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

کائنات کسی وقت بھی روشنی سے محروم نہیں ہوتی:

اس طرح انسانی زندگی محبت کے نور سے فیضیاب ہوتی رہتی ہے۔

(مترجمہ)

احمد ندیم قاسمی

نوائے ندیم

تیرے قدموں میں غرورِ شش جہات — بس یہی ہے میرے دل کی کائنات
حسن اور آئے جنوں کو پوچھنے! — لائقِ سجدہ ہے تیرا التفات
موت کی امید بھی مٹنے لگی! — مردہ و افسردہ ہے میری حیات
دل کی دھڑکن کی وہی رفتار ہے — کیا ستم سے کم ہے تیرا التفات
فرش و کرسی وجد میں آجائیں گے — سن سکے کوئی تو کہہ دوں ایک بات
تیرے دامن کا اشارا چاہیئے — ٹمٹماتی ہے مری شمعِ حیات
اشک امڈے اور پلکیں جھک گئیں — تیری آنکھوں نے سنا دی تیری بات
چاند تاروں میں تو تیرا نور ہے — کون بیٹھا ہے ورائے کائنات
زخم ہوتے ہیں دنوں میں مندمل — اور صدیوں تک چلی جاتی ہے بات
سر ہے زانو پر تو آنکھیں بند ہیں — ایک ہیں میرے لئے دن اور رات
قوتِ تعمیر ہے تخریب میں — زلزلے آئیں تو سنورے کائنات
نور و ظلمت کی حقیقت ایک ہے — روز و شب تیری خرد کے حادثات
مدتوں کے بچھڑے پھر مل جائیں گے — موت ہے دراصل روحوں کی برات

پیروی کا فن مجھے آتا نہیں
میں کہونگا اپنے دل کی واردات

نوشتہ جان کیٹس

مترجمہ سید احسان بی اے

جامِ ریحان

حسین اور سادہ دل ازبیلا اور عشق کے بیت المقدس کا ایک نوجوان راہب لورینزو ایک ہی حویلی میں رہ کر اپنے نازک دلوں کی پرکیف دھڑکنوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔ وہ جب تک ایک دوسرے کے قریب بیٹھ کر کھانا نہ کھا لیتے، ان کے لئے سیر ہو بیٹھنا ناممکن تھا۔ وہ ایک چھت تلے رہتے ہوئے اسوقت تک نیند سے ہمکنار نہیں ہو سکتے تھے۔ جب تک ایک دوسرے کی یاد میں آنسو نہ بہالیں۔

ہر صبح بلند ہونیوالا آفتاب انکی محبت کو پہلے سے بڑھا ہوا پاتا اور شام کا پہلا ستارہ اس محبت کو اور بھی گہرا اور پُر خلوص دیکھتا۔ لورینزو خواہ گھر میں ہو خواہ کھیتوں میں ازبیلا کا پیارا سراپا ہر وقت اسکی آنکھوں تلے پھرتا رہتا۔ اور لورینزو کی پرکیف تانیں ازبیلا کے لیے درختوں کی ترنم آفرینیوں اور پُر اسرار بانسری کی سحر نوازیوں سے کہیں زیادہ پرورو اور کیف بار تھیں۔

اس سے پہلے کہ دروازہ کھول کر اس حسن مجسم کو اپنی پیاری آنکھوں کی آغوش میں لے۔ لورینزو سمجھ جاتا تھا۔ کہ کسکا نرم و نازک ہاتھ دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ وہ عقاب جیسی تیز نظروں سے اسکے چہرے کو کھڑکی میں دیکھ لیتا اور جب وہ حسین چہرہ آسمان کی طرف اٹھتا تو وہ بھی آسمان کی طرف دیکھنے لگتا۔ صبح کے وقت اس کے قدموں کی مترنم چاپ کو سیڑھیوں پر سننے کی بے قراری میں وہ تمام رات انگاروں پر لوٹتا رہتا۔

مئی کا طویل مہینہ اسی ذہنی انتشار میں گذر گیا۔ اور آغاز جون نے انکے حسین چہروں پر پژمردگی دیکھی۔ لورینزو تکیے سے مخاطب ہو کر کہتا "کل میں اپنی مسرت کے سامنے سجدہ کروں گا —— کل میں اپنے دل کی ملکہ سے بھیک مانگونگا" اور ازبیلا عالم خواب میں کہتی "لورینزو! اگر تمہارے ہونٹ محبت کا راگ نہ الاپیں تو مجھے دوسری شام دیکھنی نصیب نہ ہو"

لیکن صد حیف کہ ان کے تلخ دن اسی طرح گذرتے گئے —— یہاں تک کہ گلاب کے سایے میں رہنے کے باوجود ازبیلا کے شاداب گال مرجھا گئے۔ اور اس تمنا کی ماری ماں کے گالوں کی طرح سوکھ گئے۔ جو میٹھی لوریوں میں اپنے بچے کے درد و کرب کا علاج ڈھونڈتی ہے۔ "ازبیلا کتنی پژمردہ معلوم ہوتی ہے" لورینزو کہتا "مجھے کچھ کہنا تو نہ چاہیے لیکن میں سب کچھ کہوں گا۔ اور صاف لفظوں میں اپنے دل کی رام کہانی کہوں گا میں محبت کی ان غماز آنکھوں سے چھلکتے ہوئے آنسوؤں کا ایک ایک قطرہ پی لونگا۔ کم از کم اس سے اسکے دل کی الجھنیں دور ہوجائیں گی"

ایک حسین صبح کو یہ خیال لورینزو کے ذہن میں آیا۔ اور تمام دن اسکا دل بے پناہ شدت سے دھڑکتا رہا۔ وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگتا رہا۔ کہ اسے بات کرنے کی قوت مل جائے۔ لیکن اس کے باوجود سرخی کی لہر اس کا گلا دبا دیتی۔ اور اس کی نبضیں چھوٹ جاتیں۔ ازبیلا کو بیوی بنانے کا بے باک تصور اسے بچے سے بھی زیادہ شرمیلا بنا دیتا۔ اُف! محبت کی طوفان انگیزیاں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں۔

ایک اور کرب انگیز رات کروٹیں لے لے کر گزر گئی۔ اور صبح کیوقت ازبیلا کی عقابی نگاہوں نے اسکی وسیع پیشانی کی گہری سلوٹوں میں رنج و غم کے ایک ایک نشان کو دیکھ لیا۔ پہلے وہ مردہ انسانوں کی طرح زرد معلوم ہوتا تھا۔ پھر یکدم اس کا چہرہ شرم و حیا کی سرخی سے گلگوں ہو گیا۔ یہ دیکھ کر ازبیلا نے نہایت شیریں لہجے میں کہا "لورینزو؟" اور پھر طوفانی جذبہ یکدم نسائی حجاب میں چھپ گیا۔ لیکن اس کا طرز تکلم اور اسکی نگاہیں وہ سب کچھ کہہ گئیں۔ جو کچھ کہ اسکے دل میں تھا۔

"ازبیلا میں محسوس کرنے لگا ہوں کہ میری دکھ بھری کہانی تمہارے کانوں تک پہنچنے کے قابل ہوگئی ہے اگر تم نے کبھی دنیا کی کسی چیز پر اعتماد کیا ہے تو تمہیں اسی کا واسطہ یقین جانو کہ مجھے تم سے محبت ہے میری روح آخری فیصلہ سننے کے لئے بیقرار ہے۔ میں تمہارے نازک ہاتھوں کو دبا کر تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا۔ اور نہ ہی ان مخمور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان سحر طراز نظروں کو خوفزدہ بنانا چاہتا ہوں۔ لیکن ایک اور بات کا ٹالنا میرے لئے ناممکن ہے۔ میرا جوش جنون کسی طرح بھی کم نہیں ہو سکتا —— میری روح! تم مجھے سرما کی تکلیفوں سے دو سالہ جیا دیتی ہو محترم

خاتون! تمہاری موجودگی میرے ذہن میں احساس بہار کو زندہ کر دیتی ہے میں اس پھول کو سونگھ کر رہوں گا جسکی پنکھڑیاں کیف بار صبح کے آغوش میں کھلتی ہیں۔" اس کے ہونٹ جو آجتک خاموش رہے تھے۔ بے باک ہوگئے۔ اور اسکے یاقوتی ہونٹوں سے ہم آہنگ ہوکر شعریت کی لطیف شبنم برسانے لگے۔ روحانی مسرت ان دونوں کی۔۔۔ ہمرکاب تھی۔ اور انبساط جون کے گرم جوش آغوش میں کھلنے والے پھول کیطرح بڑھ رہا تھا۔

جب وہ جدا ہونے تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ دو توام پھول چند لمحوں کے لئے جدا ہوئے ہیں تاکہ پھر ال کو ایک دوسرے کی روحانی لطافتوں میں کھو جائیں۔ ازبیلا جو ربہ حسن کی طرح باوقار اور حسین معلوم ہوتی تھی، دلکش محبت اور اندھے دیوتا کے نغمے الاپتی، اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اور لورینزو خوشی سے ناچتا اور اچھلتا ہوا غروب آفتاب کی آخری کرنوں کو پہاڑیوں کے اردگرد طلائی ہار کی طرح لپٹتا ہوا دیکھنے کے لئے چلا گیا۔

جب شام کا دھندلکا ستاروں کے حسین چہروں پر سے نقاب ہٹا دیتا اسوقت یہ دونوں ملتے ——— یہ دونوں سنبل اور سفید گلاب کے جھرمٹ میں دوسری دنیا سے اور بدنامی کی لرزتی ہوئی زبان سے بے پرواہ ہوکر ملتے۔ کاش! یہ دن ہمیشہ کے لئے اسی طرح کیف بدوش رہتے۔ اور انکی دکھبھری کہانی دنیا کے احمقوں کے لئے اکتساب مسرت کا ذریعہ بن جاتی!

تو کیا وہ رنجیدہ تھے؟ ایسا تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا! ان ہستیوں کے سلئے جن کے کارنامے سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ ہم ۔۔۔ آنسوؤں کے دریا بہا۔۔ چکے ہیں۔۔۔۔ لاتعداد آہوں کا خراج دے چکے ہیں۔ انکی موت کے بعد ان پر نوحہ خوانی کیجا چکی ہے۔ اور ہزاروں حسرت انجام کہانیاں کئی کئی دفعہ دہرائی جا چکی ہیں۔

ازبیلا کی زندگی شدید مصائب سے لبریز تھی۔ اور لورینزو کی حنوط شدہ لاش درختوں کے حرارت بیز جھنڈ میں پڑی رہتی تھی۔ لیکن پھر بھی حقیقت بدستور قائم ہے۔ کہ محبت کی سلطنت میں وقتی مسرت لاتعداد مصائب پر بھی حاوی آجاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ شہد کی مکھیاں، فدائے بہار کے دوشیزہ نغمے کی بھکارنیں۔ خوب سمجھتی ہیں کہ زہریلے پھول میں سب سے زیادہ شہد ہوتا ہے۔

حسین دوشیزہ اپنے بھائیوں کے پاس رہتی تھی۔ جو باپ، دادا کی بے شمار دولت کے مالک تھے۔ وہ بھی دولت میں اضافہ کرنے کے لئے ہزاروں بڑے ہاتھ، چراغوں کی روشنی سے منور کانوں اور کارخانوں میں اپاہج ہوجاتے تھے۔ اور وہ راتیں جو گرمی کی شدت کیوجہ سے ٹھرکتی رہتی تھیں۔ جانگداز کونڈوں سے خون بن کر بہ جاتیں ——— ان کے لئے اکثر نیم مردہ انسان چمکتے ہوئے دریا میں صبح سے شام تک کھڑے رہتے اور زرد جواہر سے بھری ہوئی کشتیاں کنارے لگاتے رہتے۔

انہیں کے لئے سیلن کے ملاح نے اپنا سانس روک لیا۔ اور عریاں جسم کے ساتھ بھوکی شارک کے منہ میں کود پڑا۔ انہیں کے لئے گروہ انسانی توتیں موت کے مہیب جبڑوں میں پس کر فنا ہوگئیں۔ محض انہیں کے لئے لاتعداد انسان لاتعداد مصائب کی وادیوں میں مارے مارے پھرتے رہے اور یہ ——— بے اعتنائی سے تقدیر کا پہیہ پھیر دیتے۔ جس سے مزدور کے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا جاتا۔

وہ کیوں مغرور تھے؟ کیا اس لئے کہ ان کے مرمریں فوارے ایک غم نصیب یتیم کی آنکھوں سے زیادہ تیزی کے ساتھ قطرے لٹاتے تھے؟ وہ کیوں مغرور تھے؟ کیا اس لئے کہ نارنگی کی پہاڑیوں پر چڑھنا۔ ایک کوڑھی کے سیڑھیوں پر چڑھنے سے زیادہ آسان تھا؟ وہ کیوں مغرور تھے؟ کیا اس لئے کہ سرخ لکیروں والے بہی کھاتے روما کے سنہری زمانے کی شاعری سے زیادہ وجد انگیز اور کیف بار تھے؟ وہ کیوں مغرور تھے؟ امارت کی شوکت و سطوت کا صدقہ ہمیں بتاؤ۔ کہ وہ کیوں مغرور تھے؟

فلارنس کے یہ دونوں فرزند ان ڈاکٹر یہودیوں کی طرح مغرور اور خود پسند ہوگئے تھے۔ جو اس سرزمین شعر و رومان میں رہنے کے باوجود چاندی سونے میں گھرا رہنے کیوجہ سے زرد رو ہوگئے تھے اور جو فقراء کو جاسوس سمجھ کر ان سے ڈرا کرتے تھے۔

بہی کھاتے کے خشک اوراق میں ڈوبے ہوئے ایسے غیر شاعر لوگوں نے کس طرح حسین ازبیلا کو شفق کی رنگین دنیا میں دیکھ لیا کیونکہ وہ لورینزو کی نظروں میں کام سے جی چرانے کا جذبہ بھانپ گئے۔ کسطرح مصر کا یہ گرم مزاج فرزند کاہل اور سست نظر آنے لگا۔ تاہم وہ سب کچھ سمجھ گئے۔ تجارت بھی کبھی کبھی شکار شدہ ہرن کی طرح پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا ہے۔

جب ہزاروں طریقوں سے ان لوگوں کو لورینزو کی محبت کا یقین ہوگیا اور انہیں یہ بھی معلوم ہوگیا۔ کہ انکی بہن اسکی محبت میں اسیر ہے تو ان دونوں نے ایک دوسرے سے اپنے خوفناک خیالات کا اظہار شروع کر دیا۔ آخر لورینزو ان کا غلام کس طرح انکی ہمشیرہ سے محبت کی رنگ رلیوں میں مشغول رہ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ چاہتے تھے۔ کہ ازبیلا کسی نواب کی بیوی بنے۔ اور اسکی وساطت سے اس نواب کے زیتون کے درختوں سے نفع اٹھانے کی سبیل نکل آئے۔

جب وہ اکٹھے بیٹھتے تو انکی حسد کی چنگاریاں بھڑک اٹھتیں۔ جب وہ تنہا ہوتے تو ہونٹ چباتے رہتے۔ آخر کچھ دنوں کے غور کے بعد انہوں نے ایک تجویز سوچ لی۔ جس سے اس بے وقوف نوجوان کو اسکی غلطی کی میزا دینے کا راستہ پیدا ہو گیا۔ مٹی کے ان سفاک پتلوں نے رحم و کرم کے گھر میں آتش بغض پھونک دیئے۔ یعنی انہوں نے لورینزو کو قتل کر کے کسی گھنے اور تاریک جنگل کی ناقابلِ عبور گہرائیوں میں دفن کر دینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

ایک خوشگوار صبح کو جب لورینزو باغ کے پل پر جھکا ہوا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آفتاب کی ابھرتی کرنوں میں نہا رہا تھا۔ یہ لوگ شبنم کو اپنے سفاک پاؤں تلے روندتے ہوئے اسکی طرف بڑھے اور بولے "ہمیں افسوس ہے کہ ہم تمہارے اس سکون میں مخل ہوتے ہیں۔ لیکن عقلندی اسی میں ہے۔ کہ ایسے ٹھنڈے وقت میں گھوڑے پر زین کس لیجائے۔ ـــ آج ـــ نہیں ـــ اسی وقت ہم اپینائن کی طرف جائیںگے اس لئے اس سے پہلے کہ شبنم کے یہ بکھرے ہوئے موتی آفتاب کے طلائی دامن میں سمٹ جائیں، نیچے اتر آؤ۔"

لورینزو نے حسبِ عادت بڑی خندہ پیشانی سے ناگن کے ان زہریلے بچوں کا استقبال کیا۔ اور جلدی جلدی پیٹی نیزہ اور شکار کے دیگر سامان سے مسلح ہونے کیلئے اندر چلا گیا۔

صحن میں سے گزرتے وقت وہ ہر قدم پر ٹھہرتا تاکہ اگر اس کے دل کی ملکہ مصروفِ نغمہ طرازی ہو تو مترنم آواز اس کی سماعت میں محفوظ ہو جائے۔ یا کم از کم ان ہلکے قدموں کی چاپ سنائی دے دے وہ اسی طرح اپنے جذبات کی فضاؤں میں اڑتا ہوا جا رہا تھا کہ اوپر کی منزل میں ایک نقرئی قہقہہ گونجا ـــ ایک ترنم ریز و موسیقی زا قہقہہ! اس نے اوپر دیکھا، ازبیلا کا دمکتا ہوا چہرہ اپنے عفت مآب دامن میں مسکراہٹوں کی جنتیں ... سمیٹے دریچے کے رخنے میں سے جھانک رہا تھا۔

"پیاری ازبیلا!" اس نے کہا: "مجھے خوف تھا کہ کہیں تمہیں صبح بخیر کہنے کی سعادت سے بھی محروم نہ کر دیا جاؤں۔ آہ! اگر تین گھنٹوں کے قلیل وقفے کی جدائی قلب و جگر کو غم و اضطرار کی چکی میں پیس سکتی ہے، تو تم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جانا کس قدر جانسوز ہوگا لیکن خوش مت کرو، ہم بھی روز روشن کی طرح جدائی کی بھیانک تاریکیوں میں نہا کر اور زیادہ نورانی ہو جائیں گے۔ خدا حافظ پیاری

ازبیلا نے کہا "خدا حافظ!" اور جب لورینزو جانے کے بعد تو ازبیلا کے ہونٹوں پر ایک وجد آور نغمہ تھرک رہا تھا۔

اس طرح دونوں بھائی اور بدنصیب محبِ فلورنس حسین وادیوں میں سے ہوتے ہوئے اسطرف چل دیئے۔ جہاں ... اپنی اٹکھیلیوں سے ترنم کے دریا بہاتی لہروں کی مترامن ... کو کاٹتی سیدھے کناروں میں سے ہوتی ہوئی گزرتی ہے۔ دو بھائیوں کے گھبرائے ہوئے چہرے یکسر زرد ہو گئے تھے۔ لیکن لورینزو کے چہرے پر پاک محبت کا لافانی نور کھیل رہا تھا۔ ... ندی پر سے گزر کر ایک بھیانک جنگل میں پہنچ گئے۔ جس کی ... خاموشی خوفناک کاروائیوں کے لئے موزوں ترین تھی۔

اسی جگہ لورینزو کو قتل کر کے دفن کر دیا گیا۔ آہ! اس جنگل کی تاریک وسعتوں میں محبت کے ایک عظیم الشان شعلے کو بجھا ... افسوس! جب روح اس طریقے سے عناصر کی قید سے آزاد کی جائے، تو وہ گناہ سے شکاری کتوں کی طرح بیقرار ہو جاتی ہے۔ ان قاتلوں نے اپنی تلواروں کو ندی کے پانی سے دھو لیا۔ اور گھوڑوں کے پہلوؤں کو اپنی گھبرائی ہوئی ایڑیوں سے زخمی کرتے ہوئے گھر کی طرف چل دیئے۔ دونوں قتل کے نشے میں سرشار تھے۔

گھر پہنچ کر انہوں نے اپنی بہن کو بتایا، کہ لورینزو کو کسی ... کام کی وجہ سے یکایک جہاز پر سوار ہو کر غیر ممالک میں جانا پڑا۔ بدنصیب لڑکی ہو گی کا لباس پہن لے۔ اور خدا سے امید کے ... نچوں سے دور بھاگ جا۔ آج تو اسے نہ دیکھ سکے گی، اور نہ کل، ... تیری طرف دیکھ کر مسکرائے گا۔ اور پرسوں کا دن تیرے لئے ... اور سسکیوں کا دن ہوگا۔

وہ اس خوشی کے لئے آنسو بہا رہی ہے۔ جو اسے کبھی ... حاصل نہ ہو گی۔ وہ روتی رہی، یہاں تک کہ شام کے دھندلکے نے ... کو اپنے سائے میں لے لیا۔ اور پھر ـــ آہ! وہ محبت کے ... پر سونے کی بجائے فراوانیٔ دولت کے طلائی کانٹوں پر تڑپتی رہی۔

اسکی نگاہیں شام کی بڑھتی ہوئی تاریکیوں میں اپنے ... سراپا دیکھتی رہیں ... بار بار ایک ہلکی آہ اس کے ہونٹوں تک ... دم توڑ دیتی۔ وہ اپنے حسین اور متناسب بازو ہوا میں پھیلائے ... اپنے بستر پر لیٹ کر زیر لب کہتی "یہاں ہو، آہ کہاں ہو؟"

جس طرح خزاں کے وسطی زمانے میں ... خوفناک کاروں سنائی دینے لگتی ہیں ... مشرق سنہری ...

ایک مسلسل کمین میں مشغول ہو جاتا ہے۔ اور جھاڑیوں کی تہوں میں تو ت
ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے لگتا ہے۔ تاکہ اپنے مشرقی غار سے نکلنے سے پہلے
پیدا ہو جائے۔ اسی طرح حسین ازبیلا آہستہ آہستہ حُسن کی
ندوں سے گر لی گئی۔

کیونکہ لورینزو واپس نہیں آیا تھا۔ وہ کبھی کبھی اپنی زرد آنکھوں
تا ہوں رکھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اپنے بھائیوں سے
پوچھتی کہ لورینزو کونسا ایسا کام تھا۔ جس نے اسے اتنی دیر تک غیر
میں روک رکھا ہے۔ اور وہ اسے خاموش کرنے کیلئے ایک
نی قصہ سنا دیتے۔ لیکن اس کی زندگی کا تاریک گناہ کثیف دھوئیں کی
طرح اس کی زندگی کے ہر شعبہ پر مسلط ہو چکا تھا۔ اور وہ رات کو سوتے
ت اپنی بہن کو بے رقائی کفن میں لپٹا ہوا دیکھ کر چیخ اٹھتے

وہ اس نشۂ آدم بے خودی سے مر گئی ہوتی۔ لیکن ظالم تقدیر نے اسے
کا خوفناک ترین چیز کے دیکھنے کے لئے زندہ رکھا۔ یہ چیز تھی ایسی دوا
ایک ایسے گھونٹ کی طرح جو موت کی سسکیاں لیتے ہوئے بیمار
چند لمحوں کے بعد کفن کی خوفناک چادر میں لپیٹ دے۔۔۔۔ ایک بیہودہ
ملے کی طرح جو دھوپ سے بھرے ہوئے کمرے میں سوتے ہوئے،
مریض؛ ذہن کو ایک بے پناہ چبھن کے ساتھ بیدار کر دے۔ اور اسے
اپنی کرب کا احساس کرا دے۔

یہ ایک خواب تھا ——— آدھی رات کی بھیانک تاریکیوں میں
س نے دیکھا کہ لورینزو اس کی چارپائی کی پائنتی پر کھڑا ہے۔ اس کی آنکھوں
سے آنسوؤں کی برکھا لگ رہی ہے۔ جنگلی قبر کی خوفناک افسردگی نے
س کے بالوں کی وہ چمک دمک چھین لی تھی۔ جو کبھی سورج کی آنکھ
منور کر دیتی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر موت کی سرد مہر ثبت ہو چکی تھی۔
اس کی آواز کا ترنم لٹ گیا تھا۔ اور اس کے خوبصورت گوشوارے آنسوؤں
کے بوجھ سے وزنی معلوم ہونے لگے تھے.

جب زرد و افسردہ سائے نے بولنے کے لئے زبان کھولی تو ازبیلا
کو اس کی آواز میں اجنبیت سی محسوس ہونے لگی۔ اس کی رقت خیز آواز
زندگی کی روانی اور مٹھاس کو واپس لانے کی بے سود کوشش میں
مصروف تھی۔ ازبیلا اس آواز کے ترنم کو دوبارہ سننا چاہتی تھی۔ اس
آواز میں رعشہ زدہ فرد کے بربط کے شکستہ تاروں کی درد انگیز کپکپا
ہٹ تھی۔ اس میں سے ایک بڑا ہی دھیما ترنم سنائی دیا۔ جو آدھی رات
کے وقت آتش فشاں پہاڑ کے شعلوں میں سے گزرنے والے تیز ہوا کے
جھونکوں کی آواز سے مشابہ تھا.

اس کی آنکھیں اگرچہ دہشت ناک تھیں۔ تاہم ان میں محبت کی چمک
ابھی تک مستور تھی۔ اسی سحر آفریں چمک نے اس ننھی بدنصیب لڑکی کو
خوف و ہراس کے پنجوں سے بچا لیا۔ لورینزو کی روح تاریک ماضی پر سے
خوفناک پردے اٹھاتی رہی۔ غرور و نخوت کے قاتلانہ عزائم۔ جنگل کی تاریک
چھت —— اور مٹی کی سرد غار —— جہاں اسے ایک لفظ کہے بغیر اپنے
آپ کو خونی برچھیوں کے حوالے کر دیا تھا.

اس نے یہ بھی کہا "میری پیاری ازبیلا! میرے سرہانے صرف
جنگلی بیریاں۔ اور میری پائنتی پر بڑے بڑے پتھر رکھے ہوئے ہیں۔ میرے ارد
گرد چشموں کے درخت سوکھے پتوں اور خاردار پھلوں کی بارش کرتے ہیں
بھیڑوں کے ریوڑ کی آواز دریا کے اس پار سے میری آرامگاہ تک آتی ہے
آؤ اور میری سونی قبر پر ایک آنسو بہا جاؤ۔ تمہارا یہ آنسو میری موت
کی ساری تلخیاں دور کر دے گا

"اب میں ایک سایہ بن گیا ہوں۔ افسوس افسوس! اور انسانی
فطرت کے بعید ترین گوشوں میں تنہا ہوں۔ میرے ارد گرد زندہ انسانوں
کی دھیمی آوازیں بند ہو جاتی ہیں۔ اور میں تنہا مقدس گیت گاتا ہوں۔ شہد
کی چمکدار مکھیاں بھنبھناتی ہوئی مرغزاروں کی طرف جاتی ہیں۔ اور عبادت
گرجوں کی مترنم آوازیں زندگی کی یاد کو تازہ کر کے میرے سینے میں بھالے
بھونک دیتی ہیں۔ اب یہ سب آوازیں میرے لئے غیر مانوس ہو جاتی
ہیں۔ اور تم مجھ سے بہت دور زندگی کی رنگین وادیوں میں رہتی ہو۔

میں جانتا ہوں کہ ماضی میں کیا ہوا تھا۔ اور حال بھی میری نگاہوں
کے سامنے ہے۔ اگر روحیں غصے سے دیوانی ہو سکتی ہیں، تو میں بھی بہت جلد
پاگل ہو جاؤں گا۔ باوجودیکہ میں زندگی کے لذائذ کو بھولتا جا رہا ہوں،
تمہارے چہرے کی یہ افسردگی میری قبر کو اس طرح منور کر دیتی ہے۔ گویا
نورانی سمندر کا کوئی طلسمی ہیرا میرے پاس ہو۔ تمہارے چہرے کی زردی
میرے دل و دماغ کو مسرت کے لافانی نور سے بھر دیتی ہے۔ تمہارا حسن
میری رگ رگ پر مسلط ہو جاتا ہے۔ اور میں ایسا محسوس کرنے لگتا ہوں
کہ محبت نو وارد بھالوں کی طرح میری روح میں پیوست ہو جاتی ہے"

روح نے ایک دردناک آہ بھر کر کہا "الوداع" جس طرح پرواز
آلام زمانہ، اور کسی ناشکور کا خیال ہماری جوانی کی راتوں سے نیند
چھین کر ہمیں موسیقی کے زیر و بم میں پناہ لینے پر مجبور کر دیتا ہے اور پر کیف
دھندلکا پیچ و تاب کھانے لگتا ہے۔ اسی طرح روح بھی تحلیل ہو کر دھندلکے
فضا میں ایک ہلکا سا ارتعاش چھوڑ کر غائب ہو گئی۔ مغموم ازبیلا کی آنکھیں
میں درد ہونے لگا۔ اور وہ پو پھٹنے تک تاب کھاتی رہی۔

"ہاہا" اس نے کہا: "میں زندگی کے ان شدائد سے ناآشنا تھی میرا خیال تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا دکھ معمولی سی خلش سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا میں سمجھتی تھی کہ قسام ازل نے کسی خوشی کے وقت یا اپنی مخالف قوتوں سے لڑتے وقت جوش میں آکر ہم دونوں کی مسرت کا بہترین حصہ بخشا ہے لیکن مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ اس دنیا میں جرائم بھی ہیں۔ ایک جانی کا خونچکاں خنجر بھی ہے! عزیز روح! تم نے میری معصومیت کو چالاکی میں بدل دیا ہے۔ میں آؤں گی تمہاری آنکھوں پر بے شمار بوسوں کی بارش کروں گی۔ اور صبح شام آسمان کی بلندیوں پر تیرا استقبال کیا کروں گی۔"

پوچھنے سے پہلے اس نے پوشیدہ طور پر اسی جنگل میں جانے کا طریقہ سوچ لیا۔ اس نے یہ بھی سوچ لیا۔ کہ کس طرح وہ عزیز ترین مٹی ڈھونڈ لے گی۔ ان ذروں کو کس طرح میٹھی لوریاں سنائے گی۔ اور پھر جب اس خواب کی تعبیر اس کی آنکھوں کے سامنے آجائے گی۔ تو کیونکر اس کی مختصر غیر حاضری معاف کر دی جائے گی۔ یہ سوچ کر اس نے ایک بوڑھی آیا کو ساتھ لیا، اور اس گھنے تاریک جنگل کی طرف چل دی۔

دیکھئے وہ ندی کے کنارے کنارے چلتے ہوئے کس طرح بڑھیا کے کانوں میں ہولے ہولے باتیں کرتی ہے۔ اور پھر کس طرح سہمی ہوئی آنکھوں کے ساتھ چاروں طرف دیکھ کر اسے ایک خنجر دکھاتی ہے: "بیٹا یہ کیسا فرزانہ شعلہ تیرے سینے میں بھڑک رہا ہے ——— یہ تمہارا بار بار مسکرانا کیسی خوشی کا آئینہ دار ہے؟" شام تک انہوں نے لورینزو کی خاکی آرامگاہ کو ڈھونڈ نکالا۔ پتھر کے ٹکڑے بھی وہیں تھے۔ اور سرخ جنگل بیر بھی!

کون ایسا متنفس ہے، جو سرسبز قبرستان میں نہیں گیا۔ اور جس کا تصور ایک عظیم الجثہ چھچھوندر کی طرح مٹی کے ڈھیروں اور رنگین پردوں میں سے گذرتا ہوا، کھوپڑی کی سوختہ استخوان اور کفن میں لپٹی ہوئی گلی سڑی ہڈیوں کو دیکھنے کے لئے قبر کے اندر نہیں پہنچا۔ اور پھر موت کے منحوس سایے تلے آکر بگڑی ہوئی صورتوں کو ترحم خیز نظروں سے دیکھ کر انہیں دوبارہ زندگی اور روح سے آشنا کرنے کے لئے بے چین نہیں ہو گیا۔ لیکن یہ سب بے چینی اور حسرت اس جذبۂ کرب کے سامنے ہیچ ہو جاتی ہے۔ جو ازبیلا نے لورینزو کے قریب دو زانو ہوتے وقت محسوس کیا۔

اس نے تازہ کھدی ہوئی مٹی کی طرف دیکھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک ہی نظر میں سارے راز طشت از بام ہو گئے ہیں۔ جس طرح نگاہیں کنویں کے شفاف پانی کی تہ میں سب کچھ صاف دیکھ لیتی ہیں، اسی طرح ازبیلا نے بھی قبر کی گہرائیوں میں دبے ہوئے زرد اعضاء کو صاف دیکھ لیا۔ وہ اس خونی مقام پر کھڑی ہوئی کسی خشک بیل کا مرجھایا ہوا گل

نظر آتی تھی۔ وہ چند لمحوں کیلئے کھڑی رہی، پھر دفعتاً جھکی اور اپنے پنجۂ نشتر سے زمین کھودنے لگی۔

جلد ہی اس مٹی میں سے ایک دھبہ دار دستانہ برآمد ہوا۔ جس پر ازبیلا کے اپنے ہاتھوں سے سرخ ڈورے سے مختلف نقوش کڑھے ہوئے تھے۔ ازبیلا نے سنگ مرمر سے زیادہ سرد ہونٹوں کے ساتھ اسے چوم کر اپنے سینے کے پاس رکھ لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ بچے کو بہلانے کا یہ معمولی کھلونا اب سرد ہو کر ہڈیوں میں جم گیا ہے۔ لیکن پھر بھی ازبیلا اپنے کام میں مشغول رہی۔ اور بکھری ہوئی زلفوں کو ماتھے پر سے ہٹانے کے سوا وہ ایک لمحے کے لئے بھی نہ رکی۔

بوڑھی آیا دیر تک قریب کھڑی دیکھتی رہی، آخر اس کا دل اس روح خراش منظر کو دیکھ دیکھ کر پانی پانی ہو گیا۔ اور اس نے بھی اپنے برف جیسے سفید بالوں کے ساتھ جھک کر اس وحشت زا کام میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ آخر تین گھنٹے کی مسلسل محنت کے بعد قبر کا پچھلا حصہ برآمد ہوا۔ کس قدر خوفناک منظر تھا! لیکن ازبیلا کی آنکھوں میں اب بھی کوئی آنسو نہیں تھا۔

سرسین کی تلوار سے بھی زیادہ کند آلے کے ساتھ ان لوگوں نے کسی غیر انسانی مخلوق کا سر نہیں کاٹا تھا۔ بلکہ یہ سر تھا، ایک ایسے شخص کا جو موت کے بعد بھی اس طرح حلیم الطبع معلوم ہو رہا تھا۔ جس طرح وہ زندگی میں تھا۔ پرانے زمانے کے شعراء کا قول ہے۔ کہ محبت کبھی نہیں مرتی، بلکہ یہ لافانی شہزادی ابدالآباد تک زندہ رہتی ہے۔ لیکن اگر محبت کا مجسمہ موت کے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے ہو بھی سکتا ہے تو ازبیلا انہیں ٹکڑوں پر بوسوں کی بارش کرتی رہی۔ اور ہولے ہولے آہیں بھرتی رہی۔ یہ محبت کا وجود تھا ——— سرد مردہ۔ لیکن اب بھی اس کی حکومت دل پر تھی۔

وہ اسے پوشیدہ طور پر لے گئی۔ اور یہ بیش بہا خزانہ ازبیلا کے لئے وقف ہو گیا۔ اس نے طلائی کنگھی سے اس کے ایستادہ بالوں کو سنوارا آنکھوں کے سیاہ حلقوں کے ارد گرد نوکیلی بھنویں تیروں کی طرح تن کر کھڑی ہو گئیں۔ بہتے ہوئے دھارے کی طرح ٹھنڈے آنسوؤں سے اس نے کٹی ہوئی گردن پر جمے ہوئے گوشت کے بدنما لوتھڑوں کو صاف کیا وہ ہر لحظہ ان بالوں میں کنگھی کرتی، اور آہیں بھرتی ——— وہ ہر لمحہ اس پر بوسوں کی بارش کرتی، اور آنسو بہاتی۔

پھر اس نے اس سر کو ایک ریشمی رومال میں لپیٹ دیا۔ جو بہار کے خوشبودار پھولوں سے مشام نواز عطر میں بسایا گیا تھا۔ ازبیلا نے اس معطر خزانے کو ایک پیالے میں رکھ دیا۔ اور اسے باغ کے ایک گوشے

میں دفن کر دیا۔ اس میں اس نے ریحان کے ننھے ننھے سبز پھول اُگائے جو اس کے آنسوؤں سے ہمیشہ تر رہتے تھے۔

چاند سورج ستاروں کا عکس بھی اس کے ذہن سے مٹ گیا۔ ہرے درختوں کی جھومتی ہوئی ٹہنیوں پر جھکا ہوا نیلگوں آسمان اس کے دماغ سے محو ہو گیا۔ وہ پانی سے بھری ہوئی شفاف جھیلوں کو بھول گئی اور سرد خزاں کی تند و تیز ہوائیں اس کے لئے بے معنی ہو گئیں لیکن ریحان کے خوشبودار پھول ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے رہتے۔ وہ انہیں اپنے آنسوؤں سے سیراب کرتی رہتی۔

کئی دن گزر گئے۔ اور وہ برابر اس نازک پودے کو اپنے نازک آنسوؤں سے سینچتی رہی یہاں تک یہ پودا خوب پھول کر ترو تازہ ہو گیا یہ پھول اتنے خوبصورت اور خوشبودار تھے کہ فلارنس بھر میں ان کا مثل ملنا ناممکن تھا کیونکہ یہ پھول خوراک حاصل کرتے تھے انسانی خون سے اور ایک انسان کا فنا ہوتا ہوا سر کھاد کی طرح استعمال ہوا تھا الغرض یہ قیمتی ہیرا عنبر بار ہستیوں کی صورت میں پھوٹ پڑا۔

اے حزن کے دیوتا! چند لمحوں کے لئے ٹھہر جا۔ موسیقی — موسیقی! ملال کی آہیں بھرا اے آہ کی دیوی! اے حزن و ملال کے شعلو! اپنے سر اٹھاؤ اور مسکراؤ۔ اپنے افسردہ سر اٹھاؤ، اور اپنے خوفناک صندوق میں زرد مدہوشی کے دھبے بکھیر دو۔ تاکہ تمہارے افسردہ مزار نقرئی روشنی کے وحشت افزا دھبوں کے سایوں میں آ جائیں۔

اے افسردگی کی تانو! غمزدہ میلیاتن کی گلے کی آہیں بنکر نکلو! بربط کے المیہ تاروں پر تھرتھراؤ اور اس کی موسیقی میں اسرار کی شراب بھر دو۔ کیونکہ سادہ دل ازبیلا جلد سے جلد موت کے کریہہ جبڑوں میں جانے والی ہے۔ وہ ایک ایسے کھجور کی طرح مرجھا رہی ہے۔ جس کو کسی ظالم نے اسکے خوشبودار شہد کے لئے کاٹ دیا ہو۔

آہ! چھوڑ دیجئے۔ اس کھجور کو مرجھا کر سوکھ جانے کیلئے اور موت کے دکھیا سانسوں میں سردی کی منجمد کر دینے والی تندی کو اس کے قریب نہ آنے دیجئے! اس کے بھائیوں: دولت کے کتوں نے اس کی مردہ آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کے مسلسل تار کو دیکھ لیا۔ اس کے رشتہ داروں میں سے چند شخص عبرت حیرت میں تھے۔ کہ حسن و جوانی کا ایسا مرکز ایک نواب کی ہونے والی بیوی کے ہاتھوں یوں مٹی میں مل رہا ہے۔

[illegible] کو حیرت تھی کہ وہ کیوں ریحان کے پودے کے قریب گھٹا رہتی [illegible] یہ پھول اس سرعت سے بڑھ رہے ہیں کہ ان کے جادو کے پھولوں کا گمان ہونے لگتا ہے۔ یہ عجیب و غریب باتیں ان کی سمجھ سے کوسوں دور تھیں! انہیں کسی طرح بھی یہ یقین نہیں آسکتا تھا۔ ریحان کا یہ چھوٹا سا جام ازبیلا کو اپنی حسین جوانی اور مسرت سے چھلکتی ہوئی عمر بلکہ گزشتہ محبت تک کو بھلا دینے کی قوت رکھتا ہے۔

اس لئے وہ اس راز کو طشت از بام کرنے پر تل گئے۔ وہ دیر تک کسی موزوں موقع کی بے سود جستجو کرتے رہے لیکن ازبیلا ہر وقت پودے کے قریب بیٹھی رہتی تھی۔ نہ ہی وہ گرجے میں جاتی، اور نہ ہی بھوک و پیاس کی بلا اسے اس جام سے علیحدہ کرنے میں کامیاب ہوتیں۔ اگر وہ کہیں جاتی تو اس پرند کی طرح، جو اپنے انڈوں پر واپس آنے کیلئے بیقرار ہے، فوراً واپس چلی آتی۔ وہ مرغی کے صبر و سکون کے ساتھ ریحان کے پھولوں کے قریب بیٹھی اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کی برکھا برساتی رہتی!

لیکن اس حفاظت کے باوجود ان ظالموں نے جام ریحان چرا کر اسے کسی خفیہ مقام پر لے جانے کا انتظام کر لیا۔ پیالے کے اندر رکھی ہوئی چیز گرگانی کی سبزی اور زرد دھبوں سے ناقابل شناخت ہو چکی تھی۔ تاہم ان کی نظریں تاڑ گئیں۔ کہ یہ لورینزو کا سر ہے۔ انہیں قتل کا معاوضہ مل گیا۔ اس لئے وہ اسے ساتھ لیکر فلارنس سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے چلے گئے۔ وہ ایک بیگناہ کے قتل کا بوجھ کندھوں پر اٹھائے غریب الوطنی کی ٹھوکریں کھانے کیلئے فلارنس سے نکل گئے۔

اے حزن کے دیوتا! آنکھیں پھیر لے اس طرف سے۔ موسیقی! موسیقی! المیہ نغمے! اب، افسردگی کے شعلو! الوداع نہ گاؤ۔ کیونکہ ازبیلا حسین ازبیلا ایک بڑی ہی غیر مکمل موت مرے گی۔ یہ ظالم اس سے جام ریحان بھی چھین کر لے گئے ہیں —

وہ مردہ اور بے روح چیزوں کی طرف ترحم خیز نظروں سے دیکھتی ہوئی اپنے گمشدہ جام ریحان کا پتہ پوچھتی، وہ اپنی آواز کے الم انگیز تاروں پر گاتی، اور آوارہ راہب سے پوچھتی کہ اسکا جام ریحان کہاں ہے۔ اور وہ کیوں اسکی نظروں سے چھپا دیا گیا ہے؟ آہ یہ کسقدر ظلم ہے۔ وہ کہتی "میرا جام ریحان بھی مجھ سے چھین لیا گیا!"

وہ آخری دم تک جام ریحان مانگتی، تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ فلارنس میں کوئی متنفس ایسا نہ تھا جس نے اس کی محبت کی پائمالی پر آنسو نہ بہائے ہوں۔ اس کی کہانی کی افسردہ بہری لوگوں کی زبانوں پر سے [illegible] فقیر پر چھپ گئی۔ اب تک گاؤں میں یہ گیت سنا جاتا ہے "آہ! یہ کیا ظلم ہے، میرا جام ریحان بھی مجھ سے چھین لیا گیا!"

اثر چکوالی

دعوتِ رنگیں

آ، دادِ حُسن و عشق دیں تاروں کی چھاؤں میں

رُسوائی کے خیال کو دل سے نکال کر
مجبوریوں کو کیف کے سانچے میں ڈھال کر
رسم و رہِ حیات کو ٹھکرا کے بیدریغ
مستی میں جھوم جھوم کے لہرا کے بیدریغ
چہروں پہ لے کے تازہ امنگوں کا نور سا
دل میں بسا کے اک جہاں کیف و سرور کا
اُلفت کی آگ سے غمِ ہستی کو پھونک کر
عقل و شعور و ہوش کی بستی کو پھونک کر
میٹھے سروں میں گا کے محبت کی راگنی
دوڑا کے ہر نفس میں جوانی کی لہر سی
آنکھوں میں لے کے ایک صنم خانۂ نشاط
بے احتیاطیوں میں بہا کر ہر احتیاط
کیفیتِ جنوں کی شرابوں سے جھوم کر
اک دوسرے کو فرطِ محبت سے چوم کر

آ، دادِ حسن و عشق دیں تاروں کی چھاؤں میں

میرزا ادیب

ایک شام

"کریمن!"

شیخ صاحب کی گرجتی ہوئی غضبناک آواز فضا میں گونجی۔ بوڑھی کریمن کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا، اور وہ کمرے میں دبک کر یہیں قطروں سے" اور مٹھی تھیلی کو دیکھنے لگی۔

"اب تمہارا کیا کام یہاں؟" شیخ صاحب اپنی چھڑی گھماتے ہوئے بولے

"بیمار تھی شیخ جی!" بڑھیا نے نحیف و نزار آواز میں کہا

"بیمار! ہر روز یہی بہانہ بے شرم کہیں کی!"

"بیمار تھی شیخ جی ―― سچ کہتی ہوں"

"اور میں بھی سچ کہتا ہوں اب تو یہاں نہیں رہ سکتی منیر فیروزہ سے بعد اس کا حساب صاف کر دے۔ ہم باز آئے اس ملازمہ سے"

کریمن کے ہاتھ سے ریشمی کا گچھا جس سے وہ تھیلی باندھ رہی تھی زمین پر گر پڑا، اور اسے ایسا محسوس ہوا، کہ وہ کسی تاریک کنوئیں میں گر پڑی ہے اس کے آقا کی غضبناک آواز اس کے کانوں میں اس طرح گونج رہی تھی، جس طرح آندھی کے تیز و تند جھونکے قبرستان کی کسی پرانی اور ٹوٹی پھوٹی دیوار سے ٹکرا کر شور پیدا کر رہے ہوں۔

"ایک دن بہانہ۔ دو دن بہانہ۔ مگر تم تو پکی بے شرم ہو چکی ہو جس وقت لوگ کام کر کے گھروں کو جاتے ہیں۔ اس وقت آپ مٹک مٹک کر کام کرنے کے لئے تشریف لاتی ہیں۔ مہربانی کر کے ہمیں اب معاف کیجئے"

بڑھیا نے بولنا چاہا، عذر پیش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی آواز رک گئی، اس نے سرد آہ بھری اور اس کے تمام جذبات آنسوؤں میں تبدیل ہو کر اسکی پلکوں پر اس طرح لرزنے لگے، جس طرح چاند کے قریب گزرتے ہوئے سیاہ بادل کا کوئی گوشہ روشن ہو جائے۔

دو چار اور باتیں کر کے شیخ صاحب اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اب دالان میں سوائے کریمن کے اور کوئی بھی نہ تھا۔ دو تین منٹ وہ گم سم پتھر کی مورتی بنی بیٹھی رہی۔ اسکی نگاہوں کے سامنے فضا میں تاریکی کے بادل منڈلاتے رہے۔ نہ معلوم وہ کب تک اس طرح بیٹھی رہتی کہ منیر نے اس کے ہاتھ میں چند سکے رکھ دیئے۔ یہ بڑھیا کی کئی ماہ کی دو [illegible] کا اجر تھا۔

"یہ چار روپے سات آنے ہیں" منیر نے کہا۔

اس کے جواب میں بڑھیا نے سکوں کو ایک میلے کچیلے رومال میں باندھ کر جیب میں ڈال لیا۔

"نو آنے انہوں نے کاٹ لئے ہیں!" منیر نے سرگوشی کے لہجے میں کہنا شروع کیا "وہ کہتے ہیں تم نے ایک پلیٹ اور ――"

بڑھیا نے آہ بھری، ایک قطرہ اشک اسکی آنکھوں سے نکل کر اس کے رخسار کی جھریوں میں ڈوب گیا۔

"اب تم چلی جاؤ گی اماں!"

"ہاں بیٹا! مجھے جانا ہی پڑ گیا، انہوں نے مجھے نکال دیا ہے ―― اپنے گھر سے نکال دیا ہے" یہ کہکر بڑھیا اٹھی اور دروازے کی طرف چلنے لگی منیر وہیں کھڑا رہا۔ یکایک اوپر سے شیخ صاحب کی آواز آئی "ادھر آؤ منیر" منیر جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا سیڑھیوں کی طرف جانے لگا۔ بڑھیا نے دروازے کے پاس پہنچ کر دیواروں پر، کھڑکیوں پر، اور فرش پر الوداعی حسرت انگیز نظر ڈالی، اور دروازے سے نکلنے لگی۔ ادھر کھڑکیوں کو جنبش ہو رہی تھی بیگم صاحبہ اور دوسرے گھر کے آدمی بدقسمت بڑھیا کو رخصت ہوتے دیکھ رہے تھے، مگر شیخ صاحب کے ڈر سے ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکال سکتے تھے۔

آج سے نو سال قبل بڑھیا بڑے آرام اور چین کے ساتھ زندگی بسر کر رہی تھی، یکایک اس کا وفادار رفیق حیات جس نے بیس سال تک اس کی زندگی کا ساتھ دیا تھا، چند ہفتے بیمار رہ کر چل بسا۔ کریمن کی دنیا اندھیرے میں ڈوب گئی۔ مگر اس اندھیرے میں بھی روشنی کی ایک لہر نمودار تھی، اور یہ روشنی کی لہر اس کا چودہ سالہ بیٹا تھا۔ ماں کی تمام دنیا سمٹ سمٹا کر بیٹے کے وجود میں سما گئی تھی۔ بیٹا ہی، شوہر کی وفات کے بعد اسکی تمام امیدوں کا مرکز، اسکی تمام مسرتوں کا سرچشمہ تھا۔ ریاض ہی اسکی تاریک دنیا کو روشن کر رہا تھا۔ ریاض ہی کے دم سے وہ زندہ تھی ―― زندہ رہنے کی آرزو مند تھی۔ مگر بدقسمتی نے دوبارہ حملہ کیا۔ اور یہ حملہ پہلے حملے سے زیادہ شدید زیادہ بے رحمانہ، اور زیادہ تباہ کن تھا۔ اسکا نوجوان بیٹا.... مسلسل زیادہ بیمار رہ کر دنیا سے رخصت ہو گیا۔ گھر میں جو کچھ اثاثہ تھا۔ وہ بیٹے کی بیماری میں اٹھ گیا۔ اور جب بیٹے نے دنیا سے منہ موڑا، تو گھر میں ایک پیسہ بھی [illegible]

سال تک تو زخم نصیب بیوہ گھر کے برتن وغیرہ بیچ بیچ کر گزارہ کرتی رہی اور پھر بالکل محتاج ہو کر شیخ صاحب کے یہاں ملازم ہو گئی۔ اس طرح بھوکے ماتی دن گزرنے لگے۔ کریمن نے انتہائی کوشش کی کہ اس کے فرائض میں ذرہ بھر کوتاہی نہ ہو۔ مگر بوڑھے بازو مشین نہیں بن سکتے تھے شیخ صاحب کبھی کبھی اسے جھڑکنے لگے۔ اور یکایک ایک دن یہ معاملہ جھڑک سے آگے نکل کر گالی گلوچ تک جا پہنچا۔ بات یہ ہوئی کہ ملک بخش اپنا مکان بیچ کر چلے گئے۔ اور جاتی دفعہ اپنی نوکرانی کو جواب دے دیا ان کی نوکرانی نازو اپنے شہر میں جانے سے پہلے دو ایک دن کے لئے شیخ صاحب کے ہاں کام کرنے ٹھہر گئی۔ شیخ صاحب کو نازو کا کام بہت پسند تھا۔ کیونکہ وہ نوجوان تھی۔ بات کرنے کا سلیقہ جانتی تھی، اور کام بھی نہایت احتیاط کے ساتھ کرتی تھی! ادھر یہ بیوہ تھی، کمزور بوڑھی اور بیمار منیرنے کریمن سے تنہائی میں کہہ دیا تھا۔ "شیخ صاحب نازو کو اپنے ہاں رکھنا چاہتے ہیں —— سمجھ لیا نا —— یہ بات ہے؟"

کریمن نے سب کچھ سنا، سب کچھ سمجھا، پھر بھی وہ کام کرتی رہی۔ آخر کام نہ کرتی، تو پیٹ کہاں سے بھرتی۔ مگر دو تین دن سے وہ سخت بیمار تھی۔ اس لئے وقت کی پابندی نہیں کر سکتی تھی اور اس کا نتیجہ —— آج وہ گھر سے نکال دی گئی۔!

آج اس کی زندگی کا آخری سہارا بھی اس سے چھن چکا تھا —— زندگی کی آخری امید بھی ٹوٹ چکی تھی۔ وہ سرخ چبوترے پر اپنا پاؤں رکھے چند منٹ کھڑی رہی۔ پھر آگے چلنے لگی۔ اس کا دل بے اختیار چاہتا تھا، کہ تنہائی میں جا کر اتنا روئے —— اتنا روئے کہ اس کی زندگی آنسوؤں میں بہ جائے۔ رونے کا خیال آتے ہی اس کی پژمردہ آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔ اس نے پھٹی پرانی قمیص کے دامن سے آنسو پونچھے بے کسی کے عالم میں آسمان کی طرف دیکھا۔ اور آگے بڑھنے لگی —— !

سورج غروب ہو چکا تھا۔ اور فضا میں بادل سانپوں کی طرح لہرا رہے تھے۔ سردی اور تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ تمام کائنات کسی تاریک غار میں جا رہی تھی۔ بیوہ کو پہلے بھی اپنی بدقسمتی کا شدید احساس تھا۔ مگر اب تو وہ خود کو دنیا کی بدنصیب ترین ہستی سمجھ رہی تھی! بارش ہونے لگی قیمتی کپڑوں میں ملبوس لوگ گھبرا گھبرا کر تانگے والوں کو آوازیں دینے لگے کریمن چلی جا رہی تھی۔ بارش اور سردی کی شدت سے بے نیاز چلی جا رہی تھی۔ بے خودی کے عالم میں اسے یہ بھی احساس نہ ہوا، کہ وہ کہاں جا رہی ہے اور کہاں پہنچ گئی ہے۔ اس کی کوٹھڑی چوک رحیم بخش میں تھی۔ مگر وہ چوک

کو بہت پیچھے چھوڑ چکی تھی۔ قادری دروازے کے پاس پہنچ کر وہ یک دم رک گئی۔ اب اسے احساس ہوا کہ وہ اپنے گھر سے بہت آگے آ گئی ہے وہ دروازے کی دیوار سے پشت لگا کر کھڑی ہو گئی۔ اس سے چند قدموں کے فاصلے پر کوئی شخص اپنے لڑکے کی انگلی پکڑے تانگے میں سوار ہو رہا تھا یہ منظر دیکھتے ہی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ [illegible] ایک سایہ سا اس کے سامنے پھرتا رہا، اور پھر چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی ......! اب اس کے قریب سوائے ایک کتے کے اور کوئی بھی نہ تھا۔ یہ دبلا پتلا زخمی کتا زمین پر دم پھیر پھیر کر چیخ رہا تھا —— ایک اور بدنصیب رُوح۔

بدنصیب بیوہ کا دل بے اختیار چاہتا تھا کہ زخمی کتے کو اپنے سینے سے لگا لے۔ اپنے سینے سے لگا کر خوب روئے —— بے قرار کتا بارش میں بھیگتا ہوا کہیں چلا گیا! اس کے جانے کے بعد بیوہ کے سر پر پھڑپھڑانے کی سی آواز ہونے لگی۔ اس نے اوپر دیکھا۔ ایک ننھا سا پرندہ پر پھڑپھڑا رہا تھا۔ بارش اور تاریکی نے اسے گھونسلے اور بچوں سے جدا کر دیا تھا۔ ایک اور بدنصیب رُوح!

چند منٹ تک بڑھیا سر جھکائے کھڑی رہی۔ پھر اس کے قریب ہی سے آواز آئی۔

"کوئی ہے خدا کا بندہ!"

بڑھیا نے اپنی داہنی جانب دیکھا۔ پانی میں شڑاپ شڑاپ ایک فقیر آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔

"ہاں بابا!" بڑھیا نے اس کی لاٹھی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ کونسا دروازہ ہے بھائی؟"

"قادری دروازہ!"

"قادری —— در —— وازہ!" فقیر نے حیرت و حسرت کے ملے جلے لہجے میں کہا۔

"تم کہاں جاؤ گے بابا؟"

"چوک رحیم بخش میں مائی بساں کے تنور کے پاس سوتا ہوں۔"

"میں لے جاؤں گی تمہیں بابا!"

"آپ —— مائی! بڑی تکلیف ہوگی آپ کو، اگر آپ جیسے نیک لوگ دنیا میں موجود نہ ہوں، تو ہم مر جائیں۔ اتنی سردی اور پھر بارش تو بہ ہے! آج پیسہ بھی کوئی نہیں ملا۔ تمام رات فاقے میں گزرے گی۔ اچھا رب مالک ہے۔ اسی نے پیدا کیا ہے —— [illegible] ہے" ما بڑھیا کی نگاہ فقیر کی پیشانی کے نیچے [illegible]

"بابا! تمہیں کچھ نظر نہیں آتا ___؟"

"میں اندھا ہوں مائی؟"

"اور بیٹا"

"بچپن ہی سے اندھا نہیں تھا؟"

"پھر اندھے کیسے ہو گئے؟"

"تقدیر مائی! بیمار ہوا۔ تمام جسم پر پھوڑے پھنسیاں نکل آئیں۔ اس بیماری میں آنکھوں کا نور بھی جاتا رہا۔"

"تو بابا تمہارا کوئی گھر بار نہیں ہے؟"

"میں پہلے فقیر نہیں تھا۔ میرا بیٹا بڑا لائق تھا۔ وہ کماتا تھا اور ہم دونوں کھاتے تھے۔ اس وقت مجھے کھانے کی فکر تھی، نہ پینے کی ___"

"تو پھر کیا ہوا؟" بڑھیا نے اس کے الفاظ کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"میرا بیٹا مر گیا ___ میں کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گیا!"

"میرا لعل بھی مر گیا تھا بابا!"

"تو تم بھی فقیرنی ہو؟"

"میں فقیرنی ___ نہ" بڑھیا کا دل بھر آیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور عالم تصور میں دیکھنے لگی۔ کہ وہ بارونق بازار میں ہاتھ پھیلائے مانگ رہی ہے!

"تم چپ کیوں ہو گئیں مائی؟"

"میں فقیرنی نہیں ہوں"

"تو پھر؟"

"میں کچھ بھی نہیں ہوں ___ میں بدنصیب ہوں"

"مجھ سے بھی بڑھ کر بدنصیب ہو مائی؟"

بڑھیا فقیر کے چہرے کو دیکھنے لگی۔ وہ صرف بیٹے سے محروم تھی۔ مگر اس کے سامنے کھڑا ہوا بدنصیب انسان، بیٹے کے علاوہ آنکھوں کے نور سے بھی محروم تھا۔ اس نے فقیر کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں [illegible] ہوا زخمی کتا، بچوں سے جدا ہو کر پھڑپھڑاتا ہوا پرندہ۔ بھیک مانگ کر پیٹ پالتا ہوا اندھا فقیر ___ تینوں بدقسمت ہستیاں اس کی نگاہوں کے سامنے رونما ہو گئیں۔ سب کا دکھ اس کی روح میں گھل مل گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا، کہ اس کا دل کائنات جتنا وسیع ہو گیا ہے۔ کائنات کا تمام دکھ اس دل میں سما رہا ہے۔

اس نے فقیر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "بابا! تم بڑے دکھی ہو!"

اس کے [illegible] فقیر نے سرد آہ بھری۔

کرین [illegible] اس نے جیب سے رومال نکالا۔ اور تمام سکے نکال کر فقیر کے ہاتھ میں رکھ دیئے۔

"یہ کیا؟" فقیر نے سکوں کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"یہ تم لے لو۔ چار روپے سات آنے ہیں ___"

بوڑھا بہت ششدر کھڑا تھا۔

"بانٹ لو انہیں"

"تم ___ آپ ___ مائی جی؟"

"مجھے ان کی ضرورت نہیں ___" بڑھیا نے کہا۔ اس کی رگ رگ میں مسرت موجزن تھی۔

"آپ کے پاس بڑی دولت ہو گی ہے نا؟"

بڑھیا کو یہ فقرہ ناگوار گزرا ___ مگر ___!

"چلو بابا، میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔ بارش تھم گئی ہے؟"

فقیر نے ایک میلا کچیلا بٹوہ نکالا۔ تمام سکے اس میں ڈال دیئے اور بٹوے کو واسکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ کرین نے فقیر کا ہاتھ پکڑا اور چلنے لگی۔

"اب تو کئی ماہ تک تم بھیک نہیں مانگو گے؟" کرین نے کہا۔ مگر فقیر اپنے خیالات میں غرق تھا۔ دونوں اس طرح قدم اٹھا رہے تھے، گویا انسانی دکھ ہاتھوں میں ہاتھ دیئے چلے جا رہے ہیں۔

"آپ کتنی اچھی ہیں مائی جی!"

کرین کچھ کہنے لگی تھی۔ کہ اس پر کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ اور جب کھانسی تھمی تو اس کی ٹھوڑی خون میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کسی نے اسکا گلا دبوچ لیا ہے۔ سینہ کچل دیا ہے۔

"وہ سامنے ہے ___ تن ___ دور" بڑھیا نے بمشکل کہا۔

"اچھا ___ خدا تمہارا بھلا کرے۔ میں چلا جاؤں گا!"

"میں وہاں ___ تک چھوڑ آؤں ___ تم ___ ایں" یہ کہہ کر بڑھیا نے تین قدم اٹھائے۔ اور آگے ___ اور آگے۔

"اب میں چلا جاؤں گا ___"

"بہت اچھا بابا ___!" کرین نے کہا اور کھڑی ہو گئی۔ بوڑھا تنور کے قریب پہنچ چکا تھا۔

یکایک کرین پر کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ اور وہ دھم سے کیچڑ میں گر پڑی۔

فقیر دعائیں دے رہا تھا۔ "مائی جی! خدا تمہارا بھلا کرے۔ تمہیں کبھی دکھ نہ پہنچے۔ بیٹا زندہ رہے ___ خدا دونوں جہان میں [illegible]"

ادارہ

نقد و نظر

اسلام میں غلامی کی حقیقت (مولفہ سعید احمد ایم اے
کتابت و طباعت نہایت اعلیٰ، صفحات ۲۶۴، سائز کلاں، قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے۔ قیمت مجلد سنہری تین روپے۔ ملنے کا پتہ۔ ندوۃ المصنفین دہلی)

یہ ہماری بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ اب ہمارے علماء دین اقتضائے وقت کے مطابق مغربی علوم کی طرف بھی توجہ دے رہے ہیں۔ ورنہ اس سے پیشتر تو علوم مذہبیہ کی تحصیل ہی میں تمام عمر صرف کر دی جاتی تھی۔ اور ہمارے علماء کو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ موجودہ دور میں دنیا کس منزل پر جا پہنچی ہے۔ اور سیاسی معاملات کا کیا رنگ ہے؛ برہان کے محترم ایڈیٹر اور اس کتاب کے فاضل مولف جہاں فاضل دیوبند ہیں وہاں مغربی علوم کے بھی متبحر عالم۔ چنانچہ ان کی یہ تالیف ہر لحاظ سے کامیاب اور جامع ہے؛ فاضل مولف نے سب سے پہلے غلامی کی حقیقت، اس کے نفسیاتی، اخلاقی اور اقتصادی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ دنیا میں غلامی کا آغاز کب ہوا؟ مختلف اقوام عالم میں اس لعنت نے کیا کیا رنگ اختیار کیا۔ اس کے بعد اصل مسئلے کو لیا ہے۔ یعنی اسلام میں غلامی کی حقیقت؟ اس سلسلے میں قرآن مجید کی روشنی میں غلامی پر بحث کی ہے۔ کتاب کا وہ حصہ بہت اہم ہے جہاں اسلام اور مسیحیت کا فرق بتاتے ہوئے بعض اعتراضات کا دنداں شکن جواب دیا ہے الغرض کتاب نہایت مفید اور جامع ہے۔ جتنا موضوع اہم ہے، اتنی ہی کتاب کامیاب ہے۔

(م ع)

ضیا کے سو شعر :۔ (مصنفہ ضیا فتح آبادی ایم اے۔ صفحات ۴۴ کتابت و طباعت خوشگوار۔ ملنے کا پتہ۔ جگن ناتھ لال سونی، موہن بلڈنگ نزد لائیڈز بینک دہلی۔)

اردو میں متعدد شعرا کے سو منتخب اشعار کے چھوٹے چھوٹے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ چنانچہ یہ مجموعہ اردو کے نغز گو شاعر جناب ضیا فتح آبادی کے سو بہترین اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر شخص کا مذاق جداگانہ ہوتا ہے مگر بعض اشعار ایسے بھی ہو سکتے ہیں، جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کو متاثر کر سکتے ہیں۔ اس مجموعے کے فاضل مرتب بھی اس لحاظ سے بہت حد تک کامیاب ہیں!

ضیا صاحب جو کچھ کہتے ہیں، وہ دلی خلوص کے ساتھ محسوس کر کے کہتے، اسی لئے ان کا کلام قارئین پر بہت اثر ڈالتا ہے۔ بعض اشعار ملاحظہ فرمائیے :۔

محفل میں اور کوئی نہیں اپنا راز داں
ہمسوز اک دیا ہے سو وہ بھی بجھا ہوا

اب چمن میں بہار کیوں آئے
اب نہ بجلی ہے اور نہ ہے ضیا

ممکن نہیں کہ حسن نہ لے عشق سے خبر
وہ سامنے تو آئیں ذرا گفتگو کریں

ان کو بھی روندتی ہوئی دنیا چلی گئی
کلیاں سی کچھ کھلی تھیں شب ماہتاب میں

--- (م ع)

محکومیت نسواں :۔ مصنفہ جان سٹورٹ مل۔ مترجمہ معین الدین صاحب انصاری صفحات ۱۴۴ کتابت و طباعت جاذب قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ جامعہ ملیہ دہلی)

محکومیت نسواں انگلستان کے مشہور منطقی جان سٹورٹ مل کی وہ شہرۂ آفاق کتاب ہے۔ جس نے شائع ہوتے ہی لوگوں کے ذہن میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ مل اس امر کا قائل ہے کہ مرد کسی حالت میں بھی عورت پر فوقیت نہیں رکھتا۔ اگر مرد میں چند ایسی ..... خصوصیات موجود ہیں، جن کی بنا پر وہ عورت سے فائق ہے تو عورت میں بھی بعض ایسی خوبیاں ہیں جو اسے مرد کے مقابلے میں فوقیت بخشتی ہیں کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ [illegible] متعلق
دیگر عورت کی [illegible]
[illegible]

[illegible]یسے کارکنوں نے یہ کتاب شائع کرکے اردو پبلک کو ایک عدیم النظیر [illegible]کے افکار سے واقف کرانے کی نہایت مستحسن کوشش کی ہے

(م ۱۰)

ہندوستانی :۔ (کتابت و طباعت نہایت اعلیٰ صفحات [illegible]۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ دہلی)

آل انڈیا ریڈیو دہلی کے ارباب اقتدار نے "ہندوستانی کیا ہے" [illegible]م موضوع پر چوبیس مقتدر حضرات سے تقریریں نشر کرائی تھیں۔ یہ ان تقریروں کا مجموعہ ہے۔ یہ چوبیس حضرات ملک کی مقتدر شخصیتیں ہیں اس [illegible]لاہر ہے جو کچھ انہوں نے کہا ہوگا۔ اپنی تمام ذمہ داریوں کو مد نظر رکھتے [illegible]ے کہا ہوگا۔ ڈاکٹر تارا چند سکریٹری ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد اور [illegible]راجندر پرشاد صدر آل انڈیا نیشنل کانگرس کی تقریروں کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے۔ آپ کو صاف معلوم ہو جائے گا کہ ان ذمہ دار [illegible]ستیوں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ موضوع کا تقاضا ہے کہ صاف اور سلیس [illegible]بان بولی جائے یہ کہتے ہوئے بھی کہ ملک کو مشترکہ زبان کی اشد ضرورت [illegible] ہندی اور سنسکرت کے ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں، جو ہم میں سے بہتوں [illegible]اب تک سنے ہی نہیں۔ ان کے مقابلے میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق۔ ڈاکٹر [illegible]اکر حسین، علامہ کیفی، دتاتریہ اور آصف علی کی تقریریں ایسی ہیں کہ انہیں [illegible]معمولی اردو جاننے والا شخص سمجھ سکتا ہے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ ہر تقریر پر اپنے [illegible]لات کا اظہار کریں۔ چنانچہ اشارات میں ہم نے ایک مستقل عنوان "ہماری [illegible]بان" قائم کر دیا ہے۔ اس کے تحت موجودہ ہندی اردو نزاع کے متعلق [illegible]ضامین شائع ہوا کریں گے۔

(م ۱۰)

تمثیلی مشاعرہ :۔ (مصنفہ علامہ کیفی۔ مرتبہ پروفیسر محمد عبدالشکور [illegible]ے۔ کتابت و طباعت جاذب نگاہ۔ صفحات [illegible]۔ قیمت ایک روپیہ [illegible] پتہ۔ انجمن ارباب ذوق لائل پور)

[illegible] اردو کے مشہور مزاح نگار جناب مرزا فرحت اللہ بیگ نے [illegible] اردو میں ایک مشاعرے کا حال اس انداز سے لکھا تھا۔ کہ مشاعرے [illegible]ہو تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آگئی تھی۔ اب علامہ کیفی یہ تمثیلی [illegible]عرہ لکھا ہے۔ جو یقیناً علامہ موصوف کا ایک ناقابل فراموش ادبی کارنامہ [illegible] اس مشاعرے میں اردو کے معروف و مشہور شعرا یعنی مرزا غالب۔ تفتہ، [illegible]مومن۔ استاد ذوق۔ مصحفی۔ آتش۔ نسیم، انشا۔ ناسخ۔ جرأت، [illegible] میر [illegible] شامل ہو کر اپنی بہترین غزلیں پڑھتے ہیں۔ [illegible] نے [illegible] انتخاب میں بہت نظر کا ثبوت دیا ہے۔

وہاں شاعروں کی زبان سے داد کے سلسلے میں جو فقرے کہلوائے ہیں۔ وہ ان شعرا کی نفسیات اور ذہنی رجحان کے بالکل مطابق ہیں۔ حکیم مومن جب داد دیتا ہے۔ تو وہ حسن تخیل اور رنگینی بیان ہی کی داد دیتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جرأت کے منہ سے صرف معاملہ بندی ہی کے ... موقع پر صدائے تحسین نکلتی ہے۔ میر تقی پر سوز اشعار ہی سے متاثر ہوتا ہے۔ مگر سودا لفظی شوکت کو قابل تحسین کوشش کہتا ہے۔

جرأت شعر پڑھتا ہے۔

اس بن جہان کچھ نظر آتا ہے اور ہی
گویا وہ آسمان نہیں، وہ زمیں نہیں

میر :۔ واد دیتے ہوئے اجی کیا شعر کہا ہے۔ یہ کیفیت جس پر گذری ہو وہی کہہ سکتا ہے۔

سودا :۔ حسن ادا قابل تعریف ہے

ذوق :۔ اے سبحان اللہ اس مضمون گوئی کی داد دینا مشکل ہے۔

ناسخ :۔ بے شک غزل کا شعر ہے۔

غالب :۔ تغزل اور تخیل کس خوبصورتی سے دست و گریباں ہیں۔

مومن :۔ نازک خیالی اور ندرت بیان کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

مصحفی :۔ جملہ کتنا بانکا ہے، واہ بھئی جرأت!

انشا :۔ شیخ صاحب واہ وا۔ دور کی سوجھی۔ واللہ اس حالت میں زمین و آسمان کے قلابے ملانا کام ہے وارد۔

شعرا کے دل کی سچی تصویر کھینچنے کے معاملے میں علامہ کیفی اتنے کامیاب ہوئے ہیں کہ اس نقلی مشاعرے کو اصلی شاعر دیکھ لیں تو وہ یقیناً حیرت کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکیں۔

(م ۱۰)

رسالہ دینیات :۔ (مولفہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ کتابت و طباعت نہایت اعلیٰ۔ صفحات ۲۴۰۔ قیمت ۱۰۔ ملنے کا پتہ۔ دفتر رسالہ ترجمان القرآن۔ ملتان روڈ۔ لاہور۔)

یہ رسالہ ملک کے مشہور انشا پرداز مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تازہ تالیف ہے جس میں انہوں نے اسلام کے تمام بنیادی اصولوں کی اس طرح تشریح کی ہے کہ ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی بآسانی اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ مولانا نے دقیق سے دقیق مسئلے کو بھی نہایت آسان عام فہم اور سلیس زبان میں بیان کر دیا ہے۔ کتاب سات ابواب کو محیط ہے۔ باب اول میں اسلام، وجہ تسمیہ، مطلب اسلام کے متعلق [illegible] کی حقیقت کفر کی نقصانات، اسلام کے فائدے [illegible] اہم [illegible]

پر مدرسین ڈونگی ہے۔ باقی ابواب بھی نہایت ضروری ہیں۔

امید ہے۔ اس مفید کتاب کو اسلامی مدارس میں بطور نصاب کے شامل کیا جائے گا۔

(م۔ا)

رسالہ نشاط :- ایڈیٹر مجید لاہوری۔ صفحات ۸۰۔ کتابت و طباعت واجبی۔ زر سالانہ تین روپے چھ آنے۔ مقام اشاعت حافظ آباد۔

"نشاط" ایک جدید ادبی ماہنامہ ہے۔ جو اردو کے ممتاز شاعر جناب مجید لاہوری کی زیر ادارت شائع ہو رہا ہے۔ مجید صاحب نے مضامین کے انتخاب میں بڑی محنت و کاوش سے کام لیا ہے۔ ملک کے کئی مشہور ادیب پہلے پرچے ہی میں نظر آ رہے ہیں۔ حافظ آباد جیسے غیر شاعرانہ اور خشک خطے سے ایسا مقصد پرچہ شائع کرنا مجید صاحب ہی کا کام ہے۔

جہاں تک مضامین کا تعلق ہے۔ ہم مجید صاحب کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ مگر تصویروں کے معاملے میں انہوں نے سخت کمزوری کا ثبوت دیا ہے۔ ایسی واہیات اور بازاری تصاویر صرف تھرڈ کلاس کیلنڈروں ہی کی زینت بن سکتی ہیں۔ ادبی رسالہ کو ان سے بہت بلند ہونا چاہیے۔

ہمیں کامل امید ہے کہ ہمارے محترم دوست آئندہ اس باب میں احتیاط سے کام لیں گے۔

(م۔ا)

سیاسی لٹریچر

سوشلزم :- مصنف فریڈرک اینگلز۔ مترجم کامریڈ باری۔ طباعت کتابت اور کاغذ اعلیٰ۔ قیمت ۸/

میری کہانی :- از پنڈت جواہر لال نہرو۔ قیمت مجلد ہر دو حصہ چار روپے

آزادیٔ ہند :- از چودھری افضل حق۔ قیمت ۸/ (دو روپے)

تلاشِ حق :- از مہاتما گاندھی۔ قیمت مجلد ہر دو حصہ ۶/

انقلاباتِ عالم کی تصویر کا دوسرا رخ :- شیخ حسام الدین بی اے۔ قیمت ۸/

انقلابی ہتھکنڈے :- پرنسپل چھبیل داس۔ قیمت بارہ آنے (۱۲/)

شعلے :- غلامی کی خس و خاشاک جلانے والے افسانے دوسرا ایڈیشن مجلد ایک روپیہ (۱/)

سوویٹ روس :- پنڈت جواہر لال نہرو کا سیاحت نامہ روس۔ قیمت ایک روپیہ۔

جمہوریت روس :- یعنی سوویٹ روس کے نظام کا راز منظر علی اظہر قیمت ۸/

انقلاب فرانس :- باری علیگ کے اپنے طرز بیان میں قیمت بارہ آنے (۱۲/)

آزادی :- یہ جان اسٹوارٹ مل کی کتاب لبرٹی کا صحیح اور بامحاورہ ترجمہ ہے جو سیاسیات کا ایک اہم جزو ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

کمپنی کی حکومت :- عہد کمپنی کے صد سالہ دور کی داستان مجلد قیمت ۸/

لینن :- مزدوروں کے پیغمبر روس کی کایا پلٹ دینے والی شخصیت کی سوانح حیات مجلد ۸/

میری جدوجہد :- ہٹلر ڈکٹیٹر جرمنی کی خود نوشت سوانح بہترین ترجمہ مجلد ۸/

تحریک خلافت :- از مولانا ظفر علی خاں قیمت ۱/

ترکی جمہوریہ :- ترکی کے متعلق بارہ سال میں ملک کے مکمل حالات مع حالات اتاترک قیمت ۸/

صحیفۂ چین :- چین کی قدیم و جدید تاریخ پر نہایت معقول روشنی ڈالی گئی ہے قیمت مجلد ۸/

قوم کی آواز :- مہاتما گاندھی کی زبان سے سوراج کی تشریح قیمت ۸/

معاہدۂ عمرانی :- از ژاں ژاک روسو کتاب معنوی حیثیت فلسفۂ سیاسی کی اہم کتاب قیمت مجلد ۸/

مضامین محمد علی :- مرتبہ پروفیسر سرور قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے (۲/۸)

روسی افسانے :- ہماری رگوں میں بجلی دوڑا دینے والے افسانے مصنفہ سعادت حسن منٹو قیمت ۸/

آتش پارے :- آگ کی چنگاریاں دہکتے ہوئے انگارے قیمت ایک روپیہ (۱/)

مزدوروں کا پیغمبر :- کارل مارکس کی سوانح۔ قیمت چار آنے (۴/)

سوشلزم :- مصنفہ پرنسپل چھبیل داس۔ قیمت آٹھ آنہ (۸/)

نپولین بوناپارٹ :- ناممکن کو ممکن بنانے والے مہم جو کے کارنامے اور حالات زندگی قیمت ۱/

ہم سوراج کیوں چاہتے ہیں؟ :- لالہ لاجپت رائے کی مشہور کتاب جس میں ہندوستان کی منہ بولی تصویر ۸/

آئینۂ ہندوستان :- ریبل انڈیا کا اردو ترجمہ قیمت ۸/

چنگاریاں :- پرنسپل چھبیل داس۔ قیمت بارہ آنے (۱۲/)

گیری بالڈی :- مصنفہ لالہ لاجپت رائے۔ قیمت بارہ آنے

تاریخ کانگرس :- مکمل تاریخ کانگرس سے متعلق جدید معلومات مجلد ۸/

ملنے کا پتہ:- **مکتبہ اردو لاہور**

حاجی لق لق کے افسانے



مکتبہ اردو لاہور

حاجی لق لق کے افسانے — ملک کے مشہور مزاح نگار حاجی لق لق کے بہترین مزاحیہ مضامین کا مجموعہ جس کے پڑھنے سے آپ کا دل کشتِ زعفران بن بن جائیگا۔

A٩ 12 حاجی لق لق



ترکی جمہوریہ میں ترکی کی مختلف ترقیات کا حال نہایت دلپذیر پیرائے میں بیان کیا گیا ہے ترکی عہد
سے پہلے کیا تھا انقلاب کے بعد ترکوں کے ذہن میں یہ انقلاب پیدا ہوا ترکی کے متعلق مستند اور تازہ ترین
معلومات حاصل کرنے کے لیے یہ کتاب بے حد مفید ہے۔ سید ضیاء ہاشمی مجلد دو روپے

نومبر 1937

Regd. L. No. 3521

علمی ادبی و تنقیدی ماہوار مرقع

مصور ادب لطیف لاہور

ایڈیٹر

چوہدری برکت علی بی اے

سالانہ چندہ
3/8/-

فی پرچہ
-/4/-

دارالاشاعت
مکتبہ اردو ۱۵ سرکلر روڈ لاہور

منظور کردہ محکمہ تعلیم پنجاب صوبہ سرحد ریاست حیدرآباد دکن

زرِ چندہ سالانہ
دو روپے آٹھ آنے
علاوہ محصول ڈاک

ادارۂ تحریر
چوہدری برکت علی
بی اے
میرزا ادیب
بی اے

رسالہ ادبِ لطیف لاہور

چندہ ممالکِ غیر سے
آٹھ شلنگ
مینیجنگ پروپرائیٹر
چوہدری نذیر احمد

مینیجر
چوہدری بشیر احمد

ماہ نومبر
سنہ ۱۹۳۹ء

مقامِ اشاعت
مکتبہ اردو لاہور

جلد (۱۱) نمبر (۴)

فہرست مضامین

چوہدری برکت علی بی اے پرنٹر پبلشر نے [illegible] کمرشل پرنٹنگ پریس وطن بلڈنگ لاہور سے چھپوا کر دفتر رسالہ ادبِ لطیف ۱۵ سرکلر روڈ لاہور سے شائع کیا۔

شذرات

ادبِ لطیف کا سالنامہ ۔

پرچہ جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے، نومبر کا پرچہ ہے، اس کے بعد چند ہفتے میں جو پرچہ شائع ہوگا وہ "ادبِ لطیف" کا عدیم النظیر سالنامہ ہوگا۔ جو بہترین مقالوں بہایت، دلآویز نظموں اور کامیاب ترین افسانوں پر مشتمل ہوگا۔

ہم سالنامے کے متعلق ابھی کچھ کہنا نہیں چاہتے مگر اس بات کا یقین ضرور دلاتے ہیں کہ آپ اس خاص نمبر کو ہر لحاظ اور ہر پہلو سے بہترین دیکھینگے۔ اس دفعہ ہم خاص طور پر کوشش کر رہے ہیں کہ سالنامے میں ایسا مواد جمع ہو جسے صحیح معنوں میں ترقی پسندانہ رجحانات کا حامل کہا جا سکے۔

ہندوستان میں اس وقت بھوک اور سیاسی غلامی نے زندگی کو ایک رستا ہوا ناسور بنا دیا ہے۔ اس لئے اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ موجودہ دور میں ایسا ادب پیش کیا جائے جس میں اس رستے ہوئے زخم کی تمام کرب آفرینیاں نمایاں ہوں تا کہ ہماری پبلک کو ملک کی بدنصیبی و مذلت کا پورا پورا احساس ہو جائے۔ جب تک ہندوستانیوں کے دل میں سیاسی غلامی کی لعنتوں کا آتشیں احساس پیدا نہیں ہوتا۔ اور جب تک لوگوں کے سینے میں انقلابی روح شرربار نہیں ہوتی اس وقت تک ہر قسم کی ہنگامہ آرائی، جدوجہد، تگ و دو بچوں کے کھیل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ ایک آتشیں شعلہ بار اور دل و دماغ پر چھا جانے والا احساس — اس چیز کی ہمارے کھوکھلے سینوں، افسردہ دلوں، اور برف کی طرح ٹھنڈی رگوں کو ضرورت ہے، یہ احساس اگر آج پیدا ہو جائے تو آج ہی غلامی کی زنجیریں کٹ جائیں۔

موجودہ جنگ کا اثر کاغذ پر :-

آج کل جمہوریت کی خود غرضی و مطلب برآری اور نازیت و فاشیت کی سرمایہ داری اور فرعونیت کے باعث جس منحوس جنگ کا آغاز ہو رہا ہے، اس نے جہاں ہماری سیاسیات زندگی پر اثر ڈالا ہے وہاں کاغذ کے بھاؤ کو بھی متاثر کئے بغیر نہیں چھوڑا چنانچہ کاغذ کی گرانباری کی وجہ سے اخبارات و رسائل جو پہلے ہی لوگوں کی سرد مہریوں کے طفیل بمشکل اپنی زندگی قائم کئے ہوئے تھے ایک نئی مصیبت کا سامنا کر رہے ہیں اور نتیجتہً ہم دیکھ رہے ہیں کہ اخبارات و رسائل کی دنیا میں "قطع و برید" کا عمل جاری ہے۔ اس لئے موجودہ حالات میں پبلک کا فرض ہے کہ وہ علمی اداروں اور رسائل و جرائد کی جہاں تک ہو سکے ہمت افزائی کریں تاکہ ہمارا ادب و صحافت تمام گرانباریوں کا مقابلہ کر کے اپنے مخصوص فرائض ادا کرتا رہے۔

ادب ہماری زندگی کا آئینہ ہے اور صحافت سیاسی حالات کا تھرمامیٹر اگر ادب مجروح ہو جائے تو قوم و ملک کی روایات خطرے میں پڑ جائیں گی۔ اور اگر صحافت کے رستے میں دشواریاں پیدا ہو جائیں۔ تو سیاست پر برے اثر پڑیں گے ہمیں امید ہے قارئین اس امر کی طرف بہت جلد توجہ کریں گے۔

ایک شکوہ اپنے قارئین سے ۔

ہر روز جب ہم ڈاک دیکھتے ہیں تو کم از کم ایسے تین چار خطوط ضرور نکل آتے ہیں جن میں یہ شکایت ہوتی ہے "ابھی تک تازہ نمبر تو کجا گزشتہ دو ماہ کے پرچے بھی نہیں پہنچے"۔

اول تو یہ بات، دیکھئے کہ جب ان حضرات کی خدمت میں گزشتہ دو ماہ کے پرچے نہیں پہنچے تھے تو انہوں نے اس وقت اطلاع کیوں نہ دی تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے۔ کہ منیجر صاحب نے ان کی خدمت میں پرچے باقاعدگی کے ساتھ نہیں بھیجے، اس قسم کی شکایتوں کا ازالہ کرتے کرتے ناک میں دم آ جاتا ہے۔ ہر روز متعدد پرچے صرف اس شکایت کو رفع کرنے کے لئے بھیجے جاتے ہیں پھر بھی دیکھتے ہیں کہ شکایت اپنی جگہ پر قائم ہے

ہم ان حضرات کی خدمت میں عرض کرینگے کہ جب ان کی خدمت میں کسی ماہ کا پرچہ نہ پہنچے تو کارڈ لکھ کر منیجر صاحب کو اس امر سے مطلع کریں، دو تین ماہ گزر جانے کے بعد ان کی شکایت بے جا شکایت ہے اور دفتر ان کے ارشاد کی تعمیل سے قاصر !

مکتبہ اردو کی علمی سرگرمیاں :-

پروفیسر علی عباس حسینی کی کتاب "باسی پھول" کی جلد بندی ہو رہی ہے چند روز میں کتاب مکمل ہو کر مارکیٹ میں آ جائے گی۔ بارتی علیگ کی کتاب — کمیونسٹ مینی فسٹو کی طباعت ہو رہی ہے۔ جو اسی ہفتہ مکمل ہو جائے گی۔

گوپال متل کے افسانوں کا مجموعہ "پھول اور کانٹے" بھی طباعت کی منزل پر پہنچ چکا ہے۔ اور اسی ہفتہ میں مکمل ہو جائے گا۔

خلیل جبران خلیل کے افسانوں کا مجموعہ "سرکش روحیں" (مترجمہ عطیہ چشتی) کتابت کی منزل طے کر رہا ہے۔

حکیم احمد شجاع کی دو کتابوں "حسن کی قیمت" اور "دیگر افسانے" اور "باپ کا گناہ" کی بھی کتابت ہو رہی ہے۔ ان کے علاوہ مسٹر عبد اللہ ملک کی کتاب ....

سرمایہ داری بھی چھپ رہی ہے۔

مسٹر عبداللہ ملک ایک وسیع المطالعہ اور ملک کی سیاسیات میں عملی حصہ لینے والے نوجوان ہیں۔ آپ نے اس کتاب (سرمایہ داری) میں بڑی تحقیق سے کام لے کر سرمایہ داری کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

مترجمین کرام سے :-

عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ ہمارے قلمی معاون صرف ایک مصنف کو منتخب کر کے اس کی ذہنی کاوشوں کو بار بار اردو میں منتقل کرتے چلے جاتے ہیں اور یہ بات معلوم کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ کہ آیا ان کا ترجمہ چھپ ہو چکا ہے یا نہیں ۔۔۔۔ ہم نے موپاساں کے ایک افسانے کو کم از کم دس رسائل میں دیکھا ہے مختلف مترجمین کے ناموں کے ساتھ اب ایک شخص جو یہ افسانہ پہلے پڑھ چکا ہے جب نئی بار یہی افسانہ مختلف رسالوں میں دیکھے گا۔ تو لامحالہ اس کی طبیعت مکدر ہو جائے گی اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائے گا۔ کہ اردو اہل قلم کی نظر بہت تنگ ہے اور وہ ایک مصنف کے علاوہ دنیا کے کسی اور مصنف کو جانتی نہیں۔

اگر ہم غلطی نہیں کرتے تو اس وقت موپاساں، چیخوف، ٹیگور، ٹالسٹائی اور گورکی کے علاوہ ہمارے مترجم کسی اور مصنف کو دیکھنا پسند ہی نہیں کرتے۔ درآنحالیکہ ان مصنفوں کی چیدہ چیدہ چیزیں اردو میں منتقل ہو چکی ہیں اور اب ضرورت اس امر کی ہے کہ دنیا کے دوسرے جلیل القدر مصنفوں کی طرف توجہ کی جائے

چاہیئے تو کہ ہمارے مترجم اردو دنیا کو دنیا کے نئے نئے مصنفوں سے روشناس کرائیں۔ اس سے ایک تو ان کی کوشش واقعی قابل تحسین ہوگی۔ اور دوسرے اردو ادب میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔ ہر مصنف اپنے تجربات حیات پیش کرتا ہے ہر مصنف دنیا اور زندگی کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اور ہر مصنف کی طرز نگارش انفرادیت لئے ہوئے ہوتی ہے اس لئے ہمارے اہل قلم کو چاہیئے کہ مندرجہ بالا مصنفوں کے علاوہ دوسرے مصنفوں کی طرف بھی متوجہ ہوں۔ ایک ہی چیز کو بار بار پیش کرنا نہ کوئی قابل تحسین ادبی کوشش ہے اور نہ اردو کی قابل وقعت خدمت!

حیرت انگیز امر تو یہ ہے۔ کہ وہ حضرات جن کی خدمت میں ادب لطیف باقاعدہ حاضر ہو رہا ہے، وہ بھی بعض اوقات ادب لطیف پر کرم فرمائی کرتے ہوئے ایسے ایسے افسانے بھیج دیتے ہیں، جو کئی ماہ پیشتر ادب لطیف ہی میں شائع ہو چکے ہیں۔ اب اگر ہم ان کرم فرماؤں کو اس طرف متوجہ کرتے ہیں۔ تو وہ فرماتے ہیں مجھے اس کا افسوس ہے۔ مگر میں محنت کر چکا ہوں۔ میرا ترجمہ پہلے ترجمے سے بالکل علیحدہ ہے۔

ہم اپنے محترم و معزز اہل قلم حضرات کی خدمت میں درخواست کرتے ہیں کہ وہ ترجمہ کرنے سے پیشتر یہ ضرور معلوم کر لیا کریں کہ جس چیز کا [illegible] ہیں۔ وہ پہلے شائع تو نہیں ہو چکی۔

اردو نواز حضرات سے :-

یہ شکوہ نہیں۔ کہ ملک میں اردو نواز حضرات کی تعداد [illegible] بلکہ شکوہ اس کا ہے کہ ہندوستان میں اردو بولنے والوں اور اردو [illegible] کی اتنی بڑی تعداد ہونے کے باوجود اردو کس مپرسی کی حالت میں ہے [illegible] ترقی کے لئے خاطر خواہ کوشش کہیں بھی بروئے کار نہیں آ رہی —

اگر بنظر غائر حالات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ [illegible] لسانی نقطۂ نظر سے ملک میں چار جماعتیں ہیں، ایک جماعت تو زبان [illegible] ہی سے واقف نہیں اور اس کو قطعاً کوئی حیثیت نہیں دیتی، دوسری [illegible] فرقہ وارانہ مناقشات کے زیر اثر سنسکرت اور ہندی کو اوڑھنا بچھونا [illegible] بنائے بیٹھی ہے۔ تیسری جماعت صوبائی زبانوں ہی کو [illegible] آخری زبانیں سمجھتی ہے۔ اور چوتھی جماعت اردو کو ہندوستان کی مشترکہ [illegible] خیال کرتی ہے۔ پہلی جماعت کو چھوڑیئے۔ کہ وہ اس جھگڑے سے ذرہ بھر [illegible] بھی نہیں رکھتی اور دوسری جماعت کسی صورت بھی مذہبی عصبیت سے [illegible] پر راضی نہیں ہو سکتی۔ تیسری جماعت لسانی نقطۂ نگاہ سے زیادہ خطرناک نہیں۔ بشرطیکہ اس کے ذہن میں یہ خیال جانشین کر دیا جائے کہ صوبائی [illegible] کے علاوہ ملک کے متحدہ مقاصد کے حصول کے لئے ایک مشترکہ زبان کی [illegible] ضرورت ہے۔ کیونکہ جب تک زبان ایک نہ ہوگی، سیاسی اتحاد کی توقع [illegible] خواب پریشاں ہے۔ اسلئے بہترین صورت یہ ہے کہ ایسے حضرات اپنی زبانیں بیشک بولیں مگر اس کے ساتھ ملک کی مشترکہ زبان کو سیکھنا بھی [illegible] بہت بڑا وطنی فرض سمجھیں۔ اب رہ گئی چوتھی جماعت اور اس صحبت میں [illegible] جماعت کی خدمت میں چند گزارشات کرنا چاہتے ہیں۔

اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہے۔ کہ اس وقت ہندوستان کے کونے گوشے میں لسانی کشمکش برپا ہے۔ اور ہر جماعت، ہر فرقہ، ہر گروہ اپنی [illegible] کے فروغ و ترقی کے لئے کوشاں ہے، یہی وجہ ہے کہ سنسکرت [illegible] کل کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا۔ آج متعصب رہنماؤں کی فرقہ پروری [illegible] کے میدان میں اتر آئی ہے۔ اور گوناگوں طریقوں سے ترقی حاصل کر رہی [illegible] ہے۔ سب سے پہلے تو یہ نکتہ جان لینا چاہیئے کہ ہر زبان اپنے بولنے والوں کی [illegible] معاشرتی اور اقتصادی روایات کو لئے ہوئے ہوتی ہے، بلکہ زبان ہی ایک ذریعہ ہے۔ جو کسی قوم یا کسی ملک کی تمام روایات کی حامل ہوتی ہے۔ اس

زبان کو مٹانا اس قوم یا ملک کی تمام روایات کو مٹا دینے کے مترادف ہے۔ اردو زبان نتیجہ ہے ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ کوششوں کا، حامل ہے دونوں قوموں کی روایات کی اور عبارت ہے ہندو مسلم اتحاد سے۔ اس لئے ہر ہندوستانی کا اہم ترین قومی فرض یہ ہے کہ وہ اردو زبان کی حفاظت کرے اس کو ترقی و فروغ دے اسے ملک کے ہر گوشے میں پھیلائے۔ جب زبان مشترکہ صورت اختیار کر لے تو سیاسی مقاصد میں ہم آہنگی کا پیدا ہو جانا ناگزیر امر ہے۔ کیونکہ جیسا آپ جانتے ہیں ایک زبان بولنے والے فطرۃً ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں، ایک دوسرے کے خیالات کو جانتے ہیں، سمجھتے ہیں اور ان پر غور کرتے ہیں۔ اور اگر زبان مختلف ہو تو وہ ہمسائے بھی اجنبی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمیں یہ خیال کبھی بھی ذہن میں نہ لانا چاہیئے کہ اردو ہماری مذہبی زبان ہے اور ہمارا فرض ہے کہ اردو کو نوازیں بلکہ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے اردو ہندو اور مسلم کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ ہے اور اردو زبان کے محسن سر تیج بہادر سپرو کے قول کے مطابق اردو زبان ہندو مسلمان دونوں کو اپنے آباؤ اجداد سے ایک مشترکہ متعدد ترکہ کی حیثیت سے ملی ہے جو قطعاً ناقابلِ تقسیم ہے۔ اس لئے ہندوستان کی بہتری کے لئے اپنی بہتری کے لئے برادرانِ ہنود کی بہتری کے لئے اور ہندوستان میں رہنے والی ہر قوم کی بہتری کے لئے لازم ہے کہ ہم اس یعنی ہندوستان کی مشترکہ زبان کو فروغ و ترقی دیں اور اس سلسلے میں کوئی دقیقہ بھی فروگزاشت نہ کریں۔

اس وقت تک جتنے بھی ادارے موجود ہیں جو اردو کی صحیح معنوں میں خدمت کر رہے ہیں، اردو نواز حضرات کا فرض ہے کہ وہ ان اداروں کا ہاتھ بٹائیں۔ اور جہاں تک ہو سکے ان کی مدد کریں۔ اس سے دو فائدے ہونگے۔ پہلے تو اردو ترقی کر جائیگی دوسرے اداروں کی ترقی بھی مضبوط ہو جائیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت اردو کا کوئی ادارہ بھی مستحکم بنیاد پر کھڑا نہیں اور اس کی وجہ بالکل صاف ہے کسی ادارے کی مضبوطی کے لئے سب سے لازم یہ ہے کہ اس کے اقتصادی ذرائع متزلزل حالت میں نہ ہوں۔ اور اقتصادی ذرائع کو مضبوط کرنے کے لئے ادارے کے معاونین کرام کی تعداد وسیع ہونی چاہیئے۔ اگر آج ہر پڑھا لکھا ہندوستانی اردو اداروں کی اعانت کرے۔ تو آج ہی اردو اپنی پست حالت سے نکل کر اوجِ کامرانی پر پہنچ سکتی ہے۔ اور اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ وہ اردو کتابیں پڑھے اور دوستوں کو ان کے پڑھنے کی ترغیب دے۔

ایجنٹ حضرات توجہ فرمائیں!

ادبِ لطیف کا عظیم الشان سالنامہ دسمبر ۳۹ء کے پہلے ہفتے میں شائع ہو رہا ہے۔ جو اپنی قدیم ادبی روایات کے پیشِ نظر ادب کے ہر پہلو پر حاوی ہوگا اور حسبِ معمول انشاء اللہ ہر طبقہ میں مقبول ہوگا۔

جن حضرات کی طرف بقایا چلے آ رہے ہیں۔ انہیں سالنامہ اس وقت تک نہیں بھیجا جائیگا جب تک وہ پچھلا حساب صاف نہیں کر دیں گے۔ نیز ہم ان حضرات کے خلاف جو روپیہ بھیجنے میں لیت و لعل کر رہے ہیں مجبوراً ادبِ لطیف کے صفحات کو کام میں لائینگے۔ ایجنٹ حضرات ہمیں اطلاع دیں کہ انہیں سالنامہ کی کتنی کاپیاں بھیجی جائیں۔ (مینیجر)

اطلاع } جو حضرات دسمبر ۳۸ء میں سالنامہ ۳۹ء کے موقع پر خریدار ہوئے تھے۔ ان کی میعادِ خریداری نومبر ۳۹ء میں ختم ہو رہی ہے۔ ختم میعادِ خریداری کی اطلاع علیحدہ بھی ان کی خدمت میں دی جا رہی ہے۔ ضروری ہے کہ وہ حضرات اردو ادب کو نوازتے ہوئے، اپنی توجہ گرامی کو جاری رکھیں اور یکم دسمبر سے پیشتر زرِ سالانہ ہے بذریعہ منی آرڈر دفتر کو بھیجکر ممنون فرمائیں۔ خط کا جواب نہ ملنے پر سالنامہ قیمت طلب وی پی کی صورت میں پوسٹ کیا جائے گا۔ جس کا وصول کرنا ان پر فرض ہے۔ (مینیجر)

مطبوعاتِ مکتبۂ اردو لاہور

لاہور کے علاوہ مندرجہ ذیل اداروں سے بھی دستیاب ہو سکتی ہیں:-

پشاور۔ مکتبہ سرحد یا صادق کمیشن ایجنسی، قصہ خوانی بازار پشاور۔
" ۔ سرحد بک ایجنسی، افغان بلڈنگ، بازار قصہ خوانی پشاور۔
کوئٹہ :۔ مسلم بک ڈپو۔ کوئٹہ
امرتسر۔ محمد صادق پاپولر بک سٹال، بیرون ہال دروازہ امرتسر۔
قادیان۔ عبداللہ خاں اختر جتوئی ایکسپریس نیوز ایجنٹ، قادیان
صوبہ بہار۔ نیا سنسار، کتاب گھر، بانکی پور پٹنہ
گونڈہ :۔ اسلامی کتب خانہ گونڈہ (اودھ)

ہماری زبان

دُنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے عمل کی ضرورت ہے۔ صرف باتوں سے کام نہیں بنتا۔ مگر ہمارے اردو نواز حضرات کو یا تو اس نظریے کی صداقت میں شبہ ہے یا پھر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو کی جڑیں اس قدر مضبوط ہو چکی ہیں کہ اب اس کی ترقی و اشاعت کے لئے کسی عمل کے مرہونِ منت ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ یہ باتیں دماغی تفریح کا سامان ہیں۔ ادھر ہندی نواز حضرات کو دیکھئے۔ وہ باتیں تو کم کرتے ہیں بلکہ کرتے ہی نہیں مگر چپ چاپ کام کرتے رہتے ہیں۔ نتیجہ اسی چپ چاپ کام کرنے کا نتیجہ ہے کہ ملک کے ہر گوشے میں ہندی کی نشر و اشاعت نہایت منظم طور پر ہو رہی ہے۔ کانگرس جیسی متحدہ قومیت کی علمبردار جماعت جس کا نصب العین ہی یہ ہے کہ ملک میں اتحاد پیدا کر کے آزادی کی جنگ لڑے اردو ہندی قضیئے کے سلسلے میں خاموشی کے ساتھ ایسے ایسے کام کر رہی ہے۔ کہ معمولی سمجھ کا انسان بھی ان پر اظہارِ حیرت کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کانگرسی وزارتوں میں ذمہ دار ہستیاں اردو کو نیست و نابود کرنے کے لئے عجیب عجیب ذرائع کام میں لا رہی ہیں اور کانگرس کے اقتدار اعلیٰ کا یہ حال ہے۔ کہ گُنگ ہے دیدم دم نہ کشیدم۔ ذیل میں کانگرس کے ایک نہایت ذمہ دار رکن کی ذہنیت آشکار کی جاتی ہے:۔

مسٹر سمپورنانند وزیرِ تعلیم یوپی، کا نام ہندی، ہندوستانی اور اردو کے سلسلہ میں اتنا مشہور ہو چکا ہے کہ اب جہاں کہیں بھی زبان سے متعلق وزیر صاحب موصوف کے ارشاداتِ گرامی کی خبر آتی ہے تو لوگ ہمہ تن گوش ہو جاتے ہیں۔ چند دن ہوئے ہندی لٹریری کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے وزیر صاحب تعلیمات صوبہ متحدہ نے قومی زبان کے متعلق فرمایا کہ ہندوستان کی قومی زبان ہونے کا شرف اسی قدرتی زبان کو ملے گا جس کے ذریعے ہندوستانی قوم اظہارِ خیال کیا کرے گی۔ اس جملہ میں اگر قومی قدرتی اور قوم کی اصطلاحیں نہ ہوتیں تو شاید جملہ کا کچھ مطلب نکل آتا۔ لیکن بڑی مشکل تو یہ ہے کہ انہی الفاظ کی تشریح کرنے کا ابھی تک وقت نہیں آیا۔ اس لئے یہ چیستان ہی بنے رہیں تو بہتر ہے سمجھنے والے سمجھ ہی جائیں گے۔ پھر بھی مسٹر سمپورنانند نے یہ بھی فرمایا کہ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ لوگ قومی زبان کی بناوٹ کے متعلق اس قدر اضطراب کا اظہار کیوں کرتے ہیں اور واقعی تعجب بھی ہے کہ قومی زبان کی جب یہ تعریف ہو چکی کہ وہ قدرتی زبان جس کے ذریعے ہندوستانی قوم اظہارِ خیال کیا کرے گی، تو پھر لوگ سمجھتے کیوں نہیں جبکہ قومی زبان کا اچھا نمونہ بھی مسٹر سمپورنانند جی خود پیش کر چکے ہیں —— آگے چل کر موصوف نے فرمایا کہ یہ کسی حکومت کے اختیار میں نہیں ہے کہ کسی موجودہ زبان کی شکل بدل دے یا ایک مصنوعی زبان نافذ کر دے —— معلوم نہیں مسٹر سمپورنانند جی نے یہ فیصلہ اپنے دو سالہ تجربہ کی بنا پر کیا ہے یا اس میں محض ایک طعن ہے —— چلتے چلتے مسٹر سمپورنانند جی نے اس کا بھی تذکرہ کر دیا کہ صوبہ متحدہ کی حکومت نے ایسی ہندی کتابیں اس غرض سے خریدی ہیں کہ کتب خانوں کے ذریعے دیہاتوں میں تعلیم دی جائے —— اس جملہ معترضہ کے بعد تو قومی زبان، قدرتی زبان، اور ہندوستانی قوم کی اصطلاحیں ذرا بھی مشکل نہیں ——

ہمیں بڑا افسوس اس بات کا ہے کہ یہ ہندی نوازی ایسے صوبے میں ہو رہی ہے جہاں کی زبان کو "ہندوستانی" کی تعریف مرتب کرتے معیار مقرر کیا گیا تھا۔ اور اس کے ذمہ دار کانگرسی حکومت کے ارکان ہیں۔ جس کے نمائندے نے تعریف مرتب کر کے خوشی خوشی اس پر دستخط کئے تھے۔

جو خریدار سالنامہ سنہ ۴۰ء کی بجائے سالنامہ ۳۹ء لکھ چکے ہیں

انہیں مطلع کیا جاتا ہے۔ سالنامہ سنہ ۴۰ء جو دسمبر ۳۹ء کے پہلے ہفتے میں شائع ہو رہا ہے انہیں قیمتاً ملے گا اسلئے انہیں دفتر کو جلد از جلد مطلع کر دینا چاہئے۔ کہ سالنامہ ۴۰ء انہیں وی۔ پی کے ذریعے بھیجا جائے یا وہ خود ایک روپیہ بذریعہ منی آرڈر بھیج دیں تاکہ پرچہ شائع ہوتے ہی انہیں ارسال کر دیا جائے —— مینجر

ضروری

جیسا کہ قارئین کو معلوم ہے۔ دسمبر کا پرچہ سالنامہ ہے اور خاص نمبر ہمیشہ ڈاک میں گم ہو جاتے ہیں۔ اسلئے اطلاعاً لکھا جاتا ہے۔ حضرات اپنا سالنامہ بحفاظت وصول کرنا چاہتے ہیں۔ وہ معاوضی ۳ آنے کے ٹکٹ رجسٹری کے لئے بھیج دیں۔ اس صورت میں رسالہ کے گم ہونے کا کوئی احتمال نہیں۔ —— مینجر

اثر صہبائی

سرگذشت

("ذکر و فکر" کا ایک ورق)

ہم نے کتنی ہی ٹھوکریں کھائیں
جب کہیں راہِ راست پر آئے

تھا نہ اک بھی نشانِ منزل کا
گو ہزاروں نشاں نظر آئے

میکدے میں کبھی رہے بدمست
کبھی کعبے میں سجدہ کر آئے

کوچۂ عقل میں پھرے برسوں
بے خبروں سے بھی مگر آئے

بارہا نقدِ دین و ایماں کو
مہ جبینوں کی نذر کر آئے

ناگہاں پڑ گئی نظر دل پر
دل میں وہ جلوہ گر نظر آئے

رات دن ان کی دید رہتی ہے
اب تو ہر روز عید رہتی ہے

احمد ندیم قاسمی

اختلافات

شفق کے پردوں سے تھرتھراتے ہوئے ستارے ابھر رہے ہیں
اُجاڑ سڑکوں سے ہولے ہولے تھکے مسافر گزر رہے ہیں
اُدھر وہ پورب کے پربتوں سے دھوئیں کا بادل اُبل پڑا ہے
اِدھر یہ سویا ہوا پپیہا ندی کنارے مچل پڑا ہے
اُدھر وہ بیمار چاند نے اپنے میلے کپڑے اتار ڈالے
اِدھر یہ قزاق جنگلوں میں نکل گئے لاٹھیاں سنبھالے
بدل گئے زندگی کے نقشے، کوئی مٹا، کوئی بن رہا ہے
کوئی لحد میں پڑا ہے خاموش، کوئی محلوں میں تن رہا ہے
کوئی گدا اپنا خالی کشکول دیکھ کر دم بخود کھڑا ہے
کسی کے قدموں میں سونے چاندی کا ایک انبار سا پڑا ہے
کسی کے بچے بلک رہے ہیں کہ رہ گیا ان کا پیٹ خالی
کسی کے ننھوں کے ہونٹ تر ہیں، تو جھلملاتی ہے منہ پہ لالی
کہیں نکلتی ہیں دل سے بیوہ کے ہچکیوں کی دبی صدائیں
کہیں نگاہیں یہ کہہ رہی ہیں کہ آؤ مل جل کے مسکرائیں
اُدھر وہ دیوار کے سہارے سے سو گئے پہرہ دینے والے
اِدھر یہ چوروں نے چپکے چپکے گھروں میں ہیں راستے نکالے
میں اپنی حسرت کا خون کر کے بھٹکتا پھرتا ہوں جنگلوں میں
وہ میرے غمخوار ناچتے پھر رہے ہیں سرسبز وادیوں میں
خدا کی یہ کائنات قائم ہے اختلافات سے صبوحی
کبھی تو پھوٹے گا چشمۂ نور، دکھ بھری رات سے صبوحی

صحرانورد کے خطوط پر ایک نظر

راحت مولائی

(قسط دوم)

رومانیت پیدا ہی اس وقت ہوتی ہے جب کسی رنگین خیال کو کسی رنگین طرز سے ادا کیا جائے۔ محض رنگین خیال، یا محض رنگین بیان مکمل رومانیت کی کبھی بھی تخلیق نہیں کر سکتے۔

انسانی فطرت کچھ اس نہج پر واقع ہوئی ہے کہ جذبات کی حقیقت کو بار بار محسوس کرنے پر بھی ہمارا دل و دماغ کوئی تکان محسوس نہیں کرتا۔ احساس جس قدر قدیم زمانہ اور جتنی مختلف نسلوں سے گزرتا ہوا ہم تک آتا ہے اتنا ہی ہمیں آسانی سے متاثر کر سکتا ہے۔ تازہ اور جدید تخیل ہمارے لئے "کل کی بات" ہوتی ہے رومان و علم دو مختلف ابواب ادب ہیں۔ علمی حقیقت صرف ایک دفعہ جانی جاتی ہے، رومانی خیال ہر مرتبہ نیا معلوم ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر مصنف اپنی کسی چیز کو ہمیشہ کے لئے انسانوں کے دلوں میں روشن اور زندہ جاوید کرکے رکھنا چاہتا ہے۔ تو اسے جذبات ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اسلئے ادبیات کا خاص انحصار جذبات پر ہے۔ علمی باتوں کو ثابت کرنا پڑتا ہے اور جذباتی کیفیات کو متحرک کرنا ضروری ہوتا ہے۔ "جذبات و حقائق تمام انسانوں میں یکساں ہوتے ہیں۔ لیکن تصنیف مصنف کی بالکل اپنی ہوتی ہے جذبہ کو اپنا بنا کر سب کا بنا دینا ہی ادبیات ہے"۔ یہ چیز تیمز ا میں اس قدر ترقی یافتہ ہے۔ کہ ہم فوراً جیسے پلاٹ تک کو تسلیم کر لینے میں ذرا پس و پیش نہیں کرتے۔

تیمزا کے ہر خط میں عشق و جمال کا وہ شدید جذبہ لہریں لیتا نظر آتا ہے۔ جس کی ادنیٰ سی رَو کائنات عالم کے تمام خس و خاشاک کو چشم زدن میں صاف کر دے۔ ان کے اس مقدس جذبہ کو دو طرح دیکھا جا سکتا ہے۔ . . . . وہ مقدس، بلند، اتنا ارفع ہے، جہاں عشق حقیقی کی روحانی پیاس تک کی تسکین ہو جاتی ہے۔ ترکی شاعر شہاب الدین کہتا ہے :-

بر ہمت ایچندہ جبس ایدرک انفعالی

روحم ایدر بو کتم ایلہ تقدیس انکسار

آہ عشق طویار شہیق تحسر ماء ملی !

بر مند یلک ایچندہ قالان عطر یادگار

(میرے ذرہ ذرہ پر وردوں کا طومار ہے، میں اپنی روح میں اس کے مٹنے کو چھپا لینے کی کوشش کرتا ہوں۔ میری حسرت کی سانسیں صرف اس خوشبو کو سونگھتی ہیں، جو اس عطرِ رخصت سے نکلتی ہے۔ جو رومال میں لگا ہوا ہے)

ادیب کی رنگیں نوائی سنیئے :-

"اس کے بعد میں خود کو نئی دنیا میں محسوس کرنے لگا، میرے افسردہ اور پژمردہ دن محبت کے حسین اور شہتوں میں لپٹے ہوئے تصورات کے رنگین و معطر ہو گئے، اور میری مایوس و مضمحل راتیں قلعے کی ساحرہ جمیل کے یاسمین جلووں سے پُر نور و خنداں۔ میری تمام کائنات سمٹ سمٹا کر قلعہ کی چار دیواری میں محدود ہو گئی۔ اور میرے خیالات ہر چیز سے ہٹ کر مرغشاہ چیشمہ کے گرد گھومنے لگے۔ راتوں کو میں مسرتوں میں ڈوبا رہتا۔ اور دن کو ان مسرتوں کے خیال میں غرق، آہ! یہ زندگی کیسی عجیب زندگی تھی خوابوں کی رنگینیوں میں تیرتی ہوئی، شہتوں کے گہوارے میں جھولتی ہوئی، اور مسرتوں کی لہروں میں بہتی ہوئی، خوش نصیب زندگی !!!"

شہاب الدین کے اشعار میں رومانیت کے ساتھ ساتھ ایک درد، ایک خلش، ایک بے تابی کی بھی آمیزش ہے جس کے ہونے یا نہ ہونے پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ مگر ادیب کے عشق و محبت میں وہی چیز ہے۔ جو ہمارے تجربہ اور مشاہدے میں آئے دن آتی رہتی ہے۔ اور جس سے ہم کسی طرح نامانوس نہیں ادیب یاس پرست فطرت کے قائل نہیں، وہ اپنی قوتوں پر یقین رکھنے والے انسان ہیں۔ ان کی رومان نگاریوں میں غم و الم کا پہلو اتنا نمایاں نہیں۔ جتنا مسرت و بہجت کا۔ وہ مسرت اور بہجت کو ایک مستقل حیثیت سے جہاں مسرت و انبساط کی جھلکیاں دیکھتے ہیں۔ وہاں یہ نہیں کہا جا سکتا، کہ غم و الم کی دل گدازیاں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں انسانی جذبات کی ایک ناقابلِ بیان دھوپ چھاؤں ملتی ہے۔ وہ کبھی جری سپاہی بن جاتے ہیں۔ کبھی رجز پڑھتے ہوئے ہمارے سامنے آتے ہیں کبھی بت بنے تن من، دھن سب کچھ تجتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کبھی محبوب کی معصوم اور بھینی بھینی خوشبوؤں سے لبریز آغوش میں ہمیشہ کے لئے سو جانا چاہتے ہیں اور کبھی اس کے گرم و شیریں تنفس کے ہلکے ہلکے جھکوروں میں عیش کی نیند کے مزے لینے لگتے ہیں وہ ہر جگہ۔ رومان پرست، رومان خیز، رومان نواز اور صحیح معنوں میں رومان نگار ہیں۔ ان کے جذبات حوصلہ مندانہ ہیں ان کی محبت نڈر اور دلیر ہوتی ہے۔ وہ محبت کے لئے حسن اور محبوبیت ضروری سمجھتے ہیں، وہ بغیر حسن کے محبت نہیں کر سکتے۔ ایک بدشکل و بدہیئت چیز

پر اپنے ژلیں و کثیف جذبات کی بھینٹ چڑھا ناحماقت ہے۔ وہ محبت کے بعد محبت کے متقاضی نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں ایک طرفہ محبت کا وجود نہیں۔ "حکایۂ جنوں" میں ان کا نقطۂ نظر کچھ بدلا ہوا ہے۔ ان کی نظریں ابتدائی افسانوں سے زیادہ وسیع ہوگئی ہیں۔ وہ یک نیا، ایک عجیب جذبہ لیکر آئے ہیں۔ مگر اپنی تمام مخصوص ادائوں اور حسن آفرینیوں کے ساتھ یہاں وہ صحیح شبابی کشمکش دیتی ہے۔ جس میں ایک محبت انجمن دل کا پڑنا لازمی امر ہے۔ حیاتِ انسانی کا پیام تخریب سُنیے:۔

" یہ داستان، جنون انگیز محبت کی تباہ کاریوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے —— محبت اور پھر جنون انگیز محبت —— !! خدا کی پناہ !!"

" یہاں بھی حسن و عشق کا ایک خونی کھیل کھیلا جاچکا ہے"۔

" تو کیا تم محبت کی ہلاکت آفرینیوں سے واقف نہیں؟"

" محبت انسانی زندگی کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ یہ ہر زمانے میں تباہی پھیلاتی رہتی ہے، اور ہمیشہ پھیلاتی رہے گی۔"

اس کے برخلاف :۔

" شاہینہ کی خوبصورت آنکھیں دو چاند تھے۔ جن کی عطر آگیں روشنی میں میرے دل کی دُنیا ہر وقت جگمگاتی رہتی۔ اور ہر روز علی الصبح جب قلعے کے مشرقی کُہر میں ملفوف مینار سے پرے، بلند درختوں کے اُوپر خورشید کے پیکرِ نوریں سے روشنی کی ندیاں بہنے لگتیں، میں محسوس کرتا کہ میری یہ دُنیا زیادہ روشن، زیادہ شاداب ہوگئی ہے"۔

" تمہیں واقعی شاہینہ سے محبت ہے؟ —— "تصورات سے بڑھ کر —!"

" . . . مگر اس دن میرے دل کے ذرّے ذرّے پر بے تابانہ مسرت یا سرورانہ بے تابی کی کیفیت چھائی ہوئی تھی"۔

" جب دل کہیں اور ہو تو ایک لمحہ بھی قیامت کی گھڑی بن جاتا ہے"۔

" . . . میرے دل میں نیا جوش، نیا ولولہ اور نیا جذبہ پیدا ہوا، مجھے محسوس ہونے لگا۔ کہ وہ دوشیزہ جسے میں انتہائی بے تابی کے ساتھ ڈھونڈ رہا ہوں۔ اور جو اپنے معطر جلووں سے میرے خوابوں کی فضاؤں کو مہکا رہی ہے۔ یہیں کسی پودے کے پیچھے، یہیں کسی تالاب کے کنارے بیٹھی ہے"۔

" محبت کرنے والا دل، محبت پر اختیار نہیں رکھ سکتا"۔ یعنی محبت کی نہیں جاتی، محبت ہوتی ہے"۔

" محبت میں انسان کا دل زیادہ مضبوط، اس کے ارادے زیادہ بلند اور اس کی روح زیادہ قوی ہو جاتی ہے۔ وہ ہر ایک مصیبت کا مقابلہ کرتا ہے اور بخندہ پیشانی کرتا ہے"۔

" مجھے دل میں محبت کا جذبہ اس نے شدت اختیار کرتا جاتا ہے۔ کہ وہ اپنی محبوبہ کو بار بار دیکھتا ہے"۔

" یہ پھول اور کانٹے ایک ہی کیاری کی پیداوار ہیں۔ اور ایک دوسرے سے کتنے متضاد ؟؟؟"

ادیب کے عشق و محبت کا دوسرا پہلو جمالیاتی ہے۔ قدرت نے ان کی تقسیم مذاق، اور تہذیب نگاہ میں مخصوص قوتوں کو صرف کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں انہوں نے قاری کے سامنے یا تو غلط طور پر کوئی حسن پیش کیا ہو۔ یا جہاں حسن نہ ہو، وہاں خواہ مخواہ حسن پیدا کرنے کی کوشش کی ہو جس طرح درزی کپڑے کو کتر بیونت کرکے ایک خوبصورت شکل میں تبدیل کر دیتا ہے، اسی طرح مبداء ازل نے ان کی فطری تہذیب میں ہر ممکن چابکدستی سے کام لیا ہے۔ ان کے جذبات میں کثافت نہیں تھی۔ وہ نفاست و لطافت کے حامل ہیں۔ ان میں بھی ایک حسن ہے، ایک دل گرفتگی ہے۔ میرزا حسن و عشق اور حیات و ممات کے دو راہے سے کبھی علیحدہ نظر نہیں آتے۔ وہ کشمکش میں بھی ایک سکون آمیز مسکراہٹ بکھیرتے رہتے ہیں۔ کشاکش میں بھی خود کو بے قابو نہیں ہونے دیتے۔ اس کی مثالیں ذیل میں ملینگی۔

رومان کا ایک جزو منظر نگاری بھی ہے۔ منظر کی تصویر کھینچنے میں بھی میرزا کو یدطولیٰ حاصل ہے۔ ان کو اپنے ماحول سے عشق معلوم ہوتا ہے۔ ان کے ہر خط میں وہ محبت رچی ہوئی ہے جو انہیں سبزہ زاروں، ریگستانوں، صحراؤں اور دیہی ہواؤں میں بسنے والے درختوں اور ان کی ترنم ریزیوں کے ساتھ ہے۔ ان چیزوں کو وہ الہامات تصوری کی جگہ دیتے ہیں۔ حسن فطرت اور فطرت کوئی محدود چیز نہیں۔ اگر چمن و بہار، مہتاب و آفتاب، ابر و انجم، شہر اور شہر کی ہنگامہ آرائیاں، تہذیب اور تہذیب کی خیرہ نگاہیاں حسن سے لبالب ہیں۔ تو عربستان کی بے آب و گیاہ وادیوں، حد نظر تک وسیع لق و دق بیابانوں سنسان و بے رونق مغیلستانوں، حدی خوانوں کے ویران راستوں، صحرا نشینوں کے تنبو اور ڈیروں، ساربانوں کی اُجڑی ہوئی پگڈنڈیوں، گدڑیوں کی سونی چراگاہوں، دور تک پھیلے ہوئے ریت کے ٹیلوں، اڑتے آہوؤں کے بے پروا خرام، ببول اور کھجوروں کے بے قاعدہ جھنڈوں اور پھر ان سب کے مہیب اور دہشت ناک سکوت میں بھی متجسس و حقیقت بین نظریں ہزاروں حسن اور لاکھوں نیرنگیاں دیکھ لیتی ہیں۔

" جس مصنف کا مکتب حریم کائنات ہو۔ اور اس کا درس نصاب حسن فطرت کے بے پناہ مناظر ہوں۔ ایسے مصنف کے سینے میں جلوے کیوں نہ تڑپیں، مستیاں کیوں نہ بیدار ہوں، روشنیاں کیوں نہ ابھریں"۔ ادیب کا اس گہرائی اور لوچ کے ساتھ صحرائی فضاؤں، افسانوی بھول بھلیوں اور رومانی مقامات

کی تصاویر اتارنا، خاص کر اس وجہ سے اور زیادہ قابلِ توجہ ہے۔ کہ وہ شہری زندگی، اس کے شور و شغب اور اس کی دلچسپی کے بھی بہت شوقین ہیں۔ اس خصوصیت میں ان کا مدِمقابل ترکی ادیب عبدالحق حامد ہے جس نے ترکی زبان کو، ادبی خیالات کے اظہار کا ایک اعلیٰ وسیلہ بنا دیا ہے۔ عبدالحق حامد کے یہاں وہ مافوق الفطرت جذبہ بھی بافراط ملتا ہے جس کا اوپر تذکرہ کر آیا ہوں۔ ادیب کی حسین منظر نگاری کی تصویریں دیکھئے۔

"میں نے کیا کچھ دیکھا؟ کیا کچھ محسوس کیا؟ بس یہ سمجھ لو کہ وہ سب کچھ دیکھا جو میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اور وہ سب کچھ محسوس کیا، جسے محسوس کرنے کی آرزو تھی۔ جاذبِ دل و نگاہ منظر، خوبصورت و مسرت بخش شفاف چشمے۔ اگرچہ ان کے ساتھ ہی مجھے صد کش مصائب بھی برداشت کرنا پڑے۔ صبح سے شام تک، شام سے صبح تک ہیبت ناک صحرا، سر بگردوں پہاڑوں کو سینہ پر اٹھائے اور ہیبت خیز دریاؤں کو پہلو میں لئے میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ ہیبت ناک صحرا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کی عظمت و ہیبت نے جسم اختیار کر لیا ہے۔ ہر لمحہ، ہر گھڑی، وہ وہ محیر العقول اور تحیر آفریں واقعات نگاہوں کے سامنے گذرتے ہیں جنہیں کبھی الف لیلہ کے ہوش ربا افسانوں میں پڑھا تھا۔"

"ہوا کے تیز و تند جھونکے شور مچاتی ہوئی خوفناک آندھی کی صورت اختیار کر کے لمبے لمبے درختوں سے دیوانوں کی طرح ٹکرا رہے تھے۔ زرد زرد چاند، ایک سفید ابر پارے کے پیچھے کفن میں لپٹی ہوئی ایک نعش کی طرح دکھائی دیتا تھا۔"

"میری نگاہوں نے، ہیبت آفریں صحراؤں، ہولناک پہاڑوں، مٹی اور ریت کے عظیم الہیئت تودوں، گنجان اور بلند درختوں کے علاوہ شاذ و نادر ہی کوئی چیز دیکھی ہے۔ اب مجھے قدرت کے ان مہیب مناظر سے محبت ہو گئی ہے۔ اور جیسے جیسے میرے قدم آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ نئے سے نئے، متحیر کن سے متحیر کن واقعات سامنے آتے جاتے ہیں۔ دوست! میں ایک ایسی دلآویز، رومانیت انگیز دنیا میں سانس لے رہا ہوں، جس کی دلچسپیاں تمہارے تصورات سے بھی بالاتر ہیں۔ صبح جب میری آنکھ کھلتی ہے، آفتاب کی شعاعِ اولیں میرے لئے ایک رومانِ تازہ، اپنے آغوشِ نور میں لے کر آتی ہے۔ اور ہر شام، رات کی تاریکی عجیب غریب پُراسرار واقعات کی دنیا دامن میں لئے ظاہر ہوتی ہے۔ یوں سمجھو صحرا ایک طویل کتاب ہے جس کے صفحے صفحے پر بے شمار رومان بکھرے پڑے ہیں۔ میری نظریں بھونرے کی مانند، جو پتی پتی کا رس چوستا ہے اور اس پر بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی، نئے نئے رومانوں کو پڑھ رہی ہیں۔ چند دن سے میں افریقہ کے صحرا کبیر شمالی زار میں اپنے رفیقِ سفر آغا بہرام کے ساتھ، قدرت کی دل آویز پرکیف اور دلکش نظاروں میں گھرا ہوا ہوں۔ اور یہاں اتنی دلچسپی محسوس کر رہا ہوں۔ کہ اس کے عوض شہری زندگی کا جادو بھی نہ لوں۔"

"کچھ دیر کے بعد ہم نیل کے کنارے پر ٹہل رہے تھے۔ اور نیل کی رنگین و رواں موجیں، بار بار اٹھ کر، ہلکا سا ترنم پیدا کر کے، ساحل پر بکھرے ہوئے کہنہ اور دھندلے معروف جہازوں کے شکستہ ٹکڑوں، چھوٹی چھوٹی چٹانوں، ریت اور مٹی کے تودوں سے ٹکرا ٹکرا کر واپس جا رہی تھیں۔ پانی کے سینے پر چھوٹی چھوٹی کشتیاں بہت خوبصورت دکھائی دے رہی تھیں ملاحوں کے ترنم ریز گیتوں سے فضا معمور تھی۔ ایک طرف معبد مصر کی بلند عمارت، سر اٹھائے اس منظر کو دیکھ رہی تھی آسمان کی مشرقی وسعتوں میں خدائے رع عظمت و جبروت کے ساتھ نمودار ہو رہا تھا۔ ہر چیز دھند کے پردوں میں لپٹی ہوئی تھی۔"

"ہر طرف، دور دور پھیلے ہوئے لق و دق صحرا میں چلنا، شیریں چشموں کے کنارے خیمہ زن ہونا، کبھی کبھی قافلوں کو صحرا نوردی کرتے ہوئے دیکھنا، ان کے اونٹوں کی گھنٹیوں کی خوش آئند آواز کو سننا، طلوعِ آفتاب کے وقت ریت کے عظیم الہیئت خوفناک تودوں کے عقب میں مشرقی آسمان کی نیلگوں وسعتوں کو سیلابِ نور میں نہاتے ہوئے دیکھنا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی الوداعی کرنوں کو، ٹیلوں کی پیشانی پر حسرت خیز نگاہیں ڈالتے ہوئے محسوس کرنا، عجیب عجیب محو شدہ صحرائی داستانوں کو سننا، ۔۔۔ آہ! یہ واقعات کتنے مسرت بخش ہیں؟ ۔۔۔ کس درجہ دلآویز؟؟ ۔۔۔"

"ایک دن شام کے وقت میں ساحلِ دریا پر، ایک چٹان سے سہارا لگائے، دور افق کی آغوش میں آہستہ آہستہ بہتی ہوئی ایک کشتی کو دیکھ رہا تھا۔ سیاہی بتدریج پھیل رہی تھی، آسمان کے گوشۂ مغرب میں شفق کی سرخیوں کے

درمیان ڈوبتا ہوا سورج ایک زخمی، خون میں شرابور سپاہی کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ جو میدانِ جنگ میں تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہا ہو۔ دریا کے دوسرے کنارے پر دیوی ساتمو کے مندر کے عقب میں، بلند، سوکھے سوکھے درخت ظلمت پوش فضا کی لاانتہائیوں میں غائب ہوتے جا رہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک آدھ کشتی ہلکا سا شور پیدا کر کے، روانہ ہو جاتی اور جب تک وہ دوسرے کنارے پر نہ پہنچے، ملاح کے گیت سے فضا میں مترنم ارتعاش چھایا رہتا۔ ملاحوں کے گیتوں سے مجھے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے اور میں ان کو بڑے شوق سے سنتا رہا ہوں۔ اس وقت بھی ملاحوں کی معصومانہ آواز میرے شوق کے لئے سامانِ تسکین پیدا کر رہی تھی ——"

تاریخ، رومان، منظر اور بیان کی ہمہ گیر پیوستگی ملاحظہ ہو:-

"بابل کے متعلق تم نے تواریخ میں بہت کچھ پڑھا ہوگا۔ اور شاید میری طرح یہ پُراسرار نام لیتے ہوئے تم بھی اپنے دل میں ایک عجیب کیفیت محسوس کرتے ہوگے —— میں جب اس کا خیال کرتا ہوں۔ تو میرے تصور کی نگاہوں کے سامنے، ماضی کے بحرِ بے پایاں کی سطح پر ایک ایسا شہر نمودار ہو جاتا ہے۔ جس کے اونچے اونچے ہیبت ناک مینار، پُر اسرار باغ، شاندار معبد، ہزاروں سال پیشتر کی انسانی زندگی کے حالات سناتے ہیں۔ بابل —— انسانیت کا اوّلین گہوارہ جہاں دُنیائے قدیم کا قاہرِ اعظم سکندر سو رہا ہے۔ جہاں دریائے فرات کے کنارے یہودی ولی "عذرا" ابدی خواب میں محو ہے۔ جہاں نمرود نے خدائی کا دعوے کیا اور پھر انتہائی ذلت کے عالم میں موت کے گھاٹ اُتر گیا۔ جہاں اپنی محبوبہ اشارت کے لئے ایک قاہر بادشاہ —— بخت نصر اعظم نے معلق باغات لگوائے۔ بابل —— جہاں عیاش بادشاہ بیلشضر کے شاہانہ غرور نے شاندار مگر آخری بزمِ عشرت میں "مقدس پیالوں" کی توہین کی۔ بابل —— جہاں عیش پرست بادشاہ ہیرودوس نے اپنی سوتیلی بیٹی سلومی کے سحر زا حسن پر عاشق ہو کر فطرت کے انتقام کو جھنجھوڑا۔ بابل —— سحر و جادو کی سرزمین، حسن جمال کی وادی، عشق و محبت کا شہر —— بابل ——

دنیا کے ایک گوشے میں، کھنڈروں کی صورت میں عظمتِ پیشیں پر ماتم کرتا ہوا، بدنصیب بابل !!! —— آہ! میرے دوست: اس وقت میرے دل کی عجیب کیفیت ہے۔"

"میرے دُور افتادہ دوست! تمہیں کیونکر بتاؤں کہ میں کیا محسوس کرتا ہوں، میرے احساسات میرے احساسات ہیں۔ تمہارا ذہن ان کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ اور کیوں نہ قاصر ہو، میرے اور تمہارے درمیان ایک دنیا حائل ہے۔ تم کائنات کے ایسے خطے میں ہو، جو شہر ہے۔ جہاں زندگی بجلی کے رنگین قمقموں، آبادی کے مختلف ہنگاموں، اور تہذیب تمدن کی گوناگوں برکتوں میں قہقہے لگا رہی ہے۔ میں کرۂ ارض کے ایسے گوشے میں ہوں، جہاں زندگی سورج، چاند اور ستاروں سے چمکتی ہوئی فضا میں ایک رنگین خواب بنی ہوئی ہے..... میں صحرا کی لامحدود فضا میں دور کہیں نگاہیں جما کر، خود کو ایک ایسی کیفیت کے حوالے کر دیتا ہوں جس کا تجزیہ میری قوتِ تحریر اور وسعتِ زبان سے باہر ہے۔ مغرب کی جانب جب تاریکیٔ شب اپنے لمبے لمبے خوفناک ناخنوں سے آفتاب کے سینہ کو چیر ڈالتی ہے اور پھر اس آغشتہ بخوں نعش کو اپنے دامن میں چھپا لیتی ہے۔ تو میں حیران ہوتا ہوں کہ یہ صحرا کی دُنیا کیسی دنیا ہے۔ یہاں آبادی نہیں، پھل دار درخت نہیں، شہر کے ہنگامے نہیں، ..... مگر اس کے باوجود اس میں اتنی جاذبیت کیوں ہے؟ یہ دنیا، یہ ہر طرف پھیلے ہوئے، چمکتے ہوئے ذراتِ ریگ کی دُنیا، یہ بڑے بڑے وحشت انگیز، وحشتناک تودوں کی دُنیا، یہ سوکھے سوکھے لمبے لمبے بدنصیب درختوں کی دنیا کیوں اتنی دلآویز؟ کیوں اس قدر رومان پرور کیوں اس درجہ حسین دنیا ہے۔ میری زندگی دنیائے رومان کا ایک سحر آلود خواب بن جاتی ہے۔ دل سے پوچھتا ہوں ان ذروں کے سینہ پر کیا کچھ ہوا ہوگا؟ عشق و محبت کے کیسے کیسے خوفناک کھیل کھیلے گئے ہوں گے؟ جاں سپاری کے کون کون سے مظاہرے کئے گئے ہوں گے؟ اور پھر موت کے پنجے میں کس کس اذیت سے انسانوں نے جان دی ہوگی؟ یکایک میرے سامنے عالمِ تصور میں عجیب عجیب مناظر رونما ہوتے ہیں، اور میں گھنٹوں خاموش، بے حس و حرکت بیٹھا رہتا ہوں،

اس عالم کیف میں میرے دل میں آرزو پیدا ہوتی ہے۔ کاش
اس صحرا، دشت و دہشت کو پالنے والی اس مہیب دنیا میں
حسن و عشق کا ایک ایسا کھیل بھی کھیلا جائے جس میں میں
کے زلف میں ادا کروں!۔ اس وقت جبکہ حسن کی نگاہیں
میرے عشق جنوں پرور پر مہربان ہو جائیں گی۔ میں اپنی زندگی
کو حقیقی معنوں میں زندگی سمجھوں گا۔ ان ہی خیالات کے طلسم
میں محسوس کرتا ہوں۔ کہ میرا سر ایک نازنین آغوش میں ہے
یہی خواب تمام رات میرے دل و دماغ پر چھایا رہتا ہے۔
یہاں تک کہ میری آنکھ کھل جاتی ہے میں دیکھتا ہوں۔ کہ
رات کی ملکہ چاند کی بجھی ہوئی مشعل ہاتھ میں لئے عدم کے
غار میں داخل ہو رہی ہے۔ . . . . "

ادیب کے ان رنگین تخیلات کو پڑھ کر مجھے انگریزی زبان کے ارنلڈ بینٹ اور اس مشہور جاپانی شاعر) سٹونسن یاد آنے لگتے ہیں بینٹ مارتن کے جمالیاتی ذوق، بینٹ کے مشاہدات زندگی اور سٹیونسن کی تخیل پروری کا حد درجہ قائل ہوں۔ مگر ادیب کی خوبصورتیوں پر غور کرتا ہوں۔ تو خود ہی یہ اعتراف بھی دیکھتا ہوں۔ کہ ہمارا ایک مصنف بڑے مصنفین کے مقابلے میں کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ ادیب نے اپنے پلاٹ اور موضوع کے انتخاب میں۔ رومانیت اور ان کے بیان کرنے میں حقیقت نگاری سے کام لیا ہے۔ ان کے موضوعات بالعموم عہد قدیم کی ان رومانیت خیز داستانوں سے ماخوذ ہیں جن کی دلچسپی اور محویت کا یہ عالم ہے۔ کہ جاڑے کی تمام تمام راتیں ان ہی کے سننے میں گزر جاتی ہیں اور باقی ماندہ سننے کے لئے ہر آنے والی رات کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔

خطوط بجائے خود ایک جدت ہیں۔ اپنے اندر ایک مخصوص رنگ رکھتے ہیں لیکن ان کی تکمیل بھی اسی حسن و کمال کے ساتھ کی گئی ہے۔ جس کے وہ متقاضی تھے مناظر کی تصویریں، مافوق الفطری قصص، صحرائی زندگی پر کاملانہ عبور، اور اس کی سرشت و واقعیت کو سمجھنے کی وجدانی قوت، وضاحت اور تفصیل پھر زبان کی شستگی اور شیرینی و روانی، ہمارے سامنے ایسی جیتی جاگتی تصویریں پیش کر دیتی ہیں۔ کہ حقیقت اور افسانہ کا فرق بالکل مٹ جاتا ہے۔ مشہور روسی ادیب گوگول گو اپنے تخیل کے زور اور بیان کی تفصیل میں میرزا سے بڑھا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر موضوعات کے تنوع اور مضامین کی اختراع میں ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچتا۔ بقول کسی کے "وہ ایک آنکھ سے روتے ہیں اور ایک آنکھ سے ہنستے ہیں"۔ اور پھر رونے والی آنکھ ہنستی اور ہنسنے والی آنکھ روتی ہوئی نظر آتی ہے۔

خطوط کی تیسری خصوصیت ان کے نفسیاتی نکات ہیں۔ یہ موضوع اس قدر دلچسپ مگر اتنا طویل ہے۔ کہ جس پر دل کھول کر لکھنا موجودہ محدود جگہ میں سراسر جرم معلوم ہوتا ہے۔ انگریزی ادب میں ہنری جیمس، ٹامس ہارڈی، جین آسٹن گالسورودی اور برنارڈ شا اس موضوع کے نمایاں علمبردار ہیں ۔۔۔ گالسورودی بحیثیت اجتماعی کی خامیوں اور کمزوریوں کو بڑی بے رحمی سے بے نقاب کرتا ہے۔ میرے خیال میں اس سے بہتر کسی نے آج تک کردار و اخلاق کا اس طرح تجزیہ نہیں کیا۔ اس کے یہاں طنز و تضحیک کے وہ سم آلود نشتر نہیں ہیں جن سے شا آراستہ و پیراستہ ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ بہ نسبت شا کے گالسورودی قاری کے دل پر زیادہ اثر کرتا ہے۔ شا درد ناک سے درد ناک باتوں کو مضحکہ بنا دیتا ہے۔ جو بعض اوقات ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ جین آسٹن فطرتاً اور عمداً دونوں طرح خود ہی فطرت انسانی کا کوئی تاریک، ادق اور الجھا ہوا مسئلہ لیکر اٹھتی ہے اور بڑے حسن اور بڑی آسانی کے ساتھ اس کو سلجھا دیتی ہے۔ اس کا قلم کہیں نہیں رکتا۔ وہ قاری پر یہ اثر نہیں ہونے دیتی۔ کہ وہ کسی جگہ غور کر کے لکھ رہی ہے۔ میرزا ادیب میں نہ گالسورودی اور شا کا طنز و تمسخر ہے اور نہ جین آسٹن کا قبل از وقت فکر و تامل۔ وہ جیمس اور ہارڈی کی طرح نفسیاتی پہلو کو زیادہ اجاگر کرنا چاہتے ہیں اس کو ابھار دیتے ہیں وہ نہ چٹکیاں لیتے ہیں۔ اور نہ پہلے سے کوئی مسئلہ سوچتے ہیں۔ وہ ہارڈی سے بھی بالکل متفق نہیں۔ ہارڈی کے یہاں صرف قنوطیت ہے اور ادیب کے پاس ایک مخصوص رجائیت! یہ چیز جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں۔ ابھی گردش روزگار سے تمامی طور پر واقف ہونے کی کمی کی بنا پر ہے۔ انہیں ابھی دنیا کی ان سیاہ کار فطرتوں سے اتنا واسطہ نہیں پڑا ہے جتنا عام انسانوں سے۔ ابھی وہ اس چیز سے کامل طور پر واقف نہیں ہوئے ہیں جس کی ان کے اندر کہیں کہیں جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ وہ رجائیت کے حامی ضرور معلوم ہوتے ہیں۔ مگر دنیا کی ابلہ فریبیوں اور انسان کی ستم رانیوں سے گھبرا بھی اٹھتے ہیں۔ ہارڈی کا مشاہدہ ان کے مشاہدہ سے بہت زیادہ تھا اور ادیب ابھی جوان کیا بلکہ نوجوان ہیں۔ شاید منازل حیات کی مسافت ان کو وہاں تک پہنچا دے جہاں ہارڈی نے کھڑے ہو کر کسی چیز کی خوبی ظاہر کرنے کے لئے۔ اس کی برائی اور تاریک پہلو کو خوب روشن کیا ہے۔ اور جہاں گناہ کے اندھیروں اور حسرت و یاس کی تاریکیوں میں وہ ایک خاص لطف محسوس کرتا معلوم ہوتا ہے۔ ساتھ ہی میں اس نتیجہ پر بھی پہنچا ہوں کہ میرزا کی قنوطیت بکنار رجائیت ان کے افسانوں میں ایک خاص حسن کے اضافہ کا باعث ہے اگر وہ اپنے اس مخصوص رنگ سے نہ ہٹے اور اسی طرح اس پر قائم رہے۔ تو شاید یہ چیز ان کی اپنی چیز ہوگی اور اس خصوصیت میں ان کا کوئی مد مقابل نہ ہو سکے گا۔ مذکورہ سطور میں ان کی رنگین نوائیوں اور رومان نگاریوں کے نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ اب اس تلخی حیات پر ان کا گرجنا بھی سنئے۔

" اگر مجھ سے پوچھا جائے۔ کہ انسانیت کا سب سے بڑا دشمن کون ہے تو میں ذرہ بھر تامل کئے بغیر کہدونگا کہ انسان ——— کون شخص اس سے انکار کر سکتا ہے۔ کہ انسانیت کی چھاتی پر انسانوں ہی نے خنجر کے لگائے ہیں۔ فطرت کی تباہکاریاں انسانوں کے خون کی ندی بہانے پر ہی اکتفا کرتی ہیں مگر جب انسان کی فطرتی بربریت انسانوں کا خون بہانے پر تل جاتی ہے، تو دنیا کے ہر گوشے میں خون کے دریا بہنے لگتے ہیں۔ تاریخ کے اوراق پلٹو، تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ کہ طاقتور انسانوں اور کمزور انسانوں میں کیا کچھ ہوتا رہا ہے۔ سنگدل فتح یابوں اور بدنصیب مظلوموں نے کون سا نظارہ پیش کیا ہے۔ اور پھر بہادر افواج نے متمدن ممالک کے ساتھ کیا کچھ کیا ہے؟؟؟ کیا تم اس حقیقت کو جھٹلا سکتے ہو کہ فتح کی صبح اس وقت نمودار ہوتی ہے جب کروڑوں انسانوں کی قیمتی زندگیاں موت کی تاریکی میں تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیتی ہیں۔ یا تم اس امر سے انکار کر سکتے ہو۔ کہ صرف ایک انسان کی عظمت کے چراغ کو روشن کرنے کیلئے بے شمار انسانوں کے خون کو تیل بنا دیا جاتا ہے ———

ابتدائے آفرینش سے انسان انسانوں کے خون سے ہولی کھیلتے چلے آرہے ہیں۔ تکوین کائنات سے لے کر اب تک انسانوں ہی کے ظلم کا سیل بے پایاں انسانیت کے زخمی سینے سے ٹکرا رہا ہے۔ ہمیشہ سے بربریت کے علمبردار انسان بے گناہ انسانوں کی خونچکاں لاشوں کو روندتے ہوئے فتح کے دروازے تک پہنچے ہیں۔ چنگیز، ہلاکو، سکندر، ہملکار، ہنی بال، بخت نصر، طیطس، سیزر، تیمور، اور نادر موت کی آگ کے آتشیں شعلے، تباہی کے سمندر کے غضبناک طوفان اور بربادی کی آندھی کے ہلاکت آفریں جھونکے بن کر آباد و شاداب کرۂ ارض پر آئے اور شہروں کو خاک تودے، آبادیوں کو لق و دق صحرا۔ اور بارونق ملکوں کو ہولناک قبرستان بنا کر عدم آباد کو چلے گئے . . . ."

میرزا نے انسانی نفسیات کا تجزیہ جس ہوشیاری اور ہنرمندی سے کیا ہے۔ وہ بہت کم ادیبوں کو نصیب ہوتی ہے۔ نفسیات افسانہ کا بڑا اہم جزو ہے اور اس قدر ادق کہ اس کا خوبصورتی سے نبھانا بڑا مشکل کام ہے۔

ادیب عورت، مرد، بوڑھے، بچوں کی فطرتوں کا جس گہری نظر سے ... ہوئے ہیں۔ اس نے ان کے افسانوں کو بہت بلند و برتر کر دیا ہے۔ "سیل حوادث" میں شیرتی کی طفلانہ اداؤں اور اس کی ... کی پوری تصویر کی ہے۔ نفسیاتی نکات کا اندازہ کرنا ہی فی نفسہ ... نہیں ہے۔ بلکہ اس کو اس کی صحیح جگہ پر بیان کرنا بھی خود کوئی ... ادیب نے موقعہ و محل کی نزاکت کے تقاضے کے مطابق ان پردوں کو ... جو نفسیات انسانی کو عام نظروں سے چھپائے رہتے ہیں۔

میرزا کے خطوط میں بعض بعض جگہ نفسیات کا ایک مخصوص ... کیا گیا ہے اور وہ اظہار نفس ہے۔ ان کا کردار کسی جگہ جذباتی ... "داخلی شدت" یا "واردات اخذ" سے اس قدر مجبور ہو جاتا ہے۔ کہ ... کے افق پر ہونے والے واقعات نظر آنے لگتے ہیں اور اس طرح ... اسی کے احساسات و شاعر ہیں یا ان کا کوئی جزو:-

" ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ کوئی روح فرسا راز منکشف ہونے والا ہے، کوئی خوفناک بھید ظہور میں آنیوالا ہے"

" ایک مبہم خوف میرے دل پر چھاچکا تھا۔ اور میں محسوس کر رہا تھا۔ کہ کوئی بہت بڑی مصیبت ہم پر ٹوٹنے والی ہے"

" ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ وہ مہیب ناگ انسان جیسا دنیا ساحر کہتی ہے، میرے دل کی دھڑکن کو سن رہا ہے، اور ابھی اس کے خونخوار پنجے میرے سینہ کیطرف بڑھینگے۔"

میرزا کی یہ خصوصیت موتی میں زیادہ نمایاں نظر آتی ہے ... کا افسانہ ایک عجیب الہیئت احساس کا حامل ہے جو اردو ادب میں ... چیز ہے۔ "پیمانہ" مرحوم (آگرہ) میں ایک مرتبہ "روح کا فنکار" ... تھا جو باوجود تمام افسانوی خصوصیات کے باوجود اس لئے معیاری ... نہیں کہا جا سکتا۔ کہ اس کا پلاٹ مخصوص طور پر اسی خیال پر تعمیر کیا گیا ... اس قسم کے خیال کو پلاٹ میں اس قدر نمایاں کر کے نہیں لانا چاہئے اس کو اس طرح رہنا چاہیئے۔ جیسے دریا کی تہ میں بہتی ہوئی کوئی ... ادیب اس نکتہ کو سمجھتا ہے۔

ادیب کی نظر انتخاب عہد عتیق کی داستانوں پر پڑی اور ... ان میں روح پھونک کر ان کو اپنا لیا۔ مگر اس کے باوجود ہم کسی ... محسوس نہیں کرتے۔ کہ وہ واقعات ہماری زندگی کے علاوہ کچھ ... ان کے کردار تک ہم ہی میں سے چند نفوس معلوم ہوتے ہیں۔ ہم ... پھرتے محسوس ہوتے ہیں اور ان کے واردات زندگی سے جو تجربات

روستان اخذ کئے جاتے ہیں۔ وہ بھی ہماری ہی زندگیوں پر منطبق ہوتے ہیں
کہ بتانا ہوں کہ میرزا اپنی اس خصوصیت اور اپنے اس فرض سے عہدہ
برآ ہونے میں نہایت کامیاب ہیں۔ میں ان کے اس درسیاتی پہلو کو کہیں
بہتر مثالیں دے کر زیادہ واضح کرسکوں گا۔ ملاحظہ فرمایئے :۔

"... بیوہ عورت کی بددعا سخت خوفناک ہوتی ہے۔"

"... زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے۔ جس
میں ذراسی غلطی کرنے سے انسان اپنی تمام زندگی تباہ
کر لیتا ہے۔"

"... طرح بھنبھناتی ہوئی مکھیاں زخم پر بیٹھنے کے لئے بیتاب
ہوتی ہیں۔ اسی طرح رقاصہ بھی صرف دولت کے لئے
بے قرار ہے۔"

"وہ کہتے ہیں جان دے دینگے۔ مگر اصول کو نہیں چھوڑینگے۔
وہ حکومت کے دل میں رحم پیدا کرنے کے لئے قربانیاں
نہیں کر رہے۔"

"تو پھر اور کس لئے؟"

"اصول کے لئے۔"

"کونسا اصول؟" ——

"وطن پرستی!"

"... ہم میں سے ایک شخص اٹھا اور اس نے اہل وطن
کے سینوں میں سوئے ہوئے جذبہ وطن پرستی کو جھنجھوڑ
کر بیدار کرنا چاہا۔ اور اسی قابل احترام فرض کی ادائیگی
میں پہلے اپنی آنکھیں اور پھر اپنی جان دیدی۔"

"اگر اہل وطن کے دل سے وطن پرستی کا جذبہ مفقود ہو جائے
تو پھر ظالم حکومت کے ظلم و ستم کا شکوہ کیا معنی رکھتا ہے؟"

"وطن کے لئے میرے باپ نے جان دی اور اسی فرض کے
لئے میں بھی اپنی جان دوں گی۔"

"مجھے تخت کی ضرورت نہیں —— میں اپنا فرض ادا کر
رہی ہوں —— اپنے محترم باپ کے نقش قدم پر چل
رہی ہوں۔"

"... فرائض جان کی قیمت پر ادا کئے جاتے ہیں۔"

اب ان خطوط کو ادبی و فنی نظر سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ ادب
میں اصول رائج ہیں۔ دماغی، اخلاقی اور جمالی۔ اور ان تینوں کی
کامیابی یا ناکامی در اصل انسانی فطرت کی ساخت پر مبنی ہے۔ دماغی شکل
کو اصول منطق، اخلاقی کو اصول اخلاص اور جمالی کو اصول حسن سے تعبیر کیا جا
سکتا ہے۔ جب تک کسی مصنف کا منطقی تخیل مضبوط و مستحکم نہیں اس میں
یہ قابلیت نہیں کہ وہ حقائق و ماہیت، مقاصد، متعلقات کا جو وہ ہمارے
سامنے پیش کرتا ہے صحیح طور پر تصور کر سکے۔ اسکی کوشش میں کوئی نہ کوئی
عیب ضرور پایا جائیگا۔ اگر وہ ہم کو کوئی چیز دکھانا چاہتا ہے۔ تو پہلے اس کو
خود وہ چیز صاف طور سے دیکھ لینی چاہیئے۔ جب تک کسی مصنف میں خلوص
نہیں وہ کامیاب مصنف نہیں۔ جو کچھ وہ لکھتا ہے اس میں ایک یقین، ایک
خلوص ایک صداقت ہونی چاہیئے ورنہ قاری کا یقین مجروح رہیگا۔ خلوص چاہے
غلط ہو لیکن ادب میں ایک صحیح استحکام کا باعث ہوتا ہے۔ اخلاص تخلیق کا
لازمی جزو ہے۔ دوسروں کے جذبات رنج و غم کا اندازہ ہم صرف اپنے نفس کے
واسطے سے کر سکتے ہیں۔ بیرونی نتائج ہم میں صداقت بیانی اور حقیقت نگاری
پیدا نہیں کر سکتے۔ آخر میں جب تک مصنف میں اپنے خیالات کی ادائیگی اپنے
طرز اور اپنی تحریروں کو ایک خاص خوبی ایک خاص حسن دینا نہیں آئیگا اسکی
تمام قوتیں رائیگاں جائینگی اور وہ اپنی تصنیف کو مقبول کرانے میں ناکام
رہے گا۔ تصنیف میں صداقت، بلندی، بیان، خلوص اور فن ہی وہ
چیزیں ہیں جو ان کو حیات دوام بخشتی ہیں۔ صداقت ادب کا اصل مقصد
ہے۔ خلوص اخلاقی صداقت کا دوسرا نام ہے۔ اور حسن جمالی صداقت کو
کہتے ہیں

بیان افسانے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ میرزا کے افسانوں کی
زبان میں حلاوت، الفاظ میں جدت، ترکیبوں میں دلکشی و ندرت، فکر و
جستجو میں ابداع و اختراع، بیان میں جوش و مستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے
وہ اپنے بیان اور اپنی زبان کے زیادہ قائل معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن باوجود اس
کے ان میں آورد اور تصنع کا کہیں نام نہیں ان کے حسین اور خوبصورت الفاظ
میں خیالات کی سی روانی پائی جاتی ہے۔ اور ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ محض زبان
لکھنے کے شوق میں لفظ لکھے گئے ہوں۔ انہوں نے افسانوں میں بیان کی تمام
ضروریات و خصوصیات کی پابندی کی ہے۔ نادر تشبیہات خوبصورت استعارات
الفاظ کی حسین تکرار، پرمعنی تراکیب، نئی نئی اضافتیں، بیان کا زور سب
چیزیں ملتی ہیں۔ بیان کی خوبیاں ملاحظہ ہوں۔ رنج و مسرت کو کس طرح وصل
کر دیا ہے :۔

"جس طرح شفاف پانی سے بھرے ہوئے چشمہ کی تہ میں کہیں
کہیں گدلا پن ہوتا ہے، اسی طرح میری خوشیوں کے عقب
میں اضطراب کی لہریں بھی دوڑ رہی تھیں۔"

بیان میں زور اور قوت بے پناہ ہے :۔

"جہاز افق کی جانب بادبان پھیلائے، سمندر کی نیلگوں سطح پر، ہچکولے کھاتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ اور میرا دل زرین مستقبل کی خوابناک فضاؤں کی آغوش میں تیر رہا تھا۔ اگر انسان کی نگاہیں ہر آن ان لمحوں کو دیکھ سکتیں جو ابھی مستقبل کے غار کی گہرائیوں میں چھپا ہوا ہے اور عنقریب تباہیوں اور بلاؤں کے ہجوم کو دامن میں لئے اس کی زندگی پر حملہ کریگا۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ اس کے قہقہوں کے عقب میں کتنے دردناک آنسو اس کے منتظر ہیں۔ اگر اسے اس حقیقت کی خبر ہوتی، کہ اس کی امیدوں اور اس کی آرزوؤں کا گلا گھونٹنے کے واسطے کتنی ہولناک ناامیدیاں اور نامرادیاں گھات میں تیار ہو رہی ہیں۔ آہ! اگر اسے اس کا پتہ ہوتا کہ ہر قہقہۂ مسرت ایک نالۂ خونیں ایک بلندۂ آہ اپنے ساتھ لائے گا۔ تو یہ بدنصیب ہستی ایک لمحہ کیواسطے بھی زندہ نہ رہ سکتی۔ یہ ہماری خوش آئند امیدیں ہیں، جو ہمارا ہاتھ تھامے مستقبل کے سہانے خواب دکھاتے، زندگی کے تنگ و تاریک راستوں پر لئے جا رہی ہیں۔"

واقعی انسان فطرتاً رجائیت کا جذبہ لے کر آیا ہے۔ اور جب تک وہ زندہ رہتا ہے محرومیوں کے باوجود مستقبل کے ساتھ ایک آرزو وابستہ رکھتا ہے۔ زمانہ اور اس کا انقلاب یا تو انسانی قلوب کو مدفنِ تمنا بنا دیتے ہیں یا گلشنِ آرزو۔ لیکن انسان جب ماضی کا جائزہ لیتا ہے۔ تو اس کی کامرانیاں بھی محرومیوں سے زیادہ ناکام نظر آتی ہیں۔ ناکامی تو خیر خلشِ دل بن کر زندگی کا ساتھ دیتی ہے۔ مگر کامرانیوں کا انجام تو بے کیفی اور افسردگی کے سوا کچھ نہیں اور اس کا بھی کیا علاج کہ انسان کیفیت چاہتا ہے۔ خواہ وہ درد ہو یا نشاط، رونا بھی تو آرزو کے وجود کی دلیل ہے۔ افلاطون نے کہا تھا کہ مجھے رونا تو رونے کا ہے۔ ہر انسان پر زندگی کے بعض ایسے معصوم اور برگزیدہ لمحے گزرتے ہیں جب اشیاء و مناظر کی حقیقت پر بھی اسے غور کرنا پڑ جاتا ہے۔ پھر اس کا موضوعِ فکر کبھی خود اس کی ذات ہوتی ہے، اور کبھی ماورائے ذات۔ سب سے پہلے انسان کی نظر زندگی اور اس کی حقیقت پر جاتی ہے اور اسی عقدہ کو حل کرنے کے بعد انسان ماورائے ذات کے ساتھ اپنے ربط و علاقہ کا یقین کرتا ہے۔ زندگی کیا ہے؟؟؟ اس کے جواب میں خیالات کا ایک طوفان بے پایاں سامنے آ جاتا ہے۔ اگر محرومیاں اور کامرانیاں دونوں آئندہ چل کر خواب و خیال بن جاتی ہیں تو پھر ہم مستقبل کے ساتھ اس قدر آرزومندانہ انہماک کیوں رکھتے ہیں؟ ہم ساری آرزوؤں کو کیوں نہیں تیاگ دیتے؟؟ اور پھر سوال یہ ہے کہ اس افسردگیٔ تمنا کے بعد ہم میں جینے کا حوصلہ کیوں باقی رہتا ہے ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید — ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

لیکن ہر انسان میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ ان داعیات اور ان کو دوسروں تک پہنچا سکے۔ صرف صاحبِ قلم ہی قائم رہنے والی چیز کی حد کرکے، غیر ضروری جزو کو نکال کر چھوٹے کو چھوٹا اور بڑے کو بڑا کرکے خیال پر اور منتشر اجزاء کو یکجا کرکے ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ صاحبِ قلم قدرت کے خوان سے چن چن کر سامان اکٹھا کرتا ہے اور ادبیات دل میں اکٹھا کرتی ہے۔ دل کی چیز کو باہر نمایاں کرنے کے لئے قوتِ تخلیق کی خاص ضرورت ہوتی ہے۔ حقیقی ادبیات میں ہم اپنے تخیل کو اپنے سکھ دکھ کو زمانۂ حال کے لئے نہیں۔ بلکہ دوام اور ہمیشگی کے لئے قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس چیز کو باہر کی، جذبات کی چیز کو زبان کی، اپنی چیز کو عالمِ انسانی کی اور عارضی فانی چیز کو قائم و دائم بنا دینا ادبیات کا کام ہے۔ تیمرز کا حسنِ بیان ملاحظہ فرمائیے:-

"۔ ۔ ۔ دریائے نیل جس کی لہروں نے ہزارہا مخلوقِ خدا کی گردنیں قہار و جبار خداؤں کی عظمتوں کے سامنے جھکتے ہوئے، اور پھر جنہوں نے خدائی کا دعویٰ کرتے ہوئے مغرور انسانوں کی ذلیل زندگیوں کو موت کے پنجے میں سسکتے ہوئے دیکھا ہے ۔۔۔ دریائے نیل، جس کے قطرے قطرے میں افسانہ ہائے عشق و محبت دفن ہیں، اپنے تمام اقتدار و عظمت کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے بہ رہا تھا میری نگاہِ تصور نے وادیٔ مصر کی حسین ساحرہ کو دیکھا کہ بصد طنطنہ و طمطراق دلیر سپاہیوں کے درمیان سنہری رتھ پر بیٹھی ہوئی چلی جا رہی ہے۔ یکایک تصور نے ایک اور پردہ اٹھایا میں نے دیکھا کہ یہی حسین شہزادی جس نے روما کی قسمت کو بدل دینے والے دو جلیل القدر جرنیلوں کی قسمت کو چشم زدن میں بدل دیا تھا۔ اپنے آپ کو ایک زہریلے سانپ سے ڈسوا رہی ہے ...."

"میری مسرتوں سے بھری ہوئی زندگی میں غم اور دکھ کے زہرِ ہلاہل کو بکھیرنے کے واسطے یہ زہریلی ناگن کہاں سے آ گئی؟"

"...... عمر کی اس منزل پر پہنچ چکا ہوں۔ جہاں انسانی زندگی اور موت کے غار کی اتھاہ گہرائیوں میں کچھ زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا...."

(باقی دارد)

انوکھی شادی

نوشتہ: یوین لنسبڈٹ

مترجمہ: جمیل احمد کنداپوری

کسی کو بھی یہ امید نہ تھی۔ کہ جارج کبھی روزی سے شادی کرنے میں کامیاب ہو سکے گا ——— مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اور جس چیز کی اُسے دل و جان سے خواہش تھی وُہ کچھ ایسے عجیب و غریب طریقہ پر پیش آئی۔ کہ اس کی تفصیل سن کر یقیناً آپ کو تعجب سا ہوگا۔ آکسفورڈ جانے سے قبل اس نے اپنی محبوبہ سے شادی کی درخواست کی۔ مگر اُس جفا شعار نے ہنسکر ٹال دیا۔

گھر واپس آنے پر اُس نے پھر دستِ سوال دراز کیا۔ مگر اس شوخ نے پہلے کی طرح اب کے پھر خندہ زیرِ لب کے ساتھ انکار کر دیا۔ تیسری مرتبہ پھر اس نے اپنی سنگدل محبوبہ سے شادی کی استدعا کی اور اس مرتبہ پھر وُہ اپنے عاشق کی حماقت پر دل کھول کر ہنسی۔

گاؤں میں صرف جارج ہی ایک ایسا شخص نہ تھا جو روزی سے شادی کرنے کا آرزومند تھا بلکہ وُہ تو تمام گاؤں والوں کی منظورِ نظر تھی۔ اور سب کے سب کسی نہ کسی حد تک اسکی محبت میں گرفتار تھے۔ اور جب جارج نے کلب میں ہمیں اپنی شادی کی خبر سنائی۔ تو ہم حیرت سے اس کا منہ تکنے لگے۔

"تمہاری شادی؟"

"شاید تم مذاق تو نہیں کر رہے؟"

"اور وُہ خوش نصیب دُلہن آخر ہے کون؟"

کچھ جواب دینے سے پہلے جارج نے اپنے پائپ میں تمباکو بھرا، اور سے روشن کرکے متبسم انداز میں یوں گویا ہُوا:—

"ہاں! میری ہی شادی! ستمبر میں روزی کے ساتھ۔"

"شاید یہ مذاق کر رہا ہے!"

"روزی کے عشق نے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے!"

"نہیں!" میں اُٹھکر کہنے لگا: "مجھے اس کی باتوں سے صداقت کی بُو آتی ہے۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ میرے دوست نے جادو اور سحر کے زور سے کامیابی حاصل کی ہے۔ ورنہ کہیں ممکن تھا۔ کہ ہمارے گاؤں کی سب سے حسین و جمیل لڑکی اس سے وابستہ ہوجانے پر رضامند ہو جاتی"۔ ——— پھر گلو خلاصی کرکے جارج سے یوں مخاطب ہوا "دوست! ذرا یہ تو کہنا، آخر وُہ کون سا جادو تھا جس سے تم نے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی ہے؟"

"جادو!" جارج ہنسکر کہنے لگا: "جادو میرا استقلال تھا۔ اور خوش نصیبی میرا سحر!"

اس کی آواز میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ ہم لوگ خاموش ہو گئے۔

× × × × × ×

سب سے تعجب انگیز بات تو یہ تھی۔ کہ جب ہم نے روزی کو مبارکباد پیش کی تو وُہ کچھ شرما سی گئی اور اس کے رخساروں پر کچھ ایسی بارونق مسکراہٹ کھیلی جس سے یہ مترشح تھا۔ کہ وُہ خود جارج کی محبت میں گرفتار ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ ——— عرصہ سے اس کی پرستش کر تی رہی ہے —— اور ہمارا خیال ——— بڑی حد تک صحیح بھی تھا ——— عورتیں فطرتاً نہایت پُراسرار ہوا کرتی ہیں۔

ہم لوگ شادی میں مدعو تھے۔ ان دنوں گاؤں کے ہر گھر میں ہر وقت اسی شادی کا تذکرہ رہتا۔ اور ہر شخص ایک دوسرے سے یہی استفسار کیا کرتا کہ "کیا واقعی روزی جارج کی محبت کا دم بھرتی ہے؟"

پہلے میں بھی کبھی کبھی اپنے دل سے اسی قسم کے سوالات کرنے کا عادی تھا۔ مگر اگست کی ایک ناقابلِ فراموش شام کے بعد مجھے پھر اس قسم کے شکوک پیدا کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

میں ایک دن گرجا کے قبرستان کی طرف سے ہوتا ہُوا گھر واپس جا رہا تھا۔ ہمارا گرجا ایک بلند مقام پر واقع تھا اور اس کے ارد گرد جو گھاس جمی ہوئی تھی، وُہ اس قدر نرم اور ملائم تھی کہ کسی مسافر کے قدموں کی آواز مطلق سنائی نہ دیتی تھی۔ چھلانگ لگا کر میں گرجا کی دیوار کے اس پار گیا۔ اور قبروں کے درمیان سے ہوتا ہُوا آگے بڑھنے لگا۔ اسی وقت میرے کانوں میں جارج کی آواز آئی اور جب میں نے چونک کر گردن اوپر اٹھائی تو دفعتاً میری نظر روزی پر پڑی ایک چوڑی سی کشادہ قبر کے نیچے وہ بیٹھی تھی، اور ڈوبتے ہوئے آفتاب کی کرنیں اس کے چہرے پر رقص کر رہی تھیں۔ جارج ——— قبر پر لیٹا ہوا تھا اور یہ اُسی کی آواز تھی جو اس وقت ماہِ اگست کی اس دلکش شام کے سکوت کو درہم برہم کر رہی تھی۔

"میری پیاری! میری جان، مجھے یقین ہے کہ میری موت کے بعد بھی اگر کبھی وقت تمہیں میری ضرورت پیش آجائے، تو میں قبر سے نکل کر تمہاری خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا!"

اپنی موجودگی ظاہر کرنے کیلئے میں ایک بار کھانسا۔ اور پھر درختوں کے سایوں میں سے گزرتا ہُوا آگے بڑھ گیا۔

تاریخ شادی سے صرف دو دن پیشتر مجھے ایک کاروباری ضرورت سے شہر جانا پڑا۔ اسٹیشن پہنچ کر ریل گاڑی کے انتظار میں، میں وقت گزارنے کے لئے یونہی اپنی گھڑی کو تکتا ہوا بے تابانہ پلاٹ فارم پر ٹہل رہا تھا۔ کہ دفعتاً میری نظر اس خوش نصیب جوڑے پر پڑی ——— جارج اور روزی دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پلاٹ فارم کے آخری حصے میں خراماں خراماں ٹہل رہے تھے۔ دونوں محبت پاش نظروں سے ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔

میں نے مناسب نہ سمجھا کہ بے وجہ خواہ مخواہ ان کی پرلطف صحبت میں بیجا مداخلت کروں چنانچہ گاڑی کے پہنچنے تک میں ان کی نظروں سے کتراتا ہوا، اِدھر اُدھر وقت گزارتا رہا۔ جب گاڑی پہنچ گئی تو میں چپکے سے ایک ڈبے میں داخل ہو کر بیٹھ رہا۔

"ہیلو، بوڑھے دوست!" جارج اتفاقاً میرے ہی ڈبے میں مع اپنے اسباب کے گھس آیا۔ "تم آخر جا کدھر رہے ہو؟ یہ خوش نصیبی ہے تم سے ملاقات ہو گئی۔ میں تو سمجھتا تھا کہ سفر بے لطف گزرے گا!"

"مگر پہلے یہ تو بتاؤ کہ تم کہاں کے ارادے سے نکلے ہو؟" ——— میں نے جارج سے پوچھا۔ اتفاقاً میری نظریں اس وقت روزی کی ان آنکھوں سے دوچار ہو گئیں۔ جو شدتِ گریہ سے   سرخ ہو گئی تھیں۔

"بوڑھے برانتریج کو دیکھنے جا رہا ہوں۔" اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر اپنی محبوبہ سے دو ایک الوداعی باتیں کرنے کے لئے، اپنی گردن دریچے سے باہر نکالی!

"آہ، جارج! میں چاہتی ہوں کہ تم نہ جاؤ!" ——— وہ نحیف آواز میں عاجزانہ درخواست کر رہی تھی۔ "مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں کوئی المناک حادثہ نہ وقوع پذیر ہو جائے۔"

"تو تمہیں یہ خدشہ ہے کہ میں شادی کے وقت تک نہ پہنچ سکوں گا؟"

"کچھ بھی ہو جارج! تم مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ" ——— یہ جملہ روزی نے کچھ ایسے پُرحسرت لہجہ میں کہا۔ کہ میرا دل پسیج گیا اور کیا عجب کہ اگر یہی جملہ وہ مجھ سے کہتی تو میں گاڑی سے اتر کر اس کے ساتھ ہو رہتا۔ مگر میری بجائے وہ جارج سے ہمکلام تھی اور اس کی طبیعت مجھ سے برعکس واقع ہوئی تھی۔ زندگی میں شاید ہی کبھی اپنی رائے بدلا کرتا اور ارادہ ——— اس پر تو وہ سختی سے کاربند رہتا اور کبھی متزلزل نہ ہونے دیتا۔

"مجھے جانا ہی پڑے گا روزی! بوڑھا برانتریج تمام عمر مجھ پر اس قدر مہربان رہا ہے۔ اور اگر اس وقت تشویشناک علالت کی حالت میں میں اسے جا کر نہ دیکھوں گا۔ تو بڑی شکایت رہے گی۔ بہرحال گھبراؤ نہیں میں پرسوں وقتِ مقررہ تک ضرور گھر واپس آ جاؤں گا۔ تاکہ" ——— ابھی جارج نے اتنا ہی کہا تھا کہ گاڑی نے سیٹی دی؛ اور پھر اپنی محبوبہ سے اس نے سرگوشیوں میں جو کچھ کہا۔ وہ میری سماعت سے بالاتر تھا!

"تو تم یقیناً وقتِ مقررہ تک واپس آ جاؤ گے نا؟" روزی نے روتے ہوئے پوچھا۔

گاڑی اب آہستہ آہستہ چلنے لگی تھی!

"دنیا کی کوئی طاقت بھی مجھ کو نہیں روک سکتی روزی!"

گاڑی کی رفتار بتدریج تیز ہوتی گئی اور بہت جلد روزی کی پیاری پیاری صورت اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

کچھ دیر تک تو وہ خاموش بیٹھا رہا۔ پھر خود ہی یوں مخاطب ہوا، "مقام سگناولی میں میرے گاڈ فادر (God father) مسٹر برانتریج رہتے ہیں۔ ان دنوں وہ سخت بیمار ہیں اور بظاہر زیست کی کوئی امید نہیں۔ مجھے انہوں نے اپنی علالت کی اطلاع بھیجی تھی۔ چنانچہ میں نے ان کو جا کر دیکھ لینا ضروری سمجھا۔" اس کے بعد وہ دو ایک مرتبہ آہستہ آہستہ کھانسا اور پھر بولا۔ "کل کسی نہ کسی وقت میں واپس ضرور آ جاؤں گا!"

"اور فرض کرو اگر تمہارے گاڈ فادر کا انتقال ہو جائے؟"

"کچھ بھی ہو! خواہ میری موت ہی کیوں نہ واقع ہو جائے۔ مگر شادی میں پنج شنبہ کے دن روزی سے ضرور ملاقات کروں گا۔" جارج نے اتنا کہہ کر اپنا سگار سلگایا اور پھر تازہ اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

جب گاڑی سگناولی اسٹیشن پہنچی۔ تو ہم نے ایک دوسرے کو الوداع کہا۔ اور جارج رخصت ہو کر گاڑی سے نیچے اترا۔ میں لندن چلا گیا اور رات وہیں گزاری۔

دوسرے دن سہ پہر کو جب میں اپنے گاؤں واپس آیا۔ تو میری بہن نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔

"جارج کدھر ہے؟"

"کیا معلوم!" میں نے قدرے چیں بجبیں ہو کر کہا۔

"میرا خیال تھا کہ شاید تمہیں اس کے متعلق کچھ علم ہو گا!"

"تو کیا وہ اب تک گاؤں واپس نہیں آیا؟" مجھے اس کا یقین تھا کہ وہ گھر واپس پہنچ چکا ہو گا۔

"نہیں! وہ اب تک نہیں پہنچا اور کیا عجب کہ اب وہ کبھی بھی واپس نہ آئے۔ . . . . میرا تو خیال ہے۔ کہ اب شادی ہرگز منعقد نہ ہو سکے گی:" میری بہن مجھے برافروختہ کرنے کی کچھ ایسی صلاحیت رکھتی ہے۔ جو دوسرے انسانوں میں مفقود ہے!

"بہتر ہو گا اگر تم آئندہ کبھی اس قسم کے احمقانہ الفاظ زبان پر نہ لاؤ۔"

میں نے اپنی بہن سے چیں بجبیں ہو کر کہا ـــ "شادی کل ہوگی اور ضرور ہوگی اور ایسی کہ تم تمام عمر یاد رکھو گی" ـــ یہ میری ایک ایسی پیشینگوئی تھی۔ جو حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔

کہنے کو تو میں نے اپنی بہن سے یہ باتیں کہہ ڈالیں۔ مگر جب رات پیدا ہو گئی اور مجھے یہ معلوم ہوا۔ کہ جارج اب تک گھر واپس نہیں آیا تو میری حیرت اور تشویش کی کوئی انتہا نہ رہی۔ دوسرے دن صبح سویرے مجھے جارج کا ایک خط ملا جس کو پڑھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور اسی وقت روزی سے ملنے چلا گیا۔

وہ باغ ہی میں میلی پوشاک زیب تن کئے ٹہل رہی تھی۔

"تو گویا جارج نے تمہیں بھی اطلاع بھیجی ہے؟" ـــ روزی نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں! مجھے اس نے شام کے تین بجے سٹیشن پر بلایا ہے وہاں سے ہم سیدھے گرجا چلے آئیں گے۔"

روزی کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ مگر آنکھوں میں کچھ ایسی درخشانی جھلک رہی تھی۔ جس سے یہ مترشح ہوتا تھا۔ کہ وہ جارج کی آمد کی خبر سے بے حد مسرور ہے۔

"مسٹر رائبرج نے اس سے کچھ اس طرح ایک رات اور ٹھیر جانے کی درخواست کی کہ وہ انکار نہ کر سکا۔" روزی نے اپنے محبوب کی طرف سے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ "جارج فطرتاً نہایت رحمدل ہے۔ مگر میری تو یہی خواہش تھی کہ وہ اس جگہ اب اور نہ ٹھہرتا۔"

میں ڈھائی بجے اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ جارج سے مجھے اس وقت کوفت سی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ خیال مجھے بے حد آزردہ بنا رہا تھا۔ کہ وہ اس قدر نا سمجھ ہے کہ خواہ مخواہ اپنی محبوبہ کی دل آزاری کا باعث بن رہا ہے۔

تین بجے والی گاڑی اسٹیشن پہنچی۔ مگر جارج کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ۲۵ منٹ سے پیشتر کوئی دوسری گاڑی نہیں آتی تھی۔

"اگر وہ آئندہ گاڑی سے آ گیا تو پھر بھی ہم وقت مقررہ تک گرجا پہنچ سکتے ہیں۔" میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ "آخر وہ کس قدر احمق ہے کہ پہلی گاڑی سے نہ آیا۔ کوئی عقلمند ایسی حرکت نہ کرتا۔"

وہ پچیس ۲۵ منٹ میرے لئے گویا ایک طویل سال تھا۔ میں سٹیشن پر ادھر اُدھر اشتہارات اور ٹائم ٹیبل پڑھتا رہا۔ ..... کسی چیز کے انتظار سے مجھے سخت نفرت ہے۔ . یوں تو کسی شخص کو بھی کشمکشِ انتظار کی الجھن پسند نہیں۔ مگر مجھے دوسروں کی بہ نسبت کچھ زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ تین بج کر پچیس ۲۵ منٹ پر آنے والی گاڑی لیٹ تھی۔

پائپ کو دانتوں کے درمیان زور سے دبائے ہوئے میں سگنل کو بغور دیکھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ یکایک نیچے کی جانب جھک گیا۔ پانچ منٹ کے بعد میں اس گاڑی میں سوار ہو گیا۔ جو جارج کو گرجا تک لے جانے کیلئے میں گاؤں سے مانگ لے کر آیا تھا۔

"چلو! جلدی سے گرجا چلو" میں نے کہا "جارج اس گاڑی سے بھی نہیں پہنچ سکا!"

غصہ نے اب اضطراب اور فکر کی صورت اختیار کر لی "آخر وہ کدھر گیا؟ . کیا یکایک اس کی طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی؟ ..... مگر ایسا ہوتا تو وہ ٹیلیگرام سے اس کی اطلاع ضرور بھیجتا۔ ضرور کوئی نہ کوئی خوفناک حادثہ اسے پیش آ گیا ہے" یہ خیال تو کبھی میرے دل میں پیدا ہی نہ ہوتا تھا۔ کہ اس نے قصداً اپنی روزی کو دھوکا دیا ہوگا۔ "بیشک کوئی نہ کوئی خوفناک حادثہ اُسے پیش آ گیا ہے۔ اور روزی کو اس واقعہ کی اطلاع دینے کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہو گئی ہے۔" ـــ اس وقت میرے دل میں یہی خواہش تھی ـــ کہ گاڑی الٹ جائے اور میرا سر پاش پاش ہو جائے۔ تاکہ اس حسینہ کو یہ وحشت انگیز خبر میری بجائے کوئی اور سنا سکے۔

جب میں گرجا کے پاس پہنچا تو چار بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ تماشہ بینوں کی دو رویہ قطار یہاں سے وہاں تک بچی ہوئی تھی گاڑی سے اتر کر میں گرجا کے احاطہ میں داخل ہونے لگا دروازہ کے پاس ہی ایک دربان کھڑا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ کیا لوگ اب تک جارج کے منتظر ہیں؟"

"منتظر! نہیں جناب! شادی تو اب تک ختم بھی ہو چکی ہوگی!"

"تو کیا جارج سگنا ولی سے واپس آ چکا؟"

"جی ہاں! شاید آپ سٹیشن پر انہیں نظر انداز کر گئے" وہ کہنے لگا "مگر جناب! مسٹر جارج کو ایسی وحشت انگیز اور سراسیمہ حالت میں میں نے پیشتر کبھی نہ دیکھا تھا۔ ان کے تمام کپڑے گرد آلود ہیں اور چہرے سے سراسیمگی مترشح ہے سچ پوچھئے تو مجھے ان کے یہ انداز مطلق پسند نہ آئے۔ .... اندر بھی لوگ ہر قسم کی چہ میگوئیاں کر رہے ہیں ...... معلوم ہوتا ہے مسٹر جارج کسی پریشان کن الجھن میں ہیں۔ یا انہوں نے کافی مقدار میں شراب پی لی ہے ... . وہ خوفناک بھوت جیسے نظر آتے ہیں اور جس وقت وہ اندر داخل ہوئے تو ان کی آنکھیں آگے کی جانب گڑی ہوئی تھیں . . نہ اِدھر اُدھر کسی کو دیکھا اور نہ کسی سے مخاطب ہی ہوئے۔ ..... ان کی اس تبدیلی نے ہر شخص کو محوِ حیرت بنا رکھا ہے .... وہ تو ہمیشہ شریفانہ برتاؤ کرنے کے عادی تھے۔"

اس دربان کو اتنی لمبی تقریر کرتے ہوئے میں نے اس سے پیشتر کبھی نہ دیکھا تھا۔ گرجا کے اندر تماشہ بین حضرات آپس میں سرگوشیاں کرنے میں مصروف تھے۔ اور رسم کے مطابق ریشمی تھیلیوں میں چاول لئے دُلہا اور دلہن پر پھینکنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ باجے والے اپنے بازوؤں کو اس لئے درست کر رہے تھے۔ کہ نوبیاہتا جوڑے کے باہر آتے ہی دلربا نغموں سے ان کا خیر مقدم کریں۔

گرجا کے اندر یکایک شور و غل سا پیدا ہوا۔ اور وہ دونوں محب و محبوبہ باہر نکلے۔ دربان نے واقعی ٹھیک کہا تھا۔ جارج بالکل بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ اس کا کوٹ گرد آلود تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر موت کی سی خوفناک زردی چھائی ہوئی تھی۔

ان کے باہر نکلنے پر لوگوں کو یہ توقع تھی۔ کہ ان کے کان باجوں کی دلکش آواز سے محظوظ ہوں گے ——— مگر ان کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ باجہ والے نقاروں کو پرے رکھ کر خرگوشوں کی طرح تیزی سے دور بھاگ گئے۔ دلہن کے جسم میں یکایک لرزہ سا پیدا ہو گیا۔ اور زرد سائے اس کے چہرے پر رقص کرنے لگے۔ مگر دولہا اپنی رہبری میں اس کو اس جگہ لے گیا۔ جہاں لوگ مٹھیوں میں چاول بھرے کھڑے تھے مگر شومئی قسمت سے نہ ان پر مٹھیوں کے چاول ہی پھینکے گئے اور نہ شادیانے ہی بجائے گئے۔ باجہ والوں کو لاکھوں منت و سماجت سے دوبارہ بلانے کی کوشش کی گئی۔ مگر بے سود۔ وہ قریب آنے پر کسی طرح بھی راضی نہ ہوئے۔

سکوت! . . . ایسے کامل سکوت میں، جیسا کہ سرزمین موت پر حکمران رہا کرتا ہے . . . جارج اور روزی گاڑی کے اندر داخل ہوئے۔ اور اندر سے کواڑ بند کر لیا۔

اب لوگ آزادی کے ساتھ ان پر نکتہ چینی کرنے لگے تماشہ بینوں اور مہمانوں میں سے ہر شخص رنج و حسرت کا اظہار کر رہا تھا۔

"جناب! کہ میں اس بدمعاش جارج کی حالت کو قبل دیکھ پاتا۔" روزی کے بوڑھے باپ نے مجھ سے راستہ میں گاڑی کے اندر کہا۔ جب ہم گرجا سے گھر کو جا رہے تھے۔" تو خدا کی قسم گرجا کے اندر ہی اس کو اٹھا کر زمین پر چپت گرا دیتا۔"

اس کے بعد دریچہ سے انہوں نے اپنا سر باہر نکال کر کوچوان سے کہا ——"جہاں تک جلد ممکن ہو۔ تیز گامی سے چلو!"

کوچوان نے ارشاد کی تعمیل کی ——— ہماری گاڑی دلہن کی گاڑی کے پاس سے گزرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ اور ہم ان سے پیشتر ہی گھر پہنچ گئے۔

چلچلاتی دھوپ میں ہم ان کے خیر مقدم کو سڑک پر کھڑے تھے۔ آدھ منٹ بھی گزرنے نہ پایا تھا۔ کہ گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ جب گاڑی سامنے آ کر رکی۔ تو میں روزی کے باپ کے ساتھ گاڑی کی طرف بڑھا۔

"خدایا خیر! گاڑی خالی پڑی ہے! اور ———!"
میں نے فوراً گاڑی کا دروازہ کھولا۔

جارج کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ . اور اسکی نصف بہتر روزی، اور سفید کپڑوں میں لپٹی لپٹائی بدحواس پڑی تھی۔ جسم کا نصف حصہ تو گاڑی کے فرش پر تھا اور نصف گاڑی کی نشست پر!

"حضور! میں گرجا سے سیدھا یہیں آ رہا ہوں"۔ کوچوان نے ہمہ تن روزی کے والد سے کہا۔" اور میں خدا کو حاضر و ناظر سمجھ کر کہہ سکتا ہوں کہ کوئی شخص بھی راستہ میں گاڑی سے باہر نہیں نکلا۔"

ہم روزی کو اتار کر گھر کے اندر لے گئے۔ میں نے نقاب ہٹا کر اس کا چہرہ دیکھا۔ میرے خدا! کیا میں اس کی اس وقت کی صورت کبھی بھول سکتا ہوں! زرد! اس درجہ زرد، جیسے اس کے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی نہ تھا۔ اور اس کے بال، اس کے دراز چمکیلے گیسو! وہ برف جیسے سفید ہو گئے تھے۔

اس وقت جبکہ میں اور روزی کا باپ خوف و دہشت کی حالت میں حیرت زدہ کھڑے تھے ایک شخص اندر داخل ہوا اور تاریخی رنگ کا ایک لفافہ دیا۔ لرزاں ہاتھوں سے میں نے مجلت تمام اسے چاک کیا۔ لکھا تھا:۔

"جب مسٹر جارج سگناولی یہاں آج ڈیڑھ بجے گاڑی پر سٹیشن جا رہے تھے۔ تو بدبختی سے ان کی گاڑی ایک درخت سے ٹکرا کر الٹ گئی ——— اور ان کی حرکت قلب اسی جگہ، اسی وقت بند ہو گئی۔" . . . . . اور روزی کی ساتھ کل ساڑھے تین بجے سب لوگوں کے سامنے اسکی شادی ہوئی نہایت ہی حیرت انگیز تھی۔ اس وقت مجھے جارج کا وہ جملہ یاد آ رہا تھا۔ جو اس نے سگناولی جانے سے قبل ریل کے اندر مجھ سے کہا تھا۔ "خواہ میری موت ہی کیوں واقع ہو جائے مگر شادی تو پنجشنبہ کے دن روزی سے ضرور کرونگا!" گرجا سے گھر آتے وقت گاڑی کے اندر پریشان کن واقعہ کسطرح ظہور پذیر ہوا؟ اسکے متعلق نہ کسی کو علم ہے اور نہ کبھی ہو سکے گا! ——— آہ! روزی! آہ! میری پیاری روزی!!!

ایک ہفتہ بھی گزرنے نہ پایا تھا۔ کہ لوگ اسے اسی گرجا کے اندر جہاں اس کی شادی ہوئی تھی اور جہاں وہ اپنے محبوب کے ساتھ حسن و عشق کے گیت گا رہی تھی۔ جارج کے پہلو میں دفن کر آئے۔

اور اس طرح ان کی انوکھی شادی وقوع پذیر ہوئی!

آئین حزیں سیالکوٹی

نکات

زیست، بے لذتِ ادراک فضول — چشمِ دل، بے نگہِ پاک فضول
جس کی پلکوں پہ نہیں خونِ جگر — ہے وہی دیدۂ نمناک فضول

(۲)

حسن، بے ذوقِ طلبگار فضول — جنس، بے چشمِ خریدار فضول
ہے ترے ہاتھ میں فطرت کی نوشت — دست، بے لذتِ کردار فضول

(۳)

حُسن، بے عشوہ و انداز فضول — عشق، بے جذبۂ جانباز فضول
تیغ، بے بازوئے بیباک فضول — باز، بے جوہرِ پرواز فضول

(۴)

مرد، بے ہمّتِ مردانہ فضول — رند، بے جرأتِ رندانہ فضول
راکھ ہو کر جو نہ اڑنے پایا — اے آئیں ہے وہی پروانہ فضول

سعادت حسن منٹو

اُسکارامو

(میکسم گورکی کا ایک افسانہ ڈرامے کے رنگ میں)

گوپال کا کمرہ۔

(دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ دستک کے بعد کتاب بند کرنے کی آواز سنائی دیتی ہے)

گوپال۔ کون ہے؟ . چلے آؤ، دروازہ کھلا ہے!

(دروازہ کھلتا ہے)

بندو۔ (ہچکچا کر کہتی ہے) میں اندر آ جاؤں؟

گوپال۔ اندر آ تو گئی ہو، اب کیا پوچھتی ہو... مگر تم ہو کون؟

بندو۔ میں ... میں ... بندو ہوں۔ "ریلوائی" کے بڑے صاحب کے یہاں آیا کا کام کرتی ہوں . . اور یہاں آپ کے پڑوس میں رہتی ہوں ... اکیلی ... میرا کوئی بھی نہیں .... میں ..

گوپال۔ (بات کاٹ کر) میں تمہارا حدود اربعہ پوچھنا نہیں چاہتا... بتاؤ کیا چاہتی ہو . اگر کچھ مانگنے آئی ہو تو مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں کچھ نہ دے سکوں گا۔ اس لئے کہ ابھی تک میرے گھر سے خرچ نہیں آیا۔ کالج کی فیس بھی ابھی تک نہیں دی۔

بندو۔ بابو جی! میں بھیک مانگنے نہیں آئی . . . کیا میں بھکارن دکھائی دیتی ہوں؟ . . . . میں تو آپ سے ایک پتر لکھوانے آئی تھی . کیا آپ لکھ دیں گے؟

گوپال۔ لکھ دوں گا ... لکھ دوں گا .... لکھنے پڑھنے کے سوا اور مجھے کام ہی کیا ہے۔

بندو۔ آپ بہت اچھے ہیں بابو جی — بہت اچھے ہیں، آپ پتر لکھ دیں، تمسّیں پیر سے لوں گی۔

گوپال۔ ہاں ہاں تمسّیں تمہیں لینا ہی پڑے گا — میں نے یہاں ڈاکخانہ تو نہیں کھول رکھا۔ چلو بیٹھو اور لکھاؤ۔

(پیڈ کھولنے کی آواز، ایک کاغذ پھاڑا جاتا ہے)

گوپال۔ ہوں .. تو کیا لکھوں؟

بندو۔ (تھوک نگلتے ہوئے) لکھئے ....

گوپال۔ ہوں .. چلو .. !

بندو۔ لکھئے ...... !

گوپال۔ ارے بابا! منہ سے تو کچھ بولو۔ یا جو دل میں آئے گھسیٹ دوں؟

بندو۔ لکھئے ..... (از طرف خاص شہر دِلّی ... محلّہ بلّی ماراں . چودہ نمبر کا کمرہ... .. اس کے آگے میرا نام لکھ دیجئے!

گوپال۔ کیا نام لکھوں؟

بندو۔ بندو!

گوپال۔ لکھ دیا ..... آگے کہو!

بندو۔ لکھئے .... میرے پیارے . میرے دل سے پیارے رامو

گوپال۔ (لکھتے ہوئے) میرے پیارے، میرے دل سے پیارے رامو، .... لکھ دیا ... آگے پڑھو!

بندو۔ تو نے اتنے دنوں سے اپنی بندو کی سدھ کیوں نہیں لی وہ برہ کی ماری تارے گن گن کر راتیں کاٹتی ہے — ہر سمے اس کا تیری ہی طرف دھیان ہے۔ وہ سوتی جاگتی، اٹھتی بیٹھتی، تیرے ہی نام کی مالا جپتی ہے، اس کا تن من، تیری یاد میں ڈوبا رہتا ہے۔ تو کب آئے گا رامو؟ — تو میرے تپتے ہوئے ہردے کو کب اپنے پریم سے ٹھنڈک پہنچائے گا — تو آئے یا نہ آئے پر تیری بندو، سدا تیری بندو رہے گی، وہ تیری ہے، ساری کی ساری تیری!

گوپال۔ ٹھہرو تو! .

بندو۔ میں ابھی بس کر دیتی ہوں، نیچے یہ بول لکھ دیجئے . .

آؤ شیام پیارے گھر:
دیپ جلے ہے کھڑکی پر
میں ابندن بیٹھی آس لئے
من میں سَو وسواس لئے
تم پھرتے پھر لئے گاؤں نگر
..نوں راہ دکھاؤ گے کنتک

... بس .. پر آپ نے تو کچھ بھی نہیں لکھا...... یہ بول بڑے

ہوں تو آپ کوئی اچھے سے لکھ دیجئے ... . ہم نے کل چھوٹی میم صاحب سے سنے تھے۔

گوپال۔ (سنجیدگی سے) یہ رامو کون ہے ؟

بندو۔ رامو ... (حیاآلود ہنسی) .. رامو .. آپ یہ کیوں پوچھتے ہیں ... ؟ (لجاکر) میں نے ابھی ابھی سبھی کچھ تو کہہ دیا ہے !

گوپال۔ تو یہ رامو تیرا وہ ہے .... ہوں . تجھ سے پریم ویم کرتا ہوگا۔

بندو۔ (حیاآلود ہنسی) .. آپ کیا کہہ رہے ہیں بابوجی!

گوپال۔ پریم کرنا پاپ نہیں! جرم نہیں، پھر یہ شرم کیسی ؟ ..... اس رامو سے تمہارا پریم کب ہوا ؟ ۔

بندو۔ پچھلے ساون میں .. .... جب بڑی میم صاحب کا بیاہ ہوا . . لایئے میرا پتر ... میں نے آپ کو بہت تنگ کیا ... . اگر آپ کہیں، تو میں ہر روز اس کمرے میں جھاڑو دے دیا کروں ؟

گوپال۔ نہیں نہیں؛ اس کی کوئی ضرورت نہیں .. . یہ کوئی تکلیف نہیں، .... یہ لو اپنا خط ....

(کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ)

بندو۔ مہربانی ... . آپ کی بڑی مہربانی ہے ....

(دروازہ بند کرنے کی آواز)

دوسرے دن :-

گوپال۔ ساری بات میں تمہیں سنا چکا ہوں کہ وہ کیسے آئی اور کیسے اپنے عاشق کے نام خط لکھوا کے لے گئی ----- اب تم اس سے کیا نتیجہ نکالتے ہو ؟

حامد۔ اس میں کونسا گہرا فلسفہ ہے۔ جو دماغ پر زور دیا جائے۔ سیدھی سادی بات ہے کہ دو انسان ایک دوسرے سے پریم کرتے ہیں اور بس :

گوپال۔ حامد! میں پوچھتا ہوں۔ کہ یہ پریم کیسے پیدا ہو جاتا ہے ؟

حامد۔ عجیب اوٹ پٹانگ سوال پوچھ رہے ہو، ارے بھئی پکنے پر پھل میٹھا کیوں ہو جاتا ہے ؟ ----- آگ پر دودھ کیوں ابلنے لگتا ہے ----- بطخ کے بچے پیدا ہوتے ہی تیرنے کیوں لگ جاتے ہیں ؟ ----- تمہاری بندو اور اس کے رامو میں پریم پیدا ہونے کی صرف ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے۔ کہ دونوں کے پہلو میں دل دھڑکتا ہے ..... اور پھر جوانی سب کچھ سکھا دیتی ہے۔

گوپال۔ ٹھیک ہے جوانی ہی سب کچھ سکھاتی ہے۔ اور کوئی چیز ایسا سبق نہیں پڑھا سکتی ----- حامد وہ بالکل خوبصورت نہیں، بھدی سی شکل ہے، کالا رنگ، میلے دانت، کھردرے کیس جیسے بال ... موٹے موٹے ہونٹ، شگفتگی سی ... . پر وہ جوان ضرور ہے .... اور معلوم ہوتا ہے یہ جوانی اس پر ابھی تازہ تازہ آئی ہے۔

حامد۔ خدا کرے کہ تمہاری بندو کا رامو اچھا آدمی ہو اور اس کا پریم سچا ہو . مجھے تو اپنے بھائیوں پر ایسے معاملوں میں کوئی اعتبار نہیں یہ لوگ مسافروں کی طرح اس درخت کو بالکل بھول جاتے ہیں ۔ جس کی چھاؤں میں انہوں نے ایک دفعہ آرام کیا ہوتا ہے۔

x x x x x x x x x x

(اس گھر کا ایک کمرہ جہاں بندو آیا کا کام کرتی ہے)

بندو۔ چھوٹی میم صاحب! بڑے صاحب کہاں ہیں !

سوشیلا۔ اپنے کمرے میں کسی دوست سے باتیں کر رہے ہیں۔ تو ابھی اس طرف نہیں جا سکتی۔

بندو۔ میں ادھر نہیں جانا چاہتی .... مجھے آپ سے ایک کام تھا۔

سوشیلا۔ کیسا کام ؟

بندو۔ آپ ہندی پڑھ لیتی ہیں نا ؟

سوشیلا۔ تو کیا اسکول میں اتنے برس گھانس چھیلتی رہی ہوں . ... تو کہنا کیا چاہتی ہے ؟

بندو۔ میں ہولے ہولے سب کچھ کہتی ہوں، چھوٹی میم صاحب .. یہ پتر پڑھ کر سنا دیجئے .... . پھر پیٹ میں کھول دوں :

(کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ)

سوشیلا۔ کیا پڑھوانا چاہتی ہے تو .... . کاغذ کا یہ ٹکڑا تو کہاں سے اٹھا کر لے آئی ہے ؟

بندو۔ پڑھیئے تو میم صاحب! .... . کیا لکھا ہے ؟

سوشیلا۔ از طرف خاص شہر دلی ----- محلہ بلی ماراں، چودہ نمبر کا کمرہ .. ... یہ کیا بکواس ہے ؟

بندو۔ آپ اس کے نیچے پڑھیئے .....

سوشیلا۔ میرے پیارے، میرے دل سے پیارے رامو! تو نے اتنے دنوں سے اپنی بندو کی سدھ کیوں نہیں لی . ... (رک جاتی ہے) .... کون ہے یہ رامو ؟

بندو۔ آپ سارا پتر پڑھ کر سنایئے .... . اپنی بندو کی سدھ کیوں نہیں لی ..... آگے . ... ؟

سوشیلا- وُہ برہ کی ماری تارے گن گن کر راتیں کاٹتی ہے (طنزیہ اور حقارت بھرے لہجے میں) ہر سمے اس کا تیری ہی طرف دھیان ہے۔ وُہ سوتی جاگتی، اٹھتی بیٹھتی تیرے ہی نام کی مالا جپتی ہے۔ اس کا تن من تیری ہی یاد میں ڈوبا رہتا ہے — —۔ تو کب آئے گا رامو! —— تو برسے تپتے ہوئے ہردے کو کب اپنے پریم سے ٹھنڈک پہنچائے گا —— تو آئے یا نہ آئے، پر تیری بندو سدا تیری بندو رہے گی .. . وُہ تیری ہے، ساری کی ساری تیری……

بندو- (آہوں میں) ساری کی ساری تیری! . . . بابو نے ایک ایک بول ٹھیک لکھ ہے . میں نے یہی لکھوایا تھا۔

سوشیلا- بندو! یہ تو نے عشق بازی کب سے شروع کی ہے۔ … صاحب کو پتہ چل گیا۔ تو چُٹیا سے پکڑ کر باہر نکال دیں گے۔

بندو۔ (بھولے پن سے) میم صاحب: میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟

سوشیلا- تجھے یہ باتیں کرتے اور دوسروں سے ایسے خط لکھواتے لاج نہیں آتی .. … ٹھیر تو سہی بتا ابھی صاحب سے ساری بات کہتی ہوں۔

بندو- آپ "بے ناحق" بگڑ رہی ہیں میم صاحب، میں آپ کے کئی پتر اُس ہیٹ والے بابو کے پاس لے جاتی رہی ہوں جو سائیکل پر آیا کرتا تھا۔ پر میں نے کبھی کسی سے اس کی بابت بات نہیں کی:

سوشیلا- چپ رہ — جا اپنا کام کر… . نالائق کہیں کی!

× × × × × × ×

دوسرے روز گوپال کے کمرے میں

(دروازے پر دستک ہوتی ہے)

گوپال- کون ہے؟ .. ارے بھئی دروازہ کھلا ہے، چلے آؤ…… (بڑبڑاتا ہے) نہ جانے یہ لوگ جان بوجھ کر، کہ میرا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا۔ کیوں بے کار دستک دینا شروع کر دیتے ہیں… . (حیرت میں) … ارے… . یہ تو بندو ہے …. آؤ آؤ بندو .. چلی آؤ… ..

بندو- (شرمیلی ہنسی) جی ہاں، میں ہوں .. . بندو!

گوپال- اپنے "اس" کے نام خط لکھوانا ہوگا .. . ہے نا؟

بندو- (شرمیلی ہنسی) جی ہاں… . نہیں…. جی ہاں! .. جی ہاں…. لکھوانا تو ایک پتر ہی ہے پر……

گوپال- ہاں ہاں کہہ ڈالو .. . اسی کے نام لکھوانا ہوگا … کیا نام بتایا تھا تم نے؟ …ہاں… . رامو!

بندو- جی نہیں…. .. میں اس کی طرف سے جواب لکھوانا چاہتی ہوں۔

گوپال- (حیرت میں) کیا کہا؟

بندو- (گھبراہٹ میں) کچھ نہیں بابو جی کچھ نہیں . … میں بھول گئی میں یہ کہنا چاہتی تھی (تھوک نگلتے ہوئے) میں یہ کہنا چاہتی تھی . . اب، اب میں بھول ہی گئی ہوں کہ میں کیا کہنا چاہتی تھی۔

گوپال- حد ہوگئی ہے…. ارے بھئی کچھ تو کہو۔

بندو- (جلدی سے) ہاں ہاں! مجھے یاد آ گیا میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ آپ مجھے ایک ایسا پتر لکھ دیں، ایک ایسا پتر لکھ دیں . رامو کو نہیں، کسی کو بھی . میرے ہی نام ….. جو پریم سے بھرا ہوا ہو۔ جس کو پڑھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ جائیں. پر میں آپ کو اچھی طرح نہیں بتا سکی، میرے من کی بات من ہی میں رہ گئی ہے .. . میں پگلی ہوں…… اب میں آپ کو کیسے سمجھاؤں!

گوپال- (سختی سے) تم پگلی نہیں ہو۔ بلکہ دوسروں کو پاگل بنا رہی ہو۔

بندو- میں مر جاؤں۔ جو آپ سے جھوٹ کہوں….. بات یہ ہے، بات یہ ہے۔ اب میں کیا بتاؤں کہ کیا بات ہے، میری زبان تالو سے چمٹ گئی ہے۔

گوپال- سنو بندو! یہ چالبازیاں میرے ساتھ نہ چلیں گی، ہاں … میں شریف آدمی ہوں جو کچھ تم نے اپنے اور اپنے رامو کے بارے میں کہا ہے، سب جھوٹ ہے۔ اس کا اول جھوٹ آخر جھوٹ…… سب من گھڑت فسانہ ہے…. یہاں آنے کے لیے خط لکھوانے کا تم نے ایک بہانہ بنایا ہے…. مجھے تمہاری حالت پہ ترس آتا ہے، اپنی جوانی یوں برباد نہ کرو. . .. جاؤ یہاں سے چلی جاؤ. اور خیال رہے کہ پھر کبھی اس کمرے میں داخل ہونے کی جرأت نہ کرنا …

بندو- بابو جی! بابو جی! …… وہی ہوا نا جس کا مجھے کھٹکا تھا۔ …. میں آپ سے کہہ نہ رہی تھی کہ مجھے کوئی بات کرنی ہی نہیں آتی .. . .. (روتی آواز میں) آپ نے مجھے کتنا برا بھلا کہا.. . (زیادہ روتی آواز میں) آپ کو کیا معلوم کہ میرے من میں کیا ہے؟ …. جانے دیں کچھ نہیں بتاؤں گی (روتی ہے)

(جانے کی آواز —— سسکیاں . … پھر دروازہ بند کرنے کی آواز)

گوپال۔ ارے ...... (اپنے آپ سے) حد ہوگئی ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ بات کیا ہے ...... عجیب معمّا ہے ...... میں نے اس کے دل کو بہت دکھ پہنچایا ہے۔ کیا پتہ کہ وہ بالکل بے گناہ ہو (زور سے) بندو ... بندو ...... اِدھر آ، میں تجھے خط لکھ دیتا ہوں (آہستگی سے) ... چلی گئی

(چند سیکنڈ خاموشی طاری رہتی ہے)

گوپال۔ میں اس کے ساتھ بہت غصّے سے پیش آیا ہوں ... میں نے یہ ٹھیک نہیں کیا، مجھے اس سے معافی مانگنا چاہیئے۔

(قدموں کی چاپ، دستک پھر دروازہ کھولنے اور بند کرنے کی آواز)

گوپال۔ بندو ... بندو!

بندو (روتی آواز میں) جی!

گوپال۔ ارے، تم تو سچ مچ رو رہی ہو؟

بندو۔ (زور زور سے رونا شروع کر دیتی ہے) نہیں تو، نہیں تو!

گوپال۔ بندو! تمہیں کیا ہوگیا ہے؟

بندو۔ (رونا بند کر دیتی ہے اور ہچکیاں لیتی ہے) مجھے کچھ بھی نہیں ہوا ... میں پاگل ہوں ...... دیوانی ...... اس میں آپ کا، یا کسی کا بگڑتا ہی کیا ہے؟ آپ چند بول لکھ دیتے اور کسی کا کلیجہ ٹھنڈا ہو جاتا۔ اس میں آپ کا کیا جاتا؟ ... سب پریم کرتے ہیں ... سب پریم کرتے ہیں ...... کیا سب پریم نہیں کرتے؟

گوپال۔ کرتے ہیں ......!

بندو۔ تو میں بھی کرتی ہوں ...... اپنے رامُو سے پریم کرتی ہوں ...... جو صرف میرے من ہی من میں ہے ... دوسرے ایسے لوگوں سے پریم کرتے ہیں جو گھروں میں رہتے ہیں، چلتے پھرتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں، بولتے ہیں ... پر میرا رامُو ان جیسا نہیں ...... میں نے اس کو آپ بنایا ہے ...... نہ کوئی بندو ہے، نہ کوئی رامُو ...... سب کچھ میں ہوں ... میں ...!

گوپال۔ (حیرت میں) کیا کہا؟ ...... یعنی یہ رامُو وامُو کوئی بھی نہیں ... اور بندو؟

بندو۔ بندو میں ہوں۔

گوپال۔ بندو تو تم ہو۔ اور رامُو میرے ہی سے کوئی نہیں ... آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟

بندو۔ میں کچھ کہنا نہیں چاہتی (کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ) یہ لیجیئے اپنا لکھا ہوا پتر! ... آپ دوسرا پتر نہ لکھ کر دیں، میں کسی اور سے لکھوا لوں گی!

گوپال۔ (کاغذ کھولنے کی آواز) ارے! ...... یہ تو وہی خط ہے جو تم نے مجھ سے اپنے رامُو کے نام لکھوایا تھا ... آخر یہ قصّہ کیا ہے؟ میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آتا ... تم اور خط لکھوانا چاہتی ہو اور ابھی تک تم نے پہلے کو ڈاک میں ڈالا ہی نہیں۔

بندو۔ میں اسے بھیجوں کہاں؟

گوپال۔ کیسے بھیجو ... رامُو کو اور کس کو؟

بندو۔ اب میں آپ سے کتنے بار کہوں کہ یہ رامُو کوئی بھی نہیں ہے ... میں جانتی ہوں کہ آپ ہنسیں گے، دُنیا ہنسے گی، پر اس میں کسی کا بگڑتا ہی کیا ہے کہ میں اس کو پتر لکھواتی ہوں۔

گوپال کس کو؟

بندو۔ رامُو کو، اور کس کو؟

گوپال۔ پر تم ابھی تو یہ کہہ رہی تھیں کہ رامُو کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

بندو۔ اب میں آپ کو کیسے سمجھاؤں ... اگر کوئی رامُو نہیں ہے۔ تو میں کیا کروں۔ اس میں میرا کیا دوش ہے۔ میں نے تو اپنے من میں اسے بنا لیا ہے نا ... وہ ہو یا نہ ہو، مجھے اس سے کیا ...... میں تو یہی سمجھتی ہوں۔ کہ وہ ہے، میری طرح جیتا جاگتا، چلتا پھرتا جیسے میں اس سے پریم کرتی ہوں ویسے ہی وہ مجھ سے پریم کرتا ہے۔ میں اس کے نام پتر لکھواتی ہوں، گویا وہ سچ مچ ہے اور وہ جواب بھی دیتا ہے ... آپ نے یہ پتر اس کے نام لکھا تھا۔ میں نے چھوٹی میم صاحب سے پڑھوایا، سُنا اور یہ سمجھا کہ وہ میرے سامنے کھڑا ہے۔ اور مجھ سے پریم بھری باتیں کر رہا ہے ...... پھر میں نے رامُو کی طرف سے اس کی بندو کے لئے جواب چاہا، اور آپ سے پتر لکھنے کو کہا ...... بس ساری بات یہی ہے، جو آپ کی سمجھ میں نہیں آتی ...... اب اگر آپ سمجھ گئے ہوں۔ تو بتایئے۔ کہ اس میں کسی کا کیا بگڑتا ہے، جو میں اپنے رامُو سے پریم کرتی ہوں جو اس دنیا میں نہیں، پر میرے ہردے میں رہتا ہے ......

* * * * * * * * *

(یہ تمثیلچہ لاہور سے دو مرتبہ اور بمبئے سے ایک مرتبہ براڈکاسٹ ہو چکا ہے)

تکمیلِ غم

ضیا فتح آبادی

آئے اور کچھ مسکرا کر کہہ گئے
اہلِ محفل دل پکڑ کر رہ گئے

منزلِ مقصود کوسوں دور تھی
چلتے چلتے راستے میں رہ گئے!

رازدارانہ ادائیں حسن کی!
جو نہیں کہنا تھا وہ بھی کہہ گئے

زندگی کے چند لمحاتِ حسیں
سیلِ اشکِ آرزو میں بہہ گئے

سرخیِ افسانۂ تکمیلِ غم
چار قطرے خونِ دل کے رہ گئے

ہو چکی تقسیم جب کل کائنات
غم اٹھانے کے لئے ہم رہ گئے

لاکھ ضبطِ غم کیا لیکن ضیاؔ
خود بخود دو چار آنسو بہہ گئے

قطعات

محرم سے کہا ہے میں نے رازِ الفت
ہمدم سے کہا ہے میں نے رازِ الفت
الفت ہے مگر ایک معمّا اب تک
عالم سے کہا ہے میں نے رازِ الفت

افتاد پر اپنی کس قدر شاد ہیں ہم
پستی کے اندھیروں ہی میں آباد ہیں ہم
جنت سے نکالا تھا فرشتوں نے جسے
اُس آدمِ کم ظرف کی اولاد ہیں ہم

طوفان کی ٹھوکروں سے ڈرنا کیسا
ڈرنا تھا تو دریا میں اترنا کیسا
پیدا جو ہوا ہے زندہ رہنے کیلئے
جینا اُسے ہر حال ہے مرنا کیسا

آزادی

نوشتہ موپاساں
مترجمہ عزیز احمد

ای دن دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی اور بغیر کچھ کہے مسلسل قہقہے لگانے لگی۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ گرینی جو کسی ناول پڑھنے میں مشغول تھی، ای دن کی اچانک آمد پر اور مسلسل قہقہوں سے پہلے تو گھبرا گئی، پھر کتاب کو صوفے پر رکھتے ہوئے ای دن کو متبسم نظروں سے دیکھتے ہوئے خود بھی مجسم قہقہہ بن گئی۔

"میں آزاد ہو گئی میری پیاری، میں بالکل آزاد ہو گئی" ای دن یہ کہہ کر ہنسنے لگی۔

"آخر کس سے تو آزاد ہو گئی، کس بلا سے تجھے نجات ملی" گرینی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں اپنے شوہر سے آزاد ہو گئی"۔

"کیسے رہا ہوئی؟"

"طلاق لے کر"۔

"کیا تو نے اپنے شوہر سے طلاق لے لی ہے؟"

"نہیں ابھی نہیں، تم بھی کتنی بھولی ہو، کیا تین گھنٹے کے مختصر عرصے میں کوئی طلاق لے سکتا ہے؛ لیکن میرے پاس اس کا کافی ثبوت ہے۔ کہ اس نے مجھے چھوڑ دیا ... غور تو کرو میں نے اسے ایک ایسے موقع پر گرفتار کیا ... ایسے موقع پر ..."

"کیا مجھ سے پوری کیفیت بیان کرو گی ... کیا تمہارے شوہر نے تم کو طلاق دے دی؟"

"ہاں لیکن نہیں ... میں کچھ نہیں جانتی، میرے پاس کافی ثبوت ہے اور یہی اصلی چیز ہے"۔

"تم کو یہ ثبوت ملا کہاں سے؟"

"کہاں سے ملا، تم سننا چاہتی ہو ...... میں بھی بڑی ہوشیار اور چالاک ہوں ...... گزشتہ تین ماہ سے وہ میرے ساتھ بہت قابل نفریں سلوک کرتا رہا، اور وہ کچھ آوارہ مزاج بھی ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس طرح گذر ہونا ناممکن ہے، بہتر ہے کہ میں اس سے طلاق لے لوں لیکن سوال یہ تھا کہ کیونکر طلاق لی جائے، کیونکہ یہ اتنی آسان بات نہیں ہے۔ وہ ہر وقت مجھے پریشان کیا کرتا، مجھے ایسے وقت باہر چلنے کو کہتا جب میں باہر جانا نہ چاہتی اور ایسے وقت مجھے گھر میں ٹھہرنے کو مجبور کرتا جب باہر جانے کی مجھے خواہش نہ ہوتی، غرض اس نے میری زندگی کو ایک مستقل عذاب بنا دیا تھا۔ پھر میں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ کہیں سے ملنے جاتا ہے۔ میرا خیال درست نکلا اس نے ایک عورت سے آشنائی پیدا کر لی تھی ... لیکن وہ نہایت ہوشیار تھا، وہ چالاکی سے اپنی محبوبہ کے پاس جاتا۔ کہ مجھے گرفتار کرنے کا موقع نہ ملے۔ اب تم بتاؤ، میں نے کیا کیا ہو گا؟"

"میں کوئی خیال آرائی نہیں کر سکتی تم کہے جاؤ!"

"تمہارے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی۔ اس مقصد کے لئے میں نے اپنے بھائی کو بلایا۔ تاکہ وہ کسی طرح مجھے اس عورت کی ایک تصویر فراہم کر دے۔ آخرکار مجھے اس کی تصویر مل گئی۔ وہ نہایت حسین عورت ہے۔ پھر میں نے اس کے عادات و اطوار کے متعلق چند معلومات فراہم کیں۔ اس کے بعد ... اس کے بعد میں نے ایک ایجنٹ کو تلاش کیا۔ اور اسے فلاں (میرے شوہر کی محبوبہ کا یہی نام ہے) کا فوٹو دیتے ہوئے کہا۔ — مجھے ایک خادمہ کی ضرورت ہے۔ جو اس تصویر کی ہم شکل ہو۔ میں اس کے لئے تمہیں کافی معاوضہ دوں گی اگر دس ہزار فرانک کی بھی ضرورت ہو، تو بھی پس و پیش نہ کروں گی۔ مجھے صرف تین مہینے اس کی خدمات کی ضرورت ہے۔ اس نے کچھ پریشان ہو کر کہا۔ کیا آپ کو ایک پاکیزہ کیرکٹر خادمہ کی ضرورت ہے۔ میں نے کچھ متعجب ہو کر جواب دیا۔ جی ہاں ایماندار اور نیک، لیکن ... کی تسلی نہیں ہوئی۔ کیونکہ اب بھی کچھ متعجب نظر آ رہا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا موسیو میرے شوہر کے لئے ...... تاکہ میں اسے پریشان کر سکوں" وہ میرا مطلب سمجھ گیا اور ہنسنے لگا۔

مجھ سے رخصت ہوتے ہوئے اس نے کہا "ایک ہفتہ کے اندر خادمہ آپ کے پاس آ جائے گی" تین دن بعد ایک سرو قد ملیح لڑکی میرے پاس آئی وہ بہت خوبصورت، خوش ادا، اور جاذب نظر تھی۔ اس نے مجھ سے کہا 'خاتون! مہربانی سے مجھے 'روز' کہہ کر پکاریں۔ میں نے اس سے پوچھا۔ کیا تمہیں معلوم ہے یہاں تم کس کام کے لئے آئی ہو؟ دیکھو! میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا ...... تمہیں کوئی دشواری نہ ہو گی"۔

کچھ توقف کے بعد اس نے پوچھا۔ "آپ کے شوہر کا پسندیدہ عطر کون سا ہے؟"

"عطر کیوڑا" میں بولی۔ اس کے بعد وہ ایک خادمہ کی طرح گھر کے کام کاج میں لگ گئی۔ ایک گھنٹہ کے بعد میرا شوہر گھر آیا۔ روز میز پر گلدستہ رکھ رہی تھی، میرے شوہر نے اسے غیر معمولی دلچسپی سے دیکھا۔ روز چند سے توقف کے بعد وہاں سے چلی گئی۔ لیکن کمرہ عطر کیوڑا کی جانفزا خوشبو سے معطر ہو رہا تھا۔ اس کے جاتے ہی شوہر نے مجھ سے پوچھا۔

"یہ لڑکی کون ہے"؟

"کیوں یہ میری نئی خادمہ ہے" میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"اچھی لڑکی معلوم ہوتی ہے" شوہر نے کہا۔

میں اپنی کامیابی پر بہت مسرور تھی۔ کیونکہ میں نے محسوس کیا۔ کہ اس کی طبیعت میں تغیر ہو رہا ہے۔ اور اسی شام کو روز نے مجھ سے کہا۔ "میں وعدہ کرتی ہوں، دو ہفتے سے زیادہ وقت نہ لگے گا"

"کیا تم نے اسے آزما لیا ہے"؟ میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ابھی نہیں۔ اس نے صرف میرا نام دریافت کیا ... تاکہ معلوم کر سکے کہ یہ کی آواز نہیں ہے۔

ہفتہ کے ختم ہونے تک یہ اتفاق ہوا کہ بمشکل سے میرا شوہر گھر سے باہر نکلتا۔ وہ سارا دن گھر ہی میں ادھر اُدھر گھومتا رہتا۔ اور خاص بات یہ ہوئی۔ کہ وہ مجھ کو باہر جانے سے روکتا بھی نہ تھا، اور میں تھی کہ تقریباً تمام دن گھر سے باہر رہتی۔ تاکہ وہ گھر میں آزادی سے رہ سکے ... ساتویں روز جب روز میرے کپڑے بدل رہی تھی اس نے دبی ہوئی زبان میں مجھ سے کہا: "اب ہم کو زیادہ انتظار نہ کرنا پڑیگا"! میں خوشی سے اچھل پڑی۔

"کیا تمام انتظام ہو چکا ہے"؟ میں نے دریافت کیا۔

"مکمل"! اس نے کہا: "گزشتہ تین دن سے متواتر وہ تنہائی میں مجھے سینے سے لگا لیتا ہے۔ اب آپ بتائیے۔ کون سا دن مقرر کیا جائے"

"جمعرات کا دن بہتر ہوگا" میں نے جواب دیا۔ کس وقت اور کس جگہ؟

روز نے پوچھا۔ "ٹھیک ۵ بجے شام کو میرے سونے کے کمرہ میں"؛ میں نے کہا۔

"اس روز میں خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ سب سے پہلے اپنے والد کے گھر گئی۔ والد اور والدہ کو اپنے ساتھ لیا۔ پھر بھی ... پاس گئی۔ ان کو بھی اپنے ہمراہ لیا۔ اس کے بعد پریسیڈنٹ ... اور جج کو بھی اپنے ساتھ لیا۔ ان تمام حضرات کو لے کر میں گھر پہنچی۔ پہنچ کر اپنے ملازم کو بھی میں نے ساتھ لیا۔ تاکہ ایک گواہ کا اور اضافہ ہو جائے۔ اور ٹھیک ۵ بجے سے کچھ پہلے جب میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں ان سب کو لئے ہوئے بالاخانہ پر پہنچی۔ جہاں میرا سونے کا کمرہ ہے۔ اور جب گھڑی نے ۵ کی پہلی صدا دی۔ میں نے دروازے کو دھکا دیا ... ... اور جب دروازہ کھل گیا ...... آہ وہ منظر میں تم سے کیا بیان کروں .... میرا شوہر خادمہ کو لے رہا تھا ... ... اس کی صورت دیکھنے کے قابل تھی .. میں مارے ہنسی کے لوٹ رہی تھی ... میرے والد بہت ... یہ افروختہ تھے .... روز نے خوب پارٹ ادا کیا ... وہ چلانے لگی ... یہ سب کچھ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا میرے پیٹ میں ہنستے ہنستے بل پڑ گئے۔ اس کے بعد میں فوراً تمہارے پاس آئی۔ تاکہ سب سے پہلے تم سے تمام واقعات بیان کروں .... اوہ! اب میں آزاد ہوں ... ... بالکل آزاد اور خود مختار"

یہ کہہ کر وہ پھر مسرت اور انبساط سے کمرے میں ناچنے لگی لیکن گرینی جو اب کسی گہری سوچ میں تھی۔ کہنے لگی

"ایسا دلفریب منظر دیکھنے کے لئے تم نے مجھے کیوں نہ اپنے یہاں بلا لیا ....؟"

ش مظفر پوری

پردیسی ادیب کا خط اپنی ماں کے نام

پیاری ماں!

میں جانتا ہوں کہ چار ماہ سے میرا خط موصول نہ ہونے کی وجہ سے آپ بہت فکرمند ہونگی۔ آپ کہینگی کہ یہ سمجھنے کے باوجود میں نے اتنے دنوں تک آپ کو کوئی خط کیوں نہ لکھا؟ میرے اس تغافل کی چند در چند وجوہ ہیں۔ کئی مرتبہ میں آپ کو خط لکھنے بیٹھا۔ مگر یہ سوچ کر ہر مرتبہ قلم ہاتھ سے رکھ دیا۔ کہ آخر آپ کو لکھوں بھی کیا۔ کوئی نئی بات ہوتی تو لکھی بھی جاتی۔ مگر یہاں تو وہی

وہی پرانے کھیل جگت کے وہی پرانی بات

—— وہی بیکاری، وہی افلاس۔ وہی تفکرات میں گھلنا، وہی مستقبل کی ہولناکیاں —— اُف! میں کیسا بدنصیب اور ناکارہ ہوں، یا میں دُنیا کے لئے نہیں یا دُنیا میرے لئے نہیں، دونوں میں سے ایک بات ضرور ہے۔ میری بالکل عنقا ہو چکی ہے۔ آہ! مجھے آزادی تو کجا غلامی تک نصیب نہیں

کبھی کبھی اپنی ذلت اور کمتری کا احساس دل میں اتنی شدت سے پیدا ہو جاتا ہے کہ خودکشی کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر رونا تو اس کا ہے کہ میں یہ بھی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ والدین اپنی اولاد کی پرورش اس لئے نہیں کرتے، کہ وہ جوان ہو کر خودکشی کرے، بلکہ مجھے بھی اس کا احساس ہے کہ والدین اپنے جگر کے ٹکڑے کو اپنے گرم گرم خون سے سینچ سینچ کر اس لئے پروان چڑھاتے ہیں کہ آئندہ دنوں میں اس کو برسرِ ترقی دیکھ کر مسرور رہوں۔ زندگی کے شاہراہ پر اس کو گامزن دیکھ کر فخر سے اپنا سر بلند کر سکیں اور خوشی سے پھولے نہ سمائیں۔ مگر غریب والدین کے سنہرے خواب، سرمایہ پرست اور شخصیت پسند ہندوستان میں اکثر شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتے۔ ان کی اولاد کی زندگی تباہ و برباد ہو جاتی ہے، اور ان کے تمام منصوبے خاک میں مل جاتے ہیں —— ہر جگہ سرمایہ داری کا ہولناک دیو، غریبوں کو اپنے تیز تیز دانتوں تلے کچل ڈالنے کے لئے اپنا بھیانک منہ پھاڑے کھڑا ہے۔ ہر طرف شخصیت پرستی کی مہلک اور خطرناک وبا پھیلی ہوئی ہے۔ جب صورتِ حال یہ ہے۔ تو پھر مجھ ایسے غریب و نادار کو کون پوچھتا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ میں یہاں پردیسی ہوں۔ اس کے علاوہ میں کسی سر یا خان بہادر کا بیٹا تو ہوں نہیں کہ نوکری نہیں تو کم از کم اچھی اور پُرزور سفارش ہی مل سکے۔ اسے میری خودستائی پر مت محمول کیجئے۔ اگر میں کہوں کہ ایسے ایسے امیرزادے ڈیڑھ سو دو سو روپیہ ماہوار نوکری سے پیدا کر رہے ہیں۔ جو اہلیت و قابلیت کے لحاظ سے مجھ سے عشر عشیر بھی نہیں مگر یا تو ان کا کوئی قریبی رشتہ دار کسی شعبہ کا افسرِ اعلیٰ ہے یا پنشن یافتہ۔ لیکن چونکہ میرے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں اسلئے میں پچیس تیس روپے کی حقیر ترین ملازمت کو بھی ترستا ہوں۔ اندر ہی اندر کڑھتا اور گھلتا رہتا ہوں۔ دل پر جبر کر کے، روح احساس کو بیحیائی کے چنگل میں، پاکر امیروں کی خوشامد بھی کرتا ہوں مگر بے سود۔ امیر لوگ اگر سب نہیں تو ننانوے فی صدی ضرور، سنگدل اور بے درد ہوتے ہیں۔ غریبوں کی بیکسی اور بیچارگی پر انہیں کبھی ترس نہیں آتا۔ بلکہ انہیں اپنی امیری اور غریبوں کی مصیبت میں ایک لطف محسوس ہوتا ہے۔ وہ امیروں کے لئے سب کچھ کر سکتے ہیں لیکن غریبوں کے لئے ان کے پاس چند چیں بہ جبیں اور صبر آزما جواب کے سوا کچھ بھی نہیں اگر بڑی مہربانی کی تو غایت عیاری اور مکاری سے اپنی بے بسی ظاہر کر دی —— اُف! ظلم بے پناہ ظلم! آخر غریب لوگ امیروں کی خوشامد کریں ہی کیوں؟ لیکن افسوس کہ غریب اس قدر بے حس اور ڈرپوک ہو چکے ہیں یا آمرانہ پالیسیوں سے انہیں اس قدر بے حس بنا دیا گیا ہے کہ "انقلاب" کا صحیح مفہوم بھی سمجھنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اباکو میں اس غلطی کے لئے کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ کہ انہوں نے امیروں کی دیکھا دیکھی بلا مستقبل کے قریب میں مبتلا ہو کر میری تعلیم پر اپنی گاڑھی کمائی کے پیسے ضائع کئے۔ —— اُف! ان کو کتنا تلخ تجربہ ہوا ہے۔ اب تو وہ شنیرِ عتیق کو پڑھانے لکھانے کا خیال بھی اپنے دل میں پیدا نہ کر سکینگے یہ میں نے اس لئے کہا کہ نادار والدین کی اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت سے دلچسپی کا واحد مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ جوان ہو کر ان کی پرورش کرے۔ وہ ایسی توقع کرنے پر مجبور بھی ہیں۔ کیونکہ ان کا سرمایۂ حیات اولاد ہی ہے۔

بارہا خیال آیا کہ ایسی ذلیل اور حقیر زندگی سے تو یہ کہیں بہتر ہوگا۔ کہ اپنے علوم و معارف سے بھرے ہوئے سر کو ریل کی پٹری پر ڈال دوں اور ہونکتا ہوا خونخوار انجن اسے کچل کر پاش پاش کر دے، ایک دلدوز چیخ بلند ہو۔ اور سرمایہ داری کا درندہ اپنی کامرانی پر ایک فلک شگاف قہقہہ بلند کر دے۔ مگر اس خیال کے آتے ہی آپ کی اور ابا کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ اور میں زندہ رہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں —— پیاری اماں! بہرحال میں جی رہا ہوں اور اس وقت تک جیتا رہوں گا۔ جب تک موت

بن بلائے نہ آجائے۔ مگر میری ہر سانس حیات و موت کے بین بین ہو گی۔

آپ میری شادی کی فکر میں یونہی مبتلا ہیں میں شادی کرنے کیلئے ہرگز تیار نہیں۔ کیونکہ میرے جذبات اب مُردہ ہو چلے ہیں۔ میرے سینے اور روح سے زندگی مفقود ہو چکی ہے۔ وہ لوگ فریبِ نظر میں مبتلا ہیں۔ جو میرے ہڈی اور گوشت کے بیجان ڈھانچے کے ساتھ "زندگی" جیسی گرانقدر چیز کو وابستہ سمجھتے ہیں۔ ایسی حالت میں میرے کمزور شانے شادی کی ذمہ واریوں کا بوجھ کیونکر اٹھا سکینگے جبکہ خود اپنا وجود میرے لئے ایک بارِ گراں ہے، جس کو بصد دقت میں اُٹھائے پھرنے پر مجبور ہوں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ میری تمام پریشانیوں کی ذمہ دار میری شاعرانہ طبیعت ہے ادبی دلچسپیوں نے مجھے کاروباری دنیا کے ناقابل بنا دیا ہے۔ مگر ہاں! ان تنگ نظروں اور کور مغزوں کو کون سمجھائے کہ شاعرانہ مزاج کے باوجود مجھ میں کام کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ جس کا کبھی امتحان نہ لیا گیا۔

ان دنوں میں ہسپتال میں بیمار پڑا ہوں۔ آپ کو اپنی بیماری کا حال اب تک اس خیال سے نہیں لکھا تھا کہ میری مسلسل بیروزگاری ہی کا صدمہ آپ کے لئے کیا کم ہے کہ اس میں اور بھی اضافہ کر دوں۔ ہرچند کہ مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ پھر بھی وہ آرام اور سکون کہاں جو آپکے مقدس ہاتھوں سے پیشانی کے سہلائے جانے سے میسّر آتا ہے۔ میری صحت کیلئے آپ کے الفاظ بھی دواؤں کی اور ادویات سے زیادہ مفید ہیں۔ بہرحال اب میں اچھا ہوں۔ دو ایک ہفتہ تک بالکل تندرست ہو جاونگا۔ آپ فکر نہ کریں۔ آپا کی خدمت اقدس میں میرا سلام۔ اور عتیق اور عصمت کو میرا بہترین پیار۔

سوگوار حیات

آپکا غم نصیب بیٹا

سراج الدین ظفر

حاکم و محکوم

اس طرح اس دور نے بدلی ہے انساں کی سرشت
حاکم و محکوم دونوں کی ہے فطرت ہیچ و زشت

اک طرف حاکم کی آنکھوں میں خوشامد کا خمار
اک طرف محکوم کی باتیں ریا کا اشتہار

اک طرف کچھ بد دماغوں کو حکومت کا دماغ
اک طرف کچھ بے حیا دامانِ خودداری پہ داغ

اک طرف اک یاوہ گو جاہل کا اندازِ خطاب
اک طرف سو سو تبسم یاوہ گوئی کا جواب

اک طرف ابنِ شغال ابنِ شغال ابنِ شغال!
اک طرف پروائے رسوائی نہ عزت کا خیال

اک طرف روحِ ہوس کاری کا تزک و احتشام
اک طرف اہلِ وفا کا دونوں ہاتھوں سے سلام

اک طرف بیباکی و شہوانیات و حرص و شر
اک طرف بیوی کی عزت بھی نثارِ سیم و زر

اک طرف شیخی و وقار اپنا دکھانے کے لئے
اک طرف کچھ لوگ ہاں میں ہاں ملانے کیلئے

روک ان پستی کے دلدادوں کو اے دنیائے دوں!
ہو نہ جائے ان کی ذہنیت سے بشریت کا خوں

عظمتِ اولادِ آدم کا انہیں عرفاں نہیں!
حاکم و محکوم دونوں میں کوئی انساں نہیں!

دیوانی

میرزا ادیب

(۱)

بھولا بھالا منوہر اگر رمیش بابو کی تمام تمناؤں کا مرکز تھا۔ تو کملا اُسے دیکھ دیکھ کر جیتی تھی، اور اس کی وجہ ظاہر تھی۔ کامل تیرہ سال تک رات دن مسلسل التجاؤں کے بعد انہیں پرماتما کی مہربانی سے بیٹے کی شکل دیکھنی نصیب ہوئی تھی۔ اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ دونوں اپنے ننھے بچے کو زندگی کا حقیقی سرمایہ نہ سمجھتے۔

وہ دونوں منوہر کے متعلق طرح طرح کی سکیمیں بناتے رہتے۔ رمیش بابو کہتا۔ جب منوہر پانچ سال کا ہو جائے گا تو میں اسے سکول میں داخل کردونگا وہیں بورڈنگ میں رہیگا۔ بورڈنگ میں رہنے سے بچے کے اخلاق کی خاص نگہداشت ہوتی ہے۔ گھر میں تربیت ناقص ہوتی ہے۔"

اس پر منوہر کی ماں کہتی۔ "میں تو اپنے بچے کو بورڈنگ میں نہیں بھیجوں گی۔ ایک ماسٹر گھر پر آکر پڑھا جایا کریگا۔"

"اب ہمیں یہ مکان بھی تبدیل کرنا ہوگا۔ دیکھتی ہو۔ اردگرد کتنا غبار اڑتا رہتا ہے بچے کی صحت پر اس کا بُرا اثر پڑے گا!"

"میں تو پہلے ہی کہہ چکی ہوں۔ بابو کرشن کی کوٹھی کے پاس ایک چھوٹی سی کوٹھی خالی ہے۔ کرایہ بھی زیادہ نہیں صرف پچاس روپے ——!"

"پچاس؛ یہ تو بہت زیادہ ہیں!"

"ہُوں" کملا بچے کی پیشانی کو چوم کر کہتی: "میرے منوہر پر لاکھوں روپے قربان! پچاس روپے کی کیا حقیقت ہے۔"

غرض وہ اس قسم کی خیال آرائیاں کرتے رہتے۔

جب منوہر پانچ سال کا ہو گیا۔ تو رمیش بابو اس کی تعلیم کے متعلق انتظام کرنے لگے۔ لیکن اس سے پیشتر کہ کوئی بندوبست ہو، منوہر کو ہلکا سا بخار ہو گیا۔ خیال یہ تھا کہ دو تین دن کے بعد یہ معمولی سی حرارت دور ہو جائے گی۔ لیکن آٹھ دن گزر گئے اور اس دوران میں بخار نے خطرناک صورت اختیار کرلی۔ والدین مضطرب ہو گئے اور بچے کے علاج معالجے میں انتہائی کوشش کرنے لگے۔ کملا بار بار ڈاکٹر کو بلاتی اور جب وہ آتا تو اس سے بچے کی بیماری کے متعلق کئی سوال ایک ہی سانس میں پوچھ لیتی۔ ڈاکٹر تسلی دیتا۔ بیماری کو ایک معمولی سی حرارت بتاتا مگر بے قرار ماں دیکھ رہی تھی کہ اس کا لختِ جگر روز بروز کمزور و نحیف ہوتا جا رہا ہے۔

ایک تاریک رات کو جبکہ فضا میں کثیف بادل چھا رہے تھے کملا منوہر کو رضائی میں لپیٹے پلنگ پر دیوار سے سہارا لگائے بیٹھی تھی۔ سامنے کرسی پر رمیش بابو کوئی خط پڑھ رہا تھا۔ اتنے میں بادل زور سے گرجا۔ بچے نے ڈر کر آنکھیں کھولدیں۔ اور پنچی پنچی آواز میں رونے لگا۔ کملا نے بچے کو سینے سے چمٹا لیا۔ پھر چمچے کے ساتھ دوائی اس کے منہ میں ڈالنے لگی۔ بچہ برابر روتا جا رہا تھا۔ اور اس کا چہرہ بالکل پیلا پڑ گیا تھا، دوائی اس کے منہ سے نکل کر۔ اس کی ٹھوڑی اور گردن پر بہنے لگی کملا گھبرا گئی اور مضطربانہ لہجے میں بولی۔

"منوہر کے پتا! ڈاکٹر کو بلاؤ۔"

رمیش نے خط کرسی پر رکھ دیا۔ اور پلنگ کے قریب پہنچکر بچے کو دیکھنے لگا۔

"ڈاکٹر کو بلا لاؤ۔ جلدی کرو۔ حالت بہت خراب ہے۔"

"باہر بارش ہو رہی ہے" رمیش بابو نے کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو کیا ہوا۔ بچے کی حالت دیکھتے نہیں! رنگ بالکل زرد پڑ گیا ہے"

"خواہ مخواہ گھبرا رہی ہو۔ بچہ ٹھیک ہے۔ اِدھر لاؤ —— ہیں —— !"

"نہیں اسے رہنے دو یہیں، تم ڈاکٹر کو بُلا لاؤ۔" کملا نے مُصر ہو کر کہا۔

"صبح سہی۔ اب تو رات کا وقت ہے اور پھر بارش۔ ایسے میں ڈاکٹر کیوں آنے لگا۔ اسے کیا مصیبت پڑی ہے!"

"تو میں جاتی ہوں۔ تمہیں تو اپنے بچے کی جان عزیز نہیں۔ مگر مجھے تو عزیز ہے —!"

یہ کہکر کملا بچے کو بستر پر لٹانے لگی۔ یہ دیکھ کر رمیش بابو بڑبڑاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد کملا نے بچے کو پھر گود میں اٹھا لیا۔ اور ہولے ہولے اس کے سنہری بالوں میں کنگھی کرنے لگی —— اس کی نگاہیں دروازے پر جمی تھیں۔

بچے کی حالت متغیر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے اور گہرے ہو گئے تھے۔ اور وہ زور زور سے سانس لے رہا تھا۔ کملا نے مضطرب

ہو کر دو بارہ بچے کے منہ میں دوائی ڈالی۔ مگر پہلے کی طرح یہ بھی حلق سے نیچے نہ اتری۔ کملا نے نوکر کو آواز دی۔

رمیش بابو دوڑ کر اندر آیا۔ کملا نے اسے دیکھتے ہی بلند آواز میں کہا۔

"ڈاکٹر آ گیا؟"

"میں کہاں گیا تھا؟" رمیش نے کہا اور بچے کو دیکھنے کے لئے ہاتھ بڑھائے۔

"ڈاکٹر نہیں آیا — تم ڈاکٹر نہیں لائے — میرا بچہ!"

"ٹھہرو تو" رمیش بابو نے کہا، اور بچے کا سوکھا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

"منگو! ڈاکٹر کو لاؤ — جلدی کرو!"

منگو اپنی مالکہ کا حکم سن کر کمرے سے نکل گیا۔

بچے نے ایک لمبا سانس لیا — اور اس کے بعد ماں کی آغوش میں منوہر کی نعش پڑی تھی!

(۲)

منوہر کے فوت ہوتے ہی رمیش بابو اور کملا کو ایسا محسوس ہوا۔ جیسے ان کی زندگی کا تمام سرمایہ لٹ چکا ہے۔ ان کی دنیا بھیانک تاریکیوں میں ڈوب گئی ہے۔ اور ان کی مسرتیں ہمیشہ کے لئے خاک نامرادی میں دفن ہو چکی ہیں۔ کئی دن تک تو وہ دونوں بے حس و حرکت چپ چاپ، افسردہ و پژمردہ سے بنے بیٹھے رہے۔ گویا زندگی اور کائنات سے بیزار ہو چکے ہیں —

مرد کو عورت کے مقابلے میں دل بہلانے کیلئے زیادہ ذرائع حاصل ہیں وہ گھر سے باہر جا کر اپنے دوستوں کی محفل میں اپنا غم غلط کر سکتا ہے۔ مختلف تفریحات میں حصہ لیکر اپنی توجہ زندگی کے غمگین واقعات سے ہٹا سکتا ہے۔ مگر عورت — آہ بدنصیب عورت ان تفریحی وسائل سے یکسر محروم ہے۔ وہ گھر کی چار دیواری میں بیٹھ کر غم و حسرت میں ڈوبی رہتی ہے۔ اس کی توجہ کسی اور طرف منعطف نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ رمیش بابو عزیزوں اور دوستوں کے بار بار کہنے سے بہت حد تک سنبھل گیا اور آہستہ آہستہ اپنے منصبی فرائض انجام دینے لگا۔ مگر بدقسمت کملا کی متألم حالت میں ذرہ بھر کمی واقع نہ ہوئی، اس کے سینے کا زخم گہرا سے گہرا ہوتا گیا۔ وہ ہر لمحہ، ہر گھڑی، بچے کے خیالات میں ڈوبی رہتی کبھی تو وہ اس کے کپڑوں کو سینے سے لگا کر اس طرح چیخنے لگتی۔ کہ رمیش بابو اور گھر کے دوسرے لوگ گھبرا جاتے۔ کبھی وہ منوہر کی چھوٹی سی چارپائی پر ہاتھ پھیر پھیر کر مادرانہ شفقت سے معمور لہجے میں کہتی "منو! دیکھو تو صبح ہو گئی اور تو ابھی سو رہا ہے۔ اٹھو بھگوان کو یاد کرو، سیر کرنے جاؤ۔ اٹھو بیٹا! صبح دیر تک سوئے رہنا ٹھیک نہیں۔" اور کبھی وہ اپنی ہمسائی کے بیٹے، اوپندر ناتھ کو پیار کر کے کہتی "تو تو سکول سے آ گیا

مگر منوہر ابھی وہیں ہے۔ اچھے دوست ہو اس کے، آئندہ اسے ساتھ لایا کرو۔ یہی تو اچھے ہمجولیوں کا کام ہے!"

رمیش بابو نے لاکھ کوشش کی۔ کہ اس کی بیوی کا جنون فرزند غم دور ہو سکے، مگر بے سود! کملا کا وہم بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ پاگل ہو گئی۔ یہ دیکھ کر رمیش نے مجبوراً بیوی کو اس کے بھائی کے ہاں بھجوا دیا۔

رشتہ دار تو پہلے ہی رمیش کو شادی پر مجبور کر رہے تھے۔ اور اب تو ان کا اصرار اور بڑھ گیا۔ آخر رمیش نے شادی پر اپنی رضامندی ظاہر کر دی — ایک معزز گھرانے میں بات چیت ہوئی اور دو تین ماہ کے بعد وسنتی بحیثیت بیوی کے رمیش کے گھر میں آ گئی۔

دیوانی کملا اپنے بھائی کے گھر چند دن تو مجنونانہ حرکتیں کرتی رہی اور پھر اس کی حالت میں سکون پیدا ہو گیا۔ جب گھر کی عورتیں رمیش بابو کی نئی بیوی کے متعلق گفتگو کرتیں تو وہ بڑے غور سے ان کی باتیں سنتی اور ایسا معلوم ہوتا۔ جیسے وہ سب کچھ سمجھ رہی ہے۔ ہر ایک بات کا اندازہ لگا رہی ہے۔

ایک دن اس نے سنا کہ رمیش بابو کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی اس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور جب شام کے وقت اس کا بھائی دکان بند کر کے گھر آیا تو وہ اس سے کہنے لگی:-

"میں وہاں جاؤں گی — ان کے گھر"

"ان کے گھر — لیکن لاجونتی تو شملے میں ہے اور وہی تمہاری سہیلی ہے!" اس کے بھائی نے کہا۔

"نہیں وہاں نہیں — میں ان کے گھر جاؤنگی — جن کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔ تمہیں معلوم نہیں؟" کملا نے مسکرا کر کہا۔

"رمیش بابو کے گھر"

دیوانی اثبات میں سر ہلانے لگی۔

"پگلی کہیں کی — وہاں بیٹھو۔ کھانا کھا لیا ہے کیا؟" یہ کہہ کر کملا کا بھائی نہانے کے لئے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

رات کو بھی دیوانی یہی الفاظ دہراتی رہی اور دوسرے دن تو وہ دروازے سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگی۔

رمیش بابو کو اس کی خبر مل گئی۔ وہ آیا اور کملا کے بھائی کو سمجھا بجھا کر کملا کو اپنے ساتھ لے گیا۔

کملا نے جب ننھے سے مسکراتے ہوئے گول مول بچے کو دیکھا۔ تو وہ اسطرح خوش ہوئی جس طرح ایک لڑکی نئی خوبصورت گڑیا کو لے کر خوش ہوتی ہے۔ اس کا دل بہل گیا۔ وہ ہر وقت بچے کو گود میں لئے پھرتی، اسے کھلاتی اور طرح طرح کی آوازیں نکال کر ہنساتی۔ نرائن بھی کملا سے مانوس ہو گیا —

اتنا مانوس ہو گیا۔ کہ کملا کے مقابلے میں اپنی ماں کی بھی کم پروا کرنے لگا۔

کئی سال گزر گئے۔ اچانک نرائن بیمار ہو گیا۔ معمولی سا بخار تھا۔ مگر بچے کو کوئی چیز ہضم نہیں ہوتی تھی۔ جو چیز کھاتا تھا قے کے ذریعے نکال دیتا۔

ایک رات وسنتی بیمار بچے کو گود میں لئے بیٹھی تھی۔ اس کے قریب کملا بیٹھی متفکرانہ نگاہوں سے نرائن کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اور ان سے کچھ دُور رمیش بابو لیٹا تھا۔

وسنتی نے بچے کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کہا: "بدن سخت گرم ہے۔ جلتا ہوا کوئلہ معلوم ہوتا ہے صبح سویرے ڈاکٹر کے یہاں لے جانا۔"

"بہت گرم ہے بدن ——" رمیش نے کہا۔ "رات خیر سے گزرے۔ صبح ڈاکٹر کو یہیں لے آؤں گا۔"

کئی منٹ گزر گئے۔ یکایک وسنتی نے سامنے کی کرسی کو خالی دیکھ کر کہا: "کملا کہاں گئی —— ابھی یہاں بیٹھی تھی۔"

"دوسرے کمرے میں ہوگی —— نرملا وہیں ہے۔ اور ہاں صبح جو دوائی ڈاکٹر سے لایا تھا۔ وُہ بچے کو پلائی؟"

"اوہو! اس کا تو خیال ہی نہیں رہا۔ وُہ الماری میں پڑی ہے، نیلی بوتل ——"

رمیش نے اُٹھ کر دوائی نکالی اور بچے کو پلانے لگا۔ کچھ دیر کے بعد بچے نے آنکھیں بند کر لیں اور سو گیا۔

رمیش بھی اطمینان کے ساتھ لیٹ گیا۔ دو پونے دو گھنٹوں کے بعد آنکھ لگی۔ اور ابھی وُہ پوری طرح سو یا بھی نہ تھا۔ کہ اُسے ایک بلند آواز سنائی دی:۔

"بابوجی ——!"

رمیش بابو جلدی سے اُٹھا۔ اس کے پاس نوکر کھڑا تھا۔

"وُہ —— ہیرا اُسے لایا ہے —— زخمی ——!"

"ہیرا لایا ہے کسے؟"

"باہر آکر دیکھئے!"

رمیش بابو نے جلدی سے سلیپر پہنے اور دروازے کے پاس آیا دروازے کے پاس ایک ٹانگہ کھڑا تھا۔ رمیش بعجلت وہاں پہنچا۔ ٹانگے میں کملا زخمی پڑی تھی۔ اور رمیش کے ہمسائے ہیرالال نے اسے تھام رکھا تھا۔

"کیا ہوا ہے؟" رمیش نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہونا کیا تھا۔ آپ نے اس کا خیال نہیں کیا۔ آپ بخوبی جانتے کہ یہ دیوانی ہے۔ پھر بھی گھر سے باہر نکلنے دیا۔ اگر میں اتفاقاً وہاں سے نہ گزرتا تو اسے یہاں کون لاتا؟" ہیرالال نے کہا۔

"بات کیا ہے بتاؤ تو؟"

"کملا ڈاکٹر گوپال کے مکان کے پاس ٹانگے کے نیچے آگئی ——"

رمیش نے جھک کر کملا کے چہرے کو دیکھا۔ کملا کے چہرے پر ایک دم سرخی سی آگئی اور وُہ رمیش بابو کو اضطراب انگیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی:۔

"نرائن —— بچہ —— ڈاکٹر ——!"

کملا نے یہ الفاظ دو بار کہے اور پھر اسکا جسم ہمیشہ کیلئے بے حس و حرکت ہو گیا۔

مجید لاہوری

نوائے راز

سرشکِ غم کو مرے سوز نے دعا دی ہے
وفا نے تشنگیِ جذبِ دل بجھا دی ہے

تری نگاہ نے کیا شے مجھے پلا دی ہے
دل و جگر میں یہ اِک آگ سی لگا دی ہے

سکون و امن کی دنیا ہے میرا گہوارہ
کہ میرے پیشِ نظر رنگ و بو کی وادی ہے

وہ راہ جس پہ جھلکتے ہیں تیرے نقشِ قدم
وہ راہ ذوقِ طلب نے مجھے سجھا دی ہے

ترے تبسمِ رنگیں کے خلدزاروں پر
لطافتوں نے جوانی سی ہی شے لٹا دی ہے

تمہارے ناز کا پروردہ ہے نیاز مرا
تمہیں نے رسم و رہِ عاشقی سکھا دی ہے

ترے خیال نے نورِ حیات بخشا ہے
ترے جمال نے تخئیل کو جلا دی ہے

تمہیں نے میری تمنا کو کر دیا گستاخ
تمہیں نے جراَتِ اظہارِ مدعا دی ہے

مجید میری زباں پر لگی ہے مہرِ سکوت
نظر نے دل کی حدیثِ الم سنا دی ہے

برکھارُت

شیر محمد اختر

"ماں آج پانی نہیں تھمے گا؟" بچے نے روتے ہوئے ماں سے پوچھا۔

بچے کے پپوٹے نیند کی وجہ سے بھاری ہو رہے تھے۔ وہ سونا چاہتا تھا مگر کمرے میں اتنی جگہ نہ تھی کہ ماں اُسے الگ چارپائی ڈال دیتی۔ چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں تین چارپائیاں بچھی تھیں۔ ایک پر گھر کے سارے برتن رکھے تھے۔ دوسری پر بستر وغیرہ اور ایک دو شکستہ ٹرنک اور تیسری پر بیمار سبحان پڑا کراہ رہا تھا۔ اس کے پاس چھوٹی لڑکی سو رہی تھی۔ بڑا لڑکا، چار پانچ برس کی عمر، باپ کے پاؤں کی طرف بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اور ماں کمرے سے بارش کا پانی نکال رہی تھی۔

متواتر کئی گھنٹوں سے بارش ہو رہی تھی۔ جس گلی میں سبحان کا مکان تھا وہ ذرا نیچی تھی۔ آس پاس کے کوچوں اور مکانوں کا پانی اس طرف آ جاتا۔ اور غریبوں کی چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں میں گھس کر اُن پر عرصۂ حیات تنگ کر دیتا۔ تاریک و تنگ کوٹھڑیاں جہاں سبحان جیسے اور بھی بہت سے مزدور پیشہ لوگ رہتے تھے۔ پہلے ہی بہت گندی تھیں۔ مگر جب کبھی بارش ہوتی اور پانی اندر گھس آتا۔ تو ان کے برتن وغیرہ سب پانی میں تیرنے لگتے۔

ساون کا مہینہ تھا۔ اور موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ باغوں میں جھولے پڑے تھے۔ نوجوان لڑکیاں اپنے نغموں سے فضا کو معمور کر رہی تھیں۔ ساون اپنے ساتھ نئی اُمنگیں نئے ولولے اور نیا جوشِ حیات لاتا ہے پپیہا پی کہاں کہہ کر دبی ہوئی چنگاریاں روشن کر دیتا ہے۔ پانی کی پھوار کسی کے آنسو بن کر ہرے ہرے کھیتوں کو اور بھی پُر رونق بنا دیتی ہے۔ آموں کے کنج مرادوں کے دن ۔۔۔۔ بارش سے بھیگی ہوئی لڑکیاں تھرکتی، کانپتی اور بدن سے چپکے ہوئے کپڑوں کو بدن سے جدا کرنے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی کھیل رہی تھیں۔ حسن، جوانی اور ساون کی برسات۔ اف ۔۔۔! یہ سماں!

سبحان کی بیوی کمرے سے پانی نکال رہی تھی۔ اس کے لئے ساون کا مہینہ ایک قیامت تھا۔ اس کا خاوند ایک معمولی معمار تھا۔ اور بیچارہ کئی دن سے بیمار پڑا تھا۔ اگر تندرست ہوتا، تو بھی کیا کرتا؟ مکانوں کی تعمیر کا کام ساون کے مہینے میں اکثر بند رہتا ہے۔ اور وہ تھا بھی کونسا بڑا کاریگر۔ "برکھارُت" ان کے لئے "ماہِ رمضان" کے مترادف تھی۔ ایک وقت کا کھانا اگر میسر آ جاتا۔ تو بھی غنیمت تھا۔

سبحان کی بیوی نے صبح سے کچھ نہ کھایا تھا۔ بچوں کے لئے وہ اپنے بھائی کے ہاں سے چند روٹیاں اور تھوڑا سا سالن مانگ لائی تھی۔ شام چولہا جلا ہی نہ سکی ۔۔۔۔ اور آگ کہاں جلاتی؟ گھر میں سوکھی جگہ ہی نہ تھی۔ بیچاری شام سے کئی بار کمرے سے پانی نکال چکی تھی۔ ادھر نکالتی اُدھر وہ پھر پانی سے بھر جاتا۔

کمرہ ایک اچھا خاصا دَل دَل بنا ہوا تھا۔ نالی کا گندہ پانی وہ ہاتھوں سے نکال کر باہر پھینک رہی تھی۔ کمرے میں ناقابلِ برداشت تعفن تھا۔ ۔۔۔ خاوند کی بیماری، بھوکے بچے اور ان کے سونے کے لئے جگہ ندارد۔ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ رحمت اس کے لئے زحمت بن چکی تھی۔ وہ تھی تو بائیس سال کی مگر بڑھیا معلوم ہوتی تھی۔ اس کا شباب غربت اور افلاس کی نذر ہو چکا تھا۔ غریبوں پر تو شباب آتا ہی نہیں۔

ساون کا مہینہ! کبھی وہ بھی اس کا بے تابی سے انتظار کیا کرتی تھی۔ جھولے پر بیٹھ کر چند دن وہ بھی گاتی تھی۔ پی کی یاد نے اسے بھی ستایا تھا آموں کے کنج میں دوسری لڑکیاں اسے چھیڑتی تھیں۔ کہ تیرا پی تو شہر میں مکان بناتا ہے۔ وہ تیرے لئے بنگلہ بنائیگا۔ جس کے گرد باغ ہوگا۔ اور تو میم صاحب بن کر اس میں ٹہلا کریگی۔ یہ سن کر وہ شرم کے مارے لال ہو جاتی۔ اس کا من [illegible] بستا تھا۔ اس کا پی شہر میں لوگوں کے لئے مکان بناتا تھا۔ وہ اس کے لئے بھی محل بنائے گا۔ اور وہ زور سے جھولا جھلا کر اکثر گایا کرتی تھی ؎

اُچیاں تے لمبیاں ٹاہلیاں نی نے وچ ساڈی اے پینگ ماہیا

مگر آج ۔۔۔۔ آج اسے سب کچھ بھول گیا تھا۔ اور وہ حسرت و ارمان کی ایک تصویر تھی

سبحان کی بیوی کو خاوند کا شکوہ نہ تھا، وہ دیندار تھا اور نیک۔ محنتی تھا اور وفاشعار۔ اس کے باوجود وہ غریب تھا۔ اس میں اس کا کیا قصور۔ بارہ گھنٹے کا کام کرنے کے بعد بھی اسے بال بچوں کے پیٹ پالنے کے لئے بمشکل کچھ میسر آتا تھا۔ اس نے محنت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ مگر پھر بھی بچوں کا پیٹ نہ بھرتا تھا۔

دونوں میاں بیوی سمجھتے تھے۔ کہ اس میں زیادہ تر اُن کی قسمت کا دخل ہے۔ اس لئے دونوں اپنی قسمت پر شاکر تھے ۔۔۔۔ غریب شکر کے سوا اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟

اُن کے گھر کے سامنے مسجد تھی۔ اور مسجد سے ملحق مولوی صاحب کا مکان

جو اکثر مسجد میں وعظ کیا کرتے تھے۔ سجان کی بیوی نے بارہا وعظ سنا تھا۔ رُوح پرور وعظ۔ دُنیا کی ناپائیداری پر مولوی صاحب اکثر لکچر دیا کرتے تھے۔ وُہ فرماتے "خدا کی بادشاہت غریبوں کے لئے ہے۔ اور دُنیا کا نظام غربا کے سہارے قائم ہے۔"

مولوی صاحب نے کئی بار خدا کے نام پر اپیلیں کیں۔ خدا کا دین خطرہ میں بتلایا۔ سجان اور اُس کی بیوی نے بہت دفعہ اپنی کم آمدنی کے باوجود کچھ نہ کچھ خدا کی خوشنودی کے لئے دیا۔ انہیں یقین تھا۔ کہ ان کا چندہ ان کی غربت کو بہت جلد دور کر دیگا۔ وُہ اسی امید میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہر آنے والا دن ان کے لئے نئی امیدیں لے کر آتا۔ وُہ اپنی بدبختی پر بعض اوقات غور کرتے مگر دستِ غیب پر ایمان لانے کے سوا اَور کوئی چارہ نہ تھا۔ وُہ دستِ غیب ——— جو ایک دن انہیں یک بیک مالدار کر دے گا۔ یا کسی کا مکان بنلتے ہوئے مکان کی بنیادوں میں سے سجان کو کوئی دفینہ مل جائے گا۔

اپنی بدحالی سے بعض اوقات وُہ بیچارے بہت حیران ہوتے۔ مگر جب وُہ مولوی صاحب کا وعظ۔ آخرت کے انعامات اَور جنت کی ابدی خوشی کا حال سنتے تو ان کی ڈھارس بندھ جاتی۔ "دنیا مومن کے لئے قید خانہ ہے"۔ یہی وُہ نظریہ تھا۔ جو انہیں اپنی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بھی خوش رکھتا تھا۔ آنے والی فراخی اَور خوشحالی کے تصور میں وُہ اپنی ساری تکالیف بھولے ہوئے تھے۔

ان کے سامنے مولوی صاحب رہتے تھے ——— وُہ مولوی صاحب جنہوں نے اپنے آپ کو مذہب کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ شاید اسی لئے خُدا نے انہیں بہت کچھ دے رکھا تھا۔ ایک فراخ مکان، سواری کے لئے موٹر، خادم خادمائیں اَور خوبصورت اولاد۔ یہ سب انعامات دیکھ کر سجان اَور اُس کی بیوی بھی سمجھتے۔ کہ یہ سب مذہب پر کاربند ہونے کا نتیجہ تھے۔ اَور شاید بارے میں ان میں ابھی کچھ کمی ہے۔ جو وُہ غریب ہیں۔

جب مولوی صاحب کے بچے شام کو سیر کرنے موٹر میں جاتے۔ تو بعض اوقات سجان اور اس کی بیوی کو دُکھ بھی ہوتا۔ ان کے بچے مولوی صاحب کے بچوں کی نسبت زیادہ صحت مند اور خوبصورت تھے۔ مگر ان کے سیر کرنے کے لئے زمین پر جگہ نہ تھی۔

بعض اوقات تقدیر کے یہ دو رُخ دیکھ کر انہیں سمجھ نہ آتی۔ کہ ایک ہی گلی میں ایک ہی مذہب کے پیرو۔ اور ایک ہی خدا کا نام جپنے والے۔ دو خاندانوں میں بُعد المشرقین کیوں ہے۔ حالانکہ دونوں ایک ہی طرح ایک ہی خدا کی عبادت کرتے تھے۔ لیکن ایک کی زندگی امیرانہ ٹھاٹھ میں بسر ہو رہی ہے۔ اور دوسرا فاقوں مر رہا ہے۔ سجان نے مولوی صاحب کے گھر کئی دعوتیں ہوتی دیکھیں۔ دیکھی ہی نہیں۔ بلکہ اس نے حصولِ ثواب کے لئے مولوی صاحب کے برتن بھی دھوئے۔ کئی کئی راتیں اَور دن ان دعوتوں کے کام کاج میں صرف کر دیئے۔ ان دعوتوں کا اہتمام دیکھکر وہ سوچا کرتا تھا۔ کہ کاش ان میں سے ایک پلیٹ کی لاگت ہی مولوی صاحب اسے حقِ خدمت میں دے دیتے تو اس کے بال بچوں کے دو تین دن گزر جاتے۔

شام سے سجان کا بخار اَور تیز ہوگیا تھا اس کی بیوی شام سے ہی پانی نکالنے میں مصروف تھی اس لئے وُہ اس کی طرف توجہ نہ کر سکی۔ اس نے لڑکی کو تو سجان کے تپتے ہوئے بدن سے لگا کر سُلا دیا۔ مگر لڑکے کے لئے جگہ نہ تھی وہ پریشان تھی۔ خاوند کی متواتر بیماری، غربت اَور بارش نے اس کو بے حال کر دیا۔ اس کے دل و دماغ میں ایک بغاوت پیدا ہو رہی تھی۔ اس کا ضمیر پکار پکار کر اسے کہہ رہا تھا "اے بدبخت لڑکی! تو مزدور کی بیوی ہے۔ اس دنیا میں تیرے لئے چین نہیں مزدور کا لہو امیروں کی عیش و عشرت میں رنگینی پیدا کرنے کے لئے ہے۔ تجھے اس حالت میں رکھنے کے لئے امیروں نے ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ اگر تو بھی آج مالدار ہو جائے۔ تو تمام محلے میں تیری بھی عزت ہو"۔

باد و باراں کا طوفان اَور بھی تیز ہوگیا۔ ان کی کوٹھڑی کے دروازے پر پڑا ہوا ٹاٹ زور سے آ کر دروازے سے لگتا۔ اور اس کی آواز سے بچے سہم جاتے۔ بچوں کی حالت دیکھکر سجان اپنی تکلیف بھول گیا۔ وہ بے بس تھا اور کچھ نہ کر سکتا تھا۔ وُہ اس فکر میں گم ہو گیا۔ غریب دکھ میں بھی زبان نہیں کھولتا۔ اَور خونِ جگر پی کر بھی شکر ہی کرتا ہے۔

سامنے مولوی صاحب کا مکان بجلی کے قمقموں سے روشن تھا۔ روشنی کھڑکیوں کے پردوں سے چھن چھن کر پانی سے بھری ہوئی گلی میں ایک پُر لطف نظارہ پیش کر رہی تھی۔ ریڈیو کے گانے کی آواز خاموش فضا میں ایک خوشگوار ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ مگر یہی گانا سجان کی بیوی کی ذہنی تکالیف میں اضافے کا موجب ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد قہقہوں کی آواز سنائی دی۔ یہ ریڈیو پر گانے والے کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا تھا۔ مگر سجان کی بیوی کو یقین ہو گیا۔ کہ دُنیا اسکی بدحالی پر ہنس رہی ہے ——— اس احساس نے اسے اور بھی پریشان کر دیا۔ وُہ تن کر کھڑی ہو گئی۔

غلیظ کمرے میں مٹی کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ ہوا کے ایک تند جھونکے نے اسے بھی بجھا دیا ——— اَور کمرے میں بالکل اندھیرا ہو گیا۔

ادھر ریڈیو پر کسی نے شاعرِ مشرق کا نغمہ چھیڑ رکھا تھا ؂

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی !!
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

محمد صابر وحشی

میں خودکشی کر رہا ہوں

(یہ اُس ڈائری کے چند ورق ہیں جسے میں نے ندی کے کنارے پڑا پایا۔ کاتب بیچارہ بیروزگاری سے تنگ آکر ڈوب مرا تھا)

۱۱۔ اگست۔ ماں نے کہا "جاؤ بیٹا! پھر قسمت کا دروازہ کھٹکھٹاؤ۔ تمہاری جبینِ نیاز اُسے منظور نہیں تو شاید میری دعائیں اس کے پتھر دل کو موم کر دیں"۔

میں اُٹھا اَور چل دیا، ایک نامعلوم منزل کی طرف۔ کہاں جا رہا ہوں مجھے معلوم نہ تھا۔ اب کیا کرنا ہوگا؟ میں یہ بھی نہیں جانتا تھا۔ پھر بھی جا رہا تھا۔ ٹانگیں میرا ساتھ دے رہی تھیں لیکن ہوش و خرد ساتھ چھوڑ چکے تھے میں ۔ ۔ ایک آوارہ منزل ۔ شہر کی بکھری ہوئی سڑکوں پر، ایک نہ ختم ہونے والے راستے پر بھٹک رہا تھا۔ اَور وقت اپنے پروں پر تیزی سے اُڑا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ ہر طرف شام کی تاریکی پھیلنے لگی ۔ ۔ ۔ ۔ سامنے سربفلک عمارتوں کے رنگین پردوں سے چھن چھن کر آتی ہوئی شعاعیں مسکرا رہی تھیں۔ میری بےکسی پر ۔ ۔ ۔ شاید اس روشنی میں، دولت کی سٹیج پر گناہ کا ڈراما کھیلا جا رہا تھا۔ قسمت اَور قدرت کی بےبسی پر قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ اور ساتھ ہی ہوا کی لہروں پر تیرتے ہوئے نغمے! اُف خدایا!! ایک وُہ ہیں جو زندگی کی رنگینیوں میں کھو کر گزرتے ہوئے وقت کا اندازہ بھی مشکل سے کر سکتے ہیں اَور ایک ہم ہیں کہ وقت ہمارے لئے ایک ناقابلِ برداشت بوجھ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وقت کے پہیے تلے ہماری زندگی بھر کی آرزوئیں کچلی جا رہی ہیں۔ آہ! غریب: دنیا کے گلے کا طوقِ لعنت!!!

۱۲ اگست ——— آج صبح خیالات کی رَو میں بہتا جا رہا تھا۔ راستے میں مظفر اَور زمرد مل گئے۔ یہ میرے کلاس فیلو ہیں۔ ہم نے ایک ہی سال بی۔ اے پاس کیا ہے۔ لیکن یہ دونوں سماج اَور دُنیا کی نظروں میں انسان ہیں مکمل انسان کالج کی چار دیواری سے باہر قدم رکھتے ہی وُہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وُہ مجھ سے ذہین نہ تھے۔ میری جسمانی صحت ان سے کئی درجہ اچھی تھی۔ لیکن پھر بھی وُہ اپنے ماں باپ کا پیٹ پال رہے ہیں، رشوت خور حکام قسمت نیلام کرتے ہیں۔ سب سے زیادہ بولی دینے والا اُس کا حق دار ہے۔ خیر ان باتوں سے فائدہ، جانے دو۔ ہاں! تو ہم تینوں ہوٹل میں جا بیٹھے۔ چائے کا دَور آیا۔ سگریٹ کے کش لگے۔ پہلے ہی کش سے میرے بدن میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ کبھی کالج کے ایام میں شوقیہ سگریٹ پیتے تھے۔ لیکن اب تو دو وقت میں ایک وقت کی روٹی مشکل سے نصیب ہوتی ہے۔ وہ بھی پیٹ بھر کے نہیں۔ اب دنیا کے افکار کو بھولنے کے لئے سگریٹ ضروری تھے مگر وُہ وقت کہاں۔ کبھی زمانے میں والدین کے گاڑھے پسینے کی کمائی بے دریغ اُڑایا کرتے تھے۔ مگر اب ایک بلیڈ سے دس حجامتیں ہوتی ہیں۔ ہم دیر تک گپیں ہانکتے رہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خدا خدا کر کے ان سے چھٹکارا حاصل ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ پھر کسی آرزو کی تلاش شروع ہوئی۔ شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔ لیلائے شب نے اپنی سیاہ اَور دراز زلفیں کائناتِ عالم پر بکھیر دیں۔ تھکا ماندہ گھر پہنچا۔ ماں سو چکی تھی۔ ڈائری لکھی اَور چپکے سے بستر میں گھس گیا۔

۱۴ ستمبر ——— خبر ملی کہ رُوئی کے کارخانے میں چند مزدوروں کی ضرورت ہے۔ دفتر میں گیا۔ مینجر نے پوچھا کیا کام ہے؟ میں نے کہا۔ نوکری چاہیئے۔ پوچھا بتیں؟ میں نے کہا ہاں مجھے! وُہ ہنسا اَور بولا۔ آپ کے لئے تو کوئی نوکری نہیں۔ ہمیں تو رُوئی کے گٹھے اٹھانے کے لئے چند مزدور درکار ہیں۔ میں سمجھ گیا۔ کہ میری پتلون اور ہیٹ اسے دھوکا دے رہے ہیں۔ لباس سے انسان کے متعلق صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ہر وُہ چیز جو چمکتی ہے سونا نہیں ہوتی۔ میں نے کہا۔ "میں مزدوری کروں گا"۔ بولا آپ مزدوری نہیں کر سکتے۔ تشریف لے جایئے۔ مزدوری کے لئے علم نہیں طاقت چاہیئے۔ مجبوراً مجھے دفتر سے نکلنا پڑا۔ یہ تھا تعلیم کا پھل مستقبل کی امید کے لئے میں نے اپنی رگوں میں کھولتے ہوئے خون کا ایک ایک قطرہ تعلیم پر صرف کر دیا اور اب؟ سرمایہ داری کی گاڑی دھکیلنے کے لئے میرے کمزور جسم میں کافی خون نہ تھا۔ میں نوجوان تھا لیکن ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ موجودہ نسلیں اپنی صحت اَور تندرستی تعلیم کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا رہی ہیں، کس امید پر؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مردہ جسم، کانپتے ہوئے ہاتھ، نظر عینک کی محتاج ۔ ۔ اور دماغ سوچنے کی صلاحیت سے عاری ۔ ۔ میں نے اس انسانیت کے اشتہار کو بدن سے اُتار پھینکنے کا ارادہ کر لیا ہے۔

۱۸۔ ستمبر ——— آج سڑک پر ایک مجبور اور بےغیرت بچہ ہاتھ پھیلا کر خیرات کا طلبگار ہوا۔ "ایک پیسہ بابا"۔ ۔ ۔ ۔ پیسہ؟ کیا کرو گے۔ مانگتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ جاؤ بازوؤں کی محنت سے کماؤ۔" اس کی آنکھو

ت، رحم اور امید کی جھلک تھی۔ یہ بچے۔۔۔ ہماری موجودہ نسلیں، ویسے ہی کمزور ناتواں نحیف بچے پیدا کر رہی ہیں۔ جو جوان ہونگے تو ان کے لئے زندگی نام ہوگا سڑکوں کے کنارے کھڑے ہو کر کانپتے ہوئے ہاتھ دوسروں کے سامنے پھیلانے کا۔ ان کے نحیف و نزار جسم مشقت کے متحمل نہیں ہو سکیں گے۔ قدرت انہیں جنم دیگی مانگنے کے لئے، زندہ رہیں گے دوسروں کی مدد پر، اور مر جائیں گے بھوک کی وجہ سے، وہ اپنے بعد ایک ایسی تاریخ چھوڑ جائیں گے۔ جس کا ہر ورق ان کی بزدلی اور کاہلی کی داستانوں سے سیاہ ہوگا ...... لیکن بازوؤں کی محنت سے روزی پیدا کرنے والے کون سا سکھ دیکھتے ہیں۔ دن بھر مزدور دولتمندوں کی خدمت جس کا معاوضہ ناکافی، اور رات کی ختم نہ ہونے والی تاریکی میں اندھی قسمت کا رونا۔۔۔ قسمت!..... جاؤ جاؤ! خدا سے کہو غریبوں کو کیوں جنم دیا؟ دولت مندوں کو دولت کیوں دی؟ کیا یہی تیرا کارخانۂ قدرت ہے؟ ایک وہ ہیں جو دولت سے کھیلتے ہیں، اور ایک یہ جو بھوک کی گود میں پرورش پاکر، تاریک جھونپڑیوں میں قسمت کو اپنی پُر درد آہوں میں ڈھونڈتے ہوئے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دیتے ہیں۔ قسمت، تقدیر!، غربت!!!

۱۱۔ اکتوبر۔۔۔ سنا ہے چین اور جاپان میں جنگ چھڑ گئی ہے ہوس اور خودداری کی جنگ۔ جاپان کمزور چین کو ہڑپ کر جانا چاہتا ہے آج کی اخبار میں لکھا تھا کہ جاپانیوں نے دس ہزار چینیوں کو فنا کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ جنگ کا دیوتا کتنا بھیانک ہے اور موت کتنی بے رحم! ہزاروں بچے یتیم ہوگئے ہونگے۔ سینکڑوں دلہنوں کا سہاگ لٹ گیا ہوگا۔ ہوس ملک گیری انسان کو وحشی درندہ بنا دیتی ہے۔ کیا مائیں اپنے بچوں کو اسی دن کے لئے جنم دیتی ہیں؟ بچے اسی لئے جوان ہوتے ہیں کہ وہ اپنی جانیں جنگ کے دیوتا پر بھینٹ چڑھائیں۔..... والدین کی ہزاروں آرزوئیں ظلم وستم کے پاؤں تلے کچلی جا رہی ہیں۔ لیکن قدرت خاموش ہے... وقت اپنے سباک پروں پر اڑا جا رہا ہے۔ دنیا کو اتنی فرصت نہیں کہ اپنے ان بھولے بچوں کی موت پر چار آنسو ہی بہالے۔

ظالم دلیری سے ظلم کر رہے ہیں اور مظلوم صبر سے برداشت۔ طاقتور کمزور کو نگل جانا چاہتا ہے۔ ملک تباہ ہوچکا ہے۔ ہمسائے ہمدردی کا پیغام بھیجتے ہیں: "ہماری ہمدردی ہر وقت تمہارے ساتھ ہے"۔ لیکن دردمند کا درد کوئی نہیں بانٹتا۔ کاش میں چین میں ہی پیدا ہوتا۔ تاکہ ملک و وطن کی حفاظت کرتے ہوئے کسی بیدرد جاپانی کی بے رحم گولی کا نشانہ بن کر زمانے کے کندھوں سے بوجھ ہلکا کر دیتا۔ مجھے پیٹ پالنے کے لئے کوئی چیز میسر نہ تھی ——— تو میں کسی بھوکے درندے کی خوراک بن سکتا۔

۱۔ دسمبر۔۔۔ اب تک مزدوری ہاتھ نہیں آئی۔ جدھر جاؤ۔۔۔ "نو ویکنسی نو ویکنسی"۔ یہ فرعون دماغ، ہم جیسے بھٹکتے ہوئے بیروزگاروں کی جاں بلب امیدوں کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ آج تین دن سے فاقہ ہے۔ رہی سہی امید بھی جاتی رہی۔ ماں! میری رحمدل ماں!! اُف اس کے احسانوں کا بدلہ؟ یہی ہے۔ میرے پاس اور کیا ہو سکتا تھا؟

بھوک نے اس کی ضعیفی کی کمر توڑ دی ہے۔ وہ شب و روز غم کھاتی ہے۔ شاید غم اس کی مرغوب غذا ہے۔ اس نے اپنی امیدوں اور بیٹے کی جوانی کو پروان چڑھتے دیکھا۔ لیکن قسمت؟ آج سے چند برس پیشتر ہی اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ بھوک! بھوک!! چوری کروں، ڈاکہ ڈالوں، کسی فریب سے دولت حاصل کروں۔ مذہب کہتا ہے چوری گناہ ہے قابل گرفت، سماج کہتا ہے۔ ڈاکہ انسانیت کے فرائض پر بدنما داغ ہے۔ اور قانون کہتا ہے۔ فریب جرم ہے ناقابل معافی۔ لیکن مذہب اُن سے کوئی بازپرس نہیں کرتا جو دوسروں کی بہو بیٹیوں کے عصمت کی چوری کرتے ہیں۔ سماج ان کو نہیں روکتا جو دنیا کے امن و سکون پر ڈاکہ ڈالتے ہیں...... ہزاروں شریف بدمعاش فریب کے جال میں دنیا کو گرفتار کرکے اپنا اُلو سیدھا کرتے ہیں اور فخر کی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے قانون کی گرفت سے صاف بچ نکلتے ہیں۔ غریبوں کے خون سے اپنی زندگی رنگین بنانے والوں کی قانون، مذہب اور سماج حمایت کرتا ہے..... مذہب دولت کا غلام۔ سماج، روپے کا بیٹا۔ قانون، سونے چاندی کے چند چمکتے ہوئے ٹکڑوں کا بدلہ۔ جہاں دیکھو پیسے کے کھیل۔ ہسپتال کی چہار دیواری، خیرات خانے، عدالتیں، جہاں دیکھو دولت کی حکومت۔ صحت کے مزار کے مجاور، قانون کے محافظ سب پیسے کو اپنا خدا مانتے ہیں۔ ڈاکٹر کی نظروں میں انسانی زندگی سے بڑھ کر دولت کی قیمت ہے۔ جج قانون کو سستے داموں بیچتے پھرتے ہیں۔

۷۔ دسمبر۔۔۔ آج دیر سے اٹھا، رات بھر مبہم اندیشے۔ تاریک شبہات اور بیم و رجا کی مشترکہ کیفیتیں میرے خوابوں پر حاوی رہیں۔ اب تک تو ماں اپنے زیورات بیچ کر میرا اور اپنا پیٹ پال رہی تھی۔ لیکن اب تو پھوٹی کوڑی تک بھی پاس نہ تھی۔ میں نے سوچا آج نوکری کی تلاش میں جانا فضول ہے۔۔۔ دوپہر کو کتابوں کی الماری کھولی سینکڑوں جلدوں والی کتابیں الماری میں مسکراتی ہوئی جھانک رہی تھیں میری بے بسی اور بے کسی پر۔ یہ ان مصنفوں کی شب و روز کی عرق ریزی کا پھل ہے جن کا دماغ نیچر کی گتھیاں سلجھانے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ کیا علم سب سے بڑی دولت ہے؟ کوئی جواب نہیں! کیا علم بھوک کی گود میں بلکتے ہوئے بچوں کے آنسو پونچھ سکتا ہے؟ نہیں..... کیا مزدور کے عریاں جسم کو سورج کی تپش اور ٹھٹھرتے ہوئے جاڑے سے بچا سکتا ہے؟ نہیں! تو پھر دولت کیسی؟..... بوجھ کے تلے دبے ہوئے مزدور، فرعون مزاج

آقاؤں کی خدمت میں خون پسینہ ایک کرنے والے غلام۔ کیا ان میں کوئی بھی علم سے بہرہ ور نہیں ؟ ہیں! تو پھر علم کی دولت ہوتے ہوئے بھی خون انکی رگوں میں گردش کرتا ہے۔ امارت کی گاڑی کو حرکت میں لانے کے لئے وہ زندگی کا سانس لیتے ہیں۔ ان کی امیدوں میں روح پھونکنے کے لئے . . ان موٹی موٹی کتابوں میں علم و ادب، سائنس، تاریخ سب کچھ ہے۔ لیکن پیٹ اور روٹی کا نسخہ ان میں تلاش کرنا فضول۔ سب کتابیں باندھ کر کباڑیئے کے پاس لے گیا۔ اتنی قیمتی کتابوں کے عوض اس کمبخت نے صرف سوا روپیہ دیا۔ اچھا کتابیں اب میرے کس کام تھیں۔ ان پیسوں سے اپنا اور اپنی ضعیف ماں کا پیٹ پالوں گا۔ لیکن کب تک؟ خیر دو چار دن ہی سہی۔

۲۲۔ دسمبر —— چند دن ہسپتال میں بیمار پڑا رہا۔ جی چاہتا تھا کہ عمر بھر یہیں پڑا رہوں۔ کیوں نہ ہو کھانا مفت ملتا تھا۔ مگر ہسپتال کی چار دیواری کے باہر بھوک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے ہسپتال سے نکال دیا گیا۔

۹۔ جنوری —— سڑک پر جا رہا تھا۔ ریڈیو کی آواز کان میں پڑی۔ گانے سن دل کی دنیا میں ہلچل مچا دی۔ سوئے ہوئے جذبات پھر انگڑائی لے کر بیدار ہو گئے . . . مجھے محبت ہے ایک سُندر لمبے بالوں والی آہو چشم کافرہ سے۔ ہم دونوں یک جان و دو قالب ہیں۔ جی چاہتا ہے۔ اپنی دن بھر کی کلفتوں کو اس کے نقرئی قہقہوں میں گم کر دوں۔ لیکن میری موجودہ حالت اجازت نہیں دیتی۔ . . . وہ ایک حسین دوشیزہ ہے لیکن پوڈر، لپ سٹک اور ساڑھی کی دلدادہ نہیں ہو سکتا ہے کہ وہ میری موجودہ مصیبتوں کی ساتھی بن کر میرے دل کے لئے سکون ثابت ہو لیکن میری زندگی تباہ ہے تو اس کی دنیا کیوں برباد کروں . . . . ؟ میں انہی خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ شور و غل نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ریڈیو کی آواز بھی گم ہو چکی تھی معلوم ہوا مزدوروں کا جلسہ ہے۔ میں نے بھی وہاں جانے کے متعلق سوچا۔ شاید وہاں ہی میرا درد بھرا افسانہ سن کر کسی کا دل پسیجے۔ کیونکہ ان میں بہت سے ایسے ہونگے۔ جو میری "موجودہ حالت" میں اپنے دن گزار چکے ہونگے۔

جلسے میں پہنچا۔ مزدوروں کا محبوب لیڈر اپنی گرجدار آواز میں تقریر کر رہا تھا: بھائیو! سرمایہ دار مزدوروں کا خون جونک کی طرح چوس رہے ہیں تمہارے جسم کا خون ختم ہو چکا ہے۔ لیکن وہ ابھی سیر نہیں ہوئے، وہ چاہتے ہیں کہ تمہارے گوشت پوست سے بھی روپیہ کمائیں۔ جب تم شور کرتے ہو تو وہ کام سے علیحدہ کر دینے کی دھمکی دیتے ہیں۔ تم مستقبل کی فاقوں بھری زندگی کا خیال آتے ہی لرز اٹھتے ہو"۔ وہ کانپ رہا تھا۔ "سرمایہ داری کی آواز پر ہڈیوں کے لاکھوں ڈھانچے کہ جن پر گوشت پوست کا نام و نشان تک نہیں ہوتا۔ آ جمع ہوتے ہیں۔ اسی طرح سرمایہ داری کا یہ کھیل کھیلا جاتا ہے . . . . . . آنکھیں کھولو۔ زمانے کی رفتار کو دیکھو۔ اگر سرمایہ داری کی گاڑی دھکیلنے کیلئے اپنی طاقت صرف کرتے ہو۔ تو دماغ اپنی بہتری کے لئے صرف کر دو۔ تمہاری موجودہ حالت دیکھکر میری ہمدردی خون کے آنسو روتی ہے۔ تمہارا تڑپنا میں ان آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا۔ میں اکیلا کچھ نہیں کر سکتا۔ ان کی پشت پر سرمایہ داری کا ہاتھ ہے۔ لیکن ہم انہیں جلد ہی بتا دیں گے۔ کہ ہمارے ساتھ بھی بھوک کی گود میں دم توڑتے ہوئے غریب مزدوروں کی آخری آہیں ہیں۔ کاش سرمایہ داروں کی آنکھیں ہوتیں تاکہ وہ غریبوں کے بے رونق چہروں کو دیکھتے۔ ان کے کان ہوتے تاکہ وہ ہماری درد بھری آواز سنتے انہیں ایک رحم بھرا دل ملتا تاکہ وہ ہماری "موجودہ حالت" کا اندازہ کر سکتے " . . !

تقریر ختم ہو گئی۔ ہزاروں ہاتھ پھولوں کے ہار لئے ہوئے آگے بڑھے۔ سینکڑوں دل اُسے گلے سے لگا لینے کے لئے بیتاب تھے۔ اس کے الفاظ بھی کیا پہلو لئے ہوئے تھے "ظلم و ستم کا یہ ڈرامہ، دولت کی سٹیج پر ہی کھیلا جاتا ہے۔"

۱۰۔ مئی —— آج ایک سال پورا ہو گیا۔ یہی دن تھا جب میں نے اپنی صحت، دولت، اور عمر کی جو قیمتی بہاریں علم کی دیوی پہ نچھاور کر کے اسے اپنا بنایا تھا۔ کس لئے؟ مجھے مستقبل کے افق پہ مسرت و شادمانی کا ستارہ چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ تعلیم کی سیڑھی سے میں بام عروج پہ پہنچنا چاہتا تھا۔ اس وقت تک مجھے دنیا میں زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں تھا جب تک کہ میں زیورِ تعلیم سے آراستہ نہ ہو جاؤں۔ سماج مجھے اسوقت تک اپنا نہ بنا سکتا تھا جب تک کہ میں اپنی عمر کی قیمتی گھڑیاں سکول اور کالج کی چار دیواری میں نہ گزار دوں۔ لیکن یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی میں دوسروں کے سہارے کا محتاج ہوں — یہ سارا قصور موجودہ طرزِ تعلیم کا ہے جس نے مجھے ہاتھ پاؤں رکھتے ہوئے غیروں کا محتاج بنا دیا۔ میں الجبرا اور ٹریگنومیٹری کی جائے وقوع دنیا کے نقشے پہ بتا سکتا ہوں جنگِ عظیم کے متعلق جو کچھ تاریخ کے صفحوں پہ بکھرا پڑا ہے سب نوکِ زبان ہے۔ الجبرا اور جیومیٹری کے مشکل سے مشکل سوالات حل کر سکتا ہوں لیکن میرے کسی کام کے ہوتے اگر کچھ سیکھا ہوتا تو سکول سے نکلکر دوسروں کا سہارا نہ ڈھونڈتا —— اب زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔ دنیا میں مجھے زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں — میں خودکشی کر رہا ہوں — ندی کی اٹھتی ہوئی لہریں مجھے اپنی گود میں سکھ اور آرام کی نیند سلائیں گی، معاف کرنا ماں، اپنے اس بدقسمت اور بزدل بیٹے کو، تمہاری ضعیفی میری موت کے غم کی متحمل نہ ہو سکے گی، دنیا میں تمہارا کوئی سہارا نہ ہوگا۔ لیکن ماں، میں زندہ رہتے ہوئے بھی تمہارے کس کام کا ؟ . . . .

الوداع! . . . . اے میرے دل کی دنیا میں بسنے والی رخصت الوداع! . . . . "

انور کمال

اُس کا لال

صبح کے وقت ایک بجا۔ نوجوان افغان سرحدی گاؤں کے ایک ٹیلے پر عالم اضطراب میں کھڑا تھا، وہ شاید کسی کا منتظر تھا۔

وسیع میدان پر سفید برف کی ایک تہ سی جم گئی تھی ایکایک اس سخت زمین پر گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی، اور مشرق کے افق سے ایک جوان افغان گھوڑے پر آتا دکھائی دیا نوجوان کو آتا دیکھ کر شہزاد کی آنکھوں میں خون اُتر آیا، اس نے اپنا لمبا خنجر نکال لیا۔ دوسرے نوجوان نے بھی خنجر نکال کر شہزاد پر حملہ کیا۔ شہزاد کا خوبصورت چہرہ غصہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ دونوں افغان اپنی خاندانی عزت اور وقار کا فیصلہ کرنے کے لئے یہاں آئے تھے۔ دیر تک کشمکش جاری رہی یکا یک فضا میں ایک چیخ کی آواز گونجی۔ شہزاد ایک بار تڑپا اور پھر زمین پر گر پڑا۔ خنجر سے گردن پر کاری زخم لگا تھا۔ اس کے خون سے برف پر دور دور تک سرخی پھیل گئی تھی۔

خاندانی عزت اور وقار کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ فاتح اپنی کامیابی پر مسرور گھوڑے پر سوار ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اور مفتوح زمین پر دم توڑ رہا تھا، تھوڑی دیر کے بعد شہزاد نے دم توڑ دیا۔ اس کی موت کے ہر آدمی کو اس کی موت کی خبر بھی مل گئی۔ صرف اس کی ماں تک یہ روح فرسا خبر پہنچنا باقی تھا۔ جو نوجوان ابھی ابھی اپنی عزت کی خاطر دشمن کے ہاتھوں ہلاک ہوا تھا، اپنی بوڑھی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا، کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ شہزاد اپنے دشمن کے ہاتھوں ہلاک ہو جائے گا۔ وہ اپنے دشمن سے کہیں زیادہ قوی اور شجاع تھا۔ تمام سپاہیوں کو اس سے محبت تھی، وہ اس کی بہادری کے قدرداں تھے۔ لیکن اب اس کی ماں کو یہ منحوس خبر کون سنائے؟ یہ سب سے مشکل کام تھا، کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ شہزاد کی بوڑھی ماں تک یہ خبر پہنچا سکے۔ آخر کار شاہ گل کو اس کام کیلئے مقرر کیا گیا۔ وہ سخت دل تھا، اور لوگ کہا کرتے تھے کہ اس کے سینے میں دل کی بجائے پتھر کا ایک ٹکڑا ہے۔ شاہ گل یہ منحوس خبر شہزاد کی ماں تک پہنچانے کے لئے شہزاد کے گاؤں روانہ ہو گیا۔

۲

زبیدہ کو بیدار ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا، وہ ہاتھ منہ دھو کر قہوہ بنا رہی تھی کہ شاہ گل اداس و مغموم اور افسردہ و مضمحل کمرے میں داخل ہوا

"خوش آمدید، بیٹھو، کہو اچھے تو ہو بیٹا!" بوڑھی زبیدہ نے شاہ گل کو مخاطب کیا۔

"تم اچھی تو ہو اماں!" شاہ گل نے آہستہ سے کہا۔

"تم شاید شہزاد سے ملنے کیلئے یہاں آئے ہو؟" بڑھیا نے شاہ گل کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں اماں میں ذرا ادھر سے گزر رہا تھا، سوچا ذرا تم سے مل لوں۔" شاہ گل نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جیتے رہو، لو یہ قہوہ کی پیالی پی لو، شہزاد ابھی سو رہا ہے۔ وہ رات نہیں سویا، بس بے چینی سے ادھر اُدھر ٹہلتا رہا ہے۔ میں نے بہت کہا سنا کر سو جاؤ لیکن نہ جانے کیا بات تھی۔ اب وہ سویا ہو گا۔ میں نے خادمہ سے کہہ دیا ہے کہ اُسے بیدار نہ کرے، کل عید ہے نا! آج آرام کر لے کل تو صبح سویرے جاگنا ہی پڑے گا۔ لیکن بیٹا اگر تم اس سے ملنا ہی چاہتے ہو تو میں اُسے بیدار کر دیتی ہوں۔"

"نہیں نہیں اُسے سونے دو اماں! وہ میٹھی نیند سو رہا ہو گا۔" شاہ گل نے غم میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

بڑھیا پھر نہ جانے کیا سوچ کر شہزاد کے کمرے کی طرف چلی گئی، شاہ گل بے چینی سے ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو بڑی بے چینی سے مل رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ بڑھیا کو ایسی منحوس خبر کیونکر سنائے۔ وہ سوچنے لگا کیوں وہ صاف طور پر بڑھیا کو یہ نہ کہہ دے، کہ اس کا بیٹا اپنے خاندان کی عزت کی خاطر مر چکا ہے۔ لیکن اس کی زبان گنگ ہو گئی۔ وہ کانپ اٹھا۔

"اب تم ہی بتاؤ نا! تم جوان لوگوں پر بھلا کیے اعتبار آسکے" زبیدہ نے شاہ گل کو کمرے سے باہر آ کر مخاطب کیا۔

"یہاں میں نے بہت کوشش کی کہ پیالیاں آپس میں نہ بجیں تاکہ بچوں کو میں نے خاص احتیاط سے دھر یا، مگر دیکھو شاہ گل۔ تمہارا دوست مجھے بتائے بغیر کہیں چلا گیا ہے، لیکن تم ذرا بیٹھ جاؤ۔ تھوڑا سستا لو، وہ بھی آتا ہی ہو گا!" زبیدہ مسکرا کر بولی۔

"مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی تھیں، شاہ گل تم بہت عرصے کے بعد ملے ہو، لیکن تمہیں شہزاد نے تم سے اُن باتوں کا ذکر کر دیا ہو گا۔ بڑا بھولا اور نادان ہے۔ جب کل رات وہ نہیں سویا۔ تو میں سوچتی رہی کہ اس کی کی بے قراری کی وجہ کیا ہے۔ بعض دفعہ تو وہ بالکل نہیں سوتا۔

"شاہ گل! میری تو بہت پرانی آرزو ہے کہ اس کی شادی زہرہ

سے کر دوں، بڑھاپے میں یہ خوشی تو دیکھ لوں، تم جانتے ہی ہو جب شہزاد کے والد اس جہان سے سدھارے، تو شہزاد صرف دو سال کا تھا، بس اس وقت سے آج تک میں اس کی پرورش کر رہی ہوں۔ دکھ درد سہہ سہہ کر اُسے جوان کیا ہے، اور اب میری آخری آرزو ہے، کہ اس کی شادی زہرہ سے ہو جائے۔ اس کی پریشانی کا باعث زہرہ کی محبت ہے" بڑھیا کی آواز بہ کہتے ہوئے بھرا گئی۔ اس کی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے آنسو ڈھلک کر اس کے گالوں پر رک گئے۔ بڑھیا نے مسکرانے کی کوشش کی اور اپنی چادر سے آنسو پونچھ کر بولی۔

"تمہیں معلوم ہی ہے شاہ گل! مجھے شروع شروع میں کس قدر مصائب اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ روپے کی قلت کی وجہ سے تم لوگ کے امیروں کو بڑی شان سے شادی کرنے کا چاؤ ہوتا ہے۔ اس لئے تو وہ کہتا ہے کہ شادی کے موقعہ پر تمام سپاہیوں کو بلاؤں گا۔ اب میں نے پانچ ہزار روپے کا انتظام کر لیا ہے، میرا ارادہ ہے کہ عید کے چند دن بعد اپنے لال کی شادی کر دوں۔ اب مجھ سے گھر کا بندوبست نہیں ہوتا۔ بوڑھی ہو گئی ہوں بیٹا! اچھا دیکھو مجھے زہرہ نے کس پیار سے خط لکھا ہے"

بڑھیا نے یہ کہہ کر اپنی جیب میں سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کچھ نکالا، اور شاہ گل کو دکھانے کے بعد پھر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"وہ کتنی پیاری لڑکی ہے" بڑھیا نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ شاہ گل بڑی بے چینی سے بڑھیا کی باتیں سن رہا تھا۔ بڑھیا کی باتوں کے ساتھ ساتھ اس کی تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اُسے یہ کس طرح کہے کہ تیرا بیٹا، جس کی نیک بختی ہی تیری زندگی کا پہلا اور آخری مقصد ہے، اب اس دنیا میں موجود نہیں" وہ سوچنے لگا کہ تھوڑی دیر کے بعد بڑھیا کی امید دل کا قصر ٹوٹ کر گر جائے گا۔ قسمت کا ہاتھ اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں پر سیاہی مل دیگا۔ لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اور چپ چاپ بڑھیا کی باتیں سنتا رہا۔

"لیکن آج تم اتنے اُداس کیوں ہو؟" بڑھیا نے شاہ گل کو متفکر دیکھ کر پوچھا۔ "تمہارا چہرہ آج خزاں زدہ پتے کی طرح کیوں زرد ہے شاہ گل"۔

بڑھیا نے دوبارہ پوچھا۔

شاہ گل چاہتا تھا کہ کہہ دے۔ بڑھیا تیری کوکھ بانجھ ہو گئی۔ تقدیر تیری دشمن بن گئی۔ لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ بڑھیا پھر بولی۔

"اور زہرہ نے تمہیں بھی تو سلام لکھا ہے۔ یقین نہ آئے تو خود پڑھ لو تم سمجھتے ہو گے بڑھیا جھوٹ کہتی ہے" زبیدہ نے پھر جیب کو ٹٹولا، اور چٹھی نکال کر پڑھنے لگی۔

پیاری اماں!

وہ وقت کب آئیگا، جب میں تمہیں صحیح معنوں میں ماں کہہ کر پکار سکوں گی۔ میں بڑی بے چینی سے اس وقت کا انتظار کر رہی ہوں، میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ وقت بہت جلد آجائے گا۔ شاہ گل کو میرا سلام اور اس کے دوست کو ہزار سلام۔

تمہاری بیٹی:-

"زہرہ"

زبیدہ نے سر اٹھایا۔ اسکی آنکھوں میں آنسوؤں کے دو مہتاب قطرے چمک رہے تھے۔

بڑھیا شاہ گل کی طرف متوجہ ہو کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔

"تم بہت خوش ہو گے شاہ گل، تم اور شہزاد تو ایک دوسرے کے بھائی ہوئے نا!" فرط انبساط سے بڑھیا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ شاہ گل بہت پریشان تھا۔ جب اس نے سنا کہ بڑھیا اس کے متعلق ایسی اچھی رائے رکھتی ہے تو شرم سے اس کا سر جھک گیا۔

دوست ہو کر وہ اپنے دوست کو دشمن کے پنجے سے نہ چھڑا سکا۔ اگر شہزاد کی جگہ خنجر اسکے سینے پار ہو جاتا، تو یقیناً اُسے بہت مسرت ہوتی، پھر وہ سوچنے لگا کہ بڑھیا آدھ گھنٹے کے بعد اس کے متعلق کیا خیال کریگی۔ احساس ندامت سے اس کی آنکھیں نیچے جھک گئیں وہ سوچنے لگا اور اس نے ارادہ کر لیا کہ بڑھیا کو اب وہ اس کے بیٹے کے متعلق سب کچھ بتا دیگا۔ لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا وہ بڑھیا کی یہ عارضی خوشی بھی نہ چھیننا چاہتا تھا۔ اُسے شجاعت سے نفرت ہو گئی جنگ و جدل سے بیزار ہو گیا۔ عزت سے اُسے بے عزتی پیاری معلوم ہونے لگی

"لو یہ قہوہ پی لو نا! اس وقت سے رکھا ہوا ہے۔ میں ذرا اندر ہو آؤں" بڑھیا یہ کہہ کر اندر چلی گئی۔ اور شاہ گل چپکے سے باہر نکل گیا۔ اور گھوڑے پر بیٹھ کر نہ جانے کہاں چلا گیا۔ بڑھیا جب باہر واپس آئی، تو قہوے کی پیالی ——— میز پر پڑی تھی، اور شاہ گل کا کوئی پتہ نہ تھا ———

——— بڑھیا مستقبل کی رنگینیوں میں کھو گئی۔

قید خانے کا عفریت

نوشتہ: او ہنری
مترجمہ: نذیر میرزا برلاس

میرے قیدی دوست جاوید نے تمسخرانہ انداز سے مسکراتے ہوئے کہا "کہتے ہیں انسان کی تخلیق جن عناصر سے ہوئی ان میں زیادہ حصہ پتھر کا تھا اور اس میں ذرا شک نہیں۔ انسان سے ایسے ایسے افعال سرزد ہوتے ہیں جن سے درندے شرما جائیں ——— قید خانہ کے عفریت امیرے ہی کو لیجئے ...."

وہ سنبھلا۔ میں سمجھا کہ امیرے کا نام بے اختیار اس کی زبان پہ آگیا تھا۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "دوست! انسانی ذلت برداشت نہیں ہو سکتی۔ اشرف المخلوقات اتنا ذلیل ہو کہ امیرے کی طرح ایک درندہ ہو کر رہ جائے۔ آہ۔ کل رات پھر اُسے بری طرح پیٹا گیا۔ میں کال کوٹھڑی میں گیا اور اس کے زخموں کی مرہم پٹی کی۔ وہ قوی ہیکل دیو! ارے کئی گھنٹے زخم دھونے میں صرف ہوئے"

اِس مہیب دیو امیرے کو ہر ہفتے دو چار بار ضرور پیٹا جاتا۔ اور ہر بار زخموں کی مرہم پٹی جاوید ہی کیا کرتا۔ لیکن آج پہلی بار اس کا ذکر مجھ سے کیا۔ امیرا قید خانے کا بپھرا شیر تھا۔ مہیب درندہ۔ بیسیوں سپاہی اس کے ہاتھوں دوسری دنیا کو سدھار چکے تھے۔

چودہ سال سے وہ کال کوٹھڑی میں پڑا سڑ رہا تھا ——— زندہ درگور۔ اُسے بستر دیا گیا تھا۔ نہ کمبل نہ روشنی ———————

جب کوئی سپاہی اس کی اندھیری کوٹھڑی کی صفائی کرنا چاہتا تو امیرا بپھرے شیر کی طرح جھپٹتا۔ بیسیوں سپاہی مل کر اسے مارتے۔ نیم بیہوشی میں اسے دبوچ لیتے۔ اس کے ہاتھوں کو بوجھل زنجیروں سے جکڑ کر اسے چھت سے لٹکا دیتے۔ لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ اس کا نام سنتے ہی ہر ایک لرزنے لگتا، کوئی بھی نہ جانتا تھا آئندہ اس کا شکار کون ہوگا۔ وہ مست ہاتھی کی طرح کال کوٹھڑی میں دندناتا پھرتا۔

میں نے اُسے کبھی نہ دیکھا تھا۔ جاوید نے جب اس کا تذکرہ کیا۔ تو میرے دل میں اُسے دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ دوسری شام میں جاوید کے پاس گیا تاکہ امیرے کے اور حالات معلوم کر دں۔ ہم سزا کی کوٹھڑی سے ذرا ہٹ کر کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے، اچانک ایک ہیبتناک چیخ ہماری کو چیرتی ہماری کانوں تک پہنچی۔ ایک خوفناک خرخراہٹ سنائی دی۔ چیخ پر چیخ بلند ہوئی، ایک گھونٹنے کی آواز آئی ——— چیخیں بند ہو گئیں۔ سناٹا چھا گیا۔

جاوید خوف سے لرز رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے میرے کان میں کہا۔ "امیرے نے پھر کسی کی خبر لی ——— ایک اور قتل ...."

دوسری صبح قید خانے میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ کل رات امیرے نے پھر ایک سپاہی کا کام تمام کر ڈالا تھا۔ قید خانے کی مشرقی سمت امیرے کیلئے خاص طور پر پتھروں کا ایک پنجرا سا بنایا گیا تھا۔ آج اُسے وہاں لے جانا تھا۔ مہینوں سے یہ پنجرا بنایا جا رہا تھا۔ گویا کسی جنگلی خونخوار درندے کو اس میں بند کرنا تھا۔ یہ اتنا تنگ بنایا گیا تھا کہ مشکل سے ہی امیرے کے جثے کا آدمی اِس میں سما سکے۔

ہم دفتر میں کام کر رہے تھے۔ جیسے ہی سنا کہ امیرے کو کوٹھڑی سے باہر نکالا جا رہا ہے۔ میں دوڑا دوڑا برآمدے میں آیا۔ کال کوٹھڑی کے باہر جیل کے سپاہیوں کی ایک جمعیت خوفزدہ کھڑی تھی۔ سبھی سپاہی سہمے سہمے کوٹھڑی کے دروازے کو تک رہے تھے۔

دروازہ کھلا۔ ایک خوفناک منظر نظر آیا۔ میں نے قید خانے کے مہیب دیو کو پہلی بار دیکھا۔ وہ حقیقت میں دیو تھا۔ قوی ہیکل، مضبوط جسم۔ کشادہ سینہ۔ کندھے آگے کو جھکے ہوئے۔ قد اتنا بلند کہ ہزاروں میں پہچانا جائے۔ چہرے سے وحشت ظاہر ہو رہی تھی۔ سوائے تھوڑے سے حصے کے سب بال سلامت تھے۔ آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا۔

سپاہی ہاتھوں میں لمبی لمبی برچھیاں لئے دورویہ کھڑے تھے۔ تاکہ امیرا ادھر ادھر بھاگ نہ سکتا تھا۔ اُسے برچھی کی انی سے ہانکا جا رہا تھا۔ برچھیوں کی نوکیں اس کے گوشت پوست میں چبھوئی جا رہی تھیں۔ اس کی ہڈیوں میں بھی سوراخ پڑ چکے تھے۔

اس کے پاؤں میں ایک بوجھل بیڑی تھی۔ پاؤں سو سو من کے ہو رہے تھے۔ لیکن وہ مجبور تھا کہ قدم اٹھائے۔ باوجود شدت کرب کے وہ گردن جھکائے خاموشی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ آخر یہ ہولناک جلوس پنجرے کے قریب آیا۔ امیرے کو اندر بند کر دیا گیا۔ اور باہر ایک تختی لٹکا دی گئی۔ "قید خانہ کا عفریت"

"قید خانے کے عفریت" کے ہر طرف چرچے تھے۔ دور دور سے لوگ اُسے دیکھنے آتے۔ مشہور تھا کہ جیل میں ایک خونخوار درندہ بند ہے۔ جس کی شکل انسانوں کی سی ہے۔ جیلر نے امیرے کے دیکھنے کے لئے چار آنہ کا ٹکٹ مقرر کر دیا تھا۔ تماشائیوں کو پنجرے سے ذرا دور کھڑا کیا جاتا۔ اور پنجرے میں جھانک کر دیکھے

ہوئے ذلیل درندے کی طرف اشارہ کیا جاتا۔ جو کبھی انسان تھا۔

ایسے موقعوں پر امیرا بڑا بیچ ہوتا۔ وہ دور ایک کونے میں سرک جاتا اور تماشائی اُسے سامنے لانے کا مطالبہ کرتے۔ ایک روز شہر کے ایک رئیس اُسے دیکھنے آئے۔ آدھ گھنٹہ ٹکٹکی جمائے پنجرے کے دروازے کو دیکھتے رہے لیکن امیرا سامنے نہ آیا۔ سپاہیوں نے بڑے جتن کئے۔ دھمکیاں دیں۔ پتھر مارے لیکن امیرا کونے میں دبکا رہا۔ مہتمم صاحب کو اطلاع دی گئی۔ اور آپ ہانپتے ہوئے تشریف لے آئے۔

"دروازہ کھولو" انھوں نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ کسی کو حکم کی تعمیل کی جرأت نہ ہوئی

"میں کہتا ہوں دروازہ کھولو" وہ چلّائے اور پاس کے سپاہی سے لاٹھی چھین لی۔ ایک سپاہی دروازہ کھول کر الگ کھڑا ہو گیا۔ مہتمم دونوں ہاتھوں میں لاٹھی تھامے پنجرے میں داخل ہوا۔ امیرا موقعہ کا منتظر تھا۔ جھٹ جھپٹا۔ لاٹھی چھین کر اس زور سے مہتمم کے سر پر جڑ دی کہ سارا حاکمانہ نشہ ہرن ہو گیا۔ دو سپاہی جھپٹ کر مہتمم صاحب کو باہر کھینچ لائے۔ اور دروازہ بند کر دیا گیا۔

تماشائی کو اپنے چار آنے وصول ہو گئے تھے۔

مہتمم صاحب کا عفریت کے پنجہ سے صحیح سلامت بچ نکلنا معجزہ سے کم نہ تھا۔ اب پنجرے کے عقب کی دیوار میں ایک کھڑکی بنوا دی گئی۔ جب امیرا تماشائیوں کے سامنے نہ آتا تو اس کھڑکی کے راستہ اُسے طرح طرح کی تکلیفیں دے کر دروازے پر آنے کو مجبور کیا جاتا۔ تین چار مہینے یہی ہوتا رہا۔

جب مہتمم بدل گیا تو نئے مہتمم نے آتے ہی امیرے کی کوٹھڑی کی تختی اتروا کر اس انسانیت سوز مظاہرے کا خاتمہ کر دیا۔

امیرے کے دردناک حالات زندگی کا علم مجھے اس وقت ہوا جب میں پولیٹیکل تعلیم یافتہ قیدی ہونے کے سبب نئے مہتمم جیل کا سیکرٹری مقرر ہوا۔ نیا مہتمم ایک نیک سرشت انسان تھا۔ اُسے معمولی سے معمولی قیدی سے مشورہ قبول کرنے میں عار نہ تھا۔ ایک واقعہ نے امیرے کی ساری زندگی بدل دی۔

ایک شام میں مہتمم کے کھانے کے کمرے سے آرہا تھا۔ جہاں سے میں نے ایک سیب اس غرض سے اٹھا لیا تھا۔ کہ ایک بیمار قیدی کو دوں گا جس کی آنکھیں لوہار خانہ میں کام کرتے کرتے ضائع ہو گئی تھیں۔

امیرے کی کوٹھڑی کے پاس سے گزرا تو دیکھا کہ وہ شکستہ مغموم ادھر ادھر پھر رہا ہے۔ چہرہ اتر گیا ہے۔ آنکھیں اندر دھنس گئی ہیں۔ آج اس کی شکل وصورت سے وحشت نہیں برس رہی تھی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کسی نے ابھی ابھی اس کی روح کو اس سے چھین لیا ہے۔ لمبے لمبے بال اس کے مہیب چہرے کو اوٹ میں لئے تھے۔ مجھ سے آنکھیں چار ہوئیں تو مجھے محسوس ہوا کہ اس کی روح مردہ ہو چکی ہے۔ اس کی مایوس نگاہ نے میرے قدم روک لئے۔ میں کوٹھڑی

کے قریب گیا۔ اور دروازے کی سلاخوں میں سے سیب اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ چلتے چلتے رک گیا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ "امیرا یہ سیب میں تمہارے ہی لئے لایا ہوں"۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں ہٹ کر آڑ کے سایے میں ہو گیا۔ اور اس انتظار میں رہا کہ دیکھوں وہ کیا کرتا ہے۔ ایک منٹ کے بعد وہ قوی ہیکل جانور اپنے ہاتھوں کو ٹیکتا آگے لپکا۔ اور مضبوط پنجہ سے سیب کو پکڑ لیا۔ ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی جھنکار سنائی دی۔ ہتھکڑی اس کی کلائیوں میں جم کر رہ گئی تھی۔ وہ سیب کو اٹھا کر چاروں پنجوں کے بل کوٹھڑی لوٹ گیا۔

اس واقعہ کے بعد ایک خاص کشش مجھے ہر روز قید خانے کے عفریت کے پاس لے جاتی۔ میرے لئے امیرا اب عفریت نہ رہا تھا۔ بلکہ ایسا انسان تھا جسے دوسروں نے ستا ستا کر بری طرح مجروح کر دیا ہو۔ میں اس کی کوٹھڑی کے دروازے سے لگ کر بیٹھ جاتا۔ اور آہستہ سے اُسے پکارتا۔ وہ میری آواز پہچانتا اور ہاتھ پاؤں کے بل سرکتے سرکتے قریب آ جاتا۔ وہ ہمیشہ چاروں پنجوں کے بل چلتا۔ اس واقعہ کے دوسرے دن میں امیرا کو دیکھنے گیا۔

"امیرا تمہیں سیب پسند آیا"۔ اُس نے مجھے اس نظر سے دیکھا۔ گویا اس کے اندرونی خیالات میں جنگ ہو رہی ہے۔ اُس نے جواب نہ دیا لیکن یونہی بیٹھے بیٹھے مجھے تکتا رہا۔ پھر اس نے سر کو زور کا جھٹکا دیا۔ جیسے کوئی بوجھ سرکا رہا ہو۔ اور اسی طرح واپس کونے میں لوٹ گیا۔

میں نے سوچا کہ اپنے قیدی دوست جاوید سے امیرے کے حالات معلوم کروں۔ جاوید ہسپتال میں کام کیا کرتا تھا۔ جب بھی امیرے کو زدوکوب کیا جاتا اس کے زخموں کی مرہم پٹی جاوید کے ہاتھوں ہوتی۔ جاوید کو اس کے زخموں سے خون رستا دیکھ کر روحانی صدمہ ہوتا۔ اور کئی کئی دن اس صدمے کی یاد تازہ رہتی۔

"دوست یہ تذکرہ نہ چھیڑو۔ یہ جگہ دوزخ سے کم نہیں۔ میں رات کو اپنا روزنامچہ لکھا کرتا ہوں"۔ جاوید ملک کا نوجوان اور نامور ادیب تھا۔ "ایک بدنصیب انسان کی دردبھری چیخیں میرے کانوں میں پڑتی ہیں۔ سانس رک جاتا ہے۔ یہ چیخیں میرے الفاظ میں سما جاتی ہیں۔ پھر میں لکھ نہیں سکتا۔"

"لیکن تم نے امیرے کو بارہا دیکھا ہے۔ کیا وہ واقعی عفریت ہے۔"

"دوست امیرا کو پاگل خانہ میں ہونا چاہئے۔ قید خانہ میں نہیں ——— اس کے سر پر ایک بوجھ سا معلوم ہوتا ہے۔ اُسے ذہنی تکلیف ہے۔"

جاوید کی رائے سے میری تسلی ہو گئی۔ میں ہر رات امیرے کے پاس جاتا۔ بسکٹ۔ گوشت اور خوردنی اشیاء ساتھ لے جاتا۔ چند دنوں میں مجھے معلوم ہو گیا کہ امیرا میری ملاقاتوں کی قدر کرتا ہے۔ میں ہر بار اُسے اپنے انتظار میں پاتا۔

یہ وحشی انسان جس سے اوروں کو خوف آتا تھا۔ دروازے کی سلاخوں سے لگ کر ہر روز میری راہ دیکھتا رہتا۔ وہ بسکٹ میرے ہاتھوں سے لیتا اور میرے سامنے بیٹھ کر کھاجاتا۔ چودہ سال تک اس صحرائی عفریت کو کھاتے نہ دیکھا تھا۔ اس کا کھانا دروازے میں سے پھینک دیا جاتا تھا۔ وہ دن کو اُسے ہاتھ نہ لگاتا۔ رات کو وہاں سے اُٹھا کاں کوٹھڑی میں لیجاتا۔

ہماری آپس کی بات چیت جیل اور اس کے مصائب کے متعلق ہوتی۔ میں باتوں باتوں میں اس کی زندگی کے حالات معلوم کرتا۔ وہ تین چار الفاظ ہی بمشکل بول سکتا۔ اُسے حالات یاد نہ آتے۔ سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر حافظہ پر زور دیتا لیکن بے فائدہ ———

ہمیں معلوم تھا کہ وہ قتل کے جرم میں قید ہے۔ اُس نے دن دھاڑے ایک آدمی کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ لیکن ان حالات کا علم نہ تھا جن سے مجبور ہو کر اس نے اس جرم کا ارتکاب کیا، اور کسی نے یہ معلوم کرنے کی کوشش بھی نہ کی ——— میں نے سوچا کہ اس کے کسی دوست کو خط لکھ کر حالات کی تفصیل معلوم کروں ——— شاید اس طرح اس کی مدد کی جاسکے۔

"میں کیا جانوں ——— میرا سر درد کرتا ہے۔" وہ کرخت آواز میں جواب دیتا۔ "ایک بار میرا سر کھل ہی گیا تھا۔ کوئلہ کی کان میں ——— کوئلوں سے لدا چھکڑا میرے سر سے ٹکرا گیا تھا۔"

کئی کئی راتیں وہ دماغ پر زور دے کر یہی تین چار فقرے بار بار دہراتا۔ وہ یاد کرنے کی کوشش کرتا۔ دل سے چاہتا کہ یاد آجائے لیکن جب کچھ یاد نہ آتا۔ تو اپنے دونوں مضبوط ہاتھوں سے سر کو تھام کر زور کا جھٹکا دیتا، اور مغموم نظروں سے میری طرف دیکھتا۔ ایک دفعہ یوں معلوم ہوا کہ اس کے دماغ میں واقعات کی یاد تازہ ہو رہی ہے۔

ان ملاقاتوں پر دو دو چار چار ساعت نوجمع کرنا میرا مشغلہ ہو گیا ایک رات میں ان واقعات پر غور کر رہا تھا کہ ایک سپاہی مجھے پکارتے پکارتے میرے سر پر آپہنچا۔ اور کہا کہ ہتمم جیل آپ کو بلا رہے ہیں۔

مہتمم صاحب مجھے دیکھتے ہی چلائے "یہ ہر شام اتنی دیر تم کہاں غائب رہتے ہو" میں نے موقع غنیمت جانا اور سبب اور امیرے کا واقعہ اُن کے گوش گزار کر دیا۔ "امیرا بیچارہ مصیبت کا مارا ہے۔ اس کا دماغ ماؤف ہے۔ ایک دفعہ اس کے سر پر سخت چوٹ آئی تھی۔"

"اگر اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ تو وہ ننھے بچے کی طرح بے آزار بن سکتا ہے۔"

مہتمم صاحب نے مجھے اس نظر سے دیکھا گویا میرا دماغ بھی چل نکلا ہے میں نے کہا "یہ حقیقت ہے۔ وہ میرے ہاتھوں سے چیزیں لے کر کھایا کرتا ہے۔"

انھوں نے کہا "اگر یہ صحیح ہے تو میں اُسے پنجرے سے باہر نکال دوں گا"

دوسری صبح ہم پنجرے کی طرف گئے۔ مہتمم نے دروازہ کھولنے کا حکم دیا میں دیکھ رہا تھا کہ امیرا ایک کونے میں دبکا بیٹھا ہے۔ سپاہی خوف سے ڈر رہا تھا۔ مہتمم نے اس کے ہاتھوں سے چابی لی۔ دروازہ کھول اندر داخل ہوئے۔ وہ خود بھی اگر حلیق گاڑی کے سامنے گر اوندھے تو موت اتنی یقینی نہ ہوتی جتنی اب تھی۔ امیرے نے سر اٹھایا۔ جھجکا اور اچانک چیتے کی طرح مہتمم کی طرف لپکا

"امیرے" میں چلایا۔ میری پکار سے وہ یوں ٹھٹھر گیا۔ گویا برقی رَو نے اس کے پاؤں جکڑ لئے ہیں۔ قید خانے کے مہیب دیو کے اُٹھے ہوئے ہاتھ وہیں کے وہیں رہ گئے۔ وہ پیٹ کے بل کہنیاں ٹیکتا ہوا مجھ تک آیا۔

میں نے اس کے کان میں کہا "امیرے یہ حرکتیں اچھی نہیں۔"

مہتمم خوف سے نیم مردہ ہو چکا تھا۔ وہ اب سنبھلا اور ہم تاریک کوٹھری کے کونے کی طرف بڑھے۔ سخت بو آرہی تھی۔ مہتمم صاحب نے شفقت کے لہجہ میں امیرے سے کہا "امیرے باہر آؤ" میں نے بھی اُسے ایسا کرنے کا اشارہ کیا۔

"امیرے اگر میں تمھیں کوئی اچھا کام کرنے کو دوں تو تم دل سے کرو گے؟"

چودہ سال کے عرصہ میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ امیرے نے جیل کے کسی افسر سے ایسے نرم الفاظ سُنے۔ اس نے میری طرف اس نظر سے دیکھا گویا اُسے مہتمم پر اعتبار نہیں۔ اور مہتمم نے جیل سے پرے ٹہلنا شروع کر دیا

"امیرے یہ افسر تم سے بہت اچھا سلوک کریں گے۔"

امیرا اگر چاہتا تو ایک چھلانگ میں مجھے آدبوچتا۔ لیکن خدا جانے وہ کیا سوچ کر چپ ہو رہا۔ مجھے پھر دیکھا اور بڑھ کر میرے ساتھ ہو لیا۔ جیل کے اہلکار مجھے حیرت سے تک رہے تھے۔

ہم لوگوں نے سیدھا ہسپتال کا رُخ کیا۔ جہاں مہتمم کے حکم سے امیرے کیلئے نہایت اچھا کھانا تیار کیا گیا۔ تین ہفتے گزرنے پر جیل والوں نے دیکھا کہ اُن سے وہ دیو ہیکل جیسے وہ امیرا کہا کرتے تھے۔ نہایت نرمی اور خوش اخلاقی سے بات چیت کر رہا ہے۔ طبی معائنہ پر معلوم ہوا کہ امیرے کے دماغ پر ایک ہڈی زور ڈالے تھی۔ جو کبھی سر پر چوٹ آنے کی وجہ سے سر میں دھنس گئی تھی۔ یہی اس کے مجنونانہ غصہ اور قاتلانہ حملوں کی وجہ تھی اس پر عمل جراحی کیا گیا۔ اس کا دماغ اچھا ہو گیا۔ اس کو گزشتہ واقعات یاد آگئے اور امیرے نے اپنی دردناک داستانِ زندگی بیان کی۔

وہ لوہے کے ایک کارخانہ میں لوہا پگھلانے کا کام کرتا تھا بڑا جان جوکھوں کا کام تھا۔ صرف اسی کے سے تن و توش کا انسان ایسا کام کرکے

ہی سکتا تھا ـــــــ

کارخانہ میں ہڑتال ہوئی۔ امیر اپنی بیوی کے پاس گاؤں کو لوٹا۔ اس کی شادی کو ابھی ایک ہی سال ہوا تھا۔ کچھ پکی پکی پونجی کام آئی۔ امیر کو کہیں کام نہ ملا۔ ایک روز امیر نے بیوی سے کہا۔ "میں کان میں جاکر کام کروں گا۔ کام مل گیا تو واپس آکر تمھیں ساتھ لے چلوں گا۔"

وہ اس کے ساتھ ساتھ کچھ راستہ آئی۔ اور اُسے رخصت کیا۔ امیر نے زندگی میں پھر بیوی کا منہ نہ دیکھا۔ یہ اُن کی آخری ملاقات تھی۔ امیر کو گاؤں سے بہت دور لوہے کی ایک کان میں کام مل گیا۔ ایک دن وہ کان کی پٹڑی پر کام کر رہا تھا۔ جگہ ڈھلوان تھی۔ کچھ چھکڑے کان میں لوہا بھرنے کو لیجانے لگے تھے۔ ایک چھکڑا علیحدہ ہوکر ڈھلوان کے رُخ تیزی سے واپس دوڑنے لگا۔

جہاں امیر کام کر رہا تھا۔ اس سے ذرا نیچے کو ایک موڑ تھا۔ موڑ کے اُس طرف بیس آدمی بیکار پٹڑی پر کام کر رہے تھے۔ امیر نے چھکڑے کو دیکھا، اور سوچا کہ اگر اسے روکا نہ گیا، تو بیس آدمی اجل کی نذر ہو جائیں گے۔

اُن کے بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی۔ سوائے اس کے کہ امیر اپنی جان پر کھیل جائے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ چھکڑے کے استقبال میں ڈٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک زور کی ٹکر ہوئی۔ چھکڑا ان سے ایک طرف کو اُلٹ گیا اور ساتھ ہی امیر بھی۔ بیس آدمیوں کی جان بچ گئی۔ امیر کے جسم پر کئی شدید چوٹیں آئیں۔ اس کا سر تو بیچارا کھل گیا۔ اسی بیہوشی کی حالت میں اُسے ہسپتال پہونچایا گیا۔

بغیر سوچے سمجھے امیر اپنے بیس انسانوں کی جان بچانے کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈال لی تھی۔ یہ حسن اتفاق تھا کہ وہ بچ نکلا۔ مرجاتا تو اس کی یادگار قائم کیجاتی اور زریں الفاظ میں اس کے کارنامے کا ذکر کیا جاتا ـــــ وہ بچ نکلا مگر اس کے کارنامے سے اُسے عزت نصیب نہ ہوئی۔ ـــ بلکہ اس کی انسانیت کی سی قیمتی چیز چھین لی گئی۔ اور وہ قید خانہ کا "عفریت" بن گیا۔

اس حادثہ کے دو مہینوں ہسپتال میں زیر علاج رہا۔ اور آخر اچھا ہوکر نکلا لوہے کے کارخانہ میں ہڑتال ختم ہو چکی تھی۔ امیر گاؤں کو لوٹا۔ اس کے گھر کو ایک پگڈنڈی جاتی تھی۔ وہ جلدی جلدی قدم بڑھاتا اس پر ہولیا تاکہ اس کی اچانک آمد سے اس کی بیوی کو خوشی اور حیرت ہو۔

کھڑکی پر سنہ پردے پڑے تھے۔ ایک اجنبی صورت باہر کو جھانکی۔

"کون ہو تم" عورت نے پوچھا۔

امیر جہاں تھا وہیں رک گیا۔ اور پوچھا "یہاں کون رہتا ہے"؟۔

"تمھیں اس سے واسطہ"

"یہ میرا مکان تھا۔ میری بیوی اس میں رہتی تھی۔ میری بیوی کہاں ہے؟"

"میں کیا جانوں۔ اُسے یہاں سے نکلوا دیا گیا تھا۔ تم ہی اس کے خاوند ہو۔ وہ رہا تمھارا کچھ سامان۔ اگر لیجانا چاہو تو لے جاؤ۔"

کمرے کے ایک کونے میں ٹوٹا پھوٹا سامان ڈھیر کیا گیا تھا۔ امیر کی یہ حالت تھی کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ وہ ہانپتا کانپتا سکتے دروازے کی طرف بڑھا۔

"چلے جاؤ خبردار اندر نہ آنا۔ ورنہ ابھی شور مچاکر پکڑوا دونگی" عورت اُسے دیکھتے ہی چلائی۔

"دروازہ کھولئے" امیر نے جواب دیا۔ "میں اندر نہیں آؤنگا ذرا دروازہ کھولئے۔ میری بیوی ـــــ آپ نے دیکھا وہ کب گئی کیا وہ زندہ ہے ـــــ بس اتنا بتا دیجئے ـــــ وہ کب گئی ـــــ ـــــ کہاں ہوگی؟"

عورت کو اس کی حالت پر ترس آیا۔ "گھبرایئے نہیں بتاتی ہوں وہ زندہ گئی لیکن مرنے سے بدتر ـــــ کیا جانوں کہاں گئی۔ شاید اب تک مر گئی ہو۔"

"بچہ ـــــ کیا بچہ بھی مر گیا؟"

"میں یہ نہیں جانتی۔ وہ جب گئی تو بچہ ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ مجھے آپ سے بڑی ہمدردی ہے۔ لیکن میں کیا جانوں وہ کہاں گئی ---- ـــــ مالک مکان سے پوچھئے۔ اُسے معلوم ہوگا۔ وہ وہیں، پچھے پرانے مکان میں رہتا ہے۔"

عورت ابھی کہنے نہ پائی تھی کہ امیر پلٹا۔ اور گلیوں میں دیوانوں کی طرح دوڑتا ہوا مالک مکان کے گھر پہنچا۔ "میری بیوی کہاں ہے ـــــ ـــــ میری بیوی جس کو تم نے گھر سے نکال دیا۔"

غصہ میں الفاظ اس کے منہ سے آگ کے شعلوں کی طرح نکل رہے تھے۔ مالک مکان نے حقارت کی نظر سے دیکھا اور گرج کر کہا "تمھیں اندر کس نے آنے دیا ـــــ نکل جاؤ۔ چلے جاؤ۔"

اس تحکمانہ لہجہ سے امیر سنبھلا۔ آگے کو جھکا۔ مالک مکان کے قدموں کو آہستہ سے چھوتے ہوئے کہا "معاف کیجئے گا۔ میرے حواس ٹھکانے نہ تھے۔ میں یہاں نہ تھا۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔ بیمار تھا۔ آج ہی لوٹا ہوں میری بیوی کا پتہ نہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں وہ کہاں ہوگی۔ لوگ کہتے ہیں آپ نے اُسے نکال دیا۔"

"اچھا وہ تمھاری بیوی تھی۔ خوب۔ خوب۔ ہاں میں نے اُسے گھر سے نکال دیا۔ اس نے کرایہ نہیں دیا تھا۔ بڑی بدمزاج تھی۔ میں نے اُسے بمشکل گھر سے نکالا۔"

"وہ کہاں ہے" امیر کی سانس پھول گئی۔ فرطِ غم سے کلیجہ منہ کو آرہا تھا۔ "وہ آخر گئی کہاں"؟۔

"نکل جاؤ یہاں سے۔ مجھے اس سے کیا غرض کہاں دفع ہوئی۔ تم اُسے چھوڑ کے کہاں چلے گئے تھے۔۔؟"

"اچھا تو اُسے تم ہی نے نکالا۔ خیر گئی کہاں۔۔؟"

"جہنم میں جہاں ایسی عورتوں کو جانا چاہیئے ——— فاحشہ کہیں کی ——"

امیرے کو اس سے زیادہ سننے کی تاب نہ تھی۔ بپھرے ہوئے شیر کی طرح جھپٹا۔ "کیا کہا ——— میری بیوی فاحشہ۔ میری بیوی ——— میری بیوی ——— بدمعاش ——— کمینے ——— پھر کہو ——— اب کہو ——— ذلیل کتے ———"

اس کی گردن امیرے کے آہنی پنجوں میں تھی۔ ایک جھٹکے میں اس کا کام تمام تھا ——— تین افسروں نے بمشکل امیرے کی گرفت کو ڈھیلا کر کے مردہ لاش کو اس سے چھڑایا۔

امیرے کے منہ سے کف جاری تھا۔ اسے اتنا پیٹا گیا کہ وہ بیہوش ہو گیا اور اُسے اسی حالت میں تھانے پہنچایا گیا۔ اس کے حواس جاتے رہے۔ اُسے عمر کی قید کا حکم سنایا گیا۔ اس کی طرف سے کوئی وکیل نہ تھا۔

یہ تھی وہ داستان، جو امیرے نے مہتمم صاحب کو عمل جراحی کے بعد ہوش میں آتے ہی سنائی۔ اب نہ وہ پہلا سا خونخوار درندہ نہ تھا۔ بلکہ صاف ستھرا لباس پہنے معزز سن رسیدہ بزرگوں کی طرح وہ زندگی کی داستانیں سنایا کرتا تھا۔

مہتمم جیل نے پھانسی کی کوٹھڑی کی صفائی اس کے سپرد کی۔ وہ پھانسی پانے والوں کو کھانا پہنچایا کرتا ——— وہ بدنصیب انسان جو زندگی کی گھڑیاں گن رہے ہوتے ——— امیرے کی تسلی آمیز باتیں غور سے سنتے ——— اور کبھی کبھی وہ ان بدنصیبوں کی حالت پر آبدیدہ ہو جاتا۔ میں امیرے سے اکثر وہاں جا کے ملا کرتا وہ خوش تھا اور زندگی سے مطمئن ——— کسی نے اُسے دو ننھی ننھی چڑیاں لا کے دی تھیں۔ مہتمم نے اُسے ان کے پالنے کی اجازت دیدی تھی۔ پھانسی کی کوٹھڑی میں ان ننھی چڑیوں کا چہکنا عجیب منظر پیدا کرتا تھا۔

اس سفید ریش، قوی ہیکل انسان کا یہ منظر آنکھوں کو بہت بھلا معلوم ہوتا تھا کہ کوٹھڑی کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ہے۔ شانے پر رنگیلے پروں کی چڑیاں پھدک پھدک کر سریلے سروں میں چہک رہی ہیں۔ ابھی شانوں پر تھیں اب بازو اور ہاتھوں پر آگئی ہیں ——— کھڑکی میں سے سورج کی شعاعیں چھن چھن کر آ رہی ہیں، اور اس کے متبسم چہرے کو روشن کر رہی ہیں۔

ایک دن مہتمم جیل جلدی جلدی دفتر میں آئے۔ ان کی آواز میں روحانی مسرت کی جھلک تھی۔ "میں نے ایک بات معلوم کی ہے۔ امیرے کو بلوا بھیجو ——— جلدی"

"بیٹھ جاؤ امیرا ——— آرام سے سنو" انھیں خود پر ضبط نہ تھا "میں آج شہر گیا تھا۔ عجیب اتفاقات دو چار ہوا ——— امیرے تم نے اپنی آپ بیتی بالکل صحیح سنائی"

"جی ہاں جناب" امیرا نے جھجکتے ہوئے جواب دیا: "اس کا ایک ایک لفظ درست تھا۔ یقین رکھئے میں نے خواب نہیں دیکھا"

"لیکن دوسرا سنو۔ تمہاری بیوی تھی نا ——— ہاں ——— وہ مرگئی ——— اسی دن جس دن اُسے مکان سے نکالا گیا۔ بچی زندہ ہے۔ آج بھی زندہ ہے۔ میں اسے دیکھ کے آرہا ہوں۔ بڑی پیاری بچی ہے۔ اُسے اس شہر کے ایک امیر گھرانے نے پالا ہے۔ وہ ہمارے جیل کے سپرنٹنڈنٹ کے دوست ہیں۔ میں نے ان سے تمہارے متعلق بات چیت کی ——— جس عورت نے تمہاری بچی کو پالا ہے۔ وہ تمہاری بیوی کی رشتہ دار ہیں ——— وہ تمھیں ایک زندہ شخصیت خیال کرتی ہیں۔ میں نے ان سے سب واقعات کہدیئے۔

"امیرا تمھاری سزا معاف کر دی گئی ہے۔ جاؤ فیکٹری میں سے کپڑے نکال لو۔ کل صبح تم رہا کر دیئے جاؤ گے"

امیرا حیرت، استعجاب اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے ماتحت آگے بڑھا۔ اور مہتمم کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا "کیا بچی کو اس کا علم ہے"

"نہیں۔ انھوں نے بچی کو نہیں بتایا۔ بچی کو بتانا بھی نہ چاہیئے"

دوسری صبح امیرا نئے کپڑے پہنے دفتر میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر روحانی مسرت کے آثار چھائے تھے۔ اس نے مجھے مخاطب ہو کر کہا "دوست! یہ سب کچھ تم نے کیا۔ ذرا سوچو ایک سبب تم نے میری زندگی بدل دی" وہ ایک لمحہ کیلئے خاموش ہو گیا "وہ مجھے پہچان نہیں سکیگی۔ اور میں بھی چاہتا ہوں کہ اُسے خبر نہ ہو کہ اس کا باپ قید خانہ کا عفونت زدہ تھا"

جب مہتمم جیل نے معافی نامہ اور پانچ روپے کا نوٹ اس کے ہاتھوں میں دیا تو اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ "جناب سمجھ نہیں سکتا کن الفاظ میں آپ کا شکریہ ادا کروں"

"اسکی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہارے باعث میری نیکنامی ہوئی، اور یہی کافی ہے"

امیرے نے چڑیوں کا پنجرہ اٹھایا "میں بچی کو یہ تحفہ دوں گا۔ میں اُسے دیکھنا چاہتا ہوں ——— دیکھ کر رہونگا" اس نے مہتمم اور مجھ سے ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گیا۔

ایک ہفتہ گزر گیا ہمیں امیرے کی کوئی خبر معلوم نہ ہوئی۔ مہتمم پریشان ہوا۔ "تعجب ہے۔ بوڑھے امیرے پر کوئی اور مصیبت نہ ٹوٹی ہو۔ چھیالیس برس ——— یہی عمر تھی نا ——— اٹھارہ سال کی قید نے اُسے کھوکھلا کر ڈالا اسکی طاقت کو۔ وہ ساٹھ سال کا معلوم ہو رہا تھا ——— خدا جانے بچی کو دیکھا یا نہ ——— ہمیں خبر نہ ہوئی"

مہتمم کو اور زیادہ اس کی فکر ہوئی۔ لڑکی کی پرورش کرنیوالی کو پیغام بھیجا۔ امیرے اور اس کی چڑیوں کے متعلق جواب میں لڑکی بنفسِ نفیس آ پہنچی۔

"بوڑھا آدمی۔" کیا کہا۔ "وہ میرا باپ تھا۔ آہ مجھے پہلے سے اس کی خبر کیوں نہ دی گئی۔ انھوں نے مجھ سے کیوں چھپائے رکھا۔ وہ چلا گیا تب بھی نہ بتایا ——— اس نے مجھے ننھی بچی کہہ کر پکارا تھا۔ آہ۔ اب کیا کیا جائے!"

ٹوٹے پھوٹے فقروں میں اس نے بوڑھے کی ملاقات کا ذکر کیا۔ وہ گھر کے دروازے پر آیا تھا۔ چڑیاں پنجرے میں چہک رہی تھیں۔ شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ میں اسکی بچی ہوں۔ وہ اس کی امارت اور معصوم حسن کو دیکھ کر خاموش ہو رہا۔ یہ معزز بوڑھا انسان اپنی بدنصیب زندگی کے واقعات سے اپنی بچی کی مسرتوں کو برباد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بن کہے رخصت ہو گیا۔

لڑکی بیٹھی حساب اتار رہی تھی۔ جب گھنٹی کی آواز آئی۔ نوکر بوڑھے کو اندر نہ آنے دیتا تھا۔ اتنے میں لڑکی خود آ پہنچی۔ اور بوڑھے کو اندر لیجا کر بٹھایا گیا۔

"بیٹی میں حساب کر رہا تھا۔ شاید تم یہ چڑیاں خرید لو۔ یہ بڑا اچھا چہکتی ہیں میں بہت غریب بوڑھا ہوں۔ میں نے خود انھیں پالا ہے۔"

لڑکی نے صرف رحم کھا کر پرندوں کو بڑے سستے خرید لیا ——— صرف ایک روپیہ میں ——— وہ سمجھ نہ سکتی تھی کہ بوڑھا اسے کیوں دیکھے جا رہا ہے اور اس کی آنکھوں سے سیلاب اشک کیوں جاری ہے۔

"خدا حافظ بیٹی! تم بالکل اپنی ماں کی شکل و صورت کی ہو۔" جاتی دفعہ اس نے کہا۔ چوکھٹ پر ہچکچا کر رکا۔ جیسے کچھ اور کہنا چاہتا تھا اس نے لڑکی کو مغموم نظروں سے دیکھا۔ اور چپ چاپ رخصت ہو گیا۔

لڑکی بیحد غمگین ہو رہی تھی: "ہم اُسے کہاں ڈھونڈیں۔ کہاں تلاش کریں۔ پہلے کسی نے مجھ سے یہ نہ کہا۔"؟

باہر برف باری ہو رہی تھی۔ ایک ہفتہ سے طوفان باد و باراں نہ تھمتا تھا۔ امیرے کی لڑکی اور مہتمم جیل نے شہر کی گلیوں اور گرد و نواح کا چپہ چپہ چھان ڈالا۔ مگر پتہ نہ چلا۔

ایک رات جیل کا بڑا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ اور آہستہ سے کہا گیا "دروازہ کھولئے مجھے اندر آنے دیجئے" سنتری نے کھڑکی سے دیکھا۔ امیرا کے کپڑے بارش اور کیچڑ سے لت پت ہو رہے تھے۔ اور وہ دروازہ کو دونوں ہاتھ سے تھامے برف میں دوزانو ہو رہا تھا۔

"دروازہ کھولئے میرا اور کہیں ٹھکانا نہیں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا تمھیں معافی مل چکی ہے۔ تم دوبارہ واپس نہیں لئے جا سکتے۔ یہ قانون کے خلاف ہے۔" جمعدار نے جواب دیا۔ مہتمم کو اطلاع کی گئی۔

اس نے پوچھا "کون اس وقت آیا ہے؟"

"امیرا" جواب ملا

وہ بھاگا بھاگا دروازہ پر پہنچا۔ دروازہ کھولا گیا۔ امیرا موجود نہ تھا۔ مہتمم ہر ایک پر غصے ہو رہا تھا "گدھو! تمھیں اس کی خبر نہیں ہم ایک ہفتہ سے اس کی تلاش کر رہے ہیں۔" وہ مشعل لئے جیل کی چار دیواری کے باہر تلاش کرنے لگا۔ اور آخر کچھ دیر بعد امیرا کو تھامے واپس آیا۔ امیرا سردی سے شل ہو چکا تھا۔ مہتمم نے اُسے تو وہ برف کے نیچے دبا پڑا تھا۔ بدن کے کچھ حصہ کو ابھی برف ڈھانپ نہ سکی تھی۔ اُسے شدت کا بخار تھا۔ اور اس کے چہرہ پر ابھی سے مُردنی چھا رہی تھی۔

مہتمم نے امیرے کی لڑکی کو بُلا بھیجا۔

نوخیز معصوم لڑکی آتے ہی باپ سے لپٹ گئی: "ابا جان۔ ابا جان۔ آپنے مجھے پہلے سے کیوں نہ بتایا۔ ابا میں آپ کی بیٹی ہوں۔ میری طرف دیکھئے ——— آہ آپ کیا جانیں میں نے کتنی بار آپکے ملنے کی دعائیں مانگی ہیں۔ ——— آپ نے مجھے تب کیوں نہ بتایا ——— آہ"

امیرے نے شدت درد و کرب سے دھندلی نگاہ اس کے معصوم چہرے پر ڈالی۔۔ لڑکی کے نرم و نازک ہاتھوں کو اپنے بھاری بھاری ہاتھوں سے تھامتے ہوئے کہا "بیٹی میں نے کہاں کہاں تمھیں ڈھونڈا۔ اچھا ہوا جو تم آ گئیں۔ یہ میری آخری آرزو تھی۔"

قید خانے کے عفریت کا سر آپ سے آپ تکیہ پر جا رہا۔ اُس کے ہونٹوں پر روحانی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ بہادر بوڑھا اپنی آخری منزل پر پہنچ چکا تھا۔

حکیم آزاد انصاری

آیاتِ دانش

ہر حال میں ناشاد سے دلشاد اچھا
ہر طرح گرفتار سے آزاد اچھا
جس دین میں افکار تک آزاد نہ ہوں
اُس دین سے سو مرتبہ الحاد اچھا

اجسام کی محسوس نظر شکلیں ہیں
ارواح کی محجوب بصر شکلیں ہیں
وہ مادے کے کثیف تر پیکر ہیں
اور یہ اُس کی لطیف تر شکلیں ہیں

مقصودِ بقا کیا ہے یہ کس سے کہئے
مفہومِ فنا کیا ہے یہ کس سے کہئے
ہم واقف اصل دوسرا تو ہیں مگر
اصل دوسرا کیا ہے یہ کس سے کہئے

رازِ تخلیق کیا ہے کس سے کہئے
اپنی تحقیق کیا ہے کس سے کہئے
ہم کو معلوم کیا ہے کس کو سمجھائیں
ہم کو تصدیق کیا ہے کس سے کہئے

ہم رازِ جہاں سے بیش و کم واقف ہیں
واقف ہیں اور مغتنم واقف ہیں
اس اہلِ وقوف سے تہی دنیا میں
اتنا بھی بہت ہے جتنے ہم واقف ہیں

میں رازِ جہاں سے کچھ نہ کچھ واقف ہوں
پیدا و نہاں سے کچھ نہ کچھ واقف ہوں
گو نابلدِ زبانِ قدرت ہوں مگر
اندازِ بیاں سے کچھ نہ کچھ واقف ہوں

حسرت تھی کہ رازِ دہر کھل کر سمجھائیں
جس طرح سمجھ سکے ہیں یکسر سمجھائیں
لیکن کوئی سمجھنے والا ہی نہیں
کس کو سمجھائیں اور کیونکر سمجھائیں

جو شے ہے وہ انتخاب ہے اپنی جگہ
جو چیز ہے لاجواب ہے اپنی جگہ
ہر ذرہ بے حقیقت اس عالم میں
غیرت دہِ آفتاب ہے اپنی جگہ

ذہن اتنے رسا نہ فہم اتنی چالاک
سمجھیں تو رموزِ دہر سمجھیں کیا خاک
دانش بخشی گئی تو ناقص دانش
ادراک عطا ہوا تو محدود ادراک

تعبیر

حیات ملک

بزمِ داستاں گویاں کے آج کے اجلاس کا پروگرام آپ بیتیاں سنانے کا تھا۔ راشد صاحب نے اپنی کالج لائف کا ایک واقعہ ختم کرتے ہوئے کہا: "یہ ہے میری پہلی اور آخری شکست کی داستان جسے میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔"

اس پر صدیقی صاحب نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا "آپ کی سکیم تو ہر لحاظ سے مکمل معلوم ہوتی تھی لیکن زندگی میں بعض واقعات ایسے بھی پیش آجاتے ہیں کہ تقدیر کو ماننا ہی پڑتا ہے، اور بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بظاہر انسان سمجھتا ہے کہ اسے شکست ہوئی لیکن درحقیقت اسی شکست میں اسکی کامیابی کا راز پنہاں ہوتا ہے۔"

"بیشک" میری زبان سے کچھ اس انداز سے نکلا ۔ جیسے ایسا ہی کوئی واقعہ مجھے پیش آچکا ہو۔ اس لئے سب دوستوں کی استفسار انگیز نظریں مجھ پر جم کر رہ گئیں۔

"چند سال ہوئے" میں نے کچھ دیر سوچ کر کہنا شروع کیا "جس دن میری شادی ہوئی۔ اسی شام کو میں تمام دن کے تھکے ماندہ دوستوں اور مہمانوں کو شب بخیر کہکر اپنے کمرہ کو چلا۔ اس وقت مختلف قسم کے امید افزا خیالات نہایت تیزی سے ایک ایک کرکے میرے دماغ میں آرہے تھے۔ کون نہیں چاہتا کہ اپنی نئی رفیقہ حیات کو شروع ہی میں اپنے مزاج و طبیعت کا بہتر سے بہتر نمونہ پیش کرکے متاثر کرے، غرض جب زینہ طے کرکے میں نے دوسری منزل پر قدم رکھا۔ تو خلاف معمول آج کمرہ زیادہ روشن پایا۔ کمرہ میں داخل ہوا تمام کمرہ مہک رہا تھا۔ میز پر گلدستے لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف پلنگ پر دلہن کمبل لپیٹے سامنے دیوار پر لگی ہوئی تصاویر کو دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے جھٹ کمبل میں منہ چھپالیا۔ میں میز کے نزدیک لگی ہوئی آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور کمرے کے سامان کا جائزہ لینے لگا۔ ہر ایک چیز نہایت صاف ستھری اور قرینہ سے رکھی تھی۔ کھونٹیوں، پردوں اور الماریوں پر ذرہ بھر گرد بھی نظر نہیں آتی تھی۔ فرش پر ردی کاغذوں کے انبار پڑے رہتے تھے آج ناپید تھے۔ میز پر ایک طرف تازہ اخبار اور میری چند کتابیں اور دوسری طرف کوئی چیز ڈھانپ کر رکھی تھی۔ میں نے کپڑا اٹھا کر دیکھا۔ تو تھال انگریزی اور دیسی مٹھائیوں سے لبریز تھا۔ دل ہی دل میں مسکرایا اور خیال کیا کہ یہ شرارت سوائے بھابی صادقہ کے اور کسی کی نہیں ہوسکتی۔ میں نے پلنگ کی طرف دیکھا لیکن وہ ہی سکڑی، گٹھڑی سی بنی منہ چھپائے پڑی تھی۔ تھال میں نے ویسے کا ویسا ڈھانپ کر رکھ دیا۔ اور اخبار اٹھالیا۔ پہلے ہی صفحہ پر جلی حروف میں یہ سرخی دیکھی۔ ۔

"کوئٹہ میں قیامت خیز زلزلہ:۔

لاکھوں جانوں اور کروڑوں کا مالی نقصان جتنے ابھی تک محسوس ہے ہیں"

میں دھک سے رہ گیا۔ مفصل حال ایک ایک لفظ کرکے پڑھنے لگا۔ ختم کرنے پر ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے میری زبان سے بے ساختہ نکلا: "اُف، اس قدر تباہی و بربادی!"

چوڑیوں کی جھنکار سے میں نے محسوس کیا۔ کہ وہ کمبل ہٹا کر میرے ان کلمات تاسف کی وجہ معلوم کرنا چاہتی ہے۔ لیکن میں بغیر توجہ کئے سامنے دیوار پر نظر جمائے بیٹھا رہا۔ میری آنکھوں کے سامنے مصیبت زدگانِ زلزلہ کی حالت زار کا نقشہ پھر گیا۔ میں پچھلے بھونچال کے موقعہ پر بہار ریلیف کیمپ میں ایک مہینہ گزار آیا تھا۔ بہار کے زلزلہ کے ہولناک منظر دیکھ چکا تھا۔ یتیم بچوں اور بیوہ عورتوں کے روح سوز نالے۔ زخمیوں کی پُر درد کراہٹ شہر میں بے گور و کفن لاشوں کا تعفن اور باہر کھیتوں میں پسماندگان کی بے سروسامانی، عالیشان اور مضبوط عمارتوں کا سپرد خاک ہونا اور پھر اہل زمین کی اس بربادی پر چاند سورج اور ستاروں کی حسب معمول بے پروائی۔ سب منظر ایک ایک کرکے میری نظر سے گزرنے لگے۔ دنیا کی اس بے ثباتی اور قدرت کی اس بے پروائی پر میں دل ہی دل میں آنسو بہانے لگا۔ نامعلوم میں کب تک یونہی پڑا او گھتا رہتا کہ یکایک میں جیسے چونک سا پڑا کسی دیوار کے دھڑام سے گرنے کی آواز سنائی دی۔ "ہائے مرگیا! اٹھو! باہر نکلو!" کی آوازیں آنے لگیں۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ لڑھکڑایا۔ کواڑ کھڑ کھڑا رہے تھے۔ سامنے دروازے کے اوپر لگی ہوئی جھیل ڈل کے ایک منظر کی رنگین تصویر فرش پر گری اور چکنا چور ہوگئی۔ "بھونچال" میں نے خوفزدہ ہو کر کہا۔ "آصفہ! آصفہ!" میں چلایا "اٹھو جلدی نیچے چلو۔ بھونچال!"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور زینہ کی طرف دوڑا۔ آگے آگے میں پیچھے پیچھے وہ بھی چلی آتی تھی۔ نصف سیڑھیاں ہی طے کی ہونگی۔ کہ زلزلہ کے ایک تازہ جھٹکے سے زینہ کی دیوار پر سے دو ایک اینٹیں میرے ننگے سر پر آلگیں میرے منہ سے ایک چیخ نکلی اور گرا ہی چاہتا تھا۔ کہ نرم ہاتھوں نے سنبھال لیا۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ مجھے مطلق خبر نہیں۔ میں بے ہوش ہوگیا۔ پھر جس

وقت میری آنکھ کھلی۔ میری رگ رگ میں سخت درد محسوس ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر میرے دل کا معائنہ کر رہا تھا۔ ڈاکٹر کے علاوہ اور بھی لوگ کمرے میں موجود تھے۔

"ہائے ..... پانی!" میرے منہ سے نکلا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ مجھے یاد نہیں ..... میں پھر بے ہوش ہو گیا تھا ... نہیں بتا سکتا کہ کتنا عرصہ اسی بے ہوشی کے عالم میں ... مجھے ہوش آئی۔ صبح نمودار ہو چکی تھی۔ درد میں کمی ... ہو آ رہی تھی۔ والدہ چمچہ سے میرے منہ میں دودھ ڈال ... انام میرے سرہانے کھڑا تھا۔

"آج کون سا دن ہے؟" میں نے والدہ سے پوچھا۔

"جمعرات ہے بیٹا! طبیعت اب کیسی ہے؟"

"اب تو آرام ہے۔"

والدہ باہر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد کسی کے کراہنے کی آواز میرے کان تک پہنچی۔ میں نے دائیں طرف دیکھا۔ تو تین قدم کے فاصلے پر ایک چارپائی پر سر پہ پٹی باندھے کوئی پڑا کراہ رہا تھا۔

"یہ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

انام جھٹ بول اُٹھا "چھوٹی بھابی جان ہیں۔"

"آسیہ!" میرے منہ سے نکلا اور ایک برقی رَو میرے جسم میں دوڑ گئی۔ جھٹ اس کی چارپائی تک پہنچا۔ دونوں ہاتھ چارپائی کے بازوؤں پر ٹیک کر جھکتے ہوئے نرمی سے پکارا۔

"آسیہ!"

اس نے آنکھیں کھولیں۔ ایک لمحہ گھورا۔ پھر دونوں ہاتھ میری طرف اُٹھائے اور مسکرا کر بولی:۔

"آپ ہیں۔ اب تو آرام ہے نا؟"

"ہاں آرام ہے لیکن تمہیں یہ چوٹ کیونکر پہنچی؟"

"اس انگیٹھی پر گر کر۔"

"انگیٹھی پر گر کر۔ وہ کیونکر؟"

"جب ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ کہ آپ کا بچنا ... محال ہے ... تو پھر ... میں نے جی کر ... کیا کرنا ..."

ابھی فقرہ ختم بھی نہیں ہوا تھا۔ کہ کوئی مجھے ہلا ہلا کر کہنے لگا۔ "دولہا میاں! اٹھو ابھی تک سوئے ہوئے ہو، دیکھو سورج کتنا چڑھ آیا ہے۔ رات ساری کرسی پہ کیوں پڑے رہے پلنگ پر کیوں نہیں سوئے؟"

میں نے آنکھیں کھولیں تو بھابی صادقہ شانہ ہلا ہلا کر مجھے جگا رہی تھی۔

سورج کی کرنیں دروازے سے اندر آ رہی تھیں۔ برقی قمقمہ اسی طرح جل رہا تھا۔ اخبار نیچے گر پڑا تھا۔ اور آسیہ بھابی کے پیچھے کھڑی میری حالت پر مسکرا رہی تھی جب میں نے اس کی طرف دیکھا۔ تو اس نے منہ چھپا لیا۔

اب بھی جب کبھی یہ واقعہ یاد آتا ہے تو سوچتا ہوں کہ کس قدر عجیب خواب تھا۔

اس پر راشد صاحب نے کہا۔ "ہاں خواب تو بے شک عجیب تھا لیکن لڑکی بہر صورت گزار کر دلہن کی ہمدردی اور اعتبار تو ضرور حاصل کر لیا ہوگا۔ وہ بھی کہتی تو ہوگی کہ عجیب انسان سے پالا ہے۔ جسے کرسی کی بجائے پلنگ پر سونے کی بھی تربیت دینی ہوگی۔"

"آپ کو بھی خلافِ توقع اپنے ارادوں میں خوب ہی شکست ہوئی" دوسرا دوست بولا۔

"انہیں بات تو ختم کر لینے دیں" صدیقی صاحب نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ہاں تو پھر رات کے واقعہ کا ذکر بیوی صاحبہ سے کبھی نہیں ہوا۔"

"یہی تو مجھے سنانا ہے۔ ایک صبح جب کہ میں غسل سے فارغ ہوا ہی تھا۔ کہ خلافِ معمول بجائے خادمہ کے وہ خود چائے لے آئی۔ اس کی اچانک آمد سے میں کچھ گھبرا گیا۔ بڑی مشکل سے رُک رُک کر اس کے سلام کا جواب دیا حیران تھا کہ کیا یہ وُہی دلہن ہے۔ جو شادی کی رات شرم و حیا کی پتلی بنے سکڑی سمٹی اپنے آپ کو کمبل سے چھپائے بیٹھی تھی۔ اور آج اتنی دیدہ دلیری کہ میں اس سے ایک لفظ تک نہیں بلوا سکا۔ اور یہ چائے خود لے کر آ گئی اور پھر اس دھماکے کا السلام علیکم۔ ہو نا ہو ضرور اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ چکی ہے کہ خاوند تو بالکل شرمیلا بچہ ہے اس سے کس بات کا ڈر۔

وہ خاموشی سے میز پر چائے رکھ کر پیالیوں میں ڈالنے لگی۔ جب دونوں پیالیاں تیار ہو گئیں۔ تو میں مقابل کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور اپنی پیالی اٹھا لی۔ چائے پینے کے دوران میں کامل خاموشی طاری رہی۔ چائے ختم کر چکنے پر اس نے ہی مہرِ سکوت کو توڑا:۔

"میں اپنی غلطی کی معافی چاہتی ہوں۔ اس رات شاید آپ بہت تھکے ہوئے تھے۔ کہ اخبار پڑھتے پڑھتے کرسی پر ہی سو گئے۔ جی تو بہت چاہتا تھا۔ کہ آپ کو جگا دوں۔ لیکن نہ جانے آپ کو جگانے کی کیوں جرأت نہ کر سکی۔ یہ میری کمزوری تھی۔ میں اب اسے محسوس کرتی ہوں آپ شاید اس پر بھی خفا ہوں۔ کہ دوسری صبح جب بہن صادقہ نے آپ کو جگایا۔ تو میں کیوں ہنسی۔ لیکن خدا شاہد ہے۔ اس سے آپ کی تضحیک مراد نہ تھی۔ میں خود نہیں سمجھ سکی۔ کہ مجھے اس وقت کیوں ہنسی آئی۔"

تصویر کا یہ دوسرا رُخ دیکھ کر میرے ہوش ٹھکانے ہوئے اور بالکل اس

شخص کی طرح محسوس کرنے لگا۔ جو ایک رات ناگہانی طور پر اپنی زندگی کی ساری کمائی چوروں کے حوالے کر بیٹھتا ہے اور دوسری صبح وہ ایک چیز صبح و شام بہر سے گھر میں موجود پاتا ہو۔ میں اب سمجھا۔ کہ جسے میں ذلیل شکست سمجھتا تھا۔ وہ دراصل ایک نمایاں فتح تھی۔ میں نے بھی اپنی ہچکچاہٹ کو دور کیا اور باتیں کرنی شروع کر دیں۔ آخر باتوں باتوں میں وہ خواب بھی کہہ سنایا۔ خواب سُن کر وہ کچھ دیر خاموش رہی اور پھر بولی:۔

"خواب کے متعلق عموماً ڈاکٹروں کا کیا نظریہ ہے؛ کیا یہی نہیں کہ دماغ میں جو مختلف اوقات پر مختلف خیالات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ وہ بعض مشاہدات کے ساتھ مل کر نیند کی حالت میں اندرونِ دماغ کے کسی حصے میں جو ابھی جاگ رہا ہوتا ہے ایک واقعہ کی صورت میں گشت لگاتے رہیں۔ جس کی یاد بیدار ہونے پر بھی دماغ میں رہ جاتی ہے۔"

"ہاں کہتے تو یونہی ہیں"۔ میں نے کسی قدر متاثر ہو کر کہا۔

"آپ نے اس بات بھوپال کے متعلق اخبار میں پڑھا۔ اور چونکہ میں کمرہ میں آپ کے ساتھ تھی۔ اسلئے خواب میں بھی مجھے ساتھ اٹھا کر لے گئے۔ یہاں تک تو مشاہدات کا تعلق ہے:"

"بالکل ٹھیک!"

"آپ ابھی تک میری فطرت سے ناواقف تھے۔ اس لئے اس خواب میں جو میرے ایثار و محبت کا جذبہ آپ نے دیکھا۔ اس کا آپ نے ابھی تک مشاہدہ نہیں کیا تھا۔ اس لئے وہ آپ کا میرے متعلق تصور ہی ہوگا"

"بالکل بجا" میں نے تعبیر کی داد دیتے ہوئے کہا

پھر کچھ دیر خاموش رہ کر کہنے لگی۔

"آپ انشاء اللہ مجھے اپنے تصورات سے بہتر ہی پائیں گے .....

. . .. سچ پوچھو تو بغیر آپ کے زندہ رہ کر آنا بھی کیا ہے ...

لیکن خدارا یوں بغیر جرم عاید کئے ناراض نہ ہو جایا کریں"

ــــــــ (؟؟؟) ــــــــ

خوبصورتی

نوشتہ
وشو مبھر ناتھ کوشک

مترجمہ
بلال مُراد آبلوی

پنڈت بدری پرشاد شکل بہت بڑے آدمی ہیں۔ ان کی زمینداری کافی وسیع ہے۔ پورے پندرہ گاؤں ان کی ملکیت میں ہیں۔ شہر میں بھی بہت سی جائداد ہے۔ ان کا خاندان بھی بڑا ہے۔ خاندان میں مرد عورتیں سب مل کر پندرہ افراد ہیں۔ پنڈت جی کے دو بچے ہیں۔ ایک لڑکا جس کی عمر لگ بھگ دس سال ہے اور ایک لڑکی جو قریباً چودہ سال کی ہے۔ شکل جی کی والدہ بھی زندہ ہیں۔

رات کا وقت تھا شکل جی اپنے کمرے میں لیٹے ایک انگریزی اخبار پڑھ رہے تھے۔ کہ ان کی والدہ کمرے میں آئیں اور بولیں۔

"بیٹا بدری! لڑکی کے بیاہ کی بھی کچھ فکر ہے — سیانی ہو گئی ہے"

پنڈت جی نے اخبار ایک طرف رکھ کر جواب دیا۔ "فکر کیوں نہیں، ادھر اُدھر کہہ رکھا ہے"

"خالی کہنے سننے سے کام نہیں چلے گا کوشش بھی تو کرنا چاہیئے" والدہ نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں کوشش بھی کر رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ آج کل کچھ ایسی ہوا چلی ہے کہ جسے دیکھو، پہلے لڑکی کا فوٹو طلب کرتا ہے"

"فوٹو مانگیں تو فوٹو بھیج دو!"

"فوٹو بھیجنے میں گڑبڑ ہو جانے کا اندیشہ ہے!"

" گڑبڑ ہو جانے کا ڈر کیوں ہے، ہماری لڑکی کوئی کانی، لنگڑی، لولی تو ہے نہیں۔ ہاں خوبصورت بھی نہیں ہے مگر یہ تو بھگوان کی مرضی — ہمارا یا اُس کا اس میں کیا قصور؟ چیچک کے داغ نہ ہوتے تو خوبصورت بھی تھی۔ اس کمبخت چیچک نے چہرا بگاڑ دیا۔"

"یہی تو خرابی ہے!"

"خرابی اس میں کیا ہے۔ بھلے گھروں کی جیسی لڑکیاں ہوا کرتی ہیں ویسی ہی یہ لڑکی ہے۔ سینے پرونے میں ہوشیار ہے۔ کھانا اچھا پکا لیتی ہے پڑھی لکھی بھی ہے اور کیا چاہیئے؟"

"یہ سب ٹھیک ہے مگر لوگ تو پہلے شکل صورت دیکھتے ہیں"

"کون دیکھتا ہے؟ ہم نے تو کہیں بھی نہیں سنا۔ کہ کوئی اتنی دیکھ بھال کے بعد بیاہ کرتا ہو"

"پہلے تو نہیں کرتے تھے لیکن آج کل ایسا ہی ہوتا ہے"

"پھر تو جو لڑکیاں خوبصورت نہیں، ان کی شادی بھلا کاہے کو ہوتی ہوگی؟"

"شادی تو خیر ہو ہی جاتی ہے۔ مگر بڑی دقت کے بعد۔ خصوصاً صاحب ثروت اور تعلیم یافتہ لڑکے ملنا تو ناممکن ہے۔ تعلیم یافتہ لڑکے بغیر لڑکی کا فوٹو دیکھے شادی کرنے کو تیار نہیں ہوتے"

اسی لئے تو لوگ پہلے بچپن ہی میں بیاہ کر دیا کرتے تھے۔ کم عمری میں شادی کرنے سے یہ جھگڑے پیدا نہیں ہوتے۔ بھلی بُری سبھی طرح کی لڑکیاں کھپ جاتی ہیں"

"ہاں یہ بات تو ضرور تھی لیکن کم سنی کی شادیوں میں اور بہت سی خرابیاں ہیں۔ اسی وجہ سے لوگ آج کل کم عمری کی شادی کے خلاف ہیں"

"کلجگ ہے نا۔ اس کلجگ میں اچھی باتیں سب ختم ہوتی جا رہی ہیں اور بُری باتیں پیدا ہو رہی ہیں"

"ہاں پھر کیا کیا جائے۔ رفتار زمانہ کے خلاف چلنا بھی تو اچھا نہیں"

"تو پھر اپنی لڑکی کے لئے کیا ہوگا؟ کیا وہ بیچاری عمر بھر کنواری ہی بیٹھی رہے گی؟"

"نہیں کنواری کیوں بیٹھی رہے گی کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ کوئی خاندانی اور غریب لڑکا مل جائے تو اسے جہیز میں ایک آدھ گاؤں دے کر بیاہ کر دوں گا۔ لیکن ابھی کوئی ایسا ملا ہی نہیں کوشش کر رہا ہوں۔ امید ہے مل جائے گا۔ میں نے آپ سے کہا نہیں، دو جگہ بات پختہ ہوئی تھی مگر جب انہوں نے لڑکی کا فوٹو دیکھا تو پیچھے ہٹ گئے"

"تو تو نے لڑکی کی تصویر بھیجی تھی؟"

"ہاں بھیجی تھی — انہوں نے مانگی ہم نے بھیج دی"

"یہی تو غلطی کی، تصویر نہیں بھیجنا چاہیئے تھی"

"تو پھر کرتا کیا۔ بغیر تصویر دیکھے وہ شادی کرنے پر رضامند نہیں تھے"

"تصویر دیکھی اور پھر بھی راضی نہ ہوئے؟" ماتا نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

"لڑکی پسند نہیں آئی اس وجہ سے راضی نہ ہوئے"

"رام — رام اتنا بُرا وقت آ گیا ہے۔ میری چاچی بیچاری بالکل سُندر نہیں تھی۔ رنگ سانولا تھا۔ ناک نقشہ بھی اچھا نہ تھا۔ مگر بیاہ بڑے اطمینان سے ہو گیا ذرا بھی دقت نہ ہوئی۔ میرے چاچا تو اسے جان سے زیادہ عزیز سمجھتے تھے بھلے آدمیوں میں یہ باتیں نہ ہوتی تھیں۔ اس وقت تو یہ دیکھا جاتا تھا۔ کہ گھر اچھا ہو۔ لڑکی سگھڑ ہو۔ گھر کے کام کاج میں ہوشیار ہو۔ بس۔ صورت شکل کوئی

ہنیں دیکھتا تھا"۔

والدہ کی اس بات پر شکل جی ہنس پڑے، والدہ بھی مسکرا دیں" بھگوان جانے میں جھوٹ تھوڑا ہی کہتی ہوں میری خالہ بڑی خوبصورت تھی۔ ایک بار میرے نانا نے کسی سے کہہ دیا "میں نے سُنا ہے، آپکی لڑکی بڑی خوبصورت ہے" یہ سن کر میرے نانا بہت ناراض ہوئے، بولے آج کہا تو کہا آئندہ ایسی بات نہ کہنا۔ ورنہ اچھا نہ ہوگا" ایک وہ زمانہ تھا۔ اور ایک یہ زمانہ ہے کہ لوگ لڑکیوں کی تصویریں بھیجتے ہیں"۔

پنڈت بدری پرشاد نے کہا" جس زمانے میں جو بات رائج ہوتی ہے۔ وہی اچھی ہوتی ہے، اس کے برخلاف کرنے میں خرابی ہے"۔

" خیر یہ تو میں جانتی نہیں، میں تو یہ جانتی ہوں۔ کہ لڑکی سیانی ہو گئی ہے اس کا بیاہ ہونا چاہیئے، بس"۔

" بیاہ تو خیر ہوگا ہی"۔

" پہلے لڑکا تو ملے"۔

" لڑکا بھی ملے گا لیکن ذرا دوڑ دھوپ سے"۔

" تو دوڑ دھوپ کب کرو گے اس کے لئے کون سا وقت آئے گا؟"

" وقت اب آ گیا ہے اور میں کوشش کر رہا ہوں"۔

" ہاں بس میں یہی چاہتی ہوں۔ میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں کم سے کم لڑکی کا بیاہ تو اپنے ہاتھوں کر جاؤں۔ لڑکے کا بیاہ دیکھا جائے گا۔ بھگوان اس کی عمر دراز کرے"۔

" سب تمہارے سامنے ہی ہوگا۔ گھبراؤ نہیں، حوصلہ رکھو!"

(۲)

شکل جی نے بڑے جتن کئے کہ لڑکی کی نسبت کہیں قرار پا جائے لیکن جہاں کہیں منگنی کی بات چیت ہوتی۔ پہلے لڑکی کا فوٹو طلب کیا جاتا اور فوٹو بھیجنے سے انکار کرنے پر وہ بات چیت کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے منقطع کر دیتے اور فوٹو بھیجتے تو لڑکی پسند نہ آتی۔ شکل جی بیچارے بڑی کشمکش میں تھے ایک دن وہ اسی فکر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کہ ان کے ایک پرانے دوست ان سے ملنے آ گئے۔ کئی برسوں کے بعد ملاقات ہونے کی وجہ سے بدری پرشاد بڑی محبت سے ان کے ساتھ پیش آئے۔ خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد شکل جی نے پوچھا

" کہو آج کل کیا شغل ہے؟"

" وہی پرانا شغل ہے"۔

" سب کام کاج خوب ہو رہا ہے؟"

" ہاں ایشور کھانے کو دیئے جاتا ہے۔ یہی بہت ہے۔ آپ آج کل کیا کیا کرتے ہیں؟"

" میں تو آج کل لڑکی کے بیاہ کی فکر میں ہوں"۔

" فکر؟ اس کے لئے فکر کیوں؟"

شکل جی نے سب کیفیت سنا کر کہا" بس یہی سبب ہے۔ بچپن میں لڑکی کے چیچک نکلی تھی۔ جس سے اس کا چہرہ بگڑ گیا۔ اس وجہ سے کوئی شادی کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ نہ ہی کوئی ایسا ملتا ہے جو بغیر لڑکی یا اس کا فوٹو دیکھے بیاہ کر لے"۔

" تو اس کے لئے دوسری ترکیب ہے"۔

" وہ کیا؟"

" نقلی فوٹو بھیجو"۔

" نقلی... " شکل جی نے نفرت انگیز لہجے میں کہا

" ہاں نقلی۔ آخر کرو گے کیا؟ لڑکی کا بیاہ تو کرنا ہی پڑیگا"۔

" مگر کسی کو دھوکہ دینے کے لئے میرا ضمیر تیار نہیں ہوتا"۔

" بے وقوف ہو، دنیا میں ہمیشہ ایماندار اور پاکباز بنے رہنے سے کام نہیں چلتا"۔

" لیکن نقلی فوٹو بھی بھیجا جائے تو کس کا؟"

" کسی کا بھی ہو۔ ہاں ایک . . . . . ایک طریقہ اور ہے۔ اپنی لڑکی ہی کا فوٹو کسی ایسے فوٹوگرافر سے کھنچواؤ جو ریٹچ (Retouch.) کر کے اسے خوبصورت بنا دے"۔

" خوبصورت بنا دے؟"

" میرا مطلب یہ ہے کہ ان عیوب کو دُور کر دے۔ جن کی وجہ سے وہ بدصورت دکھائی دیتی ہے"۔

" ہاں اگر ایسا فوٹوگرافر مل جائے تو بڑی اچھی بات ہے۔ اتنا پاپ تو میں کرنے کے لئے آمادہ ہوں۔ لیکن سولہ آنے نقلی فوٹو بھیجوں ——— یہ مجھ سے نہ ہوگا"۔

" خیر وہ نہ کرو یہ کرو"۔

" تو ایسا فوٹوگرافر یہاں تو کوئی ہے نہیں!"

" فوٹو کلکتے یا بمبئی بھیجو وہاں سے درست ہو جائے گا"۔

" تم کسی ایسے فوٹوگرافر کو جانتے ہو؟"

" ہاں دو تین پتے مجھے یاد ہیں"۔

" اچھا تو پتے لکھا دو یہ بھی کر دیکھیں"۔

دوست نے تین پتے لکھوا دیئے اور پھر بولے" ان کو صاف لکھ دینا۔ کہ چہرے میں جو نقائص ہیں وہ دُور کر دیئے جائیں"۔

" یار ایسا ہو جائے تو پھر کیا ہے، پرماتما جانے، میں اتنا پریشان

ہوں کہ کہہ نہیں سکتا۔"

"خواہ مخواہ پریشانی اٹھائی۔ یہ تو معمولی بات ہے۔ بہت لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔"

"میری فطرت ہی ایسی نہیں۔ کہ کسی کے ساتھ دھوکہ کروں۔ اسی سبب مجھے کبھی اس بات کا خیال تک نہ آیا۔"

"دُنیا میں رہ کر سب کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"ہاں جب لوگ ایمانداری کی قدر نہیں کرتے۔ تو یہ بھی کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"میں نہ آتا تو ابھی تم اسی فکر میں جانے کب تک غلطاں رہتے۔"

"ہاں اس میں کیا شک ہے۔ مجھے یہ بات کبھی نہ سوجھتی۔"

"خیر میرا آنا اکارت نہیں گیا۔"

"احباب کا آنا ہمیشہ مبارک ہوتا ہے۔"

گھنٹہ بھر بیٹھ کر دوست صاحب رخصت ہو گئے۔ شکل جی نے اُسی روز لڑکی کا فوٹو بمبئی بھیج دیا۔

پندرہ دن بعد فوٹو بن کر آ گیا۔ شکل جی اُسے دیکھ کر سناٹے میں آ گئے ناک نقشہ سب وُہی لیکن چہرہ بالکل صاف، چیچک کا کہیں ایک نشان تک نہیں۔ آنکھیں بھی اصلی آنکھوں کی نسبت کہیں اچھی بنا دی گئی تھیں۔ شکل جی نے والدہ اور اہلیہ کو وُہ فوٹو دکھایا۔ پہلے تو وُہ پہچان ہی نہ سکیں، لیکن جب شکل جی نے بتایا۔ تو ان کو بھی بڑی حیرت ہوئی۔

بیوی ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولی: "یہ چیچک نہ نکلتی۔ تو لڑکی ایسی ہی ہوتی۔"

"بیشک! مگر بھگوان کی مرضی ہی ایسی تھی۔ کیا کیا جائے۔ اب جہاں سے فوٹو کی مانگ آئے گی۔ یہی فوٹو بھیجوں گا۔"

"اب اسے دیکھ کر تو کوئی ناپسند نہ کریگا؟"

"اب کیا ناپسند کرے گا۔ اس میں خوبصورت نہیں دکھائی دیتی تو بدصورت بھی معلوم نہیں ہوتی۔"

"لیکن بیاہ کے بعد جب دیکھیں گے تب؟"

"تب دیکھا جائے گا، شادی ہو جانے پر کیا ہو سکتا ہے؟"

"ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا۔ دوسرا بیاہ بھی کر سکتے ہیں۔"

"تو کیا کریں جو لڑکی کی قسمت میں لکھا ہو گا۔ وہی ہو گا۔ ہمارے کرنے کا جو کام ہے وُہ ہم کر رہے ہیں۔"

دو تین جگہ جہاں رشتے کی بات چیت ہو رہی تھی۔ شکل جی نے وُہی فوٹو بھیج دیئے۔ نتیجے کے طور پر ایک جگہ بات پختہ ہو گئی۔ جس دن رشتے کی منظوری کا خط شکل جی کو ملا۔ اس دن وُہ بے فکری کی نیند سوئے۔ شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔

(۳)

شکل جی کی لڑکی کا بیاہ ہو گیا۔ انہوں نے دل کھول کر جہیز دیا۔ پورا گاؤں جس کی سالانہ آمدنی تقریباً چار ہزار روپیہ تھی، ایک موٹر کار۔ اور لگ بھگ بارہ ہزار کا دوسرا سامان مثلاً برتن، زیور، کپڑا وغیرہ۔ اس طرح شکل جی نے اپنے اُس گناہ کا کفارہ ادا کر دیا۔ جو انہوں نے لڑکی کا اصلی روپ چھپا کر کیا تھا۔ پنڈت جی کے سمدھی پنڈت بالک رام ترپاٹھی بہت خوش ہوئے۔

ترپاٹھی جی اوسط طبقے کے آدمی تھے۔ ان کے یہاں اناج کی آڑھت کا کام ہوتا تھا۔ اور اس طرح تین چار سو روپے ماہوار کی آمدنی ہو جاتی تھی۔ شہر میں کچھ جائداد بھی تھی۔ اتنا زیادہ جہیز پا کر ترپاٹھی جی بے حد مسرور ہوئے انہوں نے شکل جی کی خوب تعریف کی۔

وداع کے وقت شکل جی نے ترپاٹھی جی سے ہاتھ جوڑ کر بولے: "ترپاٹھی جی! بھول چُوک سب سے ہوتی ہے۔ انسان اپنی مطلب براری کے لئے سب کچھ کرتا ہے۔ میری یہ التجا ہے کہ میرے کسی قصور کا بدلہ آپ میری لختِ جگر سے نہ لیجئے۔ یہ میری اکلوتی لڑکی ہے۔ اگر اسے آپکے ہاں تکلیف پہنچی۔ تو مجھے بڑا دکھ ہو گا۔" اتنا کہتے کہتے شکل جی کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔

ترپاٹھی جی بڑی نرمی سے بولے: "یہ آپ کیا کہتے ہیں شکل جی! آپ کی لڑکی اب میری لڑکی ہو گئی۔ اسے بھلا ہم دُکھ دے سکتے ہیں۔ میرا بھی اکلوتا لڑکا ہے۔ اس وجہ سے اَور کوئی بہو نہیں۔ آپ کی لڑکی ہی کا راج رہے گا۔"

اس طرح ترپاٹھی جی بہت ہی خوش خوش واپس ہوئے۔ لیکن گھر پہنچنے پر جب دلہن کا چہرہ دیکھا گیا۔ تو ان کی تمام خوشی پر اوس پڑ گئی۔ ان کی بیوی دلہن کا منہ دیکھنے کے بعد ہانپتی ہوئی ان کے پاس پہنچی اَور بولی۔

"سالگ سے پتا لڑکی والوں نے تو بڑی دغا کی!"

ترپاٹھی جی نے گھبرا کر پوچھا: "کیسی دغا؟"

"لڑکی تو وُہ نہیں ہے جس کا فوٹو آیا تھا۔"

ترپاٹھی جی ٹپٹا کر بولے: "یہ تم بکتی کیا ہو؟ وُہ نہیں تو اور کون ہے ان کی ایک ہی تو لڑکی ہے؟"

"ایک ہو چاہے دس۔ مجھے اس سے کیا مطلب۔ میں تو یہ کہتی ہوں کہ یہ لڑکی وُہ نہیں ہے۔ جس کی تصویر آئی تھی۔"

"یہ کیونکر جانا؟"

"جب لڑکی بھی موجود ہے اَور تصویر بھی۔ تو جاننے میں کتنی دیر لگتی ہے۔"

"تو اس لڑکی میں کیا کوئی عیب ہے؟"

" عیب! یہ تو بڑی بدصورت ہے۔ چیچک کے مارے چہرہ بھڑوں کا چھتہ بن گیا ہے:"

" رنگ تو گورا ہے، میں نے ہاتھ پاؤں دیکھے تھے۔ ہاتھ پاؤں سے تو اچھی معلوم ہوتی تھی:"

" رنگ گورا ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ ناک نقشے کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ سالگ دیکھے گا۔ تو کیا کہے گا؟"

ترپاٹھی جی سناٹے میں آ گئے۔ معاً انہیں ترپاٹھی جی کے وداع کے وقت کہے ہوئے الفاظ یاد آ گئے: "انسان اپنی مطلب برآری کے لئے سب کچھ کرتا ہے۔ ——— میرے کسی قصور کا بدلہ آپ میری لختِ جگر سے نہ لیجئے گا۔" اب ترپاٹھی جی کی سمجھ میں آیا کہ ان فقروں کے کہنے سے شکل جی کا کیا مقصد تھا۔ سر ہلا کر بولے "جبھی شکل جی اتنی عاجزی دکھا رہے تھے۔ میں اب سمجھا۔"

ترپاٹھی جی کی اہلیہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگی۔ وہ آنسو آنچل سے پونچھتے ہوئے بولیں: "میرا اکلوتا بچہ اور اس کی دلہن ایسی بدصورت! میں نے نہ جانے کتنی دفعہ کہا۔ کہ لڑکی دیکھ آؤ یا کسی سے دکھوا لو ——— تصویر کا کیا بھروسہ۔ لیکن تم نے میری ایک نہ مانی۔ اب بتاؤ۔ میں کیا کروں۔ میرے بچے کی زندگی برباد ہو گئی کہ نہیں؟"

ترپاٹھی جی بولے: "تو میں کیا جانتا تھا۔ کہ اتنے بڑے آدمی بھی دغابازی کریں گے۔ جہیز تو بچارے نے بہت دیا:"

"ایسا جہیز کس کام کا۔ ہم محتاج تھوڑا ہی ہیں۔ بھگوان کا دیا سب کچھ ہے۔ امیر نہیں تو ایسے غریب بھی نہیں رہیں۔ ہمیں تو لڑکی اچھی چاہئے تھی، دھن دیتے چاہے نہ دیتے ——— سالگ تو اس سے بات بھی نہ کرے گا:"

" خیر اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔ اگر سالگ کی خواہش ہوگی تو دوسرا بیاہ کر دینگے:"

" وہ تو کرنا ہی پڑے گا۔ جو پہلے ہی میری بات مان کر لڑکی دیکھ لیتے۔ تو یہ دن کاہے کو دیکھنا نصیب ہوتا:"

" اعتماد میں مارے گئے:"

" آج کل کسی پر اعتماد کرنا بڑا احمق پن ہے:"

" خیر اب تو حماقت ہو ہی گئی۔ آئندہ کے لئے محتاط ہو گئے۔ ان کی اس دغابازی کا پھل انہی کی لڑکی کو بھگتنا پڑے گا ہمیں کیا، ہم تو لڑکے کا دوسرا بیاہ کر دیں گے۔ انہیں ایسا ہرگز نہ کرنا چاہئے تھا۔ اتنے پڑھے اور سمجھدار ہو کر ایسا کھوٹا کام کر بیٹھے رام رام۔ ذرا فوٹو تو لاؤ ——— دیکھوں تو سہی کس کا فوٹو بھیج دیا تھا:"

ترپاٹھی جی کی بیوی فوٹو لے آئی۔ فوٹو دیکھ کر وہ بولے: "تصویر تو کسی اچھی لڑکی کی ہے:"

بیوی نے جواب دیا۔ "کسی رشتہ دار کی لڑکی ہوگی:"

" اب یہ وہ جانیں ہمیں کیا پتہ:"

" انہیں لکھنا تو، کہ یہ کیا دغابازی کی؟"

" لکھنا وکھنا فضول ہے:"

" کیوں فضول ہے، انہیں بھی تو معلوم ہو جائے:"

" تو اس سے ہوگا کیا؟"

" تم لکھ تو دینا۔ ہوتا تو اب کچھ نہیں، لڑکے کا دوسرا بیاہ کرنا پڑیگا:"

" کرنا پڑے گا۔ تو کر دیا جائے گا۔ فضول خط و کتابت سے کوئی فائدہ نہیں:"

(۴)

سہاگ رات کو سالگ رام ترپاٹھی نے جب دلہن کا چہرہ دیکھا۔ تو اسے کچھ شبہ سا ہوا۔ وہ ایک تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ بی۔ اے پاس کر چکا تھا۔ ایک حسین لڑکی کو اپنی شریکِ حیات بنانا چاہتا تھا۔ لیکن شکل جی کا بھیجا ہوا فوٹو دیکھ کر اس نے ایک شریف نوجوان کی طرح لڑکی پسند کرنے کی ذمہ داری والدین کو سونپ دی۔ اس نے سوچا تھا۔ اگر لڑکی تصویر کے مطابق ہوئی تو خوبصورت نہیں تو بدصورت بھی نہ ہوگی۔ یہ سوچ کر وہ اس معاملے میں خاموش رہا۔ لیکن اس وقت بیوی کا منہ دیکھ کر اسے بڑا اچنبھا ہوا۔ اتنا فرق! کئی منٹ تک وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ آخر اپنے حواس درست کر کے بولا۔

" تمہارے پتا نے جو فوٹو بھیجا تھا۔ وہ تو تمہارا نہیں تھا۔ کس کا تھا؟"

سالگ رام کی بیوی لیلا وتی نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔ "میں کیا جانوں کس کا تھا؟"

" کیا تمہیں یہ بھی پتہ نہیں کہ تمہارے پتا نے تمہارا فوٹو بھیجا تھا؟"

لیلا نے سر کے اشارے سے بتایا کہ اسے معلوم نہیں:

سالگ رام خاموش ہو گیا۔ اور کچھ سوچتا رہا۔ پھر یکایک وہ اٹھا اور کمرے کی ایک الماری سے اس نے ایک فوٹو نکالا۔ لیلا کے قریب آیا اور اسے دکھاتے ہوئے بولا: "یہی تصویر بھیجی تھی۔ یہ تمہاری ہے؟"

لیلا نے ترچھی نظروں سے فوٹو کا جائزہ لے کر کہا: "ہاں ہے تو میری ہی!"

"تمہارا فوٹو ہے:" یہ کہہ کر سالگرام نے لیلا کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر کو اٹھایا۔ اور اس کے نقش و نگار کو فوٹو سے ملانے لگا۔ خوب دھیان سے دیکھ کر اس نے بیوی کی ٹھوڑی چھوڑ دی۔ ..... "فوٹو تو بے شک تمہارا ہی ہے۔ لیکن بڑی چابکدستی سے ری ٹچ (Retouch) کیا گیا ہے:"

لیلا سمجھ گئی۔ کہ شوہر کو اس کا چہرہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی ہے۔ اپنے

خیمہ کے [illegible] تھا۔ وہ بے چاری اچھی طرح جانتی تھی کہ بدصورت ہے۔
سالگ رام (فوٹو) دکھ کر بولے "تمہارے پتا نے بڑا ہی نامناسب کام کیا ہے۔ انہیں تمہارا اصلی فوٹو بھیجنا چاہیئے تھا"۔

لیلا خاموش رہی۔

سالگ رام نے پھر بولنا شروع کیا: "اتنے بڑے آدمی اور ایسا گرا ہوا کام۔ رام! رام!"

لیلا بے چاری پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ مارے غیرت کے پسینہ پسینہ ہو گئی لیکن زبان سے کچھ نہ کہا۔

× × × × × × × ×

"کہو دلہن پسند آئی؟" سہاگ رات کی صبح کو ایک عورت نے جو رشتے میں سالگ رام کی بھاوج ہوتی تھی پوچھا۔

سالگ رام نے کہا "تمہیں پسند آئی؟"

"مجھے تو پسند نہیں آئی۔ اور مجھے کیا کسی کو بھی پسند نہیں"۔

"پھر مجھ کو نکر پسند آسکتی ہے؟"

"بڑا دھوکہ کھایا۔ اب دوسرا بیاہ کرنا پڑے گا"۔

اس کا جواب سالگ رام نے کچھ نہیں دیا چپ چاپ چلا گیا۔

دن گزرنے لگے۔ لیلا یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کے پتی دیو اس سے محبت نہیں کرتے۔ دل سے ان کی خدمت کرتی تھی۔ ان کی چھوٹی سے چھوٹی بات کا بھی دھیان رکھتی تھی۔ اپنے سگھڑ پن اور مہذبانہ طریق عمل کی وجہ سے اس نے کبھی کسی کو شکایت کا موقعہ نہیں دیا۔

سالگ رام جب اس کی ان خوبیوں کو دیکھتا۔ تو اس کے دل میں خیال پیدا ہوتا کہ اگر ان گنوں کے ساتھ ہی یہ خوبصورت بھی ہوتی۔ تو کیا اچھا ہوتا۔

(۵)

ایک رات کو سالگ رام جب سونے کے لئے اپنے کمرے میں آئے تو انہوں نے دیکھا کہ لیلا وتی پہلے ہی سے وہاں موجود ہے۔ وہ لیٹی ہوئی تھی۔

—— سالگ رام اس کے نزدیک پہنچکر بولے "طبیعت تو اچھی ہے؟"

لیلا خاموش رہی:

سالگ رام نے اس کے چہرے پر سے آنچل ہٹایا۔ تو انہیں معلوم ہوا کہ لیلا رو رہی ہے۔ اس کے رخسار آنسوؤں سے تر تھے۔ سالگ رام نے محبت سے پوچھا "کیوں رو رہی ہو؟"

لیلا شوہر کا سوال سن کر ہچکیاں لے لیکر رونے لگی۔ اسے اس طرح روتے دیکھ کر سالگ رام کو بہت حیرت ہوئی۔ انہوں نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "آخر بات کیا ہے کچھ بتاؤ تو سہی؟"

لیلا دل کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "میں مر جاؤں تو اچھا ہے"۔

"تو کچھ بات بھی بتاؤ گی؟"

"ماتا جی اور گھر کی سب عورتیں جب دیکھو یہی کہا کرتی ہیں "نہ جانے کہاں سے پلے بندھ گئی ہے، بدصورت ہے بھونڈی ہے۔ دوسرا بیاہ کرنا پڑے گا"۔ سنتے سنتے کان پک گئے ..... کہاں تک سنوں۔ اور کسی بات میں تو قصور باقی نہیں، بس اسی کو رٹا کرتی ہیں۔ اب صورت کو میں کیا کروں ایشور نے جیسی بنا دی ویسی ہی ہے۔ اسے خوبصورت بنانا میرے بس کی بات ہو تو فوراً بنا لوں"۔

یہ کہکر لیلا پھر رونے لگی۔ سالگ رام کے دل پر چوٹ لگی۔ اس کی بے غرض خدمت اور ذاتی خوبیوں کی وجہ سے وہ اس سے کچھ محبت کرنے لگے تھے۔ اب لیلا کو یوں روتے دیکھکر انہیں بہت دکھ ہوا۔ وہ سوچنے لگے "اگر یہ خوبصورت نہیں تو اس میں اس بے چاری کا کیا قصور؟ باقی سب باتیں تو اچھی ہیں کیا صرف خوبصورت نہ ہونا دوسرے گنوں پر پانی پھیر سکتا ہے؟"

اتنا سوچ کر سالگ رام نے لیلا کی جانب دیکھا۔ وہ ابھی تک سسک سسک کر رو رہی تھی۔ سالگ رام کو اس کی بے بسی اور معصومیت کا خیال کر کے اس پر بڑا ترس آیا: "تم خواہ مخواہ رو رہی ہو۔ انہیں بکنے دو۔ ان کے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟"

"ہوتا کیوں نہیں، آخر کوئی کہاں تک برداشت کرے۔ صورت اچھی نہیں تو میں یہاں نہ رہوں گی —— چلی جاؤں گی"۔

"کیوں چلی جاؤ گی؟"

"سب لوگ طعنے دیتے ہیں!"

"میں جو کہہ رہا ہوں کہ انہیں بکنے دو۔ ہاں ...... اور دیکھو میں بھی ان کو سمجھا دونگا"۔

"کس کس کو سمجھاؤ گے؟ ایک دو ہوں تو سمجھا بھی سکو"۔

"میں سب کو سمجھا دوں گا۔ تم دیکھنا تو سہی"۔

اسی قسم کی باتیں کہکر سالگ رام نے لیلا کو چپ کرایا۔

دوسرے دن صبح ہی بیدار ہو کر وہ والدہ کے پاس گئے۔ "کیوں ماتا جی! یہ کیا بات ہے؟"

"کون سی بات؟" ماں نے پوچھا۔

"آپ سب لیلا کے پیچھے ہاتھ جھاڑ کر کیوں پڑی ہیں؟"

ماں بولیں: "تجھ سے پڑی رہتی ہیں؟ کون تیرے پیچھے پڑا رہتا ہے"۔

"آپ ہی سب طعنے دیتی ہیں"۔

"یہاں تو کوئی پوچھتا نہیں پڑا رہتا؟"

"اتنے سب بدصورت اور بھونڈی کہا کرتی ہیں؟"

"اوّل تو کوئی کہتا نہیں اور اگر کہے تو کیا جھوٹ ہے۔ بدصورت تو وہ ہوا ہی ہے۔"

"لیکن کہنے سے کیا فائدہ؟ فضول کسی کا دل دکھانے سے کچھ ملتا ہے کیا؟ اور دوسری شادی کرنے کی بات کیوں کہی جاتی ہے؟"

"دوسرا بیاہ تو کرنا ہی پڑے گا۔ اس میں کچھ جھوٹ تھوڑا ہی ہے۔"

"دوسرا بیاہ میں کروں گا تب کرو گی یا زبردستی کر دو گی؟"

یہ غیر متوقع بات سن کر والدہ سٹپٹا گئیں: "اچھا تو کیا یہ بات بھی ہے کہ تو دوسرا بیاہ نہیں کرے گا؟"

"ہرگز نہیں کروں گا — کیوں کروں؟"

"بہو بدصورت جو ہے!"

"کون کہتا ہے بدصورت ہے؟ وہ جیتنی خوبصورت ہے۔ اتنا اس گھر میں کوئی بھی نہیں ہے۔"

والدہ بے انتہا حیرت زدہ ہو کر بولیں: "واہ بھئی واہ! یہ تو نئی بات سنی۔"

"خیر بات نئی ہو کہ پرانی اب آئندہ کوئی ایسی بات نہ کہیے۔ کہیے گا تو میں اسے برداشت نہ کر سکوں گا۔ خواہ مخواہ اس غریب کو پریشان کر رکھا ہے۔ محض صورت دیکھ لی اور باتیں بھی تو دیکھی ہوتیں۔ اس کی خوش سلیقگی اور شعور بھی دیکھا ہے؟ اس معاملے میں تو یہاں کوئی اس کے پاسنگ بھی نہیں۔"

والدہ منہ بنا کر بولیں: "اوہو! کیا ٹھیک ہے۔ صورت شکل نہیں تو یہ حالت ہے، اگر خوبصورت ہوتی تو نہ جانے کیا ہوتا؟"

"صورت شکل جیسی بھگوان نے دی ہے۔ کسی کے بس کی نہیں ہے۔ اس کے لئے اس بیچاری کو کیوں قصوروار ٹھیرایا جائے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ اب ایسا سلوک نہیں کیا جانا چاہیئے ورنہ مجھے بہت دکھ ہوگا۔"

"اچھا اچھا اب نہ ہوگا..... بس؟"

رات کو لیلا سے بات چیت ہونے پر سالگ رام نے کہا: "آج میں نے سب کو ڈانٹ دیا ہے۔ اب تم سے کوئی بری طرح پیش نہ آئے گا۔"

لیلا نے شوہر پر نظر ڈالی۔ اس ایک نگاہ میں کتنی ممنونیت اور محبت تھی۔ کہنے لگی۔

"کیا تم سچ مچ دوسرا بیاہ نہ کرو گے؟"

"کیوں کروں؟ سبب؟"

"میں بدصورت جو ہوں۔" لیلا نے شرم سے سر جھکا کر کہا۔

سالگ رام پریم بھرے لہجے میں بولے: "میرے لئے نہیں ہو۔ میں تمہاری صورت نہیں دیکھتا، میں دیکھتا ہوں تمہارا دل، تمہاری سیرت۔ دل کی خوبصورتی کے سامنے ظاہری حسن کی کوئی اہمیت نہیں۔"

لیلا پتی کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی۔ "اگر یہ بات ہے تو اب مجھے چاہے ساری دنیا بدصورت کہہ کر پکارے۔ مجھے کوئی دکھ نہ ہوگا۔ تم مجھے بدصورت نہیں سمجھتے ——— میرے لئے یہی سب کچھ ہے۔"

سالگ رام بیوی کو چھاتی سے لگا کر کہنے لگے:۔

"میں تمہیں صرف خوبصورت ہی نہیں بلکہ بے حد حسین سمجھتا ہوں۔ میں تم پر بڑی سے بڑی خوبصورتی نچھاور کر سکتا ہوں۔ جسے تمہارا حسن دیکھنا ہو وہ تم کو میری آنکھوں سے دیکھے۔ تو اسے پتہ چلے گا کہ تم کتنی حسین ہو۔"

"آج مجھ سے بڑھ کر سکھی دنیا میں کوئی نہیں۔" یہ کہہ کر لیلا نے شوہر کے گریبان میں اپنا منہ چھپا لیا۔

سید فیضی جالندھری

سرودِ رفتہ

وہ اک سرود!
کیا جس نے زندگی کو خراب ....
کہاں سے ڈھونڈھ کے لاؤں میں وہ سرودِ شباب؟

چمن میں پھول میں غنچے میں دشت و صحرا میں — کہاں کہاں اُسے ڈھونڈا ہے میں نے دُنیا میں
صبا کی تیز خرامی کے طور دیکھے ہیں — شگفتِ صبح کے تیور بغور دیکھے ہیں
فلک پہ چاند ستاروں کو چھان مارا ہے — سمن بدوش بہاروں کو چھان مارا ہے

× × × × × × ×

گُلوں کے سایہ میں بلبل کی آشیاں بندی — وہ یاس و بیم سے لبریز آرزومندی
وہ نغمہ رازِ محبت وہ طور کی وادی — وہ ایک جنتِ رنگیں، وہ نور کی وادی
جہاں لبوں پہ مچلتے ہیں سینکڑوں نغمے!
کمالِ زخمہ وری، اشتعالِ پردۂ ساز — وہ مطرب کی خوش الحانیوں کا دلکش راز
بغور دیکھے ہیں میں نے یہ سب نشیب و فراز!
کہیں بھی اس کا نشاں بیش و کم نہیں ملتا — وہ نغمہ مجھ کو خدا کی قسم نہیں ملتا
تو کیا مرے خطِ قسمت میں صرف لکھا ہے ....
اِک اضطرابِ مسلسل، اِک آرزو ناکام!
نہیں! یہ روح پہ ہوتی ہے بارشِ الہام — کوئی یہ کہتا ہے اے زخم خوردۂ اوہام
ہے سعی لازمی تکمیلِ مدعا کے لئے!
پھر ایک بار ہوں سرگشتۂ وادیٔ غم میں — اُلجھ گیا ہوں تمناؤں کے نئے خم میں!

× × × × × ×

یہ اضطراب!
یکایک سوال کرتا ہوں ——
تصورات کی رنگین مزاج دنیا سے
سہے گا بربطِ غم تیز دستیٔ مضراب؟
میں کیا سنوں گا پھر اک بار وہ سرودِ شباب!

میرزا ادیب

آغازِ جنگ

کردار ——— !

حمیدہ ——— آصف، اسلم اور اصغری کی ماں
رابعہ ——— حمیدہ کی بہن
جاوید ——— حمیدہ کا شوہر
حسن ——— ان کا خادم

منظر :- ایک وسیع اور سادہ کمرہ۔ دیواروں پر جا بجا، گاندھی، بھگت سنگھ، دت، محمد علی، ابو الکلام آزاد اور دیگر وطن پرستوں کی تصویریں لٹک رہی ہیں۔ کمرے کے وسط میں ایک میز ہے۔ جس پر چند گرد آلود کتابیں اور ایک سلیٹ پڑی ہے۔ دائیں دیوار میں ایک کھڑکی ہے جو گلی میں کھلتی ہے۔ کھڑکی سے کچھ فاصلے پر ایک پلنگ بچھا ہے۔ جس پر حمیدہ بیگم مشین سے اصغری کا کرتہ سی رہی ہے

حمیدہ بیگم ادھیڑ عمر کی عورت ہے۔ چہرے پر چھائیوں کے داغ ہیں۔ اور جسم ضعیف و نزار ہے۔ مشین کے قریب آدھا چھلا ہوا ایک سیب پڑا ہے۔

اصغری آتی ہے۔ میز سے سلیٹ اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھتی ہے مگر ناگہاں ہی اس کی نظر سیب پر پڑتی ہے۔ وہ بھاگ کر پلنگ کے قریب پہنچتی ہے اور سیب اٹھا لیتی ہے۔ اور پھر ٹھوڑی کو سینے سے لگا کر، فرش کی طرف دیکھتی ہے ——— اور مسکراتی ہے۔ اصغری ایک قہقہہ لگا کر بھاگ جاتی ہے۔

حمیدہ بیگم حسن کو پکارتی ہے۔ مگر کوئی جواب سنائی نہیں دیتا۔ وہ چیں بجبیں ہو کر زور زور سے مشین چلانے لگتی ہے۔ رابعہ آتی ہے۔

دونوں بہنیں ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھتی ہیں۔ حمیدہ بیگم کرتے کو پلیٹ کر پرے رکھ دیتی ہے۔ رابعہ برقعہ کھونٹی سے لٹکا دیتی ہے اور پلنگ پر بہن کے پاس بیٹھ جاتی ہے۔

(رابعہ اپنی بہن کے مقابلے میں تندرست نظر آتی ہے۔ اس کا چہرہ بھرا بھرا ہے۔ لباس اپنی بہن سے اچھا ہے)

حمیدہ (پرے کھسکتے ہوئے) میں ابھی ابھی تمہیں یاد کر رہی تھی۔ کیا حال ہے شفیق کا؟

رابعہ۔ اب تو تندرست ہے پھر کمزوری باقی ہے، دو ہو جائیں گی دو چار دن میں ——— پر سوں کی بیبرے منو کی طبیعت قدرے ناساز ہے۔ کل تین دفعہ قے کی ———

حمیدہ۔ ناسب بدپرہیزی کا نتیجہ ہے اور اچار کھلاؤ۔

رابعہ۔ کیا کروں، خود بازار جا کر اچار خرید لیتا ہے۔ اپنی تو اسے اتنی پیاری ہے کر کیا کہوں؟

حمیدہ۔ اپنی؟ - - - - خدا بچائے اس سے۔ پچھلے دنوں میری اصغری کو اپنی کھانے کا مرض تھا۔ مگر اب تو خدا کا فضل ہے۔ اپنی کی طرف دیکھتی بھی نہیں۔

رابعہ۔ ہمارے "لیڈر" صاحب کا کیا حال ہے؟

حمیدہ۔ (ٹھنڈی آہ بھر کر) کیا کہوں اس کا حال، عجیب وہم میں مبتلا ہے ——— گورنمنٹ کی نوکری پر لعنت بھیجتا ہے۔

رابعہ۔ پھر؟

حمیدہ۔ پھر کیا، ایک دیسی فرم میں کام کرتا ہے۔ کام بہت زیادہ مگر تنخواہ کچھ بھی نہیں۔

رابعہ۔ سمجھاتی کیوں نہیں اسے؟

حمیدہ۔ میں اور وہ ہر وقت سمجھاتے رہتے ہیں۔ کہ بیٹا! تو نے اتنا علم حاصل کیا ہے، گورنمنٹ کی نوکری کر، بڑی عزت ہے اس میں، پھر معقول تنخواہ علیحدہ، مگر وہ سنتا ہی نہیں، گورنمنٹ کو ملک کا دشمن سمجھتا ہے۔

رابعہ۔ ہوں، پاگل ——— بھلا اس سے کوئی پوچھے اگر تو گورنمنٹ کی نوکری نہیں کرے گا۔ تو گورنمنٹ کا نقصان کیا؟ خواہ مخواہ اپنی زندگی تباہ کر رہا ہے۔

حمیدہ۔ کہتا ہے میں مزدور ہوں، مزدوری کر کے روزی کماؤں گا۔ اور ملک کی خدمت کروں گا۔

رابعہ۔ ملک کی خدمت کریگا، بڑا آیا گاندھی مہاراج!

حمیدہ۔ خدا ہی اسے نیکی کی ہدایت دے، گورنمنٹ کے خلاف، امیروں کے خلاف، مولویوں کے خلاف ———

رابعہ۔ (بات کاٹ کر) کیا بدی اور کیا بدی کا شور ہے؟ اس کی مخالفت سے بچا کیا، کوئی گل نہ کھلائے ڈرتی ہوں۔

حمیدہ۔ اللہ ہی اسے ہدایت دے (اصغری کے کرتے کا جائزہ لینے لگتی ہے)

رابعہ۔ (دیوار پر چند حروف دیکھ کر) یہ کیا لکھا ہے: "اُٹھو میری دنیا کے پیاری غریبوں کو جگا دو"

حمیدہ۔ (حروف کی طرف دیکھ کر) یہ اسلم کی کارستانی ہے۔۔۔ لکھا ہے۔۔۔ "اُٹھو میری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو"

رابعہ۔ تو یہ "پیاری" کیا؟

حمیدہ۔ بات یہ ہے کہ یہاں پہلے اصغری نے لکھا تھا: "آجا پیاری چڑیا آجا" مگر اسلم نے یہ حروف مٹا کر اس پر لکھ دیا، "اُٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو" "پیاری" کا لفظ پوری طرح مٹا نہیں۔

رابعہ۔ کیا حال ہے اس اسلم کا؟

حمیدہ۔ بس چھوٹا آصف سمجھو۔ بھائی نے اس کا دماغ بھی خراب کر دیا ہے۔ وُہی انقلاب زندہ باد، وُہی ملک آزاد، بہن سے کہتا ہے شیخ صاحب کی لڑکی سے نہ کھیلا کر۔

رابعہ۔ وُہ کیوں؟

حمیدہ۔ یہی کہ وُہ دولت مند کی بیٹی ہے۔ اور دولت مندوں سے ان دونوں بھائیوں کو نفرت ہے۔

رابعہ۔ اچھا یہ بات ہے۔

(اصغری روتی ہوئی آتی ہے)

حمیدہ۔ کیا ہُوا، اچھو کے بچے نے سیب چھین لیا؟

اصغری۔ نہیں (سسکیاں لیتے ہوئے) مجھے مارا ہے۔۔۔ کہتا ہے وہاں نہ جایا کر کھیلنے۔

حمیدہ۔ کہاں، شیخ صاحب کے گھر؟

(اصغری اثبات میں سر ہلاتی ہے)

رابعہ۔ وہ منع کرنے والا کون ہے۔ لڑکیاں آپس میں کیوں نہ کھیلیں؟

(اسلم آتا ہے، غصّے سے اس کے نتھنے متحرک ہیں)

حمیدہ۔ (اسلم سے) کیوں بے حیا اسے مارا ہے؟

اسلم۔ اور کیا کرتا؟

حمیدہ۔ کیوں، وُہ نوشابہ سے کیوں نہ کھیلے؟

اسلم۔ میں کب اسے کھیلنے سے منع کرتا ہوں بیشک نوشابہ سے کھیلے، مگر یہ وہاں جاکر اسے پنکھا کیوں جھلتی ہے۔ اس کے بھائی کو کیوں اٹھائے پھرتی ہے۔ ملازمہ ہے کیا؟

حمیدہ۔ بیٹا! سہیلی کو پنکھا جھلنے میں کیا حرج ہے؟

اسلم۔ مگر امی! وُہ ہمارے گھر آکر سوائے کرسی کے اور کہیں بیٹھتی ہی نہیں۔ بڑی آئی نواب صاحب کی بیٹی!۔

رابعہ۔ وُہ نواب صاحب کی بیٹی نہیں تو اَور کیا ہے۔۔۔ نوابوں کے سر سینگ ہوتے ہیں؟

اسلم۔ (پہلی دفعہ خالہ کو دیکھ کر) خالہ جی سلام۔۔۔

رابعہ۔ (قدرے مسکرا کر) وعلیکم السلام برخوردار!

اسلم۔ خالہ جی بات یہ ہے آپ کو کچھ بھی معلوم نہیں!

رابعہ۔ ٹھیک ہے بیٹا! مجھے کیا معلوم، دنیا جہاں کی باتیں تم دونوں بھائیوں کو معلوم ہیں۔ خدا جانے کیا کر کے رہوگے؟

اسلم۔ ہم کیا کر کے رہیں گے سنیئے (گا کر) اُٹھو مری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو (ڈرامائی انداز میں) ہم دنیا کے غریبوں کو جگائیں گے مزدوروں کو بیدار کریں گے۔۔۔ دولت مندوں کو انسانیت سکھائیں گے۔

حمیدہ۔ (بہن سے مخاطب ہو کر) ہے نا چھوٹا آصف۔ اب اسے کون سمجھائے شیخ صاحب کو بُرا سمجھتا ہے۔ اسے کون بتلائے۔ کہ خان بہادر شیخ عبدالرحمٰن بہت بڑے آدمی ہیں۔

اسلم۔ وُہ خان بہادر! غریبوں کا خون چوس چوس کر بڑا آدمی بن گیا ہے۔

(آصف آتا ہے۔۔۔ آصف ایک درمیانہ قد کا نوجوان ہے۔ پیشانی سے ذہانت ٹپک رہی ہے)

آصف۔ (خالہ کو دیکھ کر) آہا! خالہ جان ہیں السلام علیکم۔۔۔ خالہ جی مزاج تو اچھے ہیں، بڑی دیر کے بعد آپ کی صورت دیکھی۔

رابعہ۔ (مسکرا کر) ڈر آتا ہے تم سے بھئی!

آصف۔ مجھ سے ڈر؟

رابعہ۔ اَور کیا! تم نے گورنمنٹ اَور دولت مندوں سے جنگ چھیڑ رکھی ہے!

آصف۔ (قہقہہ لگا کر) خالہ جان آپ کو کیا معلوم موجودہ گورنمنٹ نے ہمارے ملک کو کس طرح تباہ کر دیا ہے۔ کروڑوں انسان فاقے کر کرکے مر رہے ہیں۔ اب رہ گئے دولت مند، تو بتایئے یہ کیا کر رہے ہیں۔ ان کے عالیشان محلوں کے سامنے غریب اور بے کس مزدوروں کے بچے بھوک سے بلک بلک کر جان دے رہے ہیں۔ مگر ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔۔۔

رابعہ۔ ہوں!

آصف۔ بدنصیب مزدور ان کے کارخانوں میں رات دن محنت کر کے، ان کی دولت میں اضافہ کر رہے ہیں۔ مگر یہ ظالم لوگ بیچاروں کو اتنا بھی نہیں دیتے۔ کہ وہ دو وقت اپنا پیٹ بھر سکیں! صبح روٹی ملی ہے تو شام کو نہیں۔ شام کو ملی ہے تو صبح کو نہیں۔ آپ کو ان بیچاروں کی حالت پر رحم نہیں آتا؟

رابعہ۔ گھر میں بیٹھے فتوے دے رہے ہو!

آصف۔ خالہ جان! میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے —— میں نے دیکھا ہے کہ غریب مزدور خون پسینہ ایک کرنے کے بعد بھی روٹی کے سوکھے ٹکڑوں کو ترس رہے ہیں مگر یہ سرمایہ دار کچھ بھی نہیں کرتے۔ پھر بھی عالیشان بنگلوں میں رہتے ہیں دنیا کی تمام نعمتیں کھاتے ہیں بہترین کپڑے پہنتے ہیں —— کیا یہ انصاف ہے؟

حمیدہ۔ خدا پر الزام لگا رہے ہو —— خدا نے ہی غریب اور امیر پیدا کئے ہیں، اس میں کسی کا کیا قصور؟

آصف۔ یہی ذلیل نظریہ ہندوستان کو تباہ کر رہا ہے۔ خدا نے انسان پیدا کئے ہیں۔ امیر اور غریب نہیں۔

رابعہ۔ تو پھر یہ امیری اور غریبی ——!

آصف۔ امیری اور غریبی انسانوں نے خود پیدا کی ہے۔ چالاک انسانوں نے اپنی ودلت کے فائدہ اٹھا کر محتاج انسانوں کا سب کچھ لوٹ لیا۔

رابعہ۔ رہنے دو یہ فلسفہ، تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے:

آصف۔ اچھا خالہ جان! یہ خراب دماغ مجھے مبارک مگر وہ وقت آ رہا ہے۔ جب دنیا کے ہر عقلمند کا دماغ اسی طرح خراب ہو جائے گا۔

حمیدہ (بہن سے) چھوڑو یہ بحث، یہ کسی کی مانتا ہے۔ (مضطرب ہو کر) حسن کالج کمی سے کر آیا ہے یا نہیں:

اسلم۔ ابھی تک تو نہیں آیا۔ —— (خالہ سے) اچھا خالہ جان! یہ تو بتایئے آپ نے خالو کی بیماری کی وجہ سے تین ماہ کا کرایہ ادا نہ کیا۔ اس پر سیٹھ گھنشام مالک مکان نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا:

آصف۔ مکان سے نکال دیا جھٹ پٹ!

اسلم حالانکہ اس کے پاس لاکھوں روپے موجود ہیں، چند ماہ کا کرایہ دیر سے لیتا۔ تو کیا ہو جاتا ——؟

رابعہ۔ (قدرے خفیف ہو کر) ایسی باتوں سے کیا ہوتا ہے؟

(حسن آتا ہے)

حمیدہ۔ (حسن سے) اتنی دیر کہاں لگائی؟

حسن۔ بی بی جی! بازار میں لڑائی ہو گئی ——

حمیدہ۔ کیسی لڑائی؟

حسن۔ ایک مزدور بڑی سی گٹھڑی سر پر اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ سامنے موٹر آ رہی تھی وہ بیچارہ ایک طرف ہٹتے ہوئے شیخ صاحب سے ٹکرا گیا —— اس پر شیخ صاحب نے اسے گالیاں دینی شروع کر دیں —— پاجی، گدھا، نامعقول، اندھا، کمینہ، مردود ——۔ اس بیچارے نے کہہ دیا آپ فرعون ہیں۔ بس پھر کیا تھا۔ شیخ صاحب نے اس کی گٹھڑی زمین پر پھینک دی اور اب تو پیٹ رہے ہوں گے اسے ——

آصف۔ پیٹ رہے ہوں گے —— (تیزی کے ساتھ دروازے کی طرف جاتا ہے)

حمیدہ۔ آصف! کدھر چلا تو —— بیٹا آصف! کہیں گستاخی نہ کرنا آصف!

(آصف چلا جاتا ہے۔ سب لوگ کھڑکی سے دیکھنے لگتے ہیں)

رابعہ۔ خدا خیر کرے۔ طبیعت میں تیزی ہے کچھ کر نہ بیٹھے۔ اس کے ابا کہاں ہیں؟

حمیدہ۔ (حسن سے) حسن جا کر دیکھو جلدی —— میرے اللہ اس لڑکے نے کتنا ستایا ہے!

رابعہ۔ حوصلہ کرو بہن! وہ اتنا بے وقوف نہیں کہ شیخ صاحب کی شان میں کوئی گستاخی کرے۔

حمیدہ۔ تم کیا جانو —— میرے اللہ! (تاسف سے ہاتھ ملتی ہے) میرے بیٹے کو ہدایت دے!

اسلم۔ میں بھی جاؤں امی!

رابعہ۔ تو کیا کرنے جائے گا۔ بیٹھو یہاں آ کر!

اسلم۔ نہیں میں جاتا ہوں!

حمیدہ۔ جلدی جا، بھائی جان کو بلا لا۔ اس سے کہہ امی سخت ناراض ہو رہی ہیں ——!

(اسلم چلا جاتا ہے)

حمیدہ۔ دل دھڑک رہا ہے —— خدا خیر کرے:

رابعہ۔ خدا خیر ہی کریگا بہن! اطمینان رکھو! بازاروں میں ہزاروں لوگ موجود ہوتے ہیں، کوئی ایسی بات نہیں ہو گی:

حمیدہ۔ شیخ صاحب بہت بڑے آدمی ہیں۔ ان کی شان میں کچھ گستاخی ہوئی تو پھر ہماری خیر نہیں۔ جانتی ہو پر سال انہوں نے ذرا سی بات پر فیروز نائی کو ہتھکڑی لگوا دی تھی!

(سیڑھیوں پر پاؤں کی آہٹ سنائی دیتی ہے —— چند لمحوں کے بعد جاوید اور حسن زخمی آصف کو پکڑے اوپر لاتے ہیں —— دونوں بہنیں بھاگ کر سیڑھیوں کے پاس جاتی ہیں۔ اصغری بھائی کو زخمی دیکھ کر زور زور سے رونے لگتی ہے۔ اسلم کا چہرہ سرخ ہے اس نے بھائی کا ایک ہاتھ پکڑ رکھا ہے۔)

حمیدہ۔ ہائے اللہ! —— میرے بیٹے کو کیا ہوا —— آصف میرے لال ——

جاوید۔ پاگل ہے بالکل۔ شیخ سے لڑ پڑا۔

آصف۔ چھوڑ دو مجھے —— میں اس حرامزادے، کمینے کا کچل نہ ڈالوں تو میرا نام آصف نہیں۔

حمیدہ۔ (جس کی آنکھیں اشکبار ہو گئی ہیں) میرے بیٹے آصف، میرے لال!

(جاوید اور حسن آصف کو پلنگ پر لٹا دیتے ہیں)

رابعہ۔ تو کتنا پاگل ہو گیا ہے آصف، تیری عقل کہاں گئی؟

حمیدہ۔ اللہ اسے موت دے۔ کالی ناگن کاٹے —— میرے لال کو کس بے رحمی سے مارا ہے —— خان بہادر بنا پھرتا ہے۔

جاوید۔ تمہارے لال نے بھی تو کمال کر دیا۔ وہ مزدور کو پیٹ رہا تھا۔ اور یہ ان دونوں کے درمیان کھڑا ہو گیا —— بازار میں اتنے لوگ موجود تھے کسی نے بھی شیخ کو کچھ نہ کہا —— سب مزدور کو جھوٹا کہتے تھے —— مگر اس کے دماغ میں کیا آئی۔

آصف۔ (بیتابی کے ساتھ) سب بازار والے بزدل ہیں، بے غیرت ہیں، پتھر کے بت ہیں۔ ان کے سامنے ایک بے کس مزدور کو لہو لہان کر دیا گیا مگر وہ مزے سے کھڑے تماشہ دیکھتے رہے —— تف ہے ان کی انسانیت پر!

حمیدہ۔ نہ نہ بیٹا! اب آرام کرو۔ حسن جاؤ کپڑا لاؤ —— کوٹھڑی میں آصف کی دھوتی ہے —— جلدی لاؤ سب کچھ —— (رابعہ سے) بہن پانی گرم کرنا —— جلدی کر حسن —— دودھ بھی لیتے آؤ —— ہائے اس ظالم نے کس بے دردی سے میرے بچے کو پیٹا ہے —— خدا کرے اس کے ہاتھ ٹوٹ جائیں!

جاوید۔ جنگ کرتا ہے، امیروں سے

آصف۔ جنگ! (بیٹھ کر) ابا جان! اب مزدور بیدار ہو چکا ہے۔ اب وہ ظالم سرمایہ داروں کا ظلم برداشت نہیں کر سکتا —— اب تک یہ مغلظ درندے مزدوروں کا خون چوستے رہے اور موٹے ہوتے رہے۔ مگر اب زمانہ بدل گیا ہے —— مزدور سرمایہ داروں کا مقابلہ کرے گا —— جنگ کا آغاز ہو گیا ہے —— دنیا کے مزدور جاگ اٹھے ہیں۔ سرمایہ داری تباہی کے گھاٹ اترنے والی ہے —— مزدوروں کا سر بلند ہونے والا ہے۔ (جاوید، حمیدہ، آصف کے کندھے اور ہاتھ پکڑ لیتے ہیں) اب جنگ رک نہیں سکتی —— فتح مزدور کی ہے —— مزدور فاتح ہوگا —— جنگ کا آغاز ہو گیا ہے۔ (بے ہوش ہو کر گر پڑتا ہے)

نقد و نظر

پگلے کا چھلکا اور دیگر مضامین

(از سند باد جہازی، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۲۸، مجلد قیمت ایک روپیہ، ملنے کا پتہ :- اردو اکیڈمی پنجاب، لوہاری گیٹ، لاہور)

ویسے تو ملک میں بیسیوں مزاح نگار موجود ہیں اور ہر ایک مزاح نگار کے مزاحیہ کارناموں کو ملک کے کسی نہ کسی طبقے میں بڑی قدر و وقعت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے مگر سند باد جہازی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہندوستان کے ہر طبقے میں مقبول ہیں۔ آپکا مزاح صحیح معنوں میں مزاح ہے، یہاں نہ تو عریاں شوخیاں ہیں نہ آوردکے نام و شگوفے اور نہ بیگم صاحبہ کی پرتصنع چھیڑ چھاڑ۔ سند باد جہازی جو کچھ لکھتے ہیں نہایت بے تکلفی کے ساتھ لکھتے ہیں اور کسی جگہ بھی آورد کا گمان نہیں ہوسکتا۔ سند باد جہازی کے مضامین پڑھکر بے اختیار ہنسی تو نہیں آتی۔ (اور نہ یہ سنجیدہ اور حقیقی مزاح کا فرض ہے) مگر ان کا مزاح ہمارے دل میں چٹکیاں لیتا رہتا ہے ـــ ایک عرصے تک چٹکیاں لیتا رہتا ہے۔ اور جب بھی ان کا کوئی اچھوتا فقرہ یاد پڑتا ہے، ہم مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتے۔

سند باد جہازی کی نگاہ بہت باریک بیں ہے وہ میٹھی میٹھی باتوں میں ہمیں ایسے ایسے حقائق سے آشنا کر جاتے ہیں جن سے اکثر سنجیدہ ادب بھی محروم ہے۔

(م۔ ا)

چوپال

(مصنفہ احمد ندیم قاسمی بی اے۔ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۳۰۴ قیمت ڈیڑھ روپیہ (۱۸؍) ملنے کا پتہ :- دارالاشاعت پنجاب لاہور)

حضرت احمد ندیم قاسمی اُردو کے بہترین شاعروں اور نامور افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپکی ذہنی کاوشیں ملک میں نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں۔

ندیم صاحب کو دیہاتی معاشرت کے اظہار میں ید طولےٰ حاصل ہے اور آپکے افسانوں میں دیہاتی زندگی کے مدہم سے مدہم پہلو، معمولی سے معمولی جزو، اور باریک سے باریک نقطے کو بھی نہایت کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ آپکا افسانہ پڑھ کر افسانے کی فضا کا کوئی حصہ ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں رہتا ـــ ہم دیہاتیوں کے ساتھ گاؤں کی تہذیب ناآشنا راہوں سے گزرتے ہیں۔ معصوم فضا میں لہراتے ہوئے دلآویز نغمے سنتے ہیں اور محبت سے دکھی ہوئی بستیوں کے دکھوں میں شریک ہوتے ہیں۔ اس سے بڑھکر افسانے کی اور کیا کامیابی ہو سکتی ہے۔

اس مجموعے میں اٹھارہ افسانے شامل ہیں۔ کتاب کے آغاز میں مولانا عبدالمجید سالک ایڈیٹر انقلاب اور جناب سید امتیاز علی صاحب تاج، بی اے کے دیباچے بھی شریک ہیں۔

(م۔ ل)

معارف جمیل

(مصنفہ جناب حکیم آزاد انصاری۔ کتابت و طباعت خوشگوار، صفحات ۲۵۶۔ قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے، غیر مجلد دو روپے۔ ملنے کا پتہ: مکان شاہ گنج بازو گھانسی، حیدرآباد دکن)

معارف جمیل اُردو کے نامور و مشہور جناب حکیم آزاد انصاری کے دلآویز کلام کا مجموعہ ہے۔ حکیم صاحب کہنہ مشق شاعر ہیں اور آپکا کلام اُردو کے ہر رسالے کو زینت دیتا رہا ہے۔

سلاست و صفائی زبان حکیم صاحب کی سب سے بڑی خوبی ہے اور اسی خوبی کو جلیل القدر شاعر نے ہر جگہ پیش کیا ہے۔

ذیل میں چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں جنکے مطالعے سے قارئین حکیم صاحب کی شاعرانہ خصوصیات کا کچھ نہ کچھ اندازہ لگا سکیں گے :-

امید مہربانی رائیگاں معلوم ہوتی ہے۔ نگاہ مہرباں، نامہرباں معلوم ہوتی ہے
دل افگار کی چوٹ بالکل نہاں معلوم ہوتی ہے۔ خموشی دردمند کی زباں معلوم ہوتی ہے

اک ترے شوق نے خود رفتہ بنا رکھا ہے۔ اک تری یاد نے دنیا کو بھلا رکھا ہے
دل کو بے تابی پیہم تو زباں کو نالے :: اک مزا ہے کہ جو قسمت نے بچا رکھا ہے

کس کی لگاوٹ، کس کی لاگ۔ بھاگ، بلائے عشق سے بھاگ
زلفوں والو! یہ اندھیر۔ دہرے دہرے کالے ناگ
میرا سر، اور تیرا در۔ دھن مری قسمت دھن مرے بھاگ

ہم یوں گنوا نے بیٹھے ہیں سرمایہ شکیب۔ جیسے کوئی غریب مسافر لٹا ہوا
اے مرکز امید خبر لے کہ مٹ چکی! وہ آس، زندگی کا سہارا کہیں جسے
اے کاش کوئی لطف سے اتنا تو پوچھ لے۔ جی ہی میں کچھ نہیں کہ مجال سخن نہیں

کتاب کے آغاز میں مصنف نے اپنی اور اپنی شاعری کی سرگزشت اپنے قلم سے لکھی ہے جس میں خاندانی حالات کے علاوہ اپنی خصوصیات شاعری بھی بیان کی ہیں۔

کتاب میں جناب مرزا جان صاحب کے اشعار عقیدت کے علاوہ مصنف کی تصویر کے اوپر بھی ایک شعر درج ہے یہ دونوں چیزیں نہ ہوتیں تو بہتر تھا یہ چیزیں قارئین پر ناخوشگوار اثر ڈالتی ہیں۔

(م۔ ل)

دی فیڈرل بنک آف انڈیا پنجاب لمیٹڈ لاہور

کی ترقی کا اندازہ

ذیل کے اعداد و شمار بتاریخ ۳۰ جون ۱۹۳۹ء سے لگائیے!

فروخت شدہ سرمایہ	۲۸۰۷۰۰	کاروباری سرمایہ	۱۰۳۵۰۰۴
ادا شدہ سرمایہ	۶۸۸۹۴	ڈیپازٹ	۸۳۵۸۸۴
ریزرو بقایا سرمایہ	۲۱۱۸۰۶	ریزرو فنڈ	۱۵۰۰۰

ایسے ترقی پذیر اور قومی بنک کی سرپرستی کرنا ہر ہندوستانی کا فرض اولین ہے

شرح سود فکسڈ ڈیپازٹ ——— ۴ فیصدی سالانہ

شرح سود سیونگ بنک ——— ۳ فیصدی سالانہ!

چلت حساب ——— ۲ فیصدی سالانہ!

مزید تفصیلات بنک ہذا سے طلب فرمائیں!

مینجنگ ڈائرکٹر:-

ایچ سی ماتھر بی اے آنرز ایف آر ای ایس لندن


قمیضوں اور سوٹوں کے خوبصورت تحفے!!
VARSITY FLANNELS
ورسٹی فلالین
PALMBEACH SUITINGS
پام بیچ سوٹنگز
MAYFAIR. SHIRTING
مے فیئر شرٹنگ
CRESTA SHIRTING
کریسٹا شرٹنگ
CABLE SHIRTING
کیبل شرٹنگ
The
BANGALORE WOOLLEN COTTON & SILK MILLS CO., LTD. BANGALORE
سول ڈسٹری بیوٹرز۔ میسرز برج موہن کرشن پرشاد کٹرہ اہلو والیاں امرتسر
دیگر دفاتر۔ لاہور۔ راولپنڈی۔ پشاور۔ کانپور۔ دہلی۔ بمبئی

سوال
ایسی اچھی صحت کس طرح؟



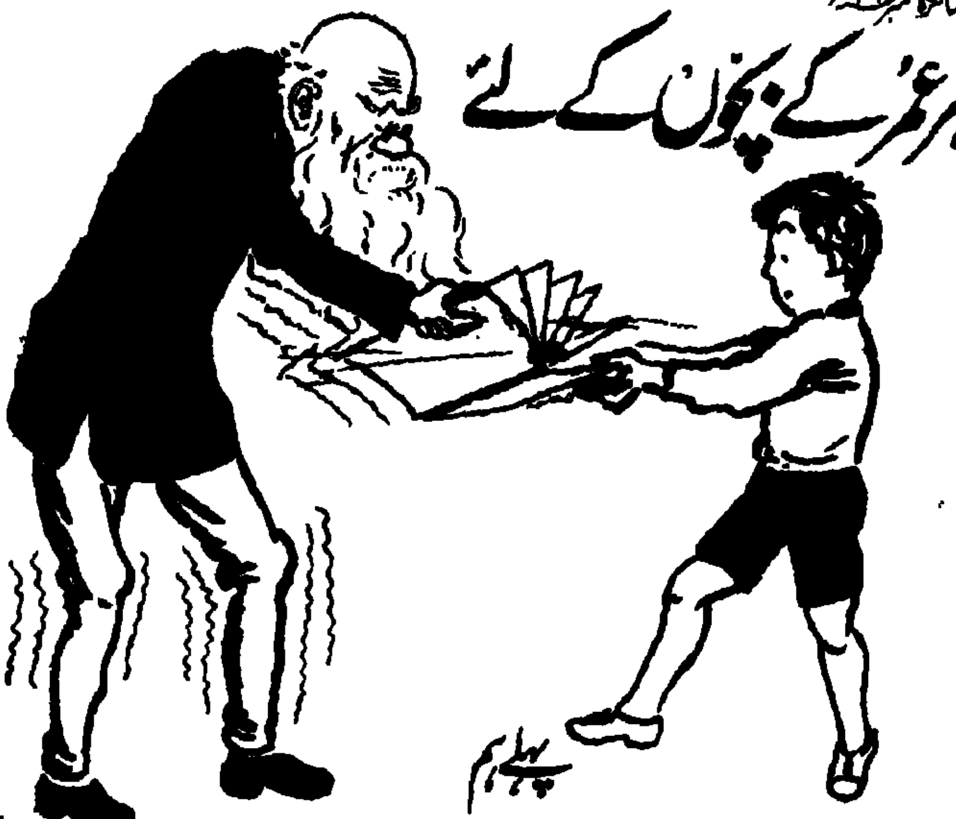
جواب
مصفّی

اگر آپ اپنے گُردوں کو دیکھ سکتے تو معلوم کرتے کہ گردہ، جگر، مثانہ، وجع المفاصل اور معدہ کی جملہ امراض۔ انفلوئنزا شدید نزلہ، ریڑھ کی درد، ضعف، ہسٹریا (اختناق الرحم) عرق النسا، ذیابیطس وغیرہ سب کے سب تیزاب اور خون کے فساد کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک مشہور ڈاکٹر کی رائے ہے کہ خون صاف کئے بغیر امراض کا علاج محض تضیع اوقات ہے۔ تسلیم شدہ ہے۔ اور اس کا ثبوت بھی باسانی فراہم کیا جا سکتا ہے کہ مختلف عضویاتی امراض اور تمام شکایات جسمانی براہِ راست زہر آلود مادہ اور فسادِ خون کی وجہ سے رُونما ہوتی ہیں۔ مثلاً یورک ایسڈ کے اثرات سے گنٹھیا اور اعصابی امراض اور معدہ کے تیزابوں کے اثر سے بدہضمی وغیرہ پیدا ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دق (TUBERCLOSES) اور معمولی زکام کے درمیان تمام امراض فسادِ خون اور تیزاب کے اثر سے وجود میں آتے ہیں۔ اور جب یہ مہلک صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ تب طبیبوں کو یہ فکر ہوتی ہے کہ کسی طرح زہر کا دفعیہ کیا جائے۔ لیکن احتیاط کا تقاضا تو یہ ہونا چاہئے کہ قبل از وقت خون کی صفائی کا خیال رکھا جائے۔ ہر شخص کو چاہئے کہ وقتاً فوقتاً جگر کو تقویت پہنچا کر معدہ اور گردوں کا تنقیہ کر کے خون صاف کرتا رہے تاکہ تولیدِ جراثیم کا کوئی مرکز ہی نہ رہے۔ خون اور نظامِ عضوی کو جراثیم اور دیگر فاسد مادہ سے صاف کئے بغیر ازالہ مرض کی کوشش کرنا بالکل ایسا ہے جیسا کہ بغیر آگ بجھائے دھوئیں کو دور کرنے کی کوشش کرنا۔ آپ اس کا ثبوت فراہم کر سکتے ہیں۔ کہ کم قیمت دوائی جس کا نام **مصفّی** ہے منگوا کر استعمال کریں۔ دو تین یوم کے استعمال سے آپ کو معلوم ہو جائیگا۔ کہ آپ کی مرض رفتہ رفتہ رخصت ہو رہی ہے اور آپ کی صحت و قوت میں اضافہ کے ساتھ آپ کی رنگت میں خوشنما سُرخی اور سفیدی بڑھ رہی ہے۔ یقیناً آپ اپنے جسم و رگوں میں نئی قوت و توانائی محسوس کریں گے۔ قیمت فی شیشی ۲۵ خوراک پانچ روپے۔ محصولڈاک ایک شیشی سے تین شیشی تک آٹھ آنے ۸؍

ہندوستان کے سول ایجنٹ:۔

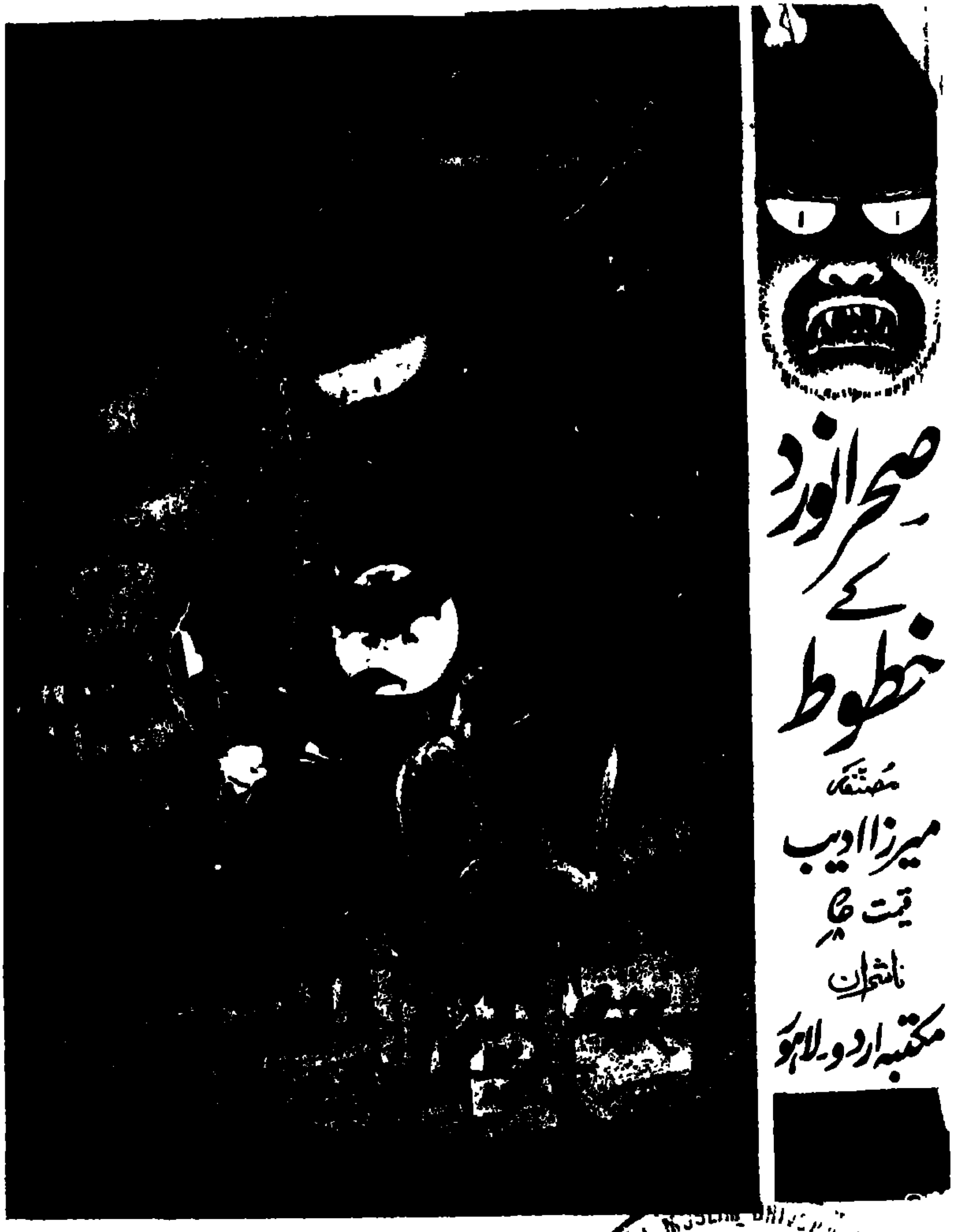
میسرز بی ایم، کے بخشی اینڈ کمپنی (وطن بلڈنگ) لاہور

سالگرہ نمبر [illegible]



اس مرتبہ سالگرہ نمبر عجیب و غریب چیز ہوگا۔ کاغذ بہت اچھا تصویریں دلچسپ غرض ظاہری صورت بہت شاندار اور مضمونوں کا تو پوچھنا ہی کیا تم اگر خریدار نہیں ہو تو فوراً ہو جاؤ۔ خریداروں سے اس کی قیمت الگ نہیں لی جاتی۔ ویسے اس کی قیمت [illegible]

منیجر پیام تعلیم قرول باغ نئی دہلی



صحرانورد کے خطوط رومان انگیز دنیا میں بسر کرنے والے صحرانورد کی کتاب زندگی کے ہیجان خیز ورق جو ایک انقلاب کی صورت میں پیش کر سکتا ہے

280

میرزا ادیب بی اے